تحسینِ ادب

مع تشریح

ثانوی زبان۔اردو

برائے ڈگری، پہلا، دوسرا، تیسرا سمسٹر

آندھرا پردیش اسٹیٹ کونسل فار ہائیر ایجوکیشن سے منظور شدہ

ریاست کی تمام یونیورسٹیوں میں ڈگری کی سطح پر بی۔اے۔بی۔کام اور بی۔ایس سی کے لیے

تعلیمی سال 21-2020 سے نافذ العمل

مرتبہ

ڈاکٹر شیخ فاروق باشا عمری

ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری

جملہ حقوق بحق مرتبین محفوظ ہیں

کتاب : تحسینِ ادب
مرتبین : ڈاکٹر شیخ فاروق باشا عمری
ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری
اشاعت دوم : 2022ء
تعداد : 1000
قیمت : Rs. 200/- (دوسو روپئے)
طباعت : سہیل گرافکس، چھتہ بازار، حیدرآباد Ph: 9246161020
رابطہ : فون: 9493330013، 8712135940

ISBN No: 978-81-953991-0-9

TAHSEEN E ADAB

SECOND LANGUAGE URDU
FOR
UG FIRST / SECOND & THIRD SEMESTER
Priscribed by APSCHE for Universities of A.P.
B.A., B.Com., & B.Sc.,
Applicable from 2020-21.

Edited By

Dr. S. FAROOQ BASHA
Head, Department of Urdu, Government Degree College, Rayachoty

Dr. SYED VASIULLA BAKHTIARY
Head, Department of Urdu, Government College for Men(Autonomous)Kadapa

Year of Publication: 2022
Price : 200/-

محکمۂ کلیاتی تعلیم، حکومتِ آندھرا پردیش
(کمشنریٹ آف کالجیٹ ایجوکیشن، گورنمنٹ آف آندھرا پردیش)



پیغام

ریاست آندھرا پردیش کے گورنمنٹ ڈگری کالجوں اور خانگی کالجوں میں اردو کو ثانوی زبان کی حیثیت سے بہت سے طلبہ پڑھتے ہیں۔ ریاست کے کئی کالجوں میں اردو میڈیم سے ڈگری کی سہولت بھی موجود ہے۔ اور مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ کئی سالوں سے ان طلبہ کی تعلیمی رہنمائی کے لیے کوئی نصابی کتاب موجود نہیں ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر شیخ فاروق باشا، شعبہء اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج، رائے چوٹی، اور ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری، شعبہء اردو، گورنمنٹ کالج برائے ذکور (خود مختار)، کڈپہ نے ''تحسینِ ادب'' کے نام سے ایک نصابی کتاب متن اور تشریح کے ساتھ ترتیب دی ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب طلبہ اور اساتذہ کی تعلیمی رہنمائی کرتے ہوئے ان کے علم میں اضافہ کا باعث بنے گی اور ان میں مسابقتی امتحانات کا جذبہ بھی پیدا کرے گی۔

پولا بھاسکر

ڈاکٹر پولا بھاسکر آئی.اے.ایس.
کمشنر آف کالجیٹ ایجوکیشن، و آندھرا پردیش

فہرست عناوین

پیش لفظ	5
عرض مرتبین	7
پہلا سمسٹر۔اردو شاعری (غزل،نظم)	8
دوسرا سمسٹر۔اردو شاعری (مثنوی،مرثیہ،قصیدہ،رباعی)	75
تیسرا سمسٹر۔افسانوی ادب (داستان،ڈرامہ،ناول،افسانہ)	111

پیش لفظ

ریاستِ آندھرا پردیش میں اردو زبان کو آٹھ اضلاع میں ثانوی زبان کا موقف حاصل ہے ۔ یہاں کے مختلف کالجوں میں طلبہ اردو کو زبان دوم کی حیثیت سے پڑھتے ہیں ۔ اردو مادری زبان ہونے کی وجہ سے بہت سے طلبہ زبان دوم کی حیثیت سے اختیار کرتے ہیں ۔ گزشتہ کئی سالوں سے ڈگری سطح پر نصابی کتاب نہیں ہونے کی وجہ سے طلبہ اور اساتذہ مواد کے حصول کے لیے بہت پریشان ہوتے تھے ۔ کسی نے اس جانب توجہ نہیں دی ۔

تعلیمی سال 21-2020 سے آندھرا پردیش میں اردو زبان کا ایک نیا نصاب تشکیل دیا گیا جو APSHCHE کی جانب سے منظور شدہ تھا ۔ اسی نئے نصاب کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر شیخ فاروق باشا عمری اور ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری نے ''تحسینِ ادب'' کے نام سے ایک اہم کتاب مرتب کی ہے جو نہ صرف طلبہ بلکہ اساتذہ کے لیے بھی نہایت مفید اور مشعل راہ ثابت ہوسکتی ہے ۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نصابی مواد کے ساتھ ساتھ متن کی تشریح اور توضیح بھی بہت عمدہ طریقے سے کی گئی ہے ۔ نصابی مواد کے حصول کے لیے اصل ماخذ اور مرجع تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب غلطیوں سے پاک نظر آتی ہے ۔

کتاب کا نام ''تحسینِ ادب'' بہت خوب رکھا گیا ہے ۔ موضوعات اور ابواب کا انتخاب بھی عمدہ ہے ۔ شعرائے اردو کے انتخاب میں نہ صرف قدیم و جدید کا لحاظ رکھا گیا ہے بلکہ ریاست آندھرا پردیش کے بعض قابل فخر استاذ شعراء کے کلام سے نئی نسل کو بھی واقف کرانے کی بہترین کوشش کی ہے ۔

اس کتاب کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں تینوں سمسٹر کے نصاب کو ایک کتاب میں ضم کر دیا گیا ہے تاکہ طلبہ کے لیے آسانی ہو اور ہر سمسٹر میں ایک نئی کتاب کی تلاش سے وہ محفوظ رہیں ۔

پہلا سمسٹر اردو شاعری پر مشتمل ہے جس میں پانچ نظمیں اور پانچ غزلیں ہیں ۔ حصہ غزل میں صف اول کے شعراء کے کلام کا انتخاب کیا گیا ہے جیسے میر تقی میر، غالب، درد، جگر، کی غزلیں شامل ہیں ۔ حصہ نظم میں نظیر اکبر آبادی (کلجگ) ، علامہ شبلی (عدلِ فاروقی) ، اکبر الہ آبادی (نصیحتِ اخلاقی) ، اقبال (چاند اور تارے) اور فیض احمد فیض (لوح و قلم) کی نظمیں شامل ہیں ۔ یہ نظمیں ایک

اچھے پیغام اور عمل وفکر کے جذبے سے معمور ہیں ۔طلبہ میں نظم نگاری کی صلاحیت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے قلوب واذہان پر مثبت نقوش مرتب ہو سکتے ہیں۔اس کتاب کی ایک اور اہم خوبی یہ ہے کہ نصاب میں شامل اصنافِ نثر ونظم کا جامع اور معلوماتی جائزہ لیا گیا ہے۔

دوسرے سمسٹر میں صنفِ مثنوی ،مرثیہ ،قصیدہ اور رباعی کے فن کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے ۔مثنوی نگار میر حسن کی سوانح حیات اور ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی مشہور زمانہ تصنیف ''سحر البیان'' کے ادبی محاسن کا جائزہ لیا گیا ہے۔میر انیس کی سوانح حیات اور ان کی مرثیہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے نصاب میں شامل چھ بند پر مشتمل مرثیہ کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔غالب کی قصیدہ گوئی کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے ان کے قصیدہ کی تشریح کی گئی ہے۔اس طرح امجد حیدر آبادی کی رباعی اور ساغر جیدی کی رباعیوں کی تشریح کرتے ہوئے ان کا سوانحی خاکہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

تیسرے سمسٹر میں افسانوی اصناف نثر ،داستان، ڈرامہ، ناول اور افسانہ کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔داستان میں میر امن کی تصنیف ''باغ و بہار'' کا نصاب میں شامل حصہ ''آغاز قصہ کا'' متن کا خلاصہ لکھا گیا ہے۔نیز میر امن کی سوانح حیات اور ان کی خدمات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔صنف ڈرامہ کا تعارف کراتے ہوئے کریم رومانی کے حالات زندگی اور ان کا مشہور دکنی ڈراما ''گڑھ کی مکھیاں'' کا خلاصہ رقم کیا گیا ہے۔ناول اور افسانہ کا تعارف کراتے ہوئے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد اور عبد الصمد کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اور ناول ''توبتہ النصوح'' اور افسانہ ''ایک اور دن'' کے مرکزی قصہ کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر زیر نظر کتاب اردو زبان وادب کا بہترین انتخاب ہے جس کے مطالعہ سے طلبہ اور اساتذہ بھرپور مستفیض ہو سکتے ہیں۔میں دونوں مرتبین کی خدمت میں ہدیہ تبریک اور تہنیت پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔

''نقش ہیں نا تمام خون جگر کے بغیر''

ڈاکٹر نشاط احمد عمری
اسسٹنٹ پروفیسر
شعبہء اردو۔سنٹرل یونیورسٹی آف حیدر آباد
گچی باؤلی۔حیدر آباد

عرض مرتبین

تقسیم ریاست آندھرا پردیش و تلنگانہ کے بعد اردو زبان آندھرا پردیش میں گویا حکومت کی سرپرستی سے یکسر محروم ہوگئی ہے۔اسکول اور کالج کی سطح پر اردو نصابی کتابوں کا مسئلہ سنگین بنا ہوا ہے۔اس سلسلے میں حکومت کی نظر التفات کب ہو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔اردو طلبہ ایک طرف کوویڈ کی وجہ سے آن لائن کلاسوں کی دشواریوں سے پریشان ہیں تو دوسری طرف نصابی کتابوں کی عدم دستیابی کی وجہ سے شدید مشکلات سے دوچار ہیں۔ان حالات میں ہم نے اس بارگراں بار کو اپنے کندھوں لیا۔طلبہ کے لیے نصابی کتابوں کے سلسلے میں کچھ سامان راحت پہنچانے کا عزم مصمم کیا۔زیر نظر کتاب اسی جہد مسلسل کا نتیجہ ہے۔

ہم نے اس بات کی کوشش کی کہ تینوں سمسٹرس کے نصاب کو ایک ہی کتاب میں پیش کیا جائے تا کہ طلبہ ہر سال کتاب کی تلاش میں سرگرداں نہ ہوں۔اور طلبہ کو اردو ادب کے بنیادی پہلوؤں سے روشناس کرایا جائے۔پہلا سمسٹر حصہ ءنظم وغزل پر مشتمل ہے۔دونوں اصناف کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے نصاب میں شامل نظموں اور غزلوں کی تشریحات بھی رقم کی گئیں ہیں۔

دوسرے سمسٹر میں مثنوی،قصیدہ،مرثیہ اور رباعی جیسی اصناف کا جامع تعارف کرایا گیا ہے اور ان کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔نیز نصاب میں شامل حصہ کا خلاصہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

تیسرے سمسٹر میں اردو کے افسانوی ادب، داستان، ڈرامہ، ناول اور افسانہ کا تعارف کراتے ہوئے اس کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مجموعی طور پر کتاب تحسینِ ادب نہ صرف امتحانی نقطہ ءنگاہ سے بلکہ اردو شایقین ادب کے لیے بھی نہایت مفید ہے۔۔اس موقع پر اس بات کا اعتراف بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کہ کوویڈ کے پیش نظر مواد کے حصول کے لیے کتب خانوں تک رسائی ممکن نہیں تھی جس کی وجہ سے انٹرنیٹ پر دستیاب کتابیں اور مضامین سے استفادہ کرنا پڑا۔جن ویب سائٹس سے ہم نے استفادہ کیا ان میں ریختہ،مضامین ڈاٹ کام،اردو نوٹس،اردو وکیپیڈیا،اردو ریسرچ جرنل،سی سی ای یل ایم یس اے پی، اردو محفل فورم وغیرہ شامل ہیں۔ان کے علاوہ ویب سائٹس پر موجود وقیع مقالہ نگاران اور ان کے مضامین سے بھی استفادہ کیا گیا ہے،ہم ان تمام کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

پہلا سمسٹر

فہرست مضامین

I-Unit

غزل- میر تقی میرؔ (متن)
نظم ''کلجگ''، نظیرؔ اکبرآبادی (متن)

II-Unit

غزل- غالب (متن)
نظم ''عدل فاروقی''، علامہ شبلی نعمانی (متن)

III-Unit

غزل- مومن خاں مومن (متن)
نظم ''چاند اور تارے''، علامہ اقبال (متن)

IV-Unit

غزل- جگر مرادآبادی (متن)
نظم ''نصیحتِ اخلاقی''، اکبرالہ آبادی (متن)

Unit-V

غزل- داغ دہلوی (متن)
نظم ''لوح و قلم''، فیض احمد فیض (متن)

پہلا سمسٹر۔ نمونہ ءپرچہ ءسوالات۔

UNIT-II

غزل۔(میر تقی میرؔ)

راہِ دورِعشق میں روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

قافلے میں صبح کے اک شور ہے
یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا

سبز ہوتی ہی نہیں یہ سر زمیں
تخمِ خواہش دل میں تُو بوتا ہے کیا

یہ نشانِ عشق ہیں، جاتے نہیں
داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا

غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز
میر اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا

(میر تقی میرؔ)

اردو غزل۔ایک تعارف

غزل اردو اصناف شاعری کی ایک مخصوص اور اہم صنف ہے جسے ہر زمانے میں شہرت اور مقبولیت حاصل رہی۔آج بھی اس کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔عام طور پر غزل میں حسن وعشق اور معاملات عشق کا بیان ہوتا ہے۔غزل میں سماجی، سیاسی، معاشرتی مسائل، فلسفہ وتصوف اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوں کی ترجمانی کی جاتی ہے۔غزل کے ہر شعر میں الگ مضمون ہوتا ہے یعنی اس کے اشعار جداگانہ ہوتے ہیں۔اگر کسی غزل کے اشعار ایک ہی موضوع پر ہوں یعنی ان میں تسلسل ہوتو اسے غزل مسلسل کہا جاتا ہے۔غزل کے پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں۔اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں مطلع کے بعد اگر دوسرا شعر بھی ہم قافیہ ہوتو اسے حسن مطلع کہتے ہیں۔غزل کے آخری شعر کو مقطع کہتے ہیں۔غزل کا سب سے عمدہ شعر بیت الغزل یا شاہ غزل کہلاتا ہے۔ردیف کے بغیر بھی غزلیں لکھی جاتی ہیں۔ایسی غزلیں غیر مردف کہلاتی ہیں۔غزل کا اصل ماخذ عربی ہے۔عربی قصیدوں میں تشبیب ایک اہم جزء ہے جس میں شعرا اپنے محبوب کا سراپا اور اس کی تعریف وتوصیف بیان کرتے ہیں فارسی میں تشبیب کو قصیدے سے الگ کر کے ایک مستقل صنف کی حیثیت دی گئی اور یہی صنف آگے چل کر غزل کا روپ اختیار کر لی۔غزل فارسی سے اردو میں رائج ہوئی۔

اردو غزل کا آغاز وارتقا

اردو غزل امیر خسرو سے شروع ہوئی لیکن دکنی شاعروں نے اس صنف کو پروان چڑھایا۔اردو غزل گوئی کا آغاز دکن میں ہوا۔سلطان محمد قلی قطب شاہ اردو کے پہلے غزل گو شاعر ہیں لیکن باشعور غزل گو ولی دکنی کو کہا جاتا ہے۔جنہوں نے اردو غزل کو نئی بلندی عطا کی۔اس دور کے دوسرے

شعرا جنہوں نے ولی کی آمد کے بعد دہلی میں اردو غزل کو ترقی دی ان میں آبروؔ، ناجیؔ، یکرنگؔ، وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے بعد دہلی کی شاعری کے ابتدائی دور میں شاہ حاتمؔ نے زبان محاوروں اور الفاظ کی اصلاح کی طرف توجہ دی۔ آگے چل کر سوداؔ، دردؔ، میرؔ نے اس صنف کی آبیاری کی۔ دورِ حاضر کی غزل میں زبان و بیان کی سادگی، صفائی اور لطف و اثر کی جو خوبیاں پائی جاتی ہیں اس کی مثال نہیں ملتی ہے۔

انیسویں صدی کے آغاز سے شاعری کا جو دور شروع ہوتا ہے وہ مختلف اعتبار سے اردو غزل کے لئے انقلاب کا دور ہے۔ غزل میں بلند اور رنگارنگ مضامین، نازک خیالات، نیا انداز بیان پیدا ہوا۔ اس دور میں دہلی میں مومنؔ، غالبؔ، ذوقؔ، نے اس صنف کو ترقی دی، لکھنو میں وزیرؔ، جراتؔ، ناسخؔ، وغیرہ نے غزل میں ایک نیا انداز قائم کیا۔ اس کے بعد اقبالؔ، مجازؔ اور فیضؔ نے اس صنف کی دنیا میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں۔ دور جدید میں غزل کو خارجی آب و تاب سے نکال کر داخلی حسن سے مزین کیا گیا۔ غزل کو نہ صرف رومانی نشاط سے بھر دیا گیا بلکہ نئی اور دلچسپ تشبیہات و استعارات سے اس کے مرتبے کو بلند کر دیا گیا۔ حسرت موہانیؔ، عزیز لکھنویؔ، فانیؔ بدایونی، جگرؔ مراد آبادی، اصغرؔ گونڈوی اور فراقؔ گورکھپوری نے سنجیدگی اور پاکیزگی، رومانیت اور حقیقت، لطافت اور نزاکت سے غزل کو اردو شاعری کی لافانی صنف بنا دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج غزل میں زندگی کے حقائق، فلسفہ کے نکات کے ساتھ ساتھ سیاسی معاملات اور وطن پرستی کے خیالات وغیرہ اس میں سب کچھ پایا جاتا ہے۔

میر تقی میر کی سوانح حیات

میر تقی میر کا اصل نام محمد تقی تھا۔ ان کے والد علی متقی اپنے زمانہ کے ایک بزرگ تھے۔ ان کے اجداد حجاز سے ہندوستان آئے تھے اور کچھ عرصہ حیدر آباد اور احمد آباد میں گزار کر بالآخر آگرہ میں مقیم ہو گئے تھے۔ میر آگرہ میں 1722/23ء کو پیدا ہوئے۔ میر کی عمر جب گیارہ بارہ برس کی تھی ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ میر کے منہ بولے چچا امان اللہ درویش، جن سے میر بیحد مانوس تھے، پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ جس کا میر کو بہت صدمہ تھا۔ باپ اور اپنے مشفق چچا امان اللہ کی موت نے میر کے ذہن پر غم کے دیرپا نقوش ثبت کر دئے جو ان کی شاعری میں جا بجا ملتے ہیں۔ والد کی وفات

کے بعد ان کے سوتیلے بھائی محمد حسن نے ان کے سر پر شفقت کا ہاتھ نہیں رکھا۔ وہ بڑی کسمپرسی کی حالت میں تقریباً چودہ سال کی عمر میں دہلی آ گئے۔ دہلی میں صمصام الدولہ، امیر الامراء ان کے والد کے عقیدتمندوں میں سے تھے۔ انہوں نے ان کا ایک روپیہ روزینہ مقرر کر دیا جو ان کو نادر شاہ کے حملہ تک ملتا رہا۔ صمصام الدولہ نادر شاہی قتل و غارت میں مارے گئے۔ ذریعہ معاش بند ہو جانے کی وجہ سے میر کو آگرہ واپس جانا پڑا لیکن اس بار آگرہ ان کے لئے پہلے سے بھی بڑا عذاب بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں ان کو اپنی ایک عزیزہ سے عشق ہو گیا تھا جسے ان کے گھر والوں نے پسند نہیں کیا اور ان کو آگرہ چھوڑنا پڑا۔ وہ پھر دہلی آئے اور اپنے سوتیلے بھائی کے ماموں اور اپنے وقت کے جید عالم، سراج الدین آرزو سے علم حاصل کیے۔ نکات الشعراء میں میر نے ان کو اپنا استاد کہا ہے لیکن ذکر میر میں میر نے جعفر علی عظیم آبادی اور امروہہ کے سعادت علی خان کو بھی اپنا استاد بتایا ہے۔ سعادت ہی کے کہنے پر میر نے شاعری پر توجہ دی۔ اور وہ محمد متقی سے میر بن گیے۔ بقول میرؔ حافظ محمد حسن نے اپنے ماموں کو میر کے خلاف بھڑکایا جس سے وہ میر سے خفا ہو گیے۔ میر ان کے سلوک سے بہت دل برداشتہ تھے۔

میر نے زندگی کے ان تلخ تجربات کا گہرا اثر لیا اور ان پر جنوں کی کیفیت طاری ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد دوا علاج سے جنوں کی شدت تو کم ہوئی مگر ان تجربات کا ان کے دماغ پر دیر پا اثر قائم رہا۔ دیوانگی دور ہوئی تو پھر روزگار کی تلاش شروع ہوئی آخر رعایت خاں سے توسل ہو گیا مگر نازک مزاجی نے نباہ نہ ہونے دی، اپنی ملازمت ترک کر کے ایک امیر جاوید خاں کے ملازم ہو گیے اسی دوران احمد شاہ ابدالی نے دہلی پر حملہ کر کے برباد کر دیا۔ دہلی اجڑی تو میر لکھنؤ میں آباد ہو گیے۔ یہاں نواب آصف الدولہ کے ملازم ہو گیے۔ عمر کے اکتیس برس وہاں گزار کر 1810ء میں لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوا۔ میر نے بھرپور اور ہنگامہ خیز زندگی گزاری۔ سکون و راحت کا کوئی طویل عرصہ ان کو نصیب نہیں ہوا۔

میر نے اردو کے چھ دیوان مرتب کئے جن میں غزلوں کے علاوہ قصائد، مثنویاں رباعیات اور واسوخت وغیرہ شامل ہیں۔ نثر میں ان کی تین کتابیں نکات الشعراء، ذکر میر اور فیض میر ہیں۔ موخر الذکر انہوں نے اپنے بیٹے کے لئے لکھی تھی۔ ان کا ایک فارسی دیوان بھی ملتا ہے۔

میر تقی میرؔ کی غزل گوئی

میر تقی میر کا شمار اردو کے عظیم شعراء میں کیا جاتا ہے۔غزل کی دنیا میں کوئی بھی شاعر میر کے مقام تک نہیں پہنچ سکا نہ ہی کسی نے میر کی ہمسری کا دعوی کیا۔ میر کے بعد آنے والے تقریبا تمام شعرا نے میر کی پیروی کی کوشش کی۔

اسی طرح انشاء، شیخ ابراہیم ذوق مرزا رفیع سودا، حسرت موہانی، غلام ہمدانی مصحفی، اکبر الہ آبادی، حالی وغیرہ نے میر کی عظمت کا کھل کر اعتراف کیا ہے۔ میر کی عظمت کا راز ہے کہ انھوں نے اپنے دل پر گزری ہوئی واردات سیدھی سادی اور بول چال کی زبان میں ادا کر دی۔ یہ واردات وہ تھی جو ہر دل پر گزر جاتی ہے۔اس لیے جس نے پڑھا یا سنا اسے یہ اپنے دل پر گزری ہوئی معلوم ہوئی۔اسی لیے کہا گیا کہ میر نے آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیا۔میر کی شاعری کی چند خصوصیات یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

میر کا تصور غم

درحقیقت میر کی شاعری درد وغم، رنج والم، آنسو کی ترجمان ہے۔ انہوں نے اپنی پوری شاعری کو غم کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ گویا غزل نہیں ان کا غم حقیقت کے پردے سے نکل کر غزل کے سانچے میں ڈھل گیا ہے۔

خلوص وصداقت وسوز وگداز

میر نے اپنی شاعری میں اپنے ذاتی غم کو آفاقی غم بنا کر پیش کیا ہے۔ان کا غم دنیا کے غم پر حاوی نظر آتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ میر نے اپنے غم کو آفاقیت بخشی ہے۔

میر کا غم عشق

میر کے ذہن میں عشق کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ میر کا مفہوم عشق بہت وسیع ہے اور عشق کا جذبہ ان کے سینے میں حقیقی طور پر سرائیت کر گیا تھا۔

میر کی تشبیہات اور استعارات

تشبیہات اور استعارات تقریباً ہر شعر کا جوہر خاص ہوتے ہیں۔ میر نے تشبیہات اور استعارات کو اس انداز سے استعمال کیا کہ وہ زبانِ زد عام ہو گئے۔ میر تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعے سے بعض کیفیات کی خوبصورت تصویر کشی کرتے ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ ان کے ہاتھوں اس فن میں مصوری جیسی شان پیدا ہو گئی ہے۔

میر اور دنیا کی بے ثباتی کا تصور

حادثات زمانہ اور گردش دوراں نے میر کے دل میں گوشہ نشینی کا تصور اور بھی گہرا کر دیا تھا اس کیفیت کا اظہار انہوں نے جا بجا کیا ہے۔ دنیا کے عارضی ہونے کا تصور ان کی شاعری میں ایک خاص مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔

انسان دوستی اور احترام آدمیت

میر نے اپنی شاعری میں انسانی عظمت اور اعلیٰ انسانی اقدار کو بڑی کثرت سے اپنی شاعری میں بیان کیا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ مضمون ان کی شاعری کا مستقل موضوع بن گیا ہے۔ اور ان کے کلام میں جگہ جگہ اس رنگ کی نشانیاں موجود ہیں۔

آہنگ اور موسیقیت میر کی شاعری کا خاص جوہر ہیں۔

میر کی شاعری کا بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بول چال کی زبان ایسے سلیقہ سے استعمال کی ہے کہ وہ شاعری کی زبان بن گئی ہے۔ آسان اور عام فہم زبان کو شعری وسائل کے ذریعے مزین کر دیا ہے۔ میر کی شاعری میں خود کلامی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ گویا شاعر اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے یہی وہ خوبیاں ہیں جن کے سبب میر کا کلام آج بھی جادو کا اثر رکھتا ہے۔ یقیناً میر اردو غزل کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری ہمیشہ آسمان ادب پر سورج کی طرح چمکتی رہے گی۔

تشریحِ غزل، میر تقی میرؔ

راہِ دورِ عشق میں روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

شاعر کہتا ہے کہ یقیناً عشق کا راستہ پر کٹھن اور پر خطر ہوتا ہے۔اس راہ کا انتخاب وہی کر سکتا ہے جو عشق کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات اور مصیبتوں پر صبر کرنے والا ہو،عشق کی ابتدائی منزل کٹھن اور اس کے بعد آنے والی ہر منزل کٹھن سے کٹھن تر ہوتی ہے اگر عاشق عشق کی ابتدائی منزل ہی سے گھبرا جائے تو آگے کی منزلیں اس کے لیے مزید کٹھن ثابت ہوں گی۔وہاں ثابت قدم ہونا اس کے لیے مشکل ہوتا ہے۔یہ شعر ضرب المثل کے طور پر مشہور ہو چکا ہے اور اس وقت کہا جائے گا جب کوئی شخص کسی بھی کام کے ابتدائی مرحلہ میں گھبرا جائے اور آگے کی منزلیں طے کرنا مشکل ہو۔

قافلے میں صبح کے اک شور ہے
یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا

صبح کے وقت قافلے کی روانگی ہونے والی ہے اور ہر چاق و چوبند شخص اس کے شور سے بیدار ہو چکا ہے اور قافلے کے ساتھ روانہ ہونے کے لیے بالکل تیار ہے۔لیکن اتنے شور کے باوجود کوئی بیدار نہ ہوا اور قافلے کے ساتھ چلنے کی تیاری نہ کرے تو وہ یقیناً غافل ہی ہو سکتا ہے۔غافل ہمیشہ پیچھے رہ جائے گا اور ہوشیار اور ذی شعور لوگ ہمیشہ سبقت لے جائیں گے۔فطرت کا قانون ہے کہ غفلت انسان کو ہمیشہ نعمتوں سے محرومی کر دیتی ہے۔

سبز ہوتی ہی نہیں یہ سر زمیں
تخمِ خواہش دل میں تُو بوتا ہے کیا

شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں کبھی کسی کی تمام خواہشات کبھی پوری نہیں ہوتیں۔خواہشات کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔اس لیے اسی میں بہتری ہے کہ دل میں خواہش کا بیج نہ بویا جائے۔دل کی زمین میں خواہشات کی تخم ریزی ثمر آور نہیں ہو سکتی۔دل کی زمین مشکلات اور مصیبتوں سے اتنی سخت اور بنجر ہو چکی ہے کہ دل میں خواہش کا ارادہ بھی مناسب نہیں کیوں کہ دل کی زمیں سرسبز و شادابی کا اثر کھو چکی

ہے۔

یہ نشانِ عشق ہیں، جاتے نہیں
داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا

شاعر کہتا ہے کہ عشق کے نشان بہت گہرے اور دیر پا ہوتے ہیں اگر کسی کی ذات عشق کے دھبوں سے سیاہ ہوجائے تو ان سے چھٹکارا پانے کی ساری کوششیں بیکار ہوتی ہیں۔شاعر نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ یہ عشق کے نشان ناکامی کے نشان ہیں ورنہ کامیابی کے نشان پر ہر کوئی فخر کرتا ہے اور اس نشان کو کوئی بھی مٹانا نہیں چاہتا۔شاعر اس شعر میں اپنی ناکام عشق کی داستان بیان کررہا ہے۔

غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز
میر اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا

مصر کے بادشاہ کا نام ملک عزیز ہے، یوسفؑ اس وقت کے پیغمبر ہیں جن کو ملک عزیز نے سلطنت کے خزانوں کا مالک اور محافظ بنایا تھا۔یوسفؑ کو یہ عہدہ اور اعلی مرتبہ یوں ہی نہیں ملا تھا بلکہ ان کی سچائی، پاکدامنی، مصیبتوں پر صبر کرنے کی وجہ سے ملا تھا جس وقت بادشاہ وقت نے عہدہ کی پیش کی تو یوسفؑ نے وقت کی نزاکت اور مستقبل کی فکر کرتے ہوئے اس عہدہ کو قبول کیا اور اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔شاعر نے اس شعر میں صنعت تلمیح کا بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔

نظم ''کل جُگ''۔ (نظیر اکبر آبادی)

پہلا بند

دنیا عجب بازار ہے ،کچھ جنس یاں کی ساتھ لے
نیکی کا بدلہ نیک ہے ،بد سے بدی کی بات لے
میوہ کھلا میوہ ملے ،پھل پھول دے پھل پات لے
آرام دے آرام لے، دُکھ درد دے آفات لے

کلجُگ نہیں کر جگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے ، اِس ہات دے اُس ہات لے

دوسرا بند

کانٹا کسی کے مت لگا، گو مثلِ گل پھولا ہے تو
وہ تیرے حق میں تیر ہے، کس بات پر بھولا ہے تو
مت آگ میں ڈال اور کو، پھر گھانس کا پولا ہے تو
سن رکھ یہ نکتہ بے خبر! کس بات پر بھولا ہے تو

کلجُگ نہیں کر جگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے، اِس ہات دے اُس ہات لے

تیسرا بند

جو اور کو پھل دیوے گا، وہ بھی سدا پھل پاوے گا
گیہوں سے گیہوں، جَو سے جَو، چاول سے چاول پاوے گا
جو آج دیوے گا یہاں ،ویسا وہ کل واں پاوے گا
کل دیوے گا، کل پاوے گا ،کل پاوے گا، کل پاوے گا

کلجُگ نہیں کر جگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے ، اِس ہات دے اُس ہات لے

چوتھا بند

جو چاہے لے چل اس گھڑی، سب جنس یاں تیار ہے
آرام میں آرام ہے، آزار میں آزار ہے
دنیا نہ جان اس کو میاں، دریا کی یہ منجدھار ہے
اوروں کا بیڑا پار کر، تیرا بھی بیڑا پار ہے

کلجُگ نہیں کر جگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے ، اِس ہات دے اُس ہات لے

پانچواں بند

تو اور کی تعریف کر، تجھ کو ثنا خوانی ملے
کر مشکل آساں اور کی، تجھ کو بھی آسانی ملے
تو اور کو مہمان کر ،تجھ کو بھی مہمانی ملے
روٹی کھلا روٹی ملے، پانی پلا پانی ملے

کلجُگ نہیں کر جگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے، اِس ہات دے اُس ہات لے

چھٹا بند

کر چُک جو کچھ کرنا ہو، اب یہ دم تو کوئی آن ہے
نقصان میں نقصان ہے، احسان میں احسان ہے
تہمت میں یاں تہمت لگے، طوفان میں طوفان ہے
رحمان کو رحمان ہے، شیطان کو شیطان ہے

کلجُگ نہیں کر جگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے، اِس ہات دے اُس ہات لے

ساتواں بند

یاں زہر دے تو زہر لے، شکّر میں شکّر دیکھ لے
نیکوں کو نیکی کا مزا، موذی کو ٹکّر دیکھ لے
موتی دے موتی ملے، پتھر میں پتھر دیکھ لے
گر تجھ کو یہ باور نہیں ، تو تو بھی کر کر دیکھ لے

کلجُگ نہیں کر جگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے ، اِس ہات دے اُس ہات لے

آٹھواں بند

غفلت کی یہ جا گہ نہیں، یاں صاحبِ ادراک رہ
دل شاد رکھ دل شاد رہ، غمناک رکھ غمناک رہ
ہر حال میں تو بھی نظیرؔ! اب ہر قدم کی خاک رہ
یہ وہ مکاں ہے او میاں، یاں پاک رہ، بیباک رہ

کلجُگ نہیں کر جگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے، اِس ہات دے اُس ہات لے

(نظیر اکبرآبادی)

نظم نگاری کی تعریف

نظم، شاعری کی ایک ایسی قسم ہے جو کسی ایک عنوان کے تحت کسی ایک موضوع پر لکھی جاتی ہے، نظم کے اشعار میں ربط و تسلسل ہوتا ہے۔ مکمل نظم کسی ایک موضوع پر کہی جاتی ہے۔ اشاریت کے بجائے وضاحت اس کی پہچان ہے۔ اس میں مضامین کی وسعت ہوتی ہے۔ نظم زندگی کے کسی بھی موضوع پر کہی جاسکتی ہے۔

وسیع تر مفہوم میں نظم سے مراد پوری شاعری ہے۔ لیکن شاعری کے باب میں غزل کے ماسوا تمام اصناف شعر کو نظم کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے مثنوی، قصیدہ، مرثیہ بھی نظم کے دائرے میں آتی ہیں۔ چونکہ ان اصناف کی اپنی علاحدہ شناخت قائم ہے اس لیے ہم انہیں اسی اعتبار سے پہچانتے ہیں۔ ان اصناف کے علاوہ بھی ہمیں ایسی نظمیں دیکھنے کو ملتی ہیں جن میں کسی موضوع پر تسلسل کے ساتھ اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ ان کا ایک مرکزی خیال بھی ہے۔ یہ نظمیں مختلف ہیئتوں میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہاں نظم سے مراد اسی طرز کی شاعری سے ہے۔ سب سے پہلے نظم کی یہ نمایاں شکل نظیر اکبرآبادی کے یہاں پورے آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہے۔ نظیر نے اردو نظم کو واضح شناخت عطا کی۔

اردو نظم کا آغاز و ارتقا

اردو نظم نگاری کی ابتدا دکن میں ہوئی۔ مذہبی اور صوفیانہ نظموں کی شکل میں اردو نظم کے ابتدائی نقوش نظر آتے ہیں۔ دکن کی بہمنی سلطنت نے اردو ادب کی خاصی پزیرائی کی۔ عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں نے اردو ادب کے فروغ میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا۔ قلی قطب شاہ، عبداللہ

قطب شاہ، ملا وجہی، غواصی، ابنِ نشاطی وغیرہ دکن کے مشہور شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

شمالی ہند میں نظم نگاری

شمالی ہند میں اردو نظم نگاری کی ابتدا سترہویں صدی میں ہوئی۔ محمد افضل اور جعفر زٹلی کے یہاں اردو نظم کے ابتدائی نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اٹھارویں صدی میں اردو شاعری کا ایک اہم دور شروع ہوتا ہے۔ نواب صدرالدین محمد خاں فائز اور شاہ ظہورالدین حاتم کے دور میں اردو نظم کو بہت فروغ حاصل ہوا۔

اردو نظم نگاری کو فروغ دینے والوں میں نظیر اکبرآبادی کا ایک اہم مقام ہے۔ ان کی نظموں کے مطالعہ سے ہم زندگی کے گوناگوں مشاہدات سے دوچار ہوتے ہیں۔ سماجی زندگی کے مختلف پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ رسم و رواج، کھیل کود، تہوار، بچپن، جوانی، گرمی، برسات، جاڑا، چرند و پرند، غرضیکہ ہم جس فضا اور ماحول میں سانس لیتے ہیں اس کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

1857ء میں ہندستان پر انگریزوں کا مکمل تسلط قائم ہونے کے بعد حکومت اور عوام کے درمیان رابطے کے لیے کئی شہروں میں انجمنوں کا قیام عمل میں آیا۔ ان انجمنوں کے اغراض و مقاصد میں علوم و فنون کی ترویج و اشاعت بھی تھا۔ 21 جنوری 1865 کو انجمن اشاعتِ مطالبِ مفیدہ پنجاب کا قیام عمل میں آیا۔ یہی انجمن 'انجمن پنجاب' کے نام سے مقبول ہوئی۔ محمد حسین آزاد اس انجمن سے وابستہ تھے۔ مئی 1874 میں کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں موضوعاتی مشاعرہ منعقد ہوا جس میں مصرع طرح کے بجائے موضوعاتی نظمیں پڑھی گئیں۔ ان شعراء میں مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی نے بھی اپنی نظمیں پیش کی ہیں۔ گرچہ مشاعروں کا یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا لیکن نظم نگاری کی انھیں کوششوں سے اردو نظم نگاری کے نئے دور کا آغاز ہوا۔

نظم نگاری کی تحریک کے روحِ رواں محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی تھے۔ ان حضرات نے نہ صرف یہ کہ عملی طور پر نظم نگاری کی توجہ دی بلکہ فکری اعتبار سے نظم نگاری کے لیے ایک سازگار فضا قائم کی۔ انھوں نے انجمن پنجاب کے جلسوں میں جو لکچر دیے وہ نظم نگاری کے لیے ایک منشور کا درجہ رکھتے ہیں۔

انیسویں صدی کے اواخر کا زمانہ اردو ادب میں غیر معمولی تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ اردو ادب

میں کئی اصناف کا ظہور ہوا۔ ناول نگاری، تنقید نگاری، سوانح نگاری، مضمون نگاری وغیرہ کے ساتھ اردو نظم نگاری کو بھی فروغ ہوا۔ اس صنف کو بے حد مقبولیت ملی۔ اس دور کے اہم شعرا میں اقبال، فیض احمد فیض، سردار جعفری، ن م راشد، اسماعیل میرٹھی اور نظم طباطبائی۔ وغیرہ اہم نظم گو شعرا ہیں۔

نظیر اکبر آبادی کی سوانح حیات

نظیر کا اصل نام ولی محمد تھا۔ والد محمد فاروق عظیم آباد کی سرکار میں ملازم تھے۔ نظیر کی ولادت دہلی میں ہوئی۔ نادر شاہ اور احمد شاہ کے حملے کی وجہ سے وہ اکبر آباد (آگرہ) منتقل ہوئے۔ آگرہ میں نظیر کا پیشہ بچّوں کو پڑھانا تھا۔ اس زمانہ کے مکتبوں اور مدرسوں کی طرح ان کا بھی ایک مکتب تھا، جو شہر کے مختلف مقامات پر رہا۔ بھرت پور، حیدر آباد اور اودھ کے شاہی درباروں نے سفر خرچ بھیج کر ان کو بلانا چاہا لیکن انھوں نے آگرہ چھوڑ کر کہیں جانے سے انکار کر دیا۔ نظیر سیر سپاٹے کے شوقین تھے، تیراکی، کبوتر بازی، کشتی، کنکوے بازی ہر طرح کے کھیل کود میں حصہ لیتے تھے۔ اور ہر میلے اور تہوار میں شریک ہوتے تھے۔ انہوں نے نہ صرف اسلام بلکہ ہندو رسم و رواج پر بھی بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ عوامی زندگی کا ہر پہلو ان کی نظر میں رہا اور اس کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔

نظیر کے متعلق جس نے بھی کچھ لکھا ہے اس نے ان کے اخلاق و عادات، سادگی، بردباری اور شرافت کا تذکرہ بہت اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ نظیر نے طویل عمر پائی۔ عمر کے آخری حصہ میں فالج ہو گیا تھا۔ اسی حالت میں 1830ء میں ان کا انتقال ہوا۔

نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری

نظیر اکبر آبادی اُردو کے پہلے عوامی شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں عوامی زندگی کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ اس دور کے تہذیبی مشاغل کے خوبصورت رنگ نظر آتے ہیں، عوامی تہواروں کی عکس بندی، زندگی کی جزئیات، انسانی نفسیات کا گہرا شعور، زندگی کے انجام پر گہری نظر، نظیر کے خاص موضوعات ہیں۔ عوامی زندگی کی ترجمانی نظیر کی شاعری کی بنیادی خصوصیت ہے۔ انہوں نے عوامی

زندگی کی ترجمانی اتنی خوبصورتی اور سچائی سے کی ہے کہ وہ اُردو کے پہلے عوامی شاعر کہلائے۔

عوامی تہواروں کی عکس بندی اور نظیر کے خاص موضوعات:

نظیر اُردو کے بہترین بیانیہ شاعر ہیں انہوں نے اپنے تہذیبی دور کے رنگ برنگے مشاغل کے جو نقشے کھینچے ہیں اس سے لاکھوں انسانوں کی دلچسپی کی جامع تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہوار، ملبوسات، موسم، پھل پھول اور ترکاریاں وغیرہ کا تذکرہ ملتا ہے مثلاً ''عید، بقرعید، ہولی، دیوالی، بسنت ان کی چہل پہل اور گہما گہمی، میلے ٹھیلے، رنگین اور زرق برق ملبوسات، موسم برسات، موسم سرما، پھل پھول، ترکاریاں، مٹی کے برتن اور چھوٹے بڑے جانور وغیرہ۔

نظیر اور قوت مشاہدہ:

نظیر کے موضوعات سے ان کے بھرپور قوت مشاہدہ کا اظہار ہوتا ہے وہ اپنی شاعری میں ایسے مرقعے پیش کرتے ہیں کہ واقعات اور اشیاء ہمارے سامنے جیتی جاگتی اور بولتی مسکراتی آجاتی ہیں۔ نظیر کی یہ خصوصیت ہمارے کلاسیکی ادب میں اپنی مثال آپ ہے۔

نظیر، ترقی پسند، اور مساوات:

نظیر کی نظر میں وہ تمام امتیازات جو اخلاقی اقدار، زر و دولت اور عہدہ اور خاندان سے قائم کیے جاتے ہیں، محض سطحی ہیں۔ نظیر اس حقیقت کے علم بردار ہیں کہ امیر و غریب، ادنیٰ و اعلیٰ، زاہد و رند سب انسان ہیں اور برابر ہیں۔ نظیر نے اپنی شاعری میں یہ احساس دلایا ہے کہ حیات انسانی ایک وحدت ختم ہونے کے باجود اس قدر متنوع ہے اور دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔

نظیر ایک مصور شاعر:

نظیر کو زندگی کے ان پہلوؤں سے بہت دلچسپی ہے جس میں طاقت، توانائی اور حرکت ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں چلنت پھرنت، بھیڑ بھڑکا، دوڑ بھاگ، ہنسی مذاق، سیر تماشہ اور ریل پیل ہے۔

مختصر یہ کہ نظیر اکبر آبادی اُردو ادب کے ایسے بلند پایہ شاعر ہیں کہ جنہوں نے نے شاعری کو خواص سے نکال کر عوام تک پہنچایا۔ اسی لئے انہیں اُردو کا پہلا عوامی شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ آپ نے

زندگی کے گہرے مشاہدے کو بڑی سچائی سے عوام کے سامنے پیش کیا۔ جو اپنی مثال آپ ہے۔ اسی لئے آپ کا کلام اُردو میں سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعری کے تعلق سے فیض احمد فیضؔ نے فرمایا: ''اردو شاعری کی پوری تاریخ میں نظیرؔ ہی ایک ایسا شاعر ہے، جو بذاتِ خود ایک دور ہے انہوں نے کسی اسکول کی پیروی نہیں کی بلکہ خود ایک دبستان کی بنیاد رکھی''۔

نظم ''کل جُگ'' کا خلاصہ

سید محمد نظیرؔ اکبر آبادی (1735-1830) اُردو کے مشہور نظم گو شاعر گذرے ہیں۔ ان کی شاعری ہندوستانی تہذیب وتمدن کی آئینہ دار ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں ہندوستانی تہواروں ہولی، دیوالی، راکھی، دسہرہ، عید، اور کھیل کود، زندگی کے تجربات اور دیگر فطری موضوعات کو بیان کیا۔ ان کا مشاہدہ گہرا تھا۔ زندگی کو انہوں نے قریب سے دیکھا اور اسے اپنی شاعری میں پیش کیا۔ انہوں نے بہت سی نظمیں عبرت اور نصیحت کی خاطر لکھیں۔ انہیں جزئیات نگاری پر عبور تھا ہر بات کو تفصیل سے مثالوں کے ذریعے اپنی نظموں میں پیش کرتے تھے۔ انہوں نے شاعری میں عوامی زبان استعمال کی۔ اسی لئے انہیں اردو کا پہلا عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔ ان کی مشہور نظمیں آدمی نامہ، بنجارہ نامہ، روٹی اور کلجگ وغیرہ ہیں۔ نصابی کتاب میں شامل ان کی ایک نظم ''کل جگ'' ہے۔

نظم ''کل جگ'' کا خلاصہ

نظیرؔ نے نظم ''کلجگ'' مسدس کی شکل میں لکھی ہے۔ نظم کے ہر بند میں چھ مصرعے ہیں اور ہر بند کے آخری ٹیپ کے دو مصرعے ساری نظم میں دہرائے گئے ہیں۔ نظیرؔ زمانہ شناس تھے انہوں نے زندگی کو قریب سے دیکھا تھا۔ اور ایک ایسے دور میں زندگی گزاری جب مغلیہ سلطنت کو زوال ہو رہا تھا اور انسانی قدریں ٹوٹ پھوٹ رہی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ نظیرؔ نے گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ انہوں نے اپنی شاعری میں لوگوں کو نصیحت کی باتیں پیش کی ہیں اور دنیائے فانی کی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ نظیرؔ نے اپنی شاعری میں ہندی یا ہندوستانی الفاظ کثرت سے استعمال کئے ہیں۔

چنانچہ اس نظم کا عنوان ''کلجگ'' ہے۔ دراصل کلجگ

ہندی لفظ کلیگ ہے جس کے معنی سیاہ دور یا تباہی و بربادی کا دور۔ ایسا دور جس میں اچھی

قدریں ختم ہوجائیں گی اور ہر طرف ظلم وزیادتی بڑھ جائے گی۔ دھاتی دور کے بعد موجودہ زمانے کو کلجگ کہا گیا ہے۔ چنانچہ نظیرؔ اس سیاہ دور کا ذکر کرتے ہوئے انسان کو اچھے کاموں کی نصیحت کرتے ہیں۔

پہلا بند:

نظم ''کلجگ'' کے پہلے بند میں نظیرؔ ایک ناصح کی طرح نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دنیا کی مثال ایک بازار کی سی ہے۔

جس طرح لوگ بازار میں طرح طرح کے کاروبار کرتے ہیں' خرید وفروخت کرتے ہیں۔ اسی طرح دنیا کے اس بازار میں انسان کو اپنے لئے کچھ اچھی چیزیں حاصل کرلینی چاہئیں۔ یہ دنیا وہ جگہ ہے جہاں نیکی کا بدلہ اچھا ہوگا اور بدی کا بدلہ برا ہوگا۔ یہ فطرت کا قانون ہے کہ انسان جو فصل بوئے گا اسی کی فصل کاٹے گا۔ اگر وہ اس دنیا میں اچھے اخلاق وکردار کے ساتھ زندگی گزارے گا تو اسے لوگوں سے اور خدا کی طرف سے اچھا بدلہ ملے گا۔ برائی کا انجام جلد یا دیر برا ہی ہوگا۔

دوسرا بند:

نظیر کہتے ہیں کہ انسان ایک پھول کی مانند ہے جب خدا نے اسے اچھی صفت پر پیدا کیا ہے تو اسے کسی کی زندگی میں کانٹے کی طرح چبھن یا مشکلات پیدا نہیں کرنی چاہئے۔ لوگوں پر ظلم کرنا یا انہیں مصیبت میں ڈالنا ایک زہر کی طرح نقصان دہ عمل ہے۔ کسی کو دشمنی کی آگ میں نہیں ڈالنا چاہئے کیوں کی انسان خود ایک گھاس کے گٹھے کی طرح ہلکا پھلکا اور نازک ہے۔ اگر ہم کسی کی زندگی کو مصیبتمیں ڈالیں گے تو ایک دن ہم بھی مصیبت میں گھر جائیں گے۔

تیسرا بند:

شاعر کہتا ہے کہ جو کسی بھوکے کو کھلائے گا تو ایک دن اس کو بھی کوئی کھلانے والا ہوگا۔ جیسا ہمارا ظرف اور رویہ ہوگا ویسے ہی ہمارے ساتھ سلوک ہوگا۔ اور یہ دنیا دار العمل ہے اور آخرت دار الجزاء ہے۔ دنیا میں ہم جیسا بوئیں گے آخرت میں اسی کا پھل ملے گا۔

چوتھا بند:

دنیا میں ہر طرح کی چیزیں موجود ہیں۔ آرام دہ اور تکلیف دہ دونوں چیزیں دستیاب ہیں۔

ہمیں چاہیے کہ لوگوں کو آرام پہنچائیں اور تکلیف دینے سے احتراز کریں۔ کیونکہ دنیا ایک دریا کی منجدھار کی مانند ہے اگر دوسروں کا بیڑا پار کریں گے تو اپنا بیڑا بھی پار ہوگا۔ ہم دوسروں کا تعاون کریں گے تو دوسرے ہمارا تعاون کریں گے۔

پانچواں بند:

نظیر کہتے ہیں کہ اگر ہم کسی کی تعریف کریں گے تو بدلے میں لوگ ہماری تعریف بھی کریں گے۔ انسانوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ دوسروں کی برائی کرتے رہتے ہیں۔ ہم لوگوں کے سامنے اور پیچھے ان کی اچھائیاں ہی بیان کریں اس رویے سے لوگ ہمیں بھی پسند کریں گے اور ہماری تعریف بھی دوسروں کے سامنے کریں گے اور ایک اچھا معاشرہ تشکیل پائے گا۔ اگر اللہ نے ہمیں نعمتیں دی ہیں تو ہم کو چاہیے کہ دوسروں کو کھلائیں اور پلائیں اور ضرورتمندوں کی ضرورت پوری کریں۔

چھٹا بند:

نظیر کہتے ہیں کہ یہ دنیا عارضی اور فنا ہونے والی ہے اس لیے زیادہ سے زیادہ ہمیں بھلائی کے کام کرنا چاہیے۔ اگر ہم کسی اور کے نقصان کے لئے گڑھا کھودتے ہیں تو کبھی نہ کبھی اسی گڑھے میں خود گرتے ہیں۔ نیک سلوک اور احسان کرنے میں ہم سے بھی وہی سلوک کیا جائے گا۔ دوسروں پر الزام تراشی کریں گے اور نقصان پہنچائیں گے تو ہماری عزت کو بھی خاک میں ملایا جائے گا۔ نیک اور اچھے کام میں ہمیشہ رحمان کی مدد شامل ہوتی ہے اور برے کام سے شیطان خوش ہوتا ہے۔ برے کا بدلہ ہمیشہ برا ہوتا ہے۔

ساتواں بند:

شاعر کہتا ہے کہ زندگی میں ہم اگر کسی کے ساتھ تلخی اور ناخوش گوار طریقے سے پیش آئیں گے تو ہمارے ساتھ بھی ویسے ہی برتاؤ کیا جائے گا۔ اگر ہم دوسروں سے شیرینیٔ کلام سے پیش آئیں گے اور اپنے آپ کو تلخیٔ کلام سے باز رکھیں گے تو ہمارے بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ اگر کسی سے ساتھ بھلا کریں گے تو ہمارا بھی بھلا ہوگا اگر کسی پر پتھر پھینکیں گے تو ہم پر بھی پتھر پھینکا جائے گا۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر ان باتوں پر کسی کو بھروسہ نہیں ہے تو آزما کر دیکھ لے، حقیقت واضح ہو جائے گی۔

آٹھواں بند:

شاعر کہتا ہے کہ یہ دنیا غفلت کی جگہ نہیں ہے یہاں غافلوں اور کاہل لوگوں کے لیے کوئی مقام اور جگہ نہیں اگر یہاں رہنا ہے تو فعال اور متحرک رہنا ہوگا۔ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ اس لیے اپنے آپ کو خوش وخرم رکھیں اور دوسروں کو بھی خوش رکھیں، دوسروں کو تکلیف اور پریشانی اور رنج نہ دیں اور خود بھی اس مصیبت سے دور رہیں۔ آخر میں شاعر اپنے آپ سے خطاب کرتا ہوا کہتا ہے کہ اگر اس دنیا میں رہنا ہے تو قدموں کی خاک کی طرح ہلکا پھلکا رہنا چاہئے یہ دنیا مسافر خانہ ہے اور یہاں عمل اور نیکی کا توشہ تیار کرتے ہوئے ہمیں ہمیشہ آخرت کے سفر پر جانے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ دنیا وہ جگہ ہے جہاں ہمیں جسمانی اور روحانی طور پر پاک وصاف اور بے باک رہنا چاہئے۔ اور اپنے آپ کو ہمیشہ پاکباز، اور اچھے اخلاق وکردار والا بنانا ہوگا اور حق کی راہ میں بیباک اور نڈر بن کر جینا ہوگا۔

مرکزی خیال:

نظیر اکبرآبادی نے نظم ''کلجگ'' میں انسانوں کو نیک وصالح زندگی گزارنے اور اچھے کاموں کی تلقین کی ہے۔ اور کہا کہ اس دنیا میں نیکی کا بدلہ نیک ہوگا اور برائی کا انجام برا ہوگا۔ نظیر کی نصیحتیں انسانوں کے لئے ہیں تاکہ ایک فرد کی تعمیر سے ایک معاشرے کی تعمیر ہو۔ اور سیاہ وتاریک دور کے خاتمے سے انسانیت کی شمع روشن ہو۔ نظیر کا یہ پیغام ہمارے آج کے نوجوانوں کی کردارسازی کے لئے اہم ہے جو مستقبل کے شہری ہیں اگر ان کے اخلاق وکردار سنور جائیں تو ہمارا مستقبل تابناک ہوگا۔

UNIT-II

غزل۔ (مرزا اسداللہ خان غالبؔ)

درد ،منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب، کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا!

غالب کی سوانح حیات

مرزا اسداللہ خاں غالب اردو زبان کے سب سے نامور شاعر ہیں۔ انھوں نے اردو غزل کو ایک وقار اور مقام بخشا۔ اردو زبان میں نئے موضوعات اور نئے مضامین داخل کر کے اس کا دامن وسیع کیا۔

مرزا غالب کا اصل نام اسداللہ بیگ خاں تھا۔ باپ کا نام عبداللہ بیگ تھا۔ آپ 8 رجب 1212ھ، دسمبر 1797ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہء نسب افراسیاب بادشاہ توران تک پہنچتا ہے ان کے دادا شاہ عالم کے زمانے میں ایران سے دہلی پہنچے۔ یہاں انھیں اعزاز و اکرام سے نوازا گیا اور پہاسو کا علاقہ بطور جاگیر عطا ہوا جو آگے چل کر ہاتھ سے نکل گیا۔ مرزا کے والد عبداللہ بیگ ملازمت کے سلسلے میں مختلف مقامات پر رہے۔ آخر کار راجہ بختاور سنگھ کے ملازم ہوئے۔ 1801ء میں کسی لڑائی میں مارے گیے۔ غالب بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے ان کی پرورش ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ نے کی لیکن آٹھ سال کی عمر میں ان کے چچا بھی فوت ہو گئے۔ نواب احمد بخش خاں نے مرزا کے خاندان کا انگریزوں سے وظیفہ مقرر کرا دیا۔ امراؤ بیگم سے ان کی شادی ہوئی اور وہ دہلی میں رہنے لگے۔

شادی کے بعد مرزا کے اخراجات بڑھ گئے اور مقروض ہو گئے۔ اس دوران میں انہیں مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور قرض کا بوجھ مزید بڑھنے لگا۔ آخر مالی پریشانیوں سے مجبور ہو کر غالب نے قلعہ کی ملازمت اختیار کر لی اور 1850ء میں بہادر شاہ ظفر نے مرزا غالب کو نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب عطا فرمایا اور خاندان تیموری کی تاریخ لکھنے پر مامور کر دیا اور 50 روپے ماہور مرزا کا وظیفہ مقرر ہوا۔

جنگ آزادی کے بعد مرزا کی سرکاری پنشن بھی بند ہو گئی۔ چنانچہ انقلاب 1857ء کے بعد

مرزا نے نواب یوسف علی خاں والی رامپور کو امداد کے لیے لکھا انہوں نے سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا جو مرزا کو تادم حیات ملتا رہا۔ غالب کو اپنے حسب ونسب اور شاعرانہ رتبے دونوں پر ناز تھا۔ وہ شاہانہ زندگی کے خواہش مند تھے، مگر ان کی آرزو پوری نہیں ہوئی۔ آخر عمر میں ان کی صحت بالکل تباہ ہوگئی مرنے سے پہلے بے ہوشی طاری رہی اور اسی حالت میں 15 فروری 1869ء کو انتقال فرمایا۔

غالب کی غزل گوئی

غالب بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اس صنف کو انھوں نے زمین سے آسمان پر پہنچا دیا اور اسی صنف کی بدولت انھیں حیات جاوداں نصیب ہوئی۔ غالب نے غزل کی وادی میں قدم رکھا تو یہ وادی بہت تنگ تھی اردو غزل کے موضوعات عشق و عاشقی تک محدود تھے۔ غالب نے اسے وسعت عطا کی اور حقیقی زندگی سے متعلق موضوعات اس میں داخل کیے اس سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے اردو غزل کو فکر کے عنصر سے روشناس کیا۔ غالب نے غزل کو بہت کچھ دیا اور اس کے صلے میں غزل نے غالب کو شہرت دوام عطا کی۔

آج غالب کی شہرت نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں ہے۔ پروفیسر نورالحسن نقوی نے غالب کے کلام کی چند اہم خصوصیات پیش کی ہیں۔ یہاں ان کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

جدت پسندی:

جدت پسندی غالب کی شاعری کا خاص وصف ہے وہ لکیر کے فقیر نہیں تھے۔ پامال راہوں پر چلنے کو انھوں نے اپنی شان کے خلاف سمجھا، غالب صاحب ہنر تھے، قدرت نے انھیں تخلیقی توانائی عطا کی تھی، انفرادیت ہمیشہ جدت پسندی سے پیدا ہوتی ہے اور یہ جدت پسندی غالب کے مزاج کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔

وسعت مضامین:

غالب سے پہلے اردو شاعری ایک محدود دائرے میں قید تھی۔ غالب نے اردو شاعری کو اس تنگنائے سے باہر نکالا اور اسے وسعت عطا کی۔ غالب نے زندگی کو بہت نزدیک سے دیکھا اور ہر رنگ میں دیکھا۔ اپنی زندگی کے نشیب و فراز، آلام اور مصائب اور خوشگوار کیفیتوں کو اپنی شاعری میں

بڑی شاعرانہ نزاکتوں کے ساتھ پیش کر دیا۔ غالب نے اردو شاعری کو عشق و عاشقی کے دائرے سے نکالا اور اسے کھلی فضا میں سانس لینا سکھایا اور اسے پوری زندگی کا ترجمان بنا دیا۔

عشقیہ شاعری:

غالب نے شعر کہنے شروع کیے تو لامحالہ حسن و عشق ہی ان کا خاص موضوع تھا۔ پہلے فارسی میں انھوں نے عشقیہ شاعری کی۔ اسی کے زیر سایہ اردو کی عشقیہ شاعری نے جنم لیا تھا۔ غالب کے ابتدائی دور کی شاعری میں عشق کا روایتی انداز ملتا ہے۔ لیکن غالب نے عشق کو فرضی اور خیالی دنیا سے باہر نکالا۔ اس میں اصلیت و واقعیت کا رنگ بھرا اور عشق کی ایک قابل یقین تصویر پیش کر دی۔ غالب کی عشقیہ شاعری کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کا محبوب کسی خیالی دنیا کا حسین نہیں، اصلی دنیا کا گوشت و پوست کا انسان ہے، اس میں کمزوریاں بھی ہیں۔ ایسا نہیں کہ وہ حور بہشتی کی طرح بے مثال ہو۔ اس کا حسن بناؤ سنگھار کا محتاج ہے۔ شوخی و ظرافت نے ان کی عشقیہ شاعری کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

تصوف:

غالب نے تصوف کے مضامین کو بہت دلکش پیرائے میں ادا بیان کیے ہیں۔ ان میں زیادہ تر مضامین فلسفہء وحدت الوجود سے متعلق ہیں۔ اس فلسفہ کا مطلب یہ ہے کہ پوری کائنات میں صرف اللہ تعالی کی واحد ذات ایسی ہے جو معتبر ہے۔ بس ایک حقیقی ذات تو یہی ہے باقی سب کی پرچھائیں ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ غالب کی زندگی مصائب و آلام، غموں اور دکھوں سے پر تھی۔ انھوں نے ہر درد کو سہا اور ہر غم پر ہنستے رہے کیوں کہ انھیں یقین تھا کہ جس طرح دنیا فنا ہونے والی ہے اسی طرح یہ مصائب بھی ختم ہو جائیں گے۔

فلسفیانہ انداز:

غالب کی شاعری میں دل اور دماغ دونوں کی آسودگی کا سامان موجود ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور کہتے ہیں کہ غالب سے پہلے اردو شاعری دل والوں کی دنیا تھی غالب نے اسے ذہن دیا۔ غالب گرچہ کہ کوئی عظیم فلسفی اور مفکر نہیں تھے۔ ان کی شاعری میں نہ درس اخلاق ہے نہ فلسفہ اور نہ پیغام وہ ایک سوچنے والے شاعر ضرور ہیں، ان کی شاعری ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔

تخیل:

شاعری کے لیے سب سے ضروری چیز تخیل ہے اس کے بغیر شاعری ممکن ہی نہیں اور جب

ایک شاعر کا کلام دوسرے شاعر سے بہتر ہوتا ہے تو اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ اس میں تخیل زیادہ قوی ہے۔ غالب کو جو شے دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کا تخیل ہے۔

تہ داری:

غالب کے کلام کی ایک اہم خصوصیت تہ داری ہے۔ تہ داری سے مراد یہ ہے کہ پہلی نظر میں شعر کے ایک معنی واضح ہوتے ہیں۔ غور کیجئے تو اس کی تہ سے دوسرے معنی برآمد ہوتے۔ تہ داری شاعری کی عظمت کی دلیل ہے۔ غالب کا ایک شعر ہے۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اس شعر کے کئی معنی ہیں۔ پہلا مطلب یہ ہے کہ دشت کی ویرانی کو دیکھ کے گھر یاد آیا کہ وہ بھی ایسا ہی اجاڑ تھا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ عشق نے دشت پیمائی کرائی اور اس ویرانی کو دیکھ کر خیال آیا کہ عشق کیا ہے کیوں کہ آباد گھر کو چھوڑ کے ویرانے میں آنا پڑا۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ یہ ویرانی تو کچھ بھی نہیں ہے اصل ویرانی تو میرے گھر کی ہے جو محبوب کے نہ آنے سے میرا گھر سنسان اور اجاڑ دکھائی دیتا ہے۔ تہ داری شعر میں گہرائی پیدا کرتی ہے۔ غالب کی شاعری کی یہ خاص پہچان ہے۔

طنز و ظرافت:

غالب نے اپنی شاعری اور نثر دونوں میں طنز و ظرافت کو خوب استعمال کیا ہے۔ طنز زہر بھرے نشتر کی طرح ہوتا ہے لیکن شوخی و ظرافت بے ضرر ہوتی ہے اصل زندگی میں بھی، خطوں میں بھی اور شاعری میں بھی غالب نے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے شوخی اور ظرافت کا خوب استعمال کیا ہے۔

غالب کے کلام کی اور بھی خصوصیات ہیں جیسے آفاقیت، انداز بیان، مصوری، موسیقی، انتخاب الفاظ اور ابہام وغیرہ

غرض غالب نے اردو شاعری کو ذہن دیا۔ غور و فکر کی قوت عطا کی، اپنے دلکش انداز بیاں سے اردو غزل کے باغ کو مہکا دیا۔

تشریح غزل

درد ،منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا

شاعر کہتا ہے کہ وہ عشق کی بیماری میں مبتلا ہے اگر اسے اس بیماری سے نجات پانا ہے تو اس کو دوا (محبوب کی رضامندی) کا استعمال ناگزیر ہے۔شاعر کا خیال ہے کہ تندرست ہونے میں کوئی برائی نہیں ہے کیونکہ اگر وہ دوا استعمال کرتا تو وہ اچھا ہو جاتا اور بیماری دفع بھی ہو جاتی تو اس پر دوا کا احسان رہ جاتا،لیکن اس کی خودداری یہ پسند نہ کرتی ہے۔

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا

شاعر محبوب کی شکایتیں لے کر اس کے پاس پہنچے اور گلے شکوے کرنے لگے،اپنی وفاداری کے قصے سنانے لگے محبوب نے اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے چند لوگوں کو بلا لیا لیکن اتفاق سے وہ فیصلہ کرنے والے غالب کے دشمن نکلے جو پہلے ہی سے غالب سے خار کھائے ہوئے تھے،ان سے صحیح فیصلے کی امید نہیں ہے وہ معاملہ کی حقیقت تک پہنچنے کے بجائے اس سنجیدہ معاملہ کا تماشا کر دیں گے۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب، کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

اے محبوب! تیرے ہونٹوں میں کتنی مٹھاس ہے کہ رقیب کو تو نے برابر گالیاں دیں،مگر انھیں کھا کے بھی وہ بے لطف،رنجیدہ اور ناخوش نہ ہوا۔یہ اس حقیقت کی روشن دلیل ہے کہ تیرے ہونٹوں کی شیرینی نے گالیوں میں بھی اتنی مٹھاس پیدا کر دی ان میں ذرا بھی تلخی باقی نہ رہی۔شعر کی خاص خوبی یہ ہے کہ رقیب سچا عاشق نہیں ہے اور جو ہونٹ جھوٹے عاشقوں کے نزدیک اتنے شیریں ہو سکتے ہیں،تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ سچے عاشقوں کے لیے کیا ہوں گے۔

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

مشہور ہے کہ محبوب میرے گھر آ رہا ہے،لیکن میری بے سامانی کا یہ عالم ہے کہ آج ہی گھر

میں بوریا تک نہیں ہے جسے بچھا کر اسے بٹھا سکتا اور بے سامانی کی یہ کیفیت اسی روز ہوئی جب محبوب کے آنے کی خبر گرم ہے۔

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

شاعر کہتا ہے کہ میری بندگی، کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھ کو سوائے نقصان کے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں ہے بلکہ عبودیت اور بندہ ہونا ہے بندگی پر نمرود کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے۔ شارحین غالب نے اس شعر کے دو مفہوم بیان کیے ہیں۔

1۔ میں نے بارگاہ خداوندی میں اپنی عبودیت کا اقرار کیا مگر افسوس کہ اقرار عبودیت سے مجھے کوئی فائدہ نہ ہوا۔

2۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا دعوہء عبودیت اس کی نظر میں نمرود کا دعوہء خدائی قرار پایا جبھی تو مجھے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

شاعر کہتا ہے کہ میں نے اپنی جان راہ حق میں دے دی لیکن اس میں میری کوئی خوبی نہیں ہے۔ کیونکہ جان میری نہ تھی بلکہ خدا کی طرف سے عطا کی گئی تھی جو اس کو لوٹا دی، دی ہوئی چیز کو لوٹا دینے میں کوئی کمال نہیں ہے۔ امانت کو واپس کرنے میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ حق تو یہ تھا کہ خدا کی طرف سے جو ہم پر عائد تھا اور جو کچھ واجب تھا اسے ہم نے پورا کرتے، ہم اپنی کوئی چیز اس کی راہ میں قربان کرتے تو ایک بات تھی، لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔ اس لیے حق ادا کرنے کا دعوی ہم نہیں کر سکتے۔

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا!

اے غالب! کچھ تو پڑھیے کیونکہ لوگ کہتے ہیں۔ آج غالب نے کوئی غزل نہیں سنائی۔

قلعہ معلّٰی میں کسی شہزادے کے یہاں مشاعرہ ہوا تھا۔ غالب بھی شریک تھے مگر طرحی غزل نہیں کہی تھی۔ اس لیے یہ غزل وہاں پڑھ دی تھی، مقطع کا انداز بتا رہا ہے کہ غالب سے لوگوں نے یہ کہا کہ اگر طرحی غزل نہیں لکھی ہے تو غیر طرحی کلام ہی سنائیے بہر حال کچھ تو پڑھیے۔

نظم عدلِ فاروقی۔ (علامہ شبلی نعمانی)

ایک دن حضرت فاروقؓ نے منبر پہ کہا
کیا تمہیں حکم جو کچھ دوں تو کرو گے منظور
ایک نے اٹھ کے کہا یہ کہ نہ مانیں گے کبھی
کہ ترے عدل میں ہم کو نظر آتا ہے فتور
چادریں مالِ غنیمت میں جواب کے آئیں
صحنِ مسجد میں وہ تقسیم ہوئیں سب کے حضور
ان میں ہر ایک کے حصہ میں فقط اک آئی
تھا تمہارا بھی وہی حق کہ یہی ہے دستور
اب جو یہ جسم پہ تیرے نظر آتا ہے لباس
یہ اسی لوٹ کی چادر سے بنا ہوگا ضرور
مختصر تھی وہ ردا اور ترا قد ہے دراز
ایک چادر میں ترا جسم نہ ہوگا مستور
اپنے حصہ سے زیادہ جو لیا تو نے تو اب
تو خلافت کے نہ قابل ہے نہ ہم ہیں مامور
گرچہ وہ حدِ مناسب سے بڑھا جاتا تھا
سب کے سب مہر بہ لب تھے چہ اُناث و چہ ذکور
روک دے کوئی کسی کو یہ نہ رکھتا تھا مجال
نشۂ عدل و مساوات سے سب تھے مخمور
اپنے فرزند سے فاروقِ معظم نے کہا

تم کو ہے حالتِ اصلی کی حقیقت پہ عبور
تمہیں دے سکتے ہو اس کا مری جانب سے جواب
کہ نہ پکڑے مجھے محشر میں مرا ربِ غفور
بولے یہ ابن عمرؓ سب سے مخاطب ہو کر
اس میں کچھ والدِ ماجد کا نہیں جرم و قصور
ایک چادر میں جو پورا نہ ہوا اُن کا لباس
کر سکی اس کو گوارا نہ مری طبعِ غیور
اپنے حصّے کی بھی میں نے انہیں چادر دے دی
واقعہ کی یہ حقیقت ہے کہ جو تھی مستور
نکتہ چیں نے یہ کہا اٹھ کے کہ ہاں اے فاروق!
حکم دے ہم کو کہ اب ہم اسے مانیں گے ضرور

علامہ شبلی نعمانی کی سوانح حیات

علامہ شبلی 1857ء میں اعظم گڑھ کے نزدیک بندوال میں پیدا ہوئے۔ یہ لوگ نسلاً راجپوت تھے۔ ان کے والد اعظم گڑھ کے نامور وکیل، بڑے زمیندار اور تاجر تھے۔ شبلی کو انھوں نے دینی تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا۔ شبلی نے اپنے وقت کے جیّد علماء سے فارسی، عربی، حدیث، فقہ اور دیگر اسلامی علوم حاصل کیے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا نے وکالت کا امتحان کامیاب کیا۔ کچھ دنوں مختلف مقامات پر وکالت کرنے کے بعد مولانا علی گڑھ میں سرسید کے کالج میں عربی اور فارسی کے استاذ مقرر ہوئے۔ یہیں سے شبلی کی کامیابیوں کا سفر شروع ہوا۔ علی گڑھ کی ملازمت کے دوران ہی مولانا نے ترکی شام اور مصر کا سفر کیا۔ ترکی میں سرسید کے رفیق اور عربی و فارسی کے اسکالر کے طور پر ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ اور ان کو "تمغہء مجیدیہ" سے نوازا گیا۔ واپسی پر انھوں نے المامون اور سیرت نعمان لکھیں۔ 1890ء میں شبلی نے ایک بار پھر ترکی، لبنان اور فلسطین کا دورہ کیا اور وہاں کے کتب خانے دیکھے۔ اس سفر سے واپسی پر انھوں نے "الفاروق" لکھی۔ 1898ء میں سرسید کے انتقال کے بعد شبلی نے علی گڑھ چھوڑ دیا۔ اور اعظم گڑھ واپس آ کر اپنے قائم کردہ "نیشنل اسکول" کی ترقی میں مصروف ہو گئے۔ پھر وہ حیدرآباد چلے گئے، جہاں کے اپنے چار سالہ قیام میں انھوں نے الغزالی، علم الکلام، الکلام، سوانح عمری مولانا روم، اور موازنہء انیس و دبیر جیسی کتابیں لکھیں۔ اس کے بعد وہ لکھنؤ آ گئے جہاں انھوں نے ندوہ العلماء کے تعلیمی معاملات سنبھالے۔ ندوہ کی مصروفیات کے درمیان ہی انھوں نے شعر العجم لکھی۔ شبلی کا خواب تھا کہ بڑے بڑے علماء کو جمع کر کے علمی تحقیق و اشاعت کا اک ادارہ "دارالمصنفین" کے نام سے قائم کیا جائے۔ انھوں نے اس کا انتظام پورا کر لیا تھا لیکن ادارہ کا افتتاح ان کی موت کے بعد ہی ہو سکا۔

آخری عمر میں وہ اعظم گڑھ آ کر اسکول اور زمینداری کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ یہاں آ کر ان کی صحت گرنے لگی اور 18 نومبر 1914ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ شبلی نعمانی ایک فعّال اور محنتی آدمی تھے۔ جس کام میں ہاتھ ڈالتے پوری محنت اور لگن سے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچاتے تھے۔

علامہ شبلی نعمانی کی نظم نگاری

علامہ شبلی نعمانی کو اللہ تعالی نے بیشمار صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ کہنہ مشق شاعر، بلند پایہ نثر نگار، عظیم سوانح نگار، معتبر مؤرخ، باشعور تنقید نگار ہیں۔ وہ شاعری سے زیادہ نثر میں اہم کارنامے انجام دے چکے ہیں۔ لیکن وہ بحیثیت شاعر بھی مشہور ہیں۔

مولانا شبلی کو بچپن ہی سے شعر گوئی سے مناسبت تھی۔ وقت کے ساتھ ان کا یہ شوق برابر ترقی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ان کی شعر گوئی ایک مسلمہ حقیقت بن گئی اور ان کے معاصرین نے بھی ان کی شاعرانہ حیثیت کا اعتراف کیا ہے۔ شبلی نے کم وبیش پانچ ہزار شعر کہے ہیں۔ اور تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، چنانچہ ان کے یہاں غزلیات، قصائد، مثنویات، مراثی، مسدس، ترکیب بند، قطعات اور جدید منظومات سبھی نمونے موجود ہیں۔ انھیں امتیاز بھی حاصل ہے کہ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی انھوں نے قابل قدر شعری آثار یادگار چھوڑے ہیں۔

مولانا شبلی نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی نظموں نے انھیں حیات جاودانی بخشی۔ شبلی نے مختلف موضوعات پر نظمیں کہی ہیں۔ اسلامی روایات، حکایات اور سیرت اور خلفائے راشدہ اور دیگر اکابرین کی حیات پر بے مثال مرقع پیش کیے ہیں۔ ان کے کلیات میں مذہبی و اخلاقی نظموں کی کافی تعداد موجود ہے۔ شبلی نے اپنی نظموں میں ہندوستانی مسلم بادشاہوں کی رواداری، انصاف اور حسن اخلاق پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

شبلی کی اصلاحی، قومی اور سیاسی نظموں میں ان کا مخصوص قومی وسیاسی نقطۂ نظر صاف دکھائی دیتا ہے۔ آزاد اور حالی کے بعد شبلی نے قومی شاعری کو متعارف کرانے میں پیش پیش رہے۔ مذہبی اور اخلاقی شاعری ادبی نقطۂ نگاہ سے بھی بہت بلند مقام رکھتی ہے۔ اسلوب کی رنگینی، بحر و وزن کی ترنم آفرینی، ردیف و قافیے کی شگفتگی ان کی شاعری کے نمایاں وصف ہیں۔ چنانچہ ان کی شاعری میں

شادابی اور جاذبیت پیدا ہوگئی ہے۔علامہ شبلی نے نثر نگاری پر زیادہ توجہ دی ہے اس لیے وہ بہترین سوانح نگار، مؤرخ، سیرت نگار اور ایک تنقید نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں اگر وہ شاعری کی طرف بھی خصوصی توجہ فرماتے تو حالی اور اقبال کے بعد بہترین شاعر شمار کیے جاتے۔

علامہ شبلی کی بہت سی نظمیں نہ صرف عوامی رجحان کی غماز ثابت ہوئیں بلکہ حکومت کے ایوان میں ان کی بازگشت بھی سنی گئی۔واقعہء کانپور پر ان کی نظموں سے حکومت کو بہت زیادہ خفت اٹھانی پڑی۔اردو شاعری میں سیاسی اور ہنگامی موضوعات کو برتنے کے سلسلے میں اولیت علامہ شبلی کو حاصل ہے۔وہ مذہب اور تہذیب سے اپنی شاعری کو پروان چڑھاتے ہیں۔ان کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ایک حصہ ملکی حالات و مسائل سے متعلق نظموں پر مشتمل ہے اور دوسرا عالم اسلام کے حالات و واقعات سے متعلق ہے۔شبلی کی نظموں کے مطالعے سے اس پورے عہد کے حالات ،واقعات اور اہم مسائل سے واقفیت ہوجاتی ہے۔

نظم ''عدلِ فاروقی'' کا خلاصہ

(علامہ شبلی نعمانی)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایک جلیل القدر صحابیء رسول ہیں۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد دوسرے اسلامی خلیفہ بھی ہیں۔انہوں نے اپنے دور خلافت میں اسلامی سرحدوں کو وسیع کیا۔عرب سے باہر اسلام کا پرچم لہرایا۔اپنی رعایا کے درمیان عدل و انصاف اور مساوات و برابری کا بہترین نظام قائم کیا۔اپنے دور خلافت میں بیت المال اور مال غنیمت کی تقسیم حد درجہ انصاف اور عدل سے کی جاتی تھی۔کسی کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کیا جاتا۔چاہے خلیفہ ہی کیوں نہ ہو۔وہ بھی مال غنیمت کی تقسیم میں عوام کے ساتھ برابر کے شریک ہوتے تھے۔

نظم ''عدلِ فاروقی'' میں علامہ شبلی نے حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جس میں حضرت عمر فاروقؓ نے عدل و انصاف کی بہترین مثال قائم کی ہے۔واقعہ یوں ہے

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ منبر پر خطاب کے لیے کھڑے ہوئے اور عوام سے کہا کہ میں جو کچھ آپ کو حکم دوں تو کیا آپ اس پر عمل کے لیے تیار ہیں۔مجمع میں سے ایک شخص اٹھ کھڑا ہوا

اور کہا اے خلیفہ ہم کو تمہارے عدل و انصاف میں کچھ کمی نظر آتی ہے کیوں کہ مال غنیمت کی چادریں جو تمام لوگوں میں تقسیم کی گئیں وہ ایک ایک تھیں سب کے برابر آپ کو بھی ایک ہی چادر ملنی تھی۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ کا لباس ایک چادر سے نہیں دو چادروں سے بنا ہوا ہے۔ اور دوسری چادر مال غنیمت کی ہی ہوگی۔ اس طرح آپ نے تمام لوگوں کو ایک اور خود کے لیے دو چادریں مال غنیمت سے لی ہیں۔ اور یہ تقسیم انصاف کے خلاف ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود جواب نہیں دیا بلکہ اپنے بیٹے عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کو جواب دینے کا حکم دیا جو دوسری چادر کے تعلق سے بخوبی جانتے تھے۔

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے اس طرح وضاحت کی کہ میرے والد نے کبھی انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ مال غنیمت کی جو چادریں تقسیم ہوئی تھیں، سب کی طرح میرے والد کے حق میں بھی ایک ہی چادر آئی تھی، جس سے میرے والد کا لباس مکمل نہیں ہو رہا تھا، میں نے اپنے حصہ کی چادر والد صاحب کو دے دی، یہ جو دوسری چادر ہے وہ میرے والد کی نہیں بلکہ میری ہے۔ یہ جواب سن کر شکایت کرنے والے نے کہا کہ اے عمر رضی اللہ عنہ جو شک و شبہ تمہارے انصاف کے تعلق سے تھا اب وہ ختم ہو چکا ہے۔ آپ کا انصاف، عدل اور برابری پر قائم ہے اس لیے اب ہم آپ کے حکم کی تعمیل کریں گے۔

UNIT-III

غزل۔(مومن خان مومنؔ)

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے بیشتر، وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو، تو اشارتوں ہی سے گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی بات ایسی اگر ہوئی، کہ تمہارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے با وفا
میں وہی ہوں مومنؔ مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔

مومن خان مومنؔ کی سوانح حیات

حکیم مومن خاں مومن کا تعلق ایک کشمیری گھرانے سے تھا۔ان کا اصل نام محمد مومن تھا۔اور تخلص مومن تھا۔حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے۔ان کے دادا حکیم مدار خاں شاہ عالم کے عہد میں دہلی آئے اور شاہی طبیبوں میں شامل ہو گئے۔مومن دہلی کے کوچہ چیلان میں 1801 میں پیدا ہوئے۔ان کے دادا کو بادشاہ کی طرف سے ایک جاگیر ملی تھی جونواب فیض خان نے ضبط کر کے ایک ہزار روپے سالانہ پنشن مقرر کر دی تھی۔یہ پنشن ان کے خاندان میں جاری رہی۔مومن خان کا گھرانا بہت مذہبی تھا۔انہوں نے عربی تعلیم شاہ عبدالقادر دہلوی سے حاصل کی۔فارسی میں بھی ان کو مہارت تھی۔دنیوی علوم کی تعلیم انہوں نے مکتب میں حاصل کی۔علوم متداولہ کے علاوہ ان کو طب، رمل، نجوم ریاضی، شطرنج اور موسیقی سے بھی دلچسپی تھی، جوانی میں قدم رکھتے ہی انہوں نے شاعری شروع کر دی تھی اور شاہ نصیر سے اصلاح لینے لگے تھے۔مومن خاں کی زندگی اور شاعری پر دو چیزوں نے بہت گہرا اثر ڈالا۔ایک ان کی رنگین مزاجی تھی اور دوسری ان کی مذہبیت۔لیکن ان کی زندگی کا سب سے دلچسپ حصہ ان کے معاشقے ہی ہیں۔محبت زندگی کا تقاضہ بن کر بار بار ان کے دل و دماغ پر چھاتی رہی۔ان کی شاعری پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کسی خیالی نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی محبوبہ کے عشق میں گرفتار ہے۔ان کے کلیات میں چھ مثنویاں ملتی ہیں اور ہر مثنوی میں کسی معاشقہ کا بیان ہے۔

مومن کے یہاں اک خاص قسم کی شانِ استغناء تھی۔مال وزر کی طلب میں انہوں نے کسی کی شان میں قصیدہ نہیں لکھا۔ان کے نو قصیدوں میں سے سات مذہبی نوعیت کے تھے۔شاہ عبدالعزیز کے خاندان سے ان کے خاندان کے گہرے مراسم تھے۔مومن عقیدہ کے اعتبار سے کٹّر مسلمان تھے۔1818ء میں انہوں نے سید احمد بریلوی کے ہاتھ پر بیعت کی لیکن ان کی جہاد کی تحریک میں

خود شریک نہیں ہوئے۔ البتہ جہاد کی حمایت میں ان کے کچھ شعر ملتے ہیں۔ 1851ء میں وہ کوٹھے سے گر کر بری طرح زخمی ہو گئے تھے اور پانچ ماہ بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

مومن خان مومنؔ کی غزل گوئی

مومن اردو کے ان چند باکمال شاعروں میں سے ایک ہیں جن کی بدولت اردو غزل کی شہرت اور مقبولیت کو چار چاند لگے۔ مومن نے اس صنف کو ایسا عروج بخشا اور ایسے استادانہ جوہر دکھائے کہ غالب جیسا عظیم شاعر ان کے ایک شعر پر اپنا دیوان قربان کرنے کو تیار ہو گیا۔ مومن صنف غزل کے صف اوّل کے شاعر ہیں۔ انہوں نے اردو شاعری کی دوسری اصناف، قصیدے اور مثنوی میں بھی طبع آزمائی کی لیکن ان کا اصل میدان غزل ہے جس میں انھوں نے نئی جدتیں پیدا کی ہیں۔

مومن کی غزلوں کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے عاشقانہ مضامین ایسے دلکش انداز میں پیش کیے ہے کہ قدم قدم پر تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس سے تغزل کی نرالی شان پیدا ہو گئی ہے۔ انھیں تشبیہوں اور استعاروں کے برتنے کا بہت سلیقہ ہے۔ نازک خیالی و مضمون آفرینی کلام مومن کی اہم خصوصیات ہیں۔

مومن نے اردو غزل میں ایک اچھوتے انداز کی بنیاد ڈالی اور اپنی بات کہنے کا ایک ڈھنگ نکالا اور اپنے محبوب سے کوئی بات اس طرح کہتے ہیں جیسے اسی کے بھلے کی کہہ رہے ہوں اور اس میں محبوب ہی کا فائدہ نظر آ رہا ہو لیکن ذرا غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو صرف بات کہنے کا انداز ہے ورنہ فائدہ اپنا ہی مقصود ہے۔

شاعری میں ابہام حسن ہے یعنی بات کو کھول کر بیان نہ کیا جائے لیکن ابہام اتنا زیادہ ہو کہ شعر پہیلی بن جائے تو یہی عیب ہو جاتا ہے مومنؔ کے کے کلام میں اثر جگہ ابہام اس طرح ہے کہ وہ حسن بن جاتا ہے۔ مومن کی غزلوں کی ایک بڑی خاصیت نزاکت تخیل ہے۔ غزل کے پرانے مضامین کو نئے انداز اس طرح باندھنا کہ تصور نیا لگے۔ مومن محاوروں اور روزمرہ کو چھوڑ کر جب اپنی بات بالکل سیدھی سادی زبان میں کہتے ہیں تو تغزل کا لطف اور طنز کی شوخی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ؎

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گیا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومن نے حسن مقطع کا بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے مقطع میں تخلص کو اس طرح نبھا نا کہ دوسرے الفاظ اسی سے مطابقت رکھتے ہوں۔تخلص کو خوبی سے نبھانے میں مومن کا نام سرفہرست ہے ۔مومن کا ایک مقطع ملاحظہ ہو۔

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

مومن نے مثنویاں بھی کہی ہیں۔ان میں زندگی کی حقیقتیں بیان کی گئی ہیں۔ان میں زندگی کی سچی باتیں آسان اور رواں زباں میں پیش کی گئی ہیں۔

مومن خاں مومن کی غزل کی تشریح

(مومن خان مومنؔ)

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

شاعر محبوب کو اپنے وصال کے ایام یاد دلا رہا ہے اور کہہ رہا ہے جب ہم آپس میں ملتے تھے ،تو ہمیشہ ساتھ رہنے اور جینے کا اقرار کرتے تھے اور اسی وعدہ پہ قائم رہنے کی قسمیں کھاتے تھے،لیکن افسوس کہ تم نے سارے وعدے بھلا دیئے اور ہم سے لاتعلق ہو گیے۔

وہ جو لطف مجھ پہ تھے بیشتر، وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اے محبوب!تم میرے حال پر ہمیشہ لطف و اکرام کا معاملہ کرتے تھے اور مجھ پر مہربان ہو تے تھے،تمہارا لطف و اکرام اور احسان کا ذرہ ذرہ مجھے بخوبی یاد ہے لیکن اب معاملہ یہ ہے کہ تمھیں نے ان احسانات کو بھلا دیا ہے۔

وہ نئے گلے وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اے محبوب!وہ دن بھی یاد کرو جب تم مجھ سے ملتی تھیں تو ہر آنے والے دن نئے گلے اور نئی

شکایتیں مجھ سے کرتی تھیں اور مزے مزے کی باتیں کیا کرتی تھیں، جب آپس میں کوئی ان بن ہوجاتی تھی تو تم ہر بات پہ بہت جلد روٹھ بھی جاتی تھیں لیکن میں تم کو منالیتا تھا۔

کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو، تو اشارتوں ہی سے گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جب ہم محفل اور مجمع میں ہوتے تو برملا نہیں بلکہ اشاروں سے ہم باتیں کیا کرتے تھے اس طرح وہاں بھی تم اظہار محبت سے باز نہیں آتی تھیں۔

کوئی بات ایسی اگر ہوئی، کہ تمہارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اگر ہمارے درمیان کوئی ناخوشگوار اور نامناسب بات ہوتی جو تمہارے دل کو صدمہ پہنچاتی تو تم اس کو اظہار نہ کرتیں بلکہ اپنی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کو بھول جاتی تھیں۔

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اے محبوب! کبھی ہم ایک دوسرے کو بے حد چاہتے تھے، ہمارے تعلقات بھی آپس میں مستحکم تھے۔ دوستی اور محبت بھی بے مثال تھی۔ لیکن تم نے ان سارے تعلقات کو فراموش کر دیا ہے۔

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنؔ مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اے محبوب! تم ہمیشہ مجھے اپنا دوست اور رفیق مانتی تھیں اور مجھے باوفا اور وعدہ کا پکا سمجھتی تھیں، تمہارے خیال کے مطابق میں آج بھی وہی مومن ہوں جسے تم اپنا دوست مانتی تھیں، میں آج بھی اپنے وعدہ پر قائم ہوں اور تمھیں اپنا وعدہ یاد دلا رہا ہوں۔

نظم ''چاند اور تارے''۔ (علامہ اقبال)

ڈرتے ڈرتے دمِ سحر سے
تارے کہنے لگے قمر سے
نظارے رہے وہی فلک پر
ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا
چلنا چلنا، مدام چلنا
بے تاب ہے اس جہاں کی ہر شے
کہتے ہیں جسے سکوں، نہیں ہے
رہتے ہیں ستم کشِ سفر سب
تارے، انساں، شجر، حجر، سب
ہوگا کبھی ختم یہ سفر کیا
منزل کبھی آئے گی نظر کیا
کہنے لگا چاند، ہم نشینو!
اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو!
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ
کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا، کچل گئے ہیں
انجام ہے اس خرام کا حسن
آغاز ہے عشق، انتہا حسن

علامہ اقبال کی سوانح حیات

شیخ محمد اقبال 9 نومبر 1877ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد کشمیری برہمن تھے۔ لیکن اسلام قبول کر کے سیالکوٹ میں بس گئے تھے۔ اقبال کے والد شیخ نور محمد زیادہ پڑھے لکھے یا خوشحال نہیں تھے لیکن دیندار تھے اور علماء کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے۔ ماں کا نام امام بی بی تھا۔ اقبال کی ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی۔ پرائمری، مڈل اور میٹرک کے امتحانوں میں امتیازی نمبروں سے پاس ہو کر وظیفہ لیا۔ ایف اے اسکاچ اسکول سیالکوٹ سے پاس کر کے بی اے کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ یہیں ان کی ملاقات عربی کے اسکالر ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ سے ہوئی۔ اقبال نے 1899ء میں فلسفہ میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور اسی کالج میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ 1905ء میں وہ مزید تعلیم کے لئے انگلستان چلے گئے اور کیمبرج میں داخلہ لیا۔ جب وہ واپس آئے تو وہ بالکل بدلے ہوئے تھے۔ ان کی شاعری قوم وملت کے لیے وقف تھی۔

اقبال نے اورینٹل کالج اور گورنمنٹ کالج میں ملازمت کی، اس کے بعد انھوں نے وکالت شروع کر دی، وکالت میں کامیاب نہیں ہوئے، حکومت برطانیہ نے 1923ء میں ان کو سر کا خطاب دیا۔

اقبال نے کیمبرج اور میونخ یونیورسٹیوں سے فلسفہ میں اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کیں۔ ان میں ''شکوہ''، ''شمع و شاعر''، ''خضر راہ'' اور ''طلوع اسلام'' انجمن کے جلسوں میں پڑھی گئیں۔ 1910ء میں فارسی مثنوی ''اسرار خودی'' شائع ہوئی اور پھر تین سال بعد ''رموز بیخودی'' منظر عام پر آئی جو ''اسرار خودی'' کا تتمّہ تھی۔ اس کے بعد اقبال کی شاعری کے مجموعے یکے بعد دیگرے شائع ہوتے رہے۔ آخری مجموعہ ''ارمغان حجاز'' ان کی زندگی میں تیار تھا لیکن موت کے بعد شائع ہوا۔

21 اپریل 1938ء میں اقبال کا انتقال ہوا۔

علامہ اقبال کی نظم نگاری

ڈاکٹر محمد اقبال کا شمار اپنے عہد کے بڑے شعرا میں ہوتا ہے۔ انہوں نے غزل اور نظم دونوں ہی اصناف میں طبع آزمائی کی مگر ایک نظم نگار کی حیثیت سے وہ اردو ادب میں خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ اقبال کو شروع سے ہی شعر و شاعری سے شغف رہا۔ انہوں نے جس وقت شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو غزل کا بول بالا تھا۔ داغ اور میر کا رنگ سخن ہر سو پھیلا ہوا تھا۔ ابتدائے فن میں اقبال نے بھی غزل کے میدان میں ہی گل کھلائے، جن پر داغ کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔

لیکن داغ کا یہ رنگ جلد ہی اقبال کی شاعری سے اترتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کی ابتدائی شاعری میں تلاش، جستجو اور اضطراب کا رنگ واضح ہے۔ اقبال پر سرسید تحریک کا خاصا اثر نظر آتا ہے۔ جہاں وہ مشرقیت کا سہارا لیتے ہوئے وطن کی محبت سے سرشار نظر آتے ہیں۔

اقبال اپنے سینے میں ایک حساس اور وطن کی محبت سے سرشار دل رکھتے تھے۔ حالات زمانہ کے تقاضے نے ان کے دل میں ملت و قوم کی بہتری کا خیال پیدا کیا اور وہ اردو کی روایتی شاعری سے نکل کر مقصد خاص کے لیے اس کا استعمال کرنے لگے۔ سن 1899ء کے آس پاس اقبال کی شاعری ہمیں قوم کی اصلاح اور وطن پرستی سے رچی بسی نظر آتی ہے۔

اقبال کو جب یورپ جانے کا موقع ملا تو وہاں بھی وطن پرستی کے گیت گنگناتے رہے۔ 1905ء سے لے کر 1908ء تک کا زمانہ قیام یورپ کا زمانہ ہے، جہاں اقبال کی شاعری ہمیں ایک نئے رنگ میں نظر آتی ہے۔ جس میں فلسفیانہ فکر نظر آتی ہے۔

1908ء ہندوستان واپس آنے کے بعد ان کا فن اور بھی پختہ ہو گیا، جس میں اسلامیت کا عنصر پہلے سے بھی زیادہ نمایاں ہے۔ ''شمع و شاعر'' جیسی اعلیٰ پایہ کی نظم اسی دور کی دین ہے جو مجموعہ ''بانگ درا'' میں دل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ ''فاطمہ''، ''شکوہ جواب شکوہ''، ''خضر راہ''، ''طلوع اسلام''، ''ملی ترانہ''، ''ہسپانیہ طارق کی دعا'' اور ''مسجد قرطبہ'' جیسی شاہکار نظمیں لکھیں۔

اقبال اردو زبان کے فلسفی شاعر ہیں۔انھوں نے اپنے فلسفے سے ملت اسلام کے درد کی دوا کی۔وہ مسلمانوں کو ذلت سے نکالنا چاہتے تھے۔اقبال نے فلسفہ ءخودی پیش کیا۔خودی کا مفہوم ہے خود شناسی اور خود آ گہی۔یعنی اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کا پتا لگانا اور انھیں نکھارنا۔استحکام خودی کے لیے انھوں نے عشق کو سب سے اہم چیز قرار دیا یعنی کسی مقصد کو حاصل کرنے کی ایسی لگن جیسی عشق کے جذبے میں ہوتی ہے۔استحکام خودی کے لیے دوسری ضروری چیز جدو جہد کو لازمی قرار دیا یعنی اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مسلسل کوشش کی جائے۔اقبال نے اس نظریہ کو بڑی شد و مد کے ساتھ اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔

نظم ''چاند اور تارے'' کا خلاصہ

ستاروں نے صبح کے وقت ڈرتے ڈرتے چاند سے کہا کہ اگر چہ ہم چمک چمک کر تھک گئے ہیں۔ہمارا کام صرف چلنا ہی ہے۔ہمارے چلنے سے آسمان کے منظر میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی یعنی ہمارا چمکنا بیکار ثابت ہوا۔ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات کی ہر چیز مضطرب ہے اور جس چیز کو سکون کہا جاتا ہے وہ اس دنیا میں نہیں۔دنیا کی ہر چیز خواہ وہ انسان ہوں،درخت ہوں یا پتھر ہمیشہ سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے رہتے ہیں۔کیا کبھی یہ سفر ختم بھی ہوگا اور ہم سب کو اپنی منزل نظر آئے گی۔

تاروں کے سوال کے جواب میں چاند نے کہا کہ اے میرے ساتھیو اور رات کے کھیتی سے فیض حاصل کرنے والو!دینا کی زندگی حرکت کی وجہ سے ہے اور یہ اس کائنات کا بہت پرانا اصول ہے۔زمانے کا گھوڑا خواہش کے چابک کھا کھا کر دوڑتا ہے یعنی حرکت کے پیچھے کسی نہ کسی طرح کی خواہش پوشیدہ ہے اور دنیا کے راستے میں ٹھہر جانا بے موقع اور نامناسب ہے۔اس لیے کہ رکنے اور ٹھہرنے کا دوسرا نام موت ہے۔جو لوگ اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے وہ دوسروں سے آگے نکل گئے اور جو رک گیے انھیں پیچھے سے آنے والوں نے روند ڈالا۔

حرکت اور روانی ہی اشیاء کو بناتی سنوارتی ہے گویا چلتے رہنے میں حسن ہے۔کائنات کی تمام چیزیں عشق کی وجہ سے حرکت شروع کرتی ہیں اور اس حرکت کی بدولت آخر میں سنور کر حسین بن جاتی ہیں۔

UNIT-IV

غزل۔(داغؔ دہلوی)

دنیا میں آدمی کو مصیبت کہاں نہیں
وہ کون سی زمیں ہے جہاں آسماں نہیں

کس طرح جان دینے کے اقرار سے پھروں
میری زبان ہے، یہ تمہاری زباں نہیں

اے موت !تو نے دیر لگائی ہے کس لیے
عاشق کا امتحان ہے، تیرا امتحان نہیں

تنہا بھی جب رہے تو وہ رہتے ہیں ہوشیار
خود اپنے پاسباں ہیں اگر پاسباں نہیں

ایسا خط ان کو راہ میں ملتا ہے روز ایک
جس میں کسی کا نام، کسی کا نشاں نہیں

داغؔ دہلوی کی سوانح حیات

داغ دہلوی کا اصل نام ابراہیم تھا لیکن وہ نواب مرزا خاں کے نام سے مشہور ہوئے ۔وہ نواب شمس الدین احمد خاں کے بیٹے تھے،25 مئی 1831ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔شاعری کی دنیا میں وہ بلبل ہندوستان، جہاں استاد، دبیر الدولہ، ناظم یار جنگ نواب فصیح الملک مرزا خاں داغ دہلوی کے نام اور خطاب سے جانے جاتے ہیں ۔ان کی والدہ مرزا خانم عرف چھوٹی بیگم تھی۔نواب شمس الدیں خان کو ایک انگریز کے قتل کی سازش میں ملوث ہونے کے الزام میں پھانسی دے دی گئی تھی۔اس کے بعد جب ان کی عمر تیرہ سال کی تھی،ان کی والدہ نے اس وقت کی برائے نام مغلیہ سلطنت کے ولی عہد مرزا فخرو سے شادی کر لی تھی۔اس طرح داغؔ کی ذہنی اور علمی تربیت قلعہ کے ماحول میں ہوئی۔ان کو اپنے وقت کی بہترین تعلیم دی گئی جو شہزادوں اور امراء کے لڑکوں کے لئے مخصوص تھی۔قلعہ کے رنگین اور ادبی ماحول میں داغؔ کو شاعری کا شوق پیدا ہوا اور انہوں نے ذوق کی شاگردی اختیار کر لی۔

لال قلعہ میں داغؔ تقریباً چودہ سال رہے۔1856 میں مرزا فخرو کا انتقال ہو گیا اور داغؔ کو وہاں سے باہر نکلنا پڑا۔ایک ہی سال بعد 1857 کا غدر ہوا اور داغؔ دہلی کو بھی خیر آباد کہہ کر رامپور چلے گئے جہاں وہ نواب کے مہمان کی طرح رہے۔اس وقت رامپور میں بڑے بڑے اہل فن جمع تھے اور داغؔ کو اپنی پسند کا ماحول میسر تھا۔نواب یوسف علی خان کی موت کے بعد نواب کلب علی خان مسند نشین ہوئے۔وہ داغؔ کی صلاحتوں سے متاثر تھے،انہوں نے داغؔ کو کارخانہ جات،فراش خانہ اور اصطبل کی داروغی سونپ کر ان کی تنخواہ 70 روپے ماہانہ مقرر کر دی، یہاں سے کچھ عرصہ کے کئے داغؔ کے ستارے گردش میں رہے۔داغؔ کو رامپور چھوڑنا پڑا۔کچھ عرصہ ملک کے مختلف شہروں اور

ریاستوں میں قسمت آزمائی کی اور شاگرد بنائے آخر حیدرآباد کے نواب محبوب علی خان نے ان کو حیدر آباد بلا لیا۔

بطور استاد ان کا وظیفہ 450 روپے ماہانہ مقرر کیا گیا جو بعد میں ایک ہزار روپے ہو گیا۔ ساتھ ہی ان کو جاگیر میں اک گاؤں ملا۔ نواب حیدرآباد نے ہی ان کو بلبل ہند، جہان استاد، دبیر الدولہ، ناظم جنگ اور نواب فصیح الملک کے خطابات سے نوازا۔ داغؔ آخری عمر تک حیدرآباد میں ہی رہے۔ یہیں 1905 میں ان کا انتقال ہوا۔ داغؔ نے پانچ دیوان چھوڑے ہیں۔ جن میں 1028 غزلیں ہیں۔

داغؔ دہلوی کی غزل گوئی

بلبل ہند، فصیح الملک نواب مرزا داغؔ وہ عظیم المرتبت شاعر ہیں جنہوں نے اردو غزل کو اس کی حرماں نصیبی سے نکال کر محبت کے وہ ترانے گائے جو اردو غزل کے لئے نئے تھے۔ ان سے پہلے غزل ہجر کی تڑپ سے یا پھر تخیل کی بے لگام اڑانوں سے عبارت تھی۔ داغؔ نے اردو غزل کو ایک شگفتہ اور رجائی لہجہ دیا اور ساتھ ہی اسے بوجھل فارسی تراکیب سے باہر نکال کے قلعہ معلیٰ کی خالص ٹکسالی اردو میں شاعری کی جس کی داغ بیل خود داغؔ کے استاد شیخ ابراہیم ذوقؔ رکھ گئے تھے۔ نیا اسلوب سارے ہندوستان میں اس قدر مقبول ہوا کہ ہزاروں لوگوں نے اس کی پیروی کی اور ان کے شاگرد بن گئے۔ زبان کو اس کی موجودہ شکل میں ہم تک پہنچانے کا سہرا بھی داغؔ کے سر ہے۔ داغؔ ایسے شاعر اور فنکار ہیں جو اپنے فکر و فن، شعر و سخن اور زبان و ادب کی تاریخی خدمات کے لئے کبھی فراموش نہیں کئے جائیں گے۔

داغؔ نے جب شاعری کا آغاز کیا تو اس وقت غالب، مومن، ذوق اور بہادر شاہ ظفر کی شہرت تھی قلعہ کے اندر اور باہر ان شعراء کے فکر و فن کا طوطی بول رہا تھا۔ داغؔ نے ابتدا میں روایتی رنگ اختیار کیا۔ بعد میں متقدمین و معاصرین کی زمینوں میں طبع آزمائی کرنے کے باوجود اپنی الگ راہ نکالی جو ان سے شروع ہوئی اور انہی پر ختم ہو گئی۔ داغؔ نے غزلوں کے علاوہ مثنوی، قصیدہ، قطعات، رباعیات، مخمسات اور مسدس وغیرہ سب اصناف سخن میں طبع آزمائی کر کے داد سخن حاصل کی ہے لیکن جو بات ان کی غزلوں میں ہے وہ کہیں نہیں، ان کی تمام شاعری میں جتنی گہری چھاپ غزل کی

ہے وہ اپنا جواب نہیں، داغؔ معشوق کے ساتھ جس خودداری، جس طنطنے اور جس وقار کے ساتھ ہم کلام ہوتے ہیں اس سے عشق کو آبرو اور عاشق کے کردار کو عظمت ملی ہے۔ داغؔ کی نظر میں اگر حسن کو خود پر ناز ہے تو عشق بھی کسی سے کم نہیں، اسے بھی اپنی ذات پر فخر ہے۔

داغؔ نہ فلسفی تھے نہ صوفی اور نہ کوئی بڑا نظریہ ءحیات رکھتے تھے وہ صرف شاعر تھے اور وہ بھی جذبات کے شاعر، انھوں نے اپنی شاعری میں جذبات کا جس انداز سے اظہار کیا ہے وہ قابل غور بھی ہے اور لائق داد بھی، وہ دنیا کی لذتوں سے محظوظ ہونے اور زندگی کا صحیح تلذذ حاصل کرنے کے لیے ساری عمر کوشاں رہے اور ایک عاشق مزاج شاعر کی حیثیت سے حسن کے متوالے رہے وہ دیکھی ہوئی چیزوں کے مقابلے میں ان دیکھی چیزوں پر یقین نہیں رکھتے تھے یہی ان کی زندگی اور یہی ان کا فلسفہ تھا۔ داغؔ زبان کے بادشاہ ہیں۔ انہوں نے روزمرہ محاورات کے بے تکلف استعمال کے ذریعہ نازک سے نازک مسئلے اور معاملات حسن و عشق کو اتنے سادہ اور آسان انداز میں پیش کر دیا کہ بے ختیار داد دینے کو دل چاہتا ہے انھوں نے سادہ اور سلیس زبان استعمال کی۔

داغؔ کا اسلوب بیان بے انتہا دلکش اور پیارا ہوتا ہے۔ ہماری غزلوں میں جو محاورات، ترنم، موسیقیت اور نغمگی کا آہنگ ہے وہ بلبل ہندوستان داغؔ دہلوی کا عطیہ ہے۔

داغؔ کی شاعری کے مجموعے اس طرح ہیں۔ گلزار داغؔ، مہتابِ داغؔ، یادگارِ داغؔ، فریاد داغؔ وغیرہ۔

داغؔ دہلوی کی غزل کی تشریح

دنیا میں آدمی کو مصیبت کہاں نہیں
وہ کون سی زمیں ہے جہاں آسماں نہیں

اللہ تعالی نے انسان کو پیدا کر کے اس دنیا میں بھیجا اور ہر انسان کے ساتھ ہنسی خوشی، دکھ درد، مسرت و شادمانی، رنج و غم اور مصیبت اور پریشانی مقدر کر رکھی ہے اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہر انسان کے ساتھ مصیبت اور پریشانی لگی ہوئی ہے، کوئی یہ نہیں کہ سکتا کہ ہم کسی بھی مصیبت اور پریشانی سے مبرا ہیں۔ جس طرح آسمان کے بغیر زمین کا تصور نہیں ہے اسی طرح مصیبت کے بغیر

زندگی کا تصور نہیں ہے اس لیے ہر انسان کو چاہیے کہ مصیبت پر صبر سے کام لیں اور اپنی زندگی کو کامیاب بنائیں۔

کس طرح جان دینے کے اقرار سے پھروں
میری زبان ہے، یہ تمہاری زباں نہیں

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب! میں نے عشق میں جان دینے کا جو وعدہ کیا ہے، میں اس سے کس طرح مکر سکتا ہوں؟ میں وعدہ خلافی نہیں کر سکتا۔ اے محبوب! میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ وعدے کا پکا ہوں۔ تمہاری طرح ہر وقت وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

اے موت !تو نے دیر لگائی ہے کس لیے
عاشق کا امتحان ہے، تیرا امتحان نہیں

شاعر مرض عشق میں مبتلا ہو کر موت سے مخاطب ہے کہ اے موت! تو نے آنے میں دیر کیوں کی۔ عاشق جان دینا چاہتا ہے، اور اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ یہ موت کا امتحان نہیں ہے بلکہ عاشق کا امتحان ہے۔

تنہا بھی جب رہے تو وہ رہتے ہیں ہوشیار
خود اپنے پاسباں ہیں اگر پاسباں نہیں

شاعر اپنے محبوب کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ ہمیشہ چوکنّا رہتا ہے۔ وہ تنہائی میں بھی اور محفل میں بھی ہوشیار رہتا ہے۔ اگر کوئی محافظ اور پاسبان نہ بھی ہو تو وہ خود اپنی حفاظت آپ کر سکتا ہے اور بیدار مغز رہتا ہے۔

ایسا خط ان کو راہ میں ملتا ہے روز ایک
جس میں کسی کا نام، کسی کا نشاں نہیں

شاعر اپنے محبوب کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ اتنا دلنشیں ہے کہ بہت سے لوگ اس پر فدا ہیں اور اس سے مخاطب ہونا چاہتے ہیں۔ اسے محبوب کے رعب اور دبدبہ سے اتنے خائف اور ڈرے ہوئے ہیں۔ روزانہ راہ میں کوئی نہ کوئی خط تھما جاتا ہے لیکن اس پر لکھنے والے کا نام ونشاں بھی نہیں ہوتا۔

نظم ''نصیحتِ اخلاقی''۔(اکبرالہ آبادی)

بیٹے کو لوگ کہتے ہیں، آنکھوں کا نور ہے
ہے زندگی کا لطف، تو دل کا سرور ہے

گھر میں اسی کے دم سے ہے ہر سمت روشنی
نازاں ہے اس پہ باپ، تو ماں کو غرور ہے

خوش قسمتی کی اس کو نشانی سمجھتے ہیں
کہتے ہیں یہ خدا کے کرم کا ظہور ہے

اکبر بھی اس خیال سے کرتا ہے اتفاق
اس کا بھی ہے یہ قول، کہ ایسا ضرور ہے

البتہ شرط یہ ہے کہ بیٹا ہو ہو نہار
مائل ہے نیکیوں پہ، برائی سے دور ہے

سنتا ہے دل لگا کے بزرگوں کے پند کو
وقت کلام لب پہ جناب و حضور ہے

برتاؤ اس کا صدق و محبت سے ہے بھرا
اس میں نہ ہے فریب، نہ ہے مکر و زور ہے

افکارِ والدین میں ہے دل سے وہ شریک
ہمدرد ہے، معین ہے، اہلِ شعور ہے

راضی ہے اس پہ باپ کی جو کچھ ہو مصلحت
صابر ہے، با ادب ہے، عقیل و غیور ہے

رکھتا ہے خاندان کی عزت کا وہ خیال
نیکوں کا دوست، صحبتِ بد سے نفور ہے

کسبِ حلال کی ہے شب و روز اس کو دھن
علم و ہنر کے شوق کا دل میں وفور ہے

لیکن جو ان صفات کا مطلق نہیں پتہ
اور پھر بھی ہے خوشی تو خوشی کا قصور ہے

اکبرالہ آبادی کی سوانح حیات

سید اکبر حسین نام، الہ آباد وطن ہے۔ وہ 16 نومبر 1846ء کو ضلع الہ اباد کے قصبہ بارہ میں پیدا ہوئے۔ والد تفضّل حسین نائب تحصیلدار تھے۔ اکبر کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ آٹھ، نو برس کی عمر میں انھوں نے فارسی اور عربی کی درسی کتابیں پڑھ لیں۔ پھر ان کا داخلہ مشن اسکول میں کرایا گیا۔ لیکن گھر کے مالی حالات اچھے نہ ہونے کی وجہ سے ان کو اسکول چھوڑ کر پندرہ سال کی ہی عمر میں ملازمت تلاش کرنی پڑی۔ اسی کم عمری میں ان کی شادی بھی خدیجہ خاتون نام کی اک دیہاتی لڑکی سے ہوگئی۔ اکبر نے کچھ دنوں ریلوے کے اک ٹھیکیدار کے پاس 20 روپے ماہوار پر ملازمت کی پھر کچھ دنوں بعد وہ کام ختم ہو گیا۔ اسی زمانہ میں انھوں نے انگریزی میں کچھ مہارت حاصل کی اور 1867ء میں وکالت کا امتحان پاس کرلیا۔ انھوں نے تین سال تک وکالت کی۔ اس عرصہ میں انھوں نے ججوں وکیلوں اور عدالت کی کارروائیوں کو گہرائی کے ساتھ سمجھا۔ 1873 میں انھوں نے ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کیا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں ان کا تقرر منصف کے عہدہ پر ہو گیا۔ 1988ء میں انھوں نے سب آرڈینیٹ جج اور پھر 1884 میں خفیفہ عدالت کے جج کے عہدہ پر ترقی پائی۔ اور علی گڑھ سمیت مختلف مقامات پر ان کے تبادلے ہوتے رہے۔ 1903ء میں وہ سیشن ججج کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور باقی زندگی الہ اباد میں گزاری۔ 1907 میں حکومت نے اکبر کو "خان بہادر" کا خطاب دیا۔ اکبر نے 1921ء میں وفات پائی۔

اکبرالہ آبادی کی نظم نگاری

اکبرالہ آبادی ایک پیامی شاعر تھے۔ ان کا پیغام تھا کہ جدید تہذیب کے طوفان سے بچو اور اپنی پرانی تہذیب سے رشتے استوار رکھو۔ ابتدا میں انہوں نے روایتی انداز کی شاعری کی اور اسی انداز کی غزلیں بھی کہی ہیں۔ لیکن ان کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اصلاحی شاعری کے لیے بنے ہوئے ہیں

۔اور اصلاحی شاعر کو لامحالہ نظم کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے نظم کا سہارا لیا اور اردو نظم پر اپنا گہرا نقش چھوڑا۔

اکبر کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری

اکبر الہ آبادی سرکاری ملازم بھی رہے اور شاید اسی لیے ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ راست لب ولہجہ میں انگریزی استبداد کے خلاف آواز بلند کرتے لیکن شعری زبان کی وسعت اور ظرافت آمیز اظہار نے اس کمی کو پورا کر دیا۔

اکبر کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری اودھ پنچ کی مرہون منت ہے۔ اس اخبار کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین نے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل پر بے خوف وخطر طنز ومزاح کے پیرائے میں نکتہ چینی کی اور یہی حال اودھ پنچ کے تمام معاونین کا تھا۔ اکبر کے مزاج میں ظرافت اور مزاح کا مادہ فطری تھا۔ مزاح ان کی طبیعت کا خاصہ تھا اور اسی لئے سرکاری ملازمت کے باوجود وہ اودھ پنچ کے لئے لکھتے رہے۔ ان کی فطری شوخی، ظرافت اور قلم کی کاٹ نے جب شعر کی زبان میں سماج، تعلیم، سیاست، معاشرت اور بدلتی اقدار پر چوٹ کی تو فکری سطح پر تیزی سے فروغ پاتی ہوئی بے راہ روی کو ایک رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑا۔

اکبر ہمیشہ انگریزوں کی استعماریت اور ہندوستانی تہذیب پر ان کے تسلط کے ہمیشہ خلاف رہے۔ سرکاری ملازمت نے ان کے اظہار کی راہ میں روڑے ضرور اٹکائے لیکن وہ دل سے قومی تحریک اور آزادی وطن کے قائل تھے۔ مغربی تعلیم کے سیلاب سے اکبر بیزار تھے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ تعلیم کے خلاف تھے۔ خود اپنے لڑکے عشرت حسین کو انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن بھیجا تھا۔ ان کے نزدیک وطن اور وطن کی تہذیبی اقدار کی بڑی اہمیت تھی۔ وہ مغربی تعلیم کے اس خطرناک پہلو سے قوم کو بچانا چاہتے تھے جس سے ہندوستانیوں کی شناخت ختم ہو سکتی تھی۔

اکبر الہ آبادی کی نظم گوئی

نظم اس صنف کو کہتے ہیں جس میں کسی موضوع سے متعلق ربط وتسلسل کے ساتھ اظہار خیال کیا گیا ہو۔ وحدت خیال اس کی پہچان ہے۔ اکبر نے ابتدا غزل سے کی لیکن 1865ء کے بعد وہ نظم

نگاری کی طرف متوجہ ہوئے ان کی نظموں میں طویل اور مختصر دونوں طرح کی ہیں ۔ان کی ابتدائی نظموں میں فارسی تراکیب کا استعمال زیادہ ہے اور انداز بیان بھی پیچیدہ ہے لیکن بعد کی نظموں میں موضوعات فکر انگیز اور سنجیدہ ہیں ساتھ ہی پیرایہء بیان بھی شستہ اور عام فہم ہے ۔سماجی اور اصلاحی نظموں میں سادگی اور سلاست پائی جاتی ہے ۔اکبر نے اپنی نظموں کے لیے غزل سے لے کر مثنوی،قطعہ،رباعی اور معری کی ہیئتیں اور بحور استعمال کی ہیں ۔اکبر کی پہلی نظم ''نامہ بنام اودھ'' ہے جو مثنوی کی ہئیت میں اس میں اکبر فارسی تراکیب کا استعمال زیادہ کیا ہے اور انداز بیان بھی پیچیدہ ہے ۔مثلاً تعلیم نسواں،نظم قومی، برق کلیسا،جلوہء دربار دہلی، برٹش راج،لب ساحل اور موج، دریا کی روانی، پیر و مرشد نے کہا، وہ ہوا نہ رہی،عشرتی گھر کی محبت کا مزا،ایک بورھا نیف وخستہ زار، پانی کا بہاؤ ،مدرسہ علی گڑھ،نئی اور پرانی روشنی کی مکالمت تعلیم نسواں ،برق کلیسا،دربار دہلی ،گاندھی نامہ،فرضی لطیفہ وغیرہ وغیرہ۔

اکبر کی نظموں میں ہمیں طنز و مزاح ، کے ساتھ ساتھ منظر نگاری کے بھی بہترین نمونے ملتے ہیں ۔اکبر الہ آبادی کو الفاظ کے استعمال پر کس قدر قدرت حاصل تھی ۔سادہ سے الفاظ کا انتخاب کر کے انھوں نے دلکش تصویر کشی کرتے ہیں ۔ان کی نظموں کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں ڈرامائیت ہے ۔مکالموں کے ذریعے اکبر ایسی تصویر بناتے ہیں کہ منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے ۔انگریزی الفاظ اور اصطلاحیں جس خوبی سے اکبر نے استعمال کی ہیں اس کی مثال نہیں ملتی ۔

نظم ''نصیحتِ اخلاقی'' کا خلاصہ

لسان العصر اکبر الہ آبادی اردو کے مشہور اور معروف شاعر ہیں ۔ان کی شاعری میں ظرافت کی چاشنی اور طنز و مزاح کا اسلوب نظر آتا ہے ۔بعض نظموں میں سنجیدگی اور متانت بھی دکھائی دیتی ہے انہوں نے سماج کی خرابیوں اور خامیوں کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے ۔ان کی مشہور نظم ''نصیحت اخلاقی'' ایک سنجیدہ نظم ہے ۔جس میں ہمارے سماج میں لڑکوں کی پیدائش پر فخر و غرور کیا جاتا ہے ۔لڑکیوں کی پیدائش پر افسوس،ندامت اور شرمندگی ظاہر کی جاتی ہے ۔اس خیال پر اکبر الہ آبادی نے سخت چوٹ کی ہے ۔وہ کہتے ہیں ۔

بیٹوں کی پیدائش کو آنکھوں کا نور، زندگی لا لطف اور دل کی خوشی سمجھا جاتا ہے۔ ماں باپ بیٹے کی پیدائش پر فخر کرتے ہیں اور اس کو خوش قسمتی کی علامت سمجھتے ہیں۔ اور یہ خیال بھی کیا جاتا ہے کہ بیٹے کی پیدائش اللہ تعالی کا خاص انعام واکرام ہے۔ اکبر الہ آبادی کہتے ہیں کہ مجھے ان خیالات سے اتفاق ہے لیکن بیٹا اگر شریف اور نیک نہ ہو تو والدین کی خوشی اور فخر وغرور سب بے معنی اور بیکار ہے۔ شاعر نے ایک اچھے بیٹے کی چند اہم خوبیاں بیان کی ہیں اور وہ یہ ہیں۔

ایک اچھے بیٹے کی خوبی یہ ہے کہ وہ نیک ہو نیکیوں سے قریب اور برائیوں سے دور ہو۔ بڑوں کی نصیحت کو غور سے سن کر عمل کرنے والا ہو اس کی بات شریفانہ ہو دوسروں کے ساتھ اس کا برتاؤ سچائی اور محبت سے پر ہو، وہ دھوکہ باز نہ ہو، سازشی اور جھوٹا نہ ہو، والدین کے خیالات سے وہ متفق ہو دوسروں کے تئیں ہمدردی کا جذبہ رکھنے والا ہو۔ مددگار اور باشعور ہو، ماں باپ کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھتا ہو، مصیبتوں پر صبر کرنے والا ہو بڑوں کا ادب کرنے والا اور عقل مند اور غیرت مند ہو، خاندان کی عزت کا ہمیشہ خیال رکھنے والا ہو۔ نیک لوگوں کی صحبت کو پسند کرنے والا ہو اور بروں کی صحبت سے دور ہو ہمیدہ حلال کمائی کی فکر کرنے والا ہو۔ علم وہنر کے جذبہ سے معمور ہو۔

شاعر کہتا ہے کہ اگر کسی لڑکے میں مذکورہ صفات بالکل نہ ہوں۔ پھر بھی ماں باپ ایسے لڑکے سے خوش ہوں تو سمجھ لیجیے کہ ایسی خوشی کا قصور ہے اور ایسی خوشی بالکل بیکار ہے۔ اگر اولاد نیک اور شریف ہے تو ماں باپ اس پر خوشی کر سکتے ہیں اگر اولاد نیک نہیں ہے تو ماں باپ کو چاہیے کہ خوش ہونے کے بجائے اس کی اصلاح کی فکر کریں۔

UNIT-V

غزل۔(جگر مرادآبادی)

کوئی یہ کہہ دے گلشن گلشن
لاکھ بلائیں، ایک نشیمن

قاتل رہبر، قاتل رہزن
دل سا دوست، نہ دل سا دشمن

پھول کھلے ہیں، گلشن گلشن
لیکن، اپنا اپنا دامن

عشق ہے پیارے، کھیل نہیں ہے
عشق ہے کارِ شیشہ و آہن

رحمت ہوگی طالب عصیاں
رشک کرے گی پاکیٔ دامن

کام ادھورا اور آزادی
نام بڑے اور تھوڑے درشن

چلتی پھرتی چھاؤں ہے پیارے
کس کا صحرا ؟کیسا گلشن؟

جگر مرادآبادی کی سوانح حیات

جگر مرادآبادی کا نام علی سکندر تھا اور وہ 1890ء میں مرادآباد میں پیدا ہوئے۔جگر تخلص تھا۔جگر کے مورث اعلی محمد سمیع دہلی سے تعلق رکھتے تھے اور شاہجہاں کے استاد تھے لیکن بادشاہ کسی بات پر اپنے استاد سے ناراض ہوگیے تو یہ خاندان شاہی عتاب سے بچنے کے لیے دہلی چھوڑ کر مرادآباد میں آ کر بس گیا۔جگر کے والد مولوی نظر علی صاحبِ دیوان شاعر تھے۔اور خواجہ وزیر لکھنوی کے شاگرد تھے،جگر کی ابتدائی تعلیم گھر پر اور پھر مکتب میں ہوئی۔مشرقی علوم کے حصول کے بعد انگریزی تعلیم کے لئے انہیں چچا کے پاس لکھنؤ بھیج دیا گیا جہاں انہوں نے نویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔اان کو انگریزی تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نویں جماعت میں دو سال فیل ہوئے تھے۔اسی عرصہ میں والد کا بھی انتقال ہوگیا تھا اور جگر کو واپس مرادآباد آنا پڑا تھا۔جگر کو زمانہء تعلیم سے ہی شاعری کا شوق پیدا ہوگیا تھا لیکن طالب علمی کے زمانہ میں وہ اسے منظر عام پر نہیں لائے۔

جگر آزاد طبیعت کے مالک تھے اور بیحد حسن پرست تھے۔تعلیم ترک کرنے کے بعد ان کے چچا کے یہاں چند قیام کیے پھر مرادآباد سے بھاگ کر وہ آگرہ پہنچے اور وہاں اک چشمہ ساز کمپنی کے سفری ایجنٹ بن گئے۔

جگر بہت جذباتی،مخلص،صاف گو،محب وطن اور ہمدرد انسان تھے۔کسی کی تکلیف ان سے نہیں دیکھی جاتی تھی وہ کسی سے مرعوب بھی نہیں ہوتے تھے۔لکھنو کے وارفنڈ کے مشاعرہ میں،جس کی صدارت ایک انگریز گورنر کر رہا تھا،انہوں نے اپنی نظم ''قحط بنگال'' پڑھ کر سنسنی مچا دی تھی۔کئی ریاستوں کے والی ان کو اپنے دربار سے وابستہ کرنا چاہتے تھے اور ان کی شرائط ماننے کو تیار تھے لیکن وہ ہمیشہ اس طرح کی پیشکش کو ٹال جاتے تھے۔ان کو پاکستان کی شہریت اور عیش وآرام کی زندگی کی

ضمانت دی گئی تو صاف کہہ دیا جہاں پیدا ہوا ہوں وہیں مروں گا۔جگر آخری زمانہ میں بہت مذہبی ہو گئے تھے 1953ء میں انہوں نے حج کیا۔زندگی کی بے اعتدالیوں نے ان کے اعضائے رئیسہ کو تباہ کر دیا تھا۔ 1941 میں ان کو دل کا دورہ پڑا۔ان کا وزن گھٹ کر صرف 100 پونڈ رہ گیا تھا۔1958 میں ان انہیں دل اور دماغ دونوں پر قابو نہیں رہا۔لکھنو میں انہیں دو بار دل کا دورہ پڑا اور آکسیجن پر رکھے گئے۔آخر کار 1960ء میں گونڈہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

جگر مرادآبادی کی غزل گوئی

جگر مرادآبادی نے 13 سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔ابتدا میں داغ دہلوی اور منشی امیر اللہ خاں تسلیم لکھنوی کے شاگرد ہوئے اور پھر اصغر گونڈوی سے فیض حاصل کیا۔ان کے کلام میں حسن و عشق اور کیف و سرور اتنار چا ہوا تھا اور ترنم اس درجہ والہانہ تھا کہ پورے برصغیر کے مقبول ترین شاعر کہلائے۔ان کی شاعری کے تین مجموعے داغ جگر،شعلہ طور اور آتش گل ان کی یادگار ہیں۔

جگر مرادآبادی کو رئیس المتغزلین اور شہنشاہِ غزل بھی کہا جاتا ہے۔جگر مرادآبادی کا شمار اردو کے اہم اور مقبول شعرا میں ہوتا ہے۔ان کی شاعری نے عوام کے دلوں میں اس طرح گھر کر لیا تھا کہ پھر انہوں نے شاعری کو ہی اوڑھنا بچھونا بنالیا۔جگر کی شاعری عشق سے عبارت ہے۔وہ عشق سے شروع ہو کر عشق پر ختم ہوتی ہے۔اس لیے وہ کہتے ہیں۔

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

جگر مرادآبادی نے ابتدائے شباب سے ہی شاعری اور شراب نوشی شروع کر دی۔حقیقت یہ ہے کہ جگر صاحب برصغیر پاک و ہند میں اپنی انہی دو باتوں کی وجہ سے مشہور ہوئے۔شاعر ایسے تھے کہ ان کا کلام عشق و محبت کا سچا آئینہ دار شمار ہوتا۔بلا کے مے نوش تھے مگر بڑھاپے میں تائب ہو گئے تھے۔جگر کی شاعری حقیقی معنوں میں ان کی شخصیت کا آئینہ تھی۔اس لئے جگر،جگر رہے،ان کے ہمعصروں میں یا بعد میں بھی کوئی ان کے رنگ کو نہیں پا سکا۔

جگر کی ابتدائی شاعری میں شراب و شباب اور رندی و مستی کا ذکر ہے جس میں جگر حسن و عشق

اور بزم مے گساری میں گھرے رہتے۔ دوسرے دور کی شاعری میں آزادی کے بعد کے اثرات، ہجرت، خوں ریزی، قیامت خیز تباہی اور خاک وخون میں تڑپتی انسانیت اور دم توڑتی مشترکہ تہذیب کا تذکرہ ہے۔ آتش گل جگر کے اسی ذہنی تغیر وانقلاب کی تخلیق ہے جو انسانیت سے حددرجہ محبت کی دلیل ہے۔ جگر نے تقسیم ہندو پاک کے سانحے کو سماجی اور خارجی حقائق کی سچی تصویر مانا اور اسے غزل کے مزاج وفن سے ہم آہنگ کر کے تاریخ کا ایک حصہ بنادیا۔

جگر ادب برائے حظ و انبساط کے قائل تھے۔ ان کے یہاں شاعری برائے شاعری، شاعری برائے حسن وعشق اور شاعری برائے زندگی کی بھی عمدہ مثالیں ملتی ہیں ہے۔ ان کے نزدیک انسان کی زندگی کا مقصد انسانیت کی بقا، ترقی اور مسرت ہے۔

جگر کی شاعری قدیم و جدید کی رنگین نگاری کا خوبصورت امتزاج ہے۔ جگر شاعری میں اخلاقیات کا درس نہیں دیتے لیکن ان کی شاعری کا اخلاقی معیار بہت بلند ہے۔ وتغزل کے پردہ میں انسانی خامیوں پر ضربیں لگاتے ہیں۔ جگر نے قدیم اور جدید تمام شعراء کی فکر سے استفادہ کیا۔ ان کا کلام بے ساختگی اور آمد سے معمور ہے۔ سرمستی اور دلفگاری، تاثر اور سرشاری ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔ جگر کی شاعری میں محاکات نگاری کی بہترین تصویر کشی دکھائی دیتی ہے۔ غزل کے اس کلاسیکی شاعر کو اردو شاعری کی تاریخ میں ہمیشہ سنہرے الفاظ میں یاد کیا جاتا رہے گا۔

جگر مرادآبادی کی غزل کی تشریح

کوئی یہ کہہ دے گلشن گلشن
لاکھ بلائیں، ایک نشیمن

شاعر کہتا ہے کہ ہر گلشن میں اعلان کر دیا جائے کہ بلائیں اور مصیبتیں لاکھ سہی مگر عزم وحوصلہ سے کام لینا چاہیئے۔ بجلیاں ہمیشہ ایک ہی نشیمن پر گرتی ہیں۔ صبر اور ثابت قدمی سے کسی بھی کام کو گلشن بنایا جاسکتا ہے۔

کامل رہبر، قاتل رہزن
دل سا دوست، نہ دل سا دشمن

شاعر کہتا ہے کہ انسان کا دل ہی سب کچھ ہے اگر انسان کا دل نیک ہے تو وہ کامل رہبر بن جاتا ہے اور اگر انسان اپنے دل کو گناہوں اور غلط چیزوں کی طرف آمادہ کر لے تو وہی دل اس کے لیے قاتل رہزن بن جاتا ہے۔ دل رہبر بھی ہے اور رہزن بھی۔ اسی لیے شاعر کہتا ہے کہ دل کی طرح نہ کوئی دوست ہے نہ دشمن ہے۔ دل کو نیکیوں کی آماجگاہ بنانا چاہیے تاکہ وہ رہبر اور دوست بن سکے۔

پھول کھلے ہیں، گلشن گلشن
لیکن، اپنا اپنا دامن

شاعر کہتا ہے کہ ہر گلشن میں پھول کھلے ہوئے ہیں لیکن جس کا دامن جتنا وسیع ہوگا وہ اتنے ہی پھول چن سکے گا۔ اپنے اپنے ظرف کے اعتبار سے وہ پھولوں کو یکجا کرے گا۔ دنیا ایک گلشن کی طرح ہے جس میں مختلف اور رنگا رنگ پھول موجود ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم پھولوں سے اپنے دامن کو مزین کریں۔

عشق ہے پیارے، کھیل نہیں ہے
عشق ہے کارِ شیشہ و آہن

شاعر کہتا ہے کہ عشق آسان کھیل نہیں ہے جس سے ہر کوئی کھیل سکے۔ عشق دراصل کانچ اور لوہے کی طرح ہے یعنی وہ کبھی کانچ کی طرح نازک ہوتا ہے اور کبھی لوہے کی طرح سخت اور دشوار ہوتا ہے۔ اسی کو کسی نے یوں کہا ہے کہ وہ شاخ گل بھی ہے اور تلوار بھی ہے۔

رحمت ہوگی طالب عصیاں
رشک کرے گی پاکی دامن

شاعر کہتا ہے کہ حشر میں پروردگار کی رحمت گناہوں کو نیکیوں سے تبدیل کر دے گی۔ رحمت گناہوں کو اس طرح پاک کرے گی کہ دامن کی پاکیزگی رشک کرے گی۔ یعنی قیامت کے دن نیک لوگ گنہگاروں کے گناہوں کی معافی اور رحمت خداوندی پر رشک کریں گے۔

کام ادھورا اور آزادی
نام بڑے اور تھوڑے درشن

شاعر کہتا ہے کہ ملک کو آزاد کرانے کے لیے جدوجہد تو کی گئی لیکن مکمل آزادی نہیں مل سکی۔

نام تو بڑے ہیں لیکن کارنامے ہرگز بڑے نہیں۔شاعر نے اس شعر میں ان لوگوں پر بھی چوٹ کی ہے جو نام ونمود اور شہرت کے طلبگار ہیں لیکن ان کے کام قابلِ تعریف یا بڑے نہیں ہوتے۔

چلتی پھرتی چھاؤں ہے پیارے
کس کا صحرا کیسا گلشن؟

شاعر کہتا ہے کہ انسان کی زندگی میں دکھ درد، خوشی اور مسرت، دھوپ اور چھاؤں، خوشی اور غم کی کیفیات ہر ایک کے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔کبھی خوشحالی تو کبھی تنگ دستی۔شاعر نے زندگی کی کیفیت کو دھوپ چھاؤں سے تعبیر کیا ہے۔جس طرح چھاؤں ایک ہی مقام پر نہیں رکتی، اسی طرح انسان کی زندگی میں خوشی بھی ہمیشہ نہیں رہتی۔اسی مفہوم میں نواز دیوبندی کا ایک شعر یوں ہے:

گنگناتا جا رہا تھا اک فقیر
دھوپ رہتی ہے نہ سایہ دیر تک

نظم ''لوح و قلم''۔(فیض احمد فیض)

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
اسبابِ غمِ عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانیٔ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے
ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے
منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے
مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے
تزئینِ درو بامِ حرم کرتے رہیں گے
باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگِ لب و رخسارِ صنم کرتے رہیں گے
اک طرزِ تغافل ہے، سو وہ ان کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے۔

فیض احمد فیض کی سوانح حیات

فیض 13 فروری 1912ء میں سیالکوٹ میں ایک فارغ البال علمی گھرانے میں پیدا ہوئے ۔ان کے والد محمد سلطان خاں بیرسٹر تھے۔فیض کی ابتدائی تعلیم مشرقی انداز میں شروع ہوئی اور انھوں نے قرآن کے دو پارے بھی حفظ کئے پھر عربی اور فارسی کے ساتھ انگریزی تعلیم پر بھی توجہ دی گئی فیض نے عربی اور انگریزی میں ایم۔اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔گورنمنٹ کالج لاہور میں دوران تعلیم فلسفہ اور انگریزی ان کے خاص مضامین تھے۔اس کالج میں ان کو احمد شاہ بخاری ''پطرس'' اور صوفی غلام مصطفی تبسم جیسے استاد اور مربی ملے۔تعلیم سے فارغ ہو کر 1935 میں فیض نے امرتسر کے محمڈن اورینٹل کالج میں بطور لیکچرر ملازمت کر لی۔

1947 میں فیض نے اخبار ''پاکستان ٹائمز'' میں مدیر اعلی کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ سال 1951 فیض کی زندگی میں صعوبتوں اور شاعری میں نکھار کا پیغام لے کر آیا۔ان کو حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں، جسے راولپنڈی سازش کیس کہتے ہیں، گرفتار کر لیا گیا۔تقریباً پانچ سال انہوں نے پاکستان کی مختلف جیلوں میں گزارے۔آخر اپریل 1955 میں ان کی سزا معاف ہوئی۔ رہائی کے بعد وہ لندن چلے گئے۔1958 میں فیض پاکستان واپس آئے لیکن جیل خانہ ایک بار پھر ان کا منتظر تھا۔اسکندر مرزا کی حکومت نے کمیونسٹ مواد شائع اور تقسیم کرنے کے الزام میں ان کو پھر گرفتار کر لیا۔اس بار ان کو اپنے مداح ذوالفقار علی بھٹو کی کوششوں کے نتیجہ میں 1960 میں رہائی ملی اور وہ پہلے ماسکو اور پھر وہاں سے لندن چلے گئے۔1962 میں ان کو لینن امن انعام ملا۔

لینن انعام ملنے کے بعد فیض کی شہرت، جو ابھی تک ہندوستان اور پاکستان تک محدود تھی، ساری دنیا بالخصوص سوویت بلاک کے ممالک تک پھیل گئی۔ انھوں نے کثرت سے غیر ملکی

دورے کئے اور وہاں لیکچر دئے۔ان کی شاعری کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہونے لگے اور ان کی شاعری پر تحقیقی کام شروع ہوگیا۔جب فیض کو پاکستان میں رہنا مشکل تھا تو وہ بیروت پہنچ گئے۔وہاں وہ رسالہ "لوٹس" کے مدیر بنادئے گئے۔1982 میں،خرابی ءصحت اور لبنان جنگ کی وجہ سے فیض پاکستان واپس آ گئے وہ دمہ اور لو بلڈ پریشر کے مریض تھے۔1964 میں انھیں ادب کے نوبل انعام کے لئے نامزد کیا گیا تھا لیکن کسی فیصلہ سے پہلے 20 نومبر 1984 کو ان کا انتقال ہوگیا۔

فیض احمد فیض کی نظم نگاری

فیض احمد فیض بیک وقت رومانی اور انقلابی،کلاسیکی اور جدید شاعر ہیں۔ان کی شاعری کو رومان اور انقلاب کا حسین سنگم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ترقی پسند نظم کے نظریہ ءشاعری کے مطابق انہوں نے حب الوطنی اور اخوت ومحبت کے گیت گائے اور صدائے انقلاب بلند کی۔غریبوں اور مزدوروں کی حمایت میں نظمیں کہیں،لیکن ترقی پسند طریقہ ءاظہار کو اپنائے بغیر اپنے مخصوص طریقہ ءاظہار کو اہمیت دی اور اردو شاعری کو ایک نیا مزاج عطا کیا۔ان کے اسلوب بیان اور زبان کی سادگی،خودکلامی کا طریقہ کار،تشبیہات واستعارات اور دیگر صنعتوں کے فن کارانہ استعمال نے ان کی شاعری کو بے پناہ مقبولیت عطا کی۔

فیض کی نظموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔رومانوی اور سیاسی

فیض احمد فیض کا مزاج بنیادی طور پر رومانی ہے۔ان کی شاعری میں اس عنصر کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔وہ جہاں کہیں بھی رہے حقیقت اور رومان کے سنگم پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ان کی ابتدائی شاعری میں عشق ومحبت کے جذبات زیادہ پائے جاتے ہیں۔موضوع پرانا ہونے کے باوجود ان میں ایک نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔فیض احمد فیض 1938ء میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے تو ان کے اندر اچانک تبدیلی آئی۔چنانچہ فیض نے اس تحریک میں شامل ہوکر استحصال اور استعمار کے خلاف اپنی تخلیقی جوہر کو استعمال کیا۔

فیض احمد فیض ترقی پسند تحریک کے سب سے اہم شاعر ہیں۔انہوں نے ترقی پسند تحریک سے جڑے موضوعات یعنی سیاسی،سماجی اور معاشی مسائل پر بڑی عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔ان نظموں میں صبح آزادی،ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے،دو عشق،نثار میں تیری گلیوں پہ،ملاقات،زنداں کی ایک

صبح، زنداں کی ایک شام، طوق ودار کا موسم، اے دل بیتاب ٹھہر، مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ ،وغیرہ بہت نمایاں ہیں ان کے ابتدائی کلام میں ابہام پایا جاتا ہے لیکن جب ان کا سامنا حالات اور مسائل سے ہوا تو ظلم و جبر کو دیکھا تو ان کے کلام میں رومان کی فضا کم ہوئی اور حقیقت پسندی کا رجحان بڑھنے لگا۔انہوں نے اشتراکی اصولوں پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی، لیکن اشتراکیت کے پرچار کے بغیر انھوں نے فنی اور جمالیاتی اصولوں کو مدنظر رکھا۔فیض احمد فیض کی نظموں میں سماجی، اور سیاسی مسائل کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں اور ان کی عشقیہ شاعی مائل بہ پرواز نظر آتی ہے۔فیض نے عشقیہ واردات کو اپنے عہد کی سیاسی کشمکشوں اور سماجی مسائل سے اس طرح ہم آہنگ کر دیا کہ ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا۔

فیض احمد فیض کے یہاں غم جاناں اور غم دوراں دونوں آپس میں ملے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ان کا غم مایوسی نہیں بلکہ رجائی ہے۔

فیض احمد فیض کی شاعری میں ایک نئی بصیرت، نئی کیفیت، تازگی اور ایک نیا جوش اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے جس میں ایک تازہ ولولہ ہے جو انسان میں عزم، حوصلہ، تازہ فکر اور ایک رجائی کیفیت پیدا کرتی ہے۔

ہم پرورش لوح وقلم کرتے رہیں گے — دل پہ جو گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
اسبابِ غمِ عشق بہم کرتے رہیں گے — ویرانئ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے
مئے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخئ مئے سے — تزئین در و بام حرم کرتے رہیں گے

فیض کی شاعری میں سیاسی اور سماجی ناہمواریوں کا بیان ہونے کے باوجود ان کی نظمیں نعرہ بازی سے پاک ہیں ۔فیض کو اپنے وطن سے بے حد محبت تھی۔ ان کی نظموں میں حب الوطنی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔

فیض ہمارے ملک کے ایک نامور شاعر ہیں جن کے انقلاب کی گھن گرج ہر زمانے میں سنائی دیتی ہے۔فیض کے مختلف مجموعے کلام شائع ہوئے ہیں، جن میں نقش فریادی، دست صبا، زنداں نامہ ،دست تہ سنگ، سرِ وادیِ سینا، شام شہر یاریں، اور میرے دل میرے مسافر، شامل ہیں جن کو یکجا کر کے ایک کلیات ''نسخہ ہائے وفا'' کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔

فیض احمد فیض کی نظم ''لوح وقلم'' کا خلاصہ

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

مرکزی خیال:۔ اس شعر میں شاعر اپنی زبان بندی کے خلاف احتجاج کر رہا ہے۔

فیض نی یہ نظم اس وقت لکھی تھی جب کہ وہ حکومت کے خلاف لکھنے کی پاداش میں قید و بند اور زنجیر وسلاسل میں جکڑے ہوئے تھے۔ان کا کہنا ہے کہ حق گوئی ہماری فطرت میں شامل ہے۔ہمیں سچ بیان کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔کوئی ہماری زبان پر تالا نہیں لگا سکتا۔کیونکہ حق چھپانے سے نہیں چھپتا،حکومت وقت ہم پر ظلم و جبر کے پہاڑ توڑ سکتی ہے لیکن جب تک ہماری جان میں جان ہے ہم قلم وقرطاس کے ذریعہ حق گوئی کو ظاہر کرتے رہیں گے۔ہمارا قلم حق اور راست گوئی کے ذریعہ جذبات واحساسات کو پیش کرتا رہے گا۔

اسبابِ غمِ عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانیٔ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے

مرکزی خیال

اس شعر میں فیض کہتے ہیں کہ وہ دنیا میں پیامِ محبت عام کرتے رہیں گے۔

تشریح

فیض کہتے ہیں کہ یہ دنیا نفرت، کدورت،تعصب،فرقہ بندی اور انتشار کی تاریکیوں سے اندھیری ہو چکی ہے۔ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں اس زمیں میں بگاڑ پیدا ہو چکا ہے۔اس اندھیرے کو محبت، اتحاد و اتفاق اور حق وصداقت ہی دور کیا جا سکتا ہے۔ہم قاصد بن کر پیغامِ محبت کو عام کریں گے۔محبت کی روشنی سے اس کو منور کر دیں گے۔

یہ دنیا غم ومصیبت کا گہوارہ بن چکی ہے۔ہر طرف سناٹا اور وحشت چھائی ہوئی ہے۔ہماری سعی ہوگی کہ اس دنیا کی ویرانی کو اپنے عزو حوصلہ سے منور کریں۔

ہاں! تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں! اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے

مرکزی خیال

اس شعر میں فیض ظلم و جبر کے خلاف عزم و استقلال کا اظہار کر رہیں ہیں۔

تشریح

اس شعر میں فیض کہتے ہیں کہ ہم ایک مدت سے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہیں ہے اور ہم پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔ ہمیں پابندِ سلاسل کر کے ہمارے جسم کے ساتھ ساتھ ہمارے خیالات اور قلم کو بھی قید کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہم اس وقت تک تختۂ مشق بنے رہیں گے جب تک کوئی اور ستم کرنے کو باقی نہ رہے گا۔ لیکن ہم اس طوفانِ ستم کے سامنے تناور درخت کی طرح کھڑے رہیں گے اور آخر کار اس کا رخ موڑ دیں گے۔ یہ جسمانی اذیت راہِ حق سے ہمارے قدموں کو اکھاڑنے کے لئے کافی نہیں، ہر ظلم ہمارے عزم کو مزید تقویت بخشتا ہے۔

شاعر قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہے۔ اس لئے کہ اس نے حق و صداقت کا علم بلند کیا ہے۔ قلم کے ذریعے اپنے احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔

منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے

مرکزی خیال

اس شعر میں شاعر ظلم و ستم مٹانے کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کا عزم کر رہا ہے۔

تشریح

اس شعر میں فیض کہتے ہیں کہ ارباب اقتدار ہم پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں اور ہمیں تختہ مشق و ستم بنا رہیں ہیں۔ وہ ہماری زبان و بیان پر قفل لگانے کے لئے ہر قسم کی عقوبت ہم پر ڈھا رہے ہیں۔ لیکن یہ ہمارا عزم ہے کہ ہم ہر ستم برداشت کریں گے، ہم اس ظلم کے ہر تیر کو مردِ آہن کی طرح اپنے سینے پر سہہ لیں گے۔ اس وقت تک جب تک بس چلے گا۔ ہم اپنی قوم کی اس قدر تاریکی سے نکالنے کے لئے اپنے قلم کی روشنی پھیلائیں گے اور اپنی قوم کو اس کڑی دھوپ میں سایہ فراہم کریں گے۔

باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگِ لب و رخسار صنم کرتے رہیں گے

مرکزی خیال

اس شعر میں شاعر ظلم کے خاتمے کے لئے ہر قسم کے ایثار کے لیے تیار ہے۔

تشریح

اس شعر میں فیض طوفانِ ستم کے آگے سینہ سپر ہونے کا عزم کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب تک روح اس جسم کی قفس میں ہے اور جب تک اس جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے، جب تک شاخِ زندگی صفحۂ ہستی کے ساتھ لگی ہوئی ہے تب تک ہم اپنی قوم وملت کی خدمت کریں گے اور ہر ظلم کو برداشت کریں گے۔ ہم ایک ایسا انقلاب برپا کر دیں گے کہ سب آرام سے رہیں گے۔ ہم اپنے لہو سے اس پروانہ آزادی کو سینچیں گے۔

زندگی مقصد سے عبارت ہوتی ہے اور مقصد کے حصول کے لئے آدمی بڑی سے بڑی قربانی دیتا ہے اور بڑی سے بڑی تکلیف برداشت کرتا ہے۔

اک طرز، تغافل ہے سو وہ اُن کو مبارک
ایک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

مرکزی خیال

اس شعر میں شاعر اپنی اور اپنے محبوب کی عادت کا ذکر کر رہا ہے۔

تشریح

اس شعر میں فیض کہتے ہیں کہ ہم اپنے محبوب سے کئی بار اظہارِ عشق کر چکے ہیں لیکن وہ ہمیشہ ہمارے دل کو کچل دیا ہے۔ ہم نے کئی مرتبہ اس کے سامنے اپنے دل کو کھول دیا لیکن اس نے ہر بار نفرت کے تیر سے ہمارے دل کو زخمی کر دیا ہے۔ یہ بے توجہی اور بے نیازی اس کی عادت ہی ہے۔ لیکن ہم امید کا دامن نہیں چھوڑیں گے۔ اس کی کرم نوازیوں کے حامل ہوں گے۔ ہم اپنی فطرت کے مطابق دوستی کا بھرم بھرتے رہیں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم جب اس کی طرف مدد بھری نظروں سے دیکھیں گے وہ نفرت سے منہ پھیر لے گا۔ لیکن ہم اس کی محبت کے دعوے دار رہیں گے اور اس کی زلف کے اسیر رہیں گے۔

محبوب کی عادت ہوتی ہے کہ وہ تغافل برتتا ہے۔ بے رخی اختیار کرتا ہے۔ ہماری خواہشات کا اسے علم ہوتا ہے لیکن وہ اس کے باوجود توجہ نہیں دیتا اور یہ اس کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اس انداز کو جانتے ہوئی بھی عرضِ تمنا کرتا رہتا ہے۔ اس امید پر کہ شاید کبھی تو اس کی تمنا پوری ہوگی اور مقصد بر آئے گا۔

پہلا سمسٹر۔نمونہ پرچہءسوالات

MODEL QUESTION PAPER - SECOND LANGUAGE -URDU
B.A.,/B.Com.,/B.Sc., SEMESTER - I : PAPER -I URDU
POETRY

Time : 3hrs Max Marks :75

Part -A

نوٹ:۔درج ذیل اشعار میں کسی پانچ (5) کی بحوالہءشاعرتشریح کیجیے۔ (5X5 :25)

1۔ راہِ دورِعشق میں روتا ہے کیا آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

2۔ قافلے میں صبح کے اک شور ہے یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا

3۔ جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

4۔ وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

5۔ جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومن مبتلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

6۔ دنیا میں آدمی کو مصیبت کہاں نہیں وہ کونسی زمیں ہے جہاں آسمان نہیں

7۔ اے موت! تو نے دیر لگائی ہے کس لیے
عاشق کا امتحان ہے، تیرا امتحان نہیں

8۔ کام ادھورا اور آزادی نام بڑے اور تھوڑے درشن

9۔ ہم پرورش لوح وقلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

10۔ پھول کھلے ہیں گلشن گلشن لیکن، اپنا اپنا دامن

Part -B

درج ذیل سوالات تفصیل سے لکھیے۔ (5x10:50)

(تمام جوابات لازمی ہیں)

11۔ میر تقی میر کی سوانح حیات پر روشنی ڈالیے؟

یا

میر تقی میر کی غزل گوئی پر اظہار خیال کیجئے؟

12۔ نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری پر اظہار خیال کیجئے؟

یا

نظیر اکبر آبادی کی نظم ''کل جگ'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے؟

13۔ غالب کی سوانح حیات پر روشنی ڈالیے؟

یا

غالب کی غزل گوئی کی خصوصیات لکھیے؟

14۔ علامہ شبلی نعمانی کی سوانح حیات پر روشنی ڈالیے

یا

نظم ''عدل فاروقی'' کا خلاصہ لکھیے؟

15۔ مومن خان مومن کی سوانح حیات پر روشنی ڈالیے؟

یا

مومن خان مومن کی غزل گوئی پر اظہار خیال کیجیے؟

دوسرا سمسٹر

اردو شاعری

فہرست مضامین

UNIT-I

مثنوی سحر البیان (آغاز داستان)

UNIT-II

مرثیہ میر انیس (جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے)

UNIT-III

قصیدۂ غالب (در مدح بہادر شاہ ظفر)

UNIT- IV

رباعیات

امجد حیدر آبادی کی رباعی

ساغر جیدی کی رباعی

UNIT- V

امجد حیدر آبادی کی سوانح حیات

ساغر جیدی کی کی سوانح حیات

دوسرا سمسٹر۔نمونہء پرچہء سوالات

مثنوی سحر البیان

آغاز داستان

کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ — کہ تھا وہ شہنشاہ گیتی پناہ
رعیت تھی آسودہ و بے خطر — نہ غم مفلسی کا ،نہ چوری کا ڈر
کسی طرف سے وہ نہ رکھتا تھا غم — مگر ایک اولاد کا تھا الم
اسی بات کا اس کے تھا دل پہ داغ — نہ رکھتا تھا وہ اپنے گھر کا چراغ
وزیروں کو اک روزاس نے بلا — جو کچھ دل کا احوال تھا ،سو کہا
کہ میں کیا کروں گا یہ مال و منال — فقیری کا ہے میرے دل کو خیال
فقیر اب نہ ہوں تو کروں کیا علاج — نہ پیدا ہوا وارث تخت و تاج
جوانی مری ہو گئی سب بسر — نمودار پیری ہوئی سر بسر
بہت ملک پر جان کھویا کیا — بہت فکر دنیامیں رو یا کیا
وزیروں نے کی عرض کہ بجایاآفتاب — نہ ہو تجھ کو ذرہ کبھی اضطراب
فقیری جو کیجئے ،تودنیا کے ساتھ — نہیں خوب ،جانا ادھر خالی ہاتھ
کرو سلطنت لے کے اعمال نیک — کہ تا دو جہاں میں رہے حال نیک
یہ دنیا جو ہے مزرع آخرت — فقیری میں ضائع کر واس کو مت
عبادت سے اس کشت کو آب د و — وہاں جا کے خرمن ہی تیار لو
رکھو یا د عدل وسخاوت کی بات — کہ اس فیض سے ہے تمھاری نجات
مگر ہاں ،یہ اولاد کا ہے جو غم — سو اس کا تردد بھی کرتے ہیں ہم
عجب کیا کہ ہووے تمھارے خلف — کرو تم نہ اوقات اپنی تلف
نہ لاؤ کبھی یاس کی گفتگو — کہ قرآن میں آیا ہے لا تقنطوا

مثنوی کا تعارف

مثنوی کا لفظ مثنیٰ سے مشتق ہے جس کے معنی دو دو کے یا دو دو علاحدہ کرنے کے ہیں۔

شعری اصطلاح میں مثنوی اس کلام کو کہتے ہیں جس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور ہر شعر کا قافیہ بقیہ اشعار کے قافیے سے مختلف ہوتا ہے البتہ مثنوی کے تمام اشعار ایک ہی بحر میں ہوتے ہیں۔

مثنوی اردو شاعری کی ایک بیانیہ اور توضیحی صنف ہے اس میں شاعر اپنے کسی خیال یا مقصد کو یا تو راست طور پر بیانیہ انداز میں نظم کر دیتا ہے یا کسی داستان یا قصے کے روپ میں پیش کرتا ہے۔

سیدھے سادے بیانیہ انداز میں قلمبند کی جانے والی مثنویاں اکثر کسی مخصوص موضوع پر لکھی جاتی ہیں۔ایسی مثنویاں عموماً مختصر ہوتی ہیں۔مثنوی میں سب سے پہلے ''حمد'' لکھی جاتی ہے۔پھر نعت رسول، منقبت اور اس کے بعد ''مدح فرماں روائے وقت'' کے عنوان سے اپنے زمانے کے بادشاہ یا کسی وزیر یا رئیس کی تعریف بیان کی جاتی ہے بعد میں شاعر کبھی کبھی ''تعریف سخن'' کا حصہ بھی شامل کرتا ہے جس میں سخن کی اہمیت اور اپنی فنکاری کی مدح و توصیف کرتا ہے اس کے علاوہ کبھی کبھی اپنے خاندان، اپنی جائے پیدائش، تاریخ ولادت وغیرہ بیان کرتا ہے۔اس کے علاوہ سبب تصنیف کے عنوان سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔مثنوی کی ترتیب اس طرح ہے۔حمد، نعت، منقبت، مناجات، مدح بادشاہ/ امراء، تعریف سخن یا تعریف خامہ، سبب تالیف، اصل قصہ، اختتام،

مثنوی میں قصہ گوئی کے تمام اجزائے ترکیبی اس طرح ہیں۔

پلاٹ، کردار نگاری، جذبات نگاری، سراپا نگاری، مکالمہ نگاری، منظر نگاری، جزئیات نگاری۔جن کی تفصیل اس طرح ہے۔

پلاٹ:

کسی بھی کہانی میں واقعات کی ترتیب کو پلاٹ کہا جاتا ہے۔عموماً مثنویوں کے پلاٹ سادہ

ہوتے ہیں اور قصہ ابتدا اور ارتقا کی منزلوں سے گزرتا ہوا اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔

کردار نگاری:

کردار کہانی کا اہم حصہ ہوتے ہیں ۔اردو مثنویوں کے قصوں میں عام طور پر بادشاہ ،شہزادے،شہزادیاں،وزیرزادے،مامائیں،کنیزیں،جادہ گر،نجومی اور دیو جن اور پری جیسے کردار ملتے ہیں۔قدیم مثنویوں میں فوق الفطری کردار جیسے دیو،بھوت اور پری کے کردار بھی ملتے ہیں۔

جذبات نگاری:

مثنوی نگار کرداروں کے جذبات کی تمام باریکیوں کو اپنے پیش نظر رکھتا ہے ۔جب وہ کرداروں کی جذبات نگاری کرتا ہے تو صداقت اور حقیقت پسندی سے کام لے کر کرداروں کے حسب مراتب ان کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔

مکالمہ نگاری:

کرداروں کی باہمی بات چیت کو مکالمہ نگاری کہتے ہیں۔مکالمہ نگاری داستانوی مثنویوں کی کامیابی کا ایک اہم پہلو ہے۔مکالمہ نگار کرداروں کی باہمی بات چیت کو جاندار مکالموں کی صورت میں پیش کرتا ہے۔

محاکات نگاری:

محاکات نگاری کسی چیز کے ایسے بیان کو کہا جاتا ہے جسے پڑھ کر اس کا جیتا جاگتا نقشہ آنکھوں میں پھر جائے۔اردو کی مشہور مثنویوں میں محاکات نگاری کی عمدہ مثالیں مل جاتی ہیں۔

منظر نگاری:۔کسی قدرتی منظر یا واقعہ کے خارجی ماحول اور مادی عناصر کی آئینہ داری کو منظر کشی کہا جاتا ہے۔

مثنوی کو موضوع کے اعتبار سے ہم رزمیہ ،عشقیہ،تاریخی ،اخلاقی ،معاشرتی ،مذہبی اور تصوفانہ جیسے اقسام میں شمار کر سکتے ہیں۔

اردو مثنوی کا آغاز وارتقا

دکن میں اردو مثنوی کا باضابطہ آغاز بہمنی عہد سے ہوتا ہے۔اس دور کا ایک مشہور شاعر فخر الدین نظامی بیدری کی مثنوی،، کدم راؤ پدم راؤ،، ہے جس کا سن تصنیف 1421ء تا 1434ء ہے۔اس مثنوی میں فارسی بحر میں ہندوی زبان میں ایک عشقیہ قصہ بیان کیا گیا ہے۔اسی عہد کی ایک اور اہم مثنوی اشرف بیابانی کی،،نوسرہا،، ہے۔میراں جی شمس العشاق بہمنی عہد کی ایک ممتاز شخصیت ہیں۔ جنہوں نے اسرار ورموز ومعرفت کو اپنی منظومات کا موضوع بنایا اور،، خوش نامہ،خوش نغز،شہادت التحقیق،مغز مرغوب،اور،، چہار شہادت،، یہ سب منظومات مثنوی کی ہیئت میں لکھی ہیں۔

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد 5 سلطنتیں وجود میں آئیں۔

ان میں عادل شاہی اور قطب شاہی خاندانوں نے اردو زبان کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

بیجاپور کی اولین شعری کاوشوں میں برہان الدین جانم کی منظومات آتی ہیں۔جن میں منفعت الایمان،وصیت الہادی،اور ارشاد نامہ اہم ہیں۔

ابراہیم عادل شاہ کے دور کا ایک اہم شاعر مقیمی ہے جس کی مثنوی، چندر بدن ومہیار،، بیجاپور کی پہلی عشقیہ مثنوی ہے۔

کمال خاں رستمی کا،،خاور نامہ،،اور ملک خوشنود کی ہشت بہشت اور، جنت سنگار مثنویاں بھی اہم ہے۔علی عادل شاہ ثانی کے درباری شاعر نصرتی کی مثنویاں درج ذیل ہیں۔

گلشن عشق (عشقیہ) ہے اور علی نامہ اور تاریخ اسکندری (یہ دونوں رزمیہ ہیں)۔

قطب شاہی عہد میں مثنوی

محمد قلی قطب شاہ کا درباری شاعر ملا وجہی نے ایک عشقیہ مثنوی،، قطب مشتری،،لکھی جسے لافانی شہرت ملی۔اسی دور کا ایک اور شاعر غواصی ہے جس کی تین مثنویاں، مینا ستونتی،سیف الملوک و بدیع الجمال،اور، طوطی نامہ بہت مشہور ہیں۔ابن نشاطی کی مثنوی،، پھول بن،،بھی اس دور کی ایک اہم مثنوی ہے۔جب ولی دکنی دلی پہنچے تو وہاں بھی مثنویاں لکھی گئیں۔افضل کی،، بکٹ کہانی،،کو شمالی ہند کی پہلی مستند مثنوی مانا جاتا ہے۔شمالی ہند کے مشہور مثنوی نگاروں میں میر تقی میر، میر حسن اور نسیم ہیں۔

1۔ میر تقی میر کی مثنوی ''دریائے عشق اور بیجو در خانہ ءخود'' مشہور ہیں

2۔ میر حسن کی ''سحر البیان'' کافی مشہور ہوئی

3۔ پنڈت دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم بھی اپنی مثال آپ ہے۔

نواب مرزا شوق کی مثنویوں کے نام: فریب عشق، بہار عشق، زہر عشق

کلیات مومن میں کل 12 مثنویاں ہیں۔،،قول غمگین،،*مومن کی سب سے اچھی مثنوی ہے جو کہ عشقیہ ہے۔سرسید اور حالی کی کوششوں سے اردو مثنوی میں تبدیلی آئی۔طویل مثنوی کا رجحان بدلنے لگا اور مختصر مثنوی نگاری کا رواج ہوا۔محمد حسین آزاد کی مشہور مثنوی،، شب قدر،، حالی کی برکھارت،شبلی کی صبح امید،اور سماعیل میرٹھی کی چھوٹی چھوٹی مثنویاں اہمیت رکھتی ہیں حفیظ جالندھری کے شاہنامہء اسلام اور اقبال کا ساقی نامہ علی سردار جعفری کی مثنوی جمہور اس دور کی بہترین مثنویاں ہیں۔موجودہ دور تک آتے آتے مثنوی نگاری کی روایت ماند پڑ گئی ہے جو قابل تشویش امر ہے۔

میر حسن کی سوانح حیات

میر حسن کے جد اعلی عہد شاہجہانی کے اواخر میں ہرات سے آ کر دہلی میں بس گئے تھے۔یہیں 1727ء میں میر حسن پیدا ہوئے۔ان کے والد میر ضاحک شاعر تھے۔میر حسن نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی والد سے حاصل کی۔شعر و شاعری کا شوق لڑکپن سے تھا وہ خواجہ میر درد کی صحبت میں رہنے لگے اور وہی شاعری میں ان کے پہلے استاد تھے۔جس زمانہ میں میر حسن نے جوانی میں قدم رکھا وہ دہلی اور دہلی والوں کے لئے سخت آزمائش کا زمانہ تھا۔معاشی حالات ابتر تھے اور ہر طرف لوٹ مار مچی ہوئی تھی۔اکثر شرفاء جان و مال کی حفاظت کے لئے دہلی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔سودا، میر تقی میر، جرأت، سوز سب دہلی چھوڑ کر اودھ کا رخ کر چکے تھے۔میر ضاحک نے بھی اہل وعیال کے ساتھ دہلی کو خیر باد کہا۔میر حسن کو دہلی چھوڑنے کا بہت غم ہوا۔میر حسن خاصے رنگین مزاج اور حسن پرست تھے۔فیض آباد جاتے ہوئے وہ لکھنؤ میں ٹھہرے اس وقت لکھنؤ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جو ان کو بالکل پسند نہیں آیا اور اس کی ہجو کہہ ڈالی۔لکھنؤ کی یہ ہجو ان کو بہت مہنگی ثابت ہوئی ۔کیوں کہ یہ آصف الدولہ کے خوابوں کا لکھنو تھا جسے وہ رشک شاہجہاں آباد بنانے پر تلے تھے۔ان کو سخت ناگوار گزرا۔بہر حال میر حسن دہلی سے فیض آباد پہنچے اور پہلے آصف الدولہ کے ماموں سالار جنگ اور پھر ان کے بیٹے سردار جنگ مرزا نوازش علی خان کے ملازم ہو گئے۔1770ء میں جب

آصف الدولہ نے لکھنو کو پایہء تخت بنالیا تو سالار جنگ بھی اپنے متعلقین کے ساتھ لکھنو منتقل ہو گئے جن کے ساتھ میر حسن کو بھی جانا پڑا۔لیکن لکھنؤ میں آصف الدولہ کی ناراضگی کی وجہ سے ان پر عرصہء حیات تنگ تھا۔انہوں نے مثنوی سحر البیان نواب کو راضی کرنے کیلئے ہی لکھی تھی۔جس کے ساتھ ایک قصیدہ بھی تھا اور نواب سے معافی طلب کی تھی۔لیکن نواب صاحب نے چند انعام واکرام پر اکتفا کر کے میر حسن کو واپس کر دیا اس طرح وہ نواب صاحب کے لطف واکرام سے محروم ہو گیے۔میر حسن کی مثنوی سحر البیان کو گرچہ کہ نواب صاحب کی نظر عنایت نصیب نہ ہوئی لیکن زمانہ نے اس کی اس قدر تحسین وتوصیف کی کہ آج تک اس کی قدر ومنزلت میں کوئی کمی نہیں آئی۔اس واقعہ کے ڈیڑھ دو سال بعد 1786ء میں میر حسن کا انتقال ہو گیا۔

مثنوی سحر البیان کی ادبی اہمیت

''سحر البیان'' اردو کی ان زندہ وجاوید مثنویوں میں سے ایک ہے جو ہر زمانے میں عوام اور خواص میں یکساں طور پر مقبول رہی ہیں۔اس مثنوی میں وہ تمام فنی محاسن اور ادبی خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھی مثنوی کے لیے ضروری ہیں۔اس لیے ''سحر البیان'' ایک مقبول مثنوی ہے۔میر حسنؔ نے کئی مثنویاں لکھی ہیں لیکن سحر البیان کی بات کسی میں نہیں ہے،خود اس مثنوی کے بارے میں کہتے ہیں۔

نہیں مثنوی ہے یہ اک پھُل جڑی
مسلسل ہے موتی کی گویا لڑی
نئ طرز ہے اور نئ ہے زبان
نہیں مثنوی ہے یہ ''سحر البیان''

مثنوی سحر البیان کے گوناگوں خصوصیات میں سے چند کا بیان ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

میر حسنؔ نے اس مثنوی میں ہندوستانی معاشرت کی بہترین عکاسی کی ہے۔مثلاً شادی بیاہ کی رسومات کا کیسا دل کش نقشہ کھینچا ہے۔

لفظی تصویر کشی شعری خوبیوں میں ایک بڑی خوبی ہے۔''سحر البیان'' کا ایک بڑا کمال اس کی تصویر کشی ہے۔میر حسنؔ نے جس منظر اور جس حالت کا جہاں بھی نقشہ کھینچا۔تصویر کشی کا حق ادا کر دیا۔

سحر البیان میں مکالمہ نگاری نہایت فطری انداز میں موجود ہے چوں کہ میر حسنؔ کے تجربات وسیع تھے انھوں نے مختلف طبقے کے لوگوں میں زندگی بسر کی تھی اس لیے ان کو مختلف لوگوں کی زبان سمجھنے کا موقع ملا۔

تشبیہات یا استعارے جہاں کلام میں چاشنی پیدے کرتے ہیں وہیں بلاغت وفصاحت میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ قاری تشبیہات واستعارات سی محظوظ ہوتا ہے۔ میر حسنؔ کے ہاں حسین تشبیہات کے خزانے موجود ہیں۔

''سحر البیان'' کے بعض اشعار اس قدر رواں ہیں کہ وہ ضرب المثال بن گئے ہیں یہ مثنوی کی سادگی وسلامت کا ثبوت ہے مثلاً:

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
کسی پاس یہ دولت رہتی نہیں سدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں

سحر البیان کی زبان میں صفائی شستگی اور روانی ہے یہ زبان میرؔ وسوداؔ کی زبان کی طرح صاف نظر آتی ہے۔ میر حسنؔ کو جذبات نگاری میں کمال فن حاصل ہے۔ وہ انسانی جذبات کی خوب ترجمانی کرتے ہیں نیز انسانی جذبات کو لفظوں میں سمو دیتے ہیں۔

میر حسنؔ نے بہت جان دار کردار استعمال کیے ہیں۔ اس میں مردانہ کردار اور نسوانی کردار، دونوں طرح کے کرداروں کا حسین امتزاج ہے۔ مردانہ کرداروں میں بے نظیر کا باپ، بے نظیر، فیروز شاہ، مسعود شاہ کے علاوہ ضمنی مردانہ کردار مثلاً نجومی اور رومال وغیرہ ہیں اسی طرح نسوانی کرداروں میں بدر منیر، نجم النسا، ماررخ کے علاوہ محل کی لونڈیاں، خواصیں بھی شامل ہیں۔ سحر البیان کی زبان صاف ستھری، رواں اور شستہ ہے جو اس دور کی نہایت معیاری زبان ہے۔ سحر البیان انہی خصوصیات کی وجہ سے ہمیشہ اردو زبان وادب میں اپنا ایک اہم مقام رکھتی ہے۔

مثنوی سحر البیان کا قصہ

کسی ملک میں ایک بادشاہ تھا جو اپنی منصف مزاجی کی وجہ سے رعایا میں ہر دلعزیز تھا۔ بادشاہ کو تمام نعمتیں میسر تھیں مگر اولاد کی نعمت سے محرومی اس کی زندگی کی سب سے بڑی محرومی تھی۔ اس

محرومی و مایوسی کے عالم میں بادشاہ دنیا ترک کر دینے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ وزیروں کے مشورے پر وہ سردست اس فیصلے پر عمل نہیں کرتا ہے۔ شاہی نجومی بادشاہ کے ہاں چاند سے بچے کی پیدائش کی خوشخبری دیتے ہیں۔ لیکن اس کی سلامتی و زندگی میں چند خطروں کی نشان دہی کرتے ہوئے احتیاط کی تلقین کرتے ہیں کہ 12 سال کی عمر تک اسے محل کے اندر رکھا جائے اور رات کھلے آسمان تلے سونے نہ دیا جائے کچھ عرصے بعد واقعی بادشاہ کے ہاں لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ اس کا نام اس کی خوبصورتی اور مردانہ وجاہت کے پیش نظر ''بے نظیر'' رکھا جاتا ہے۔ تمام شاہی تکلفات اور ناز و نعم کے ساتھ 12 سال تک اسے محل کے اندر رکھا جاتا ہے۔ مگر سال کے آخری دن جب اس کی عمر بادشاہ کے حساب سے پورے بارہ سال ہوگئی تھی (حالانکہ اتفاق سے ایک دن کم تھا) وہ رات کو ضد کر کے چھت پر سو جاتا ہے۔ آدھی رات کے قریب ماہ رخ پری کا گزر وہاں سے ہوتا ہے۔ اسے سوتے ہوئے دیکھ کر اس پر عاشق ہو جاتی ہے۔ اور اپنے ساتھ پرستان میں لے جاتی ہے۔ شہزادے کی گم شدگی پر صبح محل میں قیامت کا منظر برپا ہو جاتا ہے۔ بڑی تلاش کی گئی مگر شہزادے کو نہ ملنا تھا نہ ملا۔ شہزادہ اداس، ملول اور پریشان رہتا ہے۔ اس پریشانی کو دور کرنے کے لئے ماہ رخ پری اسے کل کا گھوڑا دیتی ہے۔ اس گھوڑے پر شہزادہ سیر کرتا پھرتا اور دل بہلاتا رہتا ہے۔ ایک مرتبہ وہ سیر کرتا ایک باغ میں اترتا ہے تو وہاں ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی کو دیکھتا ہے جس کا نام بدر منیر ہوتا ہے۔ جب وہ شہزادہ کو دیکھتی ہے تو اس پر عاشق ہو جاتی ہے، شہزادہ بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے۔ دونوں ہر دن اس باغ میں ملتے اور باتیں کرتے۔ ایک دن ماہ رخ پری دونوں کو دیکھ لیتی ہے۔ تو وہ انتہائی غضبناک ہو کر شہزادے کو واپس آنے پر کوہ قاف کے اندھے کنویں میں بند کر دیتی ہے۔ بدر منیر کا عجب حال ہے اس کی راز دار سہیلی وزیر زادی نجم النساء اس کی تلاش میں نکلتی ہے۔ اور آخر کار بڑی مشکلوں سے جنوں کے بادشاہ کے بیٹے فیروز شاہ کی مدد سے بے نظر کو رہائی دلاتی ہے۔ بے نظیر اور بدر منیر دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ اس طرح اس مثنوی کا انجام خوشی پر ہوتا ہے۔

UNIT-II

مرثیہ میر انیس ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے''

پہلا بند

جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے
جلوہ کیا سحر کے رخ بے حجا ب نے
دیکھا سوئے فلک شہ گردوں رکا ب نے
مڑ کر صدا رفیقوں کو دی اس جناب نے
آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو
اٹھو فریضہء سحری کو ادا کرو

دوسرا بند

ہاں غازیو یہ دن ہے جدا ل و قتال کا
یاں خوں بہے گا آج محمد کی آل کا
چہرہ خوشی سے سرخ ہے زہرا کے لال کا
گزری شب فراق دن آیا وصال کا
ہم وہ ہیں غم کریں گے ملک جن کے واسطے
راتیں تڑپ کے کاٹی ہیں اس دن کے واسطے

تیسرا بند

یہ صبح ہے وہ صبح مبارک ہے جس کی شام
یاں سے ہوا جو کوچ تو ہے خلد میں مقام
کوثر پہ آبرو سے پہونچ جائیں تشنہ گام
لکھے خدا نماز گزاروں میں سب کے نام

سب ہیں وحید عصر یہ غل چار سو اٹھے
دنیا سے جو شہید اٹھے سر خرو اٹھے

چوتھا بند

یہ سن کے بستروں سے اٹھے وہ خدا شناس
اک اک نے زیب جسم کیا فاخرہ لباس
شانے محاسنوں میں کیے سب نے بے ہراس
باندھے عمامہ آئے امام زماں کے پاس
رنگیں عبائیں دوش پہ کمریں کسے ہوئے
مشک و زبادو عطر میں کپڑے بسے ہوئے

پانچواں بند

سو کھے لبوں پہ حمد الٰہی رخوں پہ نور
خوف و ہراس رنج و کدورت دلوں سے دور
فیاض حق شناس اولو العزم ذی شعور
خوش فکر و بزلہ سنج و ہنر پرور و غیور
کانوں کو حسن صوت سے حظ بر ملے
باتوں میں وہ نمک کہ دلوں کو مزا ملے

چھٹا بند

ساونت برد بار فلک مرتبت دلیر
عالی منش سبا میں سلیماں وغا میں شیر
گردان دہر ان کی زبردستیوں سے زیر
فاقے سے تین دن کے مگر زندگی سے سیر
دنیا کو ہیچ پوچ سراپا سمجھتے ہیں
دریا دلی سے بحر کو قطرہ سمجھتے ہیں

مرثیہ کا تعارف اور فن

مرثیہ عربی زبان کا لفظ رثا سے نکلا ہے۔ رثا ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی مرنے والی کی تعریف کی گئی ہو۔ اصطلاحاً اردو مرثیہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے جس میں واقعات کربلا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے خانوادے کی شہادت کے واقعات بیان کئے گئے ہوں۔ اردو میں ذاتی مرثیے بھی لکھے گئے جن کو شخصی مرثیہ کہا جاتا ہے، جیسے حالی کا مرثیہ غالب اور اقبال کا مرثیہ داغ وغیرہ۔

مرثیہ کا فن

مسدس، مرثیے کی انتہائی ترقی یافتہ شکل ہے۔ ابتداء میں مرثیہ دو بیتی، مثلث، مربع اور مخمس میں بھی لکھا گیا۔ مرثیہ کے لیے مختلف ہیئت کا استعمال کیا گیا، لیکن انیس اور دبیر کے مرثیوں کی مقبولیت کی وجہ سے مسدس کے فارم کو مرثیہ سے مخصوص سمجھا جانے لگا ہے۔

مرثیہ کی تہذیبی اور تمدنی اہمیت کے علاوہ اس کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مرثیہ کی مقبولیت کا راز جہاں مذہب سے وابستگی ہے وہیں تہذیبی اخلاقی اور ادبی محاسن میں بھی مضمر ہے۔ اس کی مقبولیت کے کئی اسباب ہیں جن میں سے زیادہ مؤثر اور مقبول عام سبب مرثیہ کی جذباتی اور مذہبی نوعیت ہے۔ انیس و دبیر نے اپنی بے پناہ تخلیقی قوت سے مرثیہ کو اعلیٰ و عظیم شاعری کی صف میں لا کھڑا کیا ہے جس کی مثال عالمی ادب میں بھی نہیں مل سکتی۔ ان ہی مرثیہ نگاروں نے انسانی رشتوں، جذبات و احساسات کی آفاقیت، جمالی اقدار اور شعر کے جملہ محاسن کو پیش نظر رکھا، جس کی وجہ سے ادبی ذوق کی بھی تسکین ہوتی ہے۔

مرثیے کے اجزائے ترکیبی

مرثیہ کے موجودہ اجزائے ترکیبی میر ضمیر نے متعین کئے جن کی پابندی کی جاتی ہے۔ کبھی کبھی ان سے گریز بھی کیا گیا ہے۔ مرثیہ چونکہ واقعات کربلا پر مبنی ہے اس لئے اس میں واقعات کربلا کی تفصیل بیان ہوتی ہے۔ مثلاً جاں نثارانِ حسین اور خانوادہ ءحسین کی سیرت وشخصیت، کردار، جذبات، احساسات، اعزہ سے رخصتی، فدائیانِ حسین کی آمد، آلات حرب، جنگ کا منظر، گھوڑوں کی تیزی، تلواروں و نیزوں کی چمک دمک، فرات کے کناروں دشمنوں کے پہرے، پیاسوں کی شہادت اور پھر ان کی زخم خوردہ لاشوں پر بین و بکا وغیرہ۔ ان واقعات و بیانات میں ایک منطقی ربط و تسلسل قائم رکھنے کی خاطر مرثیے کے لئے آٹھ اجزائے ترکیبی وضع کئے گئے:

(1) چہرہ (2) سراپا (3) رخصت (4) آمد (5) رجز (6) جنگ (7) شہادت (8) بین۔

چہرہ

مرثیے میں چہرہ، قصیدہ کی تشبیب کی طرح ہوتا ہے جس میں شاعر حمد، نعت، منقبت حضرت علیؓ و امام حسینؓ کے علاوہ مکہ سے سفر، سفر کے پرخطر حالات اور موسم کا بیان ہوتا ہے۔ موسم کے بیان میں گرمی کی شدت، صبح کا منظر، چڑیوں کی چہچہاہٹ، دیگر مناظر فطرت وغیرہ کا بیان ہوتا ہے۔

سراپا

سراپا میں امام حسین کے جانبازوں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی لشکر یزید کے ساتھیوں کا بھی سراپا لکھا گیا ہے۔ سراپا لکھنے میں شاعر اپنا زور قلم صرف کر دیتا ہے، جس سے شاعر کی اپنی محبت وعقیدت کا بھرپور اظہار ہوتا ہے تو دوسری طرف باطل سے تنفر کا احساس ہوتا ہے۔

رخصت

میدان جنگ میں جانے کے لئے خیمہ حسین سے ایک بعد دیگرے جانباز، سر پر کفن باندھ کر نکلتے ہیں تو خیمے میں رہنے والے، متعلقین اور مستورات انہیں دل تھام کر، اشک بار مگر بھرپور قوت ایمانی کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔ اہل خیمہ کو یقین ہے کہ یہ اب زندہ واپس نہیں آئیں گے۔ اس موقع پر وداع کرنے والے عزیزوں اور پیاروں کے جذبات محبت اور قوت ایمانی کے جو مرقعے

مرثیوں میں کھینچے گئے ہیں وہ پڑھنے کے لائق ہیں۔

آمد

میدان جنگ میں آمد کا منظر زیادہ طویل نہیں ہوتا۔ یہ بندرخصت اور رجز سے جڑا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی آمد کے موقع پر گھوڑے کی تعریف بھی کی جاتی ہے۔

رجز

عربوں میں رواج تھا کہ دو حریف جب میدان جنگ میں آمنے سامنے ہوتے تو جنگ شروع ہونے سے قبل ایک دوسرے کو للکارتے، اپنی اور اپنے آبا و اجداد کی شجاعت، طاقت اور خاندانی عظمت، دینداری وقوت ایمانی وغیرہ کا ذکر کرتے تھے، اسی کو ''رجز'' کہتے ہیں۔

جنگ

یہ مرثیے کا نہایت ہی اہم حصہ ہوتا ہے جس میں شاعر میدان جنگ کی تیاری، فوجوں کے ساز وسامان، گھوڑوں کی تعریف، ان کا غیض وغضب، براق کی سی تیز رفتاری، تلواروں کی چمک، نیزوں کی کڑک، سپاہیوں کی پھرتی، بے جگری سے لڑائی، جاں توڑ مقابلہ وغیرہ، کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔

شہادت

اس حصہ میں حسینی فوج کی بہادری، فن سپاہ گری اور زخموں سے چور نڈھال ہوکر گر جانے اور شہادت پانے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ مرثیہ کا بڑا دلدوز حصہ ہوتا ہے۔

مرثیہ کا آخری جزو بین ہوتا ہے، جس میں مجاہد کی شہادت اور لاش کو خیمے میں لانے، خواتین کے رنج والم اور بین وبکا کے جذبات کی عکاسی کی جاتی ہے۔ یہی دراصل مرثیے کا مقصد ومنشاء ہوتا ہے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ اس حصے کو اتنا پر اثر اور جاندار بنادے کہ مجلس برپا ہوجائے۔

اردو میں مرثیہ نگاری کا آغاز وارتقا

اردو میں مرثیہ کی صنف بہت مقبول رہی ہے۔ اردو مرثیہ دکن کے صوفائے کرام کی سرپرستی میں پروان چڑھا۔ اشرف بیابانی کی نوسرہار (1503ء) کو مرثیہ کا نقطۂ آغاز سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد شاہ برہان الدین جانم اور شاہ راجو نے بھی مرثیے لکھے۔ محمد قلی قطب شاہ، غواصی اور وجہی کے

یہاں بھی مرثیے ملتے ہیں۔شمالی ہند میں مرثیہ نگاری کا آغاز روشن علی کے ''عاشور نامے'' سے ہوتا ہے۔اس کے بعد فضل علی کی ''کربل کتھا'' کا نام آتا ہے جو نثر میں ہے۔شمالی ہند کے مرثیہ نگاروں میں مسکین، محب، یکرنگ اور قائم وغیرہ نے بھی مرثے لکھے۔محمد رفیع سودا نے اردو مرثیہ کو مسدس کی ہیئت عطا کی۔ اٹھارویں صدی میں لکھے جانے والے مرثیے اپنے ارتقاء کے ابتدائی مراحل کی نشاندہی کرتے ہیں۔

انیسویں صدی کا آغاز مرثیہ کی ترقی کی نوید لاتا ہے، اس زمانے میں جن لوگوں نے مرثیے لکھے ان میں دلگیر، فصیح، خلیق اور ضمیر کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔میر محمد تقی میر اور سودا نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی لیکن ان کے مراثی کو وہ کمال حاصل نہ ہوا جو لکھنؤ کے مرثیہ نگاروں کو حاصل تھا۔

لکھنؤ میں مرثیہ کو عروج حاصل ہوا۔میر ضمیر، دلگیر اور میر خلیق کے علاوہ افسردہ، ناظم وغیرہ کے نام مرثیے کے ضمن میں اہم ہیں۔ان کے بعد ضمیر کے شاگرد، دبیر اور خلیق کے لڑکے انیس نے اردو مرثیے کو بام عروج پر پہنچایا،

غالب اور حالی نے بھی مرثیے لکھے ہیں۔اس کے بعد ریاض، اقبال، سرور، چکبست، جوش اور حفیظ جالندھری نے ذاتی اور قومی مرثیے لکھے ہیں۔ 1947 کے بعد اردو میں بے شمار مرثیے لکھے گئے جن میں آل احمد سرور، علی جعفری، روشن صدیقی اور جگن ناتھ آزاد نے اردو کشی پر مرثیے لکھے ہیں۔موجودہ دور میں مرثیہ نگاری کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے لیکن پھر بھی کسی نہ کسی رنگ میں چند شعرا مختلف عنوانات پر ذاتی، قومی اور مذہبی مرثیے لکھ رہے ہیں۔اس طرح اردو مرثیہ نگاری نے اردو زبان اور ادب کو ترقی دی۔

سوانح حیات میر انیس

میر ببر علی انیس ان شاعروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے اردو مرثیہ کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔صنف مرثیہ میں انیس کا وہی مقام ہے جو مثنوی کی صنف میں ان کے دادا میر حسن کا ہے۔انیس آج بھی اردو میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے شاعروں میں سے ایک ہیں۔

میر ببر علی انیس 1803 میں فیض آباد میں پیدا ہوئے، ان کے والد میر مستحسن خلیق خود بھی

مرثیہ کے ایک بڑے اور نامور شاعر تھے۔۔میر حسن مثنوی میں تو انیس مرثیہ میں اردو کے سب سے بڑے شاعر قرار دیے جا سکتے ہیں۔

شاعروں کے گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے انیس کی طبیعت بچپن سے ہی موزوں تھی اور چار پانچ برس کی ہی عمر میں کھیل کھیل میں ان کی زبان سے موزوں شعر نکل جاتے تھے۔انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم فیض آباد میں ہی حاصل کی۔مروجہ تعلیم کے علاوہ انہوں نے سپہ گری میں بھی مہارت حاصل کی۔ان کا شمار علماء کی صف میں نہیں ہوتا ہے تاہم ان کی علمی معلومات کا سب کو اعتراف ہے۔ایک بار انہوں نے سر منبر علم ہیئت کی روشنی میں سورج کے گرد زمین کی گردش کو ثابت کر دیا تھا۔ان کو عربی اور فارسی کے علاوہ ہندی سے بھی بہت دلچسپی تھی اور تلسی و ملک محمد جائسی کے کلام سے بخوبی واقف تھے۔کہا جاتا ہے کہ وہ لڑکپن میں خود کو ہندو ظاہر کرتے ہوئے ایک برہمن عالم سے ہندوستان کے مذہبی صحیفے سمجھنے جایا کرتے تھے۔اسی طرح جب پاس پڑوس میں کسی کی موت ہو جاتی تھی تو وہ اس گھر کی خواتین کی نالہ وزاری اور اظہار غم کا گہرائی سے مطالعہ کرنے جایا کرتے تھے۔یہ مشاہدات آگے چل کر ان کی مرثیہ نگاری میں بہت کام آئے۔

انیس نے بہت کم عمری میں ہی باقاعدہ شاعری شروع کر دی تھی۔جب ان کی عمر نو برس تھی انہوں نے ایک سلام کہا۔ڈرتے ڈرتے باپ کو دکھایا۔باپ خوش تو بہت ہوئے لیکن کہا کہ تمہاری عمر ابھی تحصیل علم کی ہے۔ادھر توجہ نہ کرو۔تیرہ چودہ برس کی عمر میں والد نے اس وقت کے استاد شیخ امام بخش ناسخ کی شاگردی میں دے دیا۔ناسخ نے جب ان کے شعر دیکھے تو دنگ رہ گئے کہ اس کم عمری میں لڑکا اتنے استادانہ شعر کہتا ہے۔۔انہوں نے انیس کے کلام پر کسی طرح کی اصلاح کو غیر ضروری سمجھا،البتہ ان کا تخلص جو پہلے حزیں تھا بدل کر انیس کر دیا۔

تیرہ چودہ برس کی عمر میں انیس نے اپنے والد کی غیر موجودگی میں گھر کی زنانہ مجلس کے لئے ایک مسدس لکھا۔اس کے بعد وہ رثائی شاعری میں تیزی سے قدم بڑھانے لگے اس میں ان کی محنت اور ریاضت کا بڑا ہاتھ تھا۔کبھی کبھی وہ خود کو کوٹھری میں بند کر لیتے،کھانا پینا تک موقوف کر دیتے اور تبھی باہر نکلتے جب حسب منشاء مرثیہ مکمل ہو جاتا۔خود کہا کرتے تھے "مرثیہ کہنے میں کلیجہ خون ہو کر بہہ جاتا ہے'۔جب میر خلیق کو،جو اس وقت تک لکھنو کے بڑے اور اہم مرثیہ نگاروں میں تھے،پورا اطمینان

ہو گیا کہ انیس ان کی جگہ لینے کے قابل ہو گئے ہیں تو انہوں نے بیٹے کو لکھنو کے باذوق اور نکتہ رس سامعین کے سامنے پیش کیا اور میر انیس کی شہرت پھیلنی شروع ہو گئی۔ میر انیس نے مرثیہ میں جو نام اور مقام حاصل کیا آج تک کوئی اس مقام کو پا نہ سکا۔

1874ء میں لکھنو میں ان کا انتقال ہوا۔ انہوں نے تقریباً 200 مرثئے اور 125 سلام لکھے، اس کے علاوہ تقریباً 600 رباعیاں بھی ان کی یادگار ہیں۔

میر انیس کی مرثیہ نگاری

میر انیس اردو شاعری کے صف اول کے شاعر ہیں۔ انہوں نے اردو مرثیہ کو اپنی تمام تر صلاحیتوں سے بام عروج پر پہنچایا۔ مرثیہ نگاری کے فن کو ترقی عطا کی، اس صنف کی وجہ سے اردو شاعری نے دنیا کی دیگر اصناف شاعری کی صف میں اپنا ایک الگ مقام بنایا۔

میر انیس کی مرثیہ نگاری کے بے شمار فنی محاسن ہیں چند ایک کا تذکرہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

جذبات نگاری:۔ جذبات نگاری شاعری کی جان ہے۔ جذبات نگاری کے لئے قادرالکلامی کے ساتھ فطرتِ انسانی کا غائر مطالعہ بھی ضروری ہے۔ میر انیس کے یہاں جذبات نگاری کے ایسے ایسے نمونے ملتے ہیں جن کی مثالی اردو میں تو کیا دوسری زبانوں میں بھی ملنا دشوار ہے۔

محاکات نگاری:۔ الفاظ میں کسی جذبہ، واقعہ یا منظر کھینچا محاکات کہلاتا ہے۔ محاکات کی قدرت انیس کو ترکہ میں ملی تھی۔ میر انیس کا کمال یہ ہے کہ جس واقعہ کو بیان کرتے ہیں اس کی تصویر کھینچ دیتے ہیں بلکہ ان کی تصویر کبھی کبھی اصل سے بھی بہتر ہو جاتی ہے۔

کردار نگاری:۔ ڈرامہ کی طرح مرثیہ میں بھی کردار نگاری کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ مرثیے کے کردار مثالی ہوتے ہیں۔ جیسے امام حسین اور ان کے ساتھی حق وصداقت کے علم بردار۔ انیس کے کردار زندہ اور متحرک ہوتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مرثیہ کا کردار سامع کا قریبی آدمی ہے۔ میر انیس کردار سیرت، عمر اور مرتبے میں بڑی رعایت رکھتے ہیں۔

فصاحت و بلاغت:۔ میر انیس کے کلام کی ایک بڑی خصوصیت ان کی فصاحت و بلاغت ہے میر انیس نے اردو شعراء میں سب سے زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مگر ان کے ہاں غیر فصیح الفاظ

کا ملنا مشکل ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو ان کو تمام دوسرے مرثیہ گو شعراء سے اور خود مرزا دبیر سے بھی یقیناً ممتاز اور نمایاں کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بیان کا حسن اور طرزِ ادا کی خوبی بھی ان کے یہاں موجود ہے۔

تشبیہات واستعارات:۔ میر انیس نے تشبیہات اور استعارات کے نہایت دلکش نقش ونگار بنائے ہیں اور عجب خوشنما رنگ بھرے ہیں۔ انیس کی تشبیہیں نہایت نیچرل سادہ اور پُر تکلف ہوتی ہیں۔

غرض یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے میر انیس کا کلام ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائیگا۔

مرثیہ میر انیس کی تشریح

پہلا بند

حضرت حسینؓ اپنے اہل وعیال اور رفقاء کے ساتھ میدان جنگ میں خیمہ زن ہیں۔ آنے والا دن جنگ وقتال کا ہے۔ سورج رات کی مسافت طے کر چکا اور سحر کا وقت قریب آچکا تھا تو حضرت حسینؓ نے اپنے ساتھیوں کو بیدار کیا، انہیں اللہ تعالی کی حمد وثنا اور تہجد کی نماز پڑھنے کی تلقین کی۔

دوسرا بند

حضرت حسینؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ آنے والا دن جنگ وقتال کا دن ہے۔ اس جنگ میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت کا دشمنوں کے ہاتھ خون بہے گا۔ اس حقیقت کے عیاں ہونے کے باوجود حضرت حسینؓ کا چہرہ خوشی سے سرخ ہے کیوں کہ وہ اس جنگ میں شہادت کے عظیم مرتبہ پر فائز ہونے والے ہیں۔ اس دن کا بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں اور اپنے حقیقی مالک سے ملاقات کے شوق سے بے انتہا خوش ہیں۔ ہماری شہادت سے انسان تو انسان فرشتے بھی حزن وملال اور غم محسوس کریں گے۔

تیسرا بند

جنگ کی شام بہت مبارک والی ہے کیوں کہ اس جنگ میں شہادت پانے والے ہمیشہ کے لیے جنت میں اپنا مقام بنائیں گے۔ پیاسے حوض کوثر سے اپنی پیاس بجھائیں گے۔ اس قافلہ کے

تمام لوگوں کے نام اللہ تعالی نمازیوں کی فہرست میں لکھے۔اور یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جولوگ شہید ہوتے ہیں دنیا سے وہ سرخرواور حقیقی معنوں میں کامیاب لوگ ہوتے ہیں۔

چوتھا بند

حضرت حسینؓ کی نصیحت سن کر اہل قافلہ جو خدا کی معرفت رکھنے والے تھے اپنے اپنے بستروں سے اٹھے اور ہر ایک نے قیمتی لباس پہنا۔بے خوف وخطر داڑھی مونچھوں میں کنگی کیے۔ مشک وعطر سے ان کے رنگین کپڑے مہکے ہوئے تھے اور وہ کمر پٹی پہنے عمامہ باندھے حضرت حسینؓ کے پاس تشریف لائے۔

پانچواں بند

شاعر میر انیس نے اس بند میں حضرت حسینؓ کے قافلہ میں شریک رفیقوں کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ان کے ہونٹ پیاس کی شدت سے سوکھ چکے ہیں لیکن حمد الٰہی جاری ہے اور ان کے چہرے پر رونق ہیں۔کل جنگ کا دن ہے لیکن خوف اور ڈر،غم اور دلوں کا میلا پن ان سے دور تھا۔وہ سخاوت کرنے والے،حق کی معرفت رکھنے والے، پکے ارادے والے اور باشعور لوگ تھے ،اچھی سوچ والے ،مزاحیہ مزاج رکھنے والے،اہل فن اور باغیرت تھے، ایسے خوش الحان اور خوش گفتار کہ ان کی باتیں بے حد متاثر کن ہوتے ہیں۔

چھٹا بند

شاعر مزید اصحاب حسینؓ کے اوصاف حمیدہ بیان کرتے ہو کہتا ہے کہ وہ بہادر،سنجیدہ اور عظیم مرتبہ اور مقام رکھنے والے تھے۔بہترین مزاج کے حامل ،وہ ملک سبا میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے مانند اور جنگل میں شیر کے جیسے تھے۔ایسا لگتا ہے کہ زمانہ ان کے قبضہء قدرت میں ہے وہ تین دن سے بھوکے اور فاقہ سے ہیں لیکن وہ زندگی سے سیر نظر آتے ہیں۔ان کی عادت شریفہ تھی کہ وہ دنیا کو معمولی اور حقیر سمجھتے تھے اور ایسے فیاض اور سخاوت کرنے والے کہ ان کی نظر میں سمندر بھی قطرہ لگے۔

UNIT-III

اردو قصیدہ نگاری

قصیدہ ''در مدح بہادر شاہ ظفرؔ''

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام — جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دم صبح — یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب — بندہ عاجز ہے گردش ایام
اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا — آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا اے سرور خاص خواص — حبذا اے نشاط عام عوام
عذر میں تین دن نہ آنے کے — لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا — صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا — تیرا آغاز اور ترا انجام
راز دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے — مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں — ایک ہی ہے امید گاہ انام
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش — غالبؔ اس کا مگر نہیں ہے غلام
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو — تب کہا ہے بہ طرز استفہام
مہر تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ — قرب ہر روزہ بر سبیل دوام
تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا — جز بہ تقریب عید ماہ صیام
جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو — پھر بنا چاہتا ہے ماہ تمام
ماہ بن ماہتاب بن میں کون — مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام
میرا اپنا جدا معاملہ ہے — اور کے لین دین سے کیا کا
ہے مجھے آرزوے بخشش خاص — گر تجھے ہے امید رحمت عام

جو کہ بخشے گا تجھ کو فر فروغ
کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام

جب کہ چودہ منازل فلکی
کر چکے قطع تیری تیزی گام

تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر
کوے ومشکوے وصحن ومنظر و بام

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
اپنی صورت کا ایک بلوریں جام

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا
توسن طبع چاہتا تھا لگام

زہر غم کر چکا تھا میرا . . .
تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام

مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں
غم سے جب ہوگئی ہو زیست حرام

بوسہ کیسا یہی غنیمت ہے
کہ نہ سمجھیں وہ لذت دشنام

کعبے میں جا بجائیں گے ناقوس
اب تو باندھا ہے دیر میں احرام

اس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد
چرخ نے لی ہے جس سے گردش وام

بوسہ دینے میں ان کو ہے انکار
دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام

چھیڑتا ہوں کہ ان کو غصہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالب اپنا نام

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ
اے پری چہرہ پیک تیز خرام

کون ہے جس کے در پہ ناصبہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن
نام شاہنشہ بلند مقام

قبل چشم و دل بہادر شاہ
مظہر ذوالجلال و الاکرام

قصیدہ کا تعارف

لفظ قصیدہ عربی زبان کے لفظ ''قصد'' سے نکلا ہے، جس کا لغوی معنیٰ ہے ارادہ کرنا ہے۔ اور چونکہ قصیدہ ارادتا کہا جاتا ہے اس لیے اس کو قصیدہ کہا گیا۔ قصیدے کا ایک دوسرا معنیٰ ''مغز'' کے ہیں۔ یعنی قصیدہ اپنے موضوعات و مفاہیم کے اعتبار سے دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں وہی مقام و مرتبہ رکھتا ہے جو انسانی جسم و اعضاء میں سر یا مغز کو حاصل ہے۔

قصیدے کی اصطلاحی تعریف

اصطلاح میں قصیدہ ایسی صنف سخن کو کہتے ہیں جس میں کسی کی مدح یا ہجو کے علاوہ مختلف موضوعات پر منظوم کلام پیش کیا جائے۔ ہیئتی اعتبار سے قصیدہ نظم کے مانند ہوتا ہے۔ جس طرح نظم میں خیالات و مضامین مربوط اور مسلسل ہوتے ہیں اسی طرح قصیدے میں بھی، مگر معانی و مفاہیم کے اعتبار سے قصیدہ عموماً چار اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے۔ جو حسب ذیل ہیں:

(۱) تشبیب (۲) گریز (۳) مدح (۴) دعاء یا حسن طلب۔

تشبیب

قصیدے کے وہ اشعار جو قصیدے کے ابتداء میں تمہید کے طور پر کہے جاتے ہیں تشبیب کہلاتے ہیں۔ شبیب کے اندر شاعر اپنے ممدوح کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کیلئے اور اپنی علمی لیاقت و قابلیت کا اظہار کرنے کیلئے دلچسپ اور قابل توجہ مضامین کا انتخاب کرتا ہے، تاکہ اسے سن کر ممدوح پوری طرح شاعر کی طرف متوجہ ہو جائے اور شاعر اپنے مقصد کو رکھنے میں کامیاب ہو جائے۔ تشبیب کے اندر ہر طرح کے مضامین کی گنجائش رہتی ہے۔ تشبیب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں بیان کردہ

مضامین ممدوح کے شایان شان ہونے کے ساتھ ساتھ بعد میں آنے والے مدحیہ اشعار سے مناسبت بھی رکھتے ہوں۔

گریز

شاعر تشبیب سے ہٹ کر اصل موضوع یعنی مدح کی طرف آنے کیلئے چند اشعار پڑھتا ہے جو گریز کہلاتے ہیں۔ گریز کی خوبی یہ ہے کہ شاعر ایسے شعر کا انتخاب کرے کہ یہ محسوس نہ ہو کہ شاعر زبردستی ممدوح کی تعریف کر رہا ہے۔

مدح

قصیدے کا تیسرا اور سب سے اہم رکن مدح ہے۔ قصیدے کا اصل مقصد ممدوح کی مدح کرنا ہوتا ہے۔ اس میں ممدوح کی ذات کے جملہ اوصاف کے ساتھ ساتھ اس کے جملہ متعلقات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ مدح میں حفظ مراتب کا خیال رکھا جائے اور جس کی مدح کی جائے وہ درحقیقت مدح کے قابل بھی ہو۔

دعا یا حسن طلب

یہ قصیدے کا آخری اور اختتامیہ حصہ ہوتا ہے۔ اس میں شاعر اپنے ذاتی حالات اور اغراض و مقاصد کو بیان کرتا ہے۔ اس میں ممدوح کی صحت و تندرستی، درازی عمر، شان و شوکت، مال و زر کی ترقی وغیرہ کیلئے خدا تعالیٰ سے دعا کرتا ہے، اور انہیں دعائیہ اشعار پر قصیدے کا اختتام ہوتا ہے۔

غالب کی قصیدہ نگاری

غالب اردو قصیدہ کے ایک اہم شاعر ہیں۔ انہوں نے صرف چار قصیدے لکھے ہیں۔ دو منقبتی اور دو درباری۔

ان قصیدوں میں جو انداز غالب نے اختیار کیا ہے اور جس جدت سے کام لیا ہے، اس کے سبب ان کا نام اردو قصیدے کے اہم قصیدہ نگاروں میں لیا جا سکتا ہے۔ بعض نے سودا، ذوق اور مومن کے ساتھ غالب کو بھی قصیدے کا اہم شاعر مانا ہے۔

غالب کی شاعری کی نمایاں خصوصیت جدت طرازی ہے اوران کی یہ خصوصیت قصیدے میں بھی نظر آتی ہے۔ دراصل غالب اپنا الگ راستہ نکالنے یا بنانے میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ صرف دوسروں کے بنائے ہوئے راستوں کے راہی نہیں بنے رہنا چاہتے تھے۔ جدت طرازی غالب کی شاعری کی جان ہے۔۔آل احمد سرور نے صحیح کہا ہے کہ ''غالب کے قصر شاعری کی بنیاد جدت طرازی پر ہے۔'' ان کی یہ جدت طرازی کسی ایک صنف کے ساتھ مخصوص نہیں۔

غالب نے قصیدے کے اجزائے ترکیبی کا بہترین استعمال کیا ہے۔قصیدے میں تشبیب کو اپنی تخلیقی قوتوں سے فروغ بخشا ہے۔ ہر جگہ،قصیدے میں بھی اپنے فن کی پختگی کا نمونہ پیش کیا ہے۔ غالب نے بہادر شاہ ظفر کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس کی تشبیب لاجواب ہے۔

گریز میں شاعر ایسے موڑ پیدا کرتا ہے جہاں سے اس کا ذہن مدح سرائی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ یہ اشعار قارئین اور سامعین کی ذہن سازی کرتے ہیں۔غالب کو اس حصے میں کمال حاصل تھا۔ قصیدہ کا اصل جزء مدح ہے۔اس فن کے وہ بادشاہ ہیں۔ وہ بادشاہ کی مدح ہو یا اس سے متعلق اشیا، اس کے علوم وفنون، اس کی جنگی مہارت یا اس کے جنگی ہتھیار کا ذکر، غالب اقتضائے قصیدہ کو نظر میں رکھتے ہوئے اشعار کہتے ہیں۔مرزا غالب نے اردو میں کم قصیدے کہے ہیں۔لیکن ان کے کم از کم تین قصائد ایسے ہیں جنھیں شعری اور فکری اعجاز اور تخلیقی معیار کی کسوٹی پر رکھ کر دیکھیں تو ان کا مرتبہ اس صنف میں بھی بلند نظر آتا ہے۔

قصیدہ ءغالب کا خلاصہ

غالب اردو کے مشہور شاعر ہیں۔غزل میں ان کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔قصیدہ گوئی میں بھی انہوں نے نام کمایا ہے۔غالب کے چار قصیدے مشہور ہیں۔درمدح بہادر شاہ ظفر ان کا مشہور قصیدہ ہے۔جس میں انہوں نے اپنے ممدوح بہادر شاہ ظفر کی بے پناہ تعریف کی ہے۔

قصیدہ کے آغاز میں تشبیب کے اشعار بیان کیے گیے ہیں غالب کی تشبیب بڑی جاندار ہے۔ چاند سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے چاند تو ہمیں اس کا نام بتا جسے تو جھک کر سلام کر رہا ہے اے چاند،تو دو دن تک صبح کے وقت نظر آیا پھر ماہ کے آخر دنوں میں دو دن غائب رہا،تو

ہم سے غائب ہوکر کہاں جاتا ہے؟ جبکہ ستاروں نے جال بچھا کر رکھا ہے۔ تیرے غائب ہوکر پھر طلوع ہونے سے ہمیں عید کی خوشیاں میسر آتی ہیں، اس لیے تیرا طلوع ہونا مبارک ہو۔ اور ہر کوئی تیرے طلوع اور غروب ہونے کو جانتا ہے۔

اے چاند میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آج دنیا میں ایک ہی امید گاہ ہے وہ ہے بہادر شاہ ظفر، جس طرح تو اس کا غلام ہے میں بھی اس کا غلام ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ممدوح کے رحم وکرم سے تو بدر کامل یعنی مکمل چاند بنتا ہے اور انعام واکرام پاتا ہے۔ تو جس طرح انعام پاتا ہے میں بھی انعام پاتا ہوں۔

اے چاند اگر تجھے بادشاہ سے رحمت کی توقع ہے تو مجھے بھی خاص عطیہ کی امید ہے جس سے میری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، قصیدہ کے درمیان غالب نے غزل کے چند اشعار بھی پیش کیے ہیں۔

قصیدہ کے آخیر میں غالب کہتے ہیں کہ اے عید کے چاند کیا تجھے معلوم ہے کہ کس کے دربار میں چاند، سورج اور ستارے سب اپنی پیشانی جھکاتے ہیں گر تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن کہ اس ہستی کا نام بلند مقام اور مرتبہ کے حامل بادشاہ قبلہ چشم و دل بہادر شاہ ظفر ہے جو خدائے ذوالجلال والاکرام کے مظہر اور نشانی ہیں۔ وہ طریقہء انصاف کے شہسوار اور باغِ اسلام کی بہار ہیں جن کا ہر کام اپنے اندر کرامت رکھتا ہے اور ان کی ہر بات الہامی معلوم ہوتی ہے۔

UNIT-IV

رباعی کا تعارف

اصنافِ سخن میں رباعی ایک خاصے کی چیز ہے، چار مصرعوں میں جامع سے جامع مضمون کو خوبصورتی سے مکمل کر دینا در یا کوکوزے میں بند کر دینے کے مترادف ہے۔

رباعی عربی لفظ رُبع سے بنایا گیا ہے جسکا مطلب چار ہے یعنی اس میں چار مصرعے ہوتے ہیں، رباعی کو دوبیتی بھی کہا جاتا ہے۔ اردو شاعری فارسی سے اور فارسی شاعری عربی شاعری سے نکلی ہے لیکن رباعی خالص فارسی شعراء کی ایجاد ہے۔

رباعی کے اوزان مخصوص ہیں، بحر ہزج کے چوبیس وزن رباعی کے لیے مخصوص ہیں، جن میں غزل، نظم وغیرہ کہنا بھی جائز ہے، لیکن ان اوزان کے علاوہ اگر دو یا زیادہ شعر کسی اور وزن میں ہوں تو وہ رباعی نہیں بلکہ قطعہ کہلاتے ہیں۔ رباعی کا پہلا، دوسرا، اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتے ہیں، تیسرے مصرعے میں بھی قافیہ لایا جاسکتا ہے۔ رباعی کی خوبصورتی کا دارومدار چوتھے مصرعے پر ہوتا ہے جس کے حسن اور برجستگی سے پہلے تین مصرعوں کو بھی چار چاند لگ جاتے ہیں۔ رباعی کا کوئی مخصوص موضوع نہیں ہوتا، لیکن شعراء کرام کی روایت رہی ہے کہ رباعی میں زیادہ تر پند و نصائح، تصوف، حمد، نعت، منقبت، فلسفہ، اخلاقیات اور دنیا کی بے ثباتی وغیرہ کے موضوع بیان کرتے ہیں۔ عشقیہ رباعیاں خال خال ہی ملتی ہیں۔

اردو رباعی کا آغاز وارتقا

ہر چند کہ اردو زبان کا آغاز شمالی ہند میں ہوا لیکن دکنی شعرا کو اردو زبان میں نثر و نظم کی مختلف اصناف کو استعمال کرنے میں اولیت حاصل ہے۔

۔ چنانچہ غزل، قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی کی طرح ہی اردو رباعی کی ابتدا بھی دکنی شعرا کی فکری پرواز کا نتیجہ ہے۔ محمد قلی قطب شاہ، ملا وجہی، ولی اورنگ آبادی، سراج اورنگ آبادی نے اس صنف کی طرف توجہ دی ہے۔ شمالی ہند میں لکھنؤ میں عاشقانہ وصوفیانہ موضوعات کے ساتھ واقعات کربلا اور ان

کے متعلقات کو بھی رباعی میں جگہ دی جانے لگی۔

انیس نے تقریباً ساڑھے پانچ سو اور دبیر نے دو سو رباعیاں کہیں۔ دونوں کی رباعیوں میں تقریباً ایک جیسی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ موضوع کی وسعت، بیان کی صفائی، زبان کی سلاست اور روانی، نیز فنی پختگی سے دونوں کی رباعیاں تاریخ میں ایک روشن باب کا اضافہ کرتی ہیں۔ میر انیس کی رباعیاں فنی طور پر بے عیب ہیں۔ ان میں سلاست و روانی، فصاحت و بلاغت، تازگی و شگفتگی اور بلند تخیل کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان کے یہاں وہ سارے موضوعات پائے جاتے ہیں، جنہیں فارسی شعرا نے اپنی رباعیوں میں باندھا ہے۔

میر انیس کے علاوہ شعرا میں امیر مینائی، میر مہدی مجروح، داغ دہلوی اور عزیز لکھنوی وغیرہ نے بھی رباعیاں کہی ہیں۔ ان میں سے امیر مینائی کو چھوڑ کر کوئی اور شاعر رباعی کے میدان میں کوئی بڑا کارنامہ انجام نہ دے سکا۔ ان شعرا کے بعد کا دور رباعی گوئی کے لحاظ سے عروج کا دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں امجد حیدر آبادی، جوش ملیح آبادی، فانی بدایونی، سیماب اکبر آبادی، فراق گورکھپوری، تلوک چند وغیرہ کا نام شامل ہے۔ امجد حیدر آبادی کا شمار رباعی کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی رباعیاں فنی پختگی کی غماز ہیں۔ ان کی رباعیوں میں تصوف، عشق حقیقی اور عرفان کے موضوعات کی عکاسی ملتی ہے۔ جوش ملیح آبادی نے بھی رباعی گوئی میں اپنا ایک مقام پیدا کیا۔ ان کی رباعیاں اپنے موضوع و رحقیقت، مواد کے اعتبار سے عمر خیام سے قریب ہیں، جن میں تصوف، فلسفہ، رموز ذات، اسرار عرفانِ ذات، شراب و شباب اور اس کے مختلف پہلوؤں کا برملا اظہار ہوا ہے۔ فراق کا شمار جدید غزل کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے بڑے شوق و شغف کے ساتھ رباعیاں بھی کہی ہیں۔ ان کی رباعیوں کا مجموعہ 'روپ' کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ انہوں نے رباعی کے تمام اوزان میں رباعیاں کہی ہیں۔ ان کی رباعیاں ہندوستانی ثقافت اور معاشرت کی عکاس ہیں۔ ان کے علاوہ چند گو شعراء یہ ہیں۔ فرید پربتی، فراغ روہوی، ظفر مرادآبادی، قمر سنبھلی، عادل اسیر دہلوی، عادل حیات وغیرہ۔ ان کی رباعیاں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر ان کی دلچسپی یوں ہی برقرار رہی تو صنف رباعی کا مستقبل تاریک ہونے کے بجائے تابناک ہوگا۔

امجد حیدر آبادی کی سوانح حیات

امجد کا اصل نام سید احمد حسین ہے اور ابو اعظم کنیت تھی۔ امجدؔ 1888ء بروز دوشنبہ حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ امجد کے والد صوفی سید رحیم علی ابن سید کریم حسین ایک نیک اور انسان تھے۔ امجد نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے حاصل کی۔ اس کے بعد دکن کی قدیم و مشہور درسگاہ جامعہ نظامیہ میں داخل ہوئے اور چھ سال تک تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد بھی خانگی طور پر تعلیم کے سلسلے کو جاری رکھا اور پنجاب یونیورسٹی سے فاضل کا امتحان امتیاز کے ساتھ کامیابی کیا۔

27 ستمبر 1908ء کو رودِ موسیٰ میں زبردست طغیانی آئی اور مسلسل بارش کی وجہ سے شہر حیدر آباد کے کئی محلے طغیانی کی زد میں آ گئے اور بھاری جانی اور مالی نقصان ہوا۔ امجدؔ کا مکان موسیٰ ندی کے قریب واقع تھا جہاں پرسٹی کالج اور ہائی کورٹ کی عمارت موجود ہے، سارا مال و اسباب سیلاب کی نذر ہو گیا اور اس سیلاب میں امجدؔ کی والدہ، بیوی اور بیٹی ان کی آنکھوں کے سامنی ڈوب گیے اور امجد کرشماتی طور پر اکیلئے بچ گیے۔ اس ناگہانی حادثے کا امجد کے دل پر گہرا اثر ہوا۔ اس حادثے کی تفصیل کو امجد اپنی نظم "قیامت صغریٰ" میں ذکر کیا ہے۔

امجد نے رباعی گوئی کے فن میں بڑا نام کمایا اور اپنے عہد کو بڑا متاثر کیا ہے۔ امجد نے اپنی رباعیوں میں آدمیت کو انسانیت کا درس دیا اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو راہِ راست پر لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ امجدؔ کی رباعیات روحانی صداقت اور عارفانہ وصوفیانہ حقیقت کی بناء پر صوفی سرمد کی رباعیوں کی ہم پلہ ہیں اسی بناء پر امجد کو " زندہ صوفی سرمد " کہا گیا ہے۔ امجدؔ ایک صوفی منش اور خدا ترس انسان و شاعر تھے۔ انہوں نے دنیائے فانی کا مطالعہ بڑی گیرائی اور گہرائی سے کیا تھا۔ مجد فرماتے ہیں کہ انسان کی حقیقت یہ ہے کہ اس کی زندگی اور موت کا دارومدار محض سانسوں کی آمد و رفت پر قائم ہے

امجدؔ نے طویل عمر پائی۔ اپنی زندگی کے 73 سال گزارے اور آخر کار 29 مارچ 1961ء کو رات کے ساڑھے بارہ بجے اپنی جان، جانِ افرین کے سپرد کر دی اور اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ اردو زبان و ادب، دکنی ادب اور شاعری کے فروغ میں حضرت امجد حیدر آبادی کی گراں قدر خدمات کو ادب کا مورخ کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا۔

امجد حیدر آبادی کی رباعی گوئی

حضرت امجد حیدر آبادی کا شمار ہندوستان کے مشہور و معروف اور عظیم المرتبت رباعی گو شاعروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے زبان کے ایسے دریا بہائے جس سے سارا ہندوستان آج بھی سیراب ہو رہا ہے۔ اُن کی شاعری وقت گزاری یا دل بہلانے کا وسیلہ نہیں ہے۔ ان کا کہا ہر قول کیف و سرمستی میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ وہ ایک صوفی منش اور درویش صفت انسان تھے۔ قناعت، خودداری، انسان دوستی، راست گفتاری اور صداقت پسندی ان کی فطرت ثانی تھی۔ امجد کو تصوف سے خاص لگاؤ تھا۔ اُن کا اصل کارنامہ ان کی شاہکار رباعیات ہیں۔

امجد کی خاص خوبی یہ ہے کہ وہ سادہ اور سلیس زبان میں بلند اور اعلیٰ تخیل کو پیش کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اور انہوں نے ایسے بے شمار اشعار تخلیق کیے ہیں جو روح کو تڑپاتے اور قلب کو گرماتے ہیں۔

امجد حیدر آبادی نے اپنی شاعری میں عشق حقیقی اور تصوف و معرفت کے دریا بہا دیئے ہیں۔ وہ ایک خدا ترس صوفی اور خوددار انسان تھے۔ اس لئے ان کے کلام میں سچی لگن، خالص روحانی جذبات، پر خلوص صداقت، اعلیٰ تہذیبی اقدار، مروت، ہمدردی، رواداری، خدمتِ خلق اور اعلیٰ تخیل اور بلند پروازی جیسے اوصاف موجود ہیں۔ امجد کا صوفیانہ کلام بندے کو مولا سے ملانے کا ذریعہ ہے۔ امجد نے اپنی رباعیوں میں اخلاقی نکات کے علاوہ آیات قرآنی اور احادیث کی طرف بھی بلیغ اشارے کیے ہیں-

امجدؔ حیدر آبادی کو علم تصوف سے گہرا لگاؤ تھا۔ اسی بناء پر انہوں نے تصوف اور اس کی کار فرمائیوں کو اپنی شاعری میں برتا اور اپنے کلام کو رونق بخشی۔ جس کا پوری اردو شاعری میں جواب نہیں ہے۔

امجد حیدر آبادی کی کئی شاہکار کتابیں ہیں جو آپ کے مخصوص نظریے حیات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ نثر میں "گلستان امجد" دراصل "گلستان سعدی" کا بامحاورہ ترجمہ ہے۔ نثری کارناموں میں سب سے اہم اور شاہکار تصانیف "پیامِ امجدؔ" اور "جمالِ امجد" ہے۔

امجد حیدر آبادی کی رباعی کی تشریح

ہر چیز مسبب سبب سے مانگو
منت سے لجاجت سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھلاتے ہو
گر بندے ہو رب کے تو رب سے مانگو

امجد حیدر آبادی اس رباعی میں کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بندے ہیں ہمارا مالک حقیقی اللہ ہے اس لیے ہم کو ہر چیز اللہ ہی سے مانگنی چاہیے اور بندے کو مانگنے کا سلیقہ بھی آنا چاہیے، عاجزی ،انکساری اور باادب بن کر اللہ سے مانگیں تو اللہ تعالی ضرور عطا فرمائے گا۔

ہر قطرے میں بحر معرفت مضمر ہے
ہر اک ذرے میں کچھ نہ کچھ جوہر ہے
ہو چشم بصیرت تو ہر چیز اچھی
گر آنکھ نہ ہو تو لعل بھی پتھر ہے

امجد حیدر آبادی اس رباعی میں کہتے ہیں کہ ہر چھوٹی سی چھوٹی چیز اور ذرہ میں اللہ کی نشانیاں موجود ہیں صرف معرفت اور پہچان کی ضرورت ہے۔انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ کائنات کی ہر شئ پر غور وفکر کرے اور اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھائے اگر انسان کے اندر بصیرت نہ ہو تو لعل جیسا قیمتی پتھر بھی اس کو صرف معمولی پتھر ہی نظر آئے گا۔

ساغر جیدی کی سوانح حیات

ڈاکٹر ساغر جیدی کڈپہ کے اہل قلم حضرات میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ان کا اصلی نام نظام شیخ قادری حسینؔ ہے اور آپ ساغر جیدی کے قلمی نام سے جانے جاتے ہیں۔آپ نظام شیخ غوث محی الدین کے فرزند ہیں۔آپ کی ولادت 14/اپریل 1941ء کو کڈپہ آندھرا پردیش میں ہوئی۔

آپ کی ابتدائی تعلیم تلگو میڈیم سے ہوئی۔موصوف نے دسویں جماعت کا امتحان 1957ء میں تلگو میڈیم سے میونسپل ہائی اسکول' کڈپہ سے کامیاب کیا۔راشٹرا بھاشا پروین (ہندی) 1977ء میں مکمل کیا۔D.A.M.S کی سند بھی 1973ء میں حاصل کی۔آپ ایک آیورویدڈاکٹر بھی ہیں۔ فارسی اور عربی زبان آپ نے مولوی محمد یعقوب صاحب بغدادی سے سیکھی۔فنِ شاعری میں ابراحسینی گنوری سے فارغ الاصلاح شاگرد رہے ہیں۔زمانہ طالب علمی سے ہی تلگو اور ہندی میں شاعری کرتے تھے۔

آپ نے تجارت اور طباعت کو ذریعہ معاش بنایا۔آپ کی بسکٹ کی فیکٹری اور ٹرانسپورٹ کا کاروبار بھی رہا۔آپ کی تخلیقات شعری کئی معیاری رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہیں۔جیسے شبِ خون' شاعر' عصری آگہی' تحریک' سالار (بنگلور)' کے علاوہ بیسوی صدی رسائل و جرائد میں کلام شائع ہوا۔اردو' تلگو اور ہندی تینوں زبانوں میں آپ کے شعری و نثری کتابیں شائع ہوئیں۔آپ کی شخصیت تین زبانوں کا سنگم بن کر ابھرتی ہے۔آپ بیک وقت اردو' ہندی اور تلگو زبانوں کے شاعر ہی نہیں بلکہ نثر نگار بھی تھے۔

موصوف ایک اہم جدید اردو شاعر کی حیثیت سے اردو دنیا میں جانے جاتے تھے۔مصوری سے بھی شغف تھا۔اردو کے علاوہ تلگو اور ہندی زبانوں میں بھی شعری اور نثری کتابیں شائع کیں جن کی کُل تعداد 22 ہے۔غالباً آندھرا پردیش کے واحد سہ لسانی شاعر کی حیثیت سے ساغر صاحب کو مدتوں یاد رکھا جائے گا۔نعت،غزل،نظم اور رباعیات کے ماسوا اردو دوہا نگاری میں ممتاز مقام کے حامل تھے۔باقی سے شمس الرحمن فاروقی تک قدآور ادبا،شعرا اور ناقدین نے ڈاکٹر ساغر جیّدی کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کا برملا اعتراف کیا۔سیاسی اور سماجی میدانوں میں بھی آپ کی خدمات ناقابلِ فراموش رہیں۔دو معیادوں کے لیے ریاستی حج کمیٹی کے رکن رہے۔رائل سیما اردو رائٹرس فیڈریشن اور محمدن ویلفیر سوسائٹی کے بانی کی حیثیت سے ادبی،ثقافتی اور سماجی خدمات انجام دیں۔امتیازِ میر ایوارڈ،اس کے علاوہ ریاستی اردو اکیڈمی نے بھی مجموعی ادبی خدمات برائے شاعری امجد حیدرآبادی ایوارڈ سے بھی نوازا۔ڈاکٹر ساغر جیّدی کا 18 جون کی دوپہر 12:30 بجے انتقال ہوگیا۔

ادبی سفر

ابتدا میں آپ نے تلگو زبان میں نظمیں لکھی ہیں۔ابتدا میں آپ کو کسی استاد کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔جتنی دلچسپی آپ کو ہندی اور تلگو زبان سے ہے اتنی ہی دلچسپی بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس سے بہت زیادہ دلچسپی اردو، فارسی اور عربی سے ہے۔اس نسبت سے آپ نے عربی و فارسی میں بنیادی معلومات حاصل کرنے کی غرض سے کڈپہ کے جید عالم حضرت سید یعقوب صاحب باقوی قادری مرحوم کے آگے زانوئے ادب تہ کیا، پھر 1978ء میں ڈپلومہ ان پرشین (Diploma in Persian) کی سند حاصل کی۔آپ کا شعری سفر غالباً 1968ء کو شروع ہوا۔علم عروض، علم شعر و سخن کی فنی لوازمات حاصل کرنے کی غرض سے مشہور استاد سخن ابر حسن گنوری کے آگے زانوئے ادب تہ کیا۔موصوف نے مختلف اصناف پر سہ زبانوں (اردو، ہندی اور تلگو) میں اپنی تخلیقات شائع کیں۔ جن کی تعداد پچیس ہے۔" لہجے " آپ کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو سنہ 1974ء کو منظر عام پر آیا۔یہ ایک اشترا کی شعری مجموعہ ہے۔

ساغرؔ جیدی کی رباعی گوئی

رباعی ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں فلسفیانہ حکیمانہ، صوفیانہ، اخلاقی اور عشقیہ مضامین کے علاوہ مختلف سماجی مسائل اور موضوعات بھی پیش کیے جاتے ہیں۔اکثر شعرا اس غلط فہمی کا شکار ہوجاتے ہیں اور وہ یہ سوچتے ہیں کہ کسی بھی وزن میں چار مصرعے کہہ کر رباعی لکھی جاسکتی ہے۔جبکہ ماہرین عروض نے رباعی کے لیے مخصوص اوزان کی پابندی کو لازمی قرار دیا ہے۔رباعی کے ہر مصرع میں ''مخصوص وزن'' کے چار چار رکن ہوتے ہیں اور یہ چار ارکین بیس ماتراؤں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ان ارکین کو عروضِ اصطلاح میں افاعیل بھی کہتے ہیں، عروض داں نے رباعی کے چوبیس اوزان کو دو گروہوں میں ''شجرہ ءاخرب'' اور ''شجرۂ اخرم'' میں برابر بانٹا ہے۔ان سب فنی لوازمات کو ہنرمندی کے ساتھ برتنے میں ساغرؔ جیدی بے انتہا کامیاب ہوئے ہیں۔ان کی رباعیات میں انسانی اقدار، اخلاقی معیار، سادگی، سلاست، روانی، سوز و گداز، جدت، ندرت، شگفتگی اور شائستگی جیسی خصوصیات پائی جاتی ہیں، اس نوعیت کی چند رباعیات ملاحظہ ہوں۔

مٹی کا کٹورا بھی نہیں ہے گھر میں
اک دوسرا کُرتا بھی نہیں ہے گھر میں
کیا بات ہو تخت و تاج کی ساغرؔ
ٹوٹی ہوئی کٹیا بھی نہیں ہے گھر میں

تہذیب کے اثرات بہت گہرے تھے
ظلمت کے دہانے پہ قدم ٹھہرے تھے
آواز ہی آواز تھی چاروں جانب
ہم لوگ فرشتے تھے مگر بہرے تھے

ساغر جیدی کی رباعی کی تشریح

تعریف کی میزان پہ تل جاتے ہیں
دو بوند خوشامد سے گھل جاتے ہیں
مضبوط زبردست تجوری ہیں مگر
ہم لوگ غلط چابی سے کھل جاتے ہیں

ساغر جیدی اس رباعی میں کہتے ہیں کہ ہم خوشامد اور جھوٹی تعریف سننے کے عادی ہو چکے ہیں۔ بظاہر ہم مضبوط اور توانا دکھائی دیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اندر قابلیت اور صلاحیت کا فقدان ہے۔ جھوٹی تعریف سنا کر کوئی بھی ہم سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ہم دشمنوں کے ہاتھ میں کھلونا بن جاتے ہیں۔ اس لیے ہم کو چاہیے کہ ہم اپنے اندر صلاحیت پیدا کریں اور اپنی قابلیت سے آگے بڑھیں۔

ظلمت کا طوفان اٹھا دیتا ہے
ایمان کی بنیاد ہی ڈھا دیتا ہے
شہرت تو ہے رنگین، مگر اس کا خمار
انسان کو شیطان بنا دیتا ہے

ساغر جیدی کہتے ہیں کہ اگر انسان اخلاص وللّٰہیت کے جذبات سے معمور ہوتو وہ اللہ کی نظر میں محبوب ہوتا ہے۔ کیوں کہ اعمال کی قبولیت کے لیے پہلی شرط اخلاص ہے۔ اخلاص کے بغیر انسان کے اعمال قابل قبول نہیں ہیں۔ شہرت اور ریا کاری سے انسان وقتی طور پر مشہور ہوتا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ تاریکیوں کے طوفان میں گم ہو جاتا ہے اور ایمان جیسی دولت سے بھی وہ محروم ہو جاتا ہے۔ شہرت اور ریا کاری گرچہ کہ رنگین دکھائی دیتی ہے لیکن انسان اس کی رنگینی میں اتنا گم ہو جاتا ہے کہ کو ہر برا کام کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے جس سے وہ شیطان بن جاتا ہے۔

دوسرا سمسٹر۔ نمونہء پرچہء سوالات۔

MODEL QUESTION PAPER - SECOND LANGUAGE -URDU
B.A.,/B.Com.,/B.Sc., SEMESTER - II: PAPER - II URDU
POETRY

Time : 3hrs ***Max Marks :75***

Part -A

نوٹ: درج ذیل سوالوں میں سے کسی پانچ (5) سوالوں کے جواب لکھیے۔ (5X5 :25)

1۔ مثنوی کی تعریف لکھیے۔

2۔ میر حسن کی مختصر سوانح حیات لکھیے۔

3۔ میر انیس کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔

4۔ نصاب میں شامل کسی ایک مرثیہ کے بند کا خلاصہ لکھیے۔

5۔ تشبیب کسے کہتے ہیں؟ واضح کیجیے۔

6۔ نصاب میں شامل کسی ایک رباعی کا مفہوم اپنے الفاظ میں لکھیے۔

7۔ ساغر جیدی کا مختصر تعارف لکھیے۔

8۔ مرثیہ کے اجزائے ترکیبی لکھیے۔

Part -B

درج ذیل سوالات میں سے کسی پانچ (5) کے جوابات تفصیل سے لکھیے۔ (5x10:50)

(تمام جوابات لازمی ہیں)

9۔ مرزا غالب کی سوانح حیات پر روشنی ڈالیے؟

یا

غالب کی قصیدہ گوئی پر اظہار خیال کیجئے؟

10۔ اردو مثنوی کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالیے؟

یا

''مثنوی سحر البیان'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے؟

11۔ میر انیس کی سوانح حیات پر روشنی ڈالیے؟

یا

میر انیس کی مرثیہ گوئی کی خصوصیات لکھیے؟

12۔ امجد حیدر آبادی کی رباعی گوئی پر روشنی ڈالیے

یا

امجد حیدر آبادی کی رباعی کا خلاصہ لکھیے؟

13۔ ساغر جیدی کی سوانح حیات پر روشنی ڈالیے؟

یا

ساغر جیدی کی رباعی گوئی پر اظہار خیال کیجیے؟

III SEMESTER
URDU FICTION PROSE

1_UNIT افسانوی نثر کا تعارف

2 _UNIT داستان ''باغ و بہار'' (آغاز قصے کا متن)

3_UNIT ڈرامہ ''گڑھ کی مکھیاں'' کا متن

4_UNIT ناول ''توبتہ النصوح'' (کلیم کا مرزا ظاہر دار بیگ کے یہاں مہمان بن کر جانا) کا متن

5_UNIT افسانہ ''ایک اور دن'' کا متن

UNIT-1

افسانوی نثر کا تعارف

داستان کا تعارف، آغاز وارتقا:

لفظ ''داستان'' فارسی الاصل ہے۔ اس کے اصطلاحی معنی قصہ، کہانی، اور داستان کے ہیں۔ داستان دنیائے ادب کی سب سے قدیم صنف ہے یہ نثر میں ہوسکتی ہے اور نظم میں بھی۔ داستان ایک طویل کہانی ہوتی ہے جس کے کردار اور واقعات فرضی اور تخیلی ہوتے ہیں جن کا حقیقی زندگی سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ داستان کی تکنیک یہ ہوتی ہے کہ اس میں ایک مرکزی قصہ ہوتا ہے اور اس مرکزی قصے کے ساتھ دیگر کہانیوں کا سلسلہ چلتا ہے اسے قصہ در قصہ کی تکنک کہتے ہیں۔ یہ ضمنی کہانیاں مرکزی قصے سے تعلق رکھ بھی سکتی ہیں اور نہیں بھی رکھ سکتیں۔ بعض داستانیں اکہرے پلاٹ پر مبنی ہیں جیسے انشا کی رانی کیتکی کی کہانی۔

داستان کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فوق الفطرت عناصر کی کارفرمائی ہوتی ہے لیکن ہر داستان میں ان عناصر کا شمول لازمی نہیں ہے۔ داستان کے کردار مثالی ہوتے ہیں یعنی اگر اچھا کردار ہے تو ساری خوبیوں کا مالک ہے اگر اگر برا ہے تو گو مجسم شیطان ہے۔ داستانیں ایک تخیلی اور مثالی دنیا کی تخلیق کرتی ہیں لیکن یہ اپنے عہد کی تہذیب وثقافت کا آئینہ ہوتی ہیں اس لیے ان کی اہمیت ہے۔ داستان کے لیے ضروری ہے کہ اس میں کوئی مرکزی قصہ ہو خواہ اکہرا ہو یا قصہ در قصہ اور زندگی کے کسی شعبہ سے تعلق رکھتا ہو۔ کرداروں کو جاندار بنانے کے لیے اس کے تانے بانے خیالی تاروں سے بنائے جاتے ہیں۔ پلاٹ اور کردار فرضی ہوتے ہیں۔ داستان کی فنی خصوصیت میں طوالت بھی ضروری ہے۔ عشق ومحبت بھی داستان کا ایک اہم عنصر ہے بلکہ اکثر عشق ومحبت ہی کے بدولت داستان وجود میں آتی ہے۔ داستان کی ایک اہم شرط اس کا اسلوبِ بیان ہے۔ بیان جس قدر سادہ، مربوط، مسلسل، مؤثر اور دلکش ہوگا داستان اسی قدر مقبول ہوگی۔

داستان کا آغاز وارتقا

اردو میں داستان کی نہایت طویل اور درخشاں روایت پائی جاتی ہے۔اردو کی متعدد ادبی اصناف کی طرح داستان کا آغاز بھی دکنی زبان میں ہوا۔منظوم داستان کی شکل میں ''کدم راؤ پدم راؤ'' اردو کی پہلی منظوم داستان ہے۔نثری داستانوں میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے ملک الشعرا ملا اسد اللہ وجہی کو اردو کا پہلا داستان نویس ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔وجہی کی سب رس اردو کی پہلی نثری داستان ہے جو 1045ھ میں معرض وجود میں آئی۔اس میں عقل،عشق،حسن،دل نظر،خیال اور دیدار وغیرہ اس تمثیلی قصے کے اہم کردار ہیں۔یہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر لکھی گئی جو مقفی اور مسجع نثر کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے۔اس کے بعد دکنی اور پھر معیاری اردو میں بے شمار داستانیں لکھی گئیں۔

شمالی ہند دستان میں لکھی جانے والی داستانوں میں عیسوی خاں کی ''قصہ مہر افروز دلبر''،عطا حسین تحسین کی ''نوطرز مرصع''،مہر چند کھتری کی ''نوآئین ہندی'' اور شاہ عالم ثانی کی ''عجائب القصص'' کو اولیت حاصل ہے۔

میر امن نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے تحت 1802ء میں ''باغ و بہار'' لکھی جس میں چار درویشوں کی کہانی ہے۔دہلوی تمدن کی آئینہ داری سے قطع نظر باغ و بہار کا اسلوب کچھ اتنا دلکش،سادہ اور شگفتہ ہے کہ موضوع اور نفس داستان سے عدم دلچسپی کے باوجود وہ ہمیشہ ہماری توجہ کا مرکز رہے گی۔اسی سال انشاء اللہ خاں انشاء نے ''رانی کیتکی کی کہانی'' لکھی۔یہ اکہرے پلاٹ کی مختصر داستان ہے۔جس میں انشا نے یہ التزام کیا ہے کہ اس میں عربی و فارسی کا کوئی نقطہ نہ آنے پائے۔مافوق الفطرت عناصر بھی کم پائے جاتے ہیں۔

1821ء کو رجب علی بیگ سرور نے ''فسانہ عجائب'' لکھی۔اس کتاب میں انشا پردازی ایک پرتکلف و پرشکوہ نثری اسلوب کو اپنایا گیا ہے۔

1801ء میں خلیل احمد خاں اشک نے ''داستان امیر حمزہ'' جیسی عظیم داستان اردو زبان کو عطا کی۔یہ اردو کی سب سے اہم اور طویل داستان ہے۔یہ داستان بہ شمول طلسم ہوشربا 46 جلدوں پر مشتمل ہے۔ہر جلد ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔خواجہ امان نے ''بوستانِ خیال'' کے نام سے ایک

طویل داستان لکھی۔

فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس، منشی نول کشور پریس اور رامپور داستاں نویسی کے مراکز رہے۔اس کے علاوہ بیتال پچیسی، سنگھاسن بتیسی، قصہ مہر افروز ودل بر، نوآئین ہندی، آرائش محفل یا قصہ حاتم طائی وغیرہ اردو کی چند اہم داستانیں ہیں۔

ڈرامہ کا تعارف، آغاز وارتقا

ڈرامہ کا تعارف

افسانوی ادب کی ایک اہم صنف ڈرامہ ہے۔بعض نقادوں نے اس کا شمار فکشن میں نہیں کیا ہے لیکن کہانی کے حوالے سے یہ بھی افسانوی ادب کے دائرے میں آتا ہے۔ڈرامہ ہندوستان اور ہندوستانی زبانوں میں قدیم زمانے سے رائج ہے۔اردو میں اسے تمثیل کا نام دیا گیا جو مقبول نہیں ہو سکا۔ڈرامہ وہ صنف ہے جس کا تعلق الفاظ اور عمل دونوں سے ہوتا ہے۔فی الحقیقت ڈرامہ وہ کہانی ہے جو اداکاروں کے ذریعے ناظرین کے سامنے اسٹیج پر پیش کی جاتی ہے۔ڈرامے کا موضوع زندگی ہے۔یہ المیہ، طربیہ، المناک طربیہ، تاریخی وغیرہ مختلف اقسام کے ہوتے ہیں۔

ارسطو نے ڈرامہ کے اجزائے ترکیبی بتائے ہیں وہ اس طرح ہیں۔

1۔پلاٹ 2۔کردار 3۔مکالمہ 4۔زبان 5۔موسیقی 6۔آرائش

پلاٹ: مختلف واقعات کا باہمی و بامعنی ربط پلاٹ کہلاتا ہے۔پلاٹ کے ذریعہ واقعات کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ایک اچھے ڈرامے کہ پلاٹ میں واقعات کی ترتیب اس طرح ہوتی ہے کہ اس میں دلچسپی برقرار رہے۔

کردار: ڈرامے میں کرداروں کی پیش کش میں ان کے سماجی پس منظر کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ڈرامے کے شروع میں کرداروں کا تعارف ہوجائے تو بہتر ہے۔

مکالمہ: ڈرامے میں مکالمہ قصہ کو آگے بڑھانے اور حرکت وعمل کو قوت عطا کرنے میں مدد دیتا ہے۔مکالمے میں موقع ومحل کی مناسبت اور اختصار کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔طویل مکالمے ڈرامے کے لیے بہتر نہیں سمجھے جاتے۔

زبان: ڈرامے میں کرداروں کے ذریعہ جو گفتگو پیش کی جاتی ہے وہ کسی نہ کسی زبان میں ہوتی ہے۔ زبان عام فہم، سادہ اور روزمرہ کی ہو تو بہتر ہے۔ ڈرامے میں موضوع پر بھی اس کی زبان کا بہت کچھ دارومدار ہوتا ہے۔

موسیقی اور آرائش کو ڈرامے میں ثانوی اجزا کی حیثیت حاصل ہے۔

ڈرامے کو دو اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

1۔ ٹریجڈی (Tragedy) المیہ

2۔ کامیڈی (Comedy) طربیہ

المیہ ڈراموں کو مغرب میں ڈرامے کی سب سے اعلیٰ قسم قرار دیا جاتا ہے۔ اس کا پلاٹ غم اور رنج پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس قسم کے ڈرامہ کو ارسطو نے انسانوں کے تزکیہ نفس کا مؤثر اور بہترین وسیلہ قرار دیا ہے۔

طربیہ ڈراموں کو دوسرے درجے کا ڈراما تصور کیا جاتا ہے۔ اس کا خاص مقصد تفریح و تفنن طبع ہے اور اس کے پلاٹ میں خوشی و مسرت پیدا کرنے والے واقعات کی کثرت ہوتی ہے۔

اردو ڈرامہ کا آغاز وارتقا

ہندوستان میں ڈرامہ کی روایت بہت قدیم ہے اس فن کو بادشاہوں کی سرپرستی حاصل تھی جس کے سبب یہ فن پروان چڑھا۔

اردو میں ڈرامے کے اولین نقوش اودھ کے حکمران واجد علی شاہ کے دور سے ملنے لگتے ہیں جنھوں نے اپنے تیار اور اسٹیج کیے ہوئے رہس ''رادھا کنھیا'' میں ڈرامائی اصول وضوابط کا لحاظ رکھا۔ لیکن یہ مکمل ڈرامہ نہیں تھا۔ عام طور پر آغا امانت حسین امانت لکھنوی کے ڈرامے ''اندر سبھا'' کو اردو کا پہلا ڈرامہ مانا جاتا ہے جو 1854ء میں اسٹیج کیا گیا تھا۔ اس ڈرامہ میں سبز پری جو کہ راجا اندر کے دربار میں رقاصہ ہے شہزادہ گلفام کے عشق کی روداد بیان کی گئی ہے۔

عبدالعلیم نامی نے ''راجا گوپی چند اور جالندھر'' کو اردو کا پہلا ڈرامہ قرار دیا ہے جو 26 نومبر 1853ء کو بمبئی میں کھیلا گیا۔ ڈاکٹر افضل الدین اقبال کے بموجب ڈرامہ ''علی بابا اور چالیس چور''

اردو کا پہلا ڈرامہ ہے جسے سینٹ فورٹ جارج کالج مدراس کے فوجی عہدیدار کیپٹن گرین اوے نے لکھا۔ یہ 1852ء میں شائع ہوا اور اسٹیج بھی کیا گیا۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں پارسی اردو تھیٹر کا آغاز ہوا۔ جس میں رقص و سرور کے عناصر پر زور دیا گیا۔ اس تھیٹر کو احسن لکھنوی، طالب بنارسی اور بیتاب بریلوی جیسے ڈرامہ نگار دستیاب ہوئے۔ احسن نے شیکسپیئر کے ڈراموں کے آزاد ترجمے ''خون ناحق''، شہید وفا'' گلنار فیروز ''، پیش کر کے اردو ڈرامہ کو وسعت دی۔ بیتاب بریلوی نے ''سداما''، ''رامائن''، ''مہابھارت'' اور ''فریب'' جیسے ڈرامے پیش کیے۔

اردو ڈرامہ کو آغا حشر کاشمیری نے بلندیوں تک پہنچایا۔ انہوں نے رومانیت کے بجائے ملک کے معاشرتی مسائل کو پیش کیا۔ ان کے ڈراموں میں ''اسیر حرص''۔ ''یہودی لڑکی''۔ ''خواب ہستی''۔ ''رستم و سہراب'' قابل ذکر ہیں۔ امتیاز علی تاج اور سید عابد حسین نے بھی فن ڈرامہ نگاری کو فروغ دیا۔ عابد حسین کا ''پردہ غفلت'' عصری ماحول کا ترجمان ہے۔ امتیاز علی تاج کا شہرہ آفاق ڈرامہ ''انارکلی'' اپنی فنی عظمت کا خوبصورت اظہار ہے۔ ان کے علاوہ اشتیاق حسین قریشی، پروفیسر محمد مجیب اور فضل الرحمن نے ڈرامے کی روایت کو آگے بڑھایا۔

ان کے علاوہ مرزا ادیب، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، خواجہ حسن نظامی، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، انتظار حسین، محمد حسن پنڈت پرشاد بے تاب نے اردو ڈرامہ نگاری کو فروغ دیا۔

۔ اردو میں امانت لکھنوی سے لے کے امتیاز علی تاج اور پھر حبیب تنویر تک صنف ڈرامہ میں متعدد تجربات ہوئے ہیں۔ جیسے absurd تھیٹر وغیرہ۔

ناول کا تعارف، آغاز و ارتقا

ناول کا تعارف

افسانوی ادب کی ایک اہم صنف ناول ہے۔ یہ صنف مغربی ادب سے ماخوذ ہے۔ ناول کا لفظ ''ناویلا'' اطالوی زبان سے انگریزی کے توسط سے اردو میں منتقل ہوا۔ ناول ایک بیانیہ یا لمبی کہانی نما ادب پارہ ہوتا ہے جس کے کردار اور ان کا عمل حقیقی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ناول زندگی کا

آئینہ اور اپنے عہد کی معاشرت کی سچی تصویر ہوتا ہے۔ ابتدا میں چار عناصر کو ناول کے اجزائے ترکیبی سمجھا جاتا تھا۔ یعنی 1۔ پلاٹ 2۔ کردار 3۔ مکالمے 4۔ منظر کشی۔ لیکن بعد میں 1۔ زمان و مکاں 2۔ زبان و بیاں 3۔ نظریہ حیات 4۔ جذبات نگاری۔ کو بھی اجزائے ترکیبی میں شامل کیا گیا۔

ناول کے لیے موضوع کی قید نہیں ہے۔ وہ سوانحی، تاریخی، مہماتی،، کرداری، سائنسی وغیرہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اسی طرح اس کی تکنیک بھی بندھی ٹکی نہیں ہے۔ ناول نگار آپ بیتی، مکتوب، ڈائری، یادداشت، داخلی خود کلامی، شعور کی رو غرض کسی بھی تکنیک میں ناول لکھ سکتا ہے۔

اردو ناول نگاری کا آغاز وارتقا

اردو ناول نگاری کا آغاز وارتقا کب ہوا؟ محققوں کے بیچ اس مسئلے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ عموماً ڈپٹی نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار اور ان کے ناول مراۃ العروس 1869ء کو اردو کا پہلا ناول مانا جاتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر محمد الٰہی کے نزدیک منشی کریم الدین کی تصنیف ''خط تقدیر'' اردو کا پہلا ناول ہے جو 1862ء میں شائع ہوا۔ اس کے برعکس ڈاکٹر ابن کنول کے خیال میں منشی گمانی لال اردو کا پہلا ناول نگار ہے جس کی تصنیف ''ریاض دلربا'' 1838ء اردو کا پہلا ناول ہے۔ لیکن بعض نقادوں کے مطابق ہر دو تصانیف کی نوعیت قصوں کی ہے۔ یہ ناول کے دائرے میں نہیں آتیں۔

اردو میں ادبی ناولوں پر مختلف رجحانات اور تحریکات نے اپنا اثر چھوڑا۔ جیسے ترقی پسند ناول، علامتی اور تجریدی ناول وغیرہ۔ مرزا ہادی رسوا نے شاہکار ناول ''امراؤ جان ادا'' لکھا۔ موضوع، مکالمے، انداز بیان، نقطہ نظر، اور ابتدا، عروج اور انتہا کے لحاظ سے ایک مکمل ناول ہے۔ عبدالحلیم شرر نے فردوس بریں، حسن انجلینا، منصور و موہنا، جیسے ناول لکھے۔ راشد الخیری بھی تاریخی ناول لکھے ہیں۔ وہ اپنے ناولوں میں مشرق اور مغرب کی کشمکش کو ظاہر کرتے ہیں۔ سماج کی اصلاح کے لیے انھوں نے عورتوں کی تربیت اور ان کی تعلیم کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ ''شام زندگی'' ان کی مقبول تصنیف ہے اس کتاب کی وجہ سے انھیں ''مصور غم'' کا لقب ملا۔ اردو میں رومانوی اور جمالیاتی تحریک مغرب اور بیرونی ممالک کے ادب کی وجہ سے آئی۔ اس تحریک کے زیر اثر زبان و بیان میں بھی حسن کاری پر زور دیا گیا۔ نیاز فتح پوری اس تحریک کے نمائندہ ناول نگار ہیں۔ پریم چند اردو

ناول میں ایک عہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کی ناول نگاری اپنے عہد کے سیاسی ،سماجی اور معاشرتی حالات سے راست طور پر وابستہ ہے۔ان کے ناولوں میں ،ہم خرما وہم ثواب ،بازار حسن ،گوشہء عافیت ،میدان عمل ،گئودان ،نرملا ،وغیرہ اہم ہیں۔جدید ناول نگاروں میں عزیز احمد کا نام شامل ہے انہوں نے ہوس ،مرمر ،اور خون ،آگ اور گریز جیسے ناول لکھے۔کرشن چندر نے اپنا ناول شکست سماج اور محبت کرنے والوں کی آویزش کے موضوع پر لکھا۔ان کے دوسرے ناولوں میں ایک گدھے کی سر گذشت ،میری یادوں کے چنار ،جب کھیت جاگے۔وغیرہ اہم ہیں۔

عصمت چغتائی کا نام بھی اردو ناول نگاری میں بے حد اہم ہے۔ان کا پہلا ناول ضدی ہے جس میں سرمایہ دارانہ نظام کے تصورات پر گہرا طنز ہے۔ٹیڑھی لکیر سوانحی نوعیت کی ہے۔قرۃ العین حیدر نے اپنا ناول میرے بھی صنم خانے لکھا جس میں شعور کی رو کی تکنیک استعمال کی ہے۔عزیز احمد نے کیسی بلندی کیسی پستی ،لکھا۔شوکت صدیقی کا ناول خدا کی بستی ،سماج کے بے حد تاریک پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے۔ان ناول نگاروں کے علاوہ خدیجہ مستور کا 'آنگن' انتظار حسین کا 'بستی' قاضی عبد الستار کا 'صلاح الدین ایوبی ،حیات اللہ انصاری کا 'لہو کا پھول' جیلانی بانو کا 'ایوان غزل' الیاس احمد گدی کا 'فائر ایریا' بھی اردو ناولوں میں ایک اہم اضافہ ہیں۔

ناول کے علاوہ اردو میں ناولٹ بھی لکھے گیے جن کا کینوا س افسانے سے بڑا لیکن ناول کے مقابلے میں چھوٹا ہوتا ہے۔اردو کے پہلے ناولٹ نگار رتن ناتھ سرشار ہیں۔جنھوں نے پی کہاں اور کرم دھم ناولٹ لکھے۔بعضوں نے نذیر احمد کے ناول ایامی کو اردو کا پہلا ناولٹ کہا ہے۔لندن کی ایک رات (سجاد ظہیر) چائے کے باغ ،سیتا ہرن (قرۃ العین حیدر)پانی (غضنفر)اور خواب رو(جوگندر پال)اردو کے اہم ناولٹ ہیں۔

افسانہ کا تعارف ،آغاز وارتقا

افسانہ کا تعارف

افسانوی ادب کی ایک اور اہم صنف افسانہ ہے۔جسے انگریزی میں short story اور اردو میں مختصر افسانہ بھی کہتے ہیں۔ناول کی طرح افسانہ بھی مغرب سے درآمد کردہ صنف ہے۔

مختصر افسانہ وہ کہانی ہے جو کسی ایک واقعے، ایک جذبے یا ایک احساس کی ترجمانی کرتی ہے ۔وحدت تاثر مختصر افسانے کا بنیادی اور امتیازی وصف ہوتا ہے۔اس کے اجزائے ترکیبی کم وبیش وہی ہوتے ہیں جو ناول کے ہیں یعنی 1۔ پلاٹ 2۔کردار 3۔مکالمے 4۔منظر کشی۔

زندگی کی وسعتوں کی طرح افسانے کے موضوعات کی وسعتیں بھی لامحدود ہیں۔یہ اصلاحی ،رومانی، سیاسی، سماجی، مذہبی، جنسی یا مزاحیہ ہو سکتے ہیں۔

اردو ادب میں افسانے کی جڑیں کافی مضبوط ہیں۔ناول کی طرح اردو کے پہلے افسانہ نگار کے تعین میں بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔بعض اہل قلم نے سجاد حیدر یلدرم کے افسانے ''نشہ کی پہلی ترنگ'' شائع شدہ رسالہ معارف بابت اکتوبر 1955 کو اردو کا پہلا افسانہ قرار دیا۔لیکن بعد کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ ترکی افسانے کا ترجمہ ہے۔طبع زاد نہیں ہے۔بعض نقادوں نے سرسید احمد خاں کی تحریروں ''امید کی خوشی'' اور گزرا ہوا زمانہ'' میں اردو افسانے کے اولین نقوش تلاش کیے ہیں ۔ڈاکٹر مسعود رضا نے اردو افسانے کا ارتقا 1965 میں راشد الخیری کے افسانے ''نصیر اور خدیجہ'' کو اردو کا پہلا افسانہ قرار دیا ہے۔

عام طور پر پریم چند کے افسانے '' دنیا کا انمول رتن'' کو اردو کا پہلا افسانہ قرار دیا گیا ہے جب کہ پریم چند کا پہلا افسانہ عشق دنیا اور حب الوطن رسالہ ''زمانہ'' کان پور میں 1908 میں شائع ہو چکا ہے۔پریم چند نے 1912 میں 'بڑے گھر کی بیٹی' کے نام سے ایک اہم افسانہ لکھا۔ان کا مشہور افسانہ 'کفن' بے حد مقبول ہوا۔سعادت حسن منٹو کے افسانے، موذیل، نیا قانون، ٹوبہ ٹیگ سنگھ، کافی مشہور ہوئے۔کرشن چندر نے ان داتا، مہالکشمی کا پل لکھ کر شہرت حاصل کی۔عصمت چغتائی نے چوتھی کا جوڑا، نانی اماں، جیسے افسانے لکھے۔بیدی نے لاجونتی اور اپنے دکھ مجھے دے دو، اور بھولا جیسے لازوال افسانے لکھے۔

1936 کے بعد جب ترقی پسند تحریک نے ادب کی ہر صنف کو متاثر کیا۔اردو افسانہ بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہیں رہا۔اس تحریک کی وجہ سے افسانوں کے موضوعات بدلے، سماجی احتجاج، استحصال کے خلاف آواز، حقیقت نگاری، مساوات اور سوشلزم، جنسی بے راہ روی کی مخالفت جیسے موضوعات پر خامہ فرسائی کی گئی۔تقسیم کے بعد جو افسانے لکھے ان میں فسادات اور 1947 کے

واقعات اور حالات بیان کیے گیے ہیں۔1936ن سے 1947 کے درمیان جن افسانہ نگاروں نے اردو کے بہترین افسانے لکھے ان میں علی عباس حسینی، حیات اللہ انصاری، اختر انصاری، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، رضیہ سجاد ظہیر، انتظار حسین، حسن عسکری، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس وغیرہ شامل ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے تقسیم ملک کی صورت میں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا بکھراؤ کو موضوع بنایا۔فرد کی تنہائی اور کرب کو پیش کیا۔جدیدیت کے زیر اثر لکھنے والے افسانوں سے کہانی پن غائب ہوگئی۔علامت، تجرید، اشاریت نے جگہ لے لی۔لیکن بہت جلد بیانیہ ٹکنک نے جگہ لے لی۔1970 کے بعد جو افسانہ نگار سامنے آئے ان میں سلام بن رزاق، عبد الصمد، انور قمر، اشرف ،غضنفر، پیغام آفاقی، ابن کنول، طارق چھتاری، مشرف عالم ذوقی، بیگ احساس وغیرہ اہم ہیں۔

اردو صنف افسانہ میں کئی تجربے بھی کیے گیے جیسے بے کرداری افسانہ، اینٹی افسانہ، پلاٹ لس (less) افسانہ، علامتی اور تجریدی افسانہ وغیرہ اسی طرح منی کہانی یا افسانچہ بھی اس صنف کا اہم تجربہ ہے۔

UNIT-II

داستان ''باغ و بہار'' (آغاز قصے کا)

اب آغاز قصے کا کرتا ہوں، ذرا کان دھر کر سنو اور منصفی کرو۔ سیر میں چہار درویش کے یوں لکھا ہے اور کہنے والے نے کہا ہے کہ آگے روم کے ملک میں ایک شہنشاہ تھا۔ کہ نوشیرواں کی سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت اس کی ذات میں تھی۔ نام اسکا آزاد بخت اور شہر قسطنطنیہ (جس کو استنبول کہتے ہیں) اس کا پایہء تخت تھا۔ اس کے وقت میں رعیت آباد، خزانہ معمور، لشکر مرفّہ، غریب غربا آسودہ، ایسے چین سے گزران کرتے اور خوشی سے رہتے کہ ہر ایک کے گھر میں دن عید، اور رات شبِ برات تھی۔ اور جتنے چور چکار، جیب کترے، صبح خیزے اٹھائی گیرے دغاباز تھے، سب کو نیست و نابود کر کر نام و نشان ان کا اپنے ملک بھر میں نہ رکھا تھا۔ ساری رات دروازے گھروں کے بند نہ ہوتے اور دکانیں بازار کی کھلی رہتیں۔ راہی مسافر جنگل میدان میں سونا اچھالتے چلے جاتے کوئی نہ پوچھتا کہ تمھارے منہ میں کئے دانت ہیں، اور کہاں جاتے ہو؟

اس بادشاہ کے عمل میں ہزاروں شہر تھے، اور کئی سلطان نعل بندی دیتے، ایسی بڑی سلطنت پر ایک ساعت اپنے دل کو خدا کی یاد اور بندگی سے غافل نہ کرتا۔ آرام دنیا کا جو چاہے سب موجود تھا، لیکن فرزند کی طرف سے محروم تھا۔ کہ جو زندگانی کا پھل ہے اس کی قسمت کے باغ میں نہ تھا۔ ایک دن شیش محل میں نماز ادا کر وظیفہ پڑھ رہے تھے کہ ایک بارگی آئینہ کی طرف جو خیال کرتے ہیں تو ایک سفید بال موچھوں میں نظر آیا کہ مانند تار مقیش کے چمک رہا ہے۔ بادشاہ یہ دیکھ کر آبدیدہ ہوئے اور ٹھنڈی سانس بھری پھر دل میں سوچا کیا کہ افسوس تو نے اتنی عمر ناحق برباد کی اور اس دنیا کی حرص میں ایک عالم کو زیر و زبر کیا اور ملک جو لیا اب تیرے کس کام آئے گا۔ آخر یہ سارا مال اسباب کوئی دوسرا اڑا لے گا، تجھے تو پیغام موت کا آ چکا۔ اگر کوئی دن جئے بھی تو بدن کی طاقت کم ہوگی۔

اس سے یہ معلوم ہوا ہے کہ میری تقدیر میں نہیں لکھا کہ وارث چیز اور تخت کا پیدا ہو، مجھے ایک روز مرنا ہے اور سب کچھ چھوڑ جانا ہے اس سے یہ بہتر ہے کہ میں ہی اسے چھوڑ دوں اور باقی زندگانی اپنے خالق کی یاد میں کاٹوں۔ بادشاہ نے بادشاہت سے ہاتھ کھینچ کر گوشہ نشینی اختیار کی۔

چاروں طرف سے غنیموں اور مفسدوں نے سر اٹھایا اور قدم اپنی حد سے بڑھایا جس نے چاہا ملک دبا لیا اور سرانجام سرکشی کا کیا۔

جہاں کہیں حاکم تھے ان کے حکم میں خلل عظیم واقع ہوا۔ سب ہی امیر وزیر کے پاس آئے اور کہا بادشاہ کی یہ صورت اور ملک کی وہ حقیقت اگر چندے تغافل ہو تو اس محنت کا ملک لیا ہو مفت میں جاتا رہے گا، پھر ہاتھ آنا مشکل ہے۔ وزیر بادشاہ کے حضور میں آیا، آداب بجالایا۔ اور دست بستہ کھڑا رہا۔

دیکھا تو بادشاہ کی عجیب صورت بن رہی ہے کہ زار زار رو رہے ہیں اور دبلاپے سے آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں اور چہرہ زرد ہو گیا ہے۔

خردمند کو تاب نہ رہی، بے اختیار دوڑ قدموں پر جا گرا۔ بادشاہ نے ہاتھ سے سر اس کا اٹھایا اور فرمایا لو، مجھے دیکھا، خاطر جمع ہوئی؟ اب جاؤ، زیادہ مجھے نہ ستاؤ، تم سلطنت کرو۔ خردمند ان کے باپ کا وزیر تھا، جب یہ شہزادے تھے، تب سے محبت رکھتا تھا، علاوہ دانا اور نیک اندیش تھا، کہنے لگا خدا کی جناب سے ناامید ہونا ہرگز مناسب نہیں۔ جس نے ہیژدہ ہزار عالم کو ایک حکم میں پیدا کیا، تمھیں اولاد دینی اس کے نزدیک کیا بڑی بات ہے؟ قبلہ عالم اس تصورِ باطل کو دل سے دور کرو، نہیں تو تمام عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ اور یہ سلطنت کس کس محنت اور مشقت سے تمھارے بزرگوں نے اور تم نے پیدا کی ہے؟ ایک ذرا میں ہاتھ سے نکل جائے گی اور بے خبری سے ملک ویران ہو جائے گا۔ خدانخواستہ بدنامی حاصل ہوگی۔ اس پر بھی باز پرس روزِ قیامت کی ہوا چاہے کہ تجھے بادشاہ بنا کر، اپنے بندوں کو تیرے حوالے کیا تھا، تو ہماری رحمت سے مایوس ہوا اور رعیت کو حیران پریشان کیا۔ اس سوال کا کیا جواب دو گے؟ پس عبادت بھی اس روز کام نہ آئے گی۔ اس واسطے کہ آدمی کا دل خدا کا گھر ہے۔ اور بادشاہ فقط عدل کے واسطے پوچھے جائیں گے۔ غلام کی بے ادبی معاف ہو، گھر سے نکل جانا اور جنگل جنگل پھرنا، کام جوگیوں اور فقیروں کا ہے۔ نہ کہ بادشاہوں کا۔ تم اپنی جوگا کام کرو، خدا کی یاد اور بندگی جنگل پہاڑ پر موقوف نہیں۔ آپ نے یہ بیت سنی ہوگی۔

خدا اس پاس، یہ ڈھونڈے جنگل میں
ڈھنڈھورا شہر میں، لڑکا بغل میں

جب بادشاہ کے دل کو تسلّی ہوئی، تب وزیر سے پوچھا کہ اور سب امیر و کبیر کیا کرتے ہیں اور

کس طرح ہیں؟ اس نے عرض کہ کہ سب ارکانِ دولت قبلہ عالم کے جان و مال کو دعا کرتے ہیں۔ آپ کی فکر سے سب حیران و پریشان ہو رہے ہیں۔ جمال مبارک اپنا دکھایئے تو سب کی خاطر جمع ہووے، چناں چہ اس وقت دیوانِ عام میں حاضر ہیں۔

جب پہر دن چڑھا ایک بارگی پردہ اٹھا اور بادشاہ نے برآمد ہو کر تختِ مبارک پر جلوس فرمایا۔ نوبت خانے میں شادیانے بجنے لگے۔ سبھوں نے نذریں مبارک بادی کی گزرانیں۔ سب کے دل کو خوشی اور چین ہوا۔

ایک روز کتاب میں بھی لکھا دیکھا، کہ اگر کسی شخص کو غم یا فکر ایسی لاحق ہو کہ اس کا علاج تدبیر سے نہ ہو سکے تو چاہیے کہ تقدیر کے حوالے کرے اور آپ گورستان کی طرف رجوع کرے، یہ بات دل میں مقرر کر کے ایک روز رات کو موٹے جھوٹے کپڑے پہن کر روپے اشرفی لے کر، چپکے قلعے سے باہر نکلے اور میدان کی راہ کی، جاتے جاتے ایک گورستان میں پہنچے، نہایت صدق دل سے درود پڑھ رہے تھے، اور اس وقت بادِ تند چل رہی تھی، بلکہ آندھی کہا چاہیے۔ ایک بارگی بادشاہ کو دور سے ایک شعلہ سا نظر آیا کہ مانند صبح کے تارے کے روشن ہے۔ دل میں اپنے خیال کیا کہ اس آندھی اور اندھیرے میں یہ روشنی خالی حکمت سے نہیں۔ جو کچھ ہو سو ہو، چل کر دیکھا چاہیے شاید اس شمع کے نور سے میرے بھی گھر چراغ روشن ہو اور دل کی مراد ملے۔ یہ نیت کر کے اس طرف کو چلے۔ جب نزدیک پہنچے، دیکھا تو چار فقیر بینوا کفنیاں گلے میں ڈالے اور سر زانو پر دھرے، عالم بے ہوشی میں خاموش بیٹھے ہیں۔ اور ایک چراغ پتھر پر دھرا ٹمٹما رہا ہے۔ ہرگز ہوا اس کو نہیں لگتی گویا فانوس اس کا آسمان بنا ہے کہ بے خطرے جلتا ہے۔

آخر بادشاہ نے یہی کیا کہ ایک کونے میں اس مکان کے چپکا جا بیٹھا کہ کسی کو اس کے آنے کی آہٹ کی خبر نہ ہوئی، اپنا دھیان ان کی طرف لگایا کہ دیکھئے آپس میں کیا بات چیت کرتے ہیں۔ اتفاقاً ایک فقیر کو چھینک آئی، شکر خدا کا کیا، وہ تینوں قلندر اس کی آواز سے چونک پڑے، چراغ کو اکسایا، ٹھیپ تو روشن تھا، اپنے اپنے بستروں پر حقّے بھر کر پینے لگے۔ ایک ان آزادوں میں سے بولا: اے یارانِ ہمدرد و رفیقانِ جہاں گرد! ہم چار صورتیں آسمان کی گردش سے اور لیل و نہار کے انقلاب سے در بہ در خاک بہ سر ایک مدت پھریں۔ الحمدللہ کہ طالع کی مدد اور قسمت کی یاوری سے آج اس مقام پر باہم ملاقات ہوئی اور کل کا احوال کچھ معلوم نہیں کہ کیا پیش آوے، ایک گت رہیں یا جدا

جدا ہو جاویں۔ رات بڑی پہاڑ ہوتی ہے، ابھی سے پڑ پڑ رہنا خوب نہیں۔ اس سے یہ بہتر ہے کہ اپنی اپنی سرگزشت جو اس دنیا میں جس پر بیتی ہو (بشرطیکہ جھوٹ اس میں کوڑی بھر نہ ہو) بیان کرے، تو باتوں میں رات کٹ جائے۔ جب تھوڑی شب باقی رہے تب لوٹ پوٹ رہیں گے۔" سبھوں نے کہا یا ہادی! جو کچھ ارشاد ہوتا ہے۔ ہم نے قبول کیا۔ پہلے آپ ہی اپنا احوال جو دیکھا ہے شروع کیجئے تو ہم مستفید ہوں۔''

میر امن کی سوانح حیات

میر امن کی سوانح حیات:

میر امن دہلی میں 1748 کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان شہنشاہ ہمایوں کے زمانے سے عالمگیر ثانی کے عہد تک منصب داروں میں شامل رہا ہے۔ ان کے پاس اچھی خاصی جاگیر تھی مگر سورج مل جاٹ نے ان کی جاگیر چھین لی، ادھر احمد شاہ درّانی نے اس طرح تباہی مچائی کہ سب کچھ دہلی میں برباد ہو گیا۔ میر امن پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ کسی طرح عظیم آباد (پٹنہ) پہنچے۔ وہاں کچھ برس قیام کیا، مگر وہاں بھی حالات نے ساتھ نہیں دیا۔ مجبوراً کلکتہ کا سفر کرنا پڑا۔ وہاں بھی کچھ دن بیکاری میں گزارے۔ اس کے بعد نواب دلاور جنگ نے اپنے چھوٹے بھائی میر کاظم خاں کی اتالیقی پر مامور کر دیا۔ یہاں بھی دو سال کے بعد طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ کے بعد اس کے بعد میر بہادر علی حسینی کے توسط سے جان گل کرسٹ سے شناسائی ہوئی اور میر امن فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہو گئے۔ جہاں 4 جون 1806 تک تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے۔ اور وہیں 1806 میں انتقال ہوا۔

میر امن کی تصانیف

1۔ باغ و بہار 2۔ گنج خوبی

میر امن کی ادبی خدمات

مشہور زمانہ تصنیف ''باغ و بہار'' جس کا جادو دو سو سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود قائم ہے

اور جس کی شہرت ومقبولیت میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔اس کتاب نے اردو نثر کو ایک نئی سمت اور روشنی عطا کی ہے۔ باغ و بہار بنیادی طور پر ترجمہ ہے مگر اس کی شہرت اصل کتاب سے کہیں زیادہ ہے۔ترجمہ اتنا خوبصورت اور سلیس ہے کہ طبع زاد کا گمان گزرتا ہے اور اس کی خوبی یہ ہے کہ اس ترجمہ کا نہ صرف انگریزی میں ترجمہ ہوا بلکہ اردو کے مشہور محقق گارساں دتاسی نے فرانسیسی میں اس کا ترجمہ کیا۔ گفتگو کی زبان میں لکھی گئی اس کتاب کے مصنف میر امّن فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ہندوستانی شعبے میں تیسرے درجے کے ملازم تھے اور ان کی تنخواہ بھی دوسرے مصنفین اور مترجمین کے مقابلے میں معمولی تھی مگر محنت اور لگن نے میر امّن کے باغ و بہار کو آج بھی سرسبز رکھا ہے۔

میر امّن پر جب معاشی تنگی گزری تو وہ فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہو گئے۔ جہاں 4 جون 1806 تک تصنیف وتالیف کا کام کرتے رہے۔

فورٹ ولیم کالج سے وابستگی کے بعد میر امّن کو پہلا کام قصہ 'چہار درویش' کے اردو ترجمہ کا ملا۔انہوں نے جان گل کرسٹ کی ہدایت کے مطابق ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں اس کتاب کا ترجمہ کیا اور اتنا عمدہ ترجمہ کیا کہ کالج کی طرف سے اس پر 500 روپیہ کا انعام دیا گیا۔انہوں نے عطا حسین خان تحسین کے 'نوطرز مرصع' کو سامنے ضرور رکھا مگر اپنے طور پر اتنی تبدیلیاں کر دیں کہ اصل کتاب گم ہوگئی۔'باغ و بہار' میں چار درویشوں کی سرگزشت ہے اور آزاد بخت اس کے مرکزی کردار ہیں۔

میر امّن نے ترجمہ میں عربی، فارسی سے گریز کر کے ہندوی کا استعمال کیا ہے بلکہ دلّی کی زبان استعمال کی ہے اور مروجہ قواعد سے بھی انحراف کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ناقدین نے باغ و بہار میں قواعد کی غلطیاں بھی نکالی ہیں اور یہ لکھا ہے کہ اس میں واحد جمع اور تذکیر وتانیث کا بھی خیال نہیں رکھا گیا ہے۔اس کے باوجود باغ و بہار کی نثر بے مثال اور بے نظیر ہے۔

'باغ و بہار' کے علاوہ 'گنج خوبی' بھی میر امّن کی ترجمہ کی ہوئی کتاب ہے۔ ملا حسین واعظ کاشفی کی 'اخلاق محسنی' کا یہ ترجمہ ہے مگر اسے 'باغ و بہار' جیسی مقبولیت نصیب نہیں ہوئی۔

باغ و بہار کی ادبی اہمیت

باغ و بہار کی ادبی اہمیت:

فورٹ ولیم کالج میں قیام کے دوران گلکرسٹ نے میر امن سے قصہ چہار درویش کو آسان اور عام بول چال کی زبان میں لکھنے کی فرمائش کی تا کہ انگریز اردو سے واقف ہوسکیں، چنانچہ انھوں نے باغ و بہار کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ باغ و بہار کو جو شہرت اور مقبولیت ملی وہ اردو کی بہت کم کتابوں کو نصیب ہوئی ہے۔ اس کتاب کے ترجمے مختلف زبانوں انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی اور لاطینی میں ہوئے۔ باغ و بہار میں چار درویشوں کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اس کا مرکزی کردار آزاد بخت ہے۔

باغ و بہار سے اردو نثر میں پہلی مرتبہ سلیس اور آسان عبارت کا رواج ہوا جسے آگے چل کر غالب کی نثر نے اسے کمال تک پہنچا دیا۔ باغ و بہار کی چند امتیازی خصوصیات یہاں ذکر کی جاتی ہیں۔

اسلوب

باغ و بہار کی غیر معمولی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ اس کا دلکش اور دلنشین انداز بیان ہے۔ جو اسے اردو زبان میں ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ میر امن نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ کتاب کی زبان سادہ اور سلیس ہو اور بول چال کی زبان اور روزمرہ محاورہ کا خیال رکھا جائے۔

زبان

باغ و بہار اپنے وقت کی نہایت فصیح اور سلیس زبان میں لکھی گئی۔ میر امن دہلی کے رہنے والے ہیں اور اُن کی زبان ٹھیٹھ دہلی کی زبان ہے۔ وہ صرف دہلی کی زبان کو ہی مستند سمجھتے ہیں۔ اور اپنی زبان کو دلی کی مستند بولی کہتے ہیں۔ باغ و بہار زبان کی فصاحت اور سلاست کے لحاظ سے اردو کی دوسری کتابوں سے منفرد ہے۔ یہ اعجاز اسے دلکش طرزِ بیان اور اسلوبِ تحریر کی وجہ سے حاصل ہوا۔

سادگی

میر امن نے باغ و بہار میں نہایت سادہ اور دل کش اسلوب بیان اختیار کیا ہے۔ لیکن زبان کی سادگی کے باوجود اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کے اس میں ترنم و آہنگ پیدا ہو۔

الفاظ کا برمحل استعمال

لفظ کو اس کے صحیح مفہوم میں موقع و محل کی مناسبت سے استعمال کرنا اصل انشاء پردازی ہے اور یہی میر امن کا فن ہے۔

ہندوستانی الفاظ کا استعمال

اردو زبان میں فارسی الفاظ وتراکیب تشبیہات اور استعارات کو بڑا دخل حاصل ہے۔اس سے مفر نہیں فارسی زبان کے اثرات سے بچ کر اردو لکھنا بہت دشوار ہے۔لیکن میر امن نے اپنی تحریروں میں اعتدال کی روش کو اپنایا ہے۔۔ان کی زبان کا تجزیہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس میں عربی فارسی کے الفاظ کم اور ٹھیٹھ اردو کے الفاظ زیادہ ہیں۔

روزمرہ محاورہ

میر امن نے اپنی زبان میں روزمرہ اور محاورے کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔بول چال کے انداز کو ہر جگہ ترجیح دی ہے محاوروں کا اتنا خوبصورت استعمال کہ محاورہ آپ ہی اپنی شرح بھی ہوتا ہے اور عبارت کو سمجھنے میں کسی وسیلہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔

معاشرت اور تہذیب کی عکاسی

میر امن کی باغ و بہار میں دہلوی تہذیب ومعاشرت کی مرقع کشی اس خوبصورت اور دلکش پیرائے میں کی گئی ہے کہ اس کے آئینے میں اُس کا دور نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔اس میں اس عہد کی دلی کے اشخاص اور افراد کی چلتی پھرتی اور بولتی چالتی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔

یوں تو باغ و بہار ایک داستان ہے اس کی حیثیت اردو کے افسانوی ادب میں ایک سنگ میل کی سی ہے۔اور اسے زبان وادب کے ایک شاہکار کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔یہ اپنے زمانے کی اجتماعی زندگی کی ایک مکمل دستاویز ہے۔یہ اپنے عہد کے معاشرتی اور تہذیبی احوال وآثار وواقعات و کوائف کا مستند تاریخی ریکاڈ ہے۔انہی خصوصیات کی وجہ سے باغ و بہار کا نام ہمیشہ سدا بہار رہا،اور اردو نثر کی ارتقا میں میر امن کی اس کاوش کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

داستان ''باغ و بہار'' آغاز قصہ کا خلاصہ

ملک روم میں ایک بادشاہ تھا اس کا نام آزاد بخت تھا،وہ نہایت انصاف پسند،سخی اور فیاض شخص تھا۔اس کی رعایا خوش حال اور چین اور سکون سے زندگی بسر کر رہی تھی۔ملک بھر میں ایسا امن

تھا کہ کسی چور اور ڈاکو کا کسی کو خوف وخطر نہیں تھا۔ رعایا آرام سے اپنے کاروبار میں مصروف تھی۔ اس بادشاہ کی سلطنت اتنی وسیع اور کشادہ تھی کہ اس کے ماتحت کئی شہر اور بادشاہ تھے جو اس کو تاوان ادا کرتے تھے۔ آزاد بخت کو دنیا کی ہر نعمت میسر تھی لیکن پھر بھی وہ پریشان اور فکر مند رہتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اولاد کی دولت سے محروم تھا۔ وہ ہر نماز میں اللہ تعالی سے وارث اور اولاد کے لیے دعا کرتا تھا۔ اسی امید میں اس کی عمر چالیس برس کو پہنچ چکی۔ ایک دن وہ نماز سے فارغ ہوا اور آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا تو اچانک اسے اپنی مونچھوں میں ایک سفید بال نظر آیا، بادشاہ اپنے بوڑھے ہونے کے احساس سے بہت مغموم اور رنجیدہ ہوا۔ اور دل میں خیال کیا کہ افسوس اتنی عمر ناحق دنیاداری اور مال و دولت کو جمع کرنے میں گزار دیا، حالانکہ وہ تیرے کسی کام کے نہیں ہیں۔ تمہارے بعد کوئی اور اس کو اپنے قبضے میں کر لے گا اور ساری دولت ہڑپ لے گا۔ اس فکر میں بادشاہ نے ارادہ کیا کہ اب وہ حکومت اور عیش وعشرت چھوڑ کر درویشی اور فقیری اختیار کر لے گا۔ بقیہ زندگی خالق کی یاد میں بسر کرے گا۔ چنانچہ اس نے تمام خاص وعام درباریوں کو جمع کیا اور حکم دیا کہ سب اپنا اپنا کام کریں، کوئی مجھ سے ملاقات نہ کرے۔ بادشاہ آزاد بخت اپنے آپ کو ایک کمرہ میں بند کر لیا۔ وہ دن بھر روزہ رکھتا اور رات بھر عبادت میں مشغول ہو جاتا، کئی دن اسی طرح گزر گیے۔

جب یہ خبر پورے ملک میں پھیل گئی کہ بادشاہ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے تو سلطنت میں پھر فتنہ وفساد سر اٹھانے لگا۔ چور اور ڈاکوؤں نے لوٹ مار مچادی، باغیوں نے چاروں طرف سے سلطنت پر قبضہ کرنا شروع کر دیا، تمام درباری پریشان ہو گئے اور آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ کسی طرح سلطنت کو بچایا جائے۔ سب نے متفق ہو کر بادشاہ کے خاص وزیر کے پاس پہنچے جو بادشاہ سے قربت رکھتا تھا اور عاقل اور دانا تھا۔ اس سے کہا کہ تم بادشاہ کو تمام حالات سے باخبر کرو اور اگر اسی طرح غفلت مزید رہی تو ساری سلطنت ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ وزیر راضی ہوا اور بادشاہ سے ملاقات کے لیے آمادہ ہوا۔ اس نے بادشاہ سے ملاقات کی خواہش کی تو بادشاہ نے اسے اجازت دی۔ اس نے بادشاہ کی قدم بوسی کی اور تمام ملک کے حالات سے باخبر کرایا۔ پہلے بادشاہ نے اس کی بات نہ مانی۔ پھر وزیر نے بادشاہ کی اس طرح نصیحت کی کہ اے بادشاہ سلامت، اس خیال کو اپنے دل سے نکال دو کہ تمہیں اولاد کی نعمت نہیں ملے گی۔ اللہ کی نعمت سے مایوس ہونا کفر کے برابر ہے۔ اللہ نے چاہا تو

تمہیں اولاد کی عظیم نعمت مل سکتی ہے۔اس سلطنت کو تمہارے بزرگوں نے بڑی محنت اور مشقت سے قایم کی ہے اگر تم نے اسے ضائع کر دیا تو اللہ کے یہاں بھی جواب دہ ہو جاؤ گے،کل قیامت کے دن اللہ تعالی تم سے سوال کرے گا کہ اے بادشاہ میں نے تمہیں سلطنت کرنے کے لیے پیدا کیا تھا تم نے ہماری رحمت سے مایوس ہو کر اسے کیوں چھوڑ دیا؟۔خالق کو کیا جواب دو گے۔؟اللہ کی عبادت کے لیے فقیری اختیار کرنا اور جنگل جنگل پھرنا مناسب نہیں ہے۔بادشاہت کرتے ہوئے بھی تو عبادت محل میں ادا کر سکتے ہو۔شرط یہ ہے کہ خالص اللہ پر یقین کر کے عبادت کرو اور اسی سے مدد مانگو،ہوسکتا ہے کہ تمہارت مراد پوری ہو۔

بادشاہ کو وزیر کی بات سے دل کی تسلی ہوئی تو وہ پھر دربار میں آیا اور دوبارہ حکومت کرنے لگا۔ایک مرتبہ اس نے ایک کتاب میں لکھا دیکھا کہ اگر کسی کو کوئی پریشانی اور غم ہے اور اس کا علاج تدبیر سے نہ ہو تو تقدیر کے حوالے کر کے قبرستان میں جا کر روئے اور دنیا کی بے ثباتی کو یاد کرے تو اس کی مراد پوری ہوگی۔چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا۔ایک روز بھیس بدل کر قبرستان گیا،وہاں چار درویشوں سے اس ملاقات ہوئی اور چھپ کر ان کی بات سنی۔چاروں درویشوں نے اپنا اپنا قصہ سنایا۔بادشاہ کو بھی اللہ نے اولاد کی نعمت سے نوازا اور سبھی ہنسی خوشی رہنے لگے۔

UNIT-III

ڈرامہ ''گڑھ کی مکھیاں''

مصنف : ڈاکٹر کریم رومانی

کردار

نواب صاحب (مرکزی کردار)۔رشید (نواب صاحب کا بھانجا) ۔رحمت اللہ (نواب صاحب کا بھتیجا) سالا۔رحیم بھائی (دوست) ۔مرزا۔بڑی بیگم۔چھوٹی بیگم۔پنچ کا سردار۔قوال اور پارٹی۔

(پردہ اٹھتا ہے۔رحیم اور مرزا داخل ہوتے ہیں۔کمرے پر نظر دوڑاتے ہیں)

رحیم بھائی: نواب صاحب آج بھی کوئی پروگرام رکھ رئیں کیا کی!

مرزا : تمہیں معلوم نہیں! آج بھوپال کے ایک مشہور و معروف قوال آئے ہوئے ہیں۔انھیں کا آج پروگرام ہے۔نواب صاحب کو خدا سلامت رکھے۔ہر دن عید اور ہر شب، شبِ برات ہوتی ہے، ان کی محفل میں۔

(نواب صاحب، رشید اور رحمت کے ساتھ داخل ہوتے ہیں)

(قوال مع اپنی پارٹی کے داخل ہوتے ہیں)

قوال : آداب عرض ہے نواب صاحب۔

نواب : آداب۔ہاں بھئی سناؤ کوئی اچھی سی چیز۔ہم نے آپ کی بہت تعریف سنی ہے۔

قوال : ذرہ نوازی ہے۔ایک نظم سنیے۔

(قوال بیٹھ جاتے ہیں اور قوالی سناتے ہیں۔)

''ماٹی کے پتلے تجھے کتنا گمان ہے''

(قوالی ختم ہونے کے بعد سب ایک ایک کر کے چلے جاتے ہیں۔رحیم اور نواب صاحب رہ جاتے ہیں)

رحیم : نواب صاحب! سنے اپے! قوال کیا بولیا سو؟

نواب : کیا؟

رحیم : مرنے کے بعد تیرے احباب تیرے کپڑے اتارلیں گے۔ یہ سب بھانجے بھتیجے سالے بن کو تماری چاپلوسی کررئیں نا۔ یہ تمارے مرنے کے بعد تم کو دفن بی نیں کریں گے بلکہ کتوں کے مافق تماری دولت پوجھپٹ پڑیں گے۔

نواب : نہیں! وہ ایسے لالچی، خودغرض کبھی نہیں ہوسکتے۔ وہ تو میرے لیے اپنی جان تک قربان کرنے کے لیے ہروقت تیار رہتے ہیں۔

رحیم : تماری جان لیے نیں تو بس، ورنہ سب ٹک لیکو بیٹھیں۔

نواب : کیا تم سمجھتے ہو کہ میرے احباب صرف میری دولت کو چاہتے ہیں! مجھے نہیں؟

رحیم : نیں تو کیا، اُن کی محبت کو تمے سچّی سمجھیں؟ ذرا تُمے مرکو تو دیکھو! کیسا چیلاں جھپٹے سریکا جھپٹ تیئں کی نیں کی۔

نواب : تمہارا مطلب؟

رحیم : ذرا مرنے کی ایکٹنگ کرکو دیکھو۔ اُنو کتّی محبت کرتیں سو معلوم ہوتاے تمنا چ۔ دوستاں کو کیا کی چمچے، دسترخوان کے بلّے کتیں۔ اِنوں کاں کاں کے کی رشتہ داراں بن کو بیٹھیں ناں، اُنوں تُمارا کِتّا خیال کرتیں کی دیکھو؟

نواب : تم کہنا کیا چاہتے ہو؟

رحیم : کیا بی نیں۔ تمے چپکے ذرا دل کا دورہ پڑیا کرکوا ایکٹنگ کرو۔ ذرّے وقت کے واسطے مرجاؤ۔ پھر تمیچ دیکھو تماشہ۔ تمنا کو چ مالوم ہوتاے۔

نواب : اچھی بات ہے۔ میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں کہ میرے اپنے میرے مرنے کے بعد کیا کرتے ہیں؟

رحیم : میں جانتا ہوں کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔
پلاؤ کھائیں گے احباب، فاتحہ ہوگا
پلاؤ کیسا کھاتیں کی دیکھو۔ اچھا شروع ہوجاؤ۔

(نواب صاحب چھاتی پکڑ لیتے ہیں اور دل کے دورے کی اداکاری کرتے ہیں)

رحیم : نواب صاحب!۔۔۔نواب صاحب!۔۔۔ یہ آپ کو کیا ہو گیا؟ ارے کوئی ہے؟ ذرا ڈاکٹر کو بلاؤ۔۔۔۔بیگم صاحبہ! یہ دیکھو! نواب صاحب کو کیا ہو گیا ئے؟ ارے کوئی ہے؟

(بیگم صاحبہ اندر سے دوڑتی آتی ہیں)

بیگم : ہائے اللہ! میرے سرتاج کو کیا ہو گیا؟ ارے رشید، رحمت اللہ۔۔۔ جاؤ ذرا ڈاکٹر کو بلاؤ۔

(رشید اور رحمت اللہ اندر داخل ہوتے ہیں)

رشید : ہائے ماموں جان! یہ تمہیں کیا ہو گیا؟ میں نہ کہتا تھا آپ کا دل کمزور ہے۔ زیادہ دل پر بوجھ مت ڈالو۔ ان ہی حضرت نے ان کو خواہ مخواہ کے اندیشوں سے پریشان کر دیا ہو گا۔

رحیم : اجی حضّت! گالیاں مجے پھر کو دیتے لیو۔ پہلے جا کو ڈاکٹر کو بلا لے کو آؤ۔

رشید : میں ماموں جان کی خدمت میں ہی رہوں گا، ان کی دیکھ بھال کرتے ہوئے۔ رحمت اللہ! تم ذرا جا کر بلا لاؤ ڈاکٹر کو۔

رحمت : ارے مجھے خدمت کرنے کا موقع دو، چچا جان کی۔ تم جاؤ، میں یہیں رہتا ہوں۔

بیگم : ارے کوئی جائے گا بھی یا یوں ہی بحث کرتے رہو گے۔ دیکھتے نہیں! ان کی حالت کیسی نازک ہو رہی ہے۔

رشید : ہاں! رحمت اللہ بھئی۔ جاؤ.....جاؤ۔ میں ماموں جان کو دیکھتا رہوں گا۔

بیگم : ارے کوئی میرے بھائی جان کو بلاؤ۔ یہ لوگ تو ابھی سے لڑ رہے ہیں۔ خدا جانے میرا کیا ہو گا۔ رحمت اللہ! خدا کے لیے جاؤ، ڈاکٹر کو بلا لاؤ۔ اور ہاں میرے بھائی کو بھی اطلاع دینا۔

(رحمت اللہ جاتا ہے۔ نواب صاحب تڑپ رہے ہیں)

رشید : ماموں جان! تجوری کی چابی کہاں ہے؟ ادھر لائیے، ورنہ وہ رحمت اللہ، ایرا غیرا نتھو خیرا آپ کی دولت لوٹ لے گا۔

(رشید نواب صاحب کے کرتے کی جیب سے چابی نکالتا ہے)

رحیم : واہ رے بھانجے۔ نواب صاحب تڑپ رئیں اور تم چابی کی فکر میں ہیں۔ شرم نیں آتی۔

رشید : تم کون ہوتے ہو جی گھریلو معاملات میں دخل دینے والے۔ ماموں جان کی جائیداد کا میں ہی تو وارث ہوں۔ چابی میں نہ لوں گا تو کون لے گا۔

رحمت : (داخل ہوتا ہے) واہ بیٹا۔ مجھے ڈاکٹر کو بلا لانے کے لیے کہہ کر خود چیکنگ کر رہے ہو۔ لاؤ ادھر چابی ورنہ اچھا نہ ہوگا۔

(رشید اور رحمت لڑنے لگتے ہیں اور نواب صاحب ٹھنڈے پڑنے کی ایکٹنگ کرتے ہیں)

رحیم : اِنّاللہ و انّا الیہ راجِعون۔ لیو نواب صاحب تمارے ڈاکٹر لانے سے پہلیچ چلے گے۔

بیگم : یا اللہ! میں اب کہاں جاؤں رے اللہ! میری دنیا لُٹ گئی۔ آپ کہاں چلے گئے مجھے چھوڑ کر۔ (تڑپ تڑپ کر روتی ہے)

(اس دوران رشید اندر جاتا ہے اور تجوری کھول کر تمام نقدی سمیٹ کر لے جانے لگتا ہے)

رحمت : ٹھہرو۔ یہ تم کیا لے جا رہے ہو۔

رشید : تم سے مطلب! تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟

رحمت : میں ان کا بھتیجا ہوں۔ ان کا واحد وارث۔ تم کون ہوتے ہو ان کی دولت کو لوٹ کر لے جانے والے۔ یتیم بچّہ سمجھ کر تمہیں گھر میں جگہ دی تھی تو کیا تم وارث ہو گئے؟ رکھ دو یہ سب۔

(رحمت، رشید کا دامن کھینچتا ہے، نوٹ گر جاتے ہیں)

رشید : تو کیا تم ان کی اولاد ہو جو حق جتاتے ہو۔ تم کہاں کے بھتیجے جب کہ ماموں جان کے کوئی بھائی ہی نہیں تھے۔

رحمت : تم کہاں کے بھانجے جب کہ ان کی کوئی بہن ہی نہیں۔ ساری جائیداد کا حق دار میں ہوں۔ میں اولاد سے ہوں۔

رشید : وارث میں ہوں۔ میں آل سے ہوں۔

(نواب صاحب کے سالے صاحب داخل ہوتے ہیں)

سالا : ارے بھائی تم دونوں لڑتے ہی رہو گے؟ میری بہن کا کیا ہوگا؟

رشید : ان کا تو بس مہر کا حق ہے نا۔ سوا پانچ سو مل جائیں گے۔ آپ بے فکر رہیے۔

سالا : تو کیا میری بہن کا کوئی حق نہیں جائیداد میں؟

رشید : جائیداد وہ اپنے گھر سے نہیں لائیں۔ یہ تو میرے ماموں کی کمائی ہے۔

رحمت : ارے میرے چچا کی کمائی ہے۔ تو کون ہوتا ہے اِسے لے جانے والا؟ رکھ یہ سب۔

(دونوں لڑتے ہوئے باہر چلے جاتے ہیں)

سالا : (بیگم کے کان میں) آپا! میری سنو! جتنے بھی زیور گھر میں ہیں پہن لینا۔ کہہ دینا کہ یہ میرے میکے کے زیور ہیں۔ ورنہ یہ دونوں سالے تمہیں ننگا کر کے گھر سے نکال دیں گے۔

بیگم : میرا سہاگ لُٹ گیا اور تم کہتے ہو کہ زیور پہن کر بیٹھوں۔ لوگ کیا کہیں گے؟

سالا : تم لوگوں کے کہنے کی فکر کرتی رہو گی تو وہ سب گھر خالی کر دیں گے اور جائیداد پوری لوٹ لیں گے۔ تم کو کوئی نہیں پوچھے گا۔ چلو وہ دونوں آنگن میں لڑ رہے ہیں، تم فوراً زیورات پہن لو۔ اگر پنچایت بیٹھی تو کہہ دیں گے کہ یہ جہیز کے ہیں۔

(دونوں اندر جاتے ہیں)

رحیم : نواب صاب! دیکھے! تمارے بھانجے، بھتیجے، سالے سوب، کسے ملا سوانوں دبالیتیں۔ نواب صاحب کو دل کا دورا پڑیا کتو کون تو بی سالا گیا ڈاکٹر کو بلالیکو آنے۔ تمارا مردہ یہاں نچ پڑیائے تمارے سالے صاحب تماری بیگم کو نیا پلان سکھارئیں۔ زیوراں سب دبالیو کرکو۔ اگر تے سچی چ مر گئے رہتے تو بی تمارا مردہ سڑکو پڑیا رہتا پن کی کون بی اٹھاتا نیں۔ لیو! تمارے سالے صاب آرئیں۔

(سالا اندر داخل ہوتا ہے پیچھے پیچھے بیگم سارے زیورات پہنے آتی ہے اور روتی ہوئی بیٹھ جاتی ہے)

بیگم : آپ نے مجھے کس کے حوالے کیا! ایسی دغا نہیں دینی تھی! میرا سب کچھ لُٹ گیا۔ اللہ! میں اب کہاں جنگل میں رہوں کہ بیابان میں؟

رشید : (اندر داخل ہوتے ہوئے غصے کی حالت میں) مجھے چور کہتا ہے اور خود لوٹنا چاہتا ہے، غیروں کا مال۔ دیکھتا ہوں کسے بلا کر لاتا ہے۔ حرام خور سالا۔ (بیگم کی طرف دیکھ کر) ارے! یہ زیورات سب آپ نے کیوں پہن لیے۔

بیگم : تم یہ پیسے سب کیوں پار لگا رہے ہو۔

رشید : وہ میرے ماموں کا مال تھا۔ میں اس کا حق دار ہوں۔

بیگم : اور یہ زیور سب میرے باپ کے ہیں۔ یہ میں جہیز میں لائی تھی۔

رشید : ارے! ماموں جان تو کہہ رہے تھے کہ آپ کو تین جوڑوں میں شادی کر کے لائے تھے۔ آپ کے والد محترم کون سے لکھ پتی لالا ہیں کہ سو ڈیڑھ سو تولا سونا دے دیتے۔ وہ تو خود کنگال ہیں۔

بیگم : تم کہاں سے والی وارث بن گئے؟ یتیم بچہ سمجھ کر انہوں نے تمہیں سہارا دیا تو آج تم ہی وارث بن بیٹھے۔ تم کہاں کے بھانجے اور وہ کہاں کے بھتیجے، سب مفت خورے۔

رحیم : تمہیں یھو نچ لڑتے رھو مردہ سڑ کو جاتا ے۔ جاؤ جی پہلے ان کو نھلانے، دُھلانے، کفنانے دفنانے کا کیا تو بی کرو۔ یہ کیا تیری چھانچ میرے بیگن کر کو لڑتے ہیں۔

رشید : خاموش بیٹھو جی چچے خاں! تم کیوں ہمارے گھریلو معاملات میں دخل دیتے ہو۔ مردہ ہمارے ماموں کا ہے، تمہارے باپ کا نہیں۔ تم کیوں فکر کرتے ہو۔ جب تک ہمارا فیصلہ نہیں ہوگا، مردہ یہاں سے نہیں اٹھے گا۔

رحیم : تمارا کیا؟ برساں گئے تو بی فیصلہ نیں ہوتا۔ جب تک کیا تمے دفناتے بی نیں، بڈھے کو۔

رشید : برف میں رکھیں گے۔ تم کیوں فکر کرتے ہو۔

(رحمت اللہ پنچوں کے ساتھ اندر داخل ہوتا ہے)

رحمت : دیکھیے پنچو! چچا جان کا دم کیا نکلا کہ یہ سب مال متاع، دولت پیسہ سب پار لگا رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ میرا کوئی حق نہیں۔ آپ فیصلہ کریں۔ آخر میں بھی تو حق دار ہوں۔

پنچ کا سردار: بھئی! تم اس طرح آپس میں مت لڑو، ورنہ معاملہ کورٹ کچہری تک جائے گا۔ دونوں کی بربادی ہوگی۔ بیٹھو! ٹھنڈے دل سے فیصلہ کرلو۔

رشید : تم سب کیوں آئے ہو؟ تمہیں کس نے بلایا فیصلے کے لیے؟

پنچ : بھئی، رحمت اللہ نے فریاد کی کہ آپ لوگ آ کر ہمارا فیصلہ کریں سو ہم آئے ہیں۔

رشید : تو اُن کے گھر جایئے اور ان کا فیصلہ کر دیجیے۔ یہ میرا گھر ہے اس پر کسی کا حق نہیں۔

(چھوٹی بیگم داخل ہوتی ہے)

چھوٹی بیگم: اویمّو !بینتا پنی ائی پوئے ۔نتّو وَدِلی ویلّی پوتی وانا راجا۔اب میرا یلا را۔نا کو بینتا موسم چیسی پوتی وی نا راجا۔نا کو ماڑی لِکّو دیتوں کر کو چپّی اُنٹی وے۔اب یَو رو راسی اِستا رونا کو!

رحمت : یہ کہاں سے ٹپک پڑی بیچ میں منحوس! نکالو اسے باہر۔

چھوٹی بیگم: کیسا نکالتا ورا نتّو ۔نا موگونی اِلّو اِدی۔

رشید : کیا تجھ سے شادی کی تھی میرے ماموں نے؟

چھوٹی بیگم: لے کا! نی لا اَنو کونٹی وا! تو یَو ری کی پوٹّا وَرا! نا کا، نا اَکّا کا؟

پنچ : ہاں بھئی! اس کا بھی تو فیصلہ کرنا ہے۔سُنا تھا نواب صاحب نے اس کے ساتھ نکاح کیا تھا۔اب وہ بے چاری کہاں جائے گی۔اس کا بھی تو حق ہے۔

رحمت : آپ کو، میں لے کے آیا ہوں۔پہلے میرا فیصلہ کریں بعد میں اس کا۔

رشید : فیصلہ میں کر دوں گا تمہارا ابھی اور اسی وقت۔تم سب نکل جاؤ۔(سب کو دھکیلتا ہے)

سالا : پہلے تم نکلو گھر سے۔کمینے، احسان فراموش۔جب تک میری بہن زندہ ہے تم کو ایک پائی بھی نہیں ملے گی۔

چھوٹی بیگم: اَونو، اِنکا منَ مِدّ رم بَتی کے اُنا مو! (ہم دونوں ابی مرے نیں۔) ان کا کیا حق؟

رحمت : تم! پہلے تم نکلو یہاں سے۔

رشید : دیکھتا ہوں مجھے کون نکالتا ہے۔ابھی تم سب کو دیکھتا ہوں۔(سب آپس میں ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے ہیں)

نواب : (اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں) ٹھہرو! میں ابھی زندہ ہوں۔

رشید : ارے! بھوت!!!!(سب لوگ بھوت، بھوت کہہ کر ادھر ادھر دوڑنے لگتے ہیں)

نواب : بھوت! یہ میرا نہیں تمہارا بھوت ہے۔

سالا : بھائی جان آپ ابھی زندہ ہیں۔

نواب : نہیں تو کیا یہ سمجھ لیا کہ سچ مچ مر گیا ہوں۔میں دیکھنا چاہتا تھا کہ میرے رشتہ دار، میرے مرنے کے بعد کیا کرتے ہیں۔میں نے دیکھ لیا کہ تم سب خود غرض ہو، احسان فراموش

ہو۔ارے! تم کو اتنی بھی فکر نہیں کہ میں مرا پڑا ہوں اور تم نے میری تجہیز و تکفین کا بھی خیال نہیں کیا۔ارے تم سے تو غیر بہتر ہیں۔ خیر اب میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میری جائیداد میں سے تم لوگوں کو ایک پائی بھی نہیں ملے گی۔ساری دولت کسی یتیم خانے کے نام وقف کردوں گا۔ ہاں! یہ بڑا مکان بڑی بیگم کے نام اور چھوٹا گھر چھوٹی بیگم کے نام کردوں گا۔ارے تم سے تو بہتر وہ یتیم بچے ہوں گے جو مجھے یاد کریں گے۔نکل جاؤ تم سب یہاں سے۔میں تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔ چلے جاؤ!

رحیم : دیکھ لیے نواب صاحب! آپ کے سگّے۔ابھی تھوڑی دیر ایسا ہچ سوئے رہتے تو انوں تمارے کپڑے بی اُتار لیتے،تمنا ننگا دفن کردیتے۔میں بولیا نیں:

میں جانتا ہوں کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

نواب : رحیم بھائی! تم ٹھیک کہتے تھے۔کل ہی میری وصیت تیار کرواؤ۔(رشید، رحمت وغیرہ سے مخاطب ہوکر) چلے جاؤ تم سب! نمک حرامو! آج سے اپنی صورت بھی نہ دکھانا! کمینو!

(پردہ گرتا ہے)

کریم رومانی کی سوانح حیات

ڈاکٹر کریم رومانی۔حیات اور کارنامے:

کریم رومانی کا اصل نام عبدالکریم اور رومانی تخلص ہے۔وہ یکم جولائی 1936ء کو کدری میں پیدا ہوئے۔اُن کے والد محترم جناب غنی میاں مرحوم کپڑے کے بڑے تاجر تھے اور ان کا شمار کدری کے اہلِ ثروت لوگوں میں ہوتا تھا۔ابتدائی تعلیم کدری میں حاصل کرنے کے بعد کریم رومانی نے گریجویشن کے لیے کرنول کا رخ کیا۔ یہاں انھیں اس وقت کے اُستاد شاعر غضنفر زیدی سے شرف تلمّذ حاصل ہوا اور آپ نے اُن سے کلاسیکی شاعری کے رموز سیکھے۔یم۔اے اردو کے لیے سری وینکٹیسورا یونی ورسٹی، تروپتی میں داخلہ لیا۔اس وقت شعبے میں دوسرے اساتذہ کے ساتھ مشہور ترقی

پسند شاعر شہاب جعفری بھی تھے۔ڈاکٹر رومانی اُن سے قریب ہوتے گئے اور مرور ایّام کے ساتھ یہ قربت بے لوث محبت میں تبدیل ہوگئی، جس کا اثر ان کی شخصیت اور شاعری دونوں پر پڑا۔ تکمیل تعلیم کے کچھ ہی دنوں کے بعد ادونی آرٹس کالج، ادونی میں انھیں اردو لیکچرار کی ملازمت مل گئی۔آپ نے اپنی ملازمت کے دوسرے تیسرے دہے میں پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کی نگرانی میں جدیدیت کے رجحان پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا اور 1992 میں آپ کو ڈاکٹریٹ کی سند عطا کی گئی۔ڈاکٹر رومانی عمر بھر ادونی سائنس اینڈ آرٹس کالج کے شعبہء اردو سے وابستہ رہے۔یہی اُن کی پہلی مستقل ملازمت تھی اور یہی آخری۔وہ ایک کامیاب استاد تسلیم کیے جاتے رہے۔وہ اپنے طلبہ سے بے حد محبت کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ علم کے خزانے لٹانے کے ساتھ ساتھ محبت کے انمول موتی بھی بکھیرتے تھے۔ اور طلبہ ہمہ وقت ان سے علم سیکھنے کے لیے مستعد رہتے تھے۔یہی ایک کامیاب معلم اور مدرس کی علامت ہے۔ڈاکٹر کریم رومانی ابھی سروس ہی میں تھے۔سبکدوشی سے چند ماہ قبل ۹۱/ فروری 1994ء بمطابق 7/رمضان المبارک 1415ھ کو اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔

ڈاکٹر کریم رومانی کی ڈرامہ نگاری:

ڈاکٹر رومانی کو ڈرامے کے فن سے جذباتی لگاؤ تھا۔وہ ڈرامے لکھتے بھی تھے، ہدایت بھی دیتے تھے اور انھیں اسٹیج بھی کرواتے تھے۔کالج کے طلبہ ہی اُن کے کردار ہوتے اور یہ ڈرامے ہر سال ادونی آرٹس کالج میں سالانہ جلسے کے وقت کھیلے جاتے۔اُن کا ایک ڈرامہ ''گڑھ کی مکھیاں'' کئی شہروں میں کھیلا گیا۔ابھی کچھ سال پہلے یونی ورسٹی آف حیدرآباد میں یہ ڈرامہ نہایت کامیابی کے ساتھ کھیلا گیا۔اس ڈرامہ میں ایک زوال یافتہ نواب کی داستان حیات بیان کی گئی ہے کہ کس طرح انہیں لوگ اپنی عیاری اور مکاری اور حرص وطمع کا نشانہ بناتے ہیں۔اس ڈرامے کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ جب بھی کھیلا جاتا، نیا لگتا۔ڈاکٹر رومانی کی ڈرامہ نگاری کی خاصیت یہ ہے کہ انہوں نے بول چال کی زبان میں ڈرامے لکھے اور ضرورت کے مطابق ان میں قوالیاں بھی رکھیں، نظمیں بھی اور شادی کے سہرے بھی۔ان کے ڈرامے محض تفنن طبع کے لیے نہیں لکھے جاتے تھے بلکہ معاصر مسائل پر لکھے جانے کی وجہ سے ان میں اصلاحِ معاشرہ کا پیغام بھی موجود ہوتا تھا جو اختتام ڈرامہ پر لوگوں کے دلوں

پر اثر انداز ہوتا تھا۔ان کے مشہور ڈرامے ''اندر سبھا'' اور ''جلوہ اسٹوڈیو'' بہت مقبول رہے۔

ڈاکٹر کریم رومانی نے بہت سے ڈرامے لکھے۔بعض کو بہت حد شہرت حاصل ہوئی۔ان کے ڈراموں کی فہرست یہ ہے۔

گڑھ کی مکھیاں
گھر کا بڑا
تنتر منتر
شیخ صاحب
اندر سبھا
گفتار کے غازی
اناتھ بچہ
بیگن کا بھرتہ

ڈرامہ ''گڑھ کی مکھیاں'' کا خلاصہ

کریم رومانی جنوبی ہند کی ایک مشہور و معروف ادبی شخصیت ہیں۔انہوں نے نظم نثر دونوں اصناف میں نام کمایا۔ڈراما نگاری میں بہت سے ادیبوں نے اپنے فن کے جوہر دکھائے لیکن دکنی لب ولہجہ کا ڈرامہ شاید اس معیار کا کسی نے نہ لکھا ہو۔ڈرامہ ''گڑھ کی مکھیاں'' ایک سماجی ڈرامہ ہے جس میں ہمارے سماج کے ایسے افراد کی تصویر کشی کی گئی ہے جو صرف مال و دولت کی حرص وطمع دلوں میں بسائے رکھے ہیں۔ان کے نزدیک رشتہ داروں کا خلوص،عزیز واقارب کی محبت کوئی معنی نہیں رکھتی ،رشتہ داری صرف صاحب دولت اشخاص سے کی جاتی ہے۔غریب اور نادار لوگوں سے رشتہ استوار رکھنا ان کے لیے معیوب ہوتا ہے۔

کریم رومانی نے سماج کے ان عناصر پر کاری ضرب کی ہے جو صرف اپنے مفاد کے لیے جیتے ہیں دوسروں کا دکھ درد ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا، چاہے کچھ بھی ہو جائے پہلے اپنا مطلوب ومقصود پورا ہو۔

ڈرامہ ''گڑھ کی مکھیاں'' میں رشید (بھانجا)،رحمت اللہ (بھتیجا)،سالا،رحیم بھائی (دوست)

،مرزا، بڑی بیگم، چھوٹی بیگم، پنچ کا سردار، قوال اور پارٹی جیسے کرداروں پر محیط ہے نواب صاحب کے کردار کو مرکزیت اور اولیت حاصل ہے جو بھولے بھالے اور معصوم لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں ۔دوسرے کرداروں میں نواب صاحب کے مخلص دوست رحیم بھائی ہیں جو ریا ونمود اور اخلاص وصفا کے پیکر ہیں اور ایسے مخلص دوست کی نمائندگی کرتے ہیں جو اپنے دوستوں کے تئیں ہمدردی کا جذبہ رکھتے ہیں انہیں مال و دولت سے کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ دیگر کرداروں میں نواب صاحب کے بھانجے اور بھتیجے اور دو بیوی شامل ہیں۔

نواب صاحب ایک دولت مند شخص ہیں۔ان کے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے صرف اولاد کی کمی ہے، بھانجے اور بھتیجے کو اپنے قریب کر کے اس کمی کو وہ پورا کرنا چاہتے ہیں ۔ بھانجا اور بھتیجا دونوں نواب صاحب سے خلوص و وفا کا ڈھونگ رچاتے ہیں ۔نواب صاحب اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ ان کے رشتہ داران پر جان چھڑکتے ہیں، ان کے ہر حکم پر تسلیم ورضا خم کرتے ہیں۔حالانکہ وہ نہایت لالچی ، بدطینت ،مفاد پرست اور ابن الوقت ہوتے ہیں۔رشتہ داروں کی حقیقت کو آشکارا کرنے کے لیے اور نواب صاحب کی خوش فہمی دور کرنے کے لیے ان کے مخلص دوست رحیم بھائی انہیں یہ مشورہ دیتے ہیں کہ دل کا دورہ پڑنے کے بہانے اپنے رشتہ داروں کی حقیقت جانیے۔

نواب صاحب دل کا دورہ پڑنے اور مرنے کی ایکٹنگ کرتے ہیں اور اپنے تمام رشتہ داروں کی حقیقت کو سمجھ جاتے ہیں ۔نواب صاحب کو دل کا شدید دورہ پڑتا ہے ۔رشتہ داران کے قریب آتے ہیں لیکن بہت اصرار کے بعد بھی کوئی ڈاکٹر کو بلانے اس لیے نہیں جاتا کہ کہیں کوئی نواب صاحب کی دولت ہڑپ نہ لے۔تمام رشتہ دار نواب صاحب کے قریب جمع ہوجاتے ہیں لیکن کسی کو ان کے علاج کی فکر نہیں ہوتی۔سبھی اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ کب نواب صاحب اس دار فانی سے رخصت ہوں گے اور کب ان کی ساری جائیداد کو ہڑپ لیں۔نواب صاحب کی جب وفات ہوتی ہے تو تجہیز وتکفین کے انتظامات کے بجائے ان کی ساری پونجی اور جائیداد کو ہتھیانے کا منصوبہ بنانے میں مشغول ہوجاتے ہیں۔رشتہ دار تو رشتہ داران کی خاص بیوی بھی بے وفا نکلتی ہے۔نواب صاحب سب کا اصلی چہرہ دیکھ لیتے ہیں اور سب کو اپنی جائیداد سے بے دخل کر دیتے ہیں۔اور اپنی ساری جائیداد کو ایک یتیم خانے کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔

کریم رومانی نے ڈرامہ گڑھ کی مکھیاں میں سماج کے ان عناصر کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے جن کے چہروں پر تکلف و تصنع، تملق و چاپلوسی اور مطلب پرستی اور ریاکاری کا نقاب پڑا ہوا ہے ۔ جہاں تک زبان و بیان اور اسلوب اور طرز نگارش کی بات ہے کریم رومانی نے اس ڈرامہ کو خالص دکنی لب ولہجہ میں لکھنے کی کوشش کی ہے جس میں ہلکا سا مزاح شامل ہو گیا ہے ۔ دکنی لب ولہجہ سے واقف اور شناسا قارئین کے لیے یہ ڈرامہ کسی عطیہ سے کم نہیں ہے۔

UNIT-IV

ناول ''توبتہ النصوح'' (کلیم کا مرزا ظاہر دار بیگ کے یہاں مہمان بن کر جانا)

اب ہم کو کلیم اور نعیمہ، دونوں بھائی بہنوں کا حال بیان کرنا چاہیے کہ باپ کے گھر سے نکل کر ان پر کیا بیتی۔ سو، چوں کہ کلیم پہلے نکلا، پہلے اسی کا حال بیان کرتے ہیں۔

کئی بار اس کو باپ نے بلوایا، یہاں تک کہ ہار کر رقعہ لکھا۔ ماں نے بہتیرا سمجھایا، بھائی نے بہت کچھ کہا سنا لیکن وہی روبراہ نہ ہوا اور جب دیکھا کہ فہمیدہ، صالحہ کے اتروانے میں مصروف ہے، آنکھ بچا، بے پوچھے، بے کہے گھر سے اس طرح نکل کھڑا ہوا کہ گویا اس کو کچھ تعلق ہی نہ تھا۔ اس دفعہ بھی وہ ضرور یہ توقع جی میں لے کر نکلا تھا کہ گلی سے نکلتے نکلتے نوکر اس کے پیچھے دوڑیں گے اور اس امید میں اس نے اپنے دوست مرزا ظاہر دار بیگ کے گھر پہنچتے پہنچتے کوئی سینکڑوں ہی مرتبہ پیچھے پھر پھر کر دیکھا۔ مگر واقع میں یہ اس کی غلط فہمی تھی۔

وہ گھر سے نکل کر ایسا بے تکلف مرزا ظاہر دار بیگ کی طرف کو مڑا، جیسے مطلق العنان گھوڑا تھان کی طرف رخ کرتا ہے۔ مرزا کی ظاہر داری نے اس کو اس قدر دھوکہ دے رکھا تھا کہ وہ ان کو ماں، باپ، بھائی، بہن، خویش و اقارب، سب سے بڑھ کر اپنا خیر خواہ، سب سے زیادہ اپنا دوست سمجھتا تھا اور بے امتحان، بے آزمائش، اس کو مرزا پر ایسا تکیہ و اعتماد تھا کہ شاید دانش مند آدمی کو، متواتر تجربوں کے بعد بھی، کسی دوست پر نہیں ہوسکتا۔

قصہ کوتاہ، کلیم شیخ چلی کے سے منصوبے سوچتا ہوا اپنے دوست مرزا کے مکان پر پہنچا۔ ہر چند ابھی کچھ ایسی بہت رات نہیں گئی تھی لیکن مرزا جیسے نکمے، بے فکرے کبھی کی لمبی تان کر سو چکے تھے۔ کلیم نے جو دروازے پر دستک دی تو جواب ندارد۔

کلیم سے اور مرزا سے محفل مشاعرہ میں تعارف ہوا۔ شدہ شدہ مرزا صاحب کلیم کے گھر پر تشریف لانے لگے۔ یہاں تک کہ چند روز سے تو دونوں میں ایسی گاڑھی چھننے لگی تھی کہ گویا یک جان

دو قالب تھے۔ کلیم کو تو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی بھی اتفاق نہیں ہوا مگر مرزا، شام کو تو کبھی کبھی، لیکن صبح کو بلا ناغہ آتے اور تمام تمام دن کلیم کے پاس رہتے۔ مرزا نے اپنا حال اصلی کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کلیم یہی جانتا تھا کہ جمعدار کا ترکہ مرزا کو ملا اور وہ جمعدار کی محل سرا کو مرزا کی محل سرا اور جمعدار کے دیوان خانے کو مرزا کا دیوان خانہ اور جمعدار کے بیٹے پوتوں کے نوکروں کو مرزا کے نوکر سمجھتا تھا اور اسی غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا تو سیدھا جمعدار کے محل سرا کی ڈیوڑھی پر جا موجود ہوا۔ بار بار کے پکارنے اور کنڈی کھڑکھڑانے سے دو لونڈیاں چراغ لئے ہوئے اندر سے نکلیں، اور ان میں سے ایک نے پوچھا: " کون صاحب ہیں اور اتنی رات گئے کیا کام ہے؟۔

کلیم : جاؤ مرزا کو بھیج دو۔

لونڈی : کون مرزا؟

کلیم : مرزا ظاہر دار بیگ جن کا مکان ہے اور کون مرزا۔

لونڈی : یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں ہے۔

اتنا کہہ کر قریب تھا کہ لونڈی پھر کواڑ بند کر لے جلدی سے کلیم نے کہا: " کیوں جی کیا یہ جمعدار صاحب کی محل سرا نہیں ہے؟"

لونڈی : ہے کیوں نہیں۔

کلیم : پھر تم نے یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں۔ کیا ظاہر دار بیگ جمعدار کے وارث اور جانشین نہیں ہیں؟

لونڈی : جمعدار کے وارثوں کو خدا سلامت رکھے، مُوا ظاہر دار بیگ جمعدار کا وارث بننے والا کون ہوتا ہے۔

دوسری لونڈی: اری کم بخت! یہ کہیں مرزا بانکے کے بیٹے کو نہ پوچھتے ہوں۔ وہ ہر جگہ اپنے تئیں جمعدار کا بیٹا بنایا کرتا ہے۔ (کلیم سے مخاطب ہو کر) " کیوں میاں! وہی ظاہر دار بیگ نا، جن کی رنگت زرد زرد ہے، آنکھیں کرنجی، چھوٹا سا قد، دبلا ڈیل، اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رہا کرتے ہیں۔

کلیم : ہاں ہاں، وہی ظاہر دار بیگ۔

لونڈی : تو میاں، اس مکان کے پچھواڑے، اپلوں کی ٹال کے برابر ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے، وہ اس میں رہتے ہیں۔

کلیم نے وہاں جا کر آواز دی تو کچھ دیر بعد مرزا صاحب ننگ دھڑنگ، جانگھیا پہنے ہوئے باہر تشریف لائے اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے اور بولے: آہا! آپ ہیں۔ معاف کیجئے گا، میں سمجھا کوئی اور صاحب ہیں۔ بندے کو کپڑے پہن کر سونے کی عادت نہیں۔ میں ذرا کپڑے پہن آؤں تو آپ کے ہم رکاب چلوں۔

کلیم : چلیے گا کہاں؟ میں آپ ہی کے پاس تک آیا تھا۔

مرزا : پھر اگر کچھ دیر تشریف رکھنا منظور ہو تو میں اندر پردہ کرادوں۔

کلیم : میں آج شب کو آپ ہی کے یہاں رہنے کی نیت سے آیا ہوں۔

مرزا : بسم اللہ، تو چلیے اسی مسجد میں تشریف رکھیے، بڑی فضا کی جگہ ہے۔ میں ابھی آیا۔

کلیم نے جو مسجد میں آ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت پرانی چھوٹی سی مسجد ہے، وہ بھی مسجد ضرار کی طرح ویران، وحشت ناک، نہ کوئی حافظ ہے، نہ ملا، نہ طالب علم، نہ مسافر۔ ہزارہا چمگدڑیں اس میں رہتی ہیں کہ ان کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود کھرنجے کا فرش بن گیا ہے۔

مرزا کے انتظام میں کلیم کو چار و ناچار اسی مسجد میں ٹھہرنا پڑا۔ مرزا آئے بھی تو اتنی دیر کے بعد کہ کلیم مایوس ہو چکا تھا۔ قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے، مرزا صاحب، بطور دفع دخل مقدر، فرمانے لگے کہ بندے کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے، خفقان کا عارضہ، اختلاج قلب کا روگ ہے۔ اب جو میں آپ کے پاس سے گیا تو ان کو غش میں پایا، اسی وجہ سے دیر ہوئی۔ پہلے تو یہ بتائیے کہ اس وقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے؟

کلیم نے باپ کی طلب، اپنا انکار، بھائی کی التجا، ماں کا اصرار، تمام ماجرا کہہ سنایا۔

مرزا : پھر اب ارادہ کیا ہے؟

کلیم : سوائے اس کے کہ اب گھر لوٹ کر جانے کا ارادہ تو نہیں ہے، اور جو آپ کی صلاح ہو۔

مرزا : خیر، نیت شب حرام، صبح تو ہو۔ آپ بے تکلف استراحت فرمایئے۔ میں جا کر بچھونا وغیرہ

بھیجے دیتا ہوں اور مجھ کو مریضہ کی تیارداری کے لئے اجازت دیجئے کہ آج اس کی علالت میں اشتداد ہے۔

کلیم : یہ ماجرا کیا ہے؟ تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں دوہری محل سرائیں، متعدد دیوان خانے، کئی پائیں باغ ہیں۔ حوض اور حمام اور کٹرے اور گنج اور دوکانیں اور سرائیں، میں تو جانتا ہوں کہ عمارت کی قسم کی کوئی چیز ایسی نہ ہوگی جس کو تم نے اپنی ملک نہ بتایا ہو، یا یہ حال ہے کہ ایک متنفس کے واسطے ایک شب کے لیے تم کو جگہ میسر نہیں۔ جو جو حالات تم نے اپنی زبان سے بیان کئے، ان سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ جمعدار کے تمام ترکے پر تم قابض اور متصرف ہو۔ لیکن میں اس تمام جاہ وحشمت کا ایک کرشمہ بھی نہیں دیکھتا۔

مرزا : آپ کو میری نسبت سخن سازی کا احتمال ہونا سخت تعجب کی بات ہے۔ اتنی مدت مجھ سے آپ سے صحبت رہی، مگر افسوس ہے کہ آپ نے میری طبیعت اور میری عادت کو نہ پہچانا۔ یہ اختلاف حالت جو آپ دیکھتے ہیں، اس کی ایک وجہ ہے۔ بندے کو جمعدار صاحب مرحوم ومغفور نے متبنیٰ کیا تھا اور اپنا جانشین کر مرے تھے۔ شہر کے کل رؤسا اس سے واقف وآگاہ ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس میں رخنہ اندازیاں کیں۔ بندے کو آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں دور بھاگتا ہے۔ صحبت ناملائم دیکھ کر کنارا کش ہوگیا۔ لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ، بندوبست کا حوصلہ نہیں۔

اسی روز سے اندر باہر واویلا مچی ہوئی ہے اور اس واسطے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندے کو منالے جائیں۔

کلیم : لیکن آپ نے کبھی اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا۔

مرزا : اگر میں آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا تو استقلال مزاج سے بے بہرہ اور غیرت و حمیت سے بے نصیب ٹھہرتا۔ اب آپ کو کھڑے رہنے میں تکلیف ہوتی ہے، اجازت دیجئے کہ میں جا کر بچھونا بھجوادوں اور مریضہ کی تیارداری کروں۔

کلیم : خیر، مقام مجبوری ہے۔ لیکن پہلے ایک چراغ تو بھیج دیجئے، تاریکی کی وجہ سے طبیعت

اور بھی گھبراتی ہے۔

مرزا : چراغ کیا میں نے تو لمپ روشن کرانے کا ارادہ کیا تھا لیکن گرمی کے دن ہیں، پروانے بہت جمع ہو جائیں گے اور آپ زیادہ پریشان ہو جیے گا اور اس مکان میں ابابیلوں کی کثرت ہے، روشنی دیکھ گرنے شروع ہوں گے اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گے۔ تھوڑی دیر صبر کیجئے کہ ماہتاب نکلا آتا ہے۔

کلیم جب گھر سے نکلا تو کھانا تیار تھا لیکن وہ اس قدر طیش میں تھا کہ اس نے کھانے کی مطلق پروانہ کی اور بے کھائے نکل کھڑا ہوا۔ مرزا سے ملنے کے بعد وہ منتظر تھا کہ آخر مرزا خود پوچھیں ہی گے تو کہہ دوں گا۔ مرزا کو ہر چند کھانے کی نسبت پوچھنا ضرور تھا، کیوں کہ اول تو کچھ ایسی رات زیادہ نہیں گئی تھی، دوسرے یہ کہ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے لڑ کر نکلا ہے، تیسرے دونوں میں بے تکلفی غایت درجے کی تھی۔ لیکن مرزا قصداً اس بات سے متعرض ہی نہ ہوا اور کلیم بے چارے کا بھوک کے مارے یہ حال کہ مسجد میں آنے سے پہلے اس کی انتڑیوں نے قل ہواللہ پڑھنی شروع کر دی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اس پہلو پر نہیں آتا اور عن قریب تمام شب کے واسطے رخصت ہوا چاہتا ہے، تو بے چارے نے بے غیرت بن کر کہا کہ، سنو یار، میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔

مرزا : سچ کہو! نہیں جھوٹ، بہکاتے ہو۔

کلیم : تمہارے سر کی قسم، میں بھوکا ہوں۔

مرزا : مرد خدا، آتے ہی کیوں نہ کہا؟ اب اتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے۔ دوکانیں سب بند ہو گئیں اور جو دو ایک کھلی بھی ہیں تو باسی چیزیں رہ گئی ہوں گی، جن کے کھانے سے فاقہ بہتر، گھر میں آج آگ تک نہیں سلگی۔ مگر ظاہراً تم سے بھوک کی سہار ہونی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ دیو اشتہا کو زیر کرنا بڑی ہمت والوں کا کام ہے۔ ایک تدبیر سمجھ میں آتی ہے کہ جاؤں چھدامی بھڑ بھونجے کے یہاں سے گرما گرم خستہ چنے کی دال بنوا لاؤں۔ بس ایک دھیلے کی مجھ کو تم کو دونوں کو کافی ہوگی، رات کا وقت ہے۔

ابھی کلیم کچھ کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ مرزا جلدی سے اٹھ باہر گئے اور چشم زدن میں چنے بھنوا لائے۔ مگر دھیلے کا کہہ کر لیے تھے، یا تو کم لایے یا راہ میں دو چار پھنکے لگا یے، اس واسطے کہ کلیم کے

روبرو دو تین مٹھی چنے سے زیادہ نہ تھے۔

مرزا : یار ہو بڑے خوش قسمت کہ اس وقت بھاڑ مل گیا۔ ذرا، واللہ ہاتھ تو لگاؤ، دیکھو تو کیسے بھلس رہے ہیں اور سوندھی سوندھی خوش بو بھی عجب ہی دلفریب ہے کہ بس بیان نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔ کوئی فن کمال بھی کیا چیز ہے۔ دیکھیے، اتنی تو رات گئی ہے مگر چھدامی کی دکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ بندے نے تحقیق سنا ہے کہ حضور والا کے خاصے میں چھدامی کی دوکان کا چنا بلا ناغہ لگ کر جاتا ہے۔ اور واقع میں ذرا غور سے دیکھیے، کیا کمال کرتا ہے کہ بھونے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے۔ بھئی تمہیں میرے سر کی قسم سچ کہنا، ایسے خوب صورت، خوش قطع، سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے؟ دال بنانے میں اس کو یہ کمال حاصل ہے کہ کسی دانے پر خراش تک نہیں، ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور اور دانوں کی رنگت دیکھیے۔ کوئی بسنتی ہے، کوئی پستی، غرض دونوں رنگ خوش نما۔ یوں صدہا قسم کے غلے اور پھل زمین سے اوگتے ہیں لیکن چنے کی لذت کو کوئی نہیں پاتا۔ آپ نے وہ ایک ظریف کی حکایت سنی ہے؟

کلیم : فرمایئے۔

مرزا : چنا ایک مرتبہ حضرت میکائیل کی خدمت میں جن کو ارزاق عباد کا اہتمام سپرد ہے فریاد لے کر گیا کہ یا حضرت میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے کہ جیوں میں نے سرزمین سے نکالا تیر ستم چلنے لگا۔ ماکولات اور بھی ہیں، مگر جیسے جیسے ظلم مجھ پر ہوتے ہیں کسی اور پر نہیں ہوتے۔ نشوونما کے ساتھ تو میری قطع و برید ہونے لگتی ہے۔ میری کو پلوں کو توڑ کر آدمی ساگ بناتے اور مجھے کچے کو کھا جاتے ہیں۔ جب بار آور ہوا تو خدا جھوٹ نہ بلوائے، آدمی بکری بن کر لاکھوں من بونٹ چر جاتے ہیں۔ اس سے نجات ملی تو ہولے کرنے شروع کیے۔ پکا تو شاخ و برگ، بھس بن کر بیلوں اور بھینسوں کے دوزخ شکم کا ایندھن ہوا۔ رہا دانہ، اس کو چکی میں دلیں، گھوڑوں کو کھلائیں، بھاڑ میں بھونیں، بیسن بنائیں، کھولتے ہوئے پانی میں ابالیں، گھنگنیاں پسائیں۔ غرض شروع سے آخر تک مجھ پر

طرح طرح کی آفتیں نازل رہتی ہیں۔ چنے کا حضرت میکائیل کے دربار میں اس طرح پر بے بیکانہ چپڑ دپڑ بولنا سن کر حاضرین دربار اس قدر ناخوش ہوئے کہ ہر شخص اسے کھانے کو دوڑا۔ چنانچہ یہ ماجرا دیکھ کر بے انتظار حکم اخیر رخصت ہوا۔ سو حضرت، یہ چنے ایسے لذت کے بنے ہیں کہ فرشتوں کے دندان آز بھی ان پر تیز ہیں۔ افسوس ہے کہ اس وقت نمک مرچ بہم نہیں پہنچ سکتا، ورنہ میر مدو کے کبابوں میں یہ خستگی اور یہ سوندھا پن کہاں؟

غرض، مرزا نے اپنی چرب زبانی سے چنوں کو گھی کی تلی دال بنا کر اپنے دوست کلیم کو کھلایا۔ کلیم بھوکا تو تھا ہی، اس کو بھی ہمیشہ سے کچھ زیادہ مزے دار معلوم ہوئے۔ مرزا نے گھر جا کر ایک میلی دری ایک کثیف سا تکیہ بھیج دیا۔ دو ہی گھڑی میں کلیم کی حالت کا اس قدر متغیر ہونا عبرت کا مقام ہے۔ یا تو خلوت خانہ اور عشرت منزل میں تھا یا اب ایک مسجد میں آ کر پڑا اور مسجد بھی ایسی جس کا تھوڑا سا حال ہم نے اوپر بیان کیا۔ گھر کے الوان نعمت کو لات مار کر نکلا تھا تو پہلی ہی وقت چنے چبانے پڑے۔ نہ چراغ نہ چارپائی، نہ بہن نہ بھائی، نہ مونس نہ غم خوار، نہ نوکر نہ خدمت گار۔ مسجد میں اکیلا ایسا بیٹھا تھا جیسے قید خانے میں حاکم کا گنہگار، یا قفس میں مرغ نوگرفتار اور کوئی ہوتا تو اس حالت پر نظر کر کے تنبیہہ پکڑتا، اپنی حرکت سے توبہ اور اپنے افعال سے استغفار کرتا، اور اسی وقت نہیں تو سویرے گجروم باپ کے ساتھ نماز صبح میں جا شریک ہوتا۔ لیکن کلیم کو اور بہت مضمون سوچنے کو تھے۔ اس نے رات بھر میں ایک قصیدہ تو مسجد کی ہجو میں تیار کیا اور ایک مثنوی مرزا کی شان میں۔

صبح ہوتے آنکھ لگ گئی، تو نہیں معلوم مرزا یا محلے کا کوئی اور عیار، ٹوپی، جوتی، رومال، چھڑی، تکیہ، دری، یعنی جو چیز کلیم کے بدن سے منفک اور اس کے جسم سے جدا تھی، لے کر چنپت ہوا۔ یوں بھی کلیم بہت دیر کو سو کے اٹھتا تھا اور آج تو ایک وجہ خاص تھی۔ کوئی پہر سوا پہر دن چڑھے جاگا تو دیکھتا کیا ہے کہ فرش مسجد پر پڑا ہے اور نیند کی حالت میں جو کروٹیں لی ہیں تو سیروں گرد کا بھبوت اور چمگدڑوں کی بیٹ کا صنما دبدن پر تھپا ہوا ہے۔ حیران ہوا کہ قلب ماہیت ہو کر میں کہیں بھتنا تو نہیں بن گیا۔ مرزا کو ادھر دیکھا ادھر دیکھا، کہیں پتا نہیں۔ مسجد تھی ویران، اس میں پانی کہاں۔ صبر کر کے بیٹھ رہا کہ کوئی اللہ کا بندہ ادھر کو آ نکلے تو اس کے ہاتھ مرزا کو بلواؤں اور یا منہ ہاتھ دھو کر خود مرزا تک

جاؤں۔اس میں دو پہر ہونے آئی۔ بارے ایک لڑکا کھیلتا ہوا آیا۔ جونہی زینے پر چڑھا کہ کلیم اس عرض مطلب کرنے کے لئے لپکا۔ وہ لڑکا اس کی ہیئت کذائی دیکھ ڈر کر بھاگا۔ خدا جانے اس نے اس کو بھوت سمجھا یا سری خیال کیا۔ کلیم نے بہتیرا پکارا اس لڑکے نے پیٹھ پھیر کر نہ دیکھا۔

ناچار کلیم نے بہ ہزار مصیبت دوسرے فاقے سے شام پکڑی اور جب اندھیرا ہوا تو الو کی طرح اپنے نشیمن سے نکلا۔ سیدھا مرزا کے مکان پر گیا اور آواز دی تو یہ جواب آیا کہ وہ تو بڑے سویرے کے قطب صاحب سدھارے ہیں۔ کلیم نے چاہا کہ اپنا تعارف ظاہر کر کے ممکن ہو تو منہ ہاتھ دھونے کو پانی مانگے اور مرزا کی پھٹی پرانی جوتی اور ٹوپی، تاکہ کسی طرح گلی کوچے میں چلنے کے قابل ہو جائے۔ یہ سوچ کر اس نے کہا: "کیوں حضرت، آپ مجھ سے بھی واقف ہیں؟"

اندر سے آواز آئی: "ہم تمہاری آواز تو نہیں پہچانتے، اپنا نام نشان بتاؤ تو معلوم ہو۔

کلیم : میرا نام کلیم ہے، اور مجھ سے مرزا ظاہر دار بیگ سے بڑی دوستی ہے۔ بلکہ شب کو مرزا صاحب ہی کی وجہ سے مسجد میں تھا۔

گھر والے: وہ دری اور تکیہ کہاں ہے جو تمہارے سونے کے لئے بھیجا گیا تھا؟

تکیہ اور دری کا نام سن کر تو کلیم بہت چکرایا اور ابھی جواب دینے میں متامل تھا کہ اندر سے آواز آئی: "مرزا زبردست بیگ! دیکھنا، یہ مردو، کہیں چل نہ دے۔ دوڑ کر تکیہ دری تو اس سے لو۔"

کلیم یہ بات سن کر بھاگا۔ ابھی گلی کے نکڑ تک نہیں پہنچا تھا کہ زبردست نے "چور چور" کر کے جا لیا۔ ہر چند کلیم نے مرزا ظاہر دار بیگ کے ساتھ اپنے حقوق معرفت ثابت کیے مگر زبردست کا ٹھینگا سر پر، اس نے ایک نہ مانی اور پکڑ کر کوتوالی لے گیا۔ کوتوال نے سرسری طور پر دونوں کا بیان سنا اور کلیم سے اس کا حسب نسب پوچھا۔ ہر چند، کلیم اپنا پتا بتانے میں جھپتا تھا مگر چار و ناچار اس کو بتانا پڑا۔ لیکن اس کی حالت ظاہری ایسی ابتر ہو رہی تھی کہ اس کا سچ بھی جھوٹ معلوم ہوتا تھا۔ کوتوال نے سن کر یہی کہا کہ میاں نصوح جن کو تم اپنا والد بتاتے ہو، میں ان کو خوب جانتا ہوں اور یہ بھی مجھ کو معلوم ہے کہ ان کے بڑے بیٹے کا یہی نام ہے جو تم نے اپنا بیان کیا ہے۔ محلے کا پتا، گھر کا نشان بھی جو تم نے کہا، سب ٹھیک ہے۔ مگر کلیم تو ایک مشہور و معروف آدمی ہے۔ آج شہر میں اس کی شاعری کی دھوم ہے۔ تمہاری یہ حیثیت کہ ننگے سر، ننگے پاؤں، بدن پر کیچڑ تھپی ہوئی۔ مجھ کو باور نہیں ہوتا۔ اچھا اب

رات کو کیا ہوسکتا ہے، جرم سنگین ہے ان کو حوالات میں رکھو۔ صبح ہو تو میں ان کے والد کو بلواؤں تو ان کے بیان کی تصدیق ہو۔

کلیم یہ سن کر رو دیا اور کہا کہ میں وہی بدنصیب ہوں جس کی شعر گوئی کا شہرہ آپ نے سنا ہے۔ آپ کو یقین نہ ہو تو میں اپنے افکار تازہ سناؤں۔ چنانچہ کل شب کو جو کچھ مسجد و مرزا کی شان میں کہا تھا، سنایا۔ اس پر کوتوال نے اتنی رعایت کی کہ دو سپاہی کلیم کے ساتھ کیے اور ان کو حکم دیا کہ ان کو میاں نصوح کے پاس لے جاؤ۔ اگر وہ ان کو اپنا فرزند بتائیں تو چھوڑ دینا، ورنہ واپس لا کر حوالات میں رکھنا۔

ڈپٹی نذیر احمد کی سوانح حیات

نذیر احمد کی پیدائش 6 دسمبر 1836 کو ضلع بجنور میں ہوئی۔ ان کے والد مولوی سعادت علی مدرس تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ بچپن بڑی تنگ دستی میں گزرا۔ مدرسہ کی تعلیم کے بعد نذیر احمد نے دلی کالج میں داخلہ لیا، یہاں انہیں وظیفہ بھی مل گیا۔ دلی میں 8 سال گزارنے کے بعد بسلسلہ ملازمت گجرات پہنچے۔ جہاں 80 روپے ماہوار پر انہیں نوکری مل گئی۔ اس کے بعد ترقی کرتے ہوئے وہ کانپور میں مدرسوں کے ڈپٹی انسپکٹر ہو گئے۔ 1857 کے انقلاب میں دلی واپس آئے۔ یہاں سے نظام دکن نے انہیں حیدر آباد بلا لیا۔ جہاں ان کی تنخواہ 1240 روپے مقرر ہوئی۔ انہیں دفاتر کا معائنہ اور کارکردگی کی مفصل روداد پیش کرنے کی ذمہ داری دی گئی۔ نذیر احمد نے بہت محنت اور لگن سے کام کیا اس لیے انہیں ترقی ملتی گئی۔ وہ صدر تعلقہ دار بن گئے۔ اس دوران انہوں نے نظام دکن کے بچوں کو پڑھانے کا بھی کام کیا۔

ڈپٹی نذیر احمد جب جالون میں تھے تو انہیں بچوں کے لیے کچھ کتابوں کی ضرورت محسوس ہوئی مگر وہ دستیاب نہ ہوسکیں تو انہوں نے خود بچوں کے لیے کتابیں لکھنے کا کام شروع کر دیا۔ 'مراۃ العروس' 'منتخب الحکایات' وغیرہ اپنے بچوں کے لیے لکھی ہوئی کتابیں ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد نے بہت سے ناول تحریر کئے جن کا مقصد اصلاحی تھا اور ان ناولوں میں زیادہ زور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت اور امور خانہ داری پر تھا۔ ان کے مشہور ناولوں میں 'مراۃ العروس' 'بنات

النعش'، 'توبۃ النصوح'، 'فسانہ مبتلا'، 'ابن الوقت'، 'ایامیٰ' اور 'رویائے صادقہ' ہیں۔

'مراۃ العروس' ان کا سب سے مشہور ناول ہے۔ جس کے کردار اکبری اور اصغری آج بھی بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ ناول جب شائع ہوا تھا تو حکومت نے ایک ہزار روپے انعام سے نوازا تھا۔ 1869 میں شائع ہوئے والے اس ناول کو زیادہ تر لوگ اردو کا پہلا ناول مانتے ہیں۔

'ابن الوقت' بھی نذیر احمد کا بہت مشہور ناول ہے، جس میں مغربی تہذیب وتمدن کی نقالی پر طنز کیا گیا ہے۔ کچھ لوگوں کے خیال میں اس میں سرسید احمد خان کو تضحیک کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ مگر ڈپٹی نذیر احمد نے اس کی تردید کی ہے کیوں کہ وہ خود سرسید کی تحریک سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ سرسید کے مشن کی تبلیغ اور ترویج کے لیے ہمیشہ سرگرم رہتے تھے۔ وہ سرسید کے تمام نظریات اور تصورات کے قدرداں تھے اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے اہم قومی خدمات بھی انجام دی ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد نے ناولوں کے علاوہ جو اہم علمی کام کئے ہیں ان میں قرآن کا ترجمہ، قانون انکم ٹیکس، قانون شہادت بہت اہم ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کی بیشتر کتابیں بہت مقبول ہوئیں اور ان کی کتابوں کا انگریزی کے علاوہ پنجابی، کشمیری، مراٹھی، گجراتی، بنگلہ، وغیرہ میں ترجمے ہوئے۔ 'مراۃ العروس' کا ترجمہ انگریزی میں 1903 میں لندن سے شائع ہوا۔ 1884 میں 'توبۃ النصوح' کا ترجمہ سر ولیم میور کے دیباچہ کے ساتھ شائع ہوا۔

ڈپٹی نذیر احمد کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کی ادبی اور مغربی خدمات کے صلے میں برطانوی حکومت نے شمس العلما کا خطاب دیا تھا۔

آخری عمر میں ڈپٹی نذیر احمد پر فالج کا حملہ ہوا اور 3 مئی 1912ء میں دلی میں وفات پا گئے۔

ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری

اردو نثر نگاری میں مولوی نذیر احمد نے سب سے پہلے اردو زبان وادب کو ناول سے روشناس کروایا اور دہلی کی اس بامحاورہ زبان کو اپنی تخلیقات میں پیش کیا۔ نذیر احمد کے طرز اسلوب کو سمجھنے کے لیے ان کی تحریروں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) تراجم (۲) مذہبی تصانیف (۳) ناول نگاری۔

نذیر احمد کا اصل کارنامہ ان کی ناول نگاری ہے۔ان کے ناولیں اخلاقی اقدار پر مشتمل ہیں۔ آپ نے محض عوامی دلچسپی کے لئے ناول نہیں لکھے بلکہ آپ کا مطمع نظر قوم کی اصلاح وفلاح بہبود تھا۔ اس لئے وہ کرداروں کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قوم غیر شعوری طور پر اس کی حالت سے آگاہ ہوکر اصلاح وترقی پر آمادہ ہوجائے کیونکہ ناول نگاری کی بڑی خوبی یہ ہے کہ زندگی کے ذریعہ کردار کو نہیں بلکہ کردار کے ذریعہ زندگی کو سنواریں۔

نذیر احمد کے ناول کے کردار اس قدر سادے اور واضح ہوتے ہیں کہ قاری بہت جلد سمجھ لیتا ہے لیکن جب یہی کردار مزاحیہ یا طنزیہ رنگ اختیار کر جاتے ہیں تو اور بھی دلچسپ بن جاتے ہیں۔مرزا ظاہر دار بیگ اور ابن الوقت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔زندگی بسر کرنے کا انداز سکھانا نذیر احمد کی تصانیف کا سب سے بڑا مقصد ہے۔اور اس کی ترقی وترویج ان کا رول کافی اہم رہا ہے۔

نذیر احمد کا پہلا ناول مراۃ العروس ہے جس میں دوسگی بہنوں کا قصہ ہے۔اس ناول کا اہم مقصد اصلاحی ہے۔بنات النعش میں خانگی امور میں خواتین کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔نیز مردوں کی زندگی کو سنوارنے اور بہتر بنانے میں ان کے رول کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔

توبتہ النصوح نذیر احمد کا شاہکار ناول ہے جو اولاد کی تربیت کے بارے میں ہے۔مکمل کتاب بارہ فصلوں پر مشتمل ہے ہر فصل الگ الگ عنوان سے قایم کیا گیا ہے۔ابن الوقت بھی ان کا مشہور ناول ہے جس میں مغربی تہذیب وتمدن کی نقالی پر طنز کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ ان کے اہم ناول فسانہ مبتلا' 'ابن الوقت' 'ایامی' اور 'رویائے صادقہ' ہیں۔''فسانہ ءمبتلا'' کا موضوع تعدد ازدواج ہے۔''ایامی'' بیوہ عورتوں اور عقد ثانی سے متعلق ہے،''رویائے صادقہ'' مذہبی عقائد سے متعلق ہے جس میں مغربی تعلیم کے زیر اثر پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔

نذیر احمد کی ناول نگاری کی خصوصیات

نذیر احمد کی ناول نگاری میں درجہ ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

(ا) رواں اسلوب

مولوی صاحب کا طرزِ تحریر سادہ اور رواں ہے۔وہ دہلی کی ٹھیٹ اور ٹکسالی زبان میں لکھتے

ہیں۔محاورات کا استعمال بھی بڑی سلیقہ مندی سے کرتے ہیں۔محاورات کے برمحل استعمال سے ان کی زبان میں تاثیر پیدا ہوگئی ہے

(2) مقصدیت

نذیر احمد جو بھی لکھتے تھے ایک مقصد کے تحت لکھتے تھے۔کیونکہ وہ ایسا دور تھا جس میں ہر ادیب قوم کی اصلاح کی خاطر کام کرتا تھا گو کہ ہر ایک کا دائرہ عمل الگ الگ تھا۔نذیر احمد نے بھی اپنے قصوں سے دین داری' خدا پرستی اور اصلاحِ معاشرت کا کام لیا۔

(3) پر جوش اندازِ بیان

نذیر احمد کا اندازِ بیان پرزور اور پر جوش ہے۔ان کے کرداروں کی گفتگو بعض اوقات سراپا تقریر معلوم ہوتی ہے۔

(4) مثالی کردار نگاری

ان کے کردار زیادہ تر مثالی ہوتے ہیں۔خیر کے لیے نیک کردار کا انتخاب کرتے ہیں اور شر کے لیے برے کردار کا۔ان کے کرداوں کی شرافت اور نیکی کو دیکھ کر قاری نصیحت حاصل کیے بغیر نہیں رہتا۔

(5) معاشرے کی عکاسی

نذیر احمد کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے تمام قصوں میں ہماری معاشرتی زندگی کی سچی تصویر پیش کی ہے۔انہوں نے قصوں سے مافوق الفطرت عناصر کی بھرمار کو خارج کر کے حقائق نگاری اور واقعیت کو پیش کیا۔وہ اصلاح معاشرہ اور اخلاق کے لیے ناول لکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ادب کو زندگی کے قریب کر دیا۔

(6) شوخی وظرافت

نذیر احمد کی نثر کا ایک خاص جوہر ان ظریفانہ رنگ ہے۔وہ نہایت زندہ دل اور ظریف آدمی تھے اور یہی ظرافت وزندہ دلی ان کی تحریروں میں پائی جاتی ہے۔

ناول ''توبتہ النصوح'' (کلیم کا مرزا ظاہر دار بیگ کے یہاں مہمان بن کر جانا) کا خلاصہ

ڈپٹی نذیر احمد کو اردو ناول نگاری میں اولیت حاصل ہے انہوں نے مراۃ العروس، بنات النعش اور توبتہ النصوح جیسی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔توبتہ النصوح اصلاحی مقاصد کے تحت لکھی گئی ایک اہم ناول ہے جس میں اس بات کو بتایا گیا یہ کہ انسان خطا اور نسیاں سے عبارت ہے۔گناہوں کا ارتکاب اس کی فطرت میں شامل ہے۔لیکن بہترین انسان وہ ہے جو اپنے گناہوں پر ندامت اور شرمندگی محسوس کرتا ہے اور توبہ واستغفار کے ذریعہ گناہوں سے باز آتا ہے اور اعمال صالحہ کے ذریعہ اپنی آخرت سنوارتا ہے اسی خیال اور فکر کو اس ناول میں اہمیت دی گئی ہے۔ناول کے کل بارہ 12 حصے ہیں۔

نویں اور دسویں حصہ میں نصوح کے بیٹے کلیم اپنے باپ کے گھر سے ناراض ہوکر اپنے دوست مرزا ظاہر دار بیگ کے یہاں جاتا ہے۔کلیم کا کردار باغیانہ کردار ہے۔وہ بے راہ روی اور غلط راستے کا انتخاب کرتا ہے۔حالات اور ماحول نے اسے اور بھی ضدی بنا دیا ہے۔اس کی بے راہ روی اور باغیانہ پن میں اس کے والدین کی تربیت کو بھی دخل ہے۔

کلیم اپنے باپ سے لڑ جھگڑ کر گھر سے نکل جاتا ہے۔اور اپنے دوست مرزا ظاہر دار بیگ کے یہاں رہنے کے لیے جاتا ہے۔مرزا ظاہر دار بیگ کا کردار اسم بامسمی ہے۔وہ نہایت چرب زبان، ریا کار، ظاہری تصنع اور جھوٹی شان وشوکت ظاہر کرنے والا اور خود کو بڑا سمجھتا ہے۔وہ نہ خود کو غریب کہتا ہے اور نہ امیروں کی برابری کرسکتا ہے۔اس نے اپنے دوست کلیم سے خود کی بہت تعریف کی تھی۔وہ یہ باور کراتا ہے کہ وہ ایک نواب کے پاس رہتا ہے۔اور وہ نواب کا رشتہ دار ہے، نوکرائیں اور خادمائیں ہمیشہ اس کی خدمت کے لیے مستعد رہتی ہیں۔رہنے کے لیے وسیع وعریض کوٹھی اور عالیشان محل ہے۔دولت کی ریل پیل اور عمدہ اور لذیذ پکوان ہر وقت کھانے کے لیے موجود ہوتے ہیں۔حالانکہ مرزا ایک کچے مکان اور غربت میں زندگی بسر کررہا تھا۔لیکن جھوٹی شان ایسی کہ وہ کسی نواب سے کم نہ تھا۔

کلیم مرزا کے بتائے ہوئے حویلی پر پہنچا تو وہاں اس کا نام ونشان نہیں تھا۔پوچھنے پر معلوم

ہوا کہ وہ قریب میں ایک کچے مکان میں رہتا ہے، کلیم رات میں قیام کرنے کے لیے کہتا ہے تو مرزا اس کو اپنے گھر میں رکھنے کے بجائے قریب کی ایک ویران مسجد میں ٹھہراتا ہے۔ مسجد اتنی قدیم اور بوسیدہ ہو چکی تھی کہ وہ مسجد کم گھوڑوں کا اصطبل معلوم ہو رہی تھی، چمکاڈروں نے اس میں اپنا قبضہ جما لیا تھا مسجد میں اندھیر تھا جس کے سبب کلیم نے چراغ کا انتظام کرنے کو کہتا ہے تو مرزا اپنی غلطی چھپاتے ہوئے بڑی خوبصورتی اور چرب زبانی سے اس طرح ٹال دیتا ہے۔ ''چراغ کیا میں نے تو لیمپ روشن کروانے کا ارادہ کیا تھا، لیکن گرمی کے دن ہیں، پروانے بہت جمع ہو جائیں گے اور آپ زیادہ پریشان ہوں گے اور اس مکان میں ابابیلوں کی کثرت ہے، روشنی دیکھ کر گرنے شروع ہوں گے اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گے۔ تھوڑی دیر صبر کیجیے کہ ماہتاب نکل آتا ہے''۔

کلیم دوسرے دن حوالدار کے ہاتھوں لگ جاتا ہے اسے تھانے کی صعوبتیں برداشت کرنے پڑتے ہیں، حوالدار اس کے باپ کا شناسائی تھا اس لیے وہ کلیم کو گھر پہنچا دیتا ہے۔

مرزا ظاہر دار بیگ کا کردار دراصل دہلی کے شکست خوردہ اور زوال پذیر معاشرے کے کھوکھلے پن کو ظاہر تا ہے۔ اس میں نام و نمود اور ریاکاری کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

UNIT-V

افسانہ ''ایک اور دن''

افسانہ نگار۔ عبدالصمد

پانچ سے لے کر شام سات بجے تک کا وقفہ ان پر یوں گزرا کہ ان کی طویل زندگی ایک طرف اور.....

یوں گھڑی بڑی سریلی موسیقی میں وقت کی اطلاع دیتی لیکن ابھی اس نے سات بجے کی جو خبر دی وہ گویا ان کے سر پر سات تابڑ توڑ ہتھوڑے کی طرح برسے ...ان کی بیوی بلکنے لگیں وہ رومال سے اپنے ماتھے کا پسینہ پوچھنے لگے

" کیوں نہیں آئی ابھی تک....؟"

وہ دھیرے سے بڑبڑائے..

"اسی لیے میں کہتی تھی".... سسکیوں کے درمیان بڑی مشکلوں سے ان کے منہ سے نکلا...

کیا کہتی تھیں..؟

تم جانتی ہو اچھی طرح پھر بھی..

انہوں نے بیوی کے ادھورے جملے سن کر اپنے اوپر قابو پانے کی کوشش ضرور کی...

باہر کسی رکشے والے کا ٹائر پھٹا ...ایک روز دار دھماکے کی آواز آئی...

در و دیوار جیسے لرز گئے...

ان کی بیوی کے ہاتھ بیساختہ اپنے کانوں پر چلے گئے ..وہ کھڑکی کی طرف لپکے ..رکشہ کے مسافر سڑک پر سراسیمگی کی حالت میں کھڑے رکشے والے کو برا بھلا کہہ رہے تھے ...اور وہ لجاجت کے ساتھ اپنی صفائی دے رہا تھا ...ٹائر تو اس کا گیا ہی تھا ...شاید مزدوری کے بھی لالے پڑے تھے...

انہوں نے اکتا کر سڑک کے دونوں طرف دیکھا اور مایوس ہو کر آ بیٹھے ... گھڑی پر ان کی

نگاہیں جیسے ٹک گئی تھیں ... گھڑی کی منٹ اور سیکنڈ کی سوئیاں ان کے پیروں سے لپٹ گئی تھیں اور انہیں مارے باندھے مقتل کی طرف لے جارہی تھیں ...ان کے ساتھ وہ گھسکنے پر مجبور تھے...

" کچھ کیجیے ناں، یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے.....

خدانخواستہ اسے.....

ان کی بیوی بیساختہ چیخ اٹھیں...

ان کے اندر رہ رہ کر جو ہوک سی آٹھ رہی تھی وہ انہیں بلبلا رہی تھی...

کیا کرسکتا ہوں،....؟

تم جانتی ہو.

انہوں نے بے بسی سے بیوی کی طرف دیکھا...

یعنی اگر وہ کچھ کرسکتے تھے تو ابھی تک اس سے باز رہتے کیا...

میرا دل تو پہلے ہی دن سے دھڑک رہا تھا .... لیکن میری سنتا کون ہے

ان کی بیوی کا غصہ اور آنسو اب الفاظ میں ڈھلنے لگے تھے...

کیا یہ وقت انہیں باتوں کا ہے؟ وہ جھنجھلا اٹھے...

نہیں، نماز پڑھنے کا...

ان کی بیوی کے منہ سے بیساختہ نکل گیا...

حالانکہ وہ خود بھی کچھ کم نمازی نہیں تھیں، وہ بوکھلا گئے...

ایں...؟

کیا کہا آپ نے ... سراسر کفر ..یعنی یہ کہ نماز جیسی عبادت کو ...بیشک یہ وقت خدا سے لو لگانے کا ہے، ورنہ ٹسوے بہانے سے...

ان کی بیوی کو فوراً احساس ہوا کہ یہ کیا کہہ دیا انہوں نے...

دونوں گالوں پر انہوں نے تین تین تھپڑ لگائے اور شوہر کی طرف چور نگاہوں سے یوں دیکھا گویا معافی کی طلب ...وہ گواہ ٹھہرے ...اس گناہ اور معافی سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ کافی دیر کے لیے خاموش ہوگئیں..

انہوں نے کرسی سے بیٹھ کر آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی ... لیکن جو آنکھیں جھپکنا بھول چکی تھیں، وہ کیا بند ہوتیں..

سامنے دیوار ہر گھڑی ٹک ٹک کر رہی تھی ...اس کے چاروں طرف کی بقیہ دیواریں ننگی تھیں ... حدنظر تک بالکل سادہ ... لیکن اس وقت ان دیواروں پر گویا پردے ٹنگے تھے اور ان پر طرح طرح کی فلمیں آ رہی تھیں...

راہ چلتے ایک نوجوان لڑکی کا اغواء....

دوسرے روز شہر کے باہر بڑے نالے کے پاس اس کی برہنہ لاش...

بس اسٹاپ پر ایک لڑکی کو دو آدمیوں نے دھر دبوچا اور آناً فاناً تیز رفتار کار میں لے کر چمپت ہو گئے...

دفتر سے نکلی لڑکی کو ایک کار والے نے لفٹ دی ....وہ لڑکی لاپتا....

اخباروں کی بھولی بسری خبریں ان کے دماغ میں پروجیکٹر کی طرح رواں ہو گئی تھیں...

انہوں نے اپنا سر تھام لیا..

آف میرے خدا ... خدا نہ کرے..

ان کی زبان سے کچھ نہیں نکلا تھا ... لیکن ان کی بیوی نے چونک کر ان کو دیکھا اور لپک کر پانی کی ایک گلاس لے آئیں...

گلاس تھامتے ہوئے ممنون نگاہوں سے انہوں نے ان کی طرف دیکھا ...پانی پی کر وہ پھر کرسی سے لگ گئے...

خبروں کے صفحات کئی تھے...

دن دھاڑے ماں باپ کے سامنے لڑکی کی....

رشتہ دار بن کر اندر داخل ہوئے ...ماں باپ کو بے بس کر کے رسیوں سے جکڑ دیا اور پھر... ڈاکو مال و اسباب بھی کے گئے اور شوہر کی آنکھوں کے سامنے بیوی کی عزت...

شادی شدہ لڑکی کی گھر کے اندر دن دھاڑے عصمت دری...

آف! آف!....

وہ بے تابانہ کھڑے ہو گئے اور آنکھوں پر اپنی ہتھیلیاں رکھ لیں...
کیا ہوا ...ان کی بیوی کھڑکی سے لگی کھڑی تھیں ...دوڑ کر ان کی طرف آئیں ؛؛
کچھ نہیں، کچھ نہیں،،،،،،
ذرا پانی کا ایک گلاس اور دینا ...وہ پھر کرسی پر بیٹھ گئے ...دیواریں پہلے کی طرح ننگی تھیں ... کھڑکی کی سوئیاں اس کی ستر پوشی کر رہی تھیں ...
اگر چہ یہی سوئیاں انہیں .....
سات پر سے کانٹا کب کا آگے جا چکا تھا ...
حد ہو گئی ...
لیکن اتنی دیر تو کبھی نہیں ہوئی تھی ...
اب تو کچھ کرنا ہی ہوگا ..
وہ اضطرابی کیفیت میں ٹہلنے لگے ..
کیا کریں گے ...اِن کی بیوی نے بڑی پر امید نظروں سے ان کی طرف دیکھا...
کچھ بھی
وہ ان کی نظروں کی تاب نہ لا کر تیزی سے باہر نکل گئے ...
ان کی بیوی کو یقین ہو گیا کہ وہ ضرور کچھ کر کے آئیں گے ...
وہ فوراً جائے نماز پر کھڑی ہو گئیں
باہر نکل کر وہ تیزی سے ایک ٹیلی فون بوتھ میں گھسے ..اس کے دفتر کا نمبر ڈائل کیا ... گھنٹی بھی،،، بجتی چلی گئی ... بجتی رہی ...
بڑے صاحب کے گھر کا نمبر پتا نہیں کن وقتوں کے لیے انہوں نے جیب ڈائری میں نوٹ کر لیا تھا ...اگر چہ ابھی تک اس کے استعمال کی نوبت نہیں آئی تھی ...
صاحب ہیں...؟
صاحب ...وہ اس وقت تو گھر پر نہیں رہتے ...جواب دینے والے کی آواز میں تحیر تھا ...
کس وقت آتے ہیں؟

وہ کلب سے دیر رات میں لوٹتے ہیں،

دفتر سے؟

دفتر سے وہ گھر نہیں آتے ...

سلسلہ منقطع ہو گیا ..صاحب کا گھر کوئی انکوائری آفس تو تھا نہیں ...

اب کیا کیا جائے ...

وہ ایک ہاتھ کی کمزور مٹھی پر دوسرے ہاتھ کی کمزور مٹھی سے مکہ مارتے ہوئے بڑبڑائے ...

پولیس ..یہ خیال کوندے کی طرح ذہن میں لپکا ...

لیکن کیا کہیں گے پولیس کو ...

پھر طرح طرح کے سوالات پوچھ تاچھ جو بات ابھی تک چھوٹے سے گھر کے اندر بند تھی وہ باہر نکل کر پتا نہیں کہاں تک جا پہنچے ...

ان کی واپسی کے مرے مرے قدم کو دیکھ کر ان کی بیوی کا کلیجہ اچھل کر ان کے حلق میں آ گیا ...

وہ دھم سے اپنی کرسی پر آ گرے ...

کیا ہوا...؟

شاید محض اپنی تشفی کے لیے ان کے منہ سے نکل گیا .... کچھ نہیں،،، انہوں نے دھیرے سے کہا ...اور اپنی آنکھیں موند لیں ...

گھڑی اب ساڑھے سات کے اسٹیشن کو بھی چھوڑ رہی تھی ... آسمان پر ہر چہار طرف تاریکی چھا گئی تھی ...اور زمین پر روشنیاں جل اٹھی تھیں ....

ان کی بیوی آنچل کا پلو منہ پر رکھ کر سسکنے لگیں،،، انہوں نے آنکھیں کھول کر غور سے ان کی طرف دیکھا ... پھر نرم لہجے میں سمجھانے لگے ...رونے سے کیا ہوگا ...اس سے مسئلے کا حل نکلے گا کیا؟

خواہ مخواہ رو کر ہلکان ہونے سے فائدہ ... یہ سوچو کہ

کیا سوچوں، میرے پاس سوچنے کو اب رہا بھی کیا ہے ...اور پھر میری بات کون سنتا ...

میں نے تو پہلے ہی کہا تھا وہ جیسے پھٹ پڑیں ...

تو میں نے کیا غلط کیا ....دنیا کر رہی ہے اس میں برائی بھی کیا ہے ...ہم تو پھر بھی مجبور ہیں، جو مجبور نہیں ہیں وہ بھی تو یہی کر رہے ہیں ....

انہوں نے جیسے اپنی صفائی دینے کی کوشش کی ...

پہلے ہم خوش نہیں تھے کیا۔ ..ان کی بیوی نے مضبوطی سے مورچہ سنبھالا ...

خوش تھے، لیکن صرف ہم ..اور خوش بھی کیا ...بس یہ کہ دال روٹی چل رہی تھی .... لیکن اس دال روٹی سے اس کے لیے ہم کچھ کر سکتے تھے کیا۔

تو گویا اس کی کمائی کا آسرا...

نہیں ایسی بات نہیں

لیکن جب تک اس کے لیے کچھ ہو نہیں جاتا تب تک اسے بیکار رکھنے سے فائدہ۔

بیکار ذہن یوں بھی شیطان کا گھر ہوتا ہے...

آن کی بیوی کچھ نہیں بولیں..

دونوں نے اپنے آپ کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا تھا...

گھڑی چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کو تیزی سے چھوڑتی جا رہی تھی ... لیکن بوکھلانے کے سوا وہ بھی اندر اندر۔۔وہ کر بھی کیا سکتے تھے...

میں تو اب اسے کبھی نہیں بھیجوں گی ...وہ صحیح سلامت گھر تو آجائے ...میری بچی...

وہ اپنے آپ بڑبڑائیں...

کسی پل چین نہیں پڑتا تھا...

وقت کسی ظالم حکمران کی طرح سب کو روندتے ہوئے آگے ہی بڑھتا جا رہا تھا...

اچانک دروازہ آہستہ سے کھلا ...اس نے خاموشی سے اندر جھانکا ...اور ایک دھیمی نگاہ ان پر ڈالی پھر تھکی تھکی سی آکر بیٹھ گئی ...ان کے چہرے کھل اٹھے ...ماں تو دوڑ کر اس سے لپٹ ہی گئی ...انہوں نے کپکپاتے ہاتھوں سے رومال نکال کر اپنی آنکھوں کے کونے صاف کئے...

اتنی دیر ... گھڑی ساڑھے آٹھ کے اسٹیشن پر آنا ہی چاہتی تھی کہ اب ان کے دل کی

دھڑکنوں سے اس کا رشتہ ختم ہو چکا تھا...

پاپا ... آج بس والوں نے اچانک اسٹرائیک کر دی ... کوئی بس نہیں آئی ... ہم لوگ بہت پریشانی میں پڑے۔

اس نے مجبور نظروں سے ماں باپ کی طرف دیکھا۔ اس کے آجانے سے ان کے چہروں پر جو رونق آئی تھی، اس کی شعائیں اس کے بدن پر بھی پڑنے لگی تھیں۔

ٹیکسی سے آجاتیں .. تھری ویلر سے آجاتیں ... کیا ضرورت تھی اس قدر پریشانی مول لینے کی۔ ماں کے لیے تو سارے مسئلوں کا خاتمہ ہو چکا تھا لیکن ان کی تشفی نہیں ہو رہی تھی...

تھری ویلر ہی میں آرہی ہوں، وہ بھی بہت مشکلوں سے ملی۔ کئی جگہ بدلنا بھی پڑا۔ یہاں تک آنے کو کوئی تیار ہی نہیں ہوتا تھا۔

پھر بھی، پتا نہیں وہ اس سے کیا سننا چاہتے تھے یا اس کے چہرے پر کیا پڑھنا چاہ رہے تھے .. پتا نہیں،

کوئی ضرورت نہیں، جو روکھی سوکھی ہے اس میں گزارا کر لیں گے ... جان اور عزت بچے گی تو بہت کچھ، ماں نے جیسے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

صرف ایک گہری اور معنی خیز نگاہ ماں پر ڈال کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

انہوں نے اپنے شام کے کوٹے کا سگریٹ سلگا لیا جس میں غیر معمولی تاخیر ہو چکی تھی۔

ایک صبح۔۔۔ ایک شام۔

صبح ناشتے کی میز پر وہ کچھ زیادہ ہی عجلت میں تھی۔ الٹے سیدھے نوالے، بے ترتیب پانی کے گھونٹ۔ وہ دونوں چپ چاپ کھاتے رہے۔ ماں نے کوشش بھی کی کہ وہ ایک آدھ روٹی اور لے لے لیکن اس نے انکار کر دیا اور اپنا پرس جھلاتی جلدی سے اٹھی اور کھڑی ہوئی۔

اچھا پاپا۔ ماما گڈ بائی

جلدی آجانا بیٹی۔

انہوں نے آہستہ سے کہا ... بہت دھیمے سے کہ در و دیوار بھی کسی طرح سن نہ لیں اور اپنی مخصوص کرسی پر جا بیٹھے...

عبدالصمد کی سوانح حیات

عبدالصمد کی سوانح حیات:

محمد عبدالصمد 18 جولائی 1952ء کو صوبہء بہار ضلع نلندہ میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام محمد شبلی تھا۔انہوں نے علم سیاسیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور پیشہء تدریس سے وابستہ ہو گیے،اورینٹل کالج پٹنہ میں لکچرار کی حیثیت سے کئی سالوں تک برسرخدمات رہے۔

سیاسیات کے استاد ہونے کے باوجود ان کو اردو زبان وادب سے بے انتہا دلچسپی رہی۔اسی وجہ سے وہ ایک اچھے ناول نگار اور افسانہ نگار کے طور پر مشہور ہوئے۔ان کا شمار صف اول کے جدید افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کے افسانوں کی خاصیت یہ ہے کہ انہوں نے افسانہ کو زندگی کی حقیقتوں سے قریب کیا۔سماجی،نفسیاتی اور تہذیبی مسائل کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔روزمرہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل کو کہانی کے طور پر پیش کرنے کے ہنر سے وہ اچھی طرح واقف ہیں۔ان کے افسانوں کی زبان اور اسلوب نہایت سادہ اور عام فہم ہوتا ہے۔

عبدالصمد نے اپنا ادبی سفر 1961 سے شروع کیا لیکن ان کا پہلا افسانہ 1965 میں شائع ہوا۔اب تک ان کے چھ افسانوی مجموعے ''بارہ رنگوں والا کمرہ''۔''پس دیوار''۔''سیاہ کاغذ کی دھجیاں''۔''میوزیکل چیئر''۔''آگ کے اندر راکھ''۔''اور بقلم خود''۔شائع ہو چکے ہیں۔عبدالصمد کے افسانوں میں کردار نگاری کا انوکھا پن پایا جاتا ہے۔ناول ''دوگز زمین'' پر انہیں ساہتیہ اکیڈمی کے ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔

عبدالصمد کی افسانہ نگاری

عبدالصمد اردو فکشن کے ایک اہم تخلیق کار ہیں۔انہوں نے آٹھ ناول اور تقریباً 77 افسانے تخلیق کیے ہیں۔معاصر افسانہ نگاروں میں وہ اپنی ایک خاص انفرادیت رکھتے ہیں۔ان کی تخلیقات میں غم ذات اور غم دوراں کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ان کے یہاں موضوعات کا تنوع نظر آتا ہے۔عصری حسیت،سیاسی،سماجی،اقتصادی،تہذیبی اومعاشرتی مسائل پر انہوں نے کھل کر اظہار خیال کیا

ہے،انھوں نے جدیدیت کے زیر سایہ اپنا سفر شروع کیا لیکن بہت جلد اپنا ایک الگ راستہ اپنایا۔

عبدالصمد جدید دور کے افسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانوں کا سماج سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔وہ سماج کے ایسے کرداروں کو پیش کرتے ہیں جن پر سب کی نظر نہیں جاتی۔وہ سماج کے ہر پہلو کا گہرائی سے جائزہ لیتے ہوئے حقیقت کو منظر عام پر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کا مشاہدہ بہت گہرا اور عمیق ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کے افسانے سطحیت کا شکار نہیں ہوتے۔

عبدالصمد نے اپنے افسانوں میں کرداروں کی ذہنی الجھنوں ،نفسیاتی حقیقتوں ،رجائی اور ناامیدی کی کیفیتوں ،شکست و فتح کی کامرانیوں کا تذکرہ اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری اس کا حصہ بن جاتا ہے۔انھوں نے کرداروں کے نفسیاتی پیچ وخم کو بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔افسانہ ''ایک اور دن'' میں والدین کی نفسیات کا گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''دونوں نے اپنے آپ کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا تھا...
گھڑی چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کو تیزی سے چھوڑتی جارہی تھی ...
لیکن بوکھلانے کے سوا وہ بھی اندر اندر کر بھی کیا سکتے تھے...
میں تو اب اسے کبھی نہیں بھیجوں گی ...وہ صحیح سلامت گھر تو آجائے ...میری بچی...''

والدین اپنی بیٹی کی تھوڑی دیر تاخیر سے اتنے پریشان ہوتے ہیں کہ دوبارہ کبھی دفتر بھیجنے کا ارادہ نہیں کرتے لیکن مجبوری اتنی سخت تھی کہ سب کچھ بھلا کر دوسرے دن اس کو دفتر روانہ کردیتے ہیں۔یہی انسان کی نفسیات ہے مصیبت ٹلنے پر سب کچھ بھول جاتا ہے۔

غائر مشاہدہ اور کم الفاظ میں بہت کچھ کہنے کی صلاحیت عبدالصمد کا خاص ہنر ہے۔ان کے افسانوں میں معانی کی تہہ در تہہ پرتیں کھلتی ہیں۔وہ انہی موضوعات کو اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں جو ان کے مشاہدات کا حصہ ہوتے ہیں۔فرضی اور غیر حقیقی کرداروں کو وہ پیش نہیں کرتے۔ایک متوسط طبقے کی عام زندگی میں پیش آنے والے واقعات بیان کرتے ہیں۔کا مشہور افسانہ ''کال بیل'' میں چھوٹے شہروں میں جہاں پیر پھیلانے کی جگہ نہیں ہوتی وہاں اگر مہمان آجائے تو میزبان کی کیا حالت ہوتی ہے اس کو موضوع پر لکھا گیا ہے۔ایک مختصر اقتباس ملاحظہ ہو۔

''دروازے پر جوں ہی دستک ہوتی ہے میاں بیوی گھر کی صفائی میں لگ جاتے ہیں اور

صفائی کے ہی دوران انہیں یاد آتا ہے کہ چائے کے لیے دودھ تو گھر میں ہے ہی نہیں۔اب شوہر جھنجھلا کر بیوی پر چیختا ہے۔بیوی اس کو یاد دلاتی ہے کہ وہ جا کر آئینہ دیکھے کہ دورانِ صفائی اس کے چہرے کی کیا حالت ہوگئی ہے۔تب وہ فوراً غسل خانے میں جاتا ہے۔وہاں پانی ختم''۔

افسانہ''راکھ کے اندر راکھ''میں ایک عورت کے احساسات وجذبات،ظلم وزیادتی اور کرب اور دکھ کو بتایا گیا ہے۔ان کے افسانوں میں کردار نگاری کے عمدہ اور بہترین نمونے ملتے ہیں۔واقعات اور حالات کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں کہ پورا قصہ اور نقشہ قاری کے سامنے ابھر کر آتا ہے۔وہ افسانے کی ابتدا اس انداز سے کرتے ہیں کہ قاری پورا افسانہ پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔یہی فنکار کی کامیابی ہے۔

عبدالصمد کے افسانوی مجموعے میں''بارہ رنگوں والا کمرہ''1980۔''پس دیوار''1983۔''سیاہ کاغذ کی دھجیاں'' 1996۔''میوزیکل چیئر''2000۔''آگ کے اندر راکھ''2011۔''اور بقلم خود''2013''دم واپسیں'' 2018 شامل ہیں۔افسانوں کے علاوہ 9 ناول بھی ان کی یادگار ہیں۔جن میں ان کے شہرہ آفاق ناول''دوگز زمین''کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

افسانہ''ایک اور دن''کا خلاصہ

عبد الصمد اردو کے جدید افسانہ نگاروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔انہوں نے اپنے افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی کی ہے۔ان کے افسانے زندگی کی حقیقتوں کو پیش کرتے ہیں۔افسانہ ایک اور دن''میں شہری زندگی کے کرب کو پیش کیا ہے۔جوان لڑکیاں جو والدین کا سہارا ہوتی ہیں ان کے گھر سے باہر جانے پر والدین کتنے فکرمند ہوتے ہیں اس کا نقشہ کھینچا ہے۔اور یہ حالات کسی کے ساتھ بھی پیش آسکتے ہیں۔اس افسانے میں انہوں نے شہری زندگی کے ڈر اور خوف کے احساس کی کیفیت کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔افسانہ کی کہانی یوں ہے۔شہر میں ایک جوان لڑکی صبح اپنے گھر سے دفتر کو جاتی ہے اور شام پانچ بجے تک اپنے گھر واپس آجاتی ہے۔یہی اس کا معمول تھا لیکن ایک دن اس کے آنے میں تاخیر ہوجاتی ہے۔پانچ سے چھے بج جاتے ہیں لیکن اس کا کوئی پتہ نہیں،ماں پریشان ہوجاتی ہے۔جیسے جیسے گھڑی کا کانٹا آگے بڑھتا ہے اس کے دل کی دھڑکن بھی تیز

سے تیز تر ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کو کچھ کرنے کے لیے کہتی ہے لیکن وہ بھی کچھ کر نہیں سکتے۔ وقت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے، ماں کے ذہن میں عجیب وغریب خیالات آنے لگتے ہیں، اخبارات اور نیوز پیپروں میں شائع ہونے والی خبریں پریشان کر دیتی ہیں۔ جیسے راہ چلتے ایک نوجوان لڑکی کا اغوا ۔۔۔۔۔ دوسرے روز شہر کے باہر بڑے نالے کے پاس اس کی برہنہ لاش ۔۔۔۔۔ بس اسٹاپ پر ایک لڑکی کو دو آدمیوں نے دھر دبوچا۔۔۔۔۔ دفتر سے نکلی لڑکی کو ایک کار والے نے لفٹ دی ۔۔۔۔ وہ لڑکی لاپتہ ۔۔۔۔ ان جیسی خبروں کو یاد کر کے اپنا سر پکڑ لیتی ہے ادھر باپ بھی پریشان ادھر ادھر ٹہلنے لگتے ہیں۔ اور باہر نکل کر ٹیلفون بوتھ میں جاتے ہیں اور فون کرتے ہیں لیکن فون منقطع ہو جاتا ہے۔ پھر وہ گھر آجاتے ہیں۔ ماں اپنے شوہر کو دیکھ کر ایک انجانے خوف کو یاد کر کے رونے لگتی ہے ۔شوہر سمجھاتا ہے کہ رونے سے کیا فائدہ؟

والدین نے اب اردہ کر لیا کہ اب وہ اپنی لڑکی کو دفتر نہیں بھیجیں گے۔ عزت بچے گی تو سب کچھ محفوظ ہے۔ کسی طرح گزارہ کر لیں گے۔ ساڑھے سات بجے کے بعد اچانک لڑکی گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتی ہے اور تھکی تھکی ایک جگہ بیٹھ جاتی ہے، ماں دوڑ کر اس سے لپٹ جاتی ہے، بیٹی !تم نے اتنی دیر کیوں کر دی؟۔ بیٹی کہتی ہے کہ آج اچانک بس والوں نے اسٹرائیک کر دی تھی۔ کوئی بس نہیں تھی۔ تھری وہیلر سے آرہی ہوں۔

والدین لڑکی کو دوبارہ دفتر بھیجنے کے لیے تیار نہیں ہیں لیکن حالات اور غریبی سے مجبور ہو کر وہ اپنی بچی کو دوسرے دن دفتر بھیجنے پر راضی ہو جاتے ہیں لیکن جب کبھی اس کے آنے میں تھوڑی تاخیر ہوتی ہے یہی خوف اور ڈر کی کیفیت ان کے ذہنوں پر طاری ہو جاتی ہے۔ ڈر اور خوف کے سائے میں زندگی گزارنا ان کا مقدر بن چکا ہے۔

عبدالصمد نے اس افسانے میں والدین اور سرپرستوں کے اس اذیت ناک ذہنی خوف کے احساس کو پیش کیا ہے جب ان کی جوان لڑکیاں گھر سے باہر ہوتی ہیں اور کسی مجبوری سے ٹھیک وقت پر گھر نہیں پہنچ پاتیں۔

تیسرا سمسٹر۔نمونہء پرچہء سوالات

MODEL QUESTION PAPER - SECOND LANGUAGE -URDU
B.A.,/B.Com.,/B.Sc., SEMESTER - III: PAPER - III URDU FICTION

Time : 3hrs **Max Marks :75**

Part -A

نوٹ:۔درج ذیل سوالوں میں سے کسی پانچ کے جواب لکھیے۔ **(5X5 :25)**

1۔ افسانہ کی تعریف کیجیے۔
2۔ افسانہ اور ناول کے درمیان فرق کو واضح کیجیے۔
3۔ ناول کا تعارف کراتے ہوے اس کے اجزائے ترکیبی کی وضاحت کیجیے۔
4۔ کریم رومانی کی مختصر سوانح حیات لکھیے۔
5۔ میر امن کی تصنیف ''باغ و بہار'' کی ادبی اہمیت واضح کیجیے۔
6۔ عبدالصمد کی مختصر سوانح حیات لکھیے۔
7۔ ڈرامہ " گڑھ کی مکھیاں" کا مرکزی خیال واضح کیجیے۔
8۔ فن ڈرامہ نگاری پر نوٹ لکھیے۔

Part -B

درج ذیل سوالات کے جوابات تفصیل سے لکھیے۔ **(5X10:50)**

(تمام جوابات لازمی ہیں)

9۔ داستان شروع قصے کا خلاصہ لکھیے۔

یا

میر امن کی ادبی خدمات پر اظہار خیال کیجیے۔

10۔ ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری پر اظہار خیال کیجئے؟

یا

ناول کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالیے؟

11۔ عبدالصمد کا افسانہ ''ایک اور دن'' کا خلاصہ لکھیے؟

یا

عبدالصمد کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کیجیے؟

12۔ ''کلیم کا مرزا ظاہر دار بیگ کے یہاں مہمان جانا'' کا خلاصہ لکھیے۔

یا

مرزا ظاہر دار بیگ کے کردار کا تفصیل سے جائزہ لیجیے؟

13۔ داستانوں کی ادبی و تہذیبی اہمیت واضح کیجیے؟

یا

داستان کی تعریف کرتے ہوئے اس کے آغاز و ارتقا پر اظہار خیال کیجیے؟

جدوجہد آزادیٔ ہند اور اردو ادب

مرتب: ڈاکٹر ارشاد احمد خان
(صدر شعبہ اردو، این ایس بی کالج ناندیڑ)

زیر اہتمام:
شعبہ اردو، نیتاجی سبھاش چندر بوس کالج، ناندیڑ (مہاراشٹرا)

© جملہ حقوق بحق شعبہ اردو این ایس بی کالج، ناندیڑ محفوظ

Copy right c Principal / Head Department of Urdu

Netaji Subhashchandra Bose College, Nanded

Jaddo Jahed Azadi-e-Hind Aur Urdu Adab

Edited by : Dr. Irshad Ahmed Khan

Year of Publication : 2023

ISBN : 978-93-5786-332-2

کتاب : جدو جہد آزادی ہند اور اردو ادب

مرتب : ڈاکٹر ارشاد احمد خان

صدر شعبہ اردو، این ایس بی کالج، ناندیڑ (مہاراشٹرا)

اشاعت : 2023ء

تعداد : 300

قیمت : -/350

کمپوزنگ : اسماک آرٹس اینڈ گرافکس، ناندیڑ

سرورق : اسماک آرٹس اینڈ گرافکس، ناندیڑ

پبلشر : اسماک پبلی کیشنز، ناندیڑ

فہرست

احوال واقعی	ڈاکٹر ارشاد احمد خان	06
جدوجہد آزادی ہند اور اردو ادب	ڈاکٹر مزمل سرکھوت	08
جدوجہد آزادی ہند میں اردو شعراء کا کردار	ڈاکٹر قاضی نوید	15
جدوجہد آزادی ہند میں اردو صحافت کا کردار	پروفیسر نسیم بیگم	31
جدوجہد آزادی ہند میں علماء کا کردار	ڈاکٹر شاہد احمد	37
اردو اور ہندی ناولوں پر تقسیم ہند کے اثرات	ڈاکٹر عبداللہ امتیاز	55
جدوجہد آزادی ہند میں اردو ادب کا کردار	ڈاکٹر شیخ اصغر	81
جدوجہد آزادی ہند اور اردو شاعری	شیخ ہما کوثر	86
جدوجہد آزادی ہند اور اردو شاعری	ڈاکٹر شائستہ تبسم	93
جدوجہد آزادی ہند اور اردو زبان و ادب	ڈاکٹر عزیز سہیل	97
تقسیم ہند اور خواتین افسانہ نگار	ڈاکٹر نزہت پروین	103
جدوجہد آزادی ہند میں ہمدرد کا رول	ڈاکٹر شیخ فاروق	108
جدوجہد آزادی ہند اور اردو شاعری	ڈاکٹر شاہد زیدی	120
تحریک آزادی ہند، اردو اور ہندوستانی سنیما	ڈاکٹر شکیل احمد	132

جدوجہد آزادی ہند میں دارالعلوم دیوبند کا حصہ	ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ	143
تحریک آزادی ہند میں مراسلات، مکتوبات کی اہمیت	ڈاکٹر قمر صدیقی	148
جدوجہد آزادی ہند میں علماء اور مدارس کا کردار	ڈاکٹر قمر النساء	154
جنگ آزادی ہند میں اردو صحافت کا کردار	پروفیسر عبدالوہاب	160
تحریک آزادی ہند اور حسرت موہانی	ڈاکٹر محمد تابش	165
جدوجہد آزادی ہند اور پریم چند کا ناول	ڈاکٹر کیرتی مالینی جاولے	180
جدوجہد آزادی ہند اور اردو زبان وادب	ڈاکٹر سمیع الدین	195
جدوجہد آزادی ہند اور اردو صحافت	ڈاکٹر ندا ف محمد فیاض	206
جدوجہد آزادی ہند میں اردو شاعری کا کردار	ڈاکٹر احرار احمد	213
قائد تحریک آزادی ہند علامہ فضل حق خیر آبادی	محمد عرفان رضا	221
جدوجہد آزادی ہند اور بیگم حسرت موہانی	ڈاکٹر فرزانہ بیگم	228
چکبست کی شاعری اور جذبۂ حب الوطنی	ڈاکٹر گلناز شیخ	233
جدوجہد آزادی ہند اور اردو افسانے کے موضوعات	شاہین انصاری	237
جدوجہد آزادی ہند اور اردو ادب	محمد زکریا	252

جدوجہد آزادی ہند میں الہلال کا کردار	سیدہ فاطمہ	259
جدوجہد آزادی ہند اور مولانا محمد علی جوہر	عبدالعزیز۔ کے	265
جدوجہد آزادی ہند اور مولانا ابوالکلام آزاد	ڈاکٹر علیم اللہ حسینی	274
جدوجہد آزادی ہند اور مولانا ابوالکلام آزاد	عارف۔ این	281
مولانا محمد علی جوہر کی غزلوں میں جذبۂ حریت	تنویر کوثر	292
جدوجہد آزادی ہند اور چکبست کی شاعری	محمد اسماعیل	305
تحریک آزادی ہند میں اردو رسائل واخبارات۔	سراج انور	313
جدوجہد آزادی ہند اور اردو شاعری	شیخ مزمّل	324
تحریک آزادئ ہند اور فن طنز ومزاح	سعید الرحمٰن انصاری	328
جدوجہد آزادی ہند اور جوشؔ	سنمتر نوگھڑے	335
جدوجہد آزادی ہند اور مولانا ابوالکلام آزاد	ڈاکٹر نورالنساء	341
جدوجہد آزادی ہند اور چکبست کی قومی شاعری	ڈاکٹر محمد اقبال وانی	348

احوال واقعی

جدوجہد آزادی ہند میں اردو زبان و ادب کا بہت ہی نمایاں کردار رہا ہے۔ 1857 سے 1947 تک اس نوّے (90) سال کے عرصے میں جہاں ہمارے ملک کے رہنماؤں اور اہل وطن نے ملک کی آزادی کے لئے اپنی جانوں کی قربانیاں دیں وہیں اردو شاعری، ناول، افسانہ اور صحافت کے ذریعے اہل وطن میں جذبہ حب الوطنی پیدا کرنے کے لئے اور اس ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے میں قلمکاروں نے اپنا کلیدی کردار ادا کیا۔

ہندوستان کو آزادی حاصل کر کے پچہتر (75) سال مکمل ہو رہے ہیں چنانچہ اس ضمن میں ملک گیر پیمانے پر آزادی کا ''پچہتر سالہ جشن'' منایا جا رہا ہے۔ لہذا اس موقع پر نیتاجی سبھاش چندر بوس کالج کے ارباب مجاز نے بھی یہ طئے کیا کہ کالج کے تمام زبانوں کے شعبہ جات (انگریزی، مراٹھی، ہندی، اردو اور سنسکرت) کی جانب سے یک روزہ قومی سیمینار منعقد کیا جائے۔ چنانچہ ''جدوجہد آزادی ہند اور اردو ادب'' اس موضوع پر کالج ہذا کی جانب سے سیمینار کے انعقاد کی تجویز سوامی رامانند تیرتھ مراٹھواڑہ یونیورسٹی، ناندیڑ کے ارباب مجاز کو منظوری کے لئے پیش کی گئی اور مذکورہ یونیورسٹی کے ارباب مجاز نے نہ صرف اجازت مرحمت فرمائی بلکہ اس سیمینار کے لئے یونیورسٹی کے اشتراک اور رقمی امداد کی بھی منظوری دی جس کے لئے میں یونیورسٹی کے ارباب مجاز کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اس سیمینار کے کامیاب انعقاد کے لئے جناب بالا صاحب پانڈے (صدر ابھینو بھارت شکشن سنستھا، ناندیڑ) ڈاکٹر ایس وی شیونیکر (پرنسپل این ایس بی کالج، ناندیڑ) اور میرے ہم منصب ڈاکٹر پرویندر کور مہاجن (کنوینر و صدر شعبہ ہندی) پروفیسر جیون مسورے (صدر شعبہ انگریزی) ڈاکٹر سی این اینگڑے (صدر شعبہ مراٹھی) اور ڈاکٹر ایس بی درگو (صدر شعبہ سنسکرت) کا بھی بے حد مشکور ہوں۔

اس سیمینار کے لئے پروفیسر مجید بیدار (سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد) نے کلیدی خطبہ کے لئے اپنی رضامندی دی جس کے لئے میں موصوف کا بے حد ممنون ہوں۔ پروفیسر نسیم الدین فریس (سابق صدر شعبہ اردو مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی حیدرآباد) پروفیسر فضل اللہ مکرم (صدر شعبہ اردو سینٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد) ڈاکٹر خالد مبشر (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) ڈاکٹر عبداللہ امتیاز (صدر شعبہ اردو ممبئی یونیورسٹی، ممبئی) ڈاکٹر کیرتی مالینی جاؤڑے (صدر شعبہ اردو ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی، اورنگ آباد) کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں ان تمام مقالہ نگاروں کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے ''جدوجہد آزادی ہند اور اردو ادب'' اس موضوع پر عمدہ اور پرمغز مقالے ارسال فرمائے۔ ان تمام مقالوں کو یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کرتے ہوئے مجھے بے حد مسرت ہو رہی ہے۔ میں اسماک پبلی کیشنز کے ارباب مجاز جناب اطہر کلیم انصاری اور سید رشید اللہ حسینی کا بھی اس کتاب کی اشاعت کے لئے بے حد ممنون ہوں۔ اس کتاب کی پروف ریڈنگ ڈاکٹر سجاد احمد خان (سابق صدر شعبہ اردو، این ایس بی کالج، ناندیڑ) نے کی اور نوک پلک سے سنوارا۔ ڈاکٹر سید نورالامین، ڈاکٹر محمد انورالدین اور طاہر حسین طاہرؔ صاحب کے مفید مشورے شامل حال رہے جس کے لئے میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ محبان اردو اس مجلّہ کا خیر مقدم کریں گے اور اس سے مستفید ہوں گے۔

خلوص کار

ڈاکٹر ارشاد احمد خان

کوآرڈی نیٹر یک روزہ قومی سیمینار

''جدوجہد آزادی ہند اور اردو ادب''

نیتاجی سبھاش چندر بوس کالج، ناندیڑ

جدو جہد آزادی ہند اور اردو ادب

ڈاکٹر مزمل سرکھوت
(اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، ممبئی یونیورسٹی، ممبئی)

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
تو وہ خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر
(مولوی اسماعیل میرٹھی)

جدو جہد کے کئی ذرائع ہیں۔ جدو جہد جسمانی ہوسکتی ہے، جدو جہد ذہنی ہوسکتی ہے، جدو جہد مالی ہوسکتی ہے، جدو جہد تقریری ہوسکتی ہے، جدو جہد تحریری ہوسکتی ہے، سیاسی ہوسکتی ہے۔ اور اسی طرح دیگر قسم ہا قسم کی جدو جہد ہوسکتی ہے۔

انگریزوں کی حکومت سے آزادی کی خاطر ہمارے رہنماؤں نے ہر قسم کی جدو جہد کا سہارا لیا۔ جسمانی، ذہنی، مالی، تقریری، تحریری، سیاسی۔ غرض منزل اور مقصود آزادی تھی، جس کے لیے کوششیں اور جدو جہد درکار تھی۔ جب ہم جدو جہد کو ادب سے جوڑتے ہیں تو براہ راست یا بالراست ''تحریری'' جدو جہد کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ ادب تحریر میں زندہ رہتا ہے۔ جب سے انگریزوں نے مغلوں کے انتظام کا خاتمہ کر کے خود کا نظام قائم کیا اسی وقت سے آزادی کی جد و جہد شروع ہو چکی تھی۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک تقریباً نوے سال کی اس طویل جدو جہد میں ادب ہر مقام پر شریک کار رہا ہے۔ یہاں اردو ادب کا ذکر خصوصیت سے رہے گا۔

اردو ادب نے شاعری اور نثر کی مدد سے جد و جہد آزادی میں اپنا کردار بخوبی نبھایا ہے۔''اسباب بغاوت ہند'' سرسید کی سب سے اولین کوشش تھی کہ جس میں انھوں نے انگریزوں کے روبرو یہ بتا دیا کہ اگر ہندوستانیوں کا غصہ بغاوت کے لیے ذمہ دار ہے تو انگریزی اقتدار کی بے پرواہی بھی اتنی ہی ذمہ دار ہے۔اپنی رعایا کے تعلق سے خبردار رہنا حکومت کا نہایت اہم فریضہ ہے جس سے انگریز غافل رہے۔ برائے نام حاکم بہادر شاہ ظفر کی کوئی وقعت نہیں تھی۔حکم انگریزوں کا چلتا تھا۔

۱۸۵۷ء کے بعد سے لے کر ۱۹۴۷ء تک متعدد انقلابات آئے، احتجاج ہوئے، کانفرنسیں ہوئیں، تحریکیں ابھریں۔اردو ادب نے تین بڑی تحریکوں کو خصوصیت سے اپنی آغوش میں پناہ دی۔سرسید کی علی گڑھ تحریک، رومانوی تحریک اور ترقی پسند تحریک۔تینوں تحریکوں میں شاعری اور نثر توازن قائم رکھتے ہوئے سفر جاری رکھے ہوئے تھی۔ساتھ ساتھ نت نئے تجربے بھی ادب کی بساط پر آزمائے جا رہے تھے۔سرسید نے آسان اور سادہ نثر اور بامعنی شاعری کی حمایت کی تو اس قسم کی تحریریں وجود میں آئیں۔رومانوی قلمکاروں نے اپنی تحریروں میں رنگینی پیدا کرنے کی کوشش کی اور خوبصورت نثر اور شاعری کی دولت سے اردو ادب کو مزین کیا۔اس دور میں منشی پریم چند جیسا یکہ وتنہا ادیب حقیقت سے روبرو ہو کر ادب کے قاری کو اس سے دوچار کرنا چاہ رہا تھا۔منشی پریم چند کے افسانے اور ناول بالراست آزاد فضا میں سانس لینے کے لیے تحریک دے رہے تھے۔ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور میں سید سبط حسن نے'' آزادی کی نظمیں'' عنوان سے ایک کتاب ترتیب دی تھی جس میں انھوں نے محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، اکبر الہ آبادی، برج نرائن چکبست

سے لے کر رضا نقوی، احتشام حسین، شمیم کرہانی تک کے شاعروں کی نظمیں شامل کیں۔ گویا آزادی کا تصور پہلی جنگ آزادی یا بغاوت یا انقلاب کے بعد سے ہی اردو کے تخلیق کاروں کے ذہن میں بیدار ہو چکا تھا۔ اس منفرد کتاب میں اسرارالحق مجاز، علی سردار جعفری، جاں نثار اختر، سلام مچھلی شہری، علی جواد زیدی، جمیل مظہری، الطاف مشہدی، احسان دانش، روش صدیقی، مخدوم محی الدین اور فیض احمد فیض جیسے کئی ترقی پسند شاعروں کی نظمیں قارئین میں آزادی کے جذبات ابھار رہی تھیں۔

گورکھپور یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لیے لکھا گیا مقالہ ''ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں اردو شاعری کا حصہ'' اردو ادب کے آزادی کی تحریک میں کردار پر مناسب روشنی ڈالنی والی تحقیق ہے جسے کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ اور پھر کتاب ڈاکٹر درخشاں تاجور کی محنت کا ثمر ہے۔ اس کتاب میں ادوار کی ترتیب کے ساتھ اردو شاعری اور جدوجہد آزادی میں اس کی شرکت پر سنجیدہ گفتگو کی گئی ہے۔ پہلا باب نوے سال کی مسلسل تحریک کو اجمالی طور پر بیان کرتا ہے۔ دوسرا باب ۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء تک کی ادبی سرگرمیوں کا احاطہ کرتا ہے، تیسرا باب ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۵ء تک کی روداد بیان کرتا ہے، چوتھا باب ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۴ء تک کی کہانی بیان کرتا ہے اور پانچواں باب ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کی داستان کا خلاصہ ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس سے ملتے جلتے موضوع پر معروف نقاد گوپی چند نارنگ کی کتاب ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری'' بھی شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہے۔ جس میں انھوں نے اردو شاعری میں حب وطن کی روایت کو آغاز سے ماقبل انقلاب ۱۸۵۷ء تک امیر خسرو، قلی قطب شاہ تا غالب اور مومن تک کے تذکرے کے ساتھ

محفوظ کیا ہے۔اس کے بعد اس سلسلے میں حقیقی آزادی یعنی ۱۹۴۷ء تک اردو شاعری کے کردار کا تفصیلی بیان ہے۔اس بیان میں ہندوستان کی تاریخ بھی محفوظ ہوئی ہے اور ساتھ میں بغاوت، تحریکوں، سرگرمیوں کا ذکر اردو شاعری کے متحرک کردار کی شہادت میں پختگی پیدا کرتا ہے۔ضیاء الرحمان صدیقی کی کتاب ''تحریک آزادی اور اردو نثر'' اردو نثر کی تقریباً تمام اصناف کے مشمولات کو سموئے ہوئے ہے۔یہ کتاب اردو ناول، اردو افسانہ، اردو ڈراما، اردو طنز و مزاح، اردو خودنوشت اور سوانح، اردو صحافت جیسے موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔دراصل اردو صحافت ایک ایسا موضوع ہے جس کے سر پر تحریک آزادی کو پروان چڑھانے کا سہرا بندھتا ہے۔اردو صحافت نے سب سے بڑھ چڑھ کر اس جدو جہد میں حصہ لیا ہے۔جس دور میں آزادی کی تحریک زور و شور سے جاری تھی وہ اردو صحافت کا سنہری دور تھا۔مولانا آزاد کا اخبار الہلال، محمد علی جوہر کا کامریڈ، ظفر علی خان کا زمیندار، مولانا حسرت موہانی کا اردوئے معلی مشتے نمونے ہیں۔یہ اور ان جیسے بے شمار اردو اخبارات و رسائل جدو جہد آزادی میں سب سے فعال کردار میں نظر آتے ہیں۔معین الدین عقیل صاحب کی کتاب ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ'' ایک بھرپور کتاب ہے، جس میں متعدد موضوعات شامل کیے گئے ہیں۔

کتابیں اور بھی اس موضوع پر لکھی گئی ہیں اور دوسری زبانوں میں بھی لکھی گئیں ہیں۔مگر درج بالا ان معدودے چند کتابوں کے مطالعے سے بھی جدو جہد آزادی میں اردو ادب کی گراں بہا خدمات کا ادراک ہو جاتا ہے۔صحافت ایک مکمل باب ہے کہ جس کے روشن ماضی نے ہمارے موضوع کو منور کیا ہے۔اسی طرح اردو

کے شاعروں نے اپنی نظموں میں بیبا کی کے ساتھ اور غزلوں میں اشاروں کنایوں میں تحریک آزادی کی حمایت کی ہے بلکہ عوام الناس کو بیدار کیا ہے۔ادب کسی دور میں بھی معاصر گہما گہمی سے بے خبر نہیں رہا۔اور ادیب کبھی بھی معاشرے کی سرگرمیوں سے لاتعلق نہیں رہا۔دور حاضر میں بھی ہم اس کی کئی شکلیں نظارہ کر سکتے ہیں۔ بیدار ذہن تخلیق کار اپنے ضمیر کی آواز کو دبا نہیں پاتا، مصلحت بھلے ہی اسے روزگار زمانہ میں پریشان کر دے یا اسے خاموشی کا زہر پلانے پر مجبور کر دے، وہ کسی بھی حال میں اپنا اضطراب پوشیدہ نہیں رکھ پائے گا۔اس کی کسی نہ کسی تحریر یا تقریر میں اصلی موضوع عود کر آئے گا۔ظفر علی خان نہ صرف ایک بے باک صحافی تھے بلکہ وہ اچھے ترجمہ نگار اور شاعر بھی تھے ان کی مختصر نظم ''طاقتِ ایمان'' آزادی کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی موجوں کا طوفان ہے جس کی معاصر اہمیت بھی کم نہیں ہے۔

وطن کو میں چمنستاں بنا کے چھوڑوں گا
اور اس کی صبح کو خنداں بنا کے چھوڑوں گا
ہر ایک وقت کے دارا کو اور سکندر کو
میں اپنے قصر کا درباں بنا کے چھوڑوں گا
لہو شہید کا لوں گا اور اس کی سرخی کو
میں غازہِ رخِ ایماں بنا کے چھوڑوں گا
وہ مشکلیں جنھیں حل جبر کر نہیں سکتا
بزور صبر انھیں آساں بنا کے چھوڑوں گا

تحریک آزادی ممکن نہیں تھی جب تک کہ ملک کا ٹوٹا ہوا شیرازہ پھر سے

جوڑا نہ جاسکتا تھا۔یعنی سیاسی اور مذہبی اختلافات کے باوجود یکجہتی اور ملکی مفاد مقدم رکھنا ازحد ضروری تھا۔اس کام کو آسان بنانے میں بھی اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔قومی یک جہتی کو قائم رکھنے کے لیے کئی نظمیں لکھی گئیں اور جگہ جگہ گائی گئیں، شائع کر کے ملک کے کونے کونے تک پہنچائی گئیں۔ تا کہ ملک کا تانہ بانہ بکھرنے نہ پائے اور یکسوئی کے ساتھ آزادی کی لڑائی لڑی جائے۔علامہ اقبالؔ کا ترانہ ہندی اس کی سب سے اچھی مثال ہے۔اس کے علاوہ بھی شاعروں نے اس موضوع پر بھرپور لکھا ہے۔افسر میرٹھی کی نظم ''وطن کا راگ'' کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے....

مذہب کچھ ہو ہندی ہیں ہم سارے بھائی بھائی ہیں
ہندو ہیں یا مسلم ہیں یا سکھ ہیں یا عیسائی ہیں

اس سلسلے میں اشعار کی مثالیں بے شمار دی جاسکتی ہیں۔تاہم کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آزادی کی تحریک کے لیے لازمی عناصر کے مہیا کرنے میں اردو ادب نے کیا شاعری اور کیا نثر اپنی بیش بہا خدمات پیش کیں ہیں۔اردو ناول اور افسانوں میں بھی آزادی کی لو روشن دکھائی دیتی ہے۔ابن الوقت، چوگان ہستی، گئو دان، شکست، لندن کی ایک رات، جیسے ناولوں میں سیاسی بیداری کی دھمک نمایاں ہے۔ منشی پریم چند کے ''سوز وطن'' کی ضبطی اس کے افسانوں کی اہمیت کی کافی گواہی دیتی ہے۔اسی طرح ترقی پسند افسانہ نگاروں نے بھی معاشرے کی عریاں حقیقتوں کو بیان کیا اور سماج میں بیداری کی روح پھونک دی۔اردو ڈراما نگاروں نے بھی اس جانب توجہ دی تھی کہ مکمل آزادی کے لیے قومی سطح پر جاری سرگرمیاں انھیں اپنے فرائض سے

بے گانہ نہیں رکھ سکتی تھیں۔ یہاں میں صرف آغا حشر کے ایک معروف ڈرامے ''رستم وسہراب'' کے ایک مکالمے کو آپ کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کروں گا۔ یاد رہے یہ ڈراما ۲۷۔۱۹۲۶ء کا تخلیق کردہ ہے۔ایک ایرانی سپاہی نہایت دلیری کے ساتھ زندگی اور آزادی کا مفہوم بتاتا ہے۔ بہادر سہراب کی قید میں ہونے کے باوجود ایرانی سپاہی ہجیر نہایت فخر کے ساتھ کہتا ہے....ملاحظہ کیجیے....

''زمین پر رینگتے ہوئے حقیر کیڑے کی طرح حرکت کرنے اور سانس لینے کا نام زندگی نہیں ہے۔آزادی اور اختیار سے محروم ہوکر پامال گھاس کی مانند زندہ رہنا انسانیت کی موت ہے۔میری تمنا ہے اور دعا ہے کہ میرے اہل وطن جئیں..لیکن غلام بن کر نہیں آقا بن کر، کتے کی طرح نہیں شیر کی طرح۔''

(باب دوسرا۔سین پانچواں)

اپنے مضمون کا اختتام میں جوشؔ ملیح آبادی کے اس شعر کے ساتھ کرنا چاہوں گا...

سنو اے بستگانِ زلف گیتی! ندا کیا آرہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر، غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

☆☆☆☆☆

جدوجہد آزادی ہند میں اردو شعراء کا کردار

ڈاکٹر قاضی نوید
صدر شعبۂ اردو،
مولانا آزاد کالج آف آرٹس، سائنس اینڈ کامرس
ڈاکٹر رفیق زکریا کیمپس، اورنگ آباد

ایک زمانہ تھا جب مادرِ وطن انگریزوں کی حکمرانی میں تھا اور وہ اہلیان ہندوستان پر اس طرح حکومت کرتے تھے جیسے کوئی جابر حاکم اپنے غلاموں پر کرتا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ غلام کو اپنے غلام ہونے کا رتی برابر بھی احساس نہیں تھا بلکہ حریت اور غلامی کی اصطلاحوں سے بھی اہلیان ہند ناواقف تھے۔ ایسے حالات میں شعراء اور علماء کرام نے جذبۂ حریت کو پروان چڑھانے کا بیڑہ اٹھایا۔ شاہ عبدالعزیز نے سب سے پہلے انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ قاسم نانا توی، مولانا محمود الحسن (شیخ الہند)، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبیداللہ سندھی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے انگریزوں کے خلاف اصلاحی تحریک چلائی۔ ان کا مطمع نظر ہندوستان کی آزادی نہیں تھا بلکہ وہ دین کی حفاظت کرنا چاہتے تھے لیکن اس کی وجہ سے انگریزوں کے خلاف ماحول پروان چڑھنے لگا۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی ذات گرامی کو صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں عوامی انقلاب اور قوموں کی آزادی کا اولین رہنما کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ حضرت اس زمانے میں

اسلامی جہاد کی حقیقی روح کے ساتھ انقلاب نو کا عملی اور فکری نمونہ دنیا کے سامنے پیش کررہے تھے۔ جب انقلاب روس کو رونما ہونے میں پچاس سال باقی تھے جسے تاریخ عالم میں اولین انقلاب کی حیثیت حاصل ہے، شاہ صاحب نے ہندوستان کی سرزمین میں اقتصادیات اور سیاسیات کے وہ اصول مرتب فرمائے جو آج بھی اقوام عالم کے لئے نشان راہ ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بعد ان کے کام کو مولوی احمد شاہ مدراسی اور مولانا لیاقت علی نے آگے بڑھایا۔ مولوی لیاقت علی انگریزوں کے خلاف جہاد کے پُر جوش مبلغ تھے اور اپنے وعظ و بیان سے انھوں نے انگریزوں کے خلاف انتہائی جوش پیدا کردیا تھا۔

واسطے دین کے لڑنا نہ پئے طمع بلاد
اہل اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد
ہے جو قرآن و احادیث میں خوبی جہاد
ہم بیاں کرتے ہیں تھوڑا سا اسے کرلو یاد
قرض ہے تم پہ مسلمانوں جہادِ کفار
اس کا سامان کرو جلد اگر ہو دیندار

قاسم نانوتوی کے شاگرد شیخ الہند مولانا محمود الحسن جس نے مہاتما گاندھی کے ساتھ شانہ بہ شانہ جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں مالٹا کی قید سے واپس آئے۔ انھوں نے ہی گاندھی جی کو مہاتما کا خطاب دیا تھا پھر خلافت تحریک میں حصہ لیا جس کی قیادت مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی بی اماں کی سرپرستی میں کررہے تھے۔

مومن مولوی سید احمد بریلوی کے مرید تھے اور غیر ملکی حکومت کے خلاف جہاد کو اصل ایمان اور اپنی جان کو اس راہ میں صرف کر دینے کو سب سے بڑی عبادت سمجھتے تھے۔ انھوں نے مثنوی ''جہادیہ'' بھی لکھی ہے۔

مومن حسد سے کرتے ہیں ساماں جہاد کا
ترسا صنم کو دیکھ کے نصرانیوں میں ہم

''غدر'' کے دنوں میں جب انقلابیوں کا زور کم پڑنے لگا تو کسی نے طنزاً کہا تھا۔

دمدمے میں مدم نہیں ، خیر مانگو جانِ کی
اے ظفر ٹھنڈی ہوئی شمشیر ہندوستاں کی

بہادر شاہ ظفؔر نے جواب دیا تھا۔

غازیوں میں بو رہے گی جب تلک ایمان کی
تب تو لندن تک چلے گی تیغ ہندوستان کی
کتنا ہے بدنصیب ظفؔر بعد مرگ بھی
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں
نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں

اردو شعراء نے مشترکہ تہذیبی عناصر کو اپنی شاعری کے لیے بنیاد بنایا، وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ جب تک ہندوستان کی تمام قومیں اور مختلف مذاہب کو ماننے والے متحد نہیں ہوتے، تب تک آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ ہند اردو شاعری کی تشکیل و تعمیر جن بنیادوں پر قائم کی گئی اور جن عناصر سے اس کا خمیر اٹھا

تھا۔ موضوع کے اعتبار سے ان عناصر میں سیکولر تصور، انسان دوستی، رموزِ حیات کی تلاش اور انسانیت کو مختلف خانوں میں تقسیم کرنے کے بجائے ایک ایسے مرکز کی جستجو تھی جہاں ہر طرح کے امتیازات مٹ جائیں۔ اردو شاعری نے انھیں موضوعات کو پیش کرنے کے لیے علامتوں کا سہارا لیا۔ حریر و حرم، شیخ و برہمن، سبحہ و زنار جیسی علامتیں فرقہ واریت کے خلاف اور ایک مرکز پر متحد کرنے کے لیے استعمال کی۔ دوسری طرف قفس، اسیری، آشیانہ، نشیمن اور صیاد کی علامتیں اپنی بھرپور اشاریت کے ساتھ واضح طور پر ان واقعات اور حقائق کی طرف متوجہ کرنے لگیں جو ملک کو درپیش تھیں۔ اس دور میں کارواں، رہبر، راہنما کی علامتیں جدید معنوں میں استعمال ہوئیں ۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہوجاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا
(اکبرالہ آبادی)

اس کے سوا نہیں خبر آشیاں مجھے
میں تھا اسیر دام تو بجلی چمن میں تھی
(فانی)

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہوجائے
(اصغر)

بنا لیتا ہے موج گل سے آشیا اپنا

وہ پابند قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے

(اصغر)

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

(ثاقب)

زمانے بڑے شوق سے سن رہا تھا

ہمیں سوگئے داستاں کہتے کہتے

صور کے پردے میں کس نے روح تازہ پھونک دی

جاگ اٹھے برسوں کے سوئے ایک ہی آواز میں

(آرزو)

ہندوستان کو انگریزی حکومت سے آزاد کرانے میں ہندوستان کی سبھی زبانوں نے اپنے اپنے طور پر کوششیں کیں۔اس طرح ملک کی ایک نمائندہ زبان کی حیثیت سے اردو زبان نے حصولِ آزادی کے لئے مسلسل جدوجہد کی اس تحریک میں قابل فخر کردار ادا کیا۔ اہلیان وطن کو غلامی کی ذلت سے آزادی کی ترغیب دی بلکہ پوری تحریک میں مجاہدوں کی رہنمائی کی ذمہ داری سرانجام دی۔اتحاد واتفاق کا درس دیا۔ برطانوی حکومت کے خلاف احتجاج بلند کرنے کا حوصلہ بخشا اور دلوں کو گرمانے والا نعرہ ''انقلاب زندہ باد'' دیا۔شاعروں اور ادیبوں نے نہ صرف اپنی تخلیقات کے ذریعے آزادی کی تحریک میں روح پھونکی بلکہ عملی طور پر اس تحریک سے وابستہ رہے۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر آزادی تک اہلیان ہندوستان کو خواب غفلت سے بیدار کرنے

کے جرم میں متعدد ادیبوں اور شاعروں کو جام شہادت نوش کرنا پڑا۔اس زمانے میں حب الوطنی اور وطن پروری کے جذبات کی سب سے زیادہ ترجمانی خواجہ الطاف حسین حالؔی اور آزاد کے کلام میں نظر آتی ہے۔ان لوگوں نے وطن پرستی کے ذکر کے ساتھ اہل ملک میں قوم پرستی کے جذبات بیدار کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔حالؔی کی نظر میں اتحاد و اتفاق کی کمی نے ملک کو انتہائی خراب حالت میں پہنچا دیا ہے ۔

ہند میں اتفاق ہوتا اگر
کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی
اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی

انگریزوں کی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی سے حالؔی بخوبی واقف تھے۔ان کی اس چال پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح
واں پاؤں جمانے کے لئے تفرقہ ڈالو

حالؔی کے علاوہ آزاد کا کلام بھی حب الوطنی کے جذبات سے سرشار نظر آتا ہے۔سرورؔ جہاں آبادی نے اہل ہند کو خواب غفلت سے بیدار کر کے ان میں جذبۂ حب الوطنی پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔کہتے ہیں ۔

خواب گراں سے چونکو ہندوستان والو
پستی میں کیوں پڑے ہو اونچے نشان والو
کب تک یہ آہ ذلت و عزوشان والو

کب تک یہ خواب غفلت سونے کی کان والو

ملک سے والہانہ وابستگی کا اظہار اکبرالہ آبادی کے کلام میں بھی جابجا نظر آتا ہے۔ انھوں نے طنز وظرافت کا سہارا لے کر اہل وطن کو غلامی سے نجات حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ کتنے پُر درد لہجے میں احتجاج کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

انقلاب دہر دیکھو بن گیا آقا غلام
قصر کا مالک جو تھا اب اس کا دربان ہوگیا

چکبستؔ کی شاعری کا ایک اہم جزو اِن کی قومی اور وطنی شاعری ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعے ہندوستانیوں کو قومیت اور وطنیت کے جذبات کو جلا بخشی ہے۔ وہ ہوم رول تحریک کے حامی تھے اور اس تحریک کو تقویت پہنچانے کے لئے انھوں نے اپنی شاعری کا استعمال کیا۔ کہتے ہیں ؎

پہنانے والے اگر بیڑیاں پہنائیں گے
خوشی سے قید کے گوشے کو ہم بسائیں گے
جو منتری درِ زنداں کے سو بھی جائیں گے
یہ راگ گا کے انھیں نیند سے جگائیں گے
طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

علامہ اقبالؔ نے بھی اہل وطن کو حب الوطنی کی طرف مائل کیا۔ ملک کی سیاسی صورت حال کو دیکھتے ہوئے انھوں نے اہل وطن کو آنے والی مصیبت سے خبردار کردیا تھا ؎

وطن کی فکر کرنا واں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اردو کی سیاسی شاعری کو اپنے انقلابی نغموں سے نئی سمت دینے والے شاعر جوشؔ ملیح آبادی نے اہل ملک کے حوصلوں کو بلند کیا اور ان میں جوش وخروش پیدا کیا۔ اپنی نظموں سے انھوں نے انگریزوں کی متعدد پالیسیوں کی مخالفت کی اور اس کے خلاف نظمیں لکھیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہو۔

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب
پست سے پست ہو چیز وہ بن جا لیکن
مر کے بھی جنس غلامی کا خریدار نہ بن

اہل وطن کو آزادی سے روشناس کرانے کے لئے انھوں نے ہر ممکنہ کوشش کی۔

سنو ائے بستگان زلف گیسی
ندا کیا آرہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر
غلامی کی حیات جاوداں سے

ظفر علی خاں نے بھی اپنے کلام کے ذریعے انگریزوں کے خلاف احتجاج

بلند کیا اور اہل وطن کو آزادی کی کھلی فضا میں سانس لینے کا جذبہ فراہم کیا۔ جلیان والا باغ کے واقعہ پر انھوں نے دو نظمیں لکھیں۔ ایک ''مظالم پنجاب'' اور دوسری ''جنرل ڈائر کی یاد میں'' شعر ملاحظہ ہو۔

ہلاکو کو عبث تاریخ میں بدنام کرتے ہیں
بیچارے نے نہتے پر دیا کب حکم فائر کا

۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نفاذ پر انھوں نے کہا۔

کاغذی گھوڑا دیا ہم کو سواری کے لئے
اک کھلونا بھیج کے بچوں کا دل بہلا دیا

تحریک آزادی کے علم بردار شعراء میں ایک نمایاں نام حسرتؔ موہانی کا ہے۔ انہوں نے عملی طور پر بھی جنگ آزادی میں شرکت کی اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ ان کی ایک خوبی یہ ہے کہ انہوں نے براہِ راست احتجاجی رویہ نہیں اپنایا بلکہ رمز و ایماء کے ذریعے اہل وطن میں آزادی کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔

ہم قول کے صادق ہیں اگر جان بھی جاتی
واللہ کبھی خدمت انگریز نہ کرتے
ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی
جو چاہو سزا دے لو اور بھی کھیل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو کی ہو جو شکایت بھی

محمد علی جوہرؔ نے بھی اپنی شاعری سے غلامی کے بندھنوں کو توڑنے کے

لئے اہل وطن کو جھنجھوڑ کر جگایا ہے۔ برطانوی اربابِ اقتدار کو للکارتے ہوئے کہتے ہیں ۔

نہیں پالا پڑا قاتل تجھے ہم سخت جانوں سے
ذرا ہم بھی تو دیکھیں تیری جلادی کہاں تک ہے

رومان پرست شاعر اخترؔ شیرانی نے بھی سیاسی نظمیں لکھی ہیں۔ یہ بات عیاں ہے کہ اخترؔ شیرانی کی تمام کائنات حسن و عشق ہے جس پر وہ اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں لیکن آزادی کے آگے حسن و عشق کو بھی معنی سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں ۔

عشق و آزادی بہارِ زیست کا عنوان ہے
عشق میری جان آزادی مرا ایمان ہے
عشق پر کردوں خدا میں اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

جگرؔ مرادآبادی خالص غزل کے شاعر تھے۔ مگر انھوں نے بھی اہل وطن کو غلامی سے آزاد ہونے کی ترغیت دی ہے ۔

ناز جس خاک وطن پر تھا مجھے آہ جگرؔ
اسی جنت پہ جہنم کا گماں ہوتا ہے

ان شعراء کے علاوہ عبدالمجید سالکؔ، تلوک چند محرومؔ، برج نارائن چکبستؔ، نکہتؔ شاہ جہاں پوری، کوکبؔ شادمانی، محمود اسرائیلی، رام پرساد بسملؔ وغیرہ کے یہاں انقلابی رنگ ملتا ہے۔

آزادی کے جذبات بیدار کرنے میں ترقی پسند شعراء کی آواز بھی بلند رہی۔ انہی شاعروں نے خالص احتجاج کا رویہ رکھنے والوں میں ایک نمایاں نام علی سردار جعفری کا ہے۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ظلم و جبر اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جنگ کرنے میں بسر ہوا۔ آزادی سے قبل وہ برطانوی استعمار کے خلاف برسر پیکار تھے۔ آزادی کے بعد بھی انھوں نے ظلم و جبر کے خلاف اپنی جنگ جاری رکھی۔ حق گوئی اور صداقت کی راہوں پر چلنے کی وجہ سے جعفری کو کئی بار قید و بند کی سزائیں جھیلنی پڑیں۔

جانتے ہو ہماری نگاہوں میں تم کون ہو
عصر حاضر کے فرعون ہو
تم وہ قاتل ہو گردن پہ جن کی
ایک دو کا نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں کا خون ہے
تم وہ پاپی ہو کہ پاپ بھی شرم سے سرنگوں ہے
ہم کو اپنی غلامی گوارا نہیں ہے
ایک بھی ذرہ اس ملک میں تمہارا نہیں ہے
بھاگو بھاگو

دکن کا شعلہ نوا انقلابی شاعر مخدوم محی الدین نے اپنے کلام کے ذریعہ لوگوں میں حریت کے جذبات کو پروان چڑھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کر دوں

کیا مجاہد نہ بنوں
کیا میں تلوار اٹھاؤں نہ وطن کی خاطر

مخدومؔ نے کئی انقلابی نظمیں تحریر کیں ان میں سے ''گل تر'' میں شامل ان کی مشہور نظم ''چاند تاروں کا بن'' بھی اپنے لہجے، انداز، کھردرے پن کی وجہ سے بغاوت و مزاحمت سے قریب ہوگئی ہے۔ مخدومؔ کی یہ نظم ہندوستان کی پوری تاریخ کو عہد غلامی سے لے کر آزادی تک کو علامتی انداز میں پیش کر رہی ہے۔ اس نظم کا آخری بند ملاحظہ ہو۔

رات کی تلچھٹیں ہیں اندھیرا ابھی ہے
صبح کا کچھ، اجالا بھی ہے
ہمدمو!
ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

مخدومؔ کے بیشتر کلام میں انقلاب کی نوید، تابناک مستقبل کی تعمیر کا خواب، ظلم و جبر کے خلاف جنگ اور غربت و جہالت کے خاتمہ کا جذبہ پورے آب و تاب سے سایہ فگن نظر آتا ہے۔ مخدومؔ شاعر انقلاب کی حیثیت سے ہماری ادبی تاریخ کا

ایک تابندہ ستارہ ہے۔

فیض احمد فیضؔ کی شاعری نے اردو زبان و ادب کو نئے اسلوب اور سیاسی پس منظر میں آشنائی عطا کی۔ فیضؔ کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے غزل جیسی نازک ولطیف صنف سخن کو احتجاج و مزاحمت کا ہنر عطا کیا۔ اردو کی احتجاجی شاعری میں فیضؔ نے اہم اضافے کئے ہیں۔ ایک ایسا احتجاجی لہجہ انھوں نے تخلیق کیا ہے جس میں رومانیت و بغاوت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ فیضؔ کے یہاں غزل کے روایتی کردار اور الفاظ مثلاً رقیب، چمن، زلف، قفس، گل و بلبل وغیرہ احتجاجی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ آزادئ اظہار پر پابندی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

متاعِ لوح و قلم چھین گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

فیضؔ کی نظم ''زنداں کی ایک شام'' اور ''زنداں کی ایک صبح'' بہت مشہور ہے۔ ان دونوں نظموں کا تیور و آہنگ احتجاج ہے۔ بلکہ فیضؔ کے دو مجموعے ''دست صبا'' اور ''زنداں نامہ'' میں خطیبانہ آہنگ اور احتجاجی لہجہ بہت بلند و بالا ہے۔ فیضؔ نے ان میں سیاسی جبر اور ریاستی ظلم کو چیلنج کیا ہے ؎

یہی جنوں کا یہی طوق و دار کا موسم
یہی جبر یہی اختیار کا موسم

ہمیں سے سنتیں منصور و قیس زندہ
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

☆

بول کہ لب آزاد ہیں ترے
بول زباں اب تک تری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے

فیضؔ کی ایک مشہور نظم جس میں احتجاجی رویہ اپنے عروج تک پہنچ گیا ہے۔ اردو کے احتجاجی ادب کی بہترین نظموں میں سرفہرست نظر آتی ہے۔ نظم ملاحظہ ہو ہم دیکھیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے۔ان کی ایک اور نظم جو احتجاجی رویہ رکھتی ہے، بہت مشہور ہوئی ہے ''نثار میں تیری گلیوں میں''۔

کلاسیکی روایتی شاعری کی علامتوں، استعاروں اور لفظیات میں معمولی تبدیلی کر کے مجروح نے معاصر سیاسی وسماجی منظرناموں سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔

مجروحؔ نے فیضؔ اور حسرتؔ کی قائم کردہ غزل کی روایت کو استحکام و اعتبار عطا کیا ہے۔ سیاسی موضوعات کو انھوں نے اپنی غزلوں میں اتنی مہارت پیش کیا ہے کہ غزلوں کے فنی محاسن پر کوئی حرف نہیں آیا ہے۔ جیل سے رہائی کے بعد بھی مجروح کے کلام میں زندانی لفظیات، زنداں، صیاد، قفس جیسے استعاروں کا استعمال برقرار رہا اور مجروحؔ کے لہجہ، آہنگ میں احتجاج و بغاوت کی لہر رہائی کے بعد اور تیز و بلند ہوگئی تھی۔ اب مجروحؔ کے چند اشعار نقل کئے جا رہے ہیں۔

سر پر ہوائے ظلم چلے، سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ
کس نے کہا کہ ٹوٹ گیا خنجر فرنگ
سینے پہ زخم نو بھی ہے داغ کہن کے ساتھ
جھونکے جو لگ رہے ہیں نسیم بہار کے
جنبش میں ہے قفس بھی اسیر چمن کے ساتھ

جاں نثار اخترؔ نے بھی اپنی شاعری کے ذریعہ مجاہدین آزادی کی حوصلہ افزائی کی خاطر انقلابی اور احتجاجی نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظمیں میں ''میں ان کے گیت گاتا ہوں''، ''ساقی''، ''سویرا''، اے ہمریان قافلہ''، ''ابھی نہیں''، ''گاندھی جناح کی ملاقات پر''، ''کرن'' اور ''ہم ایک ہیں'' وغیرہ نظمیں میں اپنے سیاسی نظریے کی ترجمانی کی ہے۔

ہم ایک ہیں
یہ وقت کھونے کا نہیں

یہ وقت سونے کا نہیں
جاگو وطن خطرے میں ہے
سارا چمن خطرے میں ہے
پھولوں کے چہرے زرد ہیں
زلفیں فضا کی گرد ہیں

ترقی پسند شاعر جنھوں نے احتجاجی شاعری کی ہے، ان میں کیفی اعظمی، ساحرؔ لدھیانوی، فراقؔ گورکھپوری، ساغرؔ نظامی، سلام مچھلی شہری، جمیل مظہری، سکندر علی وجدؔ، الطاف مشہدی، آنند نرائن ملا، وقار انبالوی، غازی کابلی وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔ ساحرؔ کا شعر دیکھئے۔

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا
تم نے جس خون کو مقتل میں دبانا چاہا
آج وہ کوچہ و بازار میں آ نکلا ہے
کہیں شعلہ کہیں نعرہ کہیں پتھر بن کر
خون چلتا ہے تو رکتا نہیں سنگینوں سے
سر اٹھاتا ہے تو دبتا نہیں آئینوں سے

☆☆☆

جدوجہد آزادی ہند میں اردو صحافت کا کردار

پروفیسر ڈاکٹر نسیم بیگم عبدالسلیم
صدر شعبہ اردو،
لیٹ سوکمل تائی جاکر مہیلا مہاودیالیہ، پربھنی۔

صحافت ایک ایسا پیشہ یا فن ہے جس کے ذریعہ ہر نئے واقعات اور حادثات کو پوری صداقت اور دیانت کے ساتھ تحریر اور تصویر سے مزین کر کے عوام تک پہنچایا جائے، جس میں قومی ترقی، ملک کی خبر اور عوام کی رہنمائی و دلچسپی کے عناصر بھی ہو۔ اور کوئی ایسی خبر شامل اشاعت نہ کی جائے جو جھوٹ پر مبنی ہو اور سماج اور ملک میں انتشار و افتراق کا باعث بنے۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد ''ہم صحافت کے بازار میں سودائے نفع کے لئے نہیں بلکہ تلاش زیاں و نقصان میں آئے ہیں۔ صلہ و تحسین کے لئے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلب گار ہیں۔ عیش کے پھول نہیں خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔ دنیا کے زر و سیم کو قربان کرنے کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے تئیں قربان کرنے آئے ہیں۔''

صحافت کا اصل مقصد نامعلوم خبروں کو معلوم بنانا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ چند اور باتیں ہیں جو صحافت کے مقاصد میں شمار کی جاتی ہیں۔ مثلاً صحافت کے ذریعے بدلتے ہوئے حالات پر تبصرہ کر کے لوگوں کو سماج کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں کے حرکت اور عمل سے روشناس کرانا بھی ہے۔ اور معاشرہ کی اصلاح، ملک

کے انتظام اور انصرام، قیام امن اور قومی یک جہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی میں معاون اور مددگار بھی ہونا ہے۔ نیز سماج کے مختلف اقدار مثلاً مشترکہ تہذیب اور عوام کے حقوق کی حفاظت بھی کرنا ہے۔ لہٰذا صحافت عوام کے لئے، عوام کے بارے میں، عوام اور سماج ہی کے ذریعے تخلیق کیا گیا وہ مواد ہے جو دن بھر کے واقعات اور حادثات کو رشحات قلم سے نکھار کر اور تصویر سے مزین کر کے انسان کی اس چاہت کو پورا کرتا ہے جس کے تحت ہر نئی بات کے جاننے کو وہ بے قرار رہتا ہے۔

جب تحریر، کاغذ، قلم اور روشنائی وجود میں آئے تو خبر رسانی، خبر گیری اور خبر نگاری کے عمل میں تیزی و سرعت آئی اور قلمی اخبارات اکثر و بیشتر ترقی یافتہ شہروں سے شائع ہونے لگے۔ قلمی اخباروں میں سب سے پہلی کوشش ملک روم میں کی گئی، جہاں ''رومی ایکٹا'' روداد شائع ہوا کرتی تھیں۔ جس میں شہر اور کونسلوں کے متعلق خبریں اور اعلانات ہوا کرتے تھے، اس روداد کو مختلف مقامات پر بھیج دیا جاتا تھا ۔۶۰ رسال قبل مسیح جولیس سیزر نے ''ایکٹا ڈائیورنا'' Acta Diurna کے نام سے 'روزنامہ' جاری کیا جسے تختے پر فٹ چسپاں کر کے اہم چوراہوں، گذرگاہوں اور عوامی جگہوں پر رکھ دیا جاتا تھا اور محققین کے رائے میں اسی کو پہلا عوامی اخبار مانا جاتا ہے۔ بادشاہوں کے عہد کے بعد ایک ہزار سال قبل چین میں ''خاندان تانگ'' کے کسی بادشاہ نے ''تی پاؤ'' (محل کی خبریں) نامی ایک اخبار جاری کروایا۔ اسی طرح مغل تاجدار اکبر اعظم کے عہد میں محل سے ''اخبار دربار معلّٰی'' نام کا ایک اخبار نکلنا شروع ہوا۔ چنانچہ یہ سلسلہ مغلیہ عہد میں وقفے وقفے سے جاری رہا اور شاہ جہاں کے زمانے میں اس اخبار کا نام ''اخبار دارالخلافہ شاہجہان آباد'' رکھا گیا۔

یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے بعد، سب سے پہلا خبر نامہ ۱۶۰۹ء میں جرمنی سے جاری ہوا۔اس خبر نامے کا نام Avisa Relation Order "Zeitung" تھا۔۲/ستمبر ۱۶۲۰ء میں برطانیہ سے ''کورنٹو''(Coranto) نام کا پہلا اخباری پرچہ جاری ہوا۔ پھر حکومت کی نگرانی میں ۱۶۶۵ء میں ''آکسفورڈ گزٹ '' جاری ہوا۔ اسی کا نام بعد میں تبدیل ہوکر ''لندن گزٹ'' ہوگیا۔اسی اخبار کو محققین نے جو لندن کا پہلا باقاعدہ پہلا اخبار تسلیم کیا ہے۔لندن کی صحافت میں اس وات ایک بڑا انقلاب آیا جب بابائے صحافت ڈینیل ڈیفو نے مع اپنے رفقاء کے ۱۷۱۹ء میں اخبار ''ڈیلی پوسٹ'' اور پھر ''لندن پوسٹ'' جاری کیا۔

ہندوستان میں صحافت کے آغاز سے متعلق غور کیا جائے تو پتہ چلتا ھیکہ اکبر کے دربار میں ''اخبار دربار معلیٰ'' اور شاہ جہاں کے دربار میں ''دارالخلافہ شاہ جہاں آباد'' کی ایک خاص اہمیت رکھتے تھے۔ ہندوستان میں سب سے پہلا اخبار ۲۹/جنوری ۱۷۸۰ء کو جیمس اگسٹس ہکی (James Augustus Hicky) نے کلکتہ شہر سے'' کلکتہ جنرل ایڈورٹائزر'' (Calcutta General Advertiser)یا ''ہکیز بنگال گزٹ'' (Hicky's Bengal Gazette) کے نام سے انگریزی زبان میں جاری کیا۔پھر دس ماہ بعد نومبر /۱۷۸۰ء میں مسٹر بی۔میزنک اور مسٹر پیٹر ریڈ نے مل کر ہندوستان میں انگریزی کا دوسرا اخبار ''انڈیا گزٹ'' کلکتہ ہی سے جاری کیا۔

مالک ہری دت بنگو اور ایڈیٹر منشی سدا سکھ کی زیر نگرانی میں ۲۷/ مارچ ۱۸۲۲ء کو اردو کا پہلا مطبوعہ اخبار ''جامِ جہاں نما'' کلکتہ سے جاری ہوا۔متحدہ

ہندوستان کے مختلف شہروں سے اردو زبان میں بہت سارے اخبارات جاری ہو گئے، جن میں بطور خاص 'آئینہ سکندری' ۱۸۳۴ء۔ ممبئی، دہلی اردو اخبار ۱۸۳۶ء۔ دہلی، منظر عام پر آئے۔ دہلی اردو اخبار کو ایک عرصہ دراز تک اردو کا پہلا اخبار کہا جاتا تھا۔ خیر خواہ ہند۔ ۱۸۳۷ء۔ مرزا پور، سید الاخبار۔ ۱۸۳۷ء۔ دہلی، لکھنو اخبار۔ ۱۸۴۷ء۔ لکھنو جو لکھنو کا پہلا اخبار تھا۔ کوہ نور۔ ۱۸۵۰ء۔ لاہور، صادق الاخبار۔ ۱۸۵۴ء۔ دہلی، طلسم اخبار۔ ۱۸۵۶ء۔ لکھنو جاری ہوئے۔ یہ تمام اخبارات اردو کے اولین اخبارات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۰ر مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ چھاؤنی سے انگریزوں کے خلاف بغاوت عظیم شروع ہوئی اسی بغاوت کو تاریخ ہند میں پہلی جنگ آزادی کے نام سے جانا جاتا ہے، بالخصوص مسلمانوں پر تو قیامت صغری آن پڑی۔ اردو اخباروں پر لارڈ کیننگ نے سخت پابندیاں عائد کیں، کئی معروف و بے باک اخباروں کو جبراً بند کر دیا گیا اور بیشتر فرض منصبی سے انصاف کرنے والے اردو صحافیوں کو سخت سزائیں دی گئیں، یہاں تک ''دہلی اردو اخبار'' کے ایڈیٹر و مالک مولوی محمد باقر کو صداقت پرستی و ہم وطنوں کی حمایت کی پاداش میں گولی مار دی گئی، یہ اور اس طرح کے کئی مظالم ان صحافیوں پر ڈھائے گئے۔ ''صادق الاخبار'' کے ایڈیٹر سید جمیل الدین ہجر کو تین سال کی قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ گویا کہ صحافیوں کی جانب سے ملک کے لیے سب سے پہلے جان کی قربانی دینے اور قید بامشقت کی سزا پانے کا شرف بھی اردو صحافیوں کو ہی نصیب ہوا۔ مولوی محمد باقر کی شہادت اور حکومت کی جانب سے اخبارت کے لئے اجازت لینے کے سبب کئی اخبارات بند ہو گئے اور اسی وجہ سے اخبارات کی دنیا

میں ایک طرح کی سکوت وخاموشی طاری ہوگئی۔۱۸۵۸ئمیں محسن اردو منشی نول کشور نے ہمت کر کے ''اودھ اخبار'' لکھنو سے جاری کیا۔اوراس کیبعد تو اردو صحافیوں نے اخبارات،رسائل اور جرائد کا ایک ضخیم سرمایہ سے اردو صحافت کے دامن کو کافی وسیع ومستحکم کردیا۔ان اخبارات و رسائل میں سید الاخبار،اخبار سائنٹفک سوسائٹی،رسالہ تہذیبالاخلاق،اودھ پنچ،پیسہ اخباراور پھر بیسویں صدی کے اوائل میں رسالہ اردوئے معلیٰ ،زمیندار،ہندوستان اور الہلال و البلاغ وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

آج کل ہمارے ملک میں فرقہ وارانہ افتراق وانتشار کے زیر اثر کچھ لوگ غیر دانستہ اور کچھ لوگ دانستہ طور پر یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہے کہ متحدہ ہندوستان کی آزادی میں اردو اخبارات اور رسائل نے قابل قدر کردار ادا نہیں کیا نیز یہ کہ اردو صحافت اور اردو داں حضرات ہمیشہ فرقہ وارانہ جذبات کو برانگیختہ کرتے رہے ہیں۔جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے،کیونکہ اردو صحافت نے اس ملک کی جدوجہد آزادی اور قومی ہم آہنگی کے فروغ میں جتنا بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور پیش پیش رہی بلا مبالغہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کی دیگر زبانوں کی صحافت نے اس کے بالمقابل حصہ نہیں لیا۔میرا یہ دعوی بغیر دلیل نہیں بلکہ اس کے شواہد تاریخ صحافت اور تاریخ جنگ آزادی کے ہر صفحے پر درخشندہ اور تابندہ ہیں۔

اردو صحافیوں نے جان و مال کا خوف کئے بغیر جنگ آزادی میں سرگرم کردار ادا کر دیا انگریزوں کے خلاف مجاہدین آزادی کی ذہن سازی کی ،اور انھیں شعلۂ جوالہ بنادیا،علاوہ ازیں مشترکہ تہذیب ،قومی ہم آہنگی ،اخوت اور محبت اور

باہمی اتحاد اور ارتباط کی بقاء کے لئے کتنی جاں فشانی اور جہد مسلسل کا مظاہرہ کیا ہے۔جیسا کہ مختلف اخبارات، جرائداور رسائل اور تاریخی کتب میں اس کے بے شمار حوالے وثبوت ہمیں دستیاب ہیں۔تحقیق وجستجو کبھی بھی مکمل نہیں ہوتی بلکہ تحقیق کے دروازے ہمیشہ کے لئے کھلے ہوتے ہیں،اسی وجہ سے ہر آئے دن جدید ترین انکشافات ہوتے رہتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

جدو جہد آزادی ہند میں علماء کا کردار

ڈاکٹر شاہد احمد

راجستھان اردو ڈیپارٹمینٹ ،اودے پور (راجستھان)

سرزمین ہندوستان پر مسلم حکمرانوں کی صدیوں تک حکومت رہی اسی درمیان ایک وقت ایسا بھی آیا جب انگریز تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے اور مکر وفریب سے ہندوستان پر قبضہ کرلیا چونکہ اس وقت مسلم حکمران میں نہ کوئی محمود غزنوی تھا اور نہ ہی کوئی اورنگزیب عالمگیر جیسا بادشاہ۔ اقتدار مسلمانوں سے چھینا گیا تھا اسی لئے جو درد و کرب مسلمانوں کو تھا اتنا درد کسی قوم و مذہب کو نہیں تھا۔ اسی لئے سب سے پہلے انگریزوں کے خلاف مسلم قائدین نے انقلاب کی صدا بلند کی۔ اسی ضمن میں مجاہدین وطن اور بالخصوص علماء کرام کی قربانیاں آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ مگر بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جن مرد مجاہد نے ملک کی آزادی کے لئے اپنی جانیں تک قربان کر دی، ان کی جائدادیں ضبط کر لی گئی ، لائبریریاں جلا دی گئیں ، ان کی زندگیوں کو کانٹوں سے زیادہ پرخار بنا دیا گیا، جنھیں جیل بھیجا گیا اور پھانسیاں دی گئی ، جن کے گھر والوں کو ان کی آنکھوں کے سامنے گولیوں سے بھونا گیا ایسے سرفروشوں کو چند ایمان فروشوں نے تاریخ سے فراموش کر دیا۔ مگر آج جب بھی مجاہد آزادی کی بات کی جاتی ہے تو ان لوگوں کو ہیرو بنا کر پیش کیا جاتا ہے جن کا جنگ آزادی میں کوئی کردار نہ تھا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور علماء کی داستان بڑی لرزہ دینے والی ہے۔ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو کچلنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ لاہور کی شاہی مسجد میں

ایک دن میں اسّی اسّی علماء کرام کو پھانسی دی جاتی تھی۔ لاہور کے دریائے راوی میں علماء کو بوریوں میں بند کر کے بہا دیا جاتا تھا اور اوپر سے ان پر گولیاں چلائی جاتی تھی۔ غرضیکہ ایسے ایسے مظالم ڈھائے گئے جس کا تصور ہی آج ہمارے رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے ؎

دنیا سے آج پوچھوں پیچھے نہیں ہیں ہم
انگریز سے رہا تھا جب امتحاں ہمارا
زد میں بھی گولیوں کی مقصد ہم نے نہ چھوڑا
قیدوں میں بھی نہ بدلہ عزم جواں ہمارا
ریلوں میں راستوں میں جیلوں میں محفلوں میں
نعرہ تھا ہم کو دے دو ہندوستاں ہمارا

ایسے مردم شناس مجاہدین اور وطن پرستوں کی فہرست میں جو اہم نام ہیں ان میں علامہ صدرالدین آزردہ دہلوی، علامہ فضل حق خیر آبادی، علامہ فیض احمد رسؔوا بدایونی، مولانا سید کفایت علی کافیؔ، دلاور جنگ مولانا احمداللہ شاہ مدراسی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا امام بخش صہبائی دہلوی، مولانا رضا علی خاں بریلوی کا تذکرہ اہم ہیں۔ جن کی مختصراً تفصیل ملاحظہ ہو۔

۱) علامہ صدرالدین آزردہ دہلوی: مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی ۱۲۰۴ھ مطابق ۱۷۸۹ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے آباو جداد کشمیری تھے۔ موصوف تمام علوم خواہ وہ نحو ہو، منطق ہو، ریاضی ہو، معانی و بیان ہو، انشاء، فقہ اور حدیث و تفسیر ہو گویا کہ ہر فن میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ آپ کا دولت کدہ اس وقت کے اکابر علماء و فضلا و ادباء و شعرا کا مرکز تھا۔ آپ کے حلقہ ارباب میں اپنے دور کی کئی عظیم شخصیات تھیں۔

جن میں علامہ فضل حق خیر آبادی، مولانا امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومنؔ، مرزا اسداللہ خاں غالبؔ، شاہ نصیرالدین نصیرؔ، شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، وغیرہ اہم ہیں۔ 'گل رعنا' میں حکیم عبدالحئ بریلوی لکھتے ہیں کہ ''جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا''۔

(گل رعنا، حکیم عبدالحئ، ص ۲۲۷، چند ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء ص ۴۱)

آپ کی جامعیت، قوت حافظہ، حسن تحریر، متانت، تقریر، فصاحت بیان، بلاغت معانی اور فنون ادبیہ میں کامل دسترس حاصل تھی جس کا اعتراف شیفتہؔ نے ان الفاظ میں کیا ہے: ''درفنون ادبیہ ثانی اعشٰی وجریرست ودرمراتب حکمیہ ثالث باقر ونصیر''۔

(مرجع سابق، ص ۴۴)

عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی تصنیف '۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی' میں رقم طراز ہیں کہ '' مفتی صاحب انگریزی صدرالصدور ہوتے ہوئے بھی انگریزوں کے حامیوں کی صف میں شامل ہونے کے بجائے ۱۹ رمضان ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۲ مئی ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ ظفر کے دربار میں شامل ہوئے''۔

(۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ، عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی، ص ۲۷)

مفتی صاحب کی دانش مندی کا ہی کمال تھا کہ بہادر شاہ ظفر بھی ان کے معترف تھے۔ فرماتے تھے کہ جو معاملات سلجھانے کی صلاحیت مفتی صاحب میں تھی اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ۱۸۵۷ء کے وقت بعض مواقع ایسے آئے جب مجاہدوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ اس وقت مفتی صاحب کی ہی کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے متحد ہو کر انگریزوں کے خلاف آزادی کا پرچم بلند کیا۔

پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران بریلی سے جب جنرل بخت خاں تقریباً چودہ ہزار انقلابیوں کی فوج لے کر انگریزوں کے خلاف آغاز جولائی کو جہاد کا الم بلند کر دہلی پہنچے اس وقت انگریزوں کے خلاف ایک فتویٰ جاری ہوا۔ جس پر ۳۸ مفتیان کرام کے دستخط تھے جن میں مفتی آزردہ دہلوی بھی شامل تھے۔ یہ فتویٰ 'اخبارالظفر' دہلی سے شائع ہوا تھا۔ نیز اس کی نقل 'صادق لاخبار' دہلی بتاریخ ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء کو چھپی تھی۔ یہ اخبار آج بھی نیشنل آرکائیوز میں محفوظ ہے۔

مفتی صاحب کو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ فساد میں تعلق روزگار اور اپنی جائداد و املاک سے ہاتھ دھونا پڑا حتیٰ کہ جہاد کے فتویٰ کے الزام میں چند ماہ تک جیل خانہ میں بھی بند رہے۔ بعد میں جرم ثابت نہ ہونے کے باعث رہا کر دئے گئے۔ آپنے اکیاسی سال کی عمر میں بمرض فالج ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء کو اس دنیا سے کوچ کیا۔

۲) علامہ فضل حق خیرآبادی: علامہ فضل حق خیرآبادی کو تحریک آزادی کا محرک اول تسلیم کیا جاتا ہے۔ آپ کی ولادت دہلی کے صدرالصدور حضرت علامہ فضل امام فاروقی خیرآبادی کے یہاں ہوئی۔ تعلیم و تربیت اپنے والد کے علاوہ شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے حاصل کی۔ محض تیرہ سال کی عمر میں علوم نقلیہ و عقلیہ کی تکمیل کر لی۔ عربی زبان کے ماہر ادیب و شاعر تھے۔ علاوہ ازیں بہت بڑے سیاست داں، مفکر اور مدبر تھے۔ آپ کا یہ عالم تھا کہ مسند درس پر بیٹھ کر علوم و فنون کی تعلیم دیتے اور ایوان حکومت میں پہنچ کر دوررس فیصلے کرتے تھے۔ بہادری و شجاعت آپ کا خاصا تھی۔ صدرالصدور، حضور تحصیل، سررشتہ دار اور دیگر کئی بڑے عہدوں پر فائز رہے۔

ہندوستان کی متحد ہندو مسلم تہذیب اور اہل وطن کی متفقہ جدوجہد کو برقرار

رکھنے کی علامہ نے خوب کوشش کی۔ جنگ کے دوران شاہی فوج کی کمان بھی سنبھالی۔ غیر ملکی غاصبوں کے خلاف جہاد کا الم بلند کیا۔ علامہ نے سلطنت کا جو دستور العمل بنایا تھا اس کے نفاذ کے لئے بہادر شاہ نے ایک مجلس کا انتخاب کیا جس کا نگراں ڈائریکٹر علامہ فضل حق خیرآبادی کو بنایا گیا۔ بعدازاں ۱۹ستمبر کو دہلی پر انگریزی تسلط قائم ہونے کے سبب علامہ اودھ میں بیگم حضرت محل کے ساتھ سرگرم عمل ہو گئے۔

۱۶ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط قائم ہو گیا۔ بہادر شاہ ظفر گرفتار کر لئے گئے۔ فتویٰ جہاد کے الزام میں علامہ فضل حق خیرآبادی پر لکھنؤ میں مقدمہ چلا جس کی پیروی تمام قانونی دلائل کی روشنی میں آپ خود انجام دیتے تھے۔ موصوف کا یہ رنگ دیکھ کر جج خود پریشان حال تھا۔ ایسی صورت حال معلوم ہو رہی تھی کہ آپ بری ہو جائیں گے مگر افسوس ایسا ہو نہ سکا۔ بالآخر بھری محفل میں آپ نے بے باکی سے فرمایا کہ جس مخبر نے فتویٰ کی خبر دی ہے وہ صحیح ہے یہ میرا ہی لکھا ہوا ہے چنانچہ آپ کو کالا پانی کی سزا ہو گئی۔

آپ آزادی کے مرد مجاہد ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پائے مصنف بھی تھے۔ آپ کی درجنوں تصانیف و حواشی ہیں۔ قید خانے کی تنہائی میں آپ نے 'الثورۃ الہندیہ' (باغی ہندوستان) تحریر کی جو انقلاب آزادی کا ایک مستند ترین ماخذ ہے۔ علامہ کی ایک منظوم تصنیف 'قصائد الہند' کو جزیرہ انڈمان (کالا پانی) سے ۱۸۶۰ء میں کوئلہ اور پنسل سے کپڑے پر لکھی ہوئی تحریر بذریعہ مفتی عنایت احمد کاکوروی اپنے فرزند مولانا عبدالحق خیرآبادی کے پاس بحفاظت پہنچایا جس پر مولانا ابوالکلام نے تعارف لکھا اور جسے مولانا عبدالشاہد خاں شیروانی نے ۱۹۴۶ء کو ترجمہ

کر کے شائع کیا۔ بعد ازاں مجمع الاسلامی مبارکپور سے حواشی اور بعض اہم مضامین کے اضافے کے ساتھ ''باغی ہندوستان'' کی اشاعت عمل میں آئی۔

ایک روز آپ کے صاحبزادے اور معتقدین رہائی کا پروانہ لے کر کالا پانی پہنچے تو ایک جنازے پر نظر پڑی، معلوم ہوا کہ وہ کسی اور کا جنازہ نہیں بلکہ علامہ فضل حق خیرآبادی کا جنازہ ہے جن کا انتقال ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء کو ہو گیا تھا۔ اب سپرد خاک کرنے جا رہے ہیں۔ ان کی صاحبزادی اور معتقدین حسرت و یاس کے عالم میں شریک دفن ہوئے اور بے نیلِ مرام واپس لوٹے:

قسمت کی بدنصیبی! کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

۳) علامہ فیض احمد رسؔا بدایونی: علامہ فیض رسؔا بدایونی بن حکیم غلام احمد کی ولادت ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۸ء میں بدایوں میں ہوئی۔ محض تین سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ کے زیر سایہ تعلیم پا کر عالم و فاضل ہوئے۔ چودہ سال کی قلیل عمر میں علوم نقلیہ و عقلیہ سے فارغ ہو کر درس و تدریس کا کام شروع کیا۔ شاعری کا اعلیٰ ذوق تھا اور رسؔا تخلص اختیار کرتے تھے۔ بعد ازاں آپ سلسلہ تدریس آگرہ میں پیش کار اور پھر بورڈ آف ریونیو میں سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ ثروت و وقار کے باوجود موصوف کا دل فقیرانہ اور مزاج شاہانہ تھا۔ سر ولیم میور جیسی شخصیت نے آپ سے عربی سیکھی۔ ہندوستان میں جس دن ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام عمل میں آیا اسی دن سے اسلام کے دشمن ہمارے مذہبی عقائد کو مسخ کرنے میں لگ گئے نیز مذہبی کتابوں اور رسائل کی اشاعت کے ذریعے ہندوستانیوں کے رجحانات و عقائد کو سلب کرنے کی

کوشش کی گئی۔الغرض یہ وہ زمانہ تھا جب عیسائیوں نے ہندوستان میں اسلام کے خلاف زبردست مہیم جاری کر رکھی تھی۔ اسی مشن کے تحت ایک پادری فنڈر (Fonder.Revd C.C.D) یورپ سے ہندوستان آیا۔آگرہ کواپنا مرکز بنایا اوراپنی دل شکن تقریروں کا سلسلہ شروع کیا۔اس نے مشاہیر علماء کومناظرہ کا چیلینج دیا۔۱۰اپریل۱۸۵۴ء میں آگرہ میں مناظرہ کا پہلا اجلاس ہوا۔جس میں اہل اسلام کی جانب سے مولانا رحمت اللہ کیرانوی مناظر اول اور ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی مناظر دوم تھے اور مولانا فیض احمد بدایونی ان کے معاون و مددگار تھے۔مسلسل تین دن تک مناظرہ چلتا رہا اور بالآخر اس تاریخی مناظرے میں پادری فنڈر نے شکست کھائی اور آگرہ سے راہِ فرار اختیار کر سیدھا یورپ پہنچا جس میں مولانا فیض احمد بدایونی کا ایک اہم کردار تھا۔

مولانا فیض احمد بدایونی کئی کتب ورسائل کے مصنف ومؤلف نگار تھے۔ مگر ان میں بیشتر کے مسودات انقلاب ۱۸۵۷ء کی افراتفری میں ضائع ہو گئے۔ آپ کی تحریری یادگار میں' تعلیم الجاہل' مطبوعہ ۱۲۶۹ھ ۔'المقامتہ البغدادیتہً (منثور)''وھدیۂ قادریہ(منظوم)'مطبوعہ۱۳۰۳ھ اہم ہیں۔

میرٹھ اور دہلی میں جب الم انقلاب بلند ہوا تو اس کا فوری اثر آگرہ پر پڑنا لازم تھا چونکہ آگرہ صوبائی حکومت کا مرکز تھا۔ یہاں مجاہدین فوج کی سرپرستی ڈاکٹر وزیر خاں اور فیض احمد بدایونی نے کی اور جنرل بخت خاں کے ساتھ دونوں سر پرستوں نے فتوائے جہاد تشہیر کی جس پر مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین آزردہؔ، مفتی فضل کریم اور مولوی عبدالقادر جیسے مرد مجاہدین کے دستخط تھے۔ مذکورہ بالا

حضرات اور فتویٰ جہاد کی تشہیر نے بدایوں اور اس مضافات کے ہزاروں افراد نے جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ (انسائکلو پیڈیا آف بدایوں، جلد۲، ص۱۳۔

بحوالہ: چند ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء، ص۸۸)

موصوف انقلاب ۱۸۵۷ء میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ دہلی پہنچے اور یہاں جاری جنگ میں کھل کر حصہ لیا۔ کچھ دن تک شہزادہ مرزا مغل فرزند بہادر شاہ ظفر کے پیش کار رہے بعد ازاں جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جنرل بخت خاں روہیلہ کے ساتھ واپس لوٹ گئے۔ اس کے بعد ککرالہ (بدایوں)، بریلی لکھنؤ اور شاہجہاں پور جیسے منفرد مقامات پر جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ بالآخر جب مولانا مدراسی نے شاہجہاں پور میں اپنی حکومت قائم کی۔ ان کی وزارت میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد آپ کا کوئی ذکر منظر عام پر نہیں آیا۔ جنگ آزادی کا یہ روشن ستارہ تاریکی میں کہیں گم ہو گیا۔

۴) مولانا سید کفایت علی کافیؔ: مولانا کافیؔ مرادآبادی ایک بہترین عالم و فاضل اور طبیب و شاعر تھے۔ شاہ ابوسعید مجددی رامپوری سے درس حاصل کیا اور مشہور شاعر ذکیؔ مرادآبادی (شاگرد امام بخش ناسخؔ) سے شاعری میں شرف تلمذ حاصل کیا۔ ۱۸۴۱ء میں حج و زیارت کی سعادت حاصل کی جس کی یادگار ان کی ایک تصنیف ''تجمل دربار رحمت'' ہے۔ علاوہ ازیں آپ کی کئی اہم تصانیف ہیں جن میں:- ترجمہ شمائل ترمذی (منظوم)، مجموعۂ چہل حدیث (منظوم) مع تشریح، خیابان فردوس، بہار خلد، نسیم جنت، مولود بہار، جذبۂ عشق اور دیوان کافیؔ مشہور ہیں۔

مولانا سید کفایت علی کافیؔ مرادآبادی ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں انگریزوں کے خلاف سینہ سپر تھے اور مرادآباد میں جاری تحریک آزادی کے قائدین میں سر

فہرست تھے۔ جب مرادآباد میں نواب مجدالدین خاں عرف مجوخاں کی سرکردگی میں آزادحکومت قائم ہوئی تو آپ کوصدرالشریعہ بنایا گیا۔آپ شرعی احکام کے مطابق مقدمات کے فیصلے سناتے تھے۔موصوف نے مرادآباد سے ہی انگریزوں کے خلاف فتوائے جہاد جاری کیا اوراس کی نقلیں دوسرے مقامات پربھجوائیں اوربعض مقامات پرآپ خودتشریف لے گئے۔آپ نے آنولہ کی تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا۔ مرادآباد میں ہنگامے سے ڈرکر جب انگریز میرٹھ اور نینی تال فرارہوگئے تب حالات کے پیش نظرعلمائے اسلام نے فوری انتظامات کے لئے ایک جنگی مشورتی کمیٹی قائم کی جوکہ شہر کا انتظام بھی دیکھے گی اور جنگ کے ذرائع و وسائل بھی فراہم کریگی۔ موصوف اس کمیٹی کے اہم رکن تھے۔مگرافسوس ایک غیرمنظّم جہادکونا کام بنانے میں نواب رامپوراور کچھ مقامی غداروں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔جس کے سبب مجاہدین کو زبردست جانی ومالی نقصانات اٹھانے پڑے۔کچھ غداروں کی مدد سے انگریز دوبارہ ۲۴اپریل ۱۸۵۸ءکوشہرمرادآباد پرقابض ہوگئے۔انگریزوں نے بڑی بے دردی سے نواب مجوخاں کوشہید کردیا۔اورپھرعیسائی تہذیب کا وہ ننگا ناچ شروع کیا جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

ملک کے غداروں کی مخبری کے سبب کئی مجاہدین کوگرفتارکر پھانسی دے دی گئی۔مولانا کافؔی کی مخبری ایک کمینہ صفت انسان فخرالدین کلال نے اس بناپرکردی کہ انگریزحکومت کےقول کے مطابق مجاہدین کی جائداد کا بڑا حصہ انھیں دیا جائیگا۔ ۳۰اپریل کومولانا کوگرفتارکیا گیا اورفوراً مقدمے کی کاروائی شروع ہوگئی۔انگریز عدالت میں ملزم کواپنی صفائی پیش کرنے کا بھی موقع نہیں دیا جاتا تھا۔مولانا کفایت

علی کانپی کا مقدمہ ایک انگریز ظالم و جابر مجسٹریٹ کے روبرو پیش ہوا اور بہت جلد فیصلہ سنادیا گیا۔

(اخبارالصنادید، بحوالہ: چندممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء، ص۹۶)

مولانا عبدالمالک مصباحی رقمطراز ہیں کہ: ''جسم نازنین پر گرم استری پھیری گئی۔زخموں پر نمک چھڑکا گیا، اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے انگریزوں نے ہرحربہ استعمال کیا مگر ناکام رہے۔آخرکار مرادآباد کے ایک چوک میں برسرعام موصوف کو تختہ پر لٹکا دیا گیا''۔ (خطبات اسلام، ص۲۳۰)

۵) دلاورِ جنگ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی: احمد علی نام ضیاء الدین لقب اوردلاور جنگ خطاب تھا۔آپ کا تعلق گولکنڈہ کے قطب شاہی خاندان سے تھا۔ مولانا شاہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے سالارِ اعظم تھے۔عہد شباب میں ہی آپ پر فکر و تصوف کا غلبہ ہوااور ریاضت ومجاہدہ کے لئے گھر کو ترک کردیا۔بعدازاں گوالیار میں محراب شاہ قلندر گوالیاری کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس حکم کے ساتھ آپ کو محراب شاہ نے اجازت وخلافت دی کہ ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے ہرحال میں آزاد کرانا ہے۔چنانچہ اپنے پیرومرشد کے وعدے کی تکمیل کے ارادے سے دہلی کے مشاہیر علماء ومشائخ سے ملاقات وگفتگو کی۔مفتی صدرالدین آزردہ کے مشورے پر آگرہ تشریف لے گئے اور یہاں پہنچ کر دینی وعلمی شخصیات اور سربرآوردہ حضرات سے رابطہ کیا اور 'مجلس علماء آگرہ' قائم کی اور علماء کو مربوط ومنظّم کیا۔

آپ کے وعظ و بیان میں ہزاروں کا مجمع ہوتا تھا۔جس کا چرچہ ہرطرف عام تھا۔بڑے بڑے علماء وفضلا اور ادباوشعرا آپ کے گرویدہ ہوگئے۔آپ کے

عزائم اور ہر دل عزیزی نے حکومت وقت کو چونکا دیا اور انگریز مخالف سرگرمیوں نے سرکاری کارندوں کے ہوش اڑا دئے۔ لہٰذا آپ کو نظر بند کر دیا گیا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء رونما ہوا اور جیل ٹوٹی تو آپ رہا ہو کر مع محبان وطن کے لکھنؤ آئے اور اپنا اقتدار بڑھانا شروع کیا اور دہلی، آگرہ، میرٹھ، پٹنہ وکلکتہ کے بھی دورے کئے اور انگریزوں کے خلاف مہیم کا دائرہ وسیع کر لیا۔

مفتی انتظام اللہ شاہی اکبرآبادی اپنی کتاب 'ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء' میں لکھتے ہیں کہ: ''مولوی احمد اللہ شاہ ہفتے میں تیسرے دن بعد نماز عصر قلعہ اکبرآباد کے میدان میں مردوں کو لے جا کر فن سپاہ گری اور شہ سواری کی مشق کرایا کرتے اور خود بھی ایسا نشانہ لگاتے جس کا جواب نہ تھا۔ تلوار کے ہاتھ ایسے جچے تلے ہوتے تھے جس کی دھوم تھی۔۔۔۔ جامع مسجد میں آپ کے زمانے میں جتنے آدمی جمع ہو گئے اتنے دیکھنے میں نہیں آئے''۔ (مرجع سابق، ص ۱۰۷)

مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی جب شاہجہاں پور پہنچے تو ایک غدار راجہ بلدیو سنگھ نے ۱۸۵۸ء میں ۵۰ ہزار روپے کے لالچ میں آپ کا سر تن سے جدا کر دیا۔ عرصہ دراز تک آپ کا سر مبارک شاہ جہاں پور کوتوالی میں لٹکا رہا اور جسم کو آگ کے حوالے کر دیا۔ مولانا مدراسی کی شہادت کے ساتھ ہی انقلاب ۱۸۵۷ء کا یہ باب ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

۶) مفتی عنایت احمد کاکوروی: جنگ آزادی کے فراموش کر دئے گئے مرد مجاہدین میں مفتی عنایت احمد کاکوروی کا نام قابل ذکر ہیں۔ آپ ۱۸۶۳ء میں دیوہ (بارہ بنکی اودھ) میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کے ساتھ کاکوری لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کی۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد رامپور سے مختلف علوم وفنون کی تعلیم لی۔ علی گڑھ میں

مدرس اور مفتی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ سرکاری ملازمت بھی کی۔ علی گڑھ اور اٹاوہ میں منصف رہے پھر صدر امین بن کر بریلی گئے۔ قیام بریلی کے دوران اصلاحی اور تبلیغی انجمن 'جلسۂ تائید دین متین' قائم کر کے لٹریچر کی نشر و اشاعت کی۔ یہ برصغیر کی پہلی اصلاحی انجمن تھی۔ ۱۸۵۷ء میں آپ کو صدر الصدور (آگرہ) بنایا گیا۔ سفر کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ مئی میں انقلاب برپا ہو گیا۔ موصوف آگرہ نہ جا کر بریلی اور رامپور میں انقلابیوں کے ہمنوا و معاون، حتیٰ کے سرپرست کی حیثیت سے سرگرم ہو گئے۔

مجاہدین کے لئے مالی تعاون اور انگریزوں کے خلاف جہاد پر مشتمل ایک فتویٰ بریلی سے جاری ہوا جس پر مفتی عنایت احمد کے دستخط تھے۔ پروفیسر محمد ایوب 'جنگ آزادی ۱۸۵۷ء' میں لکھتے ہیں کہ: ''انقلاب سے پہلے بریلی میں اس تحریک کے دو ممتاز کارکن موجود تھے۔ مولوی سرفراز علی اور مفتی عنایت احمد کاکوری''۔

(مرجع سابق۔ ص ۱۱۸)

انقلاب کی چنگاری بجھنے کے بعد انگریز حکومت نے فتویٰ جہاد کے الزام میں مفتی عنایت احمد پر مقدمہ چلایا اور اس وقت کے عام دستور کے مطابق کچھ رسمی نمائش اور عدالتی کاروائی کر کے آپ کو جزیرۂ انڈمان (کالا پانی) کی سزا دی گئی۔ جہاں آپ نے تقریباً چار سال تک ایام اسیری کی مشقتیں جھیلیں۔ ایک انگریز نے تصنیف 'تقویم البلدان' کے ترجمہ کی خواہش ظاہر کی جسے آپ نے قبول فرمایا اور دو سال کی مدت میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ یہی علمی کاوش آپ کی رہائی کا سبب بنی اور ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء کو جزیرۂ انڈمان سے رہا ہو کر ہندوستان واپس آئے۔

جزیرۂ انڈمان میں مفتی عنایت احمد کاکوروی اور علامہ فضل حق خیرآبادی کی

تاریخی وعلمی خدمات کے متعلق مولانا عبدالشاہد شیروانی رقمطراز ہیں کہ: ''علامہ (فضل حق) جزیرۂ انڈمان پہنچے۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی صدرامین بریلوی وکول مفتی مظہر کریم دریابادی اور دوسرے مجاہدین علماء وہاں پہنچے۔ان علماء کی برکت سے جزیرہ دارالعلوم بن گیا تھا۔ ان حضرات نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ وہاں بھی قائم رکھا۔خرابی آب وہوا، تکالیف شاقہ وجدا حباب کے باوجود علمی مشاغل جاری رہے''۔
(باغی ہندوستان۔ص ۲۲۵)

جزیرۂ انڈمان میں موصوف نے سیرت النبی پر ایک مختصر کتاب 'تواریخ حبیب الٰہ' اورفن صرف کی کتاب 'علم الصیغہ (فارسی)' تحریر کی جوآج بھی مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مندرجہ ہٰذا تصانیف مراجعت کتب کے بغیر محض اپنے قوت حافظہ کی مدد سے قلمبند کی گئی۔علاوہ ازیں آپ کی تحریر کردہ تقریباً دو درجن کتابیں موجود ہیں۔

۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء میں رہائی کے بعد کانپور میں دینی وعلمی درس و تدریس میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔حج وزیارتِ حرمین شریفین کی نیت سے آپ اور آپ کا پورا قافلہ حجاز مقدس کے سفر پر روانہ ہوئے۔اثنائے سفر میں ایک سخت چٹان سے آپ کا جہاز ٹکرایا اور شدت ضرب سے پاش پاش ہوگیا۔باون سال کی عمر میں ۱۷ شوال کو ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۳ء میں آپ مع قافلۂ حجاز شہید اور غریق رحمت ہوگئے۔

۷) مولانا رحمت اللہ کیرانوی: ردِنصرانیت کے ماہر مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے ۱۸۱۷ء میں ایک علمی خاندان میں آنکھیں کھولی۔آپ نے اپنی زندگی کے سب سے اہم مرحلے میں انگریزوں کے خلاف جدوجہد اور انقلاب ۱۸۵۷ء میں مخلصانہ کردار

ادا کیا اور زمین و جائداد کی قربانی دی ہے۔ مولانا امام بخش صہبائی سے بھی تحصیل علم کیا۔ مشنری اسکولوں اور پادریوں کی سرگرمیاں جب بڑھنے لگیں تو آپ نے شاہ عبدالغنی کے حکم پر ایک ضخیم کتاب 'ازالتہ الاوھام' لکھ کر عیسائیوں بالخصوص پادری فنڈر کی لکھی ہوئی کتاب 'میزان الحق' کا دنداں شکن جواب دیا۔

مولانا کیرانوی کا دہلی کے علمی طبقے اور شہزادوں سے گہرے مراسم تھے۔ اس لئے بادشاہِ وقت بہادر شاہ ظفر اور دوسرے مجاہدین کے ساتھ مولانا رحمت اللہ نے جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ نیز ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی اور مولانا فیض احمد بدایونی کے ساتھ دہلی کی جنگ آزادی میں شرکت کی۔

مولانا کی اہم تصانیف میں آثار رحمت، تاریخ عروج عہد انگلشیہ اور روزنامچہ عبداللطیف میں آپ کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان مجاہدانہ سرگرمیوں کے سبب انگریز سرکار نے آپ کے خلاف مقدمہ چلایا اور گرفتار کروانے والے کو ایک ہزار روپے کا انعام دینے کا اعلان کروایا۔ مگر اس مردمجاہد کو گرفتار نہ کیا جا سکا اور آپ کسی طرح مکہ معظّمہ پہنچ گئے۔ آپ کی تمام جائداد ضبط کر کے نیلام کر دی گئی۔ مکہ مکرمہ میں موصوف نے ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء میں مدرسہ صولتیہ قائم کیا اور درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ سلطان ترکی کی دعوت پر آپ نے کئی بار قسطنطنیہ کا سفر کیا۔ انھیں کی خواہش پر آپ نے ردِ نصرانیت میں اپنی معرکتہ الآرا کتاب 'اظہار الحق' قلمبند کر پادریوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ ۲۴ رمضان ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۱ء میں مکہ مکرمہ کی مقدس زمین پر آپ کا انتقال ہوا اور جنت المعلیٰ میں تدفین ہوئے۔

۸) مولانا ڈاکٹر وزیر علی خاں اکبرآبادی: حریت نواز مولانا ڈاکٹر وزیر علی خاں

اکبرآبادی کا تعلق صوبہ بہار سے تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد والد نے مرشدآباد (بنگال) میں انگریزی تعلیم دلائی اور پھر انگلینڈ بھیج دئے گئے جہاں آپ نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی، یونانی وعبرانی زبانیں سیکھیں اور انجیل وتوریت کا گہرا مطالعہ کیا۔ وطن واپسی کے بعد کلکتہ کے ایک اسپتال میں حکومت کی جانب سے اسسٹنٹ سرجن مقرر ہوئے۔ اس کے بعد آگرہ آگئے۔ یہاں مفتی انعام اللہ سے ربط وضبط ہوا اور جب مولانا احمداللہ مدراسی نے مجلس علماء آگرہ بنا کر اپنی سرگرمی شروع کی تو آپ ان کے دست وبازو بن گئے۔

ڈاکٹر وزیرعلی خاں کے متعلق مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی 'غدر کے چند علماء' میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں: ''ڈاکٹر وزیرخاں کو انگریز دشمنی اور حریت نواز کا چسکا شاہ صاحب (احمداللہ شاہ مدراسی) کے فیض صحبت سے پڑا۔۔۔۔۔ ۱۸۵۴ء میں پادری فنڈر سے آگرہ میں تین دن تک مناظرہ ہوا جس میں آپ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے معاون تھے''۔

(چند ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء۔ ص ۱۴۵-۱۴۲)

آگرہ میں جو فوج فدائیوں کی آئی اس کی سرپرستی ڈاکٹر وزیرعلی خاں نے کی بعد میں ڈاکٹر صاحب جنرل بخت خاں کی فوج میں شامل ہوگئے۔ جنرل صاحب نے انگریزی فوج کو جہاں مقابلہ ہوا وہاں شکست دی۔ لیکن مرزا مغل کی کمزوری سے اور کم اندیشی کے سبب مجاہدین کو ہار کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور مقبرۂ ہمایوں سے بہادر شاہ ظفر گرفتار کر لئے گئے۔

دہلی میں شکست کے بعد جنرل بخت خاں روہیلہ، ڈاکٹر وزیر خاں

اکبرآبادی اور مولانا فیض احمد بدایونی وغیرہ اپنی فوج کے ساتھ لکھنؤ واپس چلے گئے۔ لکھنؤ میں احمداللہ شاہ مدراسی کے ساتھ انگریزوں کے خلاف مورچہ بندی کی پھر شاہجہاں پور جانا پڑا لیکن وہاں بھی ناکامی کے سبب منتشر ہوکر اکثر حضرات نیپال چلے گئے۔ ڈاکٹر وزیر علی خاں مکۂ مکرمہ پہنچے اور وہیں مقیم ہوگئے۔ مکہ مکرمہ میں ڈاکٹر صاحب چودہ سال تک بقید حیات رہے۔ وہیں ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۳ء میں آپ کا انتقال ہوا اور جنت المعلیٰ میں تدفین ہوئی۔

۹) مولانا وہاج الدین مرادآبادی: بے باک مجاہد مولانا وہاج الدین دینی جذبہ اور قوم پروری میں بے مثال تھے۔ حکام شہر آپ کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ عوام و خواص میں آپ یکساں مقبول تھے۔ عربی و فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی آپ کو قدرت رکھتے تھے۔ مرادآباد میں ۱۸۵۷ء کے معرکہ میں آپ نے نمایاں کردار ادا کیا اور ۱۹ مئی ۱۸۵۷ء کو مرادآباد جیل خانہ پر آپ نے ایک ہجوم کے ساتھ حملہ کیا اور سارے قیدیوں کو آزاد کرالیا۔

مولانا وہاج الدین نے رامپور کا دورہ کیا اور وہاں بھی انگریزوں کے خلاف جہاد کا الم بلند کیا۔ نواب رامپور یوسف علی خاں انگریزوں کے وفادار تھے بغیر اس کی پرواہ کئے حب الوطنی کا جذبہ لئے بے خوف وخطر میدان میں کود پڑے اور رامپور کے گردونواح میں جلسے کرتے اور اپنی تقاریر کے ذریعے عوام کو بیدار کر جنگ آزادی کی تحریک میں شمولیت کی دعوت دیتے۔ شہزادہ فیروز شاہ کی سرپرستی میں مولانا کفایت علی کافیؔ اور مولانا وہاج الدین نے مل جل کر مرادآباد میں انقلاب برپا کردیا۔ انقلاب کی ناکامی کے بعد ایک مخبر کی غداری کے باعث عصر و مغرب کے

درمیان رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء میں آپ پر حملہ کر دیا اور گھر کے اندر ہی گولی مار کر شہید کر دیا۔

۱۰) مولانا امام بخش صہبائی دہلوی: مولانا امام بخش صہبائی ایک اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔آپ کا سلسلہ نصب والد کی طرف سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور والدہ کی جانب سے سیدنا غوث اعظم رحمت اللہ علیہ سے ملتا ہے۔امام بخش کو فن معمہ میں قدرت حاصل تھی اسی لئے انھیں معمائی بھی کہا جاتا تھا۔آپ نے تین بادشاہوں شاہ عالم ثانی، اکبر شاہ ثانی، اور بہادر شاہ ظفر کا زمانہ دیکھا۔مولانا صہبائی اپنے زمانے کے مشہور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔سر سید احمد خاں نے اپنی مشہور و معروف کتاب 'آثار الصنادید' کی ترتیب میں موصوف سے مدد بھی لی تھی۔جس کا اعتراف کرتے ہوئے سر سید احمد خاں نے اپنی کتاب میں بڑی تفصیل بیان کی ہے۔

'یادگار غالبؔ' میں الطاف حسین حالیؔ نے لکھا ہے کہ ''صہبائی کی نظم و نثر اور دیگر رسائل اور شرح تین جلدوں میں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں''۔

(یادگار غالبؔ۔ص۲۳)

امام بخش صہبائی کی عظمت و مقبولیت کا اندازہ اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے جس میں مرزا غالبؔ نے اپنے معاصرین شعراء کا ذکر کیا ہے۔کہتے ہیں ؎

مومن و نیر و صہبائی و علوی و انگاہ
حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شاہ

مولانا امام بخش صہبائی فارسی کے ایک قادر الکلام شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب طرز انشاء پرداز، دقیقہ رس شارح اور نکتہ بیں محقق کی حیثیت سے جانے

جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ آزردہ،مولانا فضل حق خیرآبادی،غالب اور شیفتہ جیسے باکمال شاعر آپ کی فارسی دانی کے قائل تھے۔مرزا غالب اور صہبائی میں گہرے مراسم تھے۔مولانا صہبائی انگریز مخالف ذہن رکھنے کے ساتھ ساتھ انقلابیوں اور مجاہدوں کے ہمدرد ونوا تھے اور قلعۂ معلہ کی مجلسوں اور بعض مشوروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔۱۸۵۷ء میں انگریزی فوج نے موصوف کے محلّہ کوچہ چیلان دہلی سے تقریباً چودہ سو افراد کو گرفتار کر کے راج گھاٹ جمنا کنارے اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا جن میں مولانا صہبائی بھی تھے۔نیز آپ کے گھر کے اکیس افراد شہید کر دئے گئے۔

آزادی کی پوری تاریخ علماء کی قربانیوں سے بھری پڑی ہے۔ملک کی آزادی کی خاطر ہمارے اسلاف نے جو خون کے دریا بہائے ہیں اس کا کہیں ذکر نہیں کیا جاتا ہے۔میدان جنگ میں جب بھی تیر و سنان کے مقابلے کی ضرورت پیش آئی ہے تو ہمارے علماء نے اپنا سینہ پیش کیا ہے مگر افسوس کہ کوئی نام نہاد مورخ علماء کی خدمات اور قربانیوں کو نظر انداز کرتا ہے اور تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔یہ اس کی بدبختی ہے وہ تاریخ کے ساتھ انصاف نہیں کر رہا ہے بلکہ ظلم کر رہا ہے۔

اک اک نفس میں بوئے وطن ہے بسی ہوئی
نبض وطن میں خون کی صورت رواں ہیں ہم

☆☆☆☆☆☆

اردو اور ہندی ناولوں پر تقسیم ہند کے اثرات

ڈاکٹر عبداللہ امتیاز احمد
صدر شعبہ اردو، ممبئی یونیورسٹی، ممبئی

تقسیم ہند، ہندوستانی تاریخ کا ایک بڑا المیہ تھا مگر اس سے بڑا المیہ یہ تھا کہ یہ سارے فسادات مذہب کے نام پر ہو رہے تھے حالانکہ دنیا کا کوئی بھی مذہب معصوموں کا قتل وخون اور کسی انسان کو گھر سے بے گھر کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ سامراجی طاقتوں نے ہندوستانی عوام کو اجنبی شہروں میں بسنے اور جلا وطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا، صرف اتنا ہی نہیں تقسیم ہند کے ردّ عمل کے طور پر ہونے والے فسادات نے انسانیت کے وجود کو ختم کر دیا اور اس کے سوچنے سمجھنے کی قوت سلب ہوگئی اور وہ انسان سے حیوان بن گیا۔ اپنے پرائے کا فرق مٹ گیا اور اس نے اپنے مذہبی جذبے سے مغلوب ہو کر وہ کارنامہ انجام دیا جس کی مثال پوری دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ تقسیم ہند کے ساتھ رونما ہونے والے فسادات نے صدیوں پرانی تہذیب وتمدن کو ختم کر دیا۔ ساتھ ہی دو قومی نظریے نے اس آگ کو بھڑکانے میں اہم کردار ادا کیا۔ چاروں طرف ہاہا کار مچ گئی، خون کی ہولی کھیلی گئی، گلی کوچے سنسان ہو گئے، لوٹ، مار، آگ زنی، چھرے بازی، عورتوں کی بے حرمتی وغیرہ ایسے واقعات ہیں جو فسادات کا شیوہ ہیں۔

ایسے ماحول میں کوئی ادیب کیسے خاموش بیٹھ سکتا تھا۔ لہٰذا اس عظیم سانحے

سے ہندوستانی ادیبوں کا متاثر ہونا بالکل فطری بات تھی۔اپنے مذہبی اور قومی جذبے سے پرے ہٹ کر انسانیت کی بقا اور تحفظ کے لیے کوشش کرنا اس عہد کا سب سے بڑا کارنامہ تھا۔اس ماحول کو دیکھتے ہوئے اختر حسین رائے پوری نے ادیبوں سے اپیل کی تھی کہ:

''تاریخ کی اس کٹھن منزل میں ہمیں اپنا توازن برقرار رکھنا ہے،ہمیں ادب اور انسانیت دونوں سے انصاف برتنا ہے۔فسادات ہوتے ہیں اور ان کے ذمہ دار انسان ہیں جو سکھ، ہندو یا مسلمان کے بہروپ میں نظر آتے ہیں۔یہ اپنے مذہب اور انسانیت کے لیے باعث ننگ ہے تاہم ہم مجاز نہیں کہ پوری قوم کو موردالزام ٹھہرا کر تاریخ کو سولی پر چڑھا دیں۔''

(نیا دور،فسادات نمبر،کراچی،ص۔۲۱)

اختر حسین رائے پوری کی اس اپیل پر ادیبوں نے لبیک کہا۔ان فسادات نے ہندوستانی ادیبوں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔اس خطرناک دور سے گزرنے والوں میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔مہاجرین کے یہ دونوں فرقے بیک وقت ظالم بھی تھے اور مظلوم بھی، ایسے حالات میں دونوں ادب میں فسادات اور ہجرت سے متعلق واقعات کا آنا لازمی تھا۔اس پرآشوب دور میں ہندی اور اردو کے ادبا نے متحد ہو کر انسان کے سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔اس سخت دور میں ہندی اور اردو کے ناول نگاروں نے اپنا ذہنی توازن برقرار رکھتے ہوئے ادب اور معاشرے کے ساتھ انصاف کیا۔تقسیم ہند کے دیرپا اثرات سے

متاثر ہوکر ہندی اور اردو ادب میں کئی ناول تخلیق ہوئے۔اردو ادب میں تقسیم ہند سے متاثر ہوکر لکھے گئے ناولوں میں قرۃ العین حیدر کے تینوں ابتدائی ناول 'میرے بھی صنم خانے'، 'صفینۂ غمِ دل' اور 'آگ کا دریا'، خدیجہ مستور کا ناول 'آنگن'، عبداللہ حسین کا ناول 'اداس نسلیں'، انتظار حسین کا ناول 'چاند گہن' اور کرشن چندر کے تینوں ناول 'غدار'، 'مٹی کے صنم' اور 'میری یادوں کے چنار' وغیرہ کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ وہیں دوسری طرف ہندی ادب میں تقسیم ہند کے موضوع پر لکھے گئے ناولوں میں یشپال کا ناول 'جھوٹا سچ'، بھیسم شاہنی کا ناول 'تمس'، گرودت کا ناول 'دیش کی ہتیار'، راہی معصوم رضا کا ناول 'آدھا گاؤں'، کرشن بلدیو وید کا ناول 'گزرا ہوا زمانہ' اور جگدیش چندر کا ناول 'مٹھی بھر کانکر' وغیرہ کو ہندی ادب میں بہت اہمیت حاصل ہے۔

اردو ادب میں تقسیم ہند کے فوراً بعد لکھنے والوں میں قرۃ العین حیدر کا نام سب سے اہم ہے جن کے تینوں ابتدائی ناول 'میرے بھی صنم خانے'، 'صفینۂ غم دل اور 'آگ کا دریا' میں تقسیم ہند کے اثرات کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ 'میرے بھی صنم خانے' اُن کا پہلا ناول ہے جس میں اودھ کے جاگیرداری زوال کے ساتھ ساتھ تقسیم ہند کو بھی موضوع بنایا ہے، اور اس کے نتیجے میں ہونے والے ہولناک فسادات کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ جس کا اندازہ ناول کے اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

> ''پنڈت جی نے بلدیو سنگھ سے کہا! خدا کے لیے دلی کی حفاظت کے کام پر فوج، ملٹری اور پولس میں مسلمان افسر بھی رکھ لو لیکن حسب معمول ان کی کسی نے چلنے نہیں دی۔ ان کے پاس فون آیا مکتبہ جل رہا ہے، خدا

کے لیے کچھ کیجئے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، اور انھوں نے چلاّ کر کہا ارے! یہ کیا غضب کر رہے ہو۔ اس مکتبے کو تو چھوڑ دو۔ یہ محض کاغذ کا انبار نہیں، یہ ایک پوری نسل کا سرمایہ ہے، قوم کی عزیز ترین دولت ہے، مستقبل کے لیے ہماری زادِ راہ ہے۔ اس کے لیے، اسے بنانے، اس ذخیرے کو جمع کرنے کے لیے ذاکر حسین نے اپنی آنکھیں کھوئیں۔ آنسوں ان کی پلکوں پر جھلملاتے رہے لیکن رندھاوا کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ سونی پت میں فساد ہو گیا۔''

(میرے بھی صنم خانے، ص ۴۲۷)

قرۃ العین کے بعد انتظار حسین ایسے تخلیق کار ہیں جن کے بیشتر ناول و افسانے کسی نہ کسی شکل میں ہجرت، فسادات اور ان سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کا احاطہ کرتے ہیں۔ 'چاند گہن' ان کا اولین ناول ہے۔ اس ناول کا اہم کردار بو جی اور ان کا بیٹا سبطین اور ان کے خاندان والے صدیوں سے یوپی کے ایک گاؤں حسن پور میں آباد تھے۔ یہ لوگ ابھی کانگریس لیگ اختلافات، دوقومی نظریے، جناح اور پٹیل کے سیاسی اختلافات اور انگریزوں کے ذریعے پیدا کی گئی نفرت کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ حسن پور میں لٹ پٹ کر آئے مہاجرین کے قافلے بسنے لگے تھے۔ مشرقی پنجاب کے شرنارتھی اپنے ساتھ دو چیزیں لے کر آئے ایک مسلمان سے نفرت کا جذبہ اور دوسرا انتقام کا جوش۔ ان کے آتے ہی دونوں چیزیں فضا میں چھا گئیں اور مختلف طبقوں میں رچ بس گئیں۔ مجبوراً سبطین کو حسن پور چھوڑ کر دہلی آنا پڑا۔ دہلی جو اس وقت فسادات کی آگ میں جل رہی تھی جس کے بارے میں سبطین

اپنی ڈائری میں لکھتا ہے:

''ایک خوفناک ہنگامہ خیز رات ہے۔جس نے پوری دلی کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔رات محلے کے ہر شخص کو یقین تھا کہ حملہ ہوگا مگر حملہ نہیں ہوا۔قیامت سر پر آ کر ٹل جاتی ہے۔یہ تذبذب کی کیفیت سخت اذیت ناک ہے۔قیامت کو اگر ٹوٹنا ہی ہے تو پھر ٹوٹ کیوں نہیں پڑتی ہے! یہ تو ایسی بات ہے کہ مجرم کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا جائے اور جلاد کہے کہ ہم حقہ پی کر آتے ہیں، پھر تجھے پھانسی لگائیں گے۔یہ پورا محلّہ پھانسی کے تختے پر کھڑا ہے، پھانسی کا پھندا سر پر لٹک رہا ہے ، گلے میں نہیں آتا۔''

(چاند گہن، ص۔۱۵۱)

تقسیم ہند اور فسادات کے ضمن میں کرشن چندر کے ناولوں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔انھوں نے اس سے متاثر ہوکر تین اہم ناول 'غدار'، 'مٹی کے صنم' اور میری یادوں کے چنار' تخلیق کیے۔ان میں 'غدار' ناول کو زیادہ اہمیت حاصل ہے، کیونکہ یہ تقسیم ہند کے دوران ہونے والے ہندو مسلم فسادات کے پس منظر پر لکھا گیا ہے۔تقسیم کے پس پردہ کن لوگوں کا ذہن کام کر رہا تھا، یہ خونی کھیل کس کے اشارے پر کھیلا جا رہا تھا اور کون لوگ اس فسادات کے لیے ذمہ دار ہیں، ناول میں اس کی طرف واضح طور پر اشارہ کیا گیا ہے۔'غدار' کی کہانی بیانیہ انداز کی ہے جو بیج ناتھ کی یادداشتوں پر مبنی ہے اور اس کی زبان سے بیان کی گئی ہے۔وہ پنجاب کے گاؤں لائل پور کا باشندہ ہے۔تقسیم ہند سے قبل ہی پنجاب اور یوپی میں فسادات کا

سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔لائل پور ابھی اس سے محفوظ تھا، جہاں پر اکثریت برہمنوں کی تھی، ہندو مسلم بھائی چارے اور امن وامان کے اس ماحول میں اس وقت تبدیلی آنے لگتی ہے جب باہر سے آئے مسلم فسادی گاؤں کے ہندوؤں پر حملہ کر دیتے ہیں۔

مقامی مسلمان گاؤں کی حفاظت کی پوری کوشش کرتے ہیں مگر نفرت اور تعصب کے اس سیلاب کو روکنے میں پوری طرح ناکام رہتے ہیں اور پورا گاؤں فسادات زد میں آجاتا ہے۔بیچ ناتھ اور گاؤں کے دوسرے ہندو راستے میں ظلم ونفرت کے مختلف مناظر کو دیکھتے ہوئے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہیں تو یہاں کے ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل عام اور عورتوں کی بے حرمتی کے مختلف نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔اس کا اندازہ ناول کے اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

> ''میں نے سامنے کیو میں کھڑے ہوئے لوگوں کو گنا۔مجھ سے آگے پچیس آدمی تھے۔دیکھتے دیکھتے میرے پیچھے پندرہ آدمی اور آکے کھڑے ہوگئے،''یہ کیو کب تک رہے گا''؟میں نے اس نوجوان سے پوچھا:''جب تک وہ لڑکی مرنہیں جاتی''نوجوان نے جواب دیا۔'' تھوڑی دیر تک تو میں کیو میں کھڑا رہا۔لوگ باری باری آگے بڑھتے تھے۔پھر بھی کیو بہت لمبا تھا اور اس لڑکی کی چیخیں بڑی دلخراش تھیں۔کھڑے کھڑے میرے دل کو کچھ ہونے لگا، جیسے کوئی میرے دل کو مٹھی میں لے کر دھیرے دھیرے مسل رہا ہو۔اس لڑکی چیخیں بڑی دردناک تھیں۔''بھراد!میں تیری بہن آں!دے دیرا میں تیری بہن آں!میں نے اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں دے دیں اور وہاں سے

بھاگ کھڑا ہوا۔'' (غدار، ص ۸۶)

یہ اقتباس اس حقیقت کو عیاں کرتا ہے کہ ہر عہد میں، ہر خطے میں جنگوں اور نسلی فسادات کے درمیان معصوم اور پاک دامن عورتوں کی بے حرمتی ہوتی رہی ہے۔ چاہے وہ تقسیم ہند کے فسادات ہوں یا ہٹلر کے جرمنی میں یہودیوں کے قتل عام کا دور ہو یا پھر بنگلہ دیش کی آزادی کا زمانہ۔ کرشن چندر کے علاوہ عورت کی اس بے حرمتی کو منٹو، بیدی اور احمد ندیم قاسمی نے بھی موضوع بنایا۔

وحشیانہ مظالم اور انسانوں کے قتل عام، عورتوں کی بے حرمتی، بستیوں کی تاراجی وغیرہ بیچ ناتھ کے دل پر حزن و ملال ایسی دھند طاری کر دیتے ہیں کہ وہ بھی انسانیت، شرافت، نیکی اور رواداری پر سے اعتقاد کھونے لگتا ہے۔ اپنے اکثر ناولوں کی طرح کرشن چندر اس ناول کا ایک کردار بن کر ابھرتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارا قصہ انھیں کی زبانی بیان کیا جا رہا ہے۔ مجموعی طور پر اس ناول کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ کرشن چندر کا پیش کردہ ناول فن کی کسوٹی پر بھلے ہی کھرا نہ اترے مگر تقسیم ہند کے موضوع پر لکھے گئے ناولوں میں اسے اہم مقام حاصل ہے۔

عبداللہ حسین کا ناول 'اداس نسلیں' تقسیم ہند کے موضوع پر لکھا گیا ایک اہم ناول ہے جس میں ۱۹۱۴ء سے ۱۹۴۷ء تک کے اہم واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔ پورا ناول چار اہم حصوں پر مشتمل ہے۔ برٹش انڈیا، ہندوستان، تقسیم اور اختتامیہ۔ اس کے ابتدائی دو باب جنگِ عظیم اور تحریک آزادی کے واقعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس ناول میں عبداللہ حسین نے اس عہد کے سیاسی سماجی اور اقتصادی حالات و واقعات کو پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی شہروں اور دیہاتوں میں بسنے والی عوام کے حالات، خیالات

و جذبات کی بھر پور عکاسی کی ہے۔جس میں ہندوستان کی سیاسی ،سماجی اور ثقافتی زندگی کی حیرت انگیز تصویر فنی مہارت کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔اس ناول کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نورالحسن نقوی نے لکھا ہے:

''آگ کا دریا' کے بعد اردو ادب کا سب سے اہم ناول 'اداس نسلیں' ہے،جس میں مصنف نے جابجا حیرت انگیز فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔''

(بحوالہ خالد اشرف، برصغیر میں اردو ناول، ص۔۱۶۱)

یہ ناول ہند و پاک کے لاکھوں مہاجرین کی بے ترتیب ، پریشان اور تباہ حال قافلوں کی بھر پور عکاسی کرتا ہے۔ناول نگار نے دونوں طبقوں سے غیر جانب داری کا رویہ اختیار کرتے ہوئے صرف انسانی نقطہ نظر سے حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے اور حقائق احتساب پر خاص زور دیا ہے۔جس میں فسادات کی شکل میں انسانیت اور تہذیبی قدروں کی شکست کا المیہ بیان کیا گیا ہے۔

اس ناول کا مرکزی کردار نعیم ہے جو روشن پور کے خوش حال کسان کا بیٹا ہے۔حال ہی میں جنگ عظیم میں حصہ لے کر وکٹوریہ کراس حاصل کر کے لوٹا ہے۔اس کی شادی اس علاقے کے سب سے بڑے جاگیردار روشن آغا کی بیٹی عذرا سے ہوتی ہے۔گاؤں کے لوگوں میں اسے بہت عزت حاصل ہے ۔جنگ سے لوٹنے کے بعد سب سے پہلے تحریک آزادی کی جدوجہد میں دہشت پسندوں کے ساتھ پھر بعد میں کانگریس میں شامل ہو جاتے ہیں۔اس کا بھائی علی اور اس کی بیوی عائشہ بھی اس کے ساتھ رہتے ہیں۔تقسیم ہند سے قبل ہی پنجاب میں فساد شروع

ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے روشن پیلس کے مکینوں کو پاکستان کی طرف ہجرت کرنی پڑتی ہے۔نعیم پاکستان جانے کے لیے قطعی تیار نہیں ہے۔مگر بعد میں اپنے ابتدائی فیصلے کو بدلتے ہوئے دہلی سے مہاجروں کے ایک قافلے میں شامل ہوکر پاکستان کی طرف ہجرت کرجاتا ہے۔یہ قافلہ دن بدن حیرت انگیز طور پر بڑھتا جارہا تھا اوران دہشت زدہ افراد کے درمیان افواہوں کا بازار گرم تھا جوان کی بھوک، پیاس اور تھکن کو دور کرنے کے لیے کافی تھا۔اس خوف کی وجہ سے اکثر قافلے میں بھگدڑ مچ جاتی اور کبھی کبھی کوئی موت بھی واقع ہوجاتی اور اس درمیان لوگ ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل جاتے تھے۔ہجرت کرنے والے اس قافلے کا حال بیان کرتے ہوئے عبداللہ حسین اپنے ناول میں لکھتے ہیں:

''وہ ایک کمزور سا نوجوان تھا جونمونیہ کی وجہ سے مرا تھا، اس کی بیماری کا کسی کو پتہ نہ چلا کیونکہ وہ اکیلا سفر کررہا تھا۔صبح سویرے گاڑی کا سہارا لے کر چلنے والوں نے اسے گاڑی میں مرا ہوا پایا اور کود کر اس پر چڑھ گئے۔چند ایک ایسے تھے جو بیٹھتے ہی اونگھنے لگے۔دو بے ہوش ہوکر گر پڑے۔چونکہ گاڑی لاوارث تھی اس میں سوار ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔جنھیں اندر جگہ نہ ملی وہ باہر ڈنڈوں پر بیٹھنے لگے۔نتیجتاً دونوں طرف کے بانس کے ڈنڈے ٹوٹ گئے آخر بیل کھینچنے سے معذور ہوگئے۔اب پیچھے رہ جانے کا عام خوف ان کے دلوں میں پیدا ہوا اور خوفناک جدوجہد کی ابتداء ہوئی۔طاقت ور کمزور کی ازلی حیوانی رقابت۔اس دھکم پیل میں گاڑی کے مالک کی لاش نیچے گر

پڑی۔آخر تھوڑی دیر بعد چند زور آور نے گاڑی پر قبضہ کرلیا اور بیل دوبارہ چلنے لگے تو وہ اپنے پیچھے آنے والوں کی طرف متوجہ ہوئے جو بظاہر ان سے مخاطب تھے۔اس قیامت کے شور میں وہ کچھ سن تو نہ سکے لیکن لوگوں کے تشویش ناک اشاروں سے انھیں لاش کی غیر موجودگی کا احساس ہوگیا۔گاڑی رکی دو آدمی اتر گئے، مردے کو کندھوں پر اٹھالائے اور گاڑی میں لاد کر روانہ ہوئے۔''

(اداس نسلیں،ص۔۵۸۶)

یہ اقتباس خوف زدہ انسانوں کے جذبات کی خوبصورت عکاسی کرتا ہے،ساتھ ہی انسانوں کی بے بسی، لاچاری،خودغرضی، چالاکی اور کمزوری کو دبانے کی ازلی روایت کا مظہر جو اس وقت بھی اپنی فطرت سے باز نہیں آرہے تھے۔

'اداس نسلیں' میں عبداللہ حسین نے پسماندہ انسانوں کی بے بسی، لاچاری اور کسمپرسی کی داستان بیان کی ہے جن کو برطانوی غلامی اور افلاس نے مضمحل،شکستہ، اعصاب زدہ اور ستم دیدہ کردیا تھا۔یہ تقسیم سامراجی طاقت کا نتیجہ تھی،ان کمزور انسانوں کی اداس نسلوں کے لیے مزید تباہی،تاراجی اور بدنصیبی لے کر آئی تھی جو انسان کے وحشت ناک دور کی علامت تھی۔اس ناول کی خصوصیت یہ ہے کہ اس ناول میں تقسیم کے جزیات کی فراہمی اور اس کو فنی چابک دستی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔مہاجرین کے قافلے کے ساتھ پیش آنے والے ہر واقعہ کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے۔اس ناول میں انھوں نے تقسیم ملک اور جنگ کی جزئیات کو بہت تفصیل سے اور دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے جو اس ناول کی کامیابی کی دلیل ہے۔اس ناول

میں مرکزی حیثیت اس ذہنی ونفسیاتی کیفیات کو حاصل ہے جس سے نعیم دوچار ہوتا ہے۔انھوں نے اپنے ناول میں محسوس محاکات سے بہت کام لیا ہے۔تجربات کو حسّی طریقے سے پیش کرنے میں انھیں بہت مہارت حاصل ہے اوران کی رواں دواں نثر مختلف تاریخی واقعات کو زمانی ومکانی خواص کے ساتھ نمایاں کرتی ہے۔

خدیجہ مستور کا ناول 'آنگن' میں تقسیم ہند کے اثرات کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔اس ناول میں ایک متوسط خاندان کے حوالے سے تقسیم ہند کے درمیان پیش آنے والے واقعات کی روداد بیان کی گئی ہے جو قومی سیاست کے زیرِ سایہ بدلتی ہوئی اقتصادیات اورنفسیاتی کیفیات کا احاطہ کرتی ہے۔اس گھر کے تمام افراد کسی نہ کسی طرح تحریک آزادی سے وابستہ ہیں اور گھر کا آنگن مختلف سیاسی نظریات کا اکھاڑہ بنا ہوا ہے جو اپنی زمین اور خاندانی نشانی کو قطعی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں جس کو جمیل اور بڑی چچی کے درمیان ہونے والے مکالمے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے:

> ''تو کیا سارے مسلمان پاکستان جاکر رہیں گے؟ بڑی چچی نے پوچھا ''واہ اس کی کیا ضرورت پڑے گی۔'' جو جہاں ہے وہیں رہے گا۔مگر ہندو ہمیں رہنے کیوں دیں گے۔'' وہ نہیں کہیں گے اپنے ملک جاؤ۔'' ان کے ہندو جو ہمارے پاکستان میں ہوں گے ہم ان سے کب کہیں گے جاؤ۔'' جمیل بھیا کی دلیل چچی کی سمجھ میں آگئی تو انھوں نے اطمینان کی سانس لی۔ہاں جمیل میاں یہ جانے وانے کی بات بری ہے میں کبھی یہ گھر نہیں چھوڑسکتی۔'' (آنگن، ص۔۲۹۱)

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہجرت کے لیے بخوشی راضی

ہونے والوں کی تعداد بہت کم تھی چنانچہ مسلم لیگ اور پاکستان کے حامی جمیل اور چچی ہندوستان چھوڑنے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں ہوتے۔ پاکستان کا قیام جہاں بڑے بچا جیسے قوم پرست اور ہندو مسلم اتحاد کے متوالے مسلمانوں کے لیے باعث ہزیمت ثابت ہوتا ہے وہیں ملک کے طول طویل عرض پر پھوٹ پڑنے والے فسادات انھیں بالکل بوکھلا دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس جس میں بڑے بچا ماضی کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''زمانے زمانے کی بات ہے، وہ بھی زمانہ تھا جب گاؤں کے ہندو اپنے گاؤں کے مسلمانوں پر آنچ آتے دیکھتے تو سر دھڑ کی بازی لگا دیتے اور مسلمان ہندوؤں کی عزت بچانے کے لیے اپنی جان نچھاور کر دیتا۔ ایسا بھائی چارہ تھا کہ لگتا کہ ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں پر اب کیا رہ گیا، دونوں کے ہاتھ میں خنجر آ گیا۔''

(آنگن، ص۔۳۰۴)

شمالی ہند کے متوسط مسلم گھرانوں کے تقسیم کے دور کے حالات اور ان کی نفسیاتی الجھنوں اور معاشی افلاس میں 'آنگن' میں بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

ہندی ادب میں تقسیم ہند کے موضوع پر بے شمار ناول اور افسانے تخلیق ہوئے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ادب سماجی، سیاسی و ثقافتی تہذیب کی عکاسی کرتا ہے۔ ہندی ادب کے ناول نگاروں نے نہ صرف تقسیم کے دوران اور اس کے فوراً بعد لکھا بلکہ برسوں بعد تک لکھتے رہے کیونکہ اس مصنوعی تقسیم سے بہت سے ادیب اب بھی مطمئن نہیں تھے اور کچھ لوگوں کو ہجرت کے بعد بھی وہاں سکون قلب حاصل نہ

ہوسکا جو اکثر و بیشتر ہندوستان آتے جاتے رہے ان کے دلوں سے ابھی مٹی کی خوشبو ختم نہیں ہوئی تھی ان کے احساسات اور جذبات کی عکاسی انھوں نے اپنے ناولوں میں کی ہے یہی وجہ ہے کہ تقسیم ہند کے بعد یشپال کا ناول ''جھوٹا سچ''، بھیسم ساہنی کا ناول ''تمس''، جگدیش چندر کا ناول ''مٹھی بھر کانکر''، گرودت کا ناول ''دیش کی ہتیا''، کرشن بلدیو کا ناول ''گزرا ہوا زمانہ'' اور راہی معصوم رضا کا ناول ''آدھا گاؤں'' وغیرہ ناولوں میں تقسیم ہند کے اثرات کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ ہندی ناولوں میں عام طور پر تین طرح کے موضوعات نظر آتے ہیں پہلا آزادی سے قبل تقسیم سے متعلق لوگوں کی قیاس آرائیاں، دوسرا تقسیم ہند کی دھندلی سی تصویر اور تقسیم ہند کے درمیان پیش آنے والے واقعات تیسرا پاکستان سے آنے والے مہاجرین اور ان کے مسائل، ہندی ناولوں میں انھیں تین موضوعات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

یشپال کا ناول ''جھوٹا سچ'' دو حصوں پر مشتمل ہے ''وطن اور دیش'' (۱۹۵۸) اور ''دیش کا بھویشیہ'' (۱۹۶۰) اس ناول میں تقسیم ہند کو عالمی پس منظر میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں تقسیم سے قبل کے واقعات، تقسیم کے درمیان ہونے والے فسادات، لوٹ مار، آگ زنی، عورتوں کی بے حرمتی، دہشت پسندی، مہاجرین کی آمد و رفت، ان کے کیمپوں کی حالت اور انسانی اقدار کی کہانی بہت دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے اس ناول میں تقسیم ہند کے ردعمل کے طور پر لاہور میں ہونے والے فسادات کی دردناک تصویر پیش کی گئی ہے۔

ناول کی ابتدا لاہور کے بھولا پانڈے گلی سے ہوتی ہے جہاں ماسٹر رام بھلیا اسکول میں درس و تدریس کے پیشہ سے منسلک ہیں دوسرے متوسط طبقہ کے لوگوں کی

طرح بڑی مشکل سے زندگی گزر بسر کرتے ہیں ان کا بیٹا جے دیو اور بیٹی تارا کالج میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، جہاں وہ دھیرے دھیرے ''Student Federation'' کے جلسوں میں حصہ لیتے ہیں۔اسی درمیان لاہور میں فسادات شروع ہوجاتے ہیں اور وہاں پر ہونے والے فسادات کا اثر دوسرے شہروں پر بھی پڑنا شروع ہوجاتا ہے"Student Federation" کے کارکن مختلف جگہوں پر جلسے کر کے شہر میں امن وامان قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بھی ناکام ثابت ہوتے ہیں۔چنانچہ ۱۹۴۶ء کلکتہ میں بھی فساد شروع ہوجاتا ہے جہاں مسلمانوں نے ہزاروں ہندوؤں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔مسلمان کہتے ہیں کہ ہم پاکستان بنائیں گے اس کے لیے مسلمان پوری تیاری کر رہے ہیں اس طرح کی افواہیں ہندوؤں تک پہنچی جس کے نتیجے میں وہاں کے ہندو بھی اپنے دوسرے بھائیوں کی مدد کے لیے چندہ جمع کرتے ہیں۔اور ہندو'' کچھک کمیٹی'' تشکیل دی جاتی ہے اس ناول میں لاہور سے نکلنے والے مختلف جلوسوں،فرقہ وارانہ فسادات اور اس کے ردعمل کے طور پر کی جانے والی تیاریوں کو بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔تقسیم ہند سے قبل اور تقسیم کے بعد پورے ملک پر خوف کے بادل منڈلاتے رہے یہ خوف زدہ لوگ جلد از جلد کسی محفوظ مقام پر پہنچنا چاہتے ہیں مگر آمد ورفت کا کوئی مستقل ذریعہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کی پریشانیاں مزید بڑھ جاتی ہیں اس موقع پر بھاگتے ہوئے لوگوں کی بھر پور تصویر کشی انھوں نے اپنے اس ناول میں کی ہے اقتباس ملاحظہ ہو۔

''امبالا اسٹیشن پر گاڑی رکی اور اتنی بھیڑ لپکی کی بھیتر بیٹھے سبھی لوگ گھبرا گئے پلیٹ فارم پر کھڑی گاڑی کے بھیتر آنا چاہنے والی بھیڑ ایسی

آتور اور آتنکت تھی جیسے گاڑی پر نہ چڑھ پانے سے وہ نسچئے مرتیو کے منھ میں چلے جائیں گے یہ گاڑی بہت ادھک بھر جانے اور لوگوں کے چھتوں پر چڑھ بیٹھ جانے کے کارن اسٹیشن سے چل ہی نہیں پا رہی تھی پولس کے سپاہیوں نے بندوق اور لاٹھی دکھا کر روتے کلپتے لوگوں کو چھتوں سے اتارا گاڑی کسی طرح چلی ترنت ہی بہت سے لوگ گاڑی کے دروازوں کے ساتھ ڈنڈے پکڑ کر پائیدانوں پر کھڑے ہو گئے''۔

(جھوٹا سچ، ص۱۹۱)

اس وقت مشرقی پنجاب کا ماحول اتنا خراب ہو چکا تھا کہ ریل گاڑی کا سفر ہو یا پھر پیدل راستے میں جگہ جگہ لاشیں دکھائی دیتی تھیں ان لاشوں سے اٹھنے والی بدبو مسافروں کے برداشت سے باہر تھی جس کی دردناک تصویر انھوں نے اپنے اقتباس میں پیش کی ہے۔

یشپال نے اپنے ناول ''جھوٹا سچ'' میں اپنے عہد کے سلگتے ہوئے مسائل کو پیش کیا ہے خاص کر تقسیم کے ردعمل کے طور پر ہونے والے فسادات کی ہولناک تصویر پیش کی ہے۔ساتھ ہی اس ناول میں انھوں نے اغوا شدہ عورتوں کے مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے جس کو نہ تو سماج ہی قبول کرتا ہے اور نہ گھر والے یہاں تک کہ اس کا خاوند بھی اس کو ٹھکرا دیتا ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ عورت کہاں جائے؟ اس کا ایک نمونہ اس اقتباس کے ذریعہ پیش کیا جا رہا ہے:

''ساس کی وانی گاج بن کر اس پر گرتی ہے'' دور رہ اب تو ہم لوگوں کے کس کام کی'' اتنا کہتے ہوئی ساس نے بنتی کا سر پاؤں سے پرے

ڈھکیل دیا۔ جب بنتی کا پتی اس کے گھر آیا تو اس نے ٹھکراتے ہوئے کہا: ''دو مہینے مسلمانوں کے گھر رہ آئی ہے ہم کیسے رکھ لیں'' آس پاس اکٹھا ہو جانے والی بھیڑ میں سے ایک عورت نے کہا: کوئی پکڑ کر تیرے منھ میں گوہ بھر دے تو تُو اپنا منھ کاٹ دے گا'' اس کے پتی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا''۔ (جھوٹا سچ، جلد دوم، ص ۱۳۱)

اس طرح یشپال کا یہ ناول تقسیم ہند اور فسادات کے موضوع پر لکھا گیا ایک اہم ناول ہے جس میں انھوں نے تقسیم کے واقعات کو عالمی پس منظر میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے ایسے مسائل کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس کا حل تلاش کرنا اشد ضروری ہے۔

یشپال کے اس ناول کے بعد ہندی ادب کا سب سے اہم ناول بھیسم ساہنی کا ناول ''تمس'' (۱۹۷۳) ہے۔ جس میں انگریزوں کی سازش کی وجہ سے ہونے والے فسادات اور اس کے کارندوں کے کارناموں سے نقاب اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تمس ناول کی کہانی صرف اتنی ہے کہ انگریزوں کے اشارے پر مراد علی، نتھو چمار کو پانچ روپئے کا لالچ دے کر سور کٹواتا ہے اور کٹے ہوئے سور کو مسجد کی سیڑھیوں پر رکھوا دیتا ہے اس کے بعد کیا ہونا تھا پورے لاہور میں آگ پھیل گئی۔ نتھو چمار نے تو مراد علی کے خوف اور پیسے کی لالچ میں آ کر سور کاٹ دیا مگر اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ یہ مرا ہوا سور مسجد کی سیڑھیوں تک کیسے پہنچ گیا۔ مراد علی نے تو اس سے کچھ اور ہی بتایا تھا۔ اس ناول میں فسادات کے مسائل کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے آزادی سے قبل پنجاب اور لہولہان ہوتی انسانیت اور مذہبی جنون کو

اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنے والے سرمایہ دار، پونجی پرست سیاست اور اس سے زخمی ہوتی انسانی زندگی، گائے اور سور کے مذہبی وتہذیبی تصور کو بچانے کی کوشش اور ثواب حاصل کرنے کی لالچ۔ انہی سب چیزوں کی خاطر انسانوں کا خون بہایا گیا پردے کے پیچھے بیٹھے خطرناک انسانی دماغ اور آنکھوں کے سامنے کٹتے مرتے انسانی جسم غرض کی ان تمام چیزوں کی عکاسی اس ناول میں بڑی بے باکی سے کی گئی ہے۔ ہندوستان کے لیے فسادات اور کمیونلزم کے مسائل کوئی نئے نہیں ہیں بلکہ یہ صدیوں پرانے مسائل ہیں جس کے چنگل سے ہندوستان آج تک آزاد نہیں ہو پایا فرق صرف اتنا ہے کہ ہر عہد میں اس کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔ ناول نگار نے انہی مسائل اور خطرناک ذہنیت کو اس ناول میں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کا انجام ایک بے گناہ اور بے قصور انسان کو بھگتنا پڑتا ہے۔ ناول نگار نے اس کہانی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے آدھونک ہندی اپنیاس میں لکھا ہے کہ:

> ''تمس کی کل کتھا پانچ چھ دن کی ہے جب راولپنڈی اور آس پاس کے گاؤں میں ہندو مسلم دنگے ہوئے تھے''۔

بظاہر تمس راولپنڈی اور گردوپیش میں پانچ چھ دن تک ہونے والے فسادات پر مشتمل ہے مگر اس کے پس منظر میں کمیونلزم کی لمبی اور مکمل تاریخ بیان کی گئی ہے۔ جب راولپنڈی اور آس پاس کے گاؤں میں ہندو مسلم فساد ہوا تھا۔ اس ناول میں فساد کی ہولناکی، تباہ کاری، قتل وخون، لوٹ مار، آگ زنی اور عورتوں کی بے حرمتی وغیرہ کی مکمل تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔ تمس کے پہلے حصہ میں فسادات کے تناؤ بڑھنے کی کہانی بیان کی گئی ہے اور دوسرے حصہ میں یہ ناول وسعت اختیار کر لیتا ہے۔

ناول کی ابتداء کی نتھو چمار کے ذریعہ مارے جانے سور سے ہوتی ہے لیکن اس درمیان ہونے والے تصادم اور رونما ہونے والے واقعات دیکھنے کے قابل ہیں۔فسادات کے دوران افواہوں کا کردار نمایاں ہے جس میں طرح طرح کی باتیں کر کے ایک دوسرے کو خوفزدہ کیا جاتا ہے اور پھر ان کے خوف کو ختم کر کے ان کے اندر ہمت بھرنے کی کوشش کی جاتی ہے یہ اقتباس اس کی عمدہ مثال ہے:

''ماسٹر جی بولے۔ادھر دیوار کے پاس بیٹھ جاؤ رنبیر، اس مرغی کو کاٹو، دیکھ چا سے پہلے تمہیں اپنی مانسک درڑھتا کا پریچئے دینا ہوگا۔جو یووک ایک مرغی کو نہیں مار سکتا وہ شترو کو کیسے مار سکتا ہے''۔

(تمس، ص ۱۷۳)

کسی بھی فساد کو بھڑکانے میں مذہب کا کردار سب سے اہم ہوتا ہے۔جس کا نمونہ تمس میں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتا ہے۔کہیں سور مار کر مسجد کی سیڑھیوں پر پھینک دیا جاتا ہے اور کہیں نیم ذبح گائے کو ہندوؤں کے دھارمک استھل پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔اس کے بعد دونوں طرف ایک دوسرے کو ختم کرنے کی سازشیں رچی جانے لگتی ہیں نتیجتاً پورا شہر آگ کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔یہ غالباً ہندی کا پہلا ناول ہے جس میں فسادات کے پیچھے انگریزوں کی سازشوں کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کیونکہ انگریز مسلسل یہ کوشش کرتے رہتے کہ ملک میں امن وامان قائم نہ ہونے پائے اور ان کی حکومت پر کوئی آنچ نہ آسکے۔کانگریسی لیڈر بخشی انگریزوں کی انہی پالیسیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''فساد کرنے والا بھی انگریز، روکنے والا بھی انگریز، روٹی دینے والا بھی

انگریز، گھر سے بے گھر کرنے والا بھی انگریز اور لوگوں کو گھر میں بسانے والا بھی انگریز۔ بخشی بار بار یہی کہتا ہے کہ: انگریز پھر بازی لے گیا'' (تمس، ص ۲۵۰)

ایک دوسرا اقتباس دیکھئے جس میں فسادات کے پیچھے انگریزوں کی سازشوں کو اور بھی واضح طور پر بیان کیا گیا ہے جس میں ڈپٹی کمشنر رچرڈ اپنی بیوی لیزا کے سوالات کے جواب میں کہتا ہے:

''جو سویں مدھیہ ایشیا سے سب سے پہلے آئے۔ شتابدیوں کے بعد انہی کے ناتی پوتے نئے دیشوں سے ادھر آئے نسل سب کی ایک ہی تھی وے بھی مسلمان کہلاتے ہیں سبھی ایک ہی مول جاتی کے لوگ تھے۔ تب لیزا نے کہا ان باتوں کو یہ لوگ بھی جانتے ہوں گے۔ تب رچرڈ نے کہا: یہاں کے لوگ کچھ نہیں جانتے یہ وہی کچھ جانتے ہیں جو ہم انھیں بتاتے ہیں''۔ (تمس، ص ۴۸)

انگریزوں کی سازش کی وجہ سے یہ فسادات بہت خطرناک رخ اختیار کر چکے تھے جس کی وجہ سے لاشیں ادھر اُدھر بکھری پڑی تھیں جس کی منظر کشی ناول نگار نے ان الفاظ میں کی:

''گھماسان یدھ کے بعد سید پور گاؤں میں لاشیں ادھر اُدھر بکھری پڑی تھیں انھیں ٹھکانے لگانے کا اوکاش کسی کے پاس نہیں تھا۔ دن نکلتے ہی چیلیں اور کوے ڈھیروں کے ڈھیروں آسمان میں اڑنے لگے۔ انیک گدھ منڈلاتے ہوئے آ گئے اسکول کے باہر ایک رونڈ منڈ پیڑ پر دس پندرہ گدھ آ کر بیٹھ گئے کچھ گدھ کوؤں کی جگت پر بھی آ بیٹھے تھے

لاشیں پھولنے لگیں تھیں اور پھول پھول کوؤں کے منھ تک پہنچنے لگی تھیں''۔(تمس ، ص۲۴۰)

تمس ناول کے مطالعے سے ایک اور چیز کا جو انکشاف ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے ذریعہ زبردستی غیر مسلموں کو مسلمان بنایا جانا جس کا ذکر تمس کے علاوہ ہندی اور اردو کے دوسرے ناولوں میں نہیں ملتا ہے اس اقتباس سے یہ بات اور بھی واضح ہو جائے گی:

''شام ہوتے ہوتے اقبال سنگھ کے شریر پر سے سکھی کی سب علامتیں دور کر دی گئی تھیں اور مسلمانی کی سبھی علامتیں اتر آئی تھیں، پرانی علامتیں ہٹا کر نئی علامتیں لانے کی دیر تھی انسان بدل گیا تھا اب وہ دشمن نہیں دوست تھا اب وہ اقبال احمد تھا''۔(تمس ، ص۲۳۰)

تقسیم ہند کے موضوع پر لکھے گئے ناولوں میں راہی معصوم رضا کا ناول ''آدھا گاؤں'' کو بہت اہمیت حاصل ہے۔جس میں انھوں نے غازی پور سے بارہ چودہ میل کی دوری پر بسے ایک گاؤں گنگولی کے پس منظر میں تقسیم ہند کے اثرات کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔تقسیم ہند کے اثرات صرف شہر ہی نہیں بلکہ دیہاتی زندگی اور گاؤں پر بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔اس ناول میں تقسیم ہند سے قبل گنگولی میں ہونے والی محرم کی رسومات، مسلم معاشرہ کی عقائد و توہمات، ان کے اقتصادی اور معاشرتی حالات اور تقسیم کے بعد ان میں آنے والی تبدیلیوں کا نفسیاتی طور پر جائزہ لیتے ہوئے اس کی حقیقی تصویر پیش کی ہے۔گنگولی میں زیادہ تر آبادی مسلمانوں کی ہے یہاں دوسری شادی عام بات ہے کوئی خاندان ایسا نہیں جہاں قلمی لڑکے اور لڑکیاں

موجود نہ ہوں چونکہ اس گاؤں میں شیعہ لوگوں کی اکثریت ہے لیکن محرم کی رسم ادا کرنے میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل رہتے ہیں۔ پورا گاؤں قومی یکجہتی کا نمونہ ہے مگر تقسیم کے بعد محرم صرف ایک مذہبی رسم بن کر رہ جاتی ہے اسی ماحول میں تقسیم ہند کے اثرات گنگولی پر بھی پڑنے شروع ہوجاتے ہیں۔ پاکستان لفظ کی گونج اب یہاں بھی سنائی دینے لگتی ہے مگر پاکستان کی حقیقی شکل سے ابھی تک کوئی واقف نہیں ہے۔ لوگ بڑی تشویش میں مبتلا ہوکر ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ پاکستان کیا ہے جس کی مثال اس اقتباس کے ذریعہ دی جاسکتی ہے:

''ستارہ نے ایک دن سبری سے پوچھا پاکستان کیا ہے؟'' سبری نے اتّر دیا پاکستان مسلمانوں کا ایک ملک بنے گا۔ گنگولی کے لوگوں کی زبان پر یہ لفظ اس قدر چڑھ گیا تھا کہ اسکول سے گھر لوٹتے ہوئے بچے نعرہ لگا رہے تھے'' لے کے رہیں گے پاکستان'' انقلاب زندہ باد۔ ان بچوں میں سے دلہن نامک بچے سے جب پوچھا گیا تو اس نے کہا'' ہم کا جانی مارلڑکو اسب چلات رہے تہ ہم ہو کہہ دیا''۔

(آدھا گاؤں، ص ۳۰۶)

جہاں گنگولی کے لوگوں میں گاؤں سے اتنی محبت پائی جاتی ہے وہیں دوسری طرف اس گاؤں کے ماحول کو خراب کرنے کے لیے دونوں فرقوں کے لوگ دن رات محنت کر رہے ہیں اب یہاں ہندوؤں کی طرف سے بھی ردعمل کے طور پر تقریریں شروع ہوجاتی ہیں سوامی اپنی تقریر میں کہتا ہے:

''دھرم سنکٹ میں ہے۔ گنگا جل اٹھا کر پرتگیا کرو کہ بھارت کی اس

پوتر بھومی کو مسلمانوں کے خون سے دھونا ہے، دیکھو کلکتہ، لاہور اور نواکھلی میں ان ملیچھ ترکوں ہماری ماتاؤں کا کیسا اپمان کیا ہے بولو بجرنگ بلی کی''۔

(آدھا گاؤں، ص۳۴۲)

اس درمیان گنگولی میں طرح طرح کی افواہوں کا بازار گرم ہے جیسے جن کے گھروں میں کبھی ہندو لڑکیوں کی بے حرمتی کی گئی ہے اور ان لڑکیوں کی بھی بے حرمتی کی جائیگی، دلی کے امام باڑہ پر سکھوں نے قبضہ کرلیا، امرتسر اور جالندھر میں تمام مسجدوں کو مندر بنا دیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں ہونے والے فسادات کی خبریں گنگولی پہنچنے لگیں جس پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مولوی صاحب کہتے ہیں:

''کلکتہ میں بلوا ہوگیا۔ بڑی مار کاٹ بھئی ہے.....سن رہے ہیں کہ یہ حرام زادے ہندو مسلمانوں کے گھروں میں گھس گھس کر قتل کرت رہین، کانگریس والے ہندوون کا دماغ بالکلئے خراب کردہن ہیں''۔

(آدھا گاؤں، ص۳۲۹)

ان افواہوں کا اثر گنگولی میں رہنے والے صغیروا پر بھی دکھائی دیتا ہے۔ پاکستان کا قانونی طور پر اعلان ہوجانے کے بعد اس کی پریشانیاں مزید بڑھ جاتی ہیں اس پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:

''آج کل بڑی مار کاٹ مچی ہے پاکستان بن جائے سے تہ مار کاٹ اور بڑھ گئی ہے۔ بڑی آفت ہے صاحب۔ اب تہ ریل روک روک کر آدمی مارے جارہے ہیں لاکھ، ڈیڑھ لاکھ سے کم آدمی نہ مارے گئے

ہوئیں۔۔اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ پاکستان جانے میں ہی خیر ہے''۔

(آدھا گاؤں، ص۳۵۲)

ان افواہوں سے گنگولی کے کچھ لوگ اس قدر خوفزدہ ہیں کہ پاکستان ہجرت کر جانے کا ارادہ کر لیتے ہیں اور کتنے تو پاکستان ہجرت بھی کر جاتے ہیں۔مگر راستے میں مارے جاتے ہیں۔

تقسیم کے اثرات گنگولی میں اور بھی واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں جس کی وجہ سے محرم کی مجلسوں میں ہندوؤں کی تعداد کم ہوگئی،زمینداری کے خاتمہ پر گنگولی کے سید خاندانوں کی حالت بد سے بدتر ہوگئی ،ادنیٰ طبقہ کے لوگوں نے ترقی کر لی یہاں تک تازیہ اٹھانے کے لیے کہار اور مزدور بہ مشکل ملتے ہیں اور نہ اب ان کے پاس ان تازیوں کی مرمت کے لیے پیسہ ہی ہے۔ان سب چیزوں کو دیکھ کر جواد میاں کہتے ہیں:

''اب تہ امام حسین کے کام میں یہ پاکستان دخل دینے لگا ہے بھائی ''۔صرف اتنا ہی نہیں بلکہ تقسیم کے اثرات وہاں کی لڑکیوں کی شادی بیاہ پر بھی نظر آتے ہیں اب لڑکیوں کی شادی بھی اہم مسئلہ بن گیا ہے۔اچھے لڑکوں کا ملنا مشکل تھا جوان لڑکیاں اپنے گھروں میں گھٹ گھٹ کر زندگی بسر کر رہی تھیں اب ان کے لیے شادی بیاہ کا خواب دیکھنا دشوار ہو گیا تھا۔زمینداری کے خاتمہ نے ان کی پریشانیوں میں اور بھی اضافہ کر دیا اس لیے حکیم صاحب کہتے ہیں:

''ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایک دن سب کے پاکستان جائے کے پڑی۔ایہاں اب رہ کیا گیا ہے ایک ٹھوز مینداری رہی تہ اوہو چلی

گئی۔ناتی پوتن کا بوجھ الگ۔کیسے جیئے کوئی''۔

(آدھا گاؤں، ص ۳۷۰)

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ زمینداری کے خاتمے کا انھیں کتنا گہرا دکھ تھا۔ساتھ ہی اپنی حالت سے تنگ آکر پاکستان جانے کے لیے اپنے آپ کو مجبور پارہے ہیں۔اگر اس ناول کا مختلف نظریے سے جائزہ لیا جائے تو اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تقسیم ہند نے گنگولی پر کتنے گہرے اثرات مرتب کئے ۔ان کی سیاسی ،سماجی اور اقتصادی حالت پر تقسیم ہند کے نقوش واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں یہاں تک کہ تقسیم ہند کے اثرات سے طبقۂ نسواں بھی محفوظ نہ رہ سکا۔اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ راہی معصوم رضا نے گنگولی کے لوگوں کا نفسیاتی طور پر تجزیہ کرتے ہوئے ان کے خیالات و جذبات کو اپنے ناول میں جس طرح پیش کیا ہے اس کی مثال ہندی ادب کے کسی دوسرے ناول میں نہیں ملتی۔اپنی انہی انفرادی خصوصیات کی بنیاد پر ہندی ناولوں میں اسے اولیت حاصل ہے۔

کرشن بلدیو کا ناول ''گزرا ہوا زمانہ''تقسیم ہند کے موضوع پر لکھے گئے ناولوں میں ایک اہم اضافہ ہے۔جس میں تقسیم ہند سے قبل مغربی پاکستان کے ایک نوجوان کے حوالے سے پوری کہانی بیان کی گئی ہے۔تقسیم ہند سے قبل ہندو مسلم قومی یکجہتی سے لے کر تقسیم کے دو تین سال بعد پنپنے والی فرقہ پرستی پر ناول نگار نے کڑی تنقید کی ہے۔اس ناول کا مرکزی کردار بیرو ہے اس کا باپ جواری،شرابی اور عیاش قسم کا انسان ہے مگر اس کی ماں ایک شریف عورت ہے۔یہ گاؤں مسلم ہندو یکجہتی کا نمونہ تھا مگر رفتہ رفتہ یہاں بھی فرقہ پرستی جنم لینے لگتی ہے۔تقسیم کے دوران افواہوں کا

کردار بہت نمایاں ہے جس کا اثر اس گاؤں پر بھی دکھائی دیتا ہے۔اب تو لوگ افواہوں پر یقین بھی کرنے لگے ہیں۔ایک دوسرے پر کسی کو بھروسہ نہیں رہا۔فسادات شروع ہو چکے تھے۔اب فرقہ پرست طاقتیں یہاں بھی آواز اٹھانے لگیں تھیں جس کی مثال اس اقتباس کے ذریعہ دی جاسکتی ہے:

''پہلے ساہنیوں کی گلی کا صفایا کرو۔ایک ایک مکان کی تلاشی لو،ایک ایک کمرے اور کوٹھی کی۔آگ،ہوا کا رخ دیکھ کر کہیں کسی مومن کا گھر نہ جل جائے۔غداروں کی خبر بعد میں لیں گے پہلے کافروں کو ٹھکانے لگاؤ.....اسلام خطرے میں ہے یہ مت بھولو کہ سکھ اور سانپ میں کوئی فرق نہیں۔اپنے مکان مردود اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتے۔لوٹ گھسوٹ بعد میں بھی ہوسکتی ہے۔پہلے مردوں کو مارو پھر عورتوں کو پھر بچوں،حکیم کے حکم پر رات بھر لڑائی چلتی رہی''۔

(گزرا ہوا زمانہ، ص ۴۲۵)

اس طرح اس ناول میں بھی تقسیم کی وجہ سے گاؤں کی بگڑی فضا کو ہی موضوع بنایا گیا ہے جس میں دوسرے ناولوں سے کچھ مختلف نہیں کہا گیا ہے۔

جگدیش چندر کا ناول ''مٹھی بھر کانکر'' میں بھی تقسیم ہند کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس ناول میں تقسیم کی وجہ سے پیدا ہونے والے تین اہم مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔پہلا پاکستان کے قیام سے قبل کی قیاس آرائیاں اور ان کی دھندلی سی تصویر،دوسرا تقسیم کے دوران ہونے والے فسادات اور تیسرا پاکستان سے آنے والے مہاجرین کے مسائل اس ناول میں انھیں

تینوں مسائل کو پیش کر کے ان کا منطقی حل تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس طرح ہندی ناولوں پر تقسیم ہند کے ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندی ادب کے ناول نگاروں نے غیر جانبداری کا راستہ اختیار کرتے ہوئے حقائق کی صحیح عکاسی کی ہے اور اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں خاص کر ہندی ادب میں واقعات جس طرح مختلف تاریخوں کے حوالہ سے پیش کئے گئے ہیں اور جس طرح واقعات کی عکاسی کی گئی ہے اس سے ناولوں میں سچائی کا عنصر مزید بڑھ جاتا ہے اور واقعات حقیقی معلوم ہوتے ہیں یہ تمام واقعات تاریخ کا گہرا اثر لیے ہوئے ہیں جس کے مطالعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ناول نہیں بلکہ تاریخ کی کوئی مستند کتاب پڑھ رہے ہیں۔

☆☆☆

جدوجہد آزادی ہند میں اردو ادب کا کردار

ڈاکٹر شیخ اصغر شیخ اکبر

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہء اردو

ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ہم اپنی آزادی کے پچھیتر سال مکمل ہونے کے بعد اسے امرت مہوتسو کی صورت میں منا رہے ہیں۔جشن آزادی کے روپ میں یہ مہوتسو پورے ہندوستان میں جوش وخروش سے منایا جا رہا ہے۔اور کیوں نہ منایا جائے بے شک آزادی ہمارے لئے سب سے بڑی نعمت ہے۔جسے ہمارے آباو اجداد نے اپنی جانوں کو قربان کر کے یہ تحفہ ہم تک پہنچایا ہے۔یقیناً اس آزادی کی لڑائی میں ہر طبقے کے افراد نے اپنی جانوں کو قربان کر کے جنگ آزادی میں میں فتح حاصل کیں۔جہاں ایک طرف افراد اپنی جانوں کو قربان کر رہے تھے وہیں دوسری طرف ادیب اور شاعر بھی اپنی تحریروں سے حصول آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ایسے میں اردو زبان کیسے پیچھے رہ سکتی تھی۔آزادی کے حصول میں اہم کردار ادا کرنے میں اردو زبان وادب کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

تحریک آزادی کے لئے اردو زبان نے ہی ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ دیا اور ترانہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' بھی عطا کیا۔اردو زبان نے جدوجہد آزادی کی تحریکات کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔مولانا الطاف حسین حالؔی نے ایک طویل نظم 'حب وطن' کے عنوان سے لکھی۔سرسید احمد کی رہنمائی

میں سماجی اصلاح کی عظیم الشان تحریک کا آغاز ہوا۔علامہ اقبال نے اپنی نظموں کے ذریعہ اتحاد و اتفاق، رواداری کا درس دیا۔انھوں نے کہا کہ۔۔

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والوں
تمہاری داستاں تک نہ ہوگی داستانوں میں

اسی طرح بسمل عظیم آبادی ایک انقلابی شاعر تھے انھوں نے اپنی غزلوں میں انگریزوں کے خلاف سر کٹانے کی بات کیں۔انھوں نے کہا کہ

سرفروشی کی تمنّا اب ہمارے دل میں ہیں

ساغر نظامی نے بھی وطن سے محبت کو اسی انداز میں بیان کیا۔وہ لکھتے ہیں کہ

جب طلائی رنگ سکوں کو نچایا جائے گا
جب مسری غیرت کو دولت سے لڑایا جائے گا
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤ گا
اور اپنے پاؤں انباز زر ٹکراؤ گا

چکبستؔ نے کہا کہ۔۔

جس میں سودائے محبت تھا وہ سر باقی ہے
رات اندھیری ہے مگر یاد سحر باقی ہے
دل کے ہر زخم میں فر یاد باقی ہے
قوم بیدار کے سینے میں جگر باقی ہے
دل دہلتے نہیں زنداں میں گرفتاروں کے
بیڑیاں ڈھونڈتے ہیں پاؤ وفاداروں کے

اس کے علاوہ اکبرالہٰ آبادی، حسرت موہانی، جوشؔ، فیض احمد فیضؔ، مخدوم محی الدین اور دیگر شعرا نے بھی اپنے کلام سے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔

جدوجہد آزادی میں اردو صحافت نے جس ثابت قدمی سے مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ آزادی کے متوالوں میں سب سے پہلے شہادت کو قبول کرنے والے اردو کے صحافی مولوی محمد باقر ہی تھے۔ انھوں نے اپنی بے باک صحافت حق پرست نظریہ اور جرآت مندانہ اقدام سے انگریز حکومت کو اس حد تک ہیبت زدہ کر دیا تھا کہ وہ ان کی جان کے دشمن بن گئے۔ اس وقت کے اردو صحافیوں نے پوری بے باکی اور بے قوفی کے ساتھ اخباروں کے ذریعے اپنے خیالات کو عوام تک پہنچایا۔ کیونکہ انھیں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اخبارات ہی ہیں جو عوام تک پہنچ کر ان کو ہماری طاقت بنا سکتا ہے۔ کچھ صحافیوں نے طنز و مزاح کی صورت میں اپنا مدعا بیان کیا جن میں منشی سجاد حسین نے اودھ پنچ کے ذریعے وہ کام کیا جو بہت سارے اخبارات اپنے اداریتی کالموں سے نہیں کر سکے۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی شامل ہیں۔ انھوں نے ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو کلکتہ سے 'الہلال' نکالا تو وہ ایک انقلابی معجزہ ثابت ہوا۔ اس نے معاصر رہنماؤں کو اس قدر متاثر کیا وہ سوتے سوتے جاگ اٹھے۔ صادق الاخبار دہلی کا ایک بے باک اخبار تھا اس کے ایڈیٹر ملوی جمیل الدین تھے۔ وہ بھی انگریزوں کے ظلم و ستم کا شکار ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں مولانا حسرت موہانی نے اردوئے معلیٰ شروع کیا جس کے ذریعے انگریزوں کے خلاف ولولہ انگیز مضامین شائع ہوئے جس کی وجہ سے انگریزی سرکار کے

ایوانوں میں زلزلہ پیدا ہوا۔ ہندوستان کی آزادی میں اردو ادب وصحافت نے جو کردار ادا کیا اسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے ۱۹۴۷ء کی حصول آزادی تک اردو صحافت محض آزادی ہی کے راگ الاپے ہیں۔

اردو ادب میں فکشن بھی اس جدو جہد کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ابتدائی دور کے افسانہ نگاروں نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جن میں پریم چند، سلطان حیدر جوش، سدرشن، علی عباس حسینی، کرشن چندر، منٹو، خواجہ احمد عباس، حیات اللہ انصاری، غلام عباس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اردو افسانوں اور ناولوں کے ذریعے تحریک آزادی کو متحرک کرنے اور آگے بڑھانے میں افسانہ نگار اور ناول نگار پیش پیش تھے۔ بلکہ ان میں بیشتر افسانے اور ناول ایسے ہیں جو کہ شاہکار کہلائے جاتے ہیں۔ ان ناولوں اور افسانوں کے ذریعے ادیبوں نے اپنے خیالات کا اظہار تحریک آزادی کے جذبے سے مغلوب ہوکر کیا۔ جن میں پریم چند کا مجموعہ 'سوز وطن' ۱۹۰۸ء میں حب الوطنی کا جذبہ کارفرما ہے۔ اسی طرح 'آشیاں' برباد، ڈامل کا قیدی، قاتل، وغیرہ افسانوں میں حصول آزادی کی تحریک کی جھلک نظر آتی ہیں۔ پریم چند نے افسانوں کے ساتھ ساتھ ناولوں کو بھی تحریک آزادی کے جذبے کو اول مقام پر رکھا۔ پریم چند کا زمانہ بیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ تھا یہی وہ زمانہ تھا جب سیاسی تحریک جنم لے رہی تھی۔ پریم چند نے جب ناول لکھنا شروع کیا تب انتشار اور سماجی سطح پر بہت سی تبدیلیاں رونما ہورہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں کے کردار آزادی کی حمایت کرتے ہیں، آزادی کے گیت گاتے ہیں۔ جن میں گوشۂ عافیت، چوگان ہستی، وغیرہ کو پیش کرسکتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی ابتداء کے

پریم چند کا دور ختم ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں پریم چند اس دنیا سے کوچ کر گئے اس زمانے میں آزادی کی لڑائی اپنے عروج پر تھی۔ دیگر ناول نگاروں نے بھی اپنے ناولوں کے ذریعے کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کیا اور اپنے ناولوں کے ذریعے انگریزوں کے خلاف پیدا ہونے والی نفرت کو اپنے ناولوں میں کامیابی کے ساتھ سمو دیا۔ ان کے ناولوں کے کردار حکومت سے نجات جو اس وقت انگریزوں کی تھی کے طلبگار نظر آتے ہیں۔ ان فکشن نگاروں نے اس دور کے حالات کو پیش کرتے ہوئے آزادی کے جذبے کو فروغ دیا جن میں سجاد ظہیر، اپیندر ناتھ اشک، عزیز احمد، رشید جہاں، وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں۔

اس جدوجہد آزادی کو مزید حرکت دینے کے لئے ہمارے ڈرامہ نگار بھی پیش پیش رہے۔ انھوں نے اپنے ڈراموں کے ذریعے ہندوستانیوں کو آزادی کی اہمیت کو بتایا، اپنے ڈراموں میں باغیانا لہجہ استعمال کرتے ہوئے اس تحریک کو آگے بڑھانے میں مدد دکیں۔ جس کی مثال میں ہم ڈرامہ 'یہ کس کا خون ہے' (سردار جعفری)، 'آزادی' (ابوسعید قریشی)، 'نقش آخر' (اشتیاق حسین قریشی)، وغیرہ ڈاموں کو پیش کر سکتے ہیں۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادیب و شعراء نے جو دو جہد آزادی اور وطن سے محبت کی اس تحریک کو آگے بڑھایا۔ اردو زبان اس تحریک میں دیگر زبانوں سے پیچھے نہیں رہی بلکہ وہ بھی مجاہد آزدی کے ساتھ شانا بہ شانا چلتی رہی۔ اردو ادیب و شعراء نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور وطن عزیز کو آزاد کرنے میں ہر طرح سے قربانیاں دیں۔

☆☆☆

جدوجہد آزادیٔ ہنداور اردو شاعری

(ابتدائی نقوش کے حوالے سے)

شیخ ہما کوثر (اسوسیٹ پروفیسر)
صدر شعبۂ اردو، کے آر ایم مہیلا کالج
ناندیڑ (مہاراشٹر)

☆تمہید (Abstract)

اردو میں جدید شاعری کا آغاز ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے بعد یعنی انجمن پنجاب کے مشاعروں میں پڑھی گئیں موضوعاتی نظموں سے مانا جاتا ہے اور یہیں سے جدوجہد آزادی اور اردو شاعری کا رشتہ بھی جوڑا جاتا ہے جو عام طور پر ۱۹۴۷ء کی مکمل آزادی تک قائم ودائم مانا جاتا ہے۔ دراصل جدوجہد آزادی ہر زمانے میں رہی ہے کیونکہ آزادی ہر انسان ہی نہیں ہر جاندار کا سب سے بڑا ارمان ہے۔ انسان جب تک زندہ رہتا ہے آزادی کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ غلامی کی زندگی انسان کو قطعی پسند نہیں ہے۔ اردو شاعری میں جدوجہد آزادی کے نقوش ۱۸۵۷ء سے بھی پہلے ملتے ہیں اور جب ہم اس کی وسعت پر نظر ڈالتے ہیں تو آج تک اس کے نشانات نظر آتے ہیں۔ ''جدوجہد آزادی اور اردو شاعری'' ایک ایسا عنوان ہے جس کا ایک مختصر مضمون احاطہ کر ہی نہیں سکتا، اس لئے اس مضمون میں جدوجہد آزادی ہنداور اردو شاعری کو ابتدائی نقوش کے حوالے سے قلمبند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

☆تعارف (Introduction)

جدوجہد کے معنی بھاگ دوڑ، سعی، کوشش، سرگرمی، محنت ومشقت کرنا ہے۔ جتن، جدوجہد کا مترادف لفظ ہے۔اس لحاظ سے جدوجہد آزادی کے معنی آزادی کے لئے کوشش کرنا ہوتے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں اردو شاعری کا بہت اہم حصہ رہا۔اشعار، نثری جملوں کے مقابلے میں دلوں پر زیادہ اثر کرتے ہیں۔اشعار انسانی جذبات کو بھڑکاتے ہیں اور اردو زبان و ادب کے اشعار میں یہ تاثیر دوسری زبانوں سے زیادہ نظر آتی ہے۔ جدوجہد غلامی اور آزادی کے درمیان کی کڑی ہے۔ زندگی ان تینوں کا احاطہ کرتی ہے، انسان اگر جدوجہد چھوڑ دے تو وہ غلامی کی زنجیروں میں بندھ جاتا ہے اور اگر جدوجہد کرتا رہے تو اُسے اپنی جائز آزادیاں نصیب ہوتی رہتی ہیں۔اردو شعراء نے ہمیشہ اپنے اشعار سے آزادی کے لئے جدوجہد کرنے کی ترغیب دی ہے۔اس طرح کی کوشش ہمیں ۱۸۵۷ء سے قبل بھی ملتی ہے۔ ویلزلی نے ۱۸۱۸ء میں پیشوا کو معزول کر دیا۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی کوششیں بھی بیکار ہوگئیں۔ ڈلہوزی نے ۱۸۳۵ء میں جھانسی، ۱۸۴۸ء میں ستارہ اور ۱۸۵۴ء میں ناگپور کو قبضے میں لے لیا تب سارے ہندوستان کا نقشہ بدلتا نظر آنے لگا۔ نہ صرف ہندوستانی رعایا بلکہ ہندوستانی حکمراں بھی غیر ملکی حکمرانوں کے غلام بننے لگ گئے۔اس دوران بہت سی اہم شخصیتیں قوم پرستانہ جذبات لئے آزادی کی جدوجہد میں شہید ہوئیں جن کی شہادت کے لوک گیت مقبول ہوئے، ان میں جھانسی کی رانی کا یہ گیت بھی شامل ہے ۔

''خوب لڑی مردانی وہ تو جھانسی والی رانی تھی
تو پیں چڑھیں میناروں پر، اگنی بان ہوا میں

اڑتے تھے

خوب لڑی مردانی''

☆اردو کی جدید شاعری کا ابتدائی دور اور جدوجہد آزادی کو ترغیب دینے والے اشعار :

ہندوستان میں حکومت کی تبدیلی اور نئی غلامانہ زندگی کو بیان کرتے ہوئے اکبرالہ آبادی نے یہ اشعار تخلیق کئے ۔

''وہ مطرب اور وہ ساز وہ گانا بدل گیا
نیندیں بدل گئیں وہ فسانہ بدل گیا
رنگِ رخِ بہار کی زینت ہوئی نئی
گلشن میں بلبلوں کا ترانہ بدل گیا
فطرت کے ہر اثر میں ہوا ایک انقلاب
پانی فلک پہ کھیت میں دانہ بدل گیا''

ان اشعار کے بارے میں وہاب اشرفی نے تحریر کیا ہے :

''اکبرالہ آبادی نے پرانے نظام کی موت اور اس جگہ نئے نظام کی آمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جب یہ اشعار کہے تھے تو اس سے بہت پہلے سے ہندوستانی ریاستیں آخری سانسیں لے رہی تھیں ۔''

[تاریخ ادب اردو۔(ابتداء سے ۲۰۰۰ء تک) وہاب اشرفی (جلد اول) ص ۲۸۱]

بہادر شاہ ظفر ایک ایسے شاعر تھے جو ۱۸۵۷ء کی جنگ میں شکست کے بعد غیر ملکی حکمرانوں کے ظلم وستم کا شکار ہوکر بادشاہ سے غلام ہی نہیں بلکہ ایک قیدی بن

گئے تھے جس کے کرب کو انھوں نے اس طرح بیان کیا۔

کتنا ہے بدنصیب ظفؔر دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

یہ وہ دور تھا جب غیر ملکی آقاؤں کے خلاف براہِ راست کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ غیر ملکی حکمرانوں کے مظالم شباب پر تھے۔ ایسے حالات میں قید و بند و غلامی کی تکلیفوں کو بیان کر کے جدوجہد آزادی کو ترغیب دینے کے لئے اشاروں و کنایوں کا سہارا لیا گیا۔ اپنی بات کہنے کے لئے انھوں نے اردو اشعار میں بجلی، قفس، گل و بلبل، طائر، بہار، خزاں، صیاد، شکاری، اسیر، چمن و ویرانہ جیسے الفاظ کا سہارا لے کر عام لوگوں کے دلوں کو بے حد متاثر کیا۔ اس دور کے متعدد شعراء کے بے شمار اشعار آج بھی دہرائے جاتے ہیں جن میں سے چند یہاں پر نقل کئے جاتے ہیں۔

بہار آئی اسیرانِ قفس آپس میں کہتے ہیں
پھڑک کر توڑنا ہے گر قفس تیار ہو جاؤ
(بہادر شاہ ظفؔر)

اسیری میں بہار آئی ہے فریاد و فغاں کر لیں
نفس کو خوش فشاں کر لیں قفس کو بوستاں کر لیں
(نظم طباطبائی)

رشکؔ کیا کیجئے سرِ گلشنِ دہر
باغ میرا نہ باغباں میرا
(علی اوسط رشکؔ)

دل شکستہ درد میں ڈوبی ہوئی آواز ہے
میں ہوں اب کنج قفس ہے حسرت پرواز ہے
(علی نقی صفی لکھنوی)

ایک گلشن میں ہے ایک خانۂ صیاد میں قید
گل و بلبل کو میسر نہیں یکجائی کبھی
(سائل دہلوی)

گلشن بہار پر تھا نشیمن بنا لیا
میں کیوں ہوا اسیر مرا کیا قصور تھا
(قزلباش ثاقب)

آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانہ
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
(علامہ اقبالؔ)

چمن کو دیکھ کر ہم روئے خوب اگلی بہاروں کو
جگر کے داغ یاد آئے جو دیکھا لالہ زاروں کو
(شوق نیموی)

۱۸۵۷ء کی پہلی جدوجہد آزادی کی جنگ نے مکمل ہار کے ساتھ ہندوستانیوں کے حوصلے پست کر دیئے تھے۔ جب اس ہار کی وجوہات پر غور کیا گیا تو ایک وجہ یہ بھی سمجھ میں آئی کہ اردو شاعری ذہنوں کو سلانے والی شاعری ہے۔ اس وقت ذہنوں کو بیدار کرنے والی شاعری کی ضرورت ہے، سرسید احمد خاں جان گئے

تھے کہ ہندوستانی اس وقت آزادی کے لئے جدوجہد کرنے کے قابل نہیں ہیں اس لئے انہوں نے نہ صرف نثر بلکہ اردو شاعری کے ذریعے بھی جدوجہد آزادی کا خمیر تیار کرنے کی ابتداء کی، اس طرح انھوں نے اپنے ہم خیال تیار کئے اور حالؔی، آزاد، شبلی اور تلوک چند محروم جیسے کئی شاعروں نے جدید شاعری کی بنیاد خواب، سرور اور خیالی دنیا کے بجائے حقیقت، حرکت و عمل پر رکھی۔ حالؔی کی مثنوی ''مسدس مدوجزر اسلام'' قوم کو بیدار کرنے کے لئے میل کا پتھر ثابت ہوئی۔ جدید شاعری کے ابتدائی دور کی تمام نظمیں ان ڈائریکٹلی جدوجہد آزادی کا خمیر تیار کرنے والی نظموں کے زمرے میں شامل ہیں۔ سنبل نگار نے ان جدید نظموں کے بارے میں تحریر کیا ہے :

> ''آزاد، حالؔی، شبلی نے نئی نظم کی بنیاد رکھنے اور اسے فروغ دینے میں کلیدی رول ادا کیا۔ ان بزرگوں کی کوشش سے اردو شاعری کے دامن کا یہ دھبہ دھل گیا کہ یہاں جھوٹے عشق کی جھوٹی داستانوں اور اہلِ دول کی چاپلوسیوں کے سوا دھرا ہی کیا ہے۔ ان شاعروں کے یہاں وہ دنیا نظر آتی ہے جو ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی ہے اور وہ مسائل و معاملات دکھائی دیتے ہیں جن سے ہم دوچار ہیں۔''

(اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ۔ سنبل نگار۔ ۲۰۰۱ء ص ۲۲۰)

جدید شاعری کے ابتدائی وارتقائی دور میں بے شمار شعراء نے اپنی شاعری کے ذریعے جدوجہد آزادی کا خمیر تیار کیا، ان میں حالؔی، آزاد، شبلی تلوک چند محروم اور سرورؔ جہاں آبادی کے علاوہ علامہ اقبالؔ، چکبستؔ، اسمٰعیل میرٹھی، مولوی سید احمد کبیر،

مولوی ظفر علی خاں، اکبرالہ آبادی، سورج نرائن مہؔر، نوبت رائے نظرؔ، گوپی ناتھ امنؔ، پنڈت امرناتھ ساحلؔ، پنڈت ہری چند اخترؔ، فراقؔ گورکھپوری، بہادر شاہ ظفرؔ، نظم طباطبائی، فضل حق آزاد، ریاض خیرآبادی، بے خود دہلوی، شوقؔ نیموی، علی نقی صفی لکھنوی اور سائل دہلوی بھی شامل رہے۔

☆ماحصل

۱۸۵۷ء سے پہلے و بعد سے لے کر ۱۹۴۷ء تک جدوجہد آزادی میں اردو شاعری کا بہت بڑا اور اہم حصہ رہا، خصوصاً جدید شاعری کے ابتدائی وارتقائی دور میں جدوجہد آزادی کے لئے جو خمیر اس دور کے شعراء نے تیار کیا تھا اسی کے بنیاد پر ہمیں آزادی کی بڑی بڑی کامیابیاں نصیب ہوئیں اور جدوجہد کا جذبہ اس مقام تک پہنچا۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

کتابیات

☆ تاریخ ادب اردو۔ وہاب اشرفی
☆ اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ۔ سنبل نگار
☆ جدید شاعری کے ارتقاء میں غیر مسلم شعراء کا حصہ۔ ڈاکٹر یوسف صابؔر
☆ مقدمۂ شعروشاعری۔ الطاف حسین حالیؔ
☆ غیر مسلم غزل گو شعراء۔ ڈاکٹر یوسف صابؔر

☆☆☆

جدوجہد آزادی ہند اور اُردو شاعری

ڈاکٹر شائستہ تبسم اسد اللہ خان
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو
پرتبھا نکیتن کالج، ناندیڑ

انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر قید و بند یا دباؤ کی زندگی کسی کو بھی منظور نہیں ہوتی ہے۔ انسانی زندگی کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ابتداء ہی سے انسان ہر طرح کی آزادی کا مطلوب رہا ہے۔ جسمانی یا ذہنی غلامی سے بنی نوع نے ہمیشہ ہی فرار کی راہ اختیار کی ہے۔ دنیا کی تاریخ کے کئی اوراق ایسے واقعات سے رنگین ہے کہ جہاں اجتماعی آزادی اور شخصی حقوق کو چھین لیا گیا ہے اور مفاد اور اقتدار کی خاطر جبراً معصوم لوگوں کو غلامی کی زنجیر پہنادی گئی ہے۔ دنیا بھر میں ایسی کئی قومیں اور ملک موجود ہیں جنھوں نے ماضی میں غلامی اور قید و بند کی مشکلات کا سامنا کیا ہے۔ انہی میں ہمارا ملک ہندوستان بھی شامل ہے۔ جیسا کہ سبھی جانتے ہیں ۱۹۴۷ء سے قبل ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت قائم تھی اور اہلِ وطن انگریزی قوم کی محکومیت میں زندگی بسر کررہے تھے، لیکن ظلم و زیادتی انفرادی ہو یا اجتماعی جب وہ حد سے تجاوز کر جائے تو بغاوت جنم لیتی ہے۔ اِس طرح انگریزوں کی ظلم و زیادتیوں اور وطن عزیز کی آزادی کی چاہ نے جنگ آزادی کے حالات کو ہموار کیا۔ کسی بھی ملک کو آزادی اتنی آسانی سے نہیں مل جاتی۔ اُس کے لئے کئی سالوں مسلسل جدوجہد کرنی

پڑتی ہے۔ اور ہندوستانیوں نے کڑی جدوجہد کی اور قربانیاں بھی دی۔ جدوجہدِ آزادی کئی طرح سے کی گئی، کسی نے خاموشی سے احتجاج کیا، جنگ وتشدد کے بجائے خاموشی سے حکومت کے خلاف مختلف مظاہرہ کئے گئے اور کسی نے ہنسا کا راستا اپنا کر انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ان کاوشوں کے درمیان ایک کاوش قلمی جنگ کی بھی تھی۔ ان میں بھی مختلف راستوں کا انتخاب کیا گیا۔ ایک تو تحریک آزادی میں صحافت نے بہترین کارکردگی انجام دی ہے۔ اس کے علاوہ جدوجہد آزادی ہند میں اُردو ادب کی خدمات ناقابل فراموش ہے۔ آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے اور برطانوی سامراج کو جڑ سے مٹا دینے کیلئے اُردو شاعروں نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اُنھوں نے قومی یکجہتی کو مضبوط بنانے کیلئے مختلف مذاہب سے وابستہ لوگوں، مختلف زبان بولنے والے اور مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو متحد اور ایک ساتھ اُٹھ کھڑا ہونے کا درس دیا۔

اُردو زبان وادب کا مطالعہ کرنے والا قاری بخوبی اِس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اُردو زبان وادب کا مزاج ہی قومی یکجہتی کا ہے۔ آزادی سے قبل اور اُس کے بعد کی شاعری اِسی بات کا ثبوت ہے۔ آزادی سے قبل متعدد شعراء نے اپنی نظموں کے ذریعے مساوات کے جذبات پر بہت زور دیا ہے اور قومی یکجہتی کے جذبات کو مقبول بنانے میں غیر معمولی حصہ ادا کیا ہے۔ اتحاد اور اتفاق اور آزادی کے خواب کو حقیقت میں بدلنے کیلئے عوام کو جوش دلانے اور غفلت کی نیند سے بیدار کرنے کیلئے کئی اشعار قلم بند کئے ہیں۔

کیوں ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہے تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
کیا ان کو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
(جوش ملیح آبادی)

اُردو شعروادب کے قافلے میں کئی ایسے شعراء بھی شامل ہیں جنھوں نے نہ صرف عوام میں آزادی کا جذبہ بیدار کیا بلکہ عوام الناس کے ساتھ آزادی کی جنگ میں شریک رہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی قلمی کاوشوں سے فرقہ وارانہ تعصب وتنگ نظری کو دور کرنا چاہا۔ ہمیشہ اپنی نظموں کے ذریعے انسان دوستی، حب الوطنی، آپسی رواداری، باہمی محبت کی طرف توجہ دلائی۔ یہ اُردو شاعری کے لئے کمال اعزاز ہے کہ اس میں آزادی جدوجہد پر اتنا شعری سرمایہ موجود ہیکہ وہ ایک بڑی تحریک کی حیثیت رکھتا ہے۔ متعدد شعراء نے وطن کی محبت اور جنگ آزادی میں مختلف ڈھنگ سے اپنے دِلی جذبات کا اِظہار کیا ہے۔

آزادی کی ایک آن ہے، محکوم کا اس سال
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
(اقبال)

روح آزاد ہے، خیال آزاد
جسم حسرت کی قید ہے بیکار
(حسرت موہانی)

کیا زمانے کو تو عزیز نہیں
اے وطن تو، تو ایسی چیز نہیں

(مولانا الطاف حسین حالؔی)

مری صدا ہے گل شمع شام آزادی
سنا رہا ہوں دلوں کو پیام آزادی

(فراق گورکھپوری)

تحریک آزادی ابتداء سے انتہا تک مختلف مرحلوں سے گزرتی رہی۔ شاعروں نے ہر مرحلے و موڑ پر موضوع و مناسبت کے لحاظ سے آزادی کی جدوجہد کو مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ کبھی شعراء نے اپنے عہد کے احساسات و جذبات کو شاعرانہ رموز کے ساتھ نرم لہجے میں پیش کیا تو کہیں شدید ردعمل کا اظہار نہایت خوشی کے ساتھ کیا۔ اِس طرح غزلوں، نظموں اور دیگر اصناف سخن اور پوری اُردو شاعری میں آزادی کی تحریک اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہے، جس میں حب الوطنی کا جذب مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔

☆☆☆☆☆

جدوجہدِ آزادی ہنداوراُردوزبان وادب

ڈاکٹرعزیزسہیل،حیدرآباد

ہمارا ملک ہندوستان جسے سونے کی چڑیا کہاجاتاہے 15/ اگست 1947ء کوانگریزوں کی غلامی سے مکمل طور پرآزاد ہوا۔اسی لئے ہرسال ہم یوم آزادی کاجشن مناتے ہیں۔آزادی سے قبل ہمارے اسلاف نے اپنی جانوں کی قربانیاں پیش کیں مختلف تحریکات چلائیں اورانگریزوں کوملک چھوڑنے پرمجبورکردیا تب ہی ہمیں یہ آزادی کا دن نصیب ہوا۔آزادی کی پہلی جنگ 1857ء کولڑی گئی جسے غدرکا نام دیاجاتاہے۔اس جنگ سے قبل شاہ ولی اللہؒ اوران کے ساتھیوں نے آزادی کی لڑائیاں لڑیں،نواب سراج الدولہ نے بھی آزادی کیلئے میدان جنگ میں حصہ لیا۔ٹیپوسلطانؒ آزادی کی جنگ میں انگریزوں سےلڑتے ہوئے شہید ہوئے یہ تمام افرادمسلمان ہی تھے مسلمانوں نے اپنے ملک عزیز کوآزادکرانے کیلئے دیگر مذاہب کےلوگوں کے ساتھ آزادی کی جدوجہد میں بھرپورحصہ لیااوراپنی جانوں ،مالوں کی قربانیاں پیش کیں اور ہمارے ملک کوانگریزوں کی غلامی سےآزادکروایا۔ 1857ء سے 1947ء تک پورے 90سال میں جنگ آزادی کیلئے مختلف تحریکات کے ذریعہ انگریزوں کو ملک چھوڑنے پر مجبورکیا گیا جس میں خاص کر مسلمانوں نے ہندوؤں،سکھوں اورعیسائیوں کے ساتھ شانہ بہ شانہ حصہ لیااوراپنی جانیں قربان کیں مختلف تکالیف برداشت کیں اورسزاؤں کا سامنا کیا تب ہی ہمیں

مکمل آزادی نصیب ہوئی۔ 1857ء کی پہلی جنگ آزادی بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں لڑی گئی جس میں مسلمانوں کو ناکامی ہوئی مگر اسی ناکامیابی نے کامیابی کیلئے مواقع فراہم کئے اور اسی جنگ نے ہر فرد کے اندر آزادی کا جوش جذبہ منصوبہ اور ملک کو انگریزوں سے آزاد کرانے کا نشانہ عطا کیا۔ بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے مقدمہ چلایا گیا۔ یہ جدوجہد جنگ آزادی کی ابتداء تھی۔

جب بھی آتا ہے یوم آزادی آرزو دل میں کسمساتی ہے
جان جو کر گئے نثار وطن ان شہیدوں کی یاد آتی ہے

تحریک آزادی اور اردو زبان و ادب:۔

جس طرح آزادی ہند کی تحریک میں دیگر زبانوں کے ادب نے بھرپور حصہ لیا وہیں اردو زبان بھی کسی سے پیچھے نہیں رہی۔ اردو زبان ہی نے ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ دیا اور محبان وطن کو اسی زبان نے یہ ترانہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا'' عطا کیا۔ جدوجہد آزادی میں اردو ادب نے آزادی کی تحریکات کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالؔی نے ایک طویل نظم ''حب وطن'' کے عنوان سے لکھی۔ سرسید احمد خاں کی رہنمائی میں سماجی اصلاح کی عظیم الشان تحریک کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر سر علامہ اقبال نے اس وقت کے حالات کے پیش نظر ایک نظم ''ترانہ ہندوستان'' لکھی تھی۔ جسے اب قومی ترانے کے طور پر بھی وقتاً فوقتاً پڑھا اور گایا جاتا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

علامہ اقبال نے اپنی نظموں کے ذریعہ آپسی اتحاد اور رواداری کو فروغ دیا ان کی نظموں ''صدائے اردو'' 1902ء ''تصویر درد'' 1904ء میں اہل وطن کو آگاہ کیا گیا ہے۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

علامہ اقبالؒ نے ہندوستانی عوام میں آزادی کا جذبہ پیدا کیا ان کی شاعری نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری انسانیت کیلئے نہایت اہم سرمایہ ہے۔

بسمل عظیم آبادی ایک نوجوان نہایت حساس و جذباتی انسان تھے اور وہ ایک انقلابی شاعر تھے انہوں نے 1919ء کے بعد ایک ایسی غزل تخلیق کی جس میں انگریزوں کے خلاف سر کٹانے کی بات کہی گئی۔ غزل کا یہ شعر دیکھیں

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

اردو نظموں میں شاعروں نے اور بھی زیادہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے ۔ ظفر علی خاں اور جوش کی شاعری نے جس طرح انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کو للکارا اس کی مثال شاید ہی کسی ہندوستانی زبان کی شاعری میں ملے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے
زندگی ان کی ہے دین ان کا ہے، دنیا ان کی ہے

جن کی جانیں قوم کی عزت پہ قرباں ہوگئیں
ہم قول کے صادق ہیں اگر جان بھی جاتی
واللہ کبھی خدمت انگریز نہ کرتے

(حسرت موہانی)

پریم چند نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں انگریزوں کے ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھائی اور ظالم و جابر حکومت کے خلاف آزادی کا نعرہ بلند کیا جس میں مزدوروں اور کسانوں کا استحصال ہو رہا تھا گوشہ عاقبت، میدان عمل، چوگان ہستی ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کی مکمل عکاسی کرتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی صحافت اور اپنی تقاریر کے ذریعہ مسلمانوں میں آزادی کا شعور بیدار کیا اور انہیں انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی ترغیب دی۔ مسلمانوں کو بتلایا کہ ملک کی ترقی اور آزادی کی ذمہ داری تو ان کے سروں پر خدائے ذوالجلال کی طرف سے ہے دنیا میں صداقت کے لئے جہاد اور انسانوں کو انسانی غلامی سے نجات دلانا تو اسلام کا قدرتی مشن ہے وہ الہلال میں رقمطراز ہیں ''یاد رکھئے کہ ہندوؤں کے لئے آزادی کیلئے جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے مگر آپ کیلئے ایک فرض دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ ہے۔''

اردو زبان وادب نے آزادی کے لئے ماحول کو سازگار کیا اور اردو زبان نے ہی آزادی کے متوالوں کے دلوں میں احساس اور جذبہ بیدار کیا اور اس مقصد کیلئے مشکل سے مشکل قربانیوں کا حوصلہ پیدا کیا ساتھ ہی ہندوستانیوں کے دلوں میں سرفروشی، جاں بازی اور حب الوطنی کے شعلوں کو اس طرح بھڑکایا کہ حصول

آزادی تک ان کے جوش وجذبہ میں کبھی کمی نہ آئی۔

جب پڑا وقت گلستاں پہ تو خوں ہم نے دیا
اب بہار آئی تو کہتے ہیں تیرا کام نہیں

تحریک آزادی اور صحافت:۔

ہندوستان کی تحریک آزادی میں اردو اخبارات نے بھی بہت ہی نمایاں رول انجام دیا ہے۔آزادی کی جنگ میں صحافت کی دنیا میں سب سے پہلے شہید ہونے والا بھی اردو زبان کا ہی ایک عظیم المرتبت صحافی مولوی محمد باقر تھا۔اردو صحافت کی تاریخ آزادی کا ایک روشن باب ہے اردو صحافیوں نے قومی یکجہتی، ملکی سلامتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے علاوہ اپنی بے باک تحریروں اور شعلہ انگیز شاعری سے ہندوستان کی تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔مولوی محمد باقر کو شمالی ہند میں اردو صحافت کے بانی اور قائد کی حیثیت حاصل ہے انہوں نے دہلی اردو اخبار کے ذریعہ انگریزوں کو للکارا تھا۔صادق الاخبار دہلی کا ایک اور بے باک اخبار تھا اس کے ایڈیٹر مولوی جمیل الدین تھے وہ بھی انگریزوں کے ظلم وستم کا شکار ہوئے۔1903ء میں مولانا حسرت موہانی نے اردو معلیٰ شروع کیا جس کے ذریعہ انگریزوں کے خلاف ولولہ انگیز مضامین شائع ہوئے جس سے انگریزی سرکار کے ایوانوں میں زلزلہ پیدا ہوا۔جس کی وجہ سے انہیں جیل کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں اور انہوں نے انقلاب زندہ باد کا نعرہ دیا۔مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی الہلال اور البلاغ کے ذریعہ تحریک آزادی کے لئے ہندوستانی عوام میں جذبہ بیدار کیا اور اپنی تحریروں کے ذریعہ انگریزوں کے خلاف نفرت پیدا کی عوامی شعور کو بیدار کیا جذبہ وطن پرستی پیدا کیا

ان کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں کا اخبار زمین دار اور مولانا محمد علی جوہر کا اخبار ہمدرد بھی قابل ذکر ہیں۔

تحریک آزادی کیلئے ہمارے رہنماؤں نے متحدہ ہوکر جدوجہد کی اور اپنی قربانیاں پیش کیں اور ہمیں آزادی دلائی ان کے ان عظیم کارناموں کو آج ہم یوم آزادی کے دن ان کو یاد کر کے تازہ کریں اور اپنے اندر جدوجہد کا جذبہ پیدا کریں اور قومی یکجہتی اور امن واتحاد کی فضاء کو عام کریں۔

میرے لہو کے رنگ سے وطن کی بیڑیاں کٹیں
ورق ورق الٹ چکا تلاش میں میں کمی نہ کی
کتاب حریت میں مگر میری داستاں نہیں
کہیں کوئی پتہ نہیں کہیں کوئی نشان نہیں

☆☆☆☆☆

تقسیمِ ہند اور خواتین افسانہ نگار

ڈاکٹر نزہت پروین محمد غوث
اسسٹنٹ پروفیسر اینڈ ہیڈ آف دی اردو ڈپارٹمنٹ
گورنمنٹ کالج آف آرٹس اینڈ سائنس اورنگ آباد

ہمارا ملک ہندوستان ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا۔ جشنِ آزادی بڑی دھوم سے منائی جارہی تھی ۔ ہر طرف خوشیاں تھیں ،روشنیاں تھیں، ملک بھر میں چراغاں کرائے گئے تھے۔ مگر حقیقت یہ بھی تھی کہ آزادئ ملک نے جہاں انگریزوں کی محکومیت سے چھٹکارا دلایا وہیں ملک کے دو حصے کر کے ایک ان مٹ زخم بھی دیا۔ ملک کا بٹوارہ ہوگیا۔ ہندوستان اور پاکستان ایک ملک کے دو نام ،دو ملک ہو گئے۔ پاکستان کے ہندو یہاں ہندوستان آنے لگے اور ادھر ہندوستان سے مسلمان جوق در جوق پاکستان ہجرت کر گئے۔ تقسیمِ ہند سے دلوں میں جو کسک جو زخم دیا تھا اس سے ادب بھی متاثر ہوا، ادب بھی زخمی ہوا۔ اور پھر فسادات و فرقہ پرستی کی وہ خوفناک تصویر سامنے آئی جس سے دونوں ممالک دوچار ہوئے۔

خواتین ادیبائیں حالات سے باخبر تھیں، تقسیمِ ہند نے انھیں تکلیف پہنچائی تھی، چنانچہ اس خونی موضوع نے انھیں بھی دعوتِ قلم دی۔ تقسیمِ ہند کے دوران بڑے پیمانے پر فسادات ہوئے۔ فرقہ پرستی نے پھر سر نکالا تھا اور تعصّب خون پیاسا ہوگیا تھا۔ مذہب پرستی نے آنکھوں پر پٹّی باندھ دی تھی اور دل پتّھر کے کر دیے تھے

۔کہیں پورا کہ پورا خاندان اس کی زد میں آیا تھا یا کہیں کوئی فرد پتنگ کی طرح اپنوں سے ٹوٹ گیا تھا۔ ملک کی تقسیم ہی کیا کم تھی جو اس میں علاقائیت کے مسئلہ نے صبر کے پیمانہ کو بھر دیا۔ غرضیکہ ہر طرف کشت وخون، غارت گری، لوٹ مار اور نفرت ودشمنی پھیلی تھی۔ اس موضوع پر اس دور کے تمام ادباء نے قلم اٹھایا۔ حیات اللہ انصاری کا ناول 'لہو کے پھول' کرشن چندر کا افسانہ 'ہم وحشی ہیں'، سعادت حسین منٹو کا 'ٹوبہ ٹیک سنگھ'، شاہکار ہیں، تو وہیں خواتین افسانہ نگار عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، صالحہ عابد حسین اور جیلانی بانو وغیرہ نے بھی برّصغیر کی جغرافیائی تقسیم کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے افسانوں میں طنز ہے، کسک ہے، آنسو ہے، آس ہے، امّید ہے، اور ان مظلوموں کی آہ بھی ہے جو فساد کا تحفہ ہے۔

عصمت چغتائی کا شہرۂ آفاق افسانہ 'جڑیں' تقسیمِ ہند کی ہی دین ہے۔ اس افسانہ کے ذریعے انھوں نے دو مذہبوں کے درمیان ہوئی ذہنی ونفسیاتی کشمکش کی بہترین عکّاسی کی ہے۔ عصمت چغتائی نے مسلم اور ہندو گھرانوں کی ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کو نمایاں کیا ہے کہ فسادات سے پہلے ان دو گھروں میں بے پناہ انس ومحبت تھی، کبھی نا ٹوٹنے والے رشتے تھے، لیکن اس مذہبی فساد نے ان کے پاک جذبات کو بھی میلا کر ڈالا تھا نتیجتاً دونوں فریقین میں بنا کچھ کیے ہی ان کہی دراڑ بن گئی تھی۔ اور اس دوری کو ایک گھر نے ترنگا لہرا کر جبکہ دوسرے گھر نے لیگ کے جھنڈے کو لگا کر اپنے نظریہ کو اور واضح کر دیا تھا۔ چونکہ نیا ملک مسلمانوں کے لیے مخصوص تھا اس لیے ایک گھر کے مکیں اب وہاں جانے کی تیّاریاں کر رہے ہیں، لیکن 'اماّں' ہندوستان کو ہی اپنا ملک مانتی تھیں اور یہیں اپنی زندگی گذارنا چاہتی تھیں۔

یہی امّاں بعد کو اپنے تمام خاندان پر ملک کو ترجیح دیتی ہیں۔عصمت چغتائی اپنے ملک کی محبت کو امّاں کے زبانی بیاں کرتی ہیں۔انھوں نے افسانے کا اختتام منفرد اور بڑا خوبصورت کیا ہے کہ آخر میں پھر سے ان دو گھروں کو ملا کر فرقہ پرستی کو ختم کر کے آپسی بھائی چارہ کا پیغام دیا ہے۔

عصمت چغتائی کی طرح قرۃ العین حیدر نے بھی ملک کی تقسیم سے بدلے ہوئے حالات و پیدا ہوئے مسائل کو نہایت سنجیدگی سے بیان کیا ہے۔اس المیہ پر انھوں نے کئی ناول بھی لکھے ہیں۔لیکن یہاں بحث افسانے کی ہے اس لئے ذکر بھی اس کا مقدّم ہے۔قرۃ العین حیدر نے اس موضوع پر بھی بہت افسانے لکھے ہیں جن میں 'جلا وطن' اور 'ہاؤ سنگ سوسائٹی' قابلِ ذکر ہیں۔حقیقت میں بھی اس المیہ نے انھیں گہرا زخم دیا تھا۔وہ کہتی ہیں:

> ''اگر کسی حادثہ نے میرے لیے محرک کا کام کیا ہے تو وہ پہلا حادثہ ۱۹۴۳ء میں والد کی موت تھا اور دوسرا تقسیمِ ہند۔ تقسیمِ ہند نے میرے لکھنے پر اثر ڈالا ہے۔''

''جلاوطن'' افسانہ بھی اسی پر مبنی ہے۔انھیں فسادات سے زیادہ یہ بات پریشان کرتی ہے کہ جو لوگ برسوں سے مل کر ساتھ رہ رہے تھے وہ آج ایک دوسرے کے دشمن کیوں بن گئے؟ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتنی نفرت کہاں سے آ گئی؟ اور سب سے بڑا سوال یہ کہ یہ المیہ ہوا کیوں؟ اس افسانے میں انھوں نے معاشرے کی حقیقت بیان کی ہیکہ جو مسلمان' پاکستان کو اپنا ملک نہ مانتے ہوئے یہیں ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں وہ اسی ملک سے محبّت کرتے ہیں،مگر ہندو ان سے مشکوک ہی

رہے ،اور انھیں اپنے ملک پاکستان کو چلے جانے کے لئے دھمکیاں دیتے ہیں ۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر نے ہندوستان میں رہ رہے مسلمانوں کی تہذیبی وثقافتی ماحول کی منظر کشی بالکل غیر جانبداریت سے کی ہے کہ وہ اپنے رسم ورواج کو آج بھی آزادی سے اپنا رہے ہیں۔

''ہاؤسنگ سوسائٹی'' بھی اسی موضوع کو سمائے ہوئے ہے۔اس افسانے میں انھوں نے نئے بنے پاکستان کے ابتدائی دور کا تجزیہ کیا ہے۔ پاکستان بن تو گیا لیکن مسائل تو ویسے ہی رہے بلکہ جو نئے نظریات سامنے آرہے تھے ان کو قرۃ العین حیدر نے بڑی فنکاری سے متعارف کروایا ہے۔اسی کے ساتھ انھوں نے اس خطرہ سے بھی آگاہ کیا ہے جس کو مفاد پرست سیاست داں بنا رہے تھے۔

صالحہ عابد حسین کے افسانوں میں سیاسی، سماجی اور تحقیقی موضوعات شامل ہیں ۔صالحہ عابد حسین کے سامنے جہاں انگریزی حکومت تھی وہیں ہندوستانی جدّ وجہد آزادی بھی تھی ۔ان کی نظر فرقہ پرستی کو بھی دیکھ رہی تھی وہیں خواتین کے گھریلو مسائل ان کے سامنے کھڑے تھے اور ذہن قدروں کے ٹوٹنے بکھرنے اور بن کے سنورنے کی کشمکش میں گھرا تھا اور وہ گہرا زخم جو تقسیم ملک سے ان کے دل میں ہوا تھا اس درد کا اظہار بھی انھوں نے اپنی تحریروں میں بخوبی کیا ہے۔

ان کے علاوہ جیلانی بانو نے بھی اس موضوع کو قلم بند کیا ہے۔انھوں نے تقسیمِ ملک سے ہوئے اثرات کا مکّمل جائزہ لیا ہے اور نومولود پاکستان کے بنیادی نیز تہذیبی وثقافتی مسائل کی طرف متوجّہ کیا۔ بات صرف ملک کو چھوڑنے کی ہوتی تو یہ کچھ حد تک درست بھی تھا،لیکن اس نئے ملک یعنی پاکستان میں حالات ان کے

لئے نہ سازگار تھے۔ ہندوستان سے جولوگ آنکھوں میں اپنا نیا اسلامی ملک جس کی بنیاد مساوات واخلاق پر قائم ہونی تھی اس خواب کو آنکھوں میں سجا کر جب یہ نئے ملک پہنچ رہے تھے وہاں یہ مہاجرین کہلائے۔ پاکستان میں ہندوستانیوں کے ساتھ غیر اخلاقی سلوک ہو رہا تھا، ان کے حقوق سے انھیں محروم کیا جارہا تھا۔ جیلانی بانو نے ان ہندوستانیوں بہ نام مہاجرین کو در پیش مسائل اور الجھنوں کو نہایت ہی خوبصورت پیرائے میں پیش کیا ہے۔

تقسیمِ ہند کے المیہ نے خواتین افسانہ نگاروں پر گہرا اثر کیا تر کیا تھا جسے ان کے افسانوں میں بہ آسانی سے تلاش کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ملک کی تقسیم پر لکھے گئے افسانے تب بھی مقبولِ عام تھے، اور آج بھی قابلِ تعریف ہیں۔

☆☆☆☆☆

جدوجہد آزادی ہند میں ہمدرد کا رول

ڈاکٹر شیخ فاروق باشا
لکچرار، شعبہ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج،
رائے چوٹی، آندھرا پردیش

تحریک آزادی میں صحافت نے اہم رول ادا کیا ہے۔ خصوصاً اردو صحافت نے ہندوستان کو آزادی دلانے میں فیصلہ کن اور موثر رول انجام دیا ہے۔ اردو صحافت کا سفر ''جام جہاں نما'' کلکتہ 1822ء سے شروع ہوتا ہے۔ اردو صحافت اپنے ابتدائی دور سے ہی فرنگی حکومت کے عتاب کا شکار رہی۔ نامساعد اور ناموافق حالات میں بھی اس نے امید کا دامن ترک نہیں کیا اور منزل مقصود کی طرف گامزن رہی۔ ملک کی سیاسی سماجی، معاشی، تعلیمی اور مذہبی موضوعات اردو صحافت کی ترجیحات میں شامل ہیں۔ حکومت جس اخبار کو بھی اپنے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہوئے پاتی اس اخبار کی یا تو ضمانت ضبط کر لیتی یا اس کو شدید نقصان سے دوچار کر دیتی، اس طرح انگریز مخالف اخبار زمانہ کا شکار ہو جاتے۔ ابتدائی دور میں اردو اخبارات کا رجحان سیکولر تھا لیکن دھیرے دھیرے ان میں مذہبیت، وطنیت اور قومیت کے عناصر فروغ پانے لگے۔ بیسویں صدی میں انگریزوں کے نظام کے خلاف اردو اخباروں کی آواز شدت اختیار کرتی گئی جس کی بدولت ملک کے ممتاز اردو صحافیوں کو جسمانی اذیتوں اور مالی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ بیسویں صدی کے جن اخبارات نے تحریک آزادی کو مستحکم کرنے میں نمایاں کردار انجام دیا ان میں

حسرت موہانی کا ''اردوئے معلیٰ'' مولانا آزاد کا الہلال، مولانا ظفر علی خاں کا زمیندار اور مولانا محمد علی جوہر کا ''ہمدرد'' اہمیت کے حامل ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر کو اس حیثیت سے اپنے معاصرین مدیران اخبار پر امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں اخبار جاری کیا۔ جنوری 1911ء میں کلکتہ سے انگریزی میں کامریڈ اخبار جاری کیا جو دیکھتے ہی دیکھتے ملک کا مقبول ترین اخبار بن گیا۔ مولانا محمد علی جوہر انگریزی زبان میں خداداد صلاحیت کے حامل تھے۔ کامریڈ کو انہوں نے اعلیٰ معیار بخشا۔ کامریڈ کے اسلوب پر انگریز بھی فریفتہ تھے۔ مولانا نے کامریڈ کے ذریعہ ہندوستانی عوام کی آواز ایوان حکومت تک پہنچانے کی کوشش کی۔ قومی اتحاد حب الوطنی اور جذبہ حریت کو فروغ دیا۔ مولانا محمد علی جوہر فروری 1913ء میں دہلی سے روزنامہ ہمدرد اردو زبان میں جاری کیا جس نے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کے علاوہ اس اخبار نے قومی اتحاد کو فروغ دینے اور مسلم قوم کو ایک مرکز پر جمع کرنے اور اردو ادب کے دائرے کو وسعت دینے میں اہم رول ادا کیا۔

ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے ہمدرد نے شروع ہی سے انگریز حکومت کے خلاف جارحانہ اور مخالفانہ رویہ اپنایا۔ ہمدرد نہ صرف ایک اخبار تھا بلکہ وہ ایک انقلاب بھی تھا۔ وہ نوجوانان ہند کو انقلاب کی دعوت دیتا حصول آزادی کے لیے انھیں اُبھارتا۔ مولانا جانتے تھے کہ اگر نوجوان طبقہ میں آزادی کی فکر اور شعور آجائے تو ہندوستان کو آزاد ہونے سے دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی، وہ نوجوانوں کو ایک پرچم تلے جمع ہونے اور پورے اہتمام اور تنظیم کے ساتھ آگے

بڑھنے کی دعوت دیتے۔ اور ہندوستانی نوجوانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے مضامین لکھتے۔ چنانچہ ۱۶/اپریل ۱۹۲۸ء کے ہمدرد میں ''آزادی ہند'' کی جدوجہد، نوجوانانِ ملک کے فرائض'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''مصر اور چین کے طلبہ کی سرفروشانہ جدوجہد کی داستانیں ہم روز سنتے رہے ہیں لیکن ہندی نوجوانوں کا جم غفیر، اِلّا ماشاءاللہ فرائض سے یک سر غافل اور بے پرواہ ہے اور نہ صرف غافل و بے پرواہ ہے بلکہ غیر ملکی حکومت کی محکومی کے علاوہ دماغی اور ذہنی غلامی اور مغربی فیشن کی سب سے بڑی لعنت میں گرفتار ہے۔ برطانیہ کا ہندوستان پر تسلط ،اس کی فوجوں، سامان حرب، مشین گنوں اور طیاروں سے اور کہیں زیادہ آزادی ملک کے لیے مہلک اور خوفناک وہ سرکاری درس گاہیں اور یونیورسٹیاں ہیں جن میں ہندی نوجوانوں کے دل و دماغ کو یورپ اور بالخصوص برطانیہ کی ذہنی اور دماغی غلامی کی زنجیروں سے جکڑا جاتا ہے۔ یوروپین تہذیب وتمدن اور طریق معاشرت کی وقعت ان کے دلوں میں پیدا کی جاتی ہے اور یہ اسی تعلیم وتربیت کا نتیجہ ہے کہ جن لوگوں پر اس کا زہر زیادہ چڑھ گیا وہ ملکی آزادی کی تحریک کے متعلق کبھی سوچتے بھی ہیں تو اپنے غیر ملکی معلموں کے دماغ سے اور اس پر نظر ڈالتے بھی (ہیں) تو اُن ہی کی آنکھ سے)

آگے مسلمانانِ ہند کے نوجوانوں کو عار دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پھر یہ کیا ہے کہ ہندوستان کے نوجوان مسلمان آج یوں محو خواب ہیں۔ ان میں کوئی حس وحرکت نہیں۔ مصری نوجوانوں کے دلوں میں جوش وطنی لہریں مارے، افغانستان، ایران اور ترکی نوجوان اپنے کارناموں سے دنیا کو متحیر ومبہوت کردیں، چین کے نوجوان مسلمان اپنے دیگر ابنائے وطن کے ساتھ وطنی آزادی کے حصول میں دوش بدوش ہوں، روس کے مسلمان میدان عمل میں سرگرم کار ہوں، ریف ومراکش، تونس والجیریا، ہر جگہ جنبش وحرکت کے آثار ہوں، مگر بے حسی اور مُردنی چھائی ہو تو ہندی مسلمانوں کے نوجوان طبقہ پر۔

شاہیں و درّاج سب اوج پر ہیں
مگر ایک ہم ہیں کہ بے بال و پر ہیں

انگریز حکومت ہندوستانی عوام پر جب کبھی ظلم وزیادتی اور ناانصافی کرتی مولانا ڈھال بن کر کھڑے ہوجاتے اور ہمدرد میں اس کے خلاف کھل کر آواز اُٹھاتے۔ باردولی کے کسانوں سے حکومت زاید لگان اُصول کرنا چاہتی تھی تو مولانا نے حکومت کی اس ناانصافی کو للکارا۔ ۲۸ رمئی ۱۹۲۸ء کے ہمدرد میں ''باردولی میں ستیہ گرہ'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

باردولی کے کسانوں اور کاشت کاروں کے ساتھ حکومت کی جانب سے جو کچھ کیا جارہا ہے وہ ظلم وبرائی اور جبر وتشدد کا کھلم کھلا مظاہرہ ہے۔ حکومت اپنی قوت اور استبداد سے چاہتی ہے کہ ان

غریب کاشت کاروں سے مال گذاری زیادہ وصول کرے جس کو وہ بہ مشکل ادا کر سکتے ہیں۔ ملک کا شاید ہی کوئی سمجھ دار فرد ایسا ہو جو حکومت کی ان جابرانہ کارروائیوں کو بہ نظر استحسان دیکھے۔ اس ناروا کارروائی کی لمحہ بھر کے لیے بھی کوئی سمجھدار شخص تائید نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ ان جائیدادوں کو جا کر خریدنا پسند کرے جو اس ظلم اور زبردستی کی جنگ میں غریب کاشتکاروں کے ہاتھ سے چھینی جا رہی ہے۔ جو لوگ ایسا کریں گے وہ یقیناً حکومت کی ظالمانہ کارروائیوں کے لیے آلۂ کار بن کر اثم و عدوان کی صریح معاونت کریں گے۔

مولانا محمد علی چاہتے تھے کہ مسلمان قومی دھارے میں شریک رہیں اور اپنے جائز حقوق حاصل کریں۔ اور کانگریس میں شریک ہو کر سوراج کے حصول کے لیے کوشاں رہیں۔ انفرادی محنت اور انگریزوں سے منت سماجت نہ مسائل کا حل ہے اور نہ اس سے حقوق حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ صرف حقوق حاصل کرنے کی خواہش رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں اس کے لیے تڑپ اور جستجو کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے حقوق کے تعلق سے ہمدرد میں لکھتے ہیں:

''دنیا میں بغیر طلب کے کوئی بھی چیز نہیں ملا کرتی۔ جہد و کوشش ہر غرض کے حصول کے لیے ضروری ہے اور پھر یہی کوشش جس قدر موزوں اور مناسب طریقے پر کی جائے گی اسی قدر جلد اور بہتر نتائج مرتب ہوں گے۔ بغیر طلب کے بچے کو بھی دودھ نہیں

ملتا، ماں اسے اسی وقت دودھ پلاتی ہے جب وہ مانگتا ہے اور روتا ہے۔ یہی حال دنیا میں سیاسی حقوق کا ہے۔ کمزور اور محکوم قوموں کو بھی ان کے حقوق اس وقت تک ہرگز نہیں ملتے جب تک وہ جدوجہد نہیں کرتیں''۔

مولانا نے مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہونے کی ترغیب دلائی کیونکہ اس وقت کانگریس ہی ملک کی سب سے بڑی پارٹی تھی اور تقریباً ملک کے جید علماء و دانشور سبھی کانگریس سے منسلک تھے۔

انگریزی حکومت ہمیشہ یہ باور کراتی تھی کہ ہندوستانی ابھی حکومت سنبھالنے کے اہل نہیں ہیں اور ان کے اندر زمام اقتدار کو ہاتھ میں لینے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس طرح وہ اپنا اُلوسیدھا کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا محمد علی ہمدرد میں ''کیا ہم سوراج کے لائق نہیں ہیں'' کے عنوان سے حکومت کی بہانہ بازی پر راست تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کسی بچے سے یہ کہنا کہ تم ابھی پڑھنا نہیں جانتے اس لیے تمہارے ہاتھ میں کتاب نہیں دی جاسکتی، صحیح اُصول نہیں ہے۔ کسی کو تیرنا سیکھنے کے لیے پانی میں گھسنے سے اس عذر پر روکنا کہ وہ تیرنا نہیں جانتا کہاں کی عقل مندی ہے؟ ایک بڑھئی کے لڑکے سے یہ کہنا کہ جب تک تمہیں کام نہ آجائے آری بسولے کو ہاتھ نہ لگاؤ ایک ایسا فعل ہوگا جس پر بے وقوفوں کو بھی ہنسی آجائے۔ پڑھنا اسی وقت آسکتا ہے جب ہاتھ میں کتاب ہو۔

تیرنا ہم اسی وقت سیکھ سکتے ہیں جب پانی میں گھسیں اور معمار یا نجار اسی وقت بن سکتے ہیں جب اوزروں سے کام لیں۔ اگر متذکرہ بالا اُمور مسلم ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم بغیر حکومت کیے کبھی بھی حکومت کے اہل ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب یہی ہوگا کہ کبھی نہیں''۔

مزید لکھتے ہیں:

''ہمیں اس بہلاوے میں رکھنا کہ ابھی ہم میں سوراج کی قابلیت نہیں پیدا ہوئی ہے ایک صریح دھوکہ ہے۔ سوراج کی قابلیت ہر انسان کے ساتھ پیدا ہوتی ہے اور جس طرح ورزش سے جسم اور تعلیم سے دماغ ترقی پاتا ہے، اسی طرح اپنے ملک کا خود انتظام کرنے سے وہ بھی نشو ونما حاصل کیا کرتی ہے۔ سوراج کی قابلیت پیدا ہونے کا انتظار کرنا، دوسرے لفظوں میں قیامت کا انتظار کرنا ہے۔ دوپہر کے وقت اگر کوئی شخص سورج نکلنے کا منتظر ہو تو اس کی حماقت پر کسے ہنسی نہ آئے گی؟ جو قابلیت کہ قدرتاً ہر انسان کے ساتھ پیدا ہوتی ہے اس کے پیدا ہونے کا انتظار کرنا کچھ اس سے کم مضحکہ خیز نہیں ہے''۔

ہمدرد نے سول نافرمانی اور ترک موالات تحریک کی کھل کر تائید کی اور اس تائید میں مضامین بھی شائع کئے۔ ترک موالات کی تحریک کے بارے میں ہمدرد لکھتا ہے:

''ترک موالات کی تحریک نے حقیقۃً اعجاز کر دکھایا ہے کہ اتنی

قلیل مدت میں ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک آزادی وحریت کی ضرورت واہمیت دل نشین کر دی ہے، اور ایک کان بھی ایسا نہیں ہے جو حریت وآزادی کے لفظ سے آشنا نہ ہو، یعنی ایک عام احساس بیداری کے آثار وعلائم ہر طرف نظر آتے ہیں اور سب سے زیادہ اہم امر یہ ہے کہ اس گدایانہ خوئے عجز ونیاز کا دور یک قلم ختم ہوگیا ہے، اور ایک عام خود اعتمادی کے عہد کا آغاز ہوگیا ہے۔ اب لوگوں کو عرض و معروضہ پر بھروسہ نہیں''۔(۱۰۹) صباح الدین، انتخاب ہمدرد، لکھنو، ۱۹۸۸ء ص ۱۲۲

''چرخہ اور کھدر'' کے عنوان سے ایک مضمون ہمدرد میں شائع ہوا جس میں ہندوستانی عوام کو اس بات کی ہدایت دی گئی کہ وہ انگریز مصنوعات کا بائیکاٹ کریں اور انگریز کے تیار کردہ ملبوسات کے استعمال سے احتراز کریں۔ اس کے متبادل چرخہ کاتیں اور کھدر کا کپڑا تیار کریں۔ خود مکتفی ہوکر انگریزوں کے مصنوعات کا مکمل بائیکاٹ کریں۔ چنانچہ ہمدرد لکھتا ہے:

''دشمن کی مدد نہ دینے کا جو مسلمہ اُصول ہے اُس کے ماتحت کپڑے کا مقاطعہ سب سے اہم اور وزنی چیز ہے۔ انگلستان میں ذرائع سے ہم کو روز بروز مفلس بنا رہا ہے۔ وہ لنکا شائر کی تجارت ہے۔ کم از کم ساٹھ کروڑ روپئے ہر سال ہماری جیبوں سے نکل جاتا ہے۔ اگر ہم اس کو روک سکیں تو یہ ایک ایسی ضرب ہوگی کہ انگلستان اُس

کو بغیر محسوس کئے نہیں رہ سکتا۔ اس سے اُن کو یہ معلوم ہو جائے گا
کہ اب ہندوستانی مصمم ارادہ کر چکے ہیں کہ اقتصادی غلامی سے
نجات حاصل کر لیں گے''۔(۱۱۰) ایضاً ص ۸۲

انگریز اور ان کی سیاسی چالوں کو ہمدرد نے جس جرأت اور بہادری سے پیش کیا وہ تاریخ صحافت کا ایک اہم باب ہے۔ اس لیے جلیان والہ باغ کا قائل گورنر پنجاب مائیکل ایڈوائر کو کہنا پڑا:

''ظفر علی خاں اور محمد علی جوہر ماں کے پیٹ سے بغاوت کا قلم لیکر
نکلے ہیں۔ انگریز دشمنی ان کی فطرت میں شامل ہے۔ کوئی عام
منصوبہ شروع کرنے سے پہلے ان کو گرفتار کرنا ضروری ہے''۔

مولانا محمد علی انگریزوں سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے۔ اُلٹا اُنھوں نے انگریزوں کو مرعوب کیا۔ کامریڈ اور ہمدرد کے ذریعہ اُنھوں نے انگریزوں کی شاطرانہ چالوں اور ان کی عیاری و مکاری کو بے نقاب کیا۔ کیونکہ وہ انگریزوں کی خوبو سے اچھی طرح واقف تھے۔

حکومت برطانیہ کی پالیسی تھی کہ ایک وائسرائے مزاج کا تیز اور گرم ہو تو دوسرا نرم لیکن دونوں کی پالیسی یہ ہوتی کہ ایک مارتا، دوسرا سہلاتا۔ ایک دھول لگاتا اور رلاتا، دوسرا تھپکی دیتا اور سہلاتا۔ محمد علی نے ہندوستانی عوام کو ان کے دھوکہ میں نہ آنے کا بارہا مشورہ دیا۔ لارڈ ارون ایک نرم دل وائسرائے ضرور تھا لیکن عیار اور مکار تھا اس کی عیاری اور مکاری سے عوام کو ہوشیار کراتے ہوئے مولانا ہمدرد میں لکھتے ہیں:

''بہرحال اگر نرم دل ، نیک نہاد ، خلق مجسم لارڈ ارون ہم ہندوستانیوں سے فرماتے کہ بڑے ضدی ہو،تم بڑے مفسد ہو،تم نے ہمارا ناک میں دم کردیا ہے،تم نے دن کا چین اور رات کی نیند حرام کردی ہے،تم کشتنی وگردن زدنی ہو، ہمارا بس چلے تو ہم تمہیں کچا ہی چباڈالیں لیکن کوئی کہاں تک تم سے لڑے جھگڑے ،تم ہمارا دماغ چاٹ گئے ،لو یہ تمہارا سوراج اب دفع ہو یہاں سے، ہٹو ہمارے سامنے سے، پھر اپنا کالا منہ ہمیں نہ دکھانا۔ خدا تمہیں غارت کرے،تم سوراج لے ہی کے ٹلے تو ہم سے قسم لو جو برا مانتے۔ہم خوشی خوشی ان کے در دولت سے چلے جاتے اور پھر کبھی ان کی دہلیز پر قدم نہ دھرتے اور ان کی گالیوں کے جواب میں کہتے

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جوابِ تلخ می زیبداب لعل شکر خارا

(۱۱۱)

سرور محمد، مضامین محمد علی، دہلی ۱۹۳۸ء ص ۳۱۸

یہ لارڈ ارون کی ابتدائی سادہ لوحی نہیں ہے بلکہ انتہائی ہوشیاری ہے۔

جدوجہد آزادی کی راہ میں ہر قدم پر مولانا نے انگریزوں کی مخالفت کی۔ سائمن کمیشن کی اُنھوں نے کھل کر مخالفت کی اور اس کے خلاف احتجاج کرنے میں پیش پیش رہے۔ چنانچہ ہمدرد میں ''لو وہ کمیشن بھی مقرر ہوا'' کے عنوان سے ایک

طویل مضمون لکھا جس میں انگریزوں کی مکارانہ ذہنیت سے پردے ہٹائے۔

مولانا محمد علی ان اخبار نویسوں کی بھی خوب خبر لیتے جو حکومت کے کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہمدرد میں لکھتے ہیں:

> دہلی میں ایک گروہ ہے جو نہ مرد ہے نہ عورت لیکن جب کسی عورت کے بچہ ہوتا ہے تو یہ تالیاں اور ڈھولک بجاتے مبارک باد دینے کے لیے دروازے پر ضرور حاضر ہوتے ہیں۔ یہی حال ان اخبار نویسوں کا ہے جو خود بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اسی کی تعلیم دیتے ہیں مگر اُمیدوں سے لبریزی کا یہ حال ہے کہ ہر کالم پر توقعات کا پیالہ چھلکتا رہتا ہے اور پیشن گوئیوں سے اخبار پڑھنے والی دنیا کا جی خوش کیا کرتے ہیں کہ ع
>
> اب ہوئی بیٹی اب ہوا بیٹا
>
> (۱۱۲) ایضاً ص ۳۰۲

مولانا محمد علی نے ہمدرد کے ذریعہ مسلمانوں کو حصول آزادی کے لیے اُٹھ کھڑے ہونے کی دعوت دی۔ اگلی قوموں کے واقعات سنا کر ان کے اندر جذبۂ آزادی پیدا کیا۔ اس سلسلہ میں ہمدرد نے مسلمان اور آزادی کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ جس میں حضرت یوسفؑ کا واقعہ، بنو اسرائیل کی غلامی اور حصول آزادی کی جدوجہد پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی۔ ان تاریخی حوالوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ غلامی کی زندگی کسی کے لیے بھی مناسب نہیں۔ نہ ہندوستان کے لیے

اور نہ ہدوسرے ممالک کے لیے۔غلامی کی لعنت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''.....انسان اور دیگر حیوانات میں جو چیز مابہ الامتیاز ہے وہ عقل ہے اسی لئے ذوی العقول کے لئے دنیا کی وہی تقسیم صحیح اور منطقی کہلائی جاسکتی ہے جو ان عقائد مذہبی کے مطابق کی جائے جو انسان اپنی عقل پر زور ڈال کر اپنے لئے طے کرتے یا کم از کم طے کر سکتے ہیں۔(۱۱۳)ایضاً ۴۵۷

خدائے واحدہ لاشریک کی غلامی نے سب کو قید و بند سے آزاد کر دیا۔ تحریک آزادی کے ہیرموڑ پر ہمدرد پیش پیش رہا، جذبۂ حریت کو فروغ دینے میں وہ اپنے معاصر اخباروں میں کسی سے پیچھے نہ رہا اور اپنے مختصر دور اشعات میں ہندوستان کی آزادی کے لیے اپنے آپ کو قربان کر دیا۔

☆☆☆☆☆

جدوجہد آزادی ہند اور اردو شاعری

ڈاکٹر محمد شاہد زیدی
اسسٹنٹ پروفیسر اردو
گورنمنٹ پی جی کالج، سوائی مادھوپور

ہندوستان کی آزادی کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزادی یوں ہی نصیب نہیں ہوتی اس کے لے برسوں کی جدوجہد کے ساتھ جانوں کی قربانی درکار ہوتی ہے۔ جدوجہد آزادیِ ہند کی یہ لڑائی چار مختلف جہتوں یا مزاجوں پر مشتمل رہی جس کا پہلا دور احتجاجی رہا جس میں یہاں کی تمام زبانوں کی شاعری نے اس ملک کے لوگوں کو اس جدوجہد کے لئے ذہنی اور جذباتی طور پر آمادہ کرنے میں اپنے اپنے طور پر اہم کردار ادا کیا۔ اس سلسلے میں اردو زبان کی شاعری کا کردار سب سے نمایاں رہا ہے۔ اردو شاعری نے سوئے ہوئے اہل ہند کے جذبات کو بیدار کر کے انگریز حکومت کے خلاف کروڑوں کی تعداد میں آزادی کے متوالوں کو مجتمع کیا اور ان کے دلوں میں خواہش حصول آزادی کے جذبے کو تیز کیا۔

اردو شاعری نے ہر دور میں اپنے عہد کی ترجمانی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ہم وطنوں کی رہنمائی کے فرائض بھی انجام دیے۔ احتجاج کے اس پہلے دور میں اردو کے جن اکابر شعراء نے اپنی تخلیقات کے ذریعے آزادی کی اس لڑائی میں صور پھونکا ان میں مرزا غالب، بہادر شاہ ظفر، مصحفی، واجد علی شاہ وغیرہ کے نام آتے ہیں

جنہوں نے 1857 کی جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کو نہایت جرأت مندی کے ساتھ پیش کیا۔ شہر دہلی کی تباہ کاریوں اور انسانی جانوں کے اتلاف پر غالب کہتے ہیں:

بس کہ فعال مایرید ہے آج
ہر سلح شور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

(1)

احتجاجی لہر اپنے دوسرے دور میں جنگی معرکے میں تبدیل ہوگئی۔ اس دور میں جو نظمیں، نغمے یا کلام منظر عام پر آئے بہت مشہور و معروف ہوئے۔ احتجاجی لہر کا تیسرا دور ''آزادی اور حب الوطنی'' کے جذبات کو پروان چڑھانے پر مبنی رہا ہے۔ اس دور میں اردو کی تمام اصناف سخن میں آزادی اور حب الوطنی کا پرچار کیا گیا لیکن نظمیہ شاعری میں یہ جذبہ زیادہ عیاں اور واضح ہے۔ خاص طور پر اس زمانے کی تخلیق کردہ نظموں میں۔ اس دور کے نظم گو شعرا میں الطاف حسین حالؔی، علامہ شبلی نعمانی، محمد حسین آزادؔ، اشفاق اللہ خان، اسماعیل میرٹھی، سرورؔ جہاں آبادی، برج نارائن چکبستؔ، علامہ اقبالؔ، مولانا حسرتؔ موہانی، جوشؔ ملیح آبادی، اکبرؔ الہ آبادی، فراقؔ

گورکھپوری، تلوک چند محرومؔ، علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، فیض احمد فیضؔ، اسرار الحق مجازؔ و دیگر نے اپنے فن کا جادو جگایا۔

الطاف حسین حالیؔ کی نظموں کے ذریعے اردو شاعری میں ایک خاموش انقلاب کی ابتداء ہوئی۔ انہوں نے قوم کی سیاسی سماجی اور تہذیبی و معاشرتی اقدار و روایات کا احساس دلایا۔ حالیؔ کی شاعری میں جذبہ حب الوطنی، یکجہتی، اتحاد، قومی و ملی ہمدردی وغیرہ جیسے تصور کی بنیاد انجمن پنجاب کے مشاعروں سے پیدا ہوئی لیکن سرسید سے ملاقات کے بعد ان کی شاعری قومی و ملی مسائل کی آئینہ دار بن گئی۔ ان کی یہی شاعری جدوجہد آزادی کے لیے فکری شعور کا باعث بنی۔ نظم جدید کی تحریک سے متاثر ہوکر حالی نے ''حب وطن'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجئے:

اے وطن اے مرے بہشت بریں
کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں
رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا
وہ زمین اور وہ آسماں نہ رہا
بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو
اٹھو اہل وطن کے دوست بنو
تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی
اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی

چھوڑو افسردگی کو جوش میں آؤ
بس بہت سوئے اٹھو ہوش میں آؤ

(2)

محمد حسین آزاد نے اپنی ملت اور قوم کی اصلاح، حب الوطنی اور آزادی کے جذبے کو بیان کرنے کے لیے نثر کے ساتھ ساتھ نظم کا بھی سہارا لیا۔ کرنل ہالکرائیڈ کے ساتھ انہوں نے انجمن پنجاب کی بنیاد ڈالی۔ اپنی نظموں کے ذریعے انہوں نے ہم وطنوں کو دوستی، محبت، یگانگت، اتحاد اور امن کا پیغام دیا۔ ان کی ایک نظم 'حب وطن' کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

الفت سے گرم سب کے دل سرد ہوں بہم
اور جو کہ ہم وطن ہوں وہ ہمدرد ہوں بہم
علم و ہنر سے خلق کو رونق دیا کریں
اور انجمن میں بیٹھ کے جلسے کیا کریں
لبریز جوش حب وطن سب کے جام ہوں
سرشار ذوق وشوق دل خاص و عام ہوں

(3)

اکبر الہ آبادی کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی قومی روایت اور تہذیب وثقافت پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں حب الوطنی اور آزادی کا پیغام دیا ہے۔ سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے انہوں نے انگریزوں کے مظالم کو بیان کرنے کے لیے اپنی شاعری میں طنز کا سہارا لیا۔ ان کی نظم

'نئی تہذیب' کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی یہ پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہوں گے
عقائد پر قیامت آنے کی ترمیم ملت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے
تمہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہیں وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

(4)

سرور جہاں آبادی نے وطن کا تصور ماں اور دیوی کی حیثیت سے پیش کیا۔ ان کی نظمیں اتحاد و اتفاق، دوستی و یگانگت، امن و آشتی اور انسانی ہمدردی جیسے جذبات کی ترجمان ہیں۔ ان کی نظموں میں ماضی کی محبت اور حال سے مایوسی اور وطن کی محکومی کا شدید احساس نظر آتا ہے۔ ان کی نظم 'خاکِ وطن' سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

آہ اے خاک وطن، اے سرمہ نور نظر
آہ اے سرمایہ آسائش جان وجگر
تیرے دامن میں شگفتہ تھے کبھی قدرت کے پھول
گندھ رہے تھے تیری چوٹی میں کبھی وحدت کے پھول

(5)

شہید اشفاق اللہ خان سے کون واقف نہیں جنہوں نے خوش دلی سے اپنے آپ کو آزادی کی خاطر دار پر پیش کیا۔ اپنی نظم 'شورش جنون' میں کہتے ہیں:

بہار آئی ہے شورش سے جنون فتنہ ساماں کی
الٰہی خیر رکھنا تو مرے جیب و گریباں کی
بھلا جذبات الفت بھی کہیں مٹانے سے مٹتے ہیں
عبث ہیں دھمکیاں دار و رسن کی اور زنداں کی
وہ گلشن جو کبھی آزاد تھا گزرے زمانے میں
میں ہوں شاخ شکستہ یاں اسی اجڑے گلستاں کی

(6)

پنڈت برج نارائن چکبستؔ کا نام اور شاعری کی تاریخ میں کافی اہم ہے ان کی شاعری میں حب وطن اور قومی یکجہتی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان کی شاعری کا زندگی سے ایک نہ ٹوٹنے والا رشتہ ہے۔ جدوجہد آزادی میں ان کی شاعری وقت کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چل رہی تھی۔ ان کی نظموں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تر سیاسی واقعات سے متاثر ہو کر کہی گئی ہیں۔ ان کی نظم 'آوازہ قوم' سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے :

یہ جوش پاک زمانہ دبا نہیں سکتا
رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا
یہ آگ وہ ہے جو پانی بھا نہیں سکتا
دلوں میں آ کے یہ ارمان جا نہیں سکتا

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

(7)

علامہ اقبالؔ نے اپنی شاعری کا آغاز حب وطن سے سرشار نظموں سے کیا تھا جس سے لوگوں میں آزادی کا جذبہ پیدا ہوا۔ وہ قومی اتحاد اور قومی یکجہتی کے علمبردار تھے۔ انہوں نے تحریک آزادی کی جدوجہد میں عملی طور پر حصہ لیا۔ انہوں نے تحریک آزادی کی جدوجہد کو فکری مواد فراہم کیا اور لوگوں میں اپنی شاعری کے ذریعے شعور پیدا کیا۔ اردو شاعری میں ان کا نام اس وقت سب سے پہلے لیا جاتا ہے جب ہم روسی انقلاب سے متاثر ہونے والے شاعروں کے بات کرتے ہیں۔ اردو میں سب سے پہلے مارکسٹ سے اقبال ہی متاثر ہوئے اور کہا:

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در ودیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

(8)

جوشؔ ملیح آبادی شاعر انقلاب کے نام سے مشہور ہوئے ان کی نظمیں سماجی، سیاسی، ثقافتی اور معاشرتی روایات کی آئینہ دار ہیں اور وہ انقلابی سوچ وفکر سے لبریز ہیں۔ انگریزوں کے خلاف جوشؔ ملیح آبادی کے جذبات کا طوفان آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑتا تھا۔ اس سے انکے سینے کے اندر کے طوفان، جلن اور تپش کا

اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جوشؔ اپنی غزلوں اور نظموں میں انگریزی حکومت سے بغاوت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ نظم 'شکست زنداں کا خواب' سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے :

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
کیا ان کو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں دوڑو کہ وہ ٹوٹی زنجیریں

(9)

حسرتؔ موہانی نے بھی اپنی زندگی جدوجہد آزادی کے لئے وقف کردی۔ وہ بیک وقت ایک نڈر سیاستدان، شاعر، ادیب، صحافی اور نقاد تھے۔ انہوں نے کئی نظمیں آزادی کے عنوان سے لکھی جیسے 'جور غلامان وقت' 'نجات ہند' وغیرہ قید و بند کی صعوبتوں سے حسرتؔ کے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش نہ آئی۔

روح آزاد ہے خیال آزاد ہے
جسم حسرت کی قید ہے بے کار
ہم قول کے صادق ہیں اگر جان بھی جاتی
ہو

واللہ کبھی خدمت انگریز نہیں کرتے
غربت کی صبح میں نہیں ہے وہ روشنی
جوروشنی کہ شام سواد وطن میں تھی

(10)

مجاز نے بہت کم عمری میں رومان سے انقلاب کی طرف رخ کیا۔ اپنی والہانہ شاعری کی بدولت پورے ملک میں نوعمری ہی میں ان کی ایک الگ پہچان قائم ہوگئی تھی۔ جدوجہد آزادی جیسے جیسے تیز ہوتی گئی ویسے ویسے اردو شاعری کے تیور بھی نکھرتے گئے۔ اس مرحلے پر بھلا وہ پیچھے کیسے رہ سکتے تھے۔ مجاز کی نظم 'انقلاب' سے ان کے تیور کی مثال ملاحظہ ہو :

آرہے ہیں جنگ کے اہل وہ منڈلاتے ہوئے
آگ دامن میں چھپائے خون برساتے ہوئے
کوہ صحرا میں زمین سے خون ابلے گا ابھی
رنگ کے بدلے گلوں سے خون ٹپکے گا ابھی
ہر طرف یلغار کرتی ہر طرف بڑھتی ہوئی
خون کی ہولی کی جنگل سے ہوائیں آئیں گی
خوں ہی خوں ہوگا نگاہیں جس طرف بھی جائیں گی

(11)

جدوجہد آزادی کی اس مہم میں حصہ لینے والے شعرا میں دو خاص نام کا مریڈ مخدوم محی الدین اور فیض احمد فیض کا بھی ہے۔ فیض اور مخدوم بھی انگریزی

بربریت اور ظلم سے شدید ناراض تھے۔ دونوں نے تحریک آزادی سے متعلق دو خوبصورت اور اثر انگیز نظمیں لکھی تھیں مخدوم کی نظم 'چاند تاروں کا بن' اور فیضؔ کی نظم 'صبح آزادی' ان نظموں نے اس وقت کے آزادی کے پروانوں میں ایک جوش اور ولولہ بھر دیا تھا۔ اس موقع پر فیضؔ کی نظم 'صبح آزادی' کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل
کہیں تو جاکے رکے گا سفینۂ غم کا دل
جواں لہو کی پر اسرار شاہراہوں سے
پکارتی رہیں باہیں بدن بلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رخ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینان نور کا دامن
سبک سبک تھی تمنا دبی دبی تھی تھک

(12)

ان شعراء کے علاوہ جن شعراء نے اپنی اپنی نظموں کی طاقت سے جدوجہد آزادی کو جلا بخشی ان میں حبیب جالب کی نظم 'ماں' علی سردار جعفری کی نظم 'اٹھو ہند

کے باغبانو اٹھو لال چند فلک کی نظم 'خوف آفت سے کہاں دل میں ریا آئے گی' عرش ملسیانی کی نظم 'میرے وطن پیارے وطن' یہ سب اردو شاعری کی وہ نظمیں ہیں جن میں حب الوطنی اور مادر وطن سے عقیدت و محبت کے جذبات پائے جاتے ہیں اور ان نظموں کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ان نظموں نے آزادی کے متوالوں کے دلوں کو گرمائے رکھا ہوگا۔ آزادی کی عملی اور فکری جدوجہد میں اردو شاعری کا نمایاں کردار رہا ہے۔ الغرض شعراء کی ان شعلہ بیانیوں اور مہر و محبت کے پیغام نے ہندوستان کو آزادی سے ہمکنار کیا۔

حوالے:

۱۔ از دیوان غالب، ریختہ بکس، ص : ۴۷۵

۲۔ الطاف حسین حالی، بحوالہ: ڈاکٹر ذاکر حسین حالی حب وطن، اردو گھر، دیلی، ۱۹۴۳ ص:

۳۔ www.rekhta.org/nazams/hubbe-watan.

۴۔ www.rekhta.org/nazams/nai-tahzib.

۵۔ سرور جہاں آباد، پیمانہ سرور، مشورہ بک ڈپو، دہلی ۱۹۰۷ء، ص : ۲۳

۶۔ www.alifyar.com/shorish-e-junun.

۷۔ برج نارائن چکبستؔ، روح چکبست، مرتب رضوان احمد، رام نرائن لال کمار، الٰہ آباد، ۱۹۸۶ء، ص : ۶۱

۸۔ علامہ اقبال، بال جبریل، فرمان خدا (فرشتوں سے) تاج کمپنی لمٹیڈ،

لاہور ۱۹۳۵ء،ص : ۱۴۹
۹۔ جوشؔ ملیح آبادی،کلیات جوشؔ،مرتبہ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی،فرید بک ڈپو، دہلی ۲۰۰۷ء،ص: ۱۲۷
۱۰۔ از دیوان حسرتؔ موہانی، ریختہ بکس
۱۱۔ اسرارالحق مجازؔ،آہنگ،مکتبہ جامعہ لمٹیڈ،نئی دہلی، ۲۰۱۱ء،ص:۶۷
۱۲۔ فیض احمد فیضؔ،نسخہ ہائے وفا،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی، ۱۹۸۶ء، ص:۱۱۴

☆☆☆☆☆

تحریکِ آزادی ہند، اردو اور ہندوستانی سنیما

ڈاکٹر شکیل احمد خان
گورنمینٹ ودربھ انسٹی ٹیوٹ آف سائنس اینڈ ہیومینیٹیز، امراوتی

ہندوستانی تاریخ کا نا قابلِ فراموش باب جب ہندوستانی عوام اور پورے ملکِ ہندوستان پر انگریزوں کا مکمل تسلط قائم ہو چکا تھا۔ اور ہمارا ملک انگریزوں کی غلامی میں سانسیں لے رہا تھا۔ تب ہمارا پورا ملک اور ملک کی عوام، مختلف طبقے لوگ اور ہمارے ملک کے مختلف شعبے انگریزوں سے ہندوستان کو آزاد کروانے کی ہر ممکن کوشش کر رہیں تھے۔ غرض کہ آزادی کی اس جنگ میں سماج کے ہر طبقے نے اپنا کردار انتہائی صدق دلی، بے غرض جذبۂ خدمت اور پوری لگن سے ادا کر رہیں تھے۔ جس میں ہندو مسلم دونوں پیار و محبت کے ساتھ مشترکہ قومی فرائض میں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ چلیں، اور تحریک آزادی میں سرگرم حصہ لیا۔

آج ہندوستان کو آزاد ہوئے پچہتر سال گذر چکے ہیں، جہاں ہمارا پورا ملک آزادی کا 'امرت مہا اتسو' منا رہا ہے، اور ان عظیم ہستیوں کو یاد کیا جا رہا ہے۔ جنھوں نے آزاد ہندوستان کا خواب شرمندہ تعبیر کیا وہیں اردو داں طبقے کے لئے فخر کی بات ہے کہ ہندوستان کے جن سپوتوں نے اپنے ملک کی محبت میں اپنے ملک کے لیے پھانسی کا پھندا ہنستے ہنستے گلے میں ڈال لیا، اور اپنی آخری سانس تک " انقلاب زندہ باد" کا نعرہ بلند کرتے رہیں۔ اور آج بھی جب ہندوستان کی تحریک آزادی، اور جوش جگانے کی بات آتی ہے تو یہی "انقلاب زندہ باد" اور اسی قبیل کے

بہت سارے اردو الفاظ جیسے 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' اور 'سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے'، قومی جذبات کو شرابور کرنے لیے کافی ہے۔ یوں بھی ہندوستان کی تحریک آزادی اور زبانِ اردو کا گہرا اور اٹوٹ رشتہ ہے، ہندوستان کی تحریک آزادی میں اردو صحافت، ادب و شاعری کا کردار ادب و شاعری ہمیشہ مجاہدانہ رہا ہے اردو زبان نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں انتہائی اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ اردو زبان ہی کی صحافت، نظم و نثر ہے، جس نے ایوانِ فرنگی کی بنیادیں ہلا دی تھیں اور حکومتِ انگلستان کی نیند حرام کر دی تھیں۔ یہ دو لفظوں کا نعرہ جسے اردو نے جنم دیا نہ جانے کتنے دلوں میں آزادی کا جوش و ولولہ بھرنے کا ذریعہ بنا اور بے شمار آزادی کے متوالوں کو اپنے سروں کو قربان کرنے پر آمادہ کیا، یہ اردو زبان ہی ہے، کہ پھانسی کا پھندا گلے میں، سولی پر جھولنے کی تیاری اور بھگت سنگھ کی زبان پر یہ شعر کہ۔

سرفروشی کی تمنّا اب ہمارے دل میں
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

1857ء کی جنگِ آزادی کا آغاز آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفؔر کی قیادت میں ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کا جب بھی ذکر آتا ہے، ذہن زبان اردو کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، یہ اردو زبان ہی کے شیدائی تھے، جن کی اردو زبان کے اشعار، اقوال، نعرے، تحریریں اور تقریریں ہندوستانیوں کے دلوں چھونے، آزادی کے حقیقی معنی کو سمجھانے، اور مجاہدینِ آزادی کی رگوں میں جوش و ولولہ بھر دینے کے لیے کافی ہوا کرتے تھے۔ انگریزوں اور ان کی حکومت سے مقابلہ کرنے کے لئیہند وستانیوں کو ایک دھاگے میں پرونے کا کام جن زبانوں نے کیا ان میں سرِ

فہرست اردو ہی ہے۔جس نے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب کو ایک ہی صف میں کھڑا کیا وہ اردو ہی ہے۔انگریزوں کے ظلم واستبداد کے رازوں کو بھی تمام اردو صحافی، ادباء وشعراء نے ہی اپنی زبان کے ذریعہ ہندوستانی اقوام پر فاش کرنے کا ناقابل فراموش خدمات انجام دی۔

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤ گیاے ہندوستان والوں
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اردو اخبارات کے مدیران حضرات جن میں ہندو اور مسلم دونوں شامل تھے ،جنھوں نے بھی بڑی ہمت ، جرات اور بیبا کی کے ساتھ اپنی صحافت کے ذریعے انگریزوں کے مظالم کی مخالفت کی ،جس کی قیمت انھیں اپنی جان دے کر ادا کرنی پڑی۔ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے وقت مذہبی اتحاد، بھائی چارگی آزادء وطن ،حب الوطنی کی ایسی کشش اردو شاعری میں دکھائی دیتی ہے جس نے ہندوستانیوں کے دلوں میں انقلاب کی جد وجہد کو کبھی مدھم ہونے نہیں دیا۔اس کی ایک تمام وجوہات میں ایک اہم وجہ یہ ہے کہ اردو زبان میں عربی، فارسی اور ایرانی لسانی وثقافتی عوامل کے ساتھ ساتھ ہندو، بدھی ،جینی اور بھکتی وادی ، یعنی ہندوستانی افکار وتصورات نے بھی اردو تہذیب اور ثقافت اور شعر وادب کے دامن کو مالا مال کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔یہی وجہ ہے کہ ہر ہندوستانی کو اردو زبان کی ہندوستانیت پر فخر ہے۔اس میں ایک اہم کردار برطانوی حکومت کا بھی ہے جسے ہم فراموش نہیں کر سکتے ،جس کے متعلق ڈاکٹر چندر شیکھر نے اپنی تصنیف میں بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہیکہ۔

''برطانوی حکومت نے فارسی زبان کو منسوخ کر کے اردو زبان کو فروغ دینے اور ایک طور پر سرکاری زبان بنانے کا ارادہ کیا تو اس سے فارسی زبان کا مستقبل تو ضرور ہندوستان میں تاریک ہو گیا مگر اردو زبان کو جو ترقی ایک عرصے میں حاصل ہوئی وہ شاید دنیا کی کسی زبان کو اتنے کم عرصے میں نہ ہوئی ہوگی، تحریکِ آزادی کے علمبرداروں نے اگر یورپ میں تعلیم حاصل کر کے انگریزی زبان سیکھ کر ملت کو ایک راہ پر گامزن کیا تو تو اس قوم اور ملت کو یکجا کرنے کا سہرا اردو زبان کو ہی حاصل ہوتا ہے۔ چونکہ اردو زبان ہندوستان کے تمام لوگوں کی مشترکہ زبان رہی ہے۔ تحریکِ آزادی کی زبان تھی تو وہ دراصل اردو ہی تھی''۔

اردو نثر میں دورِ حاضر کی مقبول ترین صنفِ سخن اردو افسانہ، اردو کے افسانہ نگار منشی پریم چند کی اردو افسانوی مجموعے حب الوطنی اور ہندوستانیوں کے مسائل کی عکاسی سے لبریز نظر آتے ہیں، جس کا عین ثبوت ان کے کئی افسانوں پر پابندی کا عائد ہونا اور اردو افسانوی مجموعوں کا ضبط ہونا ہے، 'دنیا کا انمول رتن' اس کی بہترین مثال ہے کہ جس میں وطن کی آزادی کی خاطر ہی بہائے گئے خون کے قطرے کو 'انمول رتن' قرار دیا ہے۔ جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے، اقبالؔ کی شاعری حب الوطنی سے لبریز حسرت موہانیؔ، مجازؔ لکھنوی جیسے وطن پرست شعراء نیا پنی شاعری سے لوگوں کے انگریز مخالف جذبات کو اُبھار کر مجاہدینِ آزادی کے دلوں میں ایک جنون پیدا کیا، یہ وہ دور تھا جب اردو شاعری میں انقلاب کی آگ نظر آ رہی تھی۔

جلال آتش برق شہاب پیدا کر
ازل بھی کانپ اٹھے وہ شباب پیدا کر

تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو خود انقلاب پیدا کر

اردو ادب و شاعری نے ہندوستانیوں کو وہ سلیقہ دیا جس سے سوئے ہوئے اور مایوس لوگوں میں امید کی شمع روشن ہوگئی۔ایسیا ردو ادیبوں اور شاعروں کی طویل فہرست ہے۔جنھوں نے اپنی تحریروں، مضامین، اور اشعار کے ذریعے آزادی کے جذبے کو سرگرم رکھنے کی کوشش کی، اور ان ادباء اور شعراء ؔ برطانوی حکومت کے خلاف جہاد کیا، جانی و مالی ہر طرح کی قربانیاں پیش کی، بلکہ اپنی جانوں کے نذرانے بھی پیش کئے۔ان کی تحریروں، کتابوں، اور اخبارات ورسائل کو ضبط کیا گیا مگران آزادی کے متوالے، مجاہدینِ اردو نے سرِ تسلیم خم نہیں کیا۔اردو نے تحریک آزادی میں جو کردار ادا کیا اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔گاندھی جی نے بھی تحریک آزادی کے وقت جس 'ہندوستانی' زبان کی وکالت کی وہ اُردو کے ہی زیادہ نزدیک دکھائی پڑتی ہے۔

اردو زبان وادب کے جتنے بھی گوشے یا شعبوں کی طرف نگاہ کی جائیں گی، ان سب میں ہندوستان کی علمی و ادبی، سیاسی وسماجی، تہذیبی وتمدنی، معاشی و معاشرتی، اخلاقی واقداری، اقتصادی وثقافتی، مذہبی وملّی، قومی و وطنی وغیرہ جیسے عناصر بہ کثرت مل جائیں گے۔گوکہ اردو زبان میں ہندوستانی سماج کی کامیابی اور ترقی کے راز مضمر ہے۔ایسے ہی ہم اگر ہندوستانی سنیما کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس نے بھی اس وقت جنم لیا جب اردو ہندوستان کی سب سے بڑی زبان تھی۔اور یہ ایک سب سے بڑی حقیت بھی ہے کہ ہندوستانی سنیما کی مادری

زبان بھی اردو ہی ہے۔اور اردو نے ہی ہندوستانی سنیما کو بولنا سکھایا۔

بھارت کی پہلی فیچر فلم 'راجا ہریش چندر' دادا صاحب پھالکے کی ہدایت کاری میں تیار ہوکر 1913ء میں عوامی نمائش کے لئے ریلیز کی گئی، یہ ایک خاموش فلم تھی، 1913ء سے لے کر 1930ء تک بننے والی فلموں کی تعداد زیادہ تر خاموش ہی رہی ہے۔دراصل ہندوستان میں جدید سنیما کا ارتقاء اسی دور میں تیز ہو رہا تھا جب اردو ادب میں ترقی پسند رجحانات تیزی سے داخل ہو رہے تھے۔اور یہی وہ دور تھا جب ہندوستانی سیاست میں تحریکِ آزادی کی لہر شدد اختیار کر رہی تھی۔1936ء سے اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہو گیا اور بڑی تعداد میں ادیب، شاعر اور دانشور اس تحریک سے متاثر ہوتے گئے۔1942ء سے گاندی جی نیہندوستان کی مکمل آزادی کے لیے اپنی لڑائی تیز کر دی اور "انگریزو! بھارت چھوڑو" کا نعرہ بلند کیا۔جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ اسی کے ساتھ اردو کے نعرے "انقلاب زندہ باد" سے پورے ملکِ ہندوستان کا ماحول گرما گیا۔یہ بڑا ہی پر آشوب زمانہ تھا جب ہندوستانی سنیما، تحریک آزادی اور ترقی پسند تحریک دونوں سے ایک ہی وقت میں متاثر ہو رہا تھا۔ترقی پسند تحریک سے وابستہ اور متاثر کہانی کار، نغمہ نگار، فلمساز اور ہدایت کار فلم انڈسٹری سے اپنا تعلق جوڑتے جا رہے تھے۔ان میں سب سے اہم محبّانِ اردو منشی پریم چند، احمد عباس، سعادت حسن منٹو کرشن چندر، ساحر لدھیانوی، راجندر سنگھ بیدی، وشوامترا عادل، مجروح سلطانپوری، جان نثار اختر، نجم نقوی، راجہ مہدی علی خان، عصمت چغتائی، سردار جعفری، اختر الایمان، کیفی اعظمی، حسرت جے پوری، رامانند ساگر ضیا سرحدی وغیرہ اور ایسے کتنے ہی اہم نام ہے جو ہندوستانی

فلموں سے وابستہ ہوتے چلے گئے۔اور یہی وہ لوگ تھے جو اردو ادب میں بھی ترقی پسند رجحانات کے ساتھ اپنی بہترین تخلیقات پیش کر رہے تھے۔فلموں کے لیے اردو ادیبوں کے لکھے مکالمے نہ صرف بہت پُر اثر ہوکرتے بلکہ اپنا دیرپا اثر چھوڑ جاتے،اور بعض اوقات تو ضرب المثل بن جاتے۔مثلاً فلم پاکیزہ سے''آپ کے پاؤں دیکھئے، بہت حسین ہیانھیں زمین پرمت اُتاریئے گا، میلے ہوجائے گے''۔فلم وقت سے "جن کے گھر شیشوں کے ہوں، وہ دوسروں پر پتھر نہیں پھینکا کرتے"۔وغیرہ اس طرح کے بے شمار اردو کے مکالمے آج بھی لوگوں کے ذہن میں محفوظ ہیں اور یاد کیے جاتے ہیں۔یہی نہیں جب بھی ہندوستانی سنیما میں اردو ادب کا ذکر ہوگا،فلمی نغمہ نگاری سے خالی نہ ہوگا،جس کے لئے ایک مستقل کتاب درکار ہے،اگر مختصراً ذکر کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو ادب سے وابستہ کئی بڑے شاعروں نے ہندوستانی فلموں کو بے حد معیاری اور مقبول ترین گیت دیے ہیں۔ساحر لدھیانوی،مجروح سلطانپوری، جان نثار اختر،نجم نقوی، راجہ مہدی علی خان ، سردار جعفری،اختر الایمان، کیفی اعظمی، حسرت جے پوری،کیف بھوپالی، اسد بھوپالی،قمر جلال آبادی،شکیل بدایونی اس طرح کئی ایسے اردو کے نامور شعراء ہے جنھوں نیفلمی نغموں میں اردو ادب کا معیار برقرار رکھا۔یوں تو ابتداء سے ہی اردو ادب کا گہرا رشتہ ہندوستانی سنیما سے رہا ہے، اور جب بھی اردو اور ہندوستانی فلموں کا ذکر آئے گا ذہن میں اردو مکالموں کے الفاظ اور نغمے گونجنے لگتے ہیں۔نہ جانے کتنے ہی اداکاروں کی حرکات وسکنات، اداکاری جذبات سے پُر مناظر ذہن میں اُبھرنے لگتے ہیں۔ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اپنی تمام تر نیرنگیوں کے ساتھ جلوے دکھانے لگتی ہے۔پس مذکورہ بالا تمام تر دلائل یہ

ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اردو کے بغیر ہندوستانی سنیما کا تصور ممکن نہیں، اور اور جب بھی ہندستان کی تحریکِ آزادی کا ذکر کیا جائے گا تو پھر یہ کیسے ممکن ہوگا کیاردو اور ہندوستانی سنیما اس تحریک سے محفوظ رہے اور یہی وجہ ہے کہ جب ہمارا ملک انگریزوں کا غلام تھا، ہندوستان میں " آزادی میرا پیدائشی حق ہے۔ اور میں اسے لے کر رہوں گا۔" کے نعرے بلند ہورہے تھے۔ اور اس حق کو حاصل کرنے یا چھینے کے لیے ہمارے جن دیش واسیوں نےتحریکِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ،اور اپنی جان کی بازی لگا کر ہندوستان کو آزاد کروانے گولیاں اور لاٹھیاں کھانے والے، پھانسی کے تختوں پر ہنستے ہنستے جھول جانے والوں میں طلباء، تاجر، سرکاری غیر سرکاری ملازمین، اساتذہ، شعراء، ادباء اور صحافیوں کے ساتھ ساتھ فن کار بھی شامل تھے جو بھارت کی آن پر قربان ہوگئے، شہید ہوگئے اور جو بچ گئے وہ غازی۔ اور انھیں غازیوں میں ہماری فلمی دنیا کے نامور ہدایت کار، موسیقار، نغمہ نگار اور اداکار شامل ہے۔

یہ وقت ہی ایسا تھا جب ہر ہندوستانی اپنی جان کی بازی لگا کر ہندوستان کو آزاد کروانے کی ہر ممکن کوشش کررہا تھا۔ اور وہ بھی ایسے دور میں جب ہر طرف انگریزوں کیظلم وتشدد کا بازار گرم تھا اور ان کے خلاف بغاوت میں حصہ لینے پر سخت سزائیں دی جارہی تھی۔ ایسے حالات میں حب الوطنی پر فلمیں بنانا دشوار گذار مرحلہ تھا۔ تب ہمارے فلم سازوں نے بھی اپنی فلموں کے ذریعہیم وطنوں کے ساتھ آزادی کی لوکو تیز کرنے میں اہم کردار نبھایا ہے۔ ابتداء سے ہی ہندوستانی فلموں میں تحریکِ آزادی کے نقوش نمایا ہونے لگے تھے، اس وقت ہماری فلموں میں ہندوستان کی آزادی کی تحریک کیاثرات کم نظر آنے کی سب سے اہم وجہ انگریزوں کے ذریعے

پریس سینسر شپ عائد کر دیا گیا تھا اور اس کے دائرہ کار میں ہندوستانی سنیما کو بھی جکڑ لیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جب کوئی فلم ساز تحریک آزادی کے موضوع پر کوئی فلم بنا بھی لیتا تو اس کی نمائش پر پابندی لگ جاتی۔ پھر بھی وطن کی محبت میں ہمارے فلمسازوں نے ایسی صورت میں ایک ترکیب نکالی، اپنے جذبہ وطنی اور ہندوستانیوں میں حب الوطنی کو بیدار کرنے کے لیے گیتوں کا سہارا لیا۔ جن کو سن کر لوگوں دل ملک کی محبت کے جذبوں سے سرشار ہو جاتے، اور انگریزوں سے مقابلہ کرنے کا نیا جوش وجذبہ پیدا ہو جاتا۔ 'جنم بھومی' اور 'بندھن' ایسی کئی فلمیں منظر عام پر آئی جن کے گیت سن کر لوگ وطن عزیز کی محبت میں ڈوب جایا کرتے تھے اور قومی جذبے سے سرشار ہو جایا کرتے تھے، یہ فلمیں جن کا ذکر کیا جا رہا، یہاں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ ان فلموں اور گیتوں کا تعلق بھی براہِ راست و بالراست اردو سے ہی رہا ہے جس کی ایک چھوٹی سی مثال یہ کہ سہراب مودی کی فلمیں 'سکندر' اور 'پکار' ایسے خوجہ احمد عباس کی فلم 'دھرتی کے لال' وغیرہ۔

1946ء کے آغاز کے ساتھ ہی ملک میں آزادی کی کرنیں دکھائی دینے لگی تھیں اور آزادی کے شہدائی اور متوالوں کے خلاف انگریزوں کا ظلم وستم شدد اختیار کر رہا تھا، لیکن پھر بھی ہمارے فلم ساز ایسی فلمیں بنانے سے پیچھے نہیں ہٹیاور ساتھ ہی نغمہ نگار اپنے الفاظوں کے تیر چلانے سے باز نہیں آئے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی سے پہلے نمائش ہونے والی کچھ ایسی فلمیں ہے جن میں آزادی کی جدوجہد اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار نظر آتی ہیں۔

1947ء کو ہمارا ملک آزاد ہو گیا، ملک کی آزادی کے ساتھ ہی فلم والوں کو

بھی اپنی مرضی کے موضوعات پر فلم بنانے کی آزادی ملی۔۔اور بڑی تیزی سیتحریکِ آزادی اور حب الوطنی کے موضوعات پر فلمیں بننے لگی۔ملک کی آزادی کے بعد اس نوعیت کی پہلی فلم "شہید" آئی،اس فلم فلم کا گیت

"وطن کی راہ میں وطن کے نوجواں شہید ہو" جس کے گلوکار محمد رفیع تھے،اس گیت پر اس وقت ناظرین رویا کرتے تھے اور آج بھی یہ گیت سن کر دل بھر آتا ہے،وطن سے محبت کا کوئی بھی موقع ہو یا کسی بھی قومی تقریب پر ہمیں یہ نغمہ اپنے خوبصورت بول کے ساتھ سنائی دیتا ہے۔ایسی ہی ایک فلم 'ہندوستان ہمارا' اس فلم کا گیت اردو کے شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ اقبال کا لکھا" سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا" تھا اور ترانہ ہندی کے نام سے جانا جاتا ہے۔اسی طرح فلم 'جلیان والا باغ'، 'جاگرتی' ،'شہیدِ اعظم بھگت سنگھ'،'جھانسی کی رانی'،' کرانتی' وغیرہ،ایسی ہی فلمیں ہے جنھوں نے ہندوستانیوں کو ملک کی آزادی کے بعد تحریکِ آزادی کو سمجھانے میں اہم کردار نبھایا ہے۔ان تمام دلائل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے ہدایت کاروں، موسیقاروں، نغمہ نگاروں اور گلوکاروں نے خاموش دور سے لے کر متکلم عہد کی ہندوستانی فلموں سے تحریکِ آزادی کی عکاسی کرنے اور مجاہدینِ آزادی کو اپنا خراجِ عقیدت پیش کرنے میں اپنی نیک نیتی ،لگن،خلوص اور محبت کا ثبوت دیا۔ جدوجہدِ آزادی اور مجاہدینِ آزادی پر فلمیں بنائی ،گیت لکھے اور گیت گائے ہیں جس نے تحریک آزادی کے متوالوں کو اور محبّانِ وطن کو جوش وخروش سے لبالب بھر دیا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ہندوستانی فلموں کے مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ اردو زبان ہے ، بلکہ اردو کو ہندوستانی سنیما کی مادری زبان کہنا بیجا نہ ہوگا، کیونکہ

ہندوستانی فلموں کو اردو نے ہی بولنا سکھایا۔ ہندوسانی فلموں میں مستعمل اردو زبان و بیان ،مکالموں اور نغموں نے ہندوستانی فلموں کو وہ مقام عطا کیا ہے۔ جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔اور یہ اردو زبان ہی ہے جس نے اپنے تشکیلی دور سے لے کر عروج تک اور عروج سے لے کر موجودہ دور تک کسی بھی سطح پر ہندوستانی ماحول ، معاشرے اور مشترک مزاج اور سماج سے بے نیاز نہیں ہوئی ہے اردو شروع سے ہی سب کے ساتھ مل کر اور سب کو ساتھ لے کر چلتی رہی ہے اس کے مزاج اور خمیر میں یہ بات شامل ہے۔اس کے تشکیلی عناصر ہی ہندو مسلم ہندی اور ہندوستانی ہیں یہ اخوت ومحبت کی زبان ہے اور اتحاد و اتفاق کی علامت بھی، وطن دوستی، وطن پرستی، مساوات، رواداری اور قومی یکجہتی کی ضمانت بھی، اس کا ادب، اس کی شاعری اسی کی ترجمان ہے۔ اردو زبان کی تشکیل اور ارتقا میں ہندوستانی کلچر ہے جس میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو، سکھ، عیسائی اور دوسرے مذہب کے لوگ بھی بہت فعال رہے ہیں۔ اردو شاعروں اور مصنّفین نے اس تحریک کو تیز کرنے میں اپنا بھرپور تعاون دیا ہے۔ تحریک آزادی کے وقت مذہبی اتحاد، بھائی چارہ، آزادی اور وطن پرستی کی ایسی جھنکار اردو شاعری میں سنائی پڑتی ہے جس نے انقلاب کی شمع ہندوستانیوں کے دلوں میں جلا دی۔ گویا اردو نے ہندوستانی تہذیب، ثقافتی، معاشرتی، تمدنی زندگی کو ہم نوا بنالیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی اور جہاں بھی ملکِ ہندوستان کا ذکر ہوگا، چاہے ہندوستان کی تحریکِ آزادی کا یا پھر ہندوستانی سنیما کا، زبانِ اردو کے بغیر نامکمل ہوگا۔

☆☆☆☆☆

جدو جہد آزادی ہند میں دارالعلوم دیو بند کا حصہ

ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ

اسسٹنٹ پروفیسر، پی این کالج، ناندیڑ

ہندوستان میں جب مغلیہ سلطنت کا چراغ گل ہو رہا تھا اور کچھ برس کا عرصہ ہو چکا تھا وہیں پر ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی کوشش تھی کہ ملک کو آزادی دلانے کے لیے ہو رہی تھی۔ ہر کوئی ملک کو آزاد کرنے میں اپنا حصہ، تعاون دے رہا تھا اور جو بھی کوشش کر رہے تھے ان کو تختہ پر لٹکا دیا جا رہا تھا یا پھر انھیں ختم کر دیا جا رہا تھا یا پھر انھیں جلاوطن کر دیا جا رہا تھا۔ وہ کوشش کر رہے تھے ان میں ایک جماعت علماء اکرام کی تھی۔ اس پر شکن دور میں اچھی زندگی اور آزادانہ زندگی کو بحال بنانے کی ضرورت پڑی۔ اسی کے پیش نظر علماء کی کوشش تھی کہ ایسا مذہبی آزاد تعلیمی مدرسہ کی ضرورت محسوس کرے یہاں مسلمانوں کی صحیح دینی و مذہبی رہنمائی کا کام انجام دے سکے۔

چند بزرگ علماء نے جس کے رہنما محمد قاسم نانوتوی تھے انھوں نے ملکر 15 محرم الحرام 1283ھ مطابق 1867 کو دیو بند میں ایک چھوٹی سی مسجد کے پاس ایک درخت کے نیچے ہی مدرسہ دارالعلوم دیو بند قائم کیے اور اس کا افتتاح کیا گیا۔

دارالعلوم دیو بند کے بانیوں نے اپنے مدرسے کو قائم کر کے بہت سے مسلمانوں کو ایک ایسا مستحکم و مضبوط درگاہ کی بنیاد رکھی۔ اس مدرسہ میں مسلمانوں کے یہاں اور مذہبی حفظ کے لیے بھی برابر کوشش کرتے رہے۔ اور ہندوستان میں پیش آنے والے برے حالات اور یہاں پر یشانیوں، دشواریوں اور مصائب و آلام کو بھی

خوش آمدید کیا۔

1857 میں حاجی امداد اللہ صاحب کی قیادت میں مولانا محمد قاسم نانو توی، مولانا عبد الغنی، مولانا محمد یعقوب صاحب اور مولانا رشید احمد گنگوی صاحب نے اور بہت سے علماء نے انگریزوں کے خلاف آزادی ہند کی جنگ چھڑ گئی۔ یہ جنگ ضلع مظفر نگر کے شاملی کے میدان میں ہوئی۔ اس جنگ کے کمانڈر حاجی امداد اللہ رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ ان کا شمار عالم اسلام کے بہت بڑے عکابیر اولیاء اللہ میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اس جنگ کی شروعات ان کے ہاتھوں سے ہوئی۔ اس جنگ میں ان کے ساتھ حضرت حافظ محمد صاحب بھی اس جنگ میں شریک تھے اور بہت سے علماء دیوبند اسی جنگ میں حصہ لیے تھے۔ مگر مسلمانوں کے پاس اصلحہ اور سامان کی کمی کی وجہ سے مسلمان یہ جنگ ہار گئے اور اسی جنگ کے دوران محمد حافظ اللہ رحمتہ اللہ علیہ شہید ہو گئے۔ یہ جنگ مسلمان جیت نہ سکے وہ یہ جنگ ہار گئے مگر اس جنگ میں انگریزوں کا بہت سا نقصان ہوا اور کچھ انگریز بھی مارے گئے اور اس نقصان کا انتقام لینے کے لیے انگریزوں نے ملکر وہاں ے تھانہ پر گولہ باری کر کے وہاں پر مسلمانوں کا بہت بڑا نقصان کر دیا اور وہاں حملہ کر دیا اور مسلمانوں کی ایک جماعت کمزور ہو گئی اور تمام مجاہدین بھی کمزور پڑ گئے اور یہ نقصان بہت بڑا نقصان تھا اور پھر حاجی امداد اللہ رحمتہ علیہ نے فیصلہ کیا کہ اب ہمیں ایسے حالات میں یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ اس طرح انھوں نے ہجرت کا رخ کیا اور مکہ محرمہ میں قیام پذیر ہو گئے۔ اور وہیں پر ان کا انتقال ہو گیا اور وہ اپنے حقیقی مالک سے جا ملے اور ایک بہت بڑے علمائے دین اسلام مولانا محمد قاسم نانا توی نے بھی اس جنگ آزادی میں اپنا حصہ دیا اور انھوں نے

بھی اس جنگ مین مجاہدین کی قیادت کی اور یہ جنگ کی ناکامی کے بعد انگریزان کے دشمن بن گئے اور انھیں گرفتار کرنے کا حکم بھی دیا اور ان کی گرفتاری پر انعامات بھی رکھے گئے۔مگر وہ گرفتار نہ ہوسکے اور پردہ پوش ہوگئے جبکہ وہ صرف تین دن ہی چھپے رہے پھر وہ نکل کر آزادانہ گھومنے پھرنے لگے لوگوں نے انھیں مزید چھپے رہنے کا اسرار کیا مگر وہ لوگوں کی باتین نہ سنی انھوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ اسلام میں تین دن سے زیادہ چھپے رہنے کی ممانعت ہے اور اس سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی غار حرہ میں تین دن ہی چھپے تھے اور وہ نکل کر آزادانہ طور پر گھومنے پھرنے لگے ان کی وفات بھی دیو بند میں ہی ہوئی۔اور اس جنگ میں مولانا رشید احمد گنگوی بھی شامل تھے وہ اس اس جنگ کے بعد ان کو انگریزوں نے گرفتار کرلیا تھا۔اور بعد میں نو ماہ کے بعد ہی رہا ہوگئے۔

مدرسہ دیو بند ایک ایسا تعلیمی، مذہبی مدرسہ بن گیا جہاں پر ملک کی آزادی میں سرگردی شروع ہوئی اور یہ ایک چھوٹے سے مدرسہ سے جو انگریزوں کے خلاف بغاوت کا پہلا کارنامہ تھا۔اس مدرسہ کا اہم مقصد یہ تھا کہ مسلمان انگریزوں کی تمام چال بازیوں اور ان کی مکاریوں سے بچے اور ملک کی آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔

مولانا نانا توی کی یہ خواہش تھی کہ مسلمان جنگ آزادی میں آگے آئے اور ملک سے وفاداری کرے ان کو انگریزوں کے وفاداروں سے بہت چڑھ تھی مولانا رشید احمد گنگوی نے تو یہ فتوی دے دیا تھا کہ ''ہندوستان دارالحرب ہے'' اس کا صاف صاف یہ فیصلہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمان انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے کے لیے تیار رہے اور یہ جنگ جاری رہے گی۔ ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس لڑائی

میں مکمل طور پر آگے آئے اور جنگ آزادی میں حصہ لیاس دوران مولانا رشید احمد گنگوی کا انتقال ہوگیا۔

مولانا رشید احمد گنگوی رحمتہ اللہ علیہ کے بعد دارالعلوم دیوبند کی سرپرستی شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے سنبھالی یہ وہ دور تھا اس دوران ہندوستان میں نئی سیاسی بحران شروع ہو چکا تھا اور بہت سے ملک کے نوجوانوں نے ہتھیاروں کا استعمال عام ہو چکا تھا اور ملک کے ہر نوجوانوں کو قتل کیا جارہا تھا۔انگریزوں کے خلاف نعرہ لگا رہے تھے اور ان کے خلاف مضامین شائع ہورہے تھے۔خفیہ تنظیمیں چل رہی تھی اور ہندوستان کے لوگوں سے ہتھیاروں کو لے لیا جارہا تھا اور ملک میں پیسوں کی بھی کمی کا مسئلہ بڑھ رہا تھا اور ایسے برے حالات میں مولانا محمود الحسن نے سوچا کہ جنگ شروع کرنے کے لیے ساز وسامان کی زیادہ ضرورت پڑے گی اور وہ کسی دوسرے ملک سے امداد طب کرنا چاہ رہے تھے اور ہندوستان سے قریب افغانستان کی سرحد ملی ہوئی ہے۔اس وجہ سے وہ اس ملک سے امداد لینا سب سے آسان سمجھا تھا۔اس طرح وہ افغانستان کے قبائیلیوں سے مدد لی اور اس میں انھوں کامیابی بھی ملی۔

افغانستان کے لوگ ہندوستان آنے جانے لگے اور یہیں پر وہ تجارت کرنے لگے اور یہیں پر قیام پذیر ہونے لگے اور انگریزوں کو ملک سے باہر کرنے کے لیے جنگ کا ارادہ کرنے لگے اور یہیں سے ریشمی رمال تحریک اور غالب نامہ تحریک کا آغاز ہوا۔

ہندوستان کی جنگ آزادی میں علماء دیوبند کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اس مدرسہ کے تمام علماء نے دیوبند کا نام بہت بلند کیا۔انھوں نے جنگ

آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا آج بھی یہ دیو بند دنیا کا بہت بڑا علمی، ادبی اور مذہبی کارنامہ مانا جاتا ہے جہاں پر ہزاروں لوگ فیض آب ہو رہے ہیں اور عالم، فاضل، عاقل، مفتی و مبلغ ، بن کر نکل رہے ہیں۔جس مدرسہ میں ابتداء میں درختوں کے سائے میں تعلیم ہوتی تھی۔ جہاں دھوپ، بارش سے بچے کے لیے چھت تک نہ تھی ایک بے بنیاد مدرسہ سے کچھ لوگ بزرگوں کے سامنے قرآن اور دینی تعلیم حاصل کر رہے تھے یہی مدرسہ انگریزوں کے خلاف ایک ایسی تنظیم کرے گا اور یہاں کے علماء، طلباء اس سرگرمی میں شامل ہو کر جنگ میں حصہ لیں گے یہ ایک ایسا مدرسہ تھا جہاں سب سے پہلے انگریزوں کے خلاف نشانہ سادھا تھا اور انگریزوں کو ملک یعنی ہندوستان سے نکالنے کے لیے کوشا تھا اور بہت سے علماء نے اس میں اپنی جانیں قربان کر دی۔ 170 ایکڑز پر موجود یہ ادارہ آج بھی اپنی شان آن اور بان کی اہمیت رکھتا ہے۔اور اس ادارے میں دنیا کے بہت بڑے طبقے کے لوگ اس مدرسے کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں اور پی ایچ ڈی اسکالر، ایم فل اسکالر اس ادارے کی لائبریری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔دارالعلوم دیو بند کے بارے میں چند صفحات پر لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ یہ ایک ایسا قول ہے جیسے کہ آسمان کو دیا دکھایا جائے۔

☆☆☆

تحریک آزادی ہند میں

مراسلات، مکتوبات اور اعلانات کی اہمیت

ڈاکٹر قمر صدیقی

اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی، ممبئی

1857 کی بغاوت اچانک بھڑک اٹھنے والی آگ اور یک بیک اٹھنے والا طوفان نہ تھی بلکہ یہ بغاوت انگریزوں کے جبر واستبداد کے خلاف اردو شعرا و ادبا کی مسلسل کوششوں کا نتیجہ تھی۔ یہ بغاوت کوئی جنگ ملغوبہ بھی نہ تھی بلکہ بہت حد تک منظّم طریقے سے لڑی گئی تھی۔ اب یہ الگ بات ہے کہ ہندوستانیوں کو اس بغاوت میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس ناکامی کے اسباب وعلل کیا تھے یہ ایک الگ بحث ہے لیکن اس میں کلام نہیں کہ آزادی کی یہ لڑائی باقاعدہ اور منظّم طریقے سے لڑی گئی۔ لڑائی کے منظّم ہونے کے ثبوت وہ فرامین، دستاویزات اور اس وقت کے اخبارات میں شائع ہونے والے وہ اعلانات ہیں جو اس بغاوت سے متعلق تھے۔ ان فرامین و اعلانات میں جو زمانے کی دستبرد سے بچے رہ گئے وہ انڈین نیشنل آرکائیوز، دہلی میں محفوظ ہیں۔ ان فرامین میں بہادر شاہ ظفر کے وہ احکام بھی ہیں جو انھوں نے جنگِ آزادی کے ایام میں درخواستوں اور مراسلوں کی صورت میں تحریر کئے تھے اور جن کو بہادر شاہ ظفر کے مقدمہ میں بطور ثبوت ان کے خلاف پیش کیا تھا۔ یہ فرامین بیشتر

اردو میں تھے۔انھیں فرامین میں والئی اودھ کا ایک فرمان اردو اور دیوناگری رسم الخط میں بھی ہے۔اس فرمان میں عوام کو انگریزوں کے خلاف مختلف پہلوؤں سے غلامی کا احساس دلاکر بغاوت پر ابھارا گیا تھا۔ اس طرح کے کئی احکامات اردو میں سپہ سالاروں اور فوج کے اعلیٰ حکام کی جانب سے اپنے ماتحتوں کو بھیجے گئے تھے۔مثلاً انڈین نیشنل آرکائیوز، نئی دہلی میں محفوظ ایک فرمان جس پر دو مہریں، ایک مہر کچہری اول بادشاہی اور دوسری مہر سپہ سالار بہادر کی ہے اور اس پر سنہ ۱۲۷۳ھ درج ہے۔ یہ فرمان افسران پلٹن ورسالہ وتوپخانہ وغیرہ کے نام تھا۔اس کا متن کچھ اس طرح ہے:

''تم کو لکھا جاتا ہے کہ اس وقت حکم حضور پرنور کا آیا کہ جو پلٹن اور رسالہ وتوپخانہ مورچہ کو سر کریں گے اوس پلٹن اور رسالہ کو تنخواہ کے سوائے انعام بہادری کا ملے گا۔ اب سب سرداران اور سپاہیان کو چاہئے کہ تم سب لوگ دل و جان پیش کر کے اس مورچہ کو فتح کرو اور حضور پرنور سے انعام بہادری کا پاؤ۔اس میں دیری نہ ہو، تاکید جانو مکرر یہ کہ جو شخص کہ لڑائی میں جوجہ جاوے گا (شہید ہوگا) اس کے وارثانِ حقیقی کی بخوبی پرورش ہوگی۔''

اسی طرح کے ایک دوسرے فرمان میں افسران وپلٹن ورسالہ کے نام حکم صادر ہوا کہ:

''دیکھتے ہی اس حکم نامے کے سب تیار کر کے اور کشمیری دروازہ کے حاضر ہو کر مالفانِ ناہنجار وکفرانِ بدافعال پے دھاوا کرو۔''

اس طرح کے حکم نامے اور فرامین کے ساتھ ساتھ تحریک آزادی میں وہ

مکتوبات بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں جن کے ذریعے والیانِ ریاست نے باہم جنگِ آزادی کے سلسلے میں پیغام رسانی کی تھی۔ حالانکہ اس قسم کے مکتوبات محفوظ نہ رہ سکے تاہم نانا صاحب فرنویس کا ایک خط دستیاب ہے۔ یہ خط اردو میں ہے اور اس میں ان کے جنگِ آزادی کے عزم کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

''جان یک روز کبھی جائے گی پر اس طرح عزت کھو کر کیوں مرنا اور ہم سے لڑائی و جنگ جب تک رہے گا، ہم چاہے مارے جائیں، چاہے قید ہوں، چاہے یہاں سے جو لکھا ہوگا سو ہوگا اور ہم سے جو کچھ ہوگا سو تلوار سے ہوگا۔''

اس کے علاوہ جنگِ آزادی میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کا ایک موثر ذریعہ جہاد کا فتویٰ بھی تھا۔ بخت خاں نے اپنے اختیارات اور اثر و رسوخ کے ذریعہ اس وقت کے علماء سے ایک فتوٰی جہاد کا مرتب کروایا۔ فتویٰ کے اجرا کے بعد مسلمانوں میں جنگ آزادی کے لیے مذہبی جوش اور ولولہ پیدا ہونا فطری امر تھا۔ فتویٰ اردو میں مرتب ہوا تھا اور ''اخبار الظفر''، دہلی میں شائع ہوا تھا۔ پھر اس کی نقل انہی دنوں ''صادق الاخبار''، دہلی، مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ئمیں چھپی تھی۔ اس کے علاوہ دو اشتہار حیدرآباد دکن کے انقلابیوں نے بھی مشتہر کئے تھے۔ ایک میں مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف جہاد کی ترغیب دی گئی تھی اور دوسرے میں امرا کو مخاطب کیا گیا تھا۔

پہلی جنگِ آزادی کی باضابطہ ابتدا ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے ہوئی لیکن اردو اخبارات میں اس ہلچل اور ہنگامے کے اظہار کا سلسلہ پہلے ہی سے جاری تھا اور یہی ہلچل اس پہلی جنگ آزادی کے عزم و حوصلہ کا موجب بنی۔ اس کا اعتراف خود انگریز

حکومت کے سرکردہ عہدہ داروں نے کیا ہے۔اس وقت کے گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے اردو اخبارات کے تعلق سے کہا تھا کہ:

''اردو اخباروں نے خبریں شائع کرنے کی آڑ میں ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ حد تک بغاوت کے جذبات پیدا کئے۔یہ کام بڑی مستعدی، چالاکی اور عیاری سے انجام دیا گیا۔''

اسی طرح گارساں دتاسی نے بھی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے لیے اردو اخبارات کو ہی ذمہ دار قرار دیا ہے۔اس میں حقیقت بھی ہے مثلاً اس وقت قلعہ معلیٰ سے نکلنے والا ''سلطان الاخبار'' اپنی ۱۲ اپریل ۱۸۵۷ء کی اشاعت میں تحریر کرتا ہے کہ:

''ان دنوں جتنے راجہ ہیں، سب نے بالاتفاق چٹھی اس مضمون کو تحریر کی ہے۔ جرات کی تقریر کی ہے کہ جو سرکار خلافتِ عہد و مواثیق، روسائے ہندوستان کی ریاست بجز لیتی ہے (اس سے) ایک تو خلقت بیکاری سے مرتی ہے، دوسرے بسی بسائی بستیاں سرکار ویران کئے دیتی ہے۔اس باعث ہم لوگوں نے باہم ہر ایک کو فساد پر آمادہ کیا ہے۔ ہمارا ملک اگر لیں گے، جان دینے کا ارادہ کیا ہے۔ خلافِ عہد و پیمان اگر ریاست لینے پر سرکار کو اصرار ہے تو یہاں بھی سرِ میدان ہر ایک جان دینے کو تیار ہے۔''

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا اردو اخبارات نے آنے والے انقلاب کے لیے زمین ہموار کی تھی لہٰذا ان اخبارات کی خبروں کا بغور مشاہدہ کیا جائے تو خبروں کی آڑ میں ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ حد تک بغاوت کے جذبات پیدا

کرنے کا عنصر کارفرما نظر آتا ہے۔ اس اعتبار سے ''صادق الاخبار'' زیادہ اہم ہے۔ اس اخبار کو دہلی سے مولوی سیّد جمیل الدین خاں نکالتے تھے۔ یہ نہ صرف دہلی کا سب سے بڑا اخبار تھا بلکہ دہلی سے باہر بھی بھیجا جاتا تھا۔ جمیل الدین خاں کو اخبار نکالنے کے لیے فرمان بہادر شاہ ظفر نے جاری کیا تھا۔ بلکہ اس زمانے میں دہلی سے جتنے بھی اخبارات شائع ہوتے تھے سبھی کو فرمان و اجازت بہادر شاہ ظفر ہی جاری کرتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے جنگِ آزادی کے خفیہ اخبارات کی بھی سرپرستی فرمائی۔ انھیں کی سرپرستی میں ''سراج الاخبار'' بھی شائع ہوتا تھا، جو دربار معلّٰی کا روزنامچہ ہوتا تھا۔

جنگِ آزادی کے آغاز کی سن گن بھی ان اخباروں میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ اپریل مئی کے کئی شماروں میں اس نوعیت کی خبریں مل جاتی ہیں۔ مثلاً ''صادق الاخبار'' اپنی ۲۰ اپریل ۱۸۵۷ء کی اشاعت میں لکھتا ہے:

> ''میرٹھ: وہاں سے ایک خط مورخہ آٹھ ماہِ حال سے معلوم ہوا کہ ان دنوں وہاں کوئی رات آگ لگنے سے خالی نہیں گزرتی۔ ایک بنگلہ کوارٹر ماسٹر، سرجنٹ رجمنٹ تین سواروں کا اور ایک خالی بنگلہ جل گیا۔ ۶ تاریخ بارک ماسٹر صاحب کا گودام جلادیا گیا۔ من جملہ معاملہ کارتوس نے سپاہ کے دلوں ایک آگ بھڑکا دی ہے۔''

ایسے واقعات دنیا پور، بارک پور، لکھنو، میرٹھ وغیرہ میں بھی رونما ہوئے تھے اور سپاہیوں نے اپنے باغیانہ جذبات کا ظہار مختلف انداز سے کیا۔ ان کی روداد اِن اخبارات میں موجود ہے۔ ''دہلی اردو اخبار'' مورخہ ۱۷ مئی ۱۸۵۷ء کے شمارہ میں انبالہ، میرٹھ، سہارنپور، روڑکی میں رونما ہونے والے حالات درج ہیں۔ اس کے

بعد ۲۴ مئی شمارہ سے دہلی کے تفصیلی اور دیگر شہروں کے اجمالی حالات کا علم ہوتا ہے۔

ہندوستان پر انگریزی اقتدار کیوں قائم ہوا؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کارل مارکس نے ۲۲ جولای ۱۸۵۳ء کے ''نیویارک ٹرائی بون'' کو ایک مراسلہ میں لکھا:

> ''مغلوں کی عظیم الشان طاقت کو مغل صوبے داروں نے پاش پاش کیا۔ صوبے داروں کی قوت کو مرہٹوں نے ٹھکانے لگایا اور مرہٹوں کا افغانوں نے خاتمہ کیا اور عین اس وقت جب یہ طاقتیں ایک دوسرے کو زک دینے کے لیے آپس میں دست و گریباں ہو رہی تھیں، تو برطانوی باشندوں نے جھپٹ کر سب کو اپنا مطیع بنالیا۔''

گویا کارل مارکس کا یہ تجزیہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ہندوستان میں انگریزی تسلط ہندوستانیوں میں باہمی اتحاد و اتفاق کی کمی کا نتیجہ تھا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی لڑائی پورے ملک نے مل کر لڑی تھی۔ قوم میں اس اتحاد و یکجہتی کو پیدا کرنے اور فروغ دینے میں اردو زبان و ادب نے بنیادی کردار ادا کیا تھا اور تحریک آزادی کا شاید ایسا کوئی گوشہ نہیں جسے اردو زبان و ادب نے منور و مجلیٰ نہ کر رکھا ہو۔

☆☆☆

جدوجہد آزادی ہند میں علمائے کرام اور مدارس کا کردار

ڈاکٹر قمر النسا۔ کے

صدر شعبہ اردو،

سری شنکراچاریہ یونیورسٹی آف سنسکرت۔ کالڈی، کیرلا

ہندوستان جنت شان کے مدارسِ اسلامیہ نے صرف جہالت و ناخواندگی سے نجات دلانے، دینی و علمی فنون کو عام کرنے اور ملتِ اسلامیہ کی قیادت اور رہنمائی کا فریضہ انجام دینے تک خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ ملک وملت کے وسیع تر مفاد میں بھی ان مدرسوں کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ بالخصوص برطانوی سامراج کے ظلم واستبداد اور غلامی ومحکومی سے نجات دلانے اور ابنائے وطن کو عروس حرّیت سے ہمکنار کرنے میں مدارسِ اسلامیہ اور علماء کی قربانیاں آبِ زر سے لکھی جانے کے قابل ہیں۔ مدارسِ اسلامیہ کے یہی وہ جانباز علمائے کرام تھے جنہوں نے ملک میں جدوجہد آزادی کا سور اس وقت پھونکا تھا جب ملک کے عوام ابھی خواب غفلت میں مست آزادی کی ضرورت و اہمیت سے نابلد اور احساسِ غلامی سے بے خبر تھے۔ بقول شخصے ؎

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موجِ تُند و جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

مگر یہ بھی ایک بڑا قومی المیہ ہے کہ پندرہ اگست کے اس تاریخ ساز اور

یادگار قومی دن کے مبارک و مسعود موقع پر ان مجاہدین آزادی کی قربانیوں کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جنہوں نے ملک کی آزادی کے خاطر قید و بند کی سعوبتیں برداشت کیں، ہر طرح کی اذیتیں اور جانثاری و سرفروشی کی ایسی مثالیں قائم کیں جن کی نظیر تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ان کی ان قربانیوں کو لوگوں نے یکسر فراموش کر دیا۔ اسی موقع کے لئے کسی شاعر نے کیا خوب کہا تھا۔

جب پڑا وقت گلستان پہ، تو خون ہم نے دیا
جب بہار آئی، تو کہتے ہیں ترا کام نہیں

اس بات سے عموماً لوگ بے خبر ہیں کہ ہندوستان میں تحریکِ آزادی کی داغ بیل حضرت ٹیپو سلطان شہید نے ڈالی تھی۔ انگریزوں کے خلاف جنگ چلنے والے پہلے جانباز حکمران ٹیپو سلطان شہید ہی تھے جنہوں نے ۱۷۹۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ملک میں جب انگریزوں کا اقتدار اور اثر و رسوخ بڑھنے لگا تو سب سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بڑے فرزند حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے ۱۸۰۳ء کو دلّی میں یہ فتوی دیا کہ :

''آج ہمارا ملک غلام ہو گیا ہے اور اس ملک کو آزاد کرانے کے لیے جہاد کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے''۔

یہ جرآت مندانہ اعلان اس وقت میں کیا گیا جب اس عالم دین کے علاوہ متحدہ ہندوستان میں کوئی قائد و رہنما ایسا نہیں تھا جو انگریزی حکومت کے مقابلے میں اپنی زبان سے آزادیٔ وطن کے لیے جہاد کا اعلان کر سکتا تھا۔ اس فتوے کی

پاداش میں حضرت شاہ عبد العزیز کو بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں۔ان کو زہر دیا گیا،ان کی جائداد ضبط کی گئی۔انہیں دلّی شہر سے در بدر کیا گیا۔مگر ان سخت ترین حالات میں بھی اس عالم دین کے حوصلے بلند رہے اور تادمِ مرگ وہ اپنے مقصد سے روگرداں نہیں ہوئے۔آپ کے بعد آپ کے دور وحانی شاگردوں سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید نے آزادیٔ وطن کی اس تحریک کو جاری رکھا۔پورے ملک کے دورے کیے اور مسلمانانِ ہند سے انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کا عہد لیا اور انہیں ایک فلیٹ فارم پر جمع کیا۔اسی کے نتیجے میں بالاکوٹ کے میدان میں ہزاروں مسلمان انگریزوں کی فوج سے برسرِ پیکار ہوئے اور اپنی جانیں وطنِ عزیز کے لئے قربان کردیں۔اس واقعے کے ٹھیک چھبیس سال کے بعد ۱۸۵۷ء میں دوبارہ آزادیٔ وطن کے لئے جہاد شروع ہوا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوئے لیکن مسلمان زیادہ تھے اور ہندو کم۔آزادیٔ وطن کے لیے یہ دوسرا جہاد بھی ناکام ہوا۔اس جہاد کی پاداش میں علماء کو گرفتار کیا گیا اور کچھ علماء کو نظر بند بھی رکھا گیا۔جب یہ علماء تین چار سال کے بعد جیل سے باہر آئے اور انہیں عام معافی کا اعلان ہوا تو انہوں نے بڑا عجیب وغریب منظر یہ دیکھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جو علمائے کرام شہید ہوئے ان کے یتیم بچوں کو انگریزی حکومت نے روٹی، کپڑا، مکان کا لالچ دیکر انہیں عیسائی بنانے کی خفیہ مہم چلا رکھی تھی۔چنانچہ عیسائی مشنریاں اس مقصد کے لیے میدان میں اتر آئیں اور اس خفیہ مہم کو پورا کرنے میں مصروف نظر آئیں۔ان حالات پر قابو پانے کے لیے علمائے کرام سر جوڑ کر بیٹھے اور انہوں نے یہ فیصلہ لیا کہ ملک میں آزادیٔ وطن کے لیے ایک ایسی درس گاہ بنائی جائے جہاں اپنے ملک کو آزاد

کرانے اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کیلئے مجاہدین کی جماعت تیار کی جائے۔ چنانچہ پہلی جنگ آزادی کے ٹھیک نو سال بعد ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی اور سب سے پہلے یہ تجویز منظور کی گئی کہ شہیدان وطن کے یتیم بچوں کو روٹی، کپڑا، مکان کے ساتھ دینی تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند برسوں کے اندر سمرقند و بخارا، تاشقند اور ہندوستان کے شہر شہر سے نوجوان لڑکے جمع ہونا شروع ہو گئے۔ اس ضمن میں علمائے کرام نے قوم کو یہ پیغام دیا کہ اگر یہ مدرسہ زندہ ہے تو آپ زندہ ہیں اور آپ کی اولاد زندہ ہے۔ آپ کے گھر میں اسلام زندہ ہے اور آپ آزاد ہیں۔

دارلعلوم دیوبند کے قیام سے ایک طرف ملک میں تعلیمی و دینی بیداری پیدا ہوئی تو دوسری طرف ایسے جانباز سپوت پیدا ہوئے جنہوں نے پورے ملک میں آزادیٔ وطن کی شمع روشن کی۔ دارلعلوم دیوبند کے ایسے ہی سپوتوں میں مولانا محمود حسن شیخ الہند کا شمار ہوتا ہے جو اس مدرسہ کے پہلے استاد بنے۔ مولانا موصوف بڑے دلیر تھے ان کے حوصلے پہاڑ کی طرح مضبوط تھے ہر دل میں وطن کی آزادی کے شعلے فروزاں تھے۔ آپ کی جواں مردی، شعلہ بیانی اور وطن پرستی سے خوف کھا کر انگریز گورنر مسٹن کہا کرتا تھا:

''اگر شیخ الہند محمود حسن کو جلا کر راکھ بھی کر دیا جائے تو ان کی راکھ کے اندر سے انگریز دشمنی کی بو آئے گی۔''

آزادیٔ وطن سے متعلق علمائے کرام کی اس تحریک کو ناکام بنانے کے کے لیے برطانوی سامراج نے علمائے کرام کو طرح طرح سے اذیتیں پہنچائیں ان کے

ساتھ جبر وتشدّد اور وحشت و بربریّت کا رویّہ اختیار کیا۔ مسلمانوں کو سور کی کھال میں لپیٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ فتح پور مسجد سے لال قلعہ کے دروازے تک انسانی لاشیں درختوں پر لٹکائیں۔ اس خوف وحراس بھرے ماحول میں تن کے گورے اور من کے کالے انگریزوں کے خلاف سب سے پہلے عالمِ جہاد بلند کرنے والے علامہ فضل الحق خیرآبادی تھے۔ جنھوں نے آزادیٔ وطن اور دین و مذہب کی حفاظت کے لیے انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کے فتویٰ جاری کیا۔ اس فتویٰ سے ملک بھر میں آزادیٔ وطن کی باقاعدہ لہر دوڑ گئی۔ علمائے کرام کے ساتھ عام مسلمانوں نے بھی اس جنگ میں دل و جان سے حصّہ لیا۔ اذیتیں برداشت کیں اور مسکراتے ہوئے اپنی جانیں قربانیں کر دیں۔

وطن کی آزادی کے خاطر جانباز علمائے کرام نے اپنی جان و مال کی جو قربانیاں دیں ان کا یہاں احاطہ کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اس موضوع پر با ضابطہ ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ غرض ملک کی آزادی کی اس جنگ میں علمائے کرام نے جو کردار ادا کیا اس سے متعلق ایک غیر مسلم رائٹر لکھتا ہے کہ ایک اندازے کے مطابق ۱۸۵۷ء میں پانچ لاکھ مسلمانوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ جو بھی مسلمان انگریزوں کے ہاتھ لگتا اُسے ہاتھی پر بٹھایا جاتا اور درخت کے نیچے لے جا کر پھانسی کا پھندا گردن میں ڈال کر ہاتھی کو آگے بڑھا دیا جاتا اور لاشیں درختوں پر جھول جاتیں۔ زبان منھ سے باہر نکل آتی مگر اس کے با وجود ہمارے علمائے کرام نے ملک کی آزادی کے خاطر نا اپنا قدم پیچھے ہٹایا اور نا انگریزوں کی گولیوں سے خوف کھائے بلکہ پورے جوش وخروش کے ساتھ مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش

کیا۔کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ۔

دنیا سے آج پوچھو پیچھے نہیں تھے ہم
انگریز لے رہا تھا جب امتحان ہمارا
ریلوں میں راستوں میں جیلوں میں محفلوں میں
نعرہ تھا ہم کو دے دو ہندوستان ہمارا

آج ہم آزادی کی جس خوش گوار اور پُر امن فضا میں زندگی کے لمحات بسر کر رہے ہیں یہ علمائے کرام ہی کے سرفروشانہ جذبات اور مجاہدانہ کردار کا نتیجہ ہے۔ انہیں کے مقدس اور محترم لہو سے شجرِ آزادی کی آبیاری و آب پاشی ہوئی ہے۔اگر ان علمائے کرام نے بروقت حالات کے طوفانی رخ کو بدلا نہ ہوتا تو آج ہندوستانی یہاں کس حال میں ہوتے وہ آپ خود بہتر جانتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

جنگ آزادی ہند میں اُردو صحافت کا کردار

پروفیسر ڈاکٹر شیخ عبدالوہاب
شعبہ اُردو، راشٹر ماتا اندرا گاندھی کالج جالنہ۔

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے یہاں مختلف ذات، مذاہب کو ماننے والے لوگ رہتے ہیں۔ ہندوستانی تہذیب گوناگوں رسم و رواج ،تہواروں، روایتوں، عقائداور نظریات کی خوب صورت امتزاج ہے۔ ہندوستانی روایتی رواداری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہاں مختلف مذاہب ،عقائد، رسم ورواج اورزبانیں ہونے کی وجہ سے ہر سطحہ پر اختلاف دکھائی دیتا ہے لیکن اس کے باوجود ہندوستانی عوام میں بدرجہ اتم یکجہتی اور یگانگت ہر طرف سے جاری ہے۔ ہندوستانی عوام باہمی رفاقت آپسی رواداری اور بھائی چارے کے جزئیات سے معمور ہیں۔

ہندوستانیوں کی اس خوبی کا انگریزوں نے پورا فائدہ اُٹھایا اور بذاتِ خود ہندوستانیوں کو اپنا نمک خوار بنا کر آہستہ آہستہ ان کے استعمال سے پورے ہندوستان پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کوئی لمحاتی حادثہ نہ تھا بلکہ انگریز فوج میں داخل ہندوستانی فوجیوں اورعوام کی سمجھ میں انگریزوں کی مکروہ حکمت عملی اس وجہ سے آ گئی تھی کہ انگریزوں نے ہندوستانی اقتدار پر قبضہ کرنے کے ساتھ ساتھ مذاہب پر بھی چلنا شروع کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے ہندوستانیوں کے اہل مذہب طبقے نے یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ انگریز تمام ہندوستانیوں کو عیسائی بنا

لینا چاہتے ہیں لہذا علمائے کرام نے ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے انگریزوں کے خلاف جدوجہت کرتے ہوئے عوام کو خبردار کرنا شروع کر دیا تھا جس میں اُردو صحافت نے اہم کردار ادا کیا تھا۔

۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے ''جام جہاں نما'' کی اشاعت سے صحافت کی ابتدا ہوچکی تھی لیکن دہلی میں اس کی ابتداء ۱۸۳۶ء میں ''دہلی اخبار'' کی اشاعت سے شروع ہوئی۔بعض تحقیقات اُردو کا پہلا اخبار مولوی اکرام علی سیتا پوری کا ''اُردو اخبار'' ہونا ثابت کرتی ہیں۔بعض اطلاعات کی بناء پر اُردو کا پہلا اخبار سلطان ٹیپو کی نگرانی میں ۱۷۹۴ء میں ''قومی اخبار'' کے نام سے جاری ہونا بتایا جاتا ہے۔لیکن تصدیق شدہ اطلاع یہ ہے کہ ۲۷/ مارچ ۱۸۲۲ء کو کلکتہ سے ''جام جہاں نما'' کے نام سے اُردو کا پہلا اخبار شائع ہوا تھا جس کے بانی ہری دت اور ایڈیٹر منشی سدا سکھ لال تھے۔''جام جہاں نما'' کی اشاعت کے ساتھ اُردو زبان ادب کے علمی سفر کی بھی ابتداء ہوئی کیوں کہ ہمارا موضوع اُردو زبان وادب کا ارتقاء ہے صرف اس طرف توجہ مبذول کرانا ہمارا مقصد ہے کہ اُردو صحافت کے ابتداء کے بعد ایسے جوہر شناس پیدا ہوئے جنھوں نے اُردو صحافت کو میدان بنا کر انگریزوں کے خلاف صف بستہ ہوئے۔

''صادق الاخبار'' دہلی سے تقریباً ۱۸۴۵ء میں شائع کیا گیا جس کے ایڈیٹر و مالک سید جمیل الدین خان تھے۔یہ اخبار اس وقت کے عمدہ اخباروں میں شمار کیا جاتا تھا،اس اخبار میں سنجیدہ اور صحت مند مضامین شائع کئے جاتے تھے۔یہ اخبار ملک وقوم کے تئیں ہندوستانیوں کے احساس کو بیدار کرنے ظلم و ناانصافی سے نبرد آزما ہونے اور مادر وطن کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے جذبوں کو فروغ دے رہا

تھا۔اس اخبار نے خود کو مکمل طریقے سے آزادئ وطن کی تحریک سے وابستہ کر دیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ اس اخبار کے تمام صفحات پر جنگ آزادی کے علاوہ کوئی دیگر خبر شائع نہیں کی جاتی تھی۔اس اخبار نے ہندوستانی عوام کی ہمت اور حوصلہ بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔''صادق الاخبار'' نے ایسی خبریں اور مضامین چھاپے جن سے ہندوستانی عوام میں انگریزوں کے خلاف حد درجہ نفرت عود کر گئی اور وہ انگریزوں کے خلاف لڑائی کو اپنے اوپر فرض کر لیا۔

''پیام آزادی'' کی اشاعت ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کے پوتے مرزا بیدار بخت کے حکم سے شروع کی گئی تھی اس کے نگراں وایڈیٹر عظیم اللہ خان تھے۔جو تحریک آزادی کے عظیم مجاہد تھے۔''پیام آزادی'' کا واحد مقصد جنگِ آزادی کی ترجمانی کرنا تھا۔اس لئے اس اخبار کو ہندوستان کا پہلا قومی اخبار قرار دیا جاتا ہے۔یہ ایک بے باک اخبار تھا جس کے منتظمین انگریزوں کی عیاری،مکاری،خود غرضی اور موقع پرستی کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔لہذا اس اخبار نے انگریزوں کی ان تمام سازشوں کا بروقت پردہ فاش کر دیا۔جو کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو برباد کرنے کیلئے انگریزوں نے اپنا آلۂ کار غدار ہندوستان والوں کی وساطت سے تشکیل دیں تھیں۔

''پیام آزادی'' نے ہندو مسلم اتحاد قائم کر کے اسے ایک ناقابل شکست طاقت میں تبدیل کر دیا تھا۔جس کی وجہ سے انگریزوں کو زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔بہادر شاہ ظفر کا پیغام آزادی بھی اسی اخبار میں شائع کرایا گیا تھا۔اس اعتبار سے جنگِ آزادی میں اس اخبار کی کارگردگی انتہائی اہم اور انقلابی تھی۔اسی وجہ سے جب انگریزوں نے دوبارہ دہلی پر قبضہ پایا تو ان تمام لوگوں کو پھانسی پر لٹکا دیا

جن کے گھروں سے اس اخبار کا ایک شمارہ بھی دستیاب ہوا تھا۔

ملک کے عوام کے دلوں میں قومیت اور اجتماعیت کا احساس پیدا کرنے میں اُردو صحافت نے نمایاں کردار ادا کیا حالاں کہ اُردو زبان واُردو صحافت کو کبھی بھی خوش حالی میسر نہیں آئی۔ اُردو صحافیوں نے ہمیشہ خون جگر سے زبان وادب اور ملک و قوم کی خدمات انجام دیں لیکن مالی معاونت کی قلت کے سبب بہت سے اخبارات و رسائل کی عمر دراز نہ ہوسکی جب کہ اُردو صحافت نے بڑے بڑے اثر انداز طریقے سے وطن عزیز کی آزادی میں اپنا کردار ادا کیا لیکن اپنے بے لوث جذبوں اور قربانیوں کے باوجود اپنے محدود وسائل کی وجہ سے زیادہ نمایاں نہ ہوسکی۔

مولانا محمد علی جوہر ایک مخلص وطن پرست اور عوام دوست شخص تھے۔ مولانا نے محسوس کیا کہ اگر مسلمانوں کا اپنا انگریزی اخبار ہو تو ان کے آواز زیادہ بہتر طریقے سے حکومت تک پہنچائی جاسکتی ہے۔ لہذا مولانا محمد علی جوہر اپنی نوکری سے سبک دوش ہوگئے اور انھوں نے ملک وملت کی مختلف ڈھنگ سے خدمت کرنے کی غرض سے اپنا انگریزی اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا۔ جس کے تحت ۴؍جنوری ۱۹۱۱ء کو انھوں نے کلکتہ سے پہلا ہندوستانی ہفتہ روزہ انگریزی اخبار ''کامریڈ'' شائع کیا۔ اخبار نویسی کے سلسلے میں ان کا اپنا ضابطہ اخلاق تھا جس کے تحت وہ اپنے اخبار کو ذاتیات سے بالکل الگ رکھتے تھے۔ اس میں عبارت آرائی سے گریز کرتے تھے۔ مولانا نے ''کامریڈ'' کے پہلے شمارے سے ہی اپنے اخبار کو انگریزی اخبارات کی مقبول فہرست میں شامل کرانے میں کامیابی حاصل کرلی تھی کیوں کہ انھوں نے اپنے اخبار کو زبان وادب اور معنوی اعتبار سے انتہائی دل کش بنانے میں اپنی تمام تر صلاحیتیں

بروئے کار لائی تھیں اس میں مختلف مضامین شائع کئے جاتے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کا اخبار نہ صرف ہندوستانی عوام میں مقبول ہوگیا بلکہ انگریز افسر بھی اس کے بے پناہ مداح بن گئے تھے، اور اخبار کا بے چینی سے انتظار کیا کرتے تھے۔ اپنی پسندیدگی او رمقبولیت کے باوجود بھی ''کامریڈ'' کی ضمانت ضبط کرلی گئی۔ مولانا محمد علی جوہر نے ''کامریڈ'' کو دہلی منتقل کردیا اور ۱۹۱۲ء سے دہلی سے شائع کرنا شروع کردیا جو طویل عرصے تک ہندوستانیوں کے جذبات، مسائل اور ضرورتوں کی ترجمانی کرتا رہا۔

مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸-۱۹۵۸ء) نے ۱۳/جولائی ۱۹۱۴ء کو ''الہلال'' جاری کیا جس کے ذریعہ مولانا نے صحافتی شعور و آگہی سے ملک کی سیاسی، سماجی، تہذیبی، مذہبی، معاشرتی، لسانی، ادبی اور صحافتی معیار اور وقار قائم کیا وہ اب تاریخ کا سنہرا باب ہے۔

عظیم صدیوں کا یہ صحافتی کارواں تھما نہیں بلکہ دن دوگنی ترقی کرتا گیا اور جینا ناتھ جی جو اپنے دور کے مقبول ترین اور ممتاز شخصیت تھے انھوں نے اُردو کا ایک روزنامہ ''دیش'' اور ہفتہ روزہ ''ہمالیہ'' جاری کیا جنھوں نے اپنے مضمون اور بحثوں کی وجہ سے بے انتہا مقبولیت اور وسیع اشاعت حاصل کی۔ اُردو صحافت نے اپنی ابتداء سے ملک کے عوام کے بہتر مستقبل کی تعمیر کے لئے جو جوسر فروشانہ اور مجاہدانہ کردار ادا کیا ہے اس کا اعتراف کرتے ہوئے اُردو صحافت کو اس کے شایانِ شان مرتبہ و اہمیت دیا جانا ہی اُردو صحافت کی خدمات کو دی جانے والی سچی خراجِ عقیدت ہوسکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

تحریک آزادی ہنداور حسرت موہانی

ڈاکٹر محمد تابش خان
شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی، ممبئی

حسرت موہانی بڑے خوددار اور خدا ترس انسان تھے۔ انہوں نے ملک کی جنگ آزادی کو کامیاب بنانے کے لیے بڑی بڑی مشکلوں سے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ ملنساری، ہمدردی، اعلیٰ اخلاق اور خدمت خلق اُن کے جوہر تھے۔ وہ کانگریس پارٹی کے اہم قائد تھے۔ حسرت کے قومی رہنماؤں سے گہرے مراسم تھے۔ سبھی لوگ حسرت کی شخصیت اور شاعری کے مداح تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح حسرت موہانی کو بھی ملک کی آزادی کے علاوہ ''ہندو مسلم'' اتحاد بہت عزیز تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ عملی طور پر ''ہندو اور مسلمان'' اپنے باہمی اختلافات کو فراموش کر کے اتحاد و یگانگت کے ساتھ رہیں اور ملک کی ترقی میں اہم رول ادا کریں اور ملک کی سالمیت کو مضبوط کریں اور ہندوستان کی جنگ آزادی میں اہم رول ادا کریں۔ حسرت موہانی نے اپنی شخصیت اور شاعری سے اپنے عہد کو بڑا متاثر کیا جس کے اجلے نقوش آج بھی موجود ہیں۔

اردو صحافت:

صحافت لفظ ''صحف'' سے ماخوذ ہے جو عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے لغوی معنیٰ کتاب یا رسالہ کے ہیں۔ اردو میں صحافت سے اخبار نویسی مراد لی جاتی ہے، اس حوالے سے صحافی کو اخبار نویس کہا جاتا ہے۔ صحافت ایک عظیم فن ہے۔ اس

کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو تازہ خبروں سے آگاہ کیا جائے۔ اس حوالے سے کہنا چاہیے کہ صحافت ابلاغ کا وہ مستند ذریعہ ہے جو عوام کو حالات اور واقعات کا شعور بخشتا ہے۔ عوام کے شعور کو بالیدہ کرنے کے لیے بھی صحافت نے بڑا کام کیا ہے جس کی ہر دور میں ستائش کی گئی ہے۔ عوامی اور سیاسی سطح پر صحافت نے وہ کارنامے انجام دیے ہیں جن کی مثال دوسری اصناف میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اخبارات نے بہت سی حکومتوں کے قیام میں نہ صرف اہم کردار ادا کیا ہے، بلکہ بہت سی حکومتوں کو استحکام بھی بخشا ہے۔ مشہور فاتح اور حکمراں نپولین بونا پارٹ کہتا ہے کہ تین مخالف اخباروں سے ایک ہزار بندوقوں سے بھی زیادہ خوف کھانا چاہیے۔ (سید اقبال قادری، رہبر اخبار نویسی: 26) تاریخ میں یہ بھی واقعہ درج ہے کہ اکبر اعظم کے زمانے میں وسط ایشیا کے ایک حکمراں نے کہا تھا ''مجھے اکبر اعظم کی تلوار سے اتنا خوف نہیں ہوتا، جتنا ابوالفضل کے قلم سے ڈر لگتا ہے۔'' اس سے اندازہ ہوا کہ قلم و صحافت کی طاقت عہد قدیم سے ہی تسلیم کی گئی ہے۔

اردو کا پہلا اخبار ''جامِ جہاں نما'' 1822ء میں شائع ہوا اور مغلیہ سلطنت کے خاتمہ تک تقریباً 40 اردو کے اخبارات جاری ہو چکے تھے، جنھوں نے عوام میں وطن پرستی اور ملک کی آزادی کا جذبہ پیدا کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا، ''تاریخِ صحافت اردو'' کے مؤلف کے بقول 1857ء میں ہندوستانیوں نے انگریز سامراج کے خلاف جو بغاوت کی اُس کی ذمہ داری انگریزوں نے اردو کے مذکورہ اخبارات پر ہی ڈالی اور اِس کی پاداش میں ''دہلی اردو اخبار'' کے بانی مولوی محمد باقر کو

سولی پر چڑھا دیا گیا، اُن کے بیٹے محمد حسین آزاد کے نام بھی گرفتاری کا وارنٹ تھا لیکن وہ بچ کر نکل گئے، اُن کے ہم عصر ''صادق الاخبار'' کے ایڈیٹر جمیل ہجر پر بغاوت کا مقدمہ چلایا اور انہیں تین سال کی سزا ہوئی۔ اِسی سلسلہ کی ایک کڑی 1857ء میں بہادر شاہ ظفر کے نواسے مرزا بیدار بخت کے تحریری حکم سے شائع ہونے والا اردو اور ہندی کا اخبار ''پیامِ آزادی'' ہے جو حقیقی معنوں میں آزادی کا نقیب بن کر منہ نمرِ عام پر آیا، اِس اخبار نے جنگِ کی آگ بھڑکانے میں ایندھن کا کام کیا، یہی وجہ ہے کہ انگریز حکمرانوں نے اس اخبار کو بند کرنے کے ساتھ اِس کے پڑھنے والوں کو بھی سزا کا مستحق قرار دیا۔ یہاں تک کہ جن لوگوں کے گھروں سے اِس باغی اخبار کا شمارہ یا ایک ورق دستیاب ہوا اُنہیں بھی انگریز حکومت کے عتاب کا شکار ہونا پڑا، اِس اخبار کے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر بیدار بخت کو موت کی سزا دی گئی۔ اخبارات کی اشاعت کا باقاعدہ مرحلہ شروع ہونے سے پہلے ہی اردو زبان عوام کے درمیان رابطہ کی زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی، صرف دہلی سے بارہ ایسے قلمی اخبار سپرد ڈاک کیے جاتے، جن کا مقصد انگریز حکومت کے خلاف عوام کو بیدار کر کے بغاوت کے لیے اُکسانا تھا، یہی وجہ ہے کہ لارڈ آک لینڈ اور لارڈ کیننگ کو اعتراف کرنا پڑا کہ ''قلمی اخبارات کی صحافت نے ہندوستانی عوام میں برطانوی حکومت کے خلاف بدگمانی پھیلا کر 1857ء کے انقلاب کی راہ ہموار کی ہے''۔

بیسویں صدی کے آغاز میں اردو صحافت نے نئی کروٹ لی۔ مسلمان اپنے سیاسی حقوق کی بازیافت کے لیے جد وجہد کرنے کی ضرورت محسوس کرنے لگے۔ اس کے بنیاد گزار مولانا حسرت موہانی تھے۔

حسرت موہانی کی حیات:

مولانا حسرت موہانی کا اصل نام سید فضل الحسن ہے۔ شاعری میں حسرتؔ تخلص اختیار کیا، یکم جنوری 1881 میں ضلع اناؤ کے موہان میں پیدا ہوئے تھے۔ حسرت موہانی کی ابتدائی تعلیم موہان میں ہوئی۔ وہیں سے انہوں نے مڈل کا امتحان پاس کیا اور اس کے بعد مزید تعلیم کیلئے حسرت موہانی فتح پور گئے اور وہاں سے انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ حسرت موہانی نے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد بی اے کرنے کے لیے ایم اے او (محمڈن اینگلو اورینٹل) کالج کی راہ لی اور بی اے کے دوران سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی پاداش میں ہاسٹل سے نکال دیے گئے لیکن کالج کے پرنسپل ماریسن کی خصوصی نظر کرم کی بدولت انہیں بی اے کے امتحان میں شامل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ وہ وکیل بننا چاہتے تھے، ایل ایل بی میں داخلے کے بعد وظیفے کی درخواست دی جس کو ماریسن نے مسترد کر دیا۔ دل برداشتہ ہوکر حسرت نے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا اور صحافت کو اپنی زندگی کا ذریعہ معاش بنالیا۔ میدانِ سیاست میں وہ ایک بڑے انقلاب کے علم بردار بنے۔ ان کی زندگی میں غضب کی درویشانہ صفات تھیں، جس کی وجہ سے وہ ہر جگہ اپنی چھاپ چھوڑنے میں کامیاب رہتے تھے۔

1901ء میں حسرت موہانی کی شادی نشاط النساء بیگم سے ہوئی۔ نشاط النساء بیگم بھی پڑھی لکھی، سلیقہ مند، بہادر، سمجھ دار خاتون تھیں۔ 19 ویں صدی کے اواخر اور 20 ویں صدی عیسوی کے شروع میں جن خواتین نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں اہم رول ادا کیا تھا ان میں بیگم حسرتؔ موہانی کا نام سرفہرست ہے۔ ان

کی محبوب بیگم کی عزتِ نفس کا یہ حال تھا کہ حسرت کے قید و بند کے زمانے میں جب ایک سرمایہ دار نے بیگم حسرت موہانی کو مالی امداد کی پیشکش کی تو ان کی غیرت فقر نے اس امداد کو قبول کرنا گوارا نہ کیا۔ جب امداد کی پیشکش کرنے والے نے مولانا سے اپنی عقیدت کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ اگر حسرت سے ایسی ہی عقیدت ہے تو ان کی کتابیں خریدیں مگر میں امداد قبول کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ بیگم حسرت موہانی کا طویل علالت کے بعد 18 اپریل 1937ء کو کانپور میں انتقال ہو گیا۔ وہ 37 برس تک حسرت موہانی کی شریک حیات رہیں۔ حسرت موہانی کو اپنی رفیقہ حیات کی جدائی کا بڑا صدمہ ہوا۔

تحریک آزادی اور حسرت موہانی:

حسرت موہانی فطری طور پر شاعر، انقلابی اور اصلاحی ذہن کے حامل تھے۔ وہ سرفروش، حریت پسند، نمائندہ نثر نگار، حق گو اور بے باک مقرر، محقق، روشن ضمیر صاحب الرائے اور نڈر صحافی تھے۔ ملک کی آزادی کے لیے جاری تحریک میں شامل ہونے سے خود کو روک نہ سکے۔ مولانا حسرت موہانی ہندوستان کی جنگ آزادی کے ایسے منفرد اور بے باک مجاہد آزادی ہیں جنھوں نے ہر جگہ ملک کی آزادی کے لیے ہر بار بے خوف و خطر اور انجام سے بے پرواہ ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی شخصیت شاعری، صحافت اور سیاست حریت سے عبارت تھی۔ انہوں نے ایک ایسے وقت میں ہندوستان کی کامل آزادی اور انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے کی مانگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا جبکہ اس کا تصور محال تھا۔ لیکن ایسا نہیں کہ جدو جہد آزادی میں سرگرمی نے ان کے شاعرانہ احساسات و جذبات کو سرد

کر دیا ہو بلکہ حصول آزادی کی تگ ودو کے ساتھ ساتھ مشق سخن بھی جاری رہی۔اس کا اعتراف ان کے اس مشہور شعر میں نظر آتا ہے۔

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
ایک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

تحریک آزادی میں حسرت نے خود کو تحریر یا مضمون نگاری تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ عملی سیاست میں بھی کھل کر حصہ لیا۔حسرت نے دسمبر 1906 کو بمبئی میں منعقدہ کانگرس کے اجلاس میں شرکت کر کے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔انہوں نے ملک کی آزادی کی لڑائی میں بابائے قوم گاندھی جی اور پنڈت نہرو کے شانہ بشانہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔حسرت موہانی نہ صرف اردو ادب، شاعری میں ممتاز و بلند مقام رکھتے ہیں، بلکہ اردو صحافت کے ان سرکردہ سپہ سالاروں اور جاں نثاروں میں ہیں، جنہوں نے بے باک صحافت کے پرچم کو بلند کرنے میں اپنی تمام تر قوتیں صرف کر دیں۔اس لیے انہیں بانیِ اردو صحافت بھی کہا جاتا ہے۔حالاں کہ یہ خط مولوی محمد باقر مدیر ''دہلی اردو اخبار'' کے سر ہے، لیکن حسرت کی اردو صحافت کو پروان چڑھانے میں نمایاں خدمات ہیں۔انگریزوں کے خلاف لڑائی میں انقلاب زندہ باد جیسا نعرہ حسرت موہانی کی ہی دین ہے۔ان کا یہ نعرہ آج بھی مختلف قسم کی تحریکیں چلانے والوں کے دلوں کو جوش اور ولولے سے بھر دیتا ہے۔حسرت موہانی نے برطانوی سامراج کے سامنے کبھی بھی سر نہیں جھکایا۔وہ کئی مرتبہ جیل بھی گئے، اور جیل میں ان کے ساتھ عام قیدیوں کے جیسا سلوک کیا گیا، لیکن زبان پر کبھی شکوہ نہیں آیا۔حسرت موہانی اپنے مزاج کے مطابق کانگریس کے شدت پسند گروپ سے وابستہ رہے۔

حسرت موہانی نے بال گنگا دھر تلک جیسے ہندو ہردیے سمراٹ کو اپنا محرک مانا۔ حسرت موہانی 1904 سے 1907 تک منعقد کانگریس کے سبھی اجلاسوں میں پابندی سے شریک ہوتے رہے۔ 1905 میں آل انڈیا انڈسٹریل کانفرس کی سرگرمیوں میں پورے جوش وخروش کے ساتھ حصہ لیا۔ اس کے بعد سودیشی تحریک کے زبردست اور سرگرم مبلغ بن گئے۔ سودیشی تحریک کو فروغ اور عوام میں مقبول بنانے کے لیے رسل گنج (علی گڑھ) میں خود ایک سودیشی اسٹور بھی کھولا جو وسائل کی کمی کے باوجود محض ان کی تگ ودو اور جدوجہد کے سبب خوب چلا۔ سودیشی تحریک انہیں اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی ایک مرتبہ انہیں شدید سردی کے عالم میں اپنے کسی عزیز کے یہاں رات گزارنی پڑی تو بستر پہ جو کمبل رکھا تھا اس پر 'میڈ اِن انگلینڈ' لکھا تھا، لہذا انہوں نے پوری رات سردی میں گزار دی مگر کمبل کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ان کی سودیشی جنون کو دیکھ کر مہاتما گاندھی نے ینگ انڈیا میں لکھا تھا کہ ''حسرت کے سر ہر وقت سودیشی کا بھوت سوار رہتا ہے۔''

حسرت موہانی اپنے سیاسی عزائم، مقصد اور نصب العین حاصل کرنے لئے ہر اس پارٹی سے عقیدت رکھتے تھے جو ان کے مقاصد پورے کر سکے۔ بمبئی میں پہلی مرتبہ 1915 میں مسلم لیگ اور کانگریس کا اجلاس ہوا حسرت موہانی نے اس میں شامل ہوئے پہلی عالمی جنگ کے دوران ان کے گھر کی خانہ تلاشی ہوئی، اگرچہ کوئی ممنوع یا ایسا ثبوت پولیس کے ہاتھ نہیں لگا مگر پھر بھی انہیں برٹش حکومت نے دو سال کی قید بہ مشقت کی سزا سنا دی۔ دسمبر 1918 کو انہیں قید فرنگ سے نجات حاصل ہوئی۔ 1918 کے سورت کانگریس جلسہ میں چیمسفورڈ نے ہوم رول کی تجویز

رکھی جسے کانگریس کے اعتدال پسند گروپ نے قبول کرلیا مگر حسرت موہانی نے اسے قبول نہیں کیا۔ 1919 میں امرتسر کے کانگریس اجلاس میں حسرت موہانی نے گاندھی جی کی مخالف کرتے ہوئے کہا کہ محض ولایتی کپڑوں کے بائیکاٹ کرنے سے کام نہیں چلے گا بلکہ برطانوی مصنوعات کا مکمل بائیکاٹ کرنا چاہیئے۔

27 دسمبر 1921 کو احمد آباد کے اجلاس میں حسرت موہانی سبجیکٹ کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے۔اس اجلاس میں حسرت موہانی نے گوریلا وار اور کامل آزادی کی تجویز پیش کر دی۔ اس وقت تک کانگریسی لیڈران کے وہم وگمان میں کامل آزادی کا تصور بھی موجود نہیں تھا۔حسرت موہانی روشن ضمیر تھے انہیں معلوم تھا کہ ان کے ریزولیشن کو سب کی تائید وحمایت نہیں مل سکے گی، چنانچہ وہ اپنی قرارداد کی حمایت کے لئے اپنی بیگم نشاط النساء کو بھی ساتھ لے گئے تا کہ مستقبل میں کوئی مورخ یہ نہ لکھے کہ جب کامل آزادی کی تجویز پیش ہوئی، کانگریس کے اتنے بڑے مجمع میں ایک بھی ہاتھ ریزولیشن کی تائید میں نہیں اٹھا۔گاندھی جی نے یہ تجویز کی مخالف کرتے ہوئے کہا کہ ایسا قدم اٹھانے سے قبل اس کے عواقب پر پچاس بار غور کرنا لازم ہے جس سے ہمیں نا قابل تلافی نقصان پہنچنے کا امکان ہو- ہم کو اتنے گہرے پانی میں نہیں اترنا چاہیے جس کی گہرائی کا علم نہ ہو اور حسرت موہانی کی قرارداد ہمیں اتنے گہرے پانی میں لے جانا چاہتی ہے جس کی گہرائی اتھاہ ہے۔پورے اعتماد کے ساتھ اسے مسترد کر دینے کی میں آپ سے اپیل کرتا ہوں''۔اسی سال مسلم لیگ کا بھی اجلاس ہوا اس میں بھی حسرت نے کامل آزادی کی قرارداد پیش کی۔ستم ظریفی دیکھیے کہ جب 1929 میں جب پنڈت نہرو نے اس تجویز کو پیش کیا تو اس کا سہرا حسرت کے

بجائے پنڈت نہرو کے سر گیا۔

حسرت کی تیسری گرفتاری 1923 میں ہوئی اس وقت ان کی اکلوتی دختر کی شادی مقرر ہو چکی تھی۔ باپ کی غیر موجودگی میں بیگم نشاط النساء کو ہی ماں باپ دونوں کی ذمہ داری نبھانی پڑی۔ 12 اگست 1924 کو انگریزی قید و بند سے چھوٹے۔ 1927-1928 میں آل انڈیا پارٹیز کانفرس میں جب نہرو کمیٹی کی مجوزہ آئین کی سفارشات پر تبادلہ خیال کے لیے تمام سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کو مدعو کیا گیا تو اس میں درجہ نو آبادیات کی تجویز رکھی گئی جس کو حسرت موہانی نے خارج کر دیا کیونکہ حسرت موہانی کامل آزادی سے کم کسی چیز کو کسی بھی حالت میں منظور نہیں کر سکتے تھے۔

طلوعِ آزادی کے ساتھ ہی بھارتی مسلمانوں کو براہِ راست یا بالواسطہ کانگریسی سیاست کا جزو لاینفک بنانے کی مساعی شروع ہو گئی تھیں۔ دسمبر 1937ء میں ایک کل جماعتی مسلم کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں تمام مسلم ادارے سیاسی حیثیت سے ختم کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ مولانا حسرت موہانی کی سیاسی بصیرت اور دینی نظر نے اس کانفرنس کو ناکام بنا دیا تھا۔ اپنے 27 دسمبر 1948ء کے ''روزنامچہ'' میں مولانا رقم طراز ہیں:

> ''مولانا ابوالکلام آزاد نے صاف صاف اقرار کیا کہ آج کی کانفرنس کا صرف ایک مقصد ہے وہ یہ کہ تمام مسلم ادارے سیاسی حیثیت سے ختم ہوں کل فرقہ وارانہ جماعتیں کانگریس میں مدغم ہو جائیں اس پر ہم لوگ یہ کہہ کر چلے آئے کہ ''ہم لوگوں کی شرکت بیکار ثابت ہوگی۔'' دورانِ گفتگو چلتے چلتے میں نے ایک

فقرہ ابوالکلام کے متعلق چست کر دیا اور جس سے ان کی ساری کارستانیوں پر پانی پھر گیا اور جس سے وہ انتہا درجہ بھنائے۔ میں نے کہا 1857ء میں برٹش گورنمنٹ کی بدگمانیاں رفع کرنے کی غرض سے سرسید نے مسلمانوں کو صرف تعلیمی اور سماجی امور پر زور دینے کی تلقین کی تھی بالکل اسی طرح 1947ء میں آپ کانگریس کے ساتھ مسلمانوں کو وفاداری سکھاتے ہیں اور اسلامی اداروں کو سماجی امور کے لیے محدود کر دینے کے درپے ہیں۔ لاحول ولاقوۃ اِلا باللہ۔''

حسرت موہانی دس بارہ برس مسلم لیگ کے صفِ اوّل کے لیڈروں میں شمار رہا مگر قائداعظم کی بھی کبھی خوشامد نہ کی۔ مسلم لیگ نے اپنے اجلاس لکھنو میں اپنا نصب العین آزادی کامل مولانا حسرت موہانی کی تجویز پر ہی منظور کیا تھا۔ 3 جون 1947ء کو پارٹیشن پلان کے اعلان کے بعد حسرت موہانی نے آل انڈیا مسلم لیگ کے ممبر کی حیثیت سے استعفیٰ دے دیا اور جب ملک کی تقسیم واقع ہوئی تو انہوں نے آزاد ہندوستان میں رہنے کا انتخاب کیا اور ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کے رکن بنے جس نے ہندوستانی آئین کا مسودہ تیار کیا۔ انہوں نے آئین میں اقلیتوں کے تئیں اپنی تشویش کے مدنظر اس پر دستخط نہیں کیے۔

حسرت موہانی اور اردوئے معلیٰ :

مولانا حسرت موہانی سیاستدان اور صحافی بھی تھے اور شاعر اور عاشق بھی۔ ان ہر چار میدانوں میں انھوں نے حق گوئی اور بیبا کی کا دامن کبھی نہ چھوڑا۔

حسرت موہانی نے جولائی 1903ء میں ''اردوئے معلیٰ'' کے نام سے ایک معیاری رسالہ نکالا۔ حسرت نے اردو معلیٰ کو کانگریس کے رنگ میں ایسا رنگا کہ وہ کانگریس کا ترجمان معلوم ہونے لگا۔ یہ رسالہ 1942ء تک جاری رہا۔ کئی مرتبہ بند ہوا، پھر جاری ہوا۔ حکومت اس رسالے پر پابندی لگاتی، کچھ دن بند رہتا پھر پابندی ختم ہونے کے بعد جاری کر دیا جاتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حسرت موہانی کو اردوئے معلیٰ سے کس قدر عشق تھا۔ یہ اردو کا پہلا ایسا رسالہ ہے جس نے مسلمانوں میں قومیت پر مبنی سیاسی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ ایک ایسا رسالہ جس نے شعر وسخن کے پھول اور سیاست کے کانٹے ایک ساتھ قارئین کے سامنے پیش کیے اور بے شمار معروف اور غیر معروف شعراء کے حالات زندگی شائع کر کے ان کو نئی زندگی عطا کی۔ اردوئے معلیٰ اپنے وقت کا وہ واحد رسالہ تھا جس نے اپنے قارئین کو آزادی کامل کے لفظ سے روشناس کرایا اور بتایا کہ ملک کی فلاح و بہبود کا انحصار ملک کو انگریزوں کی گرفت سے مکمل طور پر آزاد کرانے میں ہی ہے۔ حسرت موہانی نے اپنے مزاج سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا اور انگریزوں کو اس ملک سے نکالنے کے لیے ہر وہ طریقہ اختیار کیا جس کے اثرات تیزی سے مرتب ہوں۔

پروفیسر آل احمد سرور کے مطابق اس رسالے کا سب سے بڑا مقصد ''درستی مذاق'' قرار دیا گیا تھا۔ یہ صرف ایک ادبی رسالہ نہیں تھا بلکہ اس رسالے میں قومی اور بین اقوامی سیاسیات اور حالات حاضرہ پر تبصرے بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ حسرت موہانی ادب کے ساتھ ساتھ سیاسی ذہن کے بھی مالک تھے۔ اس ادبی جریدے سے انہوں نے ادب کی ترویج کے ساتھ ساتھ اپنے سیاسی وفنّی نظریات کو

بھی بڑی بے باکی کے ساتھ شائع کیا۔حسرت موہانی نے اردو ادب میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، وہ تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔اردوئے معلیٰ نے اردو صحافت کو زبان دی۔آداب واخلاق کے ضابطے مقرر کیے۔شائستگی کے اصولوں سے ہمکنار کر کے شعر وادب کے نکات سے آشنا کیا۔اردوئے معلیٰ نے ملک کے تعلیم یافتہ طبقے کے ذہنوں میں بیداری پیدا کی اور ان میں سیاسی اور ادبی شعور کو پختہ کیا۔ اردوئے معلیٰ کئی مرتبہ برطانوی سامراج کے جبر واستبداد کا شکار ہو۔اس لیے کہ حسرت ہی کی تحریروں کا اثر تھا کہ حکومتِ وقت کو اپنا مستقبل ڈولتا ہوا نظر آنے لگا۔ حسرت موہانی نے ایک اہم کام یہ انجام دیا کہ اردوئے معلیٰ کے ذریعہ اساتذہ کے دیوان فراہم کر کے ان کا انتخاب شائع کرتے تھے۔ان کی اس سعی مسلسل کی بدولت حاتم، سوز، مصحفی، جرأت، قائم اور میر حسن وغیرہ کا کلام محفوظ ہو گیا اور فنی حیثیت سے بھی انہوں نے 'نکاتِ سخن'، 'محاسن سخن'، 'معائبِ سخن'، شائع کر کے اردوئے معلیٰ کو تقویت بخشی۔ یہی نہیں حسرت نے دیوانِ غالب کی شرح بھی شائع کی۔ان کی پوری زندگی شاعری، صحافت اور سیاست سے عبارت ہے۔

اردوئے معلیٰ کی تاریخ میں ایک سخت موڑ اس وقت آیا جب 1908ء میں اردوئے معلیٰ نے مصری رہنما مصطفیٰ کمال کی موت پر ایک خصوصی شمارہ شائع کیا۔رسالے میں مصر میں برطانیہ کی پالیسی کے زیرِ عنوان ایک مضمون مصنف کے نام کے بغیر شائع ہوا، جس میں برطانوی حکومت کی حکمتِ عملی پر جارحانہ تنقید کی گئی تھی، یہ مضمون اگرچہ کسی اور کا لکھا ہوا تھا، لیکن حکومت نے اس مضمون کے ماٰخذ کو باغیانہ قرار دیتے ہوئے حسرت موہانی کو بطور مدیر حراست میں لے لیا اور ان کے

خلاف غداری کا مقدمہ قائم کر دیا گیا۔علی گڑھ کے سربرآوردہ رہنما اس صورت حال سے پریشان ہو گئے ۔حکومت نے کتب خانہ اور پریس ضبط کر لیا۔حسرت کے خلاف مقدمہ چلایا گیا اور انہیں دو برس کی سزا 500 روپے جرمانہ کے ساتھ سنائی گئی۔ جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید 6 مہینے کی سزا رکھی گئی۔حسرت موہانی جرمانہ ادا کرنے سے قاصر تھے،اس وجہ سے ان کا نہایت نادر کتب خانہ جس میں سیکڑوں نایاب قلمی کتابیں اور کمیاب تصانیف موجود تھیں۔ بہت سے دیوان اور تذکرے تھے،جنہیں انہوں نے انتہائی تلاش وجستجو کے بعد جمع کیا تھا،سب کچھ کباڑ کی طرح نیلام کر دیا گیا۔بیگم حسرت نے ایک جگہ لکھا ہے کہ یہ کتب خانہ تقریباً ساڑھے چار ہزار کی مالیت کا تھا اور حکومت نے اسے صرف ساٹھ روپے میں فروخت کر دیا، کہنے والوں نے کہا اور لکھنے والوں نے لکھا کہ اگر حسرت چاہتے اور مضمون نگار کا نام ظاہر کر دیتے تو اس عتاب سے بچ سکتے تھے،لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اور سب کچھ اپنے جان ومال پر برداشت کیا۔اسی قید وبند کے زمانے کا یہ شعر ہے:

ہے مشق سخن جاری، چکّی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

اردوئے معلیٰ کے علاوہ حسرت موہانی نے تذکرۃ الشعرا، استقلال، اور مستقل جیسے رسائل بھی نکالے۔ان رسالوں میں وہ اپنے ادبی، سیاسی اور مذہبی خیالات وافکار کا اظہار انتہائی بے باکی کے ساتھ کرتے رہے۔ان چاروں میں جو مقام ومرتبہ اردوئے معلیٰ کو حاصل ہوا، وہ دوسرے کسی رسالے کے حصے میں نہ آیا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ طویل عرصہ یعنی جولائی 1903ء سے مارچ 1942 تک

جاری رہا۔ اردوئے معلیٰ کی زندگی میں بہت سے نشیب وفراز آئے،لیکن کروٹیں لے لے کر یہ پھر جاری ہوتا رہا اور اپنی بے خوف اور بے باک صحافت کے باوصف لوگوں میں اپنی مقبولیت کا جواز فراہم کرتا رہا۔اپنی شخصیت اور اپنی دینی وسیاسی جدوجہد کوخود مولانا نے اپنے اس شعر کے دومصرعوں میں بڑی خوبی کے ساتھ منتقل کر دیا ہے:

درویشی و انقلاب مسلک ہے مرا
صوفی مومن ہوں، اشتراکی مسلم

وفات:

ہندوستان کی آزادی کے بعد حسرت موہانی یوپی اسمبلی اور مرکزی دستور ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور کامیاب نمائندگی کی تھی مگر آہستہ آہستہ ان کی صحت ساتھ چھوڑنے لگی اور وہ کبھی بیمار پڑ جاتے اور ٹھیک بھی ہو جاتے تھے۔غرض یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا اور آخر کار انہوں نے 13 مئی 1951ء کو اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر دی اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔آپ کے جسدِ خاکی کو لکھنؤ کے انوار باغ کے فرنگی محل احاطے کے قبرستان میں ہزاروں سوگواروں کے بیچ سپرد لحد کر دی گئی۔اردو زبان وادب، شاعری، صحافت، سیاست اور ہندوستان کی جنگِ آزادی میں گراں قدر خدمات کے سبب حسرت موہانی کا نام تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا اور جب کبھی بھی تاریخ وادب کا مورخ ہندوستان کی جنگ آزادی کا تذکرہ لکھے گا تو حسرت کا نام توقیر سے لیا جائے گا اور ایسے محسن علم وادب کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کرے گا۔مولانا حسرت موہانی نے اپنی زندگی میں تیرہ (13) حج کیے تھے۔ میر تقی میر کا مشہور شعر مولانا حسرت موہانی کی شخصیت پر پورا صادق آتا ہے۔

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کے بہت یاد رہو

مصادر و مراجع:

1۔رہبر اخبار نویسی، سید اقبال قادری، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔2000۔(ص:۲۶)
2۔ابلاغیات، محمد شاہد حسین، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، 2004
3۔ اردو صحافت، انور علی دہلوی، اردو اکادمی، دہلی، 2000
4۔مولانا حسرت موہانی اور تحریک آزادی، ایڈیٹر و ناشر محمد طیب، 1996
5۔اردو صحافت اور جنگ آزادی 1857، معصوم مرادآبادی، اردو اکادمی، دہلی، 2008
6۔حسرت موہانی حیات اور کارنامے، احمر لاری، ادبستان نظام پور، گورکھپور، 1973
7۔اردو صحافت اور حسر موہانی، شریف الدین، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، 2005
8۔حسرت موہانی: حیات و خدمات، شاہد ماہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2013
9۔تاریخ صحافت اردو، امداد صابری، ناشر: اسرار الحق، 1962
10۔مولانا حسرت موہانی، شبیر حسن، حسرت موہانی اشاعت گھر، بیگوسرائے

☆☆☆☆☆

جدوجہد آزادی ہند اور پریم چند کا ناول

(میدان عمل کی روشنی میں)

ڈاکٹر کیرتی مالینی وِٹھل راؤ جاولے

اسوسیٹ پروفیسر وصدر شعبہ اُردو

ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد

ادب اور زندگی میں حقیقی اور قریبی تعلق کی بہترین مثال پریم چند کے افسانوی ادب میں ملتی ہے۔ بیسویں صدی کا آغاز، پریم چند کے عہد کے نام سے مشہور ہے۔ اصل نام دھنپت رائے تھا۔ بنارس کے گاؤں لمہی میں ۳۱/ جولائی ۱۸۸۰ء کو پیدا ہوئے۔ آٹھ برس کی عمر میں والدہ اور سولہ سال کی عمر میں والد کی محبت وشفقت سے محروم ہوگئے۔ سوتی ماں کے دباؤ میں والد نے پندرہ سال کی عمر میں دھنپت کی شادی کرادی تھی۔ لڑکپن کی عمر میں سوتیلی ماں، ان کے دو بیٹے اور ایک بھائی کی کفالت کا بوجھ ان کی ذمہ داری بن گیا تھا۔ اپنی بیوی کی ذمہ داری بھی ان کی اپنی تھی۔ پہلی ملازمت پانچ روپیے ماہوار ٹیوشن تھی۔ خود کھانا بنا کر ایک وقت کھاتے ۔طلسم ہوشربا اور اُردو ناول پڑھنے کا شوق تھا۔ عیسائی مشنری اسکول میں اٹھارہ روپیے ماہوار کی نوکری ملی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد سرکاری اسکول میں درس وتدرس کا موقع ملا۔ ۱۹۰۲ء تک ان کے مضامین نواب رائے کے نام سے شائع ہونے لگے۔ یہ نام انھیں ان کے والد اور چچا نے دیا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں سوز وطن پہلا افسانوی جموعہ ''سب

سے انمول رتن'' شائع ہوا۔ اس کا موضوع حب الوطنی کا شدید جذبہ ہے۔ انگریز سرکار نے حب الوطنی کو غداری کی موہر لگا کر کتاب کی ضبطی کی اور آئندہ کے لیے قبل از تحریر کے لیے منظوری کی شرط کا حکم جاری کر دیا۔

ہر تحریر کا کلکٹر صاحب کو بھیجنا لازم قرار دینے سے واپسی میں مہینوں لگ جاتے تھے۔ ''زمانہ'' کے مدیر دیا نرائن نگم نے نواب رائے کی جگہ قلمی نام پریم چند تجویز کیا۔ دیا نرائن کے نام لکھتے ہیں:

> ''پریم چند اچھا نام ہے مجھے بھی پسند ہے، افسوس صرف یہ ہے کہ پانچ چھ سالوں میں نواب رائے کو فروغ دینے کی جو کچھ محنت کی گئی۔ وہ سب کارت ہوگئی۔''[۱]

ذاتی زندگی کی آسودگی ان کے نزدیک بے معنی تھی۔ انھیں مٹھائی کھانے کا ارمان تھا۔ جبکہ اخراجات پورے کرنے میں ہی کثرت لازمی تھی۔ ایک دور میں اتنا روپیہ حاصل ہوا کہ وہ من پسند نعمتیں کھا سکتے تھے۔ ان کی زندگی کے آخری ایام غربت اور افلاس میں گزرے اور بالآخر ۱۸/اکتوبر ۱۹۳۶ء کو بیماری نے ان کا چراغ ہستی ہمیشہ کے لیے بجھا دیا۔

پریم چند جو والدہ کی طرف سے بے انتہائی لاڑ پیار ملا۔ جلد ہی ممتا کی اس جنت سے محروم ہوگئے۔ پریم چند کے والد بیٹے کے حوالے سے جذباتی طور پر بنجر تھے۔ پھر وہ دوسری بیوی اور تبادلوں کی وجہ سے پریم چند کی شفقت پدری سے محروم رہے۔ پریم چند کے کردار کی تعمیر میں، ان کے باپ اور دادا کے کردار کا اہم حصّہ رہا ہے۔ اگر ہم پریم چند کے بارے میں یہ کہا جائے کہ ایک حد تک وہ اپنے والد اور دادا

کی ہر طرح سے ضد ہیں کہتے ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ دادا راشی پٹواری تھے، عیاش، شرابی اور ظالم شوہر تھے۔ شراب کے نشے میں اپنی بیوی کی سرعام پٹائی کرتے تھے۔ عیاشی کے باوجود عیاری سے انھوں نے کافی ذرعی زمین پر قبضہ کر رکھا تھا۔ جبکہ مال و دولت میں حصّہ صرف دوسرے نمبر کے بیٹے مہاویر لال کو ملا تھا۔ باقی تینوں بیٹوں کے حصّے میں باپ کی رسوائی اور ناانصافی ملی تھی۔ تینوں بیٹے ماں کی پٹائی دیکھتے رہتے لیکن مہاویر لال باپ کی طاقت کا حیوانیت سے جواب دیتا تھا۔

خاموش ظلم سہنے اور سرکاری ملازمت کی وجہ سے عجائب لال کو معاشرہ عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پریم چند کو وراثت میں ظلم اور جبر کے سوا کچھ نہ ملا۔ پریم چند نے باپ کی طرح ظلم کو اپنے زیر کفالت افراد کی جانب منتقل کرنے کے بجائے طالموں کی جانب لوٹا دیا۔ اور اپنوں پر پیار محبت اور قہقہوں کے پھول برساتے رہے۔ چنانچہ اپنے دوست احباب انھیں ''بمبوق'' کہتے تھے۔ خاندان کے خواتین میں انھیں اپنی حقیقی ماں اور دادی کی طرف سے انھیں بہت پیار ملا۔ دادی صبر و شکر و محبت کا زندہ مجسمہ تھی۔ اور ایثار و خدمت کی دیوی کا روپ تھی۔ ماں خوبصورت، خوش مزاج، خوش آواز ہمہ وقت بیٹے پر جان قربان کرنے کے تیار رہتی تھی۔ پریم چند کے طرز احساس میں امن پسندی، ایثار اور صبر کی صفات دادی کی بدولت آئی تھی۔ دوسری ماں اور پہلی بیوی کے تلخ تجربات کے بوجود پریم چند خواتین اور خاص طور پر بیوہ کے حقوق کے دل و جان سے علمبردار رہے۔ ذاتی زندگی میں انھوں نے گیارہ سال کی عمر میں بیوہ ہوئی شیورانی دیوی سے شادی کر کے سماج میں ایک مثال قائم کی۔

برصغیر میں مذہبی اور سماجی اصلاحات کا آغاز ۱۸۲۸ء میں ہو چکا تھا۔ پریم

چندو ویکا نند سے بہت متاثر تھے۔ جلوۂ ایثاران کا ایک سوانحی ناول ہے۔ جس میں پریم چند نے سوامی وویکا نند کی زندگی اور شخصیت کو ناول کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ وویکا نند کے علاوہ تلک اور گاندھی کی شخصیتوں کی گونج پریم چند کی تصانیف میں سنائی دیتی ہے۔ ۱۹۱۷ء میں انقلاب روس کے بعد ظلم و جبر کو تشدد کے ذریعہ ختم کرنے کا رجحان رونما ہوا ل ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک جس کا نقطہ عروج تھی۔ پریم چند نے مرنے سے بیشتر ترقی پسند کانفرنس میں خطبہ صدارت پڑھ کر، تشدد کے ذریعے استحصالی نظام کو ختم کرنے کے رجحان پر کسی حد تک مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔

انسویں صدی کے نصف آخر میں، انگلستان کے صنعتی انقلاب کے برصغیر میں کافی حد تک مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ۱۸۵۶ء میں بیوہ کی شادی کے حق میں اور ستی کے خلاف فضاء تیار ہوئی۔ ریلوے نظام جاری ہوا۔ شہر رعیت پر کھل گئے۔ کارخانوں میں مزدوروں کو بڑی تعداد میں روزانہ یکجا ہونے کے مواقع ملنے لگے۔ اس طرح تلک جیسے انقلابیوں کو ٹریڈ یونین تحریک کی بنیاد رکھنے میں کامیابی ہوئی۔ خود انگریزی سرکار کے ریٹائر اعلیٰ عہدیدار نے برصغیر کی پہلی سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگریس میں ۱۸۸۵ء میں قائم کی گویا سب اچھا تھا۔

بیسوی صدی کے آغاز سے ہی کچھ اچھا نہ رہا۔ سرکار کے لیے، نہ عوام کے لیے بدیسی مال کی منڈی بن جانے کی وجہ سے دست کار بے روزگار، ذرعی اجناس کی ارزانی کی بنا پر کسان بدحال اور ضروریات زندگی کی مہنگائی کی وجہ سے شہری بے حال ہوئے۔ عوام کی طاقت کو تقسیم کرنے کی غرض سے سرکار نے ۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم کر دی سرکار کی عیاری کام نہ آئی۔

دوسری طرف جرمنی اور جاپان، سلطنت برطانیہ کے لیے بیرونی خطرے بن گئے تھے۔ یہ دونوں ممالک نئے نئے سامرجی بننے تھے اور برطانیہ سے نوآبادیاں اور منڈیاں جھپننے کے فراق میں تھے۔ سامراجیوں کی یہی ہوس ملک گیری ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کی صورت اختیار کر گئی۔ سامراج برصغیر کے غلاموں کو آزادی کا جھانسہ دینے لگے۔ غلاموں نے آزادی کی خوش فہمی میں آقاؤں کی سلامتی کے لیے جنگ لڑی۔ لاکھوں نے خون کا نذرانہ پیش کیا اور چندن وکٹوریہ کراس و دیگر اعزازات حاصل کئے۔ قوم کو رولٹ ایکٹ ملا۔ جس کا مطلب نہ اپیل نہ وکیل نہ دلیل۔ سب سے بڑا انعام جلیان والا باغ امرتسر میں گولیوں کی بوچھار کی صورت میں ملا۔

پریم چند کے ناول میدان عمل کے تصنیفی مراحل ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۳ء کے درمیانی مدت کے ہیں۔ ہندی میں یہی ناول کرم بھومی کے عنوان سے ۱۹۳۲ء میں شائع ہو گیا۔ جبکہ اُردو میں اس کی اشاعت مصنف کی وفات کے کچھ پہلے ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔

ناول کا خلاصہ

لالہ سمرکانت دولت کا پجاری ہے اپنے اکلوتے بیٹے کے تعلیمی اخراجات اٹھانا بھی اسے گوارا نہیں۔ بیٹا باپ کی ضد ہے۔ اسے کاروباری ذہنیت سے نفرت ہے وہ گاندھی کے زیر اثر ہے۔ اسکول سے آتے ہی دو گھنٹے کے لیے چرخے پر سوت کاتنے بیٹھ جاتا ہے۔ بچپن میں اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ بیوی امیر گھرانے سے آئی ہے۔ غریب امرکانت اپنے ہی گھر میں اجنبی ہے۔ صورت حال سے غیر مطمئن ہونے کی بنا پر وہ کانگریس کمیٹی کس ممبر بن جاتا ہے۔ روشن خیال اور انصاف پسند پروفیسر ڈاکٹر شانتی کمار امرکانت سمت کچھ طلباء کو دیہاتی زندگی کا مطالعہ کرنے

کی غرض سے دیہی علاقوں میں لے جاتا ہے۔لڑکوں نے مشاہدہ کیا کہ ایک بیمار کسان کی لگان کی عدم ادائیگی کے بہانے زمیندار ڈگری کرا لیتا ہے۔ دوسرا واقعہ ارہر کے کھیت میں ایک بے بس خاتون کی گورے بے حرمتی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر شانتی کمار کی پیش قدمی پر طلباء گوروں کی جی بھر کے پٹائی کرتے ہیں۔ امرکانت باپ کے ظالمانہ رویے سے تنگ آ کر گھر چھوڑنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کی بیوی سکھدا ساتھ دینے کا اشارا دیتی ہے۔ گھر کے ساتھ ساتھ پورے سماج میں ہل چل مچی ہوئی ہے۔ وہی خاتون (منی) جس کی آبروریزی ہوئی تھی۔ تین گوروں کو قتل کرتی اور بھاگنے کے بجائے دلیرانہ اقبال جرم کر لیتی ہے اس کے ساتھ ہوئے حادثے کے بعد اس نے اپنا گھر اور گاؤں چھوڑ دیے تھے کہ انتقام ہی اس کی زندگی کا واحد مقصد رہ گیا تھا۔ ہزاروں لوگ منی کا ساتھ دیتے ہیں۔ حاکم عدالت اسی کے حق میں فیصلہ سناتا ہے۔ اس خاوند اسے قبول کرنے تیار ہے۔ مگر منی کچھ اور ہی چاہتی ہے۔

ان حالات میں امرکانت کو گاندھیائی فلسفہ اہنسا کے حوالے سے منی کا رد عل بلا جواز لگتا ہے۔ جبکہ سکھدا کو یہ جوابی تشدد درست محسوس ہوتا ہے۔ اپنے بچہ کی پیدائش کے بعد عارضی طور پر امرکانت گھر میں دلچسپی لیتا ہے۔ لیکن سکینہ س محبت کی وجہ سے وہ سکھدا سے پھر دور چلا جاتا ہے۔ سکینہ سے شادی کی خاطر وہ مسلمان ہونے کو بھی تیار ہوتا ہے۔

عوام میں سیاست سے بیداری کی وجہ سے امرکانت میونسپل کا بورڈ ممبر منتخب ہو گیا۔ لیکن امرکانت ترک وغنا کی راہ پر دیہاتوں میں نکل گیا۔ اچھوتوں کی بستی میں جہاں منی سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ اونچی ذات کی ٹھکرائن لیکن ذات پات کے

نظام سے بے نیاز چماروں کے ساتھ کنبہ کی طرح رہتی ہے۔امر کانت دیہات میں رہتے وہئے کسانوں اور جاگیرداروں کے تضاد میں وہ حق کی طرفدارفی کرتا ہے۔شہر میں شانتی کمار شودروں پر مندروں کے در کھلوانے کا میاب تحریک چلاتا ہے۔سکھدار بے گھر لوگوں کے لیے گھر بنوانے کی جدوجہد کرتی ہے۔جس میں امر کانت کی بہن سمر کانت کی بیٹی شہد ہو جاتی ہے۔اس طرح سمر کانت بھی راہ راست پر لوٹ آتا ہے۔ سلیم آی۔سی۔ایس افسر بن گیا تھا۔لیکن سرکار کو چھوڑ کر وہ بھی عوام کی صفوں میں آکر شامل ہو جاتا ہے۔ایسے تو اچھے برے کردار جیل میں یکجا ہو جاتے ہیں۔

تمام کردار حق و باطل میں سرگرم ہوتے ہیں اور سرکار کو انھیں زنداں رہا کرنا لازمی ہوتا ہے۔سیاسی اصلاحی وانقلابی تحریکوں کا اثر اس قدر ہمہ گیر ہے کہ جیل کے عادی مجرم بھی انقلابی بن جاتے ہیں۔مثلاً پکا چور کالے خاں جیل میں خدمت وایثار کا پیکر بن جاتا ہے۔وہ دیگر قیدیوں کی جگہ چکی پیستا ہے اور ان کی جگہ کوڑے کھانے کو تیار رہتا ہے وہ نہ صرف مخلوق بلکہ خالق کے حقوق بھی دل و جان سے ادا کرتا ہے ۔نماز میں سجدہ ریز ہوتا ہے تو فرعون صفت سرکاری کارندوں کے بیسوں کوڑے بھی اس کی عبادت میں خلل انداز نہیں ہوتے۔

میدان عمل کا مرکزی کردار امر کانت کا خمیر گاندھی جی کے فکر وعمل سے اٹھتا ہے گاندھی جی کا فرمان ہے کہ روزانہ آدھ گھنٹہ چرخہ چلاؤ۔امر کانت اسکول سے آتے ہی دو گھنٹے چرخہ چلاتا ہے۔باپ سمر کانت سیٹھ ہے۔بیٹے کو دولت پیدا کرنے کی مشین بنانا چاہتا ہے۔مگر امر کانت خدمت ایثار کا پیکر ہے۔باپ جب جائداد سے بے دخل کرنے کی دھمکی دیتا ہے تو اس کا ردعمل۔

''جس دن آپ کا یہ مقدس ارادہ پورا ہوگا۔ وہ میری زندگی
کا سب سے مبارک دن ہوگا۔ میں ہوس کی قید سے آزاد ہو
جاؤں گا۔ جب تک میں اس قید میں پڑا رہوں گا، میری
روح کی نجات نہ ہوگی۔''[۲]

ڈاکٹر شانتی کمار روشن خیال تعلیم یافتہ اور سیکولر دیکھائی دیتا ہے۔ لیکن گاندھی کی آندھی اسے بھی اپنا رخ بدلنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ بھکتی کے لیے چماروں پر مندروں کے دروازے بند تھے۔ لیکن وہ سیڑھیوں پر بیٹھ کر رام کتھا سنتے ہیں۔

''بھگوان کے مندر میں، بھگوان کے بھکتوں کے ہاتھوں، بھگوان کے بھکتوں پر، جوتوں کی باش ہونے لگی۔'' [۳]

ڈاکٹر شانتی کمار فلسفہ ویدانت کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ ''نوجوان سبھا'' بناتے ہیں۔ روحانی تعلیم کا درس دیتے ہیں۔

''وہی اعلیٰ ہے، جس کا باطن پاک ہے وہی انیٰ ہے جس کا
باطن کثیف ہے۔ اس تذکرے میں روحانی عروج کا ایک
زندہ پیغام تھا۔ جیسے سن کر ناظرین کو ایسا محسوس ہوتا تھا گویا
ان کی اندرونی زنجیریں ٹوٹ گئی ہیں اور دنیا جنت کا نمونہ
بن گئی ہے۔'' [۴]

ڈاکٹر شانتی کمار نے شودروں کو بتایا کہ غلامی انھیں ایشور کی طرف سے نہیں ملی۔ وہ سماج کی بنیاد ہیں۔ ٹھاکر جی کے درشن کرنا ان کا حق ہے۔ یوں تو مندر کی جانب عوامی یلغار کی تحریک آغاز ہوئی۔[۵]

عدم تعاون کی تحریک میں گاندھی جی نے سرکاری و نیم سرکاری اداروں کے بائیکاٹ کا فرمان جاری کیا تھا۔ ڈاکٹر شانتی کمار نے غیر سرکاری تعلیمی ادارہ ''سیوا آشرم'' کھول دیا۔ یہی نہیں وہ ہر ہر تہذیب یافتہ طبقے سے واقف ہو گئے کہ وہ خود پرستی اور ذاتی مفاد کی دلدل میں دھنسا ہوا ہے۔ یورپ کی غلامی میں ڈیڑھ سو برس میں روحانیت پر مادیت نے بالادستی حاصل کر لی ہے۔ تاہم انھیں یقین ہے۔

''ہندوستان کی روح ابھی تک زندہ ہے۔ وہ وقت جلد
آنے والا ہے جب ہم خدمت اور ترک کے پرانے معیار
پر لوٹ آئیں۔'' ۶

امرکانت جس دیہات میں مظلوم کسانوں کی نجات کے لیے پہنچا تھا۔ وہاں اس کا تضاد ایک مہنت جی سے ہوتا ہے مہنت لاکھوں ایکڑ ارضی کے مالک اور کسانوں پر ظلم کرنے کا کوئی حربہ نہیں چھوڑتے، سب کو عمل میں لاتے۔ مہنت کو اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والے سوامی جی ہیں۔ تشدد کے راستہ پر چلتے ہیں۔ امرکانت اور اس کے والد ستہ گرہ کے پابند ہیں۔ سمرکانت سوامی جی کو گاندھی جی کا درس یاد دلاتا ہے۔

''سوامی جی آپ کو اپنی روحانیت سے اپنے حاکموں کو راہ
راست پہ لاتا ہے۔ آپ ظلم پر ظلم سے نہیں پریم سے فتح پا
سکتے ہیں۔'' ۷

مصنف کے خیالات کا ترجمان خاص امرکانت ہے۔ جس کا فکر و عمل اس بات کو واضح کرتا ہے کہ حیات و کائنات کی بنیاد حق و صداقت پر مبنی ہے۔ بے لوگ بھی

آخر میں اچھے ہو جاتے ہیں۔

''ہر ایک انسان کے دل کی گہرائیوں میں وہ تار موجود ہے جس میں قربانیوں سے جھنکار پیدا ہوتی ہے۔'' ۸

ستہ گرہ میں مارنے کے بجائے مرنے سے ظالم کے دل کی گہرائیوں میں دبے ہوئے حق وصداقت اور پیار کے تار کبھی نہ کبھی جھنجھنا اُٹھتے ہیں۔ان تاروں کے ہونے کا ہر ایک کو احساس ضرور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ غلط کاموں پر بھی اچھائی اور بھلائی کے پردے ڈالنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔

''آج طاقت اور جبر کے پجاریوں میں بھی یہ ہمت نہیں کہ وہ کسی کمزور قوم پر اس اعلان کے ساتھ حملہ کر سکے کہ ہم تمہارے اوپر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔۔اسے بھی اپنے دعوے کی حمایت کے لیے صداقت یا تہذیب یا تنظیم کا پردہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔'' ۹

پریم چند تمام برے کرداروں کی اصلاح کرتے ہیں۔ ہر ایک کے دل میں نیکی کا تار موجود تھا جو کبھی جلدی تو کبھی دیر سے جھنجھلاتا ہے۔

میدان عمل میں مسٹر غزنوی کا مقصد یہ ہے کہ انقلاب وہ بھی چاہتے ہیں مگر پرامن انداز میں۔اگر حکومت دفاعی اخراجات نصف کر دے تو لگان اور دیگر ٹیکسوں میں اتنی کمی ہو سکتی ہے کہ عوام اپنی حالت میں انقلابی تبدیلی محسوس کریں گے۔ایسے تو انقلاب کے بغیر آزادی ممکن ہے۔لیکن ایسی آزادی دامن میں کچھ خطرات بھی لائے گی۔مسلمان فاتحین کی زیادتیوں کو مبالغہ آمیز انداز میں بیان کر کے شر پسند ہندو مسلم

فسادات کی آگ بھڑکا سکتے ہیں۔ ہندوؤں کو کون سمجھائے گا کہ مسلمانوں کی جگہ وہ حکمران ہوتے تو زیادتیاں ان سے بھی ہو جاتیں۔ بہرحال یہ بات غور طلب ہے کہ ہندو زیادہ تعداد میں جدید تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے وہ مذہب کے بجائے سیکولرزم کو بروئے کار لائیں گے۔ ایسے بھی۔

''مذہب کا دور۔۔۔۔۔ختم ہو گیا ہے۔صرف ہندوستان میں اس کی کچھ جان باقی ہے ۔ یہ معاشیات کا دور ہے۔''[۱۰]

لوگ اپنے اپنے طبقات کے مفاد میں معاشی آزادی کی جنگ لڑیں گے۔ اس مقصد کے لیے الگ الگ گروہ، الگ الگ جماعتیں وجود میں آئیں گی۔ ان میں محاز آرائی ہوگئی۔ انسان مالک و مزدور دو طبقات میں تقسیم ہے۔ مسٹر غزنوی کے خیال میں بنیادی انسانی حقوق کے بارے میں بیداری بڑھ رہی ہے۔

''شاید ہی کوئی تعلیم یافتہ آدمی ملے جو مساوات کا حامی نہ ہو آخر، ایک دو صدی کے بعد دنیا میں ایک سلطنت قائم ہو جائے گی۔ ساری دنیا کے لیے ایک قانون ہوگا۔ ایک نظام ہوگا۔ ایک معیار ہوگا۔۔۔۔۔۔ مذہب محض شخصی چیز رہ جائے گی۔ حاکم اور محکوم کی تمیز اٹھ جائے گی۔[۱۱]

خواتین کے لیے پریم چند خاصے روشن خیال ثابت ہوئے ہیں۔ وہ خاتون کو مرد سے بلند و برتر مقام دیتے نظر آتے ہیں۔ خدمت اور ایثار میں وہ مرد سے کہیں آگے ہے۔ وہ مرد کے رحم و کرم پر ہرگز نہیں رہتی ہیں۔ امرکانت اس کی بیوی سکھدا

کی پرواہ کیئے بغیر سماجی بھلائی کے کاموں پر تنہا گھر چھوڑ دیتا ہے۔سکھدا نہ صرف عوامی جدوجہد کی قیادت کرتی ہے بلکہ اس کا فیصلہ یہ بھی ہے کہ مرد کے سماج میں وہ الگ رہے گی۔اپنی حفاظت خود کرے گی۔۱۲؎

ڈاکٹر شانتی کمار کے الفاظ میں:

''۔۔۔۔۔ارتقاء کے عمل میں وہ (مرد)عورت سے بہت پیچھے ہے۔جس دن اس کا ارتقائی سفر پورا ہو جائے گا وہ بھی عورت ہو جائے گا۔ ہمدردی، رحم، قربانی اور خدمت ان ہی بنیادوں پر دنیا کا نظام قائم ہے اور یہی سب نسوانی اوصاف ہیں۔۔۔۔۔''۱۳؎

صدیوں سے ہندو عقیدے کے تحت جینے والے ہندوستانیوں نے خواتین کو کمتری اور غلامی کی زنجیریں پہنا رکھی ہیں۔ پریم چند انھیں توڑتے ہیں۔خواتین آزاد ہیں۔آزادی کا بنیادی حق ہے۔اگر اس میں خدمت و ایثار کی صفات نہ ہوں تو وہ مرد کو غلام بنانے کی قابلیت رکھتی ہیں۔انھیں صفات کی بنا پر مرد کا معاشرہ مستحکم ہے۔گویا مرد کی آزادی کا راز خاتون کے ایثار کی بدولت ہے۔

سکھدا کی والدہ خدمت و ایثار کا عمدہ مثالی کردار ہے۔وہ اپنا کل سرمایہ شانتی کمار کے سیوا آشرم کے نام کر دیتی ہے کہ وہ نوکری سے استعفیٰ دے کر غریب مفلس طلباء کو بہترین تعلیم دے سکیں۔سکھدا بے گھروں کو گھر دلانے کی تحریک چلاتی ہے۔اسی جدوجہد میں گرفتار ہوتی ہے۔ان حالات میں خواتین کا احترام سمر کانت سیٹھ کرتا ہے۔

''عورتوں کو دنیا صنف نازک کہتی ہے۔کتنی بڑی جہالت

ہے۔انسان جس چیز کو۔۔۔۔۔عزیز سمجھتا ہے وہ اس کی
مٹھی میں ہے۔۔۔۔۔''[۱۴]

نینا جیل جانے کے بجائے ظالم کی گولی کا شکار ہوگئی۔رما دیوی،سکینہ،منی اور سب سے بڑھ کر سکھدا نے خدمت وایثار کی بدولت ہیرو کا سر نیچا کر دیا۔یہ سب جیل میں تھیں۔امر کانت نے سب کو خراج تحسین پیش کیا۔تاہم سکھدا کے سامنے سر تسلم خم کر کے کہتا ہے۔

''۔۔۔۔۔میں سمجھتا تھا کہ ان کے ساتھ (سکھدا کے
ساتھ) میری زندگی برباد ہوگئی لیکن آج میں ان کے
قدموں کی خاک اپنی پیشانی پر لگانے میں اپنی عزت سمجھتا
ہوں۔میں سب ہی ماؤں بہنوں کے سامنے ان سے عافی
مانگتا ہوں''[۱۵]

ایسے بھی پریم چند ہیرو کے جگہ شوہر کو ہٹا کر بیوی کو بٹھائے ہیں۔خاتون کی آزادی کی اس سے بہتر مثال اور کیا بن سکتی ہے۔

میدان عمل کی نینا، ہندوستان کے حوالے سے انقلابی دستک کی طرف اس طرح اشارہ کرتی ہے۔

''میں لکشمی کے بیٹیوں سے کہتی ہوں، انقلاب کے
درندے کو چھیڑ چھاڑ کر نہ جگائیے۔اسے جتنا چھیڑو گے اتنا
ہی جھلائے گا اور جب وہ بلآخر۔۔۔زور سے دھاڑے گا
تو پھر آپ کو بھاگنے کی رہ نہ ملے گی۔۔۔۔۔'' [۱۶]

غرض یہ کہ پریم چند کسی بھی ازم کے پابند نہیں ہیں۔ وہ نئی صورت حال کا ادراک معروضی مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ پریم چند کا پیغام یہ ہے کہ کرہ ارض کے رہنے والے، ارضی حقیقتوں کا ادراک پہلی فرصت میں کریں۔ فکر و استدلال اور آئین کی راہ اپنائیں۔ اس طرح اخوت، مساوات اور آزادی کے ستونوں پر جنت ارضی کی تعمیر کریں۔ رام رحیم کے ماننے والے ہاتھ اٹھائیں ملانے کے لیے نہ کہ مارنے کے لیے۔ ہندو مسلم تو وطنی بھائی ہیں۔ پریم چند مذہب کی بنا پر بنی نوع انسان کو ٹکڑوں میں بٹا دیکھنے کے قائل ہیں۔ لکھتے ہیں۔

> ''میرے لیے رام رحیم، بدھ، عیسیٰ: سب ہی عقیدت والے کردار ہیں اور ان سب کو مہان انسان سمجھتا ہوں۔۔۔۔ میں ایک انسان ہوں۔۔۔۔ جو انسانیت رکھتا ہوں۔۔۔۔''[۱۷]

الغرض پریم چند کا نقطہ نظر، انقلابی ہے۔ فسادی نہیں۔ وہ قومی و سماجی آزادی کے علمبردار ہے۔ وہ اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ قوم کو باور کراتے ہیں کہ مذہبی فساد بدترین تشدد ہے اس کے نتیجہ میں کوئی انقلاب نہیں آتا۔ کوئی آزادی نہیں ملتی۔ روس والوں نے اگر تشدد کیا تو وہ مناسب تھا یوں تو ان کی زندگی میں انقلاب آیا۔ استحصال ختم ہوا اور کمزور و محنت کش عوام نے نئی زندگی ملی۔

پریم چند کو آزادی بہت عزیز ہے۔ غلامی وحدت انسانی کو پارہ پارہ کر رکھا ہے نہیں تو انسان اور انسان کے مابین کوئی تفریق نہیں ہے۔

حواشی:

۱۔ پریم چند بنام دیانرائن نگم ۱۹۱۰ء: پریم چند کے خطوط: مرتبہ مدن گوپال: ۳۷

۲۔ میدان عمل: ۹۰۔۹۸

۳۔ میدان عمل: ۲۶۴

۴۔ میدان عمل: ۲۶۷

۵۔ میدان عمل: ۷۰۔۲۶۹

۶۔ میدان عمل: ۲۸۶

۷۔ میدان عمل: ۴۳۶

۸۔ میدان عمل: ۴۶۳

۹۔ میدان عمل: ۴۶۴

۱۰۔ میدان عمل: ۳۹۹

۱۱۔ میدان عمل: ۳۹۹

۱۲۔ میدان عمل: ۲۸۴

۱۳۔ میدان عمل: ۲۸۸

۱۴۔ میدان عمل: ۳۴۸

۱۵۔ میدان عمل: ۴۹۰

۱۶۔ میدان عمل: ۷۷۔۴۷۶

۱۷۔ شیورانی دیوی: پریم چند گھر میں: ۱۵۹

☆☆☆☆☆

جدوجہد آزادی ہنداور اُردو زبان وادب

ڈاکٹر محمد سمیع الدین
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو،
سکیاب اے۔آر۔ایس انعامدار ڈگری کالج
برائے خواتین، وجئے پور (کرناٹک)

ہمارا ملک ہندوستان گنگا جمنی تہذیب کے لئے عالمی سطح پر مقبول ہے۔ جسے سونے کی چڑیا کہا جاتا ہے جس کو انگریزوں کی نظر لگ گئی اور وہ مغلیہ سلطنت کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو شکست دے کر انہیں رنگون میں قید کر دیتے ہیں۔ 1857ء کی ناکام بغاوت کے بعد ہندوستان کی تہذیبی وادبی، معاشی صورت حال میں بگاڑ آجاتا ہے انگریز بڑی دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے ہندوستان پر قابض ہوجاتے ہیں اب ہندوستانیوں کے لئے یہ بڑا مسئلہ تھا کہ کس طرح انگریزوں کو ہندوستان سے بھگا دیا جائے تب ہمارے شعراءوادبا شعروادب کے ذریعہ ہندوستانیوں کے اندر جذبۂ آزادی حب الوطنی کے راگ الاپنے لگے اوران کے ضمیروں کو جھنجوڑنے کا کام کرنے لگے یقیناً جدوجہد آزادی میں اُردو زبان وادب کا بہت ہی اہم کردار رہا ہے۔ ہندوستان کی آزادی ہمیں ایسے ہی نہیں ملی بلکہ شاہ ولی اللہ، نواب سراج الدولہ، حضرت ٹیپو سلطان، بہادر شاہ ظفر وغیرہ نے اپنی جانوں مالوں کی قربانیاں پیش کی اور تب کہیں جاکر ہمارے ملک کو انگریزوں سے نجات حاصل ہوئی۔

1857ء سے 1947ء یعنی پورے 90 سال کا یہ آزادی والا سفر کافی مشکل رہا اس آزادی کے لئے مختلف تحریکات کے ذریعہ انگریزوں کو ملک چھوڑنے پر مجبور کیا گیا جس میں بالخصوص مسلمانوں نے ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں کا بھرپور ساتھ دیا بلکہ ان کے ساتھ شانہ بہ شانہ حصہ لیا اور اپنی زندگیاں قربان کی اور مختلف تکالیف، اور سزاؤں کو برداشت کرتے ہوئے صبر وتحمل اور خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آزادی کی جنگ میں اپنی جانوں کو قربان کر کے وطن عزیز سے محبت کرنے کا ثبوت پیش کیا۔ ان ہی کی قربانیوں کے بعد ہمیں مکمل آزادی نصیب ہوئی۔

اُردو کے شاعر اور ادیب بحیثیت مجموعی ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں نہ صرف شریک بلکہ پیش پیش رہے تھے۔ اس سلسلہ میں آلِ احمد سرور لکھتے ہیں:

> ''جدید اُردو نثر میں دو سب سے بڑے نام حالؔی اور پریم چند کے ہیں۔ دونوں کے یہاں حب وطن کا ایک گہرا احساس ہے۔ دونوں محدود وطنیت کے بجائے انسانیت کا ایک تصور رکھتے ہیں دونوں کے یہاں خدمت عبادت ہے۔ مگر پریم چند کے ہاتھوں ناول اور افسانے ہندوستان کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز بن جاتے ہیں۔ یہاں ارتعاش رنگیں اور آشوب خیال والا حسن و عشق نہیں زندگی، انسانیت، سماجی مقاصد، معاشرتی اصلاح، قومی عروج اور آزاد روح کا حسن ہے۔ پریم چند کی پیروی میں ہمارے افسانہ نگاروں نے غلامی کے خلاف نفرت پیدا کی ہے۔ آزادی کا ولولہ پیدا کیا ہے۔ مغربی سیاست کی قلعی کھولی ہے۔

ہندوستان کے باشندوں کو قومی مقاصد کے یکجا ہونے کا سبق پڑھایا ہے۔ ابھی تک آزادی کا کوئی واضح تصور ہمارے سامنے نہ تھا۔ فرد کی آزادی، تحریر و تقریر کی آزادی، مساوات غرض وہ تمام چیزیں جو ایک نئے اور بہتر سماج کی بنیاد ڈالنے کے لئے ضروری ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے ذریعے سے سامنے آئیں اور ترقی پسند تحریک کو ہمارے ادب کی سب سے بڑی تحریک بنانے میں پریم چند کا بہت بڑا حصہ ہے۔''

(ہندوستان کی جنگ آزادی میں اُردو کا حصہ، آل احمد سرور Rekhta.com)

تحریک آزادی اور اُردو زبان کا مضبوط اور اٹوٹ رشتہ ہے۔ ہندوستان کی آزادی میں اُردو زبان و ادب کا کردار مجاہدانہ اور سب سے نمایاں رہا ہے۔ اُردو صحافت اور نظم و نثر نے ایوانِ فرنگی کی بنیادیں ہلا دی تھیں اور انگریزوں کی نیند حرام کر دی تھی۔ اُردو صحافت کا کردار اس طرح سے تھا کہ لوگ مولانا ظفر علی خاں کا اخبار زمیندار ایک آنہ دے کر خریدتے اور ایک آنہ دے کر پڑھاتے تھے۔ اور مولانا محمد علی جوہر کا اخبار ہمدرد بھی جدو جہد آزادی میں اہم رول نبھایا ہے۔ ہمارے ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد اُردو زبان کے شیدائی تھے بلکہ وہ خود اُردو کے بہترین قلمکار ہیں جنہوں نے الہلال و البلاغ کے ذریعہ جدو جہد آزادی میں حصہ لینے کی بات کرتے ہیں۔ انہوں نے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی وجہ سے کئی بار جیل جا چکے ہیں جنہوں نے اُردو زبان اور تحریک آزادی کے لئے اپنی زندگی لگا دی۔ اُردو زبان کے اشعار، اقوال اور نعرے مجاہدین آزادی کی رگوں میں

جوش وولولہ بھر دیتے تھے اور وطن کی محبت سے سرشار ہو کر مسکراتے ہوئے تختہ دار پر چڑھ جاتے اور سر کٹانے پر آمادہ کر دیئے تھے۔ بزرگ مجاہد آزادی مہر چند آہوجہ کے یہ الفاظ کتنے سچے ہیں:

''ہم مجاہدین آزادی کی جس زبان نے فرنگی حکومت کی بنیادوں میں زلزلے ڈالے وہ زبان صرف اُردو تھی بلکہ یہ بھی میرا ایمان ہے کہ اُردو نے دوسری زبانوں کے مقابلے میں حب الوطنی کے جذبوں کو سب سے زیادہ تقویت پہنچائی۔ آزادی کی داستاں سناتے ہوئے مجھے اکثر یہ شعر یاد آتا ہے،

؎ اپنے محبوب سے جب پیار کیا تھا میں نے
کاسۂ سر میں لہو بھر کے دیا تھا میں نے

اُردو کو کل بھی ایک تحریک سمجھتا تھا اور آج بھی ایک تحریک سمجھتا ہوں ہمالہ کی بلندیوں سے گنگا جمنا کی مچلتی لہروں تک اُردو کی وسعتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ آزادی اور انقلاب کی جب مجھے یاد آتی ہے تو میں کہتا ہوں کہ بنکے بابو، روی ٹھاکر، لوک مان تلک، بال، پال اور لال جیسے قد آور مجاہدین آزادی نے جب لوگوں کو کرانتی امر رہے سمجھانا چاہا تو عوام پورے طور پر نہ سمجھ سکے لیکن جب سردار بھگت سنگھ اور وینکشور دت نے اسمبلی ہال میں اُردو کے دو لفظ انقلاب زندہ آباد، للکارے تو ہندوستانیوں کو انقلاب کے معنی معلوم ہو گئے''

(تحریک آزادی میں اُردو زبان کا کردار، عبدالسمیع، ماہنامہ اُردو دُنیا اگست 2022ء صفحہ 18)

جدوجہد آزادی میں اُردو زبان وادب کے کردار کے متعلق مہر چند آہوجہ ہی اعتراف نہیں کرتے بلکہ اندرا گاندھی نے بھی جدوجہد آزادی میں اُردو کے کردار کے متعلق وہ 17 رنومبر 1973ء کو قیصر باغ بارہ دری لکھنؤ میں منعقد اُردو ایڈیٹرس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے واضح انداز میں کہا تھا:

''اُردو ایک زندہ زبان ہے، اُردو نے ملک کی آزادی میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اگر اُردو کمزور ہوگی تو ملک کمزور ہوگا۔''

(ماہنامہ اُردو دُنیا نومبر 2011ء صفحہ 34)

اس کے علاوہ مہاتما گاندھی جی بھی اُردو زبان وادب سے بے حد متاثر تھے اور انہوں نے بھی جنگ آزادی میں جو اُردو زبان وادب کا حصہ رہا ہے اس کا وہ دل سے اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں اُردو اپنے طور پر ترقی کرے گی جس میں عربی اور فارسی کے الفاظ کو بالادستی حاصل ہوگی۔ اسی طرح ہندی بھی اپنے طور پر ترقی کرے گی جس میں سنسکرت الفاظ کی آمیزش زیادہ ہوگی۔ تلسی داس اور سورداس کی زبان کبھی نہیں مرسکتی۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح شبلی کی زبان نہیں مرسکتی۔

اُردو شاعری میں ہمیں سامراجی طاقتوں کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار ملتا ہے۔ غزل جو معاملات حسن وعشق اور واردات قلبی کی ترجمان سمجھی جاتی ہے اس میں بھی سلگتے ہوئے حالات کی آہٹ محسوس ہوتی ہے شاعر طنز وظرافت کا لحاف اوڑھے ہوئے اپنے عہد کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی ہے انہوں نے ظالم انگریزوں کو کبھی گلچیں کبھی صیاد کا نام دے کر ان کے خلاف بغاوت کا اظہار کیا ہے اور

ان کے ظلم وستم کا تذکرہ کر کے ہندوستانیوں کے دلوں میں بغاوت کی آگ بھڑکانے کی کوشش کی چند اشعار بطورِ نمونہ پیش ہیں:

داغ گر جھوٹا نہیں یہ کس کا لہو ہے قاتل
ہاتھ بھی دکھ گئے دامن ترا دھوتے دھوتے
(آرزو)

صبا سے ہر سحر مجھ کو لہو کی باس آتی ہے
چمن میں آہ گلچیں نے کس بلبل کا دل توڑا
(سودا)

یہ عیش گہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے
ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا
(میر)

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
(غالب)

جتنی بوندیں ہیں شہیدان وطن کے خون کی
قصر آزادی کی آرائش کا ساماں ہوگئیں
(ظفر علی خاں)

ہم قول کے صادق ہیں اگر جان بھی جاتی
واللہ کبھی خدمت انگریز نہ کرتے

(حسرت موہانی)

غزلوں کے علاوہ ہمارے شعراء نے نظموں میں اور بھی زیادہ کھل کر اپنے قلبی واردات کا اظہار کیا ہے۔ جس کی وجہ سے ہمارے شعراء وادباء کو سخت سزائیں انگریزوں کی طرف سے بھگتنی پڑیں اور جان و مال کا شدید نقصان اٹھانا پڑا۔ امام بخش صہبائی اپنے خاندان کے اکیس افراد کے ساتھ قتل کر دئے گئے، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی جاگر ضبط ہوئی اور انہیں سات سال قید کی سزا دی گئی جس سے بعد میں وبری ہو گئے۔ ظہیر دہلوی عرف مرزا نواب دہلوی کو بھی بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا اور در بدری ان کا مقدر بنا۔ اس کے علاوہ انگریزوں کے ظلم وستم کا نشانہ بننے والے ایک شاعر منیر شکوہ آبادی بھی تھے جنہیں عمر قید کی سزا دے کر کالا پانی بھیج دیا گیا تھا۔ ویسے تو بے شمار شعراء وادباء ہیں جنہوں نے اپنی زندگیوں کو قربان کر کے آنے والی نسل کے لئے راحت کا ذریعہ بنے۔

جذبۂ آزادی، حب وطن اور اتحاد واتفاق کے حوالے سے ڈاکٹر اقبال کی شاعری بالکل منفرد انداز کی ہے۔ انہوں نے اُردو شاعری کو نیا شعور، آفاقی فکر، ذہنی بلندی، جدید لب ولہجہ اور انوکھا احساس دیا۔ ان کی شاعری کا آغاز ہی وطن کی محبت کے اظہار واعتراف سے ہوتا ہے۔ ان کی لافانی نظمیں ''ترانۂ ہندی'' ''نیا شوالہ'' ''تصویر درد'' اور ''شعاع امید'' اپنی مثال آپ ہیں۔ نیا شوالہ میں وہ مذہبی ٹھیکہ داروں کے حوالے سے عوام کو اپنی اپنی حدود سے نکل کر وسیع محبت ومساوات اپنانے کا درس دیتے اور انہیں اس نکتے سے آگاہ کرتے ہیں کہ ملک کے باشندوں کے لئے آپسی میل محبت ہی امن وسکون کا نسخۂ کیمیا ہے اس لئے اقبال کہتے ہیں:

وطن کی فکر کر ناداں، مصیبت آنے والی ہے
تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

تحریک آزادی کے وقت مذہبی اتحاد بھائی چارہ، آزادی اور وطن پرستی کی ایسی جھنکار اُردو شاعری میں سنائی دیتی ہے۔ جس نے انقلاب کے شمع ہندوستانیوں کے دلوں میں جلادی اُردو ادب نے سوئے ہوئے دلوں میں اُمید کی کرن اور مایوس لوگوں میں انقلابی کیفیت پیدا کردی۔ علامہ اقبال کی شاعری کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں حب الوطنی کا جذبہ لبریز ہوتا ہوا نظر آیا اور انگریز مخالف جذبات سے پُر شاعری پڑھ کر بھی لوگوں میں ایک جنون پیدا ہوا۔ انہوں نے غلامی سے نجات دینے والی اور خون کے آنسو رلانے والی نظمیں لکھیں۔ جب گاندھی جی نے تحریک عدم تعاون چلایا تو حسرت موہانی اور مجاز لکھنوی جیسے وطن پرستوں کی شاعری نے بھی لوگوں کو بیدار کرنے کا کام کیا یہ وہ دور تھا جب اُردو شاعری میں انقلاب کی آگ نظر آرہی تھی مجاز لکھنوی کے ان اشعار کو ہی دیکھ لیجئے:

جلال آتش برق شہاب پیدا کر
ازل بھی کانپ اُٹھے وہ شباب پیدا کر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو خود انقلاب پیدا کر

ایسے وقت میں اشفاق اللہ خاں کی شاعری نے بھی ہندوستانی عوام کے

دلوں میں اپنی جگہ بنائی اوران میں نیا جوش پیدا کیا۔ ویسے سیکڑوں شعراء ہیں جنھوں نے وطن پرستی، جذبۂ انقلاب کے موضوع پر شاعری کی ہے جن میں بالخصوص حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، پنڈت برج نارائن چکبست، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، ساحرلدھیانوی، جاں نثار اختر، مجاز، کیفی اعظمی، اختر الایمان، پنڈت آنند نرائن ملا، وغیرہ نے اپنی شاعری اورتن من دھن سے تحریک آزادی کوتوانائی اور زندگی بخشی، جنگ آزادی میں اُردو زبان نے تاریخ ساز کردارادا کیا ہےاور ہمیشہ اُردو زبان انگریزی سامراج سے نبرد آزما رہی ہے۔
علی سردار جعفری نے صحیح لکھا ہے:

> ''اُردو والوں نے آزادی کی جدوجہد کوقومی دائرے تک محدود نہیں رکھا اس کے دائرے مابین قومیت ملائے اور اس طرح عوام میں ایک زیادہ جاندار اور ہمہ گیر شعور بیدار کیا۔ اُردو ادب نے جس طرح ملک کوآزاد کرانے میں اہم رول انجام دیا اسی طرح وہ پندرہ اگست 1947ء سے لے کرآج تک ملک وقوم کی خدمت میں مصروف ہیں۔''

(ہندوستان میں اُردو کا ماضی حال اور مستقبل، ڈاکٹر محمد نعمان مشمولہ جنگ آزادی میں اُردو کا حصہ، مرتب اقبال بیدار، بھوپال 1998ء صفحہ 57)

جدو جہد آزادی کے حوالے سے نہ صرف شاعری بلکہ اُردو نثر کی تمام اصناف ناول، افسانہ، ڈرامہ، طنز ومزاح، خودنوشت، وسوانح اور صحافت نے اہم کردار نبھایا ہے پریم چند، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، علی عباس

حسینی، عزیز احمد، سجاد ظہیر، حیات اللہ انصاری، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ ایسے نام ہیں جنہوں نے اُردو میں اپنی لازوال تحریروں سے ملک کی آزادی کا پرچم بلند کیا۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ انگریزوں کی سازشوں کو بے نقاب کیا۔ یہی وجہ ہے کہ پریم چند کے پہلے افسانوی مجموعہ ''سوز وطن'' کو انگریزوں نے ضبط کر کے اس پر پابندی لگادی تھی اسی طرح سے یہ کیفیتیں دیگر مصنفین کے ساتھ بھی پیش آتی رہی ہیں لیکن ان کی تحریروں سے انگریزوں کی پریشانیاں بڑھ رہی تھیں تو دوسری طرف آزادی کے متوالوں میں جوش وخروش ابھر رہا تھا تحریک آزادی زور پکڑ رہی تھی اور کئی صحافیوں، لیڈروں، مصنفین کی گرفتاریاں بھی عمل میں آئی۔ اُردو نثر کی تحریک آزادی میں خدمات کے بارے میں پروفیسر ضیاء الرحمان صدیقی رقمطراز ہیں:

> ''انگریزوں نے اپنے نوآبادیاتی نظام کو مستحکم کرنے کے لئے جن تصورات کو فروغ دیا ان میں قومیت کا شعور بھی تھا جو ہندوستان کے حق میں آزادی کی نعمت کا مقدمہ ثابت ہوا۔ ہندوستان میں قومی شعور کی بیداری کے ساتھ جنگ آزادی میں تیزی اور ہمہ گیری پیدا ہوگئی اور ہندوستانیوں نے انگریزوں کو اپنے ملک سے باہر نکالنے کا مصمم ارادہ کرلیا تحریک آزادی کے فروغ اور قومی شعور کی بیداری میں اُردو زبان وادب نے عموماً اور اُردو نثر نے خصوصاً ایک اہم اور موثر کردار ادا کیا اور آزادی کی تحریک میں ایک نئی روح پھونکی۔''

(تحریک آزادی میں اُردو زبان کا کردار، عبد السمیع، ماہنامہ اُردو

دُنیا اگست 2022ء صفحہ 20-19)

اُردو کے شعراء و ادباء نے اپنے ملک اس کی آزادی اور ملک کے باشندوں سے محبت اور ان کے اتحاد امن کی خواہش و کوشش کا ثبوت ہے کہ 1857ء سے لیکر 1947ء تک آزادی کی فضا تیار کرنے میں اہم کردار نبھایا ہے اور وہ اپنی کوشش میں بالآخر کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔ جدو جہد آزادی میں ہمارے رہنماؤں نے متحد ہو کر اس ملک کو آزاد کرنے میں نا قابل فراموش کارنامہ انجام دیا ہے۔ اور رہتی دنیا تک ان کی قربانیوں کو یاد کیا جائے گا اور آزادی وطن کی جدوجہد میں اُردو زبان و ادب نے جو کردار نبھایا ہے کسی اور زبان و ادب میں یہ مثال ملنا مشکل ہے۔

☆☆☆☆☆

جدوجہدِ آزادی ہنداور اردو صحافت

ڈاکٹر نداف محمد فیاض عبدالقادر

صدر شعبہ اردو

شیواجی مہاودِیالہ، اودگیر، ضلع لاتور

ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں اردو صحافت نے قابلِ تعریف کردار ادا کیا ہے۔ ہندوستان کو آزاد کرانے اور انگریزوں کو ملک سے بھگانے اور ایک آزاد حکومت کو قائم کرنے کو ممکن بنانا یہ ہر ایک تحریک کا اہم مقصد تھا۔ ہر تحریک اپنے غصّے کا اظہار مختلف انداز سے کر رہی تھی۔ اور حکومت سے ٹکّر لے رہی تھی۔ ایسے دور میں اردو صحافت نے بھی لوگوں میں انقلابی جوش و جذبہ پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اس جدوجہد کو ہم اردو صحافت کی تحریک کا نام دے سکتے ہیں۔ کیونکہ ملک کی آزادی میں صحافیوں نے بھی اپنی جانیں قربان کی ہیں۔ مولوی محمد باقر پہلے صحافی تھے جنہوں نے ملک کی آزادی کی خاطر جان کی قربانی دی۔

(اِ۔ص۔۱۸۸، اردو صحافت آزادی کے بعد)

ہندوستان میں اردو زبان سے متعلق ہمیں یہ معلومات ملتی ہے کہ ۱۸۰۰ء میں انگریزوں نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ڈال کر اردو زبان کو آسان سے آسان تر کر کے ہندوستان میں عام بولی جانے زبان کو سکھ کر سمجھ کر دیر پا حکومت کرنے کے سپنے دیکھے تھے۔ ۱۸۳۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اردو کو ہندوستان کی سرکاری زبان بنایا جبکہ اس سے قبل فارسی سرکاری زبان تھی اور عوام میں اردو پہلے

سے ہی رائج تھی۔

اردو کا پہلا اخبار ''جامِ جہاں نُما'' ۱۸۲۳ء میں کلکتہ کی سرزمین سے منظر عام پر آیا۔ یہ اخبار ہفتہ واری اخبار تھا جسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی ضرورت کے تحت نکلوایا تھا۔ یہ اخبار کبھی اردو میں کبھی فارسی ،کبھی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔اس اخبار کے مالک ہری ہردت تھے اور ایڈیٹر لالہ سدا سکھ رائے تھے۔(۲ ۔ص۔ ۷۹۔اردو صحافت آزادی کے بعد)اس کے بعد اردو اخبار ایک کے بعد ایک نکلنا شروع ہوگئے۔ چنانچہ ۱۸۲۳ء سے ۱۸۵۷ء کے غدر تک اردو اخبارات کی تعداد ۱۲۲ تک پہنچ گئی۔اور یہ تعداد بڑھتے بڑھتے ۱۹۰۰ء تک ۴۰۰ تک پہنچ گئی۔اردو اخبار سے متعلق 'بھارت متر' کلکتہ کے ایڈیٹر بال مکند نے ۱۹۰۴ء میں ایک بڑی دلچسپ بات لکھی تھی وہ یہ ہے کہ:۔

> ''ہندی اخباروں کے ریویو کا خیال دل میں آتے ہی پہلے اردو اخبار کی طرف نگاہ جاتی ہے کیوں کہ اردو اخبارات ہندی اخبارات سے پہلے جاری ہوئے اور پہلے ہی انہوں نے ترقی کے میدان میں قدم آگے بڑھایا۔ظاہر ہے اردو اور ہندی میں اس وقت بڑی نا چاقی ہے اردو کے طرفدار ہندی والوں کو اور ہندی کے طرفدار اردو والوں کو ذرا ترچھی نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر حقیقت میں اردو اور ہندی کا بڑا میل ہے یہاں تک کہ ایک ہی شہ کہلانے کے لائق ہیں جس نے فارسی رسم الخط کا جامہ پہننے سے اردو نام پایا وہی دیوناگری کے لباس میں ہندی کہلائی۔''

(ص۔۸۰۔اردو صحافت آزادی کے بعد)

۱۸۲۳ء سے ۱۸۵۷ء تک شائع ہونے والے اخبارات کی سرپرستی برطانوی حکومت کرتی تھی اور بیشتر کا پیاں خود حکومت خریدتی تھی۔۱۸۲۳ء سے ۱۹۰۰ء تک شائع ہونے والے اردو اخبارات کے مالک ۲۵ فی صد ہندو تھے۔اور قارئین میں ہندوؤں کی تعداد ۲۵ فی صد سے لے کر ۶۰ فی صد تک تھی۔ اردو اخبارات نے باغیانہ مضامین، جذبات کو برانگیختہ کرنے والی نظمیں اور ہندوستانیوں پر انگیزوں کے مظالم کو نمایاں انداز میں شائع کیا۔ملک کے کئی زبانوں کے اخباروں نے بھی جنگِ آزادی میں اپنا حصہ لیا ہے لیکن اردو صحافت ذہن و دل کی ترجمانی اور اس کو تسخیر کرنے میں پیش پیش رہی ہے۔بقول ظ۔انصاری:۔

> ''مزاج اس زبان کا بہر حال سوداوی ہے اسے گرمی جلدی چڑھتی ہے اور موسم بھی گرم ہو (کسی سیاسی یا ہنگامی مسئلے پر) تو اس کیبدن سے پسینے کے فوارے اور بھپکے پھوٹتے ہیں۔۔۔۔ گرم مزاجوں کو اس زبان کی صحافت راس آئی ہے۔آتی ہی ہے۔جبتوپ مقابل ہو تو اخبار نکالو کا منظر ہماری زبان کی صحافت میں الٹا چل رہا ہے۔''

یہ اقتباس بتاتا ہے کہ تحریک آزادی میں اردو صحافت نے قائدانہ کردار ادا کیا ہے۔انقلابی جذبات کو ابھارنے اور عوام وخواص کو ملک میں ہونے والے واقعات سے باخبر رکھنے کا اہم کارنامہ اردو صحافت نے بڑی کامیابی اور لیاقت کے ساتھ انجام دیا ہے۔ ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی میں جن چند اور خاص اخباروں کا

رول رہا ہے ان میں سے ایک خاص نام لکھنوء سے شائع ہونے والا اخبار ''اودھ پنچ'' کا ہے۔ یہ اخبار سجاد حسین کی نگرانی میں ۱۸۷۷ء میں جاری ہوا۔ اس اخبار نے تحریکِ آزادی میں ایک نئی روح پھونکی اور برطانوی حکومت کے خلاف کھل کر بغاوت کا اعلان کر دیا۔ نامور ادیبوں، دانشوروں، صحافیوں اور شعراؤں نے اپنے قلم کی تلواریں چلا کر انگریزی حکومت کی ناک میں دم کر دیا۔ ان مشہور شخصیات میں مولوی محمد باقر کے فرزند محمد حسین آزاد، احمد علی شوق، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، رتن ناتھ سرشار، منشی جوالہ پرشاد برق، اکبرالہ آبادی جیسے نام شامل ہیں۔ اردو صحافیوں کو اس بات کا یقین تھا کہ صحافت ہی وہ طاقت ہے جو عوام کو ہر راز سے اور ہر حقیقت سے وابستہ کرا سکتی ہے۔ اس کے ذریعہ ہی اپنے احساسات و تاثرات کو ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ اور انگریزوں کی چالبازیوں کو ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ جوش ملیح آبادی کہتے ہیں کہ:۔

نہ ہو مغرور گر مائل بابی ہو سلطانی
یہ بھی اک صورت ہے تجھے غافل بنانے کی
گئے وہ دن کہ تو زنداں میں جب آنسوں بہاتا تھا
ضرورت ہے قفص پر اب تجھے بجلی گرانے کی

شیر محمد امین لکھتے ہیں کہ:۔

''۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی بلکہ اس سے بھی پہلے سے لے کر ۱۹۴۷ء کے حصول آزادی تک اردو صحافت نے آزادی اور قومی اتحاد کی تحریک میں جو نمیاں رول ادا کیا ہے وہ تاریخ کا ایک روشن

باب ہے۔ یہ اردو صحافی ہی تھے جو سب سے پہلے برطانوی
سامراج کے ظلم وستم کا نشانہ بنے۔انہوں نے نہ صرف یہ کہ قید و
بند کی صعوبتیں برداشت کیں بلکہ مالی قربانیاں بھی دیں۔
(شیر محمد خاں۔تحریک آزادی میں اردو کا کردار۔۲۰۰۶)

۱۸۵۷ء میں اردو کا پہلا روزنامہ ''اردو گائڈ'' کلکتہ سے شائع ہوا۔ روزنامہ ''پنجاب'' لاہور سے جاری ہوا۔اس کے علاوہ ملک کی آزادی کے لئے جدو جہد کا جذبہ اور سیاسی شعور پیدا کرنے کا اہم کام ۱۸۶۰ء میں دہلی کے مختلف امراء اور نواب زادوں کی زیر سرپرستی چھ اخبارات شائع ہو رہے تھے،ان میں سب سے مشہور ''اکمل اخبار'' تھا۔۱۸۷۷ء میں تین مزید نئے اخبارات کا اجراء عمل میں آیا۔ یہ اخبار ''نصرت الاکبر''، نصرت الاسلام'' اور ''مہرِ درخشاں'' تھے۔جن کا مقصد عوام کو حالاتِ حاضرہ سے باخبر رکھنا تھا۔۱۸۸۰ء کے دوران بارہ نئے اخبارات منظر عام پر آئے، اُس وقت تک میرٹھ، آگرہ، لکھنوء، علی گڑھ اور لاہور میں اردو اخبارات اپنا حلقہ اثر قائم کر چکے تھے۔ نیز آزادی کے لئے جدو جہد کو آگے بڑھانے میں مصروف تھے۔اور سر سید احمد خاں کے اخبار ''سید الاخبار'' سے اردو میں ایک معیاری صحافت کا آغاز ہوا۔اس دور کے بعد اخباروں کا ایک سنہرا اور جوشیلا دور شروع ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان میں ظلم وستم کی انتہا ہو چکی تھی اور عوام کے صبر کا پیمانہ ٹوٹ چکا تھا ۔اخباروں میں صاف گوئی اور بغاوت کا پرچم لہرانے لگا جس میں ''زمیندار'' لاہور سے اور حسرت موہانی کا ماہانہ رسالہ ''اردو معلیٰ'' علی گڑھ سے شائع ہوا۔ مولانا حسرت موہانی نے اپنے اخبار میں مکمل آزادی کا مطالبہ کر دیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب

ہندوستان میں سیاسی بیداری عروج پر تھی اور بڑے بڑے رہنماؤں میں اتنی جرات نہ تھی کہ مکمل آزادی کا مطالبہ کریں۔مکمل آزادی کا مطالبہ کرنے کے پاداش میں حسرت موہانی کو ۱۹۰۸ء میں دو سال قید کی سزا سنائی ۔ اوراخبار پر پابندی عائد کردی۔مگراس قدم کی وجہ سے اردوصحافت کواور زیادہ طاقت ملی اورآگے چل کر انقلابی اخباروں کی جھڑی لگ گئی۔ لالہ لجپت رائے نے ''سوراجیہ'' جاری کیا۔اس اخبار میں شاعروں نے بھی اپنی بےخوف بیانی سے کام لیا۔فراق لکھتے ہیں کہ:

اہل زنداں کی یہ محفل ہے نبوت اس کا فراق
کہ بکھر کر بھی یہ شیرازہ پریشاں نہ ہوا

مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو''الہلال'' اور۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو ''البلاغ'' جاری کیا۔جس نے صحافت کومزید توانائی بخشی۔مولانا آزادایک قابل عالم ومفکراورمقرر تھے۔مولانا نے اپنے مضامین کے ذریعے مسلمانوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کی۔تحریک آزادی پورے ہندستان میں پھیل چکی تھی اور ہرطرف سے بغاوت کی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ادیبوں کی شولہ بیانی،شاعروں کی جوشیلی نغمیں اسے تقویت پہنچارہے تھے۔اسی دوران مولانا محمدعلی جوہر نے ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کو''ہمدرد'' کا اجراء کیا تھا۔اس سے قبل وہ'' کامریڈ'' نکالتے تھے۔ ہمدرد نکالنے کاان کا مقصد بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:۔

''وہ (محمدعلی جوہر) صحافت کو پیسہ کمانے کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ صحیح اور سچی خبریں پہنچانا اخبار پڑھنے والوں کوایمانداری سے نیک مشورہ دینااورصورت حال کا بےلاگ تجزیہ کرنا ایک صحافی کا

فرض منصبی سمجھتے تھے اس لئے اخبار نکالنے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ
اس کے ذریعے ہندوستانیوں میں آزادی کی روح پھونکی جائے اور
ملک کے مختلف فرقوں میں اتحاد کی فضا قائم و پیدا کی جائے۔''

(ص۔۸۔انتخاب ہمدرد صباح الدین عمر اتر پردیش اردو اکادمی لکھنوء ۱۹۸۹ء)

برصغیر کی تقسیم سے قبل تمام اخبارات کا مقصد ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانا تھا اور اس میں ہندو اور مسلمانوں نے مل کر اپنی گراں قدر خدمات کے ذریعے ہندوستان سے انگریزوں کو جانے پر مجبور کر دیا اور یوں اردو صحافت کی بے بہا خدمات سے ہندوستانی عوام کو آزادی کی فضاء میسر ہوئی۔ ہندوستان کی آزادی کی پچھتر سالہ جشن کے موقع پر ہم اردو صحافت اور اس وقت کے تمام صحافیوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

جدوجہد آزادیِ ہند میں اردو شاعری کا کردار

ڈاکٹر شیخ احرار احمد (احرار اعظمی)
جز وقتی اسسٹنٹ پروفیسر
شعبہ اردو، ممبئی یونی ورسٹی، ممبئی

ادب اپنے دور کے ہر قسم کے حالات و واقعات کا نہ صرف آئینہ ہوتا ہے بلکہ عوامی سطح پر بھی ہر قسم کے تغیر اور انقلاب کا موجب اور مددگار رہوتا ہے۔ کسی تحریک اور جدوجہد کو مہمیز کرنے، ذہنی اور جذباتی طور پر لوگوں کو اکسانے اور بیدار کرنے کا فریضہ بھی ادب انجام دیتا ہے۔ ادب اپنے عہد کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ حالات کا رخ بدلنے کی بھی استطاعت رکھتا ہے۔

ہندوستان کی جہد آزادی کی بات کریں تو اس میں ہندوستان کی صرف زبانوں ہی نہیں بلکہ مقامی بولیوں نے بھی اپنا کردار ادا کیا ہے۔ اردو کا چلن اس وقت عام تھا۔ ملک کے ہر حصے میں خاص و عام سبھی اسے کم و بیش سمجھتے اور بولتے تھے۔ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے مقابل اردو زبان کا دائرہ وسیع تھا یہی وجہ ہے کہ ملک کے ہر حصے سے جہد آزادی کی تحریک کے اظہار کا وسیلہ اردو زبان رہی۔ اردو زبان میں جتنا قومی اور وطنی موضوع پر ادبی سرمایہ ہے اتنا ہندوستان کی دوسری زبانوں میں نہیں ہے۔ خاص کر کے اردو شاعری کی بات کریں تو جہد آزادی میں جتنا ہندوستان کی سبھی زبانوں نے مل کر حصہ لیا اس سے کہیں زیادہ صرف اردو شاعری

نے اپنا کردار نبھایا۔

۲۳/ جون ۱۷۵۷ء کو انگریزوں کے ہاتھوں جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کی شکست کے بعد، ۱۷۶۴ء میں نواب بنگال میر قاسم، نواب اودھ شجاع الدولہ اور شہنشاہ ہند شاہ عالم کی متحدہ فوجوں کو شکست دی۔ ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کو شہید کیا۔ ۱۸۰۱ء میں روہیل کھنڈ پر قابض ہوئے، ۱۸۰۳ء میں مغل شہنشاہ کو اپنا قیدی اور وظیفہ خوار بنا کر دہلی کے لال قلعے میں محصور کر دیا۔ انھیں سب خلفشار نے ۱۸۵۷ء میں ہندوستان گیر جدوجہد کی راہ ہموار کی۔ ۱۸۵۷ء کی جہد آزادی کے اسباب کو عموماً چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: ۱۔ سیاسی ۲۔ اقتصادی ۳۔ معاشرتی اور مذہبی ۴۔ عسکری۔

سیاسی اسباب میں لارڈ ڈلہوزی کی الحاق کی پالیسی سب سے اہم ہے جس کے تحت ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو انگریز سلطنت میں شامل کر کے ان ریاستوں کے اقتدار کو ختم کر دیا گیا۔ ۱۸۴۸ء میں ستارا، ۱۸۵۰ء میں جیت پور اور سنبھل، ۱۸۵۳ء میں ناگپور اور ۱۸۵۴ء جھانسی کی ریاست۔ ۱۸۵۳ء میں نانا صاحب کی پینشن کو غصب کرنے کا فیصلہ۔ ۱۳/ فروری ۱۸۵۶ء کو اودھ کا الحاق۔ بہادر شاہ ظفر کو دہلی کے قریب قطب میں منتقل کرنے کا منصوبہ۔

اقتصادی اسباب میں ہیں: بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کو ان کی املاک سے محروم کرنا۔ اودھ ریاست پر برطانوی کمشنر مقرر کرنا۔ جس کے سبب بہت سے وظیفہ خوار اپنے وظیفوں سے محروم ہو گئے۔ فوجیوں کی فوج سے معطّلی۔

معاشرتی اور مذہبی اسباب کچھ اس طرح تھے۔ عوام کے طرز معاشرت،

رسم و رواج، معاشرتی قواعد وضوابط میں دخل اندازی کے ساتھ ساتھ مذہب اور تہذیب وتمدن پر بھی حملہ آور ہوئے۔ستی کی رسم کا خاتمہ، ہندو بیوہ کی دوسری شادی، عیسائی ہونے پر آبائی جائداد میں حصہ۔مختلف ذاتوں کے قیدیوں کا ایک ساتھ کھانا پینا۔ ریلوں پر سب ذاتوں کے لوگوں کا ایک ساتھ بیٹھنا۔ مندروں کے انتظام کو اپنے ہاتھ میں لینا۔سمندر پار نوکری کی شرط پر سپاہیوں کی بھرتی۔

جنگ پلاسی کے بعد ہی سے شعرا نے ان واقعات پر نظموں کے ذریعے اپنے تاثرات کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا۔آصف الدولہ کی وفات (۱۷۹۷ء) کے فوراً بعد شاہ کمال الدین کمالؔ نے ایک نظم ''مخمس شہر آشوب'' کہی جس میں انھوں نے لکھنؤ کی سیاسی حالت کو قلم بند کیا ہے:

وہی یہ شہر ہے اور ہے وہی یہ ہندوستاں
کہ جس کو رشک جناں جانتے ہیں سب انساں
فرنگیوں کی سو کثرت سے ہو کے سب ویراں
نظر پڑے ہے بس اب صورتِ فرنگستاں
نہیں سوار رہے یاں سوائے ترک سوار
جہاں کہ نوبت و شہنائی جھانجھ کی تھی صدا
فرنگیوں کا ہے اس جا پہ ٹم ٹم اب بجتا
اسی سے سمجھو رہا سلطنت کا کیا رتبا
ہو جب کہ محل سراؤں میں گوروں کا پہرا
نہ شاہ ہے نہ وزیر اب فرنگی ہیں مختار

ہندوستان کو معاشی طور پر کمزور اور اقتصادی بدحالی لانے میں انگریزوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی جس کا ذکر مصحفی (وفات: ۱۸۲۵ء) بہت پہلے کر چکے تھے:

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
ظالم فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

جرأت (وفات: ۱۸۰۹ء) نے ان لوگوں پر بھی طنز کیا ہے جو انگریزوں کے ہاتھوں اپنا ضمیر بیچ چکے تھے:

کہئے نہ انھیں اسیر اب اور نہ وزیر
انگریزوں کے ہاتھ یہ قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ وہ پڑھائیں سو یہ منہ سے بولیں
بنگالے کی مینا ہیں یہ پورب کے امیر

غرض کہ ناسخ (وفات: ۱۸۲۸ء)، آتش (وفات: ۱۸۴۷ء) مومن (وفات: ۱۸۵۱ء) اور اس دور کے دیگر شعرا کے یہاں بھی انگریز دشمنی کا اظہار ہو رہا تھا لیکن اس وقت اس میں وہ شدت نہیں تھی جو ۱۸۵۷ء کے بعد سے ہوئی۔ غدر کے وقت جب انگریزوں پر باغیوں کو غلبہ حاصل ہوا تو محمد حسین آزاد نے اس فتح سے مسرور ہو کر ایک نظم ''تاریخِ انقلاب عبرت افزا'' کہی۔

اس وقت دہلی سے جاری ''صادق الاخبار'' میں باغیوں اور ہندوستانی عوام کے حوصلوں کو بڑھانے اور جرأت دکھانے کے لیے اکثر نظمیں شائع ہوتی رہیں جس میں بہادر شاہ ظفر اور بہت سے شعرا کے کلام اکثر شائع ہوتے رہتے۔ عید قرباں کے موقعے پر ۳؍اگست ۱۸۵۷ء کے ''صادق الاخبار'' میں شائع منشی غلام علی

مشتاقؔ کا یہ قطعہ ملاحظہ فرمائیں:

عید ہر سال تمہیں تہنیت آمیز رہے
غرق خوں جان عدو خنجر خوں ریز رہے
قتل کفار ہوں اور فتح مبارک ہو ظفر
نام کو بھی نہ جہاں میں سرِ انگریز رہے

۲۰ر ستمبر ۱۸۵۸ء تک انگریزوں نے دہلی پر مکمل طور پر قبضہ کرلیا تھا۔ بغاوت کا اہم مرکز اودھ پہلے ہی ۱۳ر فروری ۱۸۵۶ء میں انگریز حکومت نے الحاق کرلیا تھا۔ واجد علی شاہ کو معزول کر کے کلکتہ میں نظر بند کیا جاچکا تھا۔ جہاں انھوں نے ایک مثنوی ''حزن اختر'' کہی۔ جس میں انھوں نے کلکتہ کے سفر اور قید فرنگ میں مصائب وآلام پر تفصیلی اظہار کیا ہے۔

غدر کے دوران ایک قومی ترانہ بھی تخلیق ہوا جو انقلابی تحریک کے ترجمان اخبار ''پیام آزادی'' میں شائع ہوا تھا۔

ہندو مسلماں سکھ ہمارا بھائی بھائی پیارا
یہ ہے آزادی کا جھنڈا اسے سلام ہمارا

دہلی کی تباہی پر اس وقت کی بیش تر نظموں کو غالبؔ کے ایک شاگرد تفضّل حسین کوکبؔ نے کتابی شکل میں مرتب کر کے ''فغانِ دہلی'' کے نام سے ۱۸۶۲ء میں شائع کی تھی جس کی تقریظ میں قربان علی بیگ خاں سالکؔ کچھ اس طرح فرماتے ہیں:

''.....ظاہر ہے کہ جب شعراء کی کثرت ہو اور ایسا انقلاب ظہور میں آئے زبان پر کوئی مُہر نہیں ہے کہ گویائی سے باز رہے اور دل

پر کچھ زور نہیں ہے کہ درد سے بھر نہ آئے اور اظہار درد شاعرانہ نہ کیا جائے۔ کسی نے اپنی فغاں کو بطرز مسدّس شہرِ آشوب بلند کیا۔ کسی نے اپنے نالے کو طراز غزل بخشا۔ اگر غور کیجئے تو ہر ایک مسدس ایک مرثیہ ہے اور ہر ایک غزل ایک نوحہ ہے کس کی طاقت ہے کہ سنے نہ روئے کس کا جگر ہے کہ درد سے خون نہ روئے۔''

(''فغانِ دہلی'' مرتبہ: تفضّل حسین کوکبؔ۔ ص ۲۰۴)

میلکم لوئین جج عدالت العالیہ مدارس وممبر کونسل نے لندن سے شائع ایک رسالے میں لکھا تھا جس کا حوالہ سید طفیل احمد منگلوری اپنی کتاب ''مسلمانوں کا روشن مستقبل''، ص ۶۷ پر اس طرح لکھتے ہیں:

''ہم نے ہندوستانیوں کی ذاتوں کو ذلیل کیا۔ اون کے قانون وراثت کو منسوخ کیا، بیاہ شادی کے قاعدوں کو بدل دیا، مذہبی رسم و رواج کی توہین کی، عبادت خانوں کی جاگیریں ضبط کرلیں، سرکاری کاغذات میں اونھیں کافر لکھا، امراء کی ریاستیں ضبط کرلیں، لوٹ کھسوٹ سے ملک کو تباہ کیا۔ اونھیں تکلیف دیکر مالگزاری وصول کی، سب سے اونچے خاندانوں کو برباد کرکے اونھیں آوارہ گرد بنا دینے والے بندوبست قائم کئے۔''

(مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ ص ۶۷۔ سید طفیل احمد منگلوری)

کوئی ایسا ستم نہیں بچا تھا جو ہندوستانیوں پر انگریزوں نے نہ ڈھائے ہوں۔ اس ذلت آمیز زندگی سے ہند کی عوام کو نکالنے کے لیے اردو شعرا نے سب

سے اہم رول ادا کیا۔ اپنے کلام سے عوام کے ضمیر کو بیدار کیا، ان کے پست اور شکست خوردہ دلوں اور ذہنوں کو حوصلہ دیا اور ان کے جوش و جذبے کو مہمیز کیا۔ اس کے لیے ہمارے شعرا میں سے کسی نے طنزیہ لہجہ اختیار کیا تو کسی نے احتجاجی، کسی نے آزدی اور غلامی کے فرق کو اپنا موضوع بنایا تو کسی نے حب الوطنی پر نغمہ سرائی کی۔ کسی نے نعرے بازی سے کام لیا تو کوئی انقلابی طرز اظہار اپنایا۔ غرض کہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء، یعنی آزادیِ ہند تک اردو شاعری کا بیش تر سرمایہ اسی قسم کے موضوعات پر اور جذبے سے سرشار نظر آتا ہے۔ آزادؔ، حالیؔ، اکبرؔ، شبلیؔ، اقبالؔ، تلک چند محرومؔ، برج نرائن چکبستؔ، جوشؔ، سردار جعفری، فیضؔ، کیفیؔ، مجروحؔ اور اس دور کے سبھی چھوٹے بڑے شعرا نے اپنی شاعری کے ذریعے ملک سے محبت اور انگریزوں کے تسلط سے آزادی کا پیغام دیا ہے۔ بسملؔ عظیم آبادی کے اس شعر سے کون ایسا ہندوستانی ہے جو واقف نہیں:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

آج بھی فیضؔ کے یہ شعر ہر خاص و عام زبان زد ہیں:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

اور مجروحؔ کا یہ شعر تو ضرب المثل بن گیا ہے:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اس دور کے منظر کی عکاسی کرتا ہوا مجروحؔ کا یہ انقلابی شعر جوش وولولے سے لبریز، انقلاب پسندوں کے لیے آج بھی کشش رکھتا ہے۔

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

اس کے علاوہ قومی اور حب الوطنی کے موضوعات پر مبنی نظموں میں بھی جہد آزادیِ ہند کا عکس ہم دیکھ سکتے ہیں جو کہ بہت واضح اور پر اثر بھی ہے۔ مذکورہ باتوں کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو شاعری، ہندوستانی شہیدوں اور مجاہدوں کی پسندیدہ اظہارِ جذبہ رہی ہے۔

☆☆☆☆☆

قائد تحریک آزادی ہند علامہ فضل حق خیر آبادی

محمد عرفان رضا
ریسرچ اسکالر، ممبئی یونیورسٹی، ممبئی

ہندوستان کی تحریک آزادی میں جن علماے اسلام نے عملی طور پر حصہ لیا اور اپنی قائدانہ صلاحیتوں سے عوام الناس کو انگریزوں کو خلاف جنگ کرنے کے لیے آمادہ کیا ان میں نمایاں نام علامہ فضل حق خیر آبادی کا ہے۔

آپ کی پیدائش 1797ء میں اودھ کے مردم خیز قصبہ خیر آباد (ضلع سیتا پور ،یو پی) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم خیر آباد میں حاصل کی بعدہ دہلی چلے گئے، جہاں آپ نے منتہی کتابیں پڑھیں۔ آپ کے اساتذہ میں آپ کے والد گرامی علامہ فضل امام خیر آبادی، شاہ عبدالقادر محدث دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی جیسی نابغۂ روزگار شخصیا ت تھیں۔ آپ تیرہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے اور درس وتدریس سے وابستہ ہو گئے۔ آپ کے علمی وفقہی کارناموں کا اعتراف آپ کے ہم عصر علما نے بطور خاص کیا ہے۔ چنانچہ سرسید اپنی مشہور تصنیف ''آثار الصنادید'' میں رقم طراز ہیں:

> ''جمیع علوم وفنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق وحکمت کی تو گویا انہی کی فکرِ عالی نے بنا ڈالی ہے۔ علماے عصر بل فضلاے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس سرگروہِ اہل کمال کے حضور میں بساطِ مناظرہ آراستہ کرسکیں۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو یگانۂ

فن سمجھتے تھے، جب ان کی زبان سے ایک حرف سنا دعوائے کمال
کو فراموش کر کے نسبتِ شاگردی کو اپنا فخر سمجھے''۔(۱)

آپ نے کئی کتابیں تصنیف فرمائیں جس میں اکثر کتابیں غیر مطبوعہ ہیں۔آپ کی مشہور تصنیف لثورۃ الھندیہ''(جس کو 'باغی ہندوستان' کے نام سے عبد الشاہد شیروانی نے مرتب کیا) انقلاب کا ایک اہم ماخذ ہے۔علاوہ ازیں آپ نے غالبؔ کے اردو کلام کے انتخاب میں بھی اہم کردار ادا کیا اس بات کا ذکر حالیؔ اور آزادؔ دونوں نے کیا ہے۔محمد حسین آزاد''آب حیات''میں رقم طراز ہیں:

سن رسیدہ اور معتبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں ان کا دیوان بڑا تھا۔یہ منتخب ہے۔مولوی فضل حق خیر آبادی فاضل بے عدیل تھے جو ایک زمانے میں دہلی کی عدالت ضلع میں سر رشتہ دار تھے۔۔۔۔۔انھوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔مرزا نے کہا اتنا کچھ کہہ چکا۔اب تدراک کیا ہوسکتا ہے؟ انھوں نے کہا خیر جو ہوا سو ہوا۔انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔مرزا صاحب نے دیوان حوالے کر دیا۔دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا۔وہ یہی دیوان ہے جو آج عینک کی طرح لوگ آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں''۔(۲)

مولانا فضل حق خیر آبادی نے فارغ التحصیل ہونے کے کچھ دنوں بعد کمپنی کی ملازمت اختیار کی اور عدالت دیوانی دہلی میں سر رشتہ دار مقرر ہوئے۔یہ ملازمت

علامہ کو پسند نہ تھی، والد بزرگوار کے حکم اور فرمانبرداری کے تحت آپ نے یہ ملازمت تقریباً چار برس کی۔ والد ماجد کے انتقال کے بعد آپ والیِ جھجر نواب فیض علی کی دعوت پر ریاست جھجر چلے گئے۔ بعدہ الور، سہارن پور، ٹونک، لکھنؤ، رامپور وغیرہ میں بھی آپ نے مختلف عہدوں پر کارہائے نمایاں انجام دیے۔

علمی اعتبار سے تو آپ کا مقام بلند تھا ہی 1857ء کی جہدِ آزادی میں آپ کے مجاہدانہ کردار نے آپ کو اور زیادہ ممتاز کر دیا۔ دراصل یہ آپ کی شخصیت کی ایک الگ جہت ہے۔ جب 1857ء کا ہنگامہ شروع ہوا تو آپ الور سے دہلی چلے آئے اور لوگوں کو انقلاب کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا۔ اس درمیان انگریزوں سے جہاد کے متعلق فتویٰ بھی صادر ہوا، جو اشتہار کے ساتھ ساتھ اخبار (اخبار الظفر، صادق الاخبار) میں بھی شائع ہوا۔ (یہی وہ فتوی ہے جس پر علامہ فضل حق کا دستخط نہیں تھا، جس کی بنیاد پر کچھ محققین نے علامہ فضل حق خیر آبادی کو علما کے اس زمرے سے باہر رکھا ہے جنھوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتوی دیا تھا) علامہ فضل حق نے دہلی آنے کے بعد انقلاب اور جہاد کی بات علی الاعلان کرنی شروع کر دی۔ اس بات کی تصدیق انگریز مخبر تراب علی کی (28 اگست 1857ء) رپورٹ سے بھی ہوتی ہے:

> ''مولوی فضل حق جب سے دہلی آیا ہے شہریوں اور فوجیوں کو انگریزوں کے خلاف اکسانے میں مصروف ہے۔ وہ کہتا پھرتا ہے کہ اس نے آگرہ گزٹ میں برطانوی پارلیمنٹ کا ایک اعلان پڑھا ہے جس میں انگریزی فوج کو دہلی کے تمام باشندوں کو قتل

کر دینے اور پورے شہر کو مسمار کر دینے کے لیے کہا گیا ہے
۔آنے والی نسلوں کو یہ بتانے کے لئے کہ یہاں دہلی شہر آباد
تھا شاہی مسجد کا صرف ایک مینار باقی چھوڑا جائے گا''۔(۳)

اس درمیان آپ نے مختلف کام کیے، جس میں حکومت کے لیے آپ نے ایک دستور العمل بنایا۔عوام کے ساتھ ساتھ شہزادوں کو بھی انقلاب میں عملی طور پر شر کت کرنے کے لیے کہا۔خاص طور ہندو مسلم اتحاد کے لیے بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے آپ کے مشورے سے علما سے ایک فتویٰ لیا جس کے تحت بادشاہ کی عملداری میں گائے کے ذبح پر پابندی لگا دی گئی ۔ اس دوران آپ نے دہلی کی جامع مسجد میں انگریزوں کے خلاف جہاد کے عنوان سے تقریر کی۔عبدالشاہد شیروانی لکھتے ہیں:

''علامہ سے جنرل بخت خاں ملنے پہنچے،مشورہ کے بعد علامہ نے
آخری تیر ترکش سے نکالا، بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں علما کے سامنے
تقریر کی ،استفتا پیش کیا۔مفتی صدرالدین خاں آزردہ صدرالصدور
دہلی،مولوی عبدالقادر،قاضی فیض اللہ دہلوی،مولانا فیض احمد بدایونی،
ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی،سید مبارک شاہ رامپوری نے دستخط
کیے۔اس فتوے کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی
،دہلی میں نوے ہزار فوج جمع ہوگئی تھی''۔(۴)

اب فوج کو تنخواہ دینے اور حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے مالیت کی سخت ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ بادشاہ بہادر شاہ ظفر اور مجلس کے دیگر اراکین کے کہنے پر آپ نے فوج کے لیے مالیت اور رسد وغیرہ کے انتظام میں بھی خاطر وخواہ دلچسپی لی

اور اپنے عزیز و اقارب کو اس کام کے لیے لگایا، جنھوں نے علامہ فضل حق کے مشورے کے مطابق بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے پیغامات کو مختلف والیان ریاست اور صاحب ثروت لوگوں تک پہنچایا۔ اس بابت حکیم محمود احمد رقم طراز ہیں:

''اس سلسلے میں مولینا نے بہادر شاہ کے سامنے دو یہ دو تجویزیں رکھیں:

(۱) دور اور قریب کے تمام والیان ریاست سے زر اعانت کا مطالبہ کیا جائے۔

(۲) زر مال گزاری کی تحصیل کے لئے موجودہ نا اہل ملازمین کی جگہ موزوں اور کارداں افراد کا تقرر کیا جائے۔

بادشاہ نے پہلی تجویز کو منظور کر کے والیان ریاست کے نام خطوط روانہ کئے جائیں۔ چنانچہ جھجر، بلب گڑھ، فرخ نگر، بریلی، جے پور، الور، جودھپور، بیکانیر، گوالیار، جیسلمیر، پٹیالہ کے فرمانرواؤں کو خطوط لکھے گئے''۔(۵)

اس طرح مولانا فضل حق نے 1857ء کی جہدِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر عملی طور پر حصہ لیا اور انگریزوں کے خلاف ایک ایسا محاذ تیار کیا جس کو فتح کرنے میں انھیں مہینوں لگ گئے۔ یہ تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے کہ 1857ء کے غدر کو انگریزوں نے کچل دیا لیکن یہ بغاوت آزادی کے لیے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ۹ ستمبر 1857ء کو دہلی پر انگریزوں نے مکمل طور پر قبضہ کر لیا۔ اب شہر میں ہر اس شخص کی دھر پکڑ شروع ہو گئی جنھوں نے اس جدو جہد میں حصہ لیا تھا۔ بہادر شاہ لال قلعہ سے ہمایوں کے مقبرے چلے گئے۔ لیکن ابھی بھی بہت سے سرفروش ایسے

تھے جن کا ماننا تھا کہ کسی ایک محاذ پر شکست ہر محاذ پر شکست کے مترادف نہیں، اس لیے ان سرفروشان وطن کو جہاں بھی انگریز حکومت کے خلاف کوئی فوج لڑتی ملی اس میں شامل ہو گئے۔ علامہ فضل حق بھی دہلی سے بڑی مشکل سے سیتا پور پہنچے اور وہاں سے حضرت محل کے ساتھ جہد آزادی میں ایک بار پھر شریک ہو گئے۔ اس درمیان چھوٹے بڑے کئی معرکے ہوئے۔ آخری معرکہ بوندی کا ہوا جس میں ہندوستانی فوج کو شکست ہوئی۔ اور اس کے سرکردہ لیڈر روپوش ہو گئے۔

جب انگریز تقریباً ہر محاذ پر جیت گئے تو نومبر 1858ء میں ملکہ وکٹوریہ نے عام معافی کا اعلان کیا اور 30 دسمبر 1858ء تک کی مہلت دی کہ اس مدت میں جو بھی باغی سرگرمیوں سے باز آئے گا اسے نہ گرفتار کیا جائے گا اور نہ سزا دی جائے گی۔ علامہ آزادی سے مایوس ہو کر اور اس اعلان پر اعتماد کرتے ہوئے خیر آباد میں 26 دسمبر کو کرنل کلارک سے ملے، کرنل نے انھیں ڈپٹی کمشنر کی تحویل میں دے دیا۔ 30 جنوری 1959 کو آپ کو گرفتار کر کے لکھنؤ بھیج دیا گیا۔ 22 فروری کو مقدمہ پیش ہوا اور حسب ذیل فرد جرم عائد کی گئی:

(الف) وہ 1857 اور 1858ء کے دوران باغی سرکار کی حیثیت میں سرغنہ رہا اور دہلی اور اودھ اور دوسرے مقامات پر اس نے لوگوں کو بغاوت اور قتل کی ترغیب دی۔

(ب) اس نے بوندی کے مقام پر مئی 1858ء باغی سرغنے ممو خاں کی مجلس مشاورت میں نمایاں حصہ لیا۔

(ج) اس نے بوندی کے مقام پر مئی 1858ء میں ایک

سرکاری ملازم عبدالحکیم کو قتل کرنے کی ترغیب دی۔(۶)

مقدمے میں لگائے گئے تمام الزام درست ثابت ہوئے اور انھیں الزامات کی بنیاد پر 4مارچ 1859ء کو جوڈیشیل کمشنر جارج کیمبل (G. Cambell) اور میجر بارو (Barrow) قائم مقام کمشنر خیرآباد ڈویژن کی مشترکہ عدالت نے علامہ کو باغی قرار دیتے ہوئے ان کی جائداد کی ضبطی اور حبس دوام بعبور دریائے شور (کالا پانی) کا فیصلہ سنایا۔ چنانچہ آپ کو مختلف جیلوں میں رکھنے کے بعد 8اکتوبر 1859ء کو کلکتے سے جزیرۂ انڈمان نکوبر کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ جہاں تقریباً ڈیڑھ برس قید میں گزارنے کے بعد 12اگست 1858ء کو آپ کا انتقال ہوگیا۔

حواشی

(۱) آثار الصنادید (جلد دوم)، سرسید احمد خاں، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی، صفحہ نمبر ۸۸

(۲) آب حیات، محمد حسین آزاد، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو، صفحہ نمبر ۴۹۷

(۳) ۱۸۵۷ کے غداروں کے خطوط، سید عاشور کاظمی، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، صفحہ نمبر ۱۵۹

(۴) باغی ہندوستان، علامہ فضل حق خیرآبادی، المجمع الاسلامی، مبارکپور، صفحہ نمبر ۲۱۵

(۵) فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون، حکیم محمود برکاتی، برکات اکیڈمی، کراچی، صفحہ نمبر ۵۰

(۶) بحوالہ علامہ فضل حق خیرآبادی چند عنوانات، خوشتر نورانی، ادارۂ فکر اسلامی، دہلی، صفحہ نمبر ۷۰

☆☆☆☆☆

جدوجہدِ آزادئ ہند اور بیگم حسرت موہانی

از: ڈاکٹر فرزانہ بیگم،
کے آر ایم مہیلا مہاودیالیہ، ناندیڑ

تیرے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے ایک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا

اس شعر میں مجاز خواتین سے مخاطب ہیں۔ اور عورتوں سے اپنے آنچل کو پرچم بنانے کی تلقین کررہے ہیں۔ جبکہ یہ بات تو ظاہر ہے کہ نہ صرف آنچل بلکہ اپنے جسم و جانوں کو بھی خواتین نے ملک پر نچاور کردیا۔ مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین نے بھی عظیم قربانیاں دیں ملک کی آزادی کا کوئی بھی باب خواتین کی قربانیوں سے خالی نہیں ہے۔ وہ کبھی حوصلہ بن کر کبھی طاقت بن کر اور کبھی تحریک بن کر متحرک رہیں اور مجاہدین کا حوصلہ بلند کرتی رہیں۔ وہ نہ تو حق سے دستبردار ہوئیں نہ فرض سے۔ امور خانہ داری کو سرانجام دینے والی خواتین ضرورت پڑنے پر اپنی تنظیمی صلاحیتوں کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہوکر میدانِ جنگ میں اتر آئیں کئی مرتبہ جیل گئیں تلوار کی کاٹ اور قلم کی دھار کو بوقتِ ضرورت استعمال کیا۔ تو دوسری طرف اپنے شوہروں، بھائیوں اور بیٹوں کو اخلاقی اور معنوی تعاون فراہم کیا جس کی بنا پر وہ پوری یکسوئی سے جدوجہد کرسکے۔

ایسا ہی ایک کردار بیگم حسرت موہانی کا ہے۔ جنہوں نے گھر کی چاردیواری سے نکل کر انقلابی پرچم کو بلند کیا۔ اور اپنے خاوند عظیم انقلابی حسرت موہانی

کے شانہ بہ شانہ خاردار راہوں پر چلیں جو نہ صرف ایک باوفا شریک حیات تھیں بلکہ ایک محبّ وطن خاتون بھی تھیں۔ جن کی زبان سے شکوہ شکایت تو دور کبھی اُف بھی نکلی جب ان کی شادی مولانا حسرت موہانی سے ہوئی تب وہ سیاست سے بالکل ناواقف تھیں لیکن وقت نے ایسا موڑ لیا کہ گھر کی ذمہ داریوں میں مصروف عورت عدالتوں سے لیکر وزیر ہند تک اپنی بے خوفی اور بے باکی کی وجہ سے مشہور ہو گئیں۔

بیگم حسر موہانی کا اصل نام سیدہ نشاط النساء بیگم تھا۔ ان کے والد وکیل تھے۔ انکا نام سید بشیر حسین موہانی تھا۔ وہ حسرت موہانی کے ماموں بھی تھے اور پھوپھا بھی سیدہ نشاط النساء 1885ء میں موہان ضلع اناؤں کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئیں شادی سے قبل انھیں اردو، فارسی اور عربی کی باقاعدہ تعلیم دی گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گاؤں اور قصبے تو کیا شہروں میں بھی لڑکیوں کو تھوڑا سا قرآن شریف پڑھا دینا ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔

نشاط النساء بیگم صرف بیوی نہیں تھیں بلکہ حسرت کے کام میں ان کی ساتھی تھیں حسرت موہانی اپنے اخبار ''اردوئے معلیٰ'' کی کتابت کرتے مشین چلاتے اور بیگم حسرت اخبار میں کام کرتیں۔ وہ آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کی ممبر تھیں اور سیاسی جلسوں میں ہمیشہ اپنے شوہر کے ساتھ شریک ہوتی تھیں۔

1908ء میں جب حسرت موہانی پہلی مرتبہ گرفتار ہوئے تو علی گڑھ میں گرفتاری کا پہلا واقعہ تھا نشاط النساء بیگم اس وقت صرف 23 سال کی تھیں حالات حوصلہ شکن، ماحول مخالف، گود میں ایک شیر خوار بچی اس کے باوجود گرفتاری کے چند ہی روز بعد اپنے شوہر کو جیل میں خط بھیجا اس میں لکھا:

''تم پر جو افتاد پڑی اسے مردانہ وار برداشت کرو میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا خبردار کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو۔'' 1؎

دوسری مرتبہ مولانا کو گرفتار کیا گیا تو نشاط النساء بیگم گھر کی چار دیواری سے باہر آ گئیں اور خود اس مقدمے کے دفاع کی ذمہ داری اُٹھالی۔ نشاط النساء بیگم خود عدالت میں گئیں اور برطانوی حکومت کے سامنے بڑی دلیری سے کھڑی ہوئیں۔

بڑے بڑے رہنماؤں نے ان کی خدمت کا اعتراف اس طرح کیا ہے مولانا محمد علی جوہر نے لکھا تھا:

''بھائی حسرت سے کہہ دیجئے کہ برادرم! باوجود ہمت و استقلال کے تمہارا مرتبہ ایک نحیف الحبثہ عورت سے کم ہی رہے گا جس کے سینے میں بظاہر تم سے بھی بڑا دل موجود تھا اور جس نے تمہاری غیر حاضری میں مسلمانوں کو ہمت و استقلال جرأت و حوصلہ کا وہ سبق دیا جو تم خود آزاد ہو کر نہ دے سکتے تھے۔'' 2؎

خواجہ حسن نظامی بیگم نشاط کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حسرت موہانی کی بیوی ہند کی عورتوں میں بڑی وفا شعار اور شوہر پرست عورت ہے۔ ایام بلا میں بھی وفا شعاری اس عورت سے ایسے ظاہر ہوتی ہے جیسے سیتا جی نے رام چندر جی کے ساتھ کی تھی۔''

مولانا عبدالحلیم شرر نے کہا تھا:

''بیگم نشاط نے جس مردانہ وار اولوالعزمی سے شوہر کی وفاداری

کے ساتھ ملک کی قومی اور ادبی خدمات انجام دے رہی ہیں وہ
نہایت قابلِ داد ہیں۔'' 3؎

کرشن پرشاد کول نے بیگم حسرت کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے کہ:

''بیگم حسرت میں وطن پرستی اتنی ہی تھی جتنی حسرت میں ان کی
حیثیت جدوجہد آزادی میں منفرد تھی۔ ان کا دماغ بمقابلہ
حسرت زیادہ سلجھا ہوتھا حسرت کی صحبت نے اس میں چار چاند
لگادیئے تھے۔'' 4؎

بیگم حسرت موہانی تعلیم نسواں کی بھی زبردست حامی تھیں۔ شادی سے پہلے ان کی خاص مشغلہ پسماندہ طبقے کی لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا تھا۔ 28/دسمبر 1905 کو علی گڑھ میں ہونے والی خواتین ایجوکیشنل کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے معلمات کی تربیت کے لئے مدرسہ کی تجویز پیش کی۔

1920ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ناگپور میں ہوا تو مولانا حسرت کے ساتھ ان کی بیگم نے بھی اس میں شرکت کی انہوں نے علمی اور قلمی میدان میں بھی ان کا بھرپور ساتھ دیا مولانا حسرت نے عہد کیا تھا کہ وہ ہمیشہ سودیشی چیزیں استعمال کریں گے تو بیگم نے اس میں بھی انکا بھرپور ساتھ دیا۔ وہ اپنے ہاتھ سے بنے ہوئے سوت کے کپڑے پہنتی رہیں۔ مولانا جیل جاتے تو رسالے، کتابوں، پریس اور اسٹور کا کام وہ خود سنبھال لیتیں کئی بار ان کے گھر کے حالات اس حد تک خراب ہوئے کہ اجرت پر لوگوں کے کپڑے سی کر اور کاغذ کے لفافے بنا کر گذارا کرتیں۔ وہ اتنی خوددار تھیں کہ کسی کی مدد قبول بھی نہیں کرتی تھیں۔ اور کئی مرتبہ مولانا کے مقدمہ کی

ذمہ داری بھی سرانجام دیں۔

تیسری بار 1922ء میں جب حسرت کی گرفتاری عمل میں آئی اس وقت ان کی اکلوتی دختر نعیمہ کی شادی مقرر ہو چکی تھی۔لیکن بیگم حسرت نے باپ کی کمی کا ذرا بھی احساس نہ ہونے دیا۔ بلکہ اپنی بیٹی کو خوشی خوشی گھر سے رخصت کیا۔

حسرت موہانی جس جیل میں قید ہوتے بیگم حسرت اسی شہر میں قیام کرتیں۔مختلف شہروں میں قیام، نامساعد حالات میں سفر ذہنی پریشانیوں اور سخت مالی دشواریوں کی وجہ سے بیگم صاحبہ بیمار رہنے لگیں آخر 18/اپریل 1937ء کو خالق حقیقی سے جا ملی۔اس طرح مولانا حسرت موہانی کو آزادی کے لئے لڑنے کی ترغیب دیتے ہوئے۔نشاط النساء خود جنگ آزادی کا ایک شاندار کردار بن کر ابھریں خاتون خانہ کا کردار ادا کرنے والی نشاط النساء نے جدوجہد آزادی میں اہم کردار ادا کیا اگر ملک آزادی کے امرت مہتسو جشن میں جنگ آزادی کے عظیم مجاہدین کو یاد کر رہا ہے تو اس میں بلاشبہ نشاط النساء بیگم جیسی خواتین کا رتبہ بلند ہوگا جنہوں نے جرأت و ہمت کی عظیم مثال قائم کی۔

ماخذ:

۱۔مکتوب بیگم حسرت بنام حسرت موہانی

۲۔مکتوب بنام بیگم حسرت موہانی: مولانا محمد علی جوہر (22/مئی 1918ء)

۳۔حیات و سیرت حسرت موہانی (مرتبہ شفقت رضوی)

۴۔حسرت موہانی: مظفر حنفی

پنڈت برج نرائن چکبست کی شاعری اور جذبہ حب الوطنی

ڈاکٹر گلناز بیگم محمد اسحاق خان
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو، پی۔این کالج، ناندیڑ

اِس کو نہ قدر ے عالم کا صلہ کہتے ہیں
مر چکے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

چکبست مکمل نام پنڈت برج نارائن چکبست اُردو شعر و ادب کے نامور شاعر اور ادیب و نقاد تھے۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ وہ کشمیری برہمن تھے۔ انھوں نے بہت کم عمری سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور اُنھوں نے کبھی کوئی اُستاد کو اپنا کلام دکھا کر اصلاح نہیں کی۔ انھیں مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ اِسی عمیق مطالعہ کے شوق کی وجہ سے خود ہی شاعری کی مشق اور اصلاح کیا کرتے تھے۔ انھوں نے کبھی کوئی تخلص بھی اختیار نہیں کیا۔ چکبست ایک عالمگیر حیثیت کے شاعر تھے۔ اُن کے نام چکبست پر ہی تخلص کا اکتفا کیا گیا۔

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

چکبست نے روایتی انداز میں اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ اُنھوں نے غزلیں، نظمیں بھی کہی اور اُنھوں نے اپنی شاعری کا موضوع وطن پرستی کو بنایا۔ چکبست نے ہوم رول کی موضوعات کو موضوع بحث بنایا۔ اور اُسی میں اُنھوں نے

ہوم رول کے نظریہ پر نظمیں کہنا شروع کی۔ اِن کی نظموں میں قدرتی مناظر کی بہت بڑی عمدہ دلکش تصویر ہمیں پڑھنے کو ملتی ہے اور اُنھوں نے اپنے وطن کی محبت میں ڈوب کر بہت ہی جذباتی طریقے سے ملک کی آزادی کی تڑپ اور دردمندی کے پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہیں اور اِس کی نمایاں خصوصیات کو بیان کرتے ہیں۔ چکبست کو اپنے ملک کے احباب بزرگوں اور رہنماؤں سے انھیں بہت محبت تھی اور اُنھوں نے اِن رہنماؤں پر بہت سے مرثیے بھی تحریر کیے ہیں۔ اور اِن مرثیوں میں ان کے عمدہ پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔ اِن کی نظموں کا مجموعہ صبح وطن، مضامین کا مجموعہ ہے۔ اِن کے تمام مضامین چکبست کے نام سے اُردو ادب میں شائع ہوئے ہیں۔

چکبست نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اُس وقت ہندوستان کا ماحول تیزی سے بدل رہا تھا۔ ہر جگہ ردو بدل ہو رہے تھے، ملک ایک عجیب کیفیت سے گزر رہا تھا۔ ایک جانب ابھی تک ہندوستان کے سماج پر قدامت کا رنگ چھایا ہوا تھا تو دوسری جانب نئی پرانی تہذیبیں تیزی سے پروان چڑھ رہی تھی اور اپنا اثر جما رہی تھی۔ اِس ماحول میں بے چینی پیدا ہوگئی تھی۔ کچھ لوگ قدامت پرست کو اپنا رہے تھے تو کچھ لوگ نئی دنیا کے خواب دیکھ رہے تھے۔ چکبست لکھنوی تہذیب کے دلدادہ تھے، ان کے دِل میں وطن پرستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یعنی

یہ ہندوستان ہے ہمارا وطن
محبت کا آنکھوں کا تارا وطن
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

وطن پرست شہیدوں کی خاک لائیں گے
ہم اپنی آنکھ کا سرمہ اسے بنائیں گے
غریب ماں کیلئے درد دکھ اُٹھائیں گے
یہی پیام وفا قوم کو سنائیں گے

مجھ سے اس ہمدردی والفت کا کیا ہووے بیان
جو ہے وہ قومی ترقی کے لیے دیوانہ ہے
اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض قدرت تیرے لیے رواں ہے

چکبست نے قومی شاعری کے علاوہ مذہبی شاعری کی طرف بھی رجحان کیا۔ اِن کی مذہبی شاعری میں رامائن کا ایک سین بھی اُنھوں نے تحریر کیا جو بہت ہی مشہور ہوا۔ چکبست کو ہندوستان کی سرزمین سے بہت محبت و الفت تھی۔ وہ اپنی زندگی کا تمام تر حصہ ہندوستان کی آزادی اور اِس ملک کی ترقی کیلئے وقف کرنا چاہتے تھے۔ اِن کے خیال میں جس طرح اِس شعر سے واضح ہوتا ہے۔

اگر دردِ محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا
نہ کچھ مرنے کا غم ہوتا نہ جینے کا مزہ ہوتا

اِس شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہیکہ چکبست نے کس طرح ہندوستان کے لوگوں سے التجا کرتے نظر آتے ہیں کہ انسان کے دِل میں ایک دوسرے کیلئے ہمدردی ہونا چاہئے کیونکہ یہ جذبہ اگر انسان کے پاس نہ ہوتو وہ انسان، انسان نہیں رہتا بلکہ اِس

میں اخلاقی گراوٹ آجاتی ہے۔ ایک دوسرے کے کام آنا اور ایک دوسرے کیلئے ہمدردی کا جذبہ رکھنا انسان کو انسان بنا دیتا ہے۔ چکبست یہ خیال رکھتے تھے کہ اگر دنیا میں جینا ہے تو ایک دوسرے سے ہمدردی، ایثار اور محبت کو اپنے دِلوں میں لے کر جیئے تو جینے کا مزہ آجائے گا۔

جب ہم چکبست کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو اِن کی شاعری میں ہمیں ہر جگہ ہندوستان میں ملک کی آزادی اور بھائی چارگی کا سبق ہی نظر آتا ہے۔ چکبست ایک مخلص اور باوفا شاعر تھے، انھوں نے جس دور میں شاعری کی وہ دور بہت ہی پرفتن دور تھا، ہر جگہ لوٹ مار اور آپسی مذہبی جھگڑے رونما ہوتے رہتے تھے۔ اِسی کے پس منظر میں بہت سے شعراء نے اپنا قلم اٹھایا اور لوگوں میں انسانیت، ہمدردی اور حب الوطنی کے جذبہ کو نکھارا۔ اُس وقت ملک کو آزاد کرانے کی جو تحریکیں چلتی تھی، اِن تحریکوں میں بھی تمام شعراء آگے آئے، اور اپنا قلم اُٹھایا۔ اور اِس کو مدنظر رکھ کر شاعری شروع کی۔ چکبست کا مجموعہ کلام میں اِن کا ایک ہی مجموعہ ہے جو اِن کی موت کے بعد شائع ہوا، اِس مجموعہ کلام میں نظمیں، غزلیں، قطعات اور سخنی مجموعہ شامل ہے۔ اِن کا یہ مجموعہ کلام پانچ حصہ پر مشتمل ہے۔ اِن تمام مجموعہ میں اِن کی حب الوطنی کی تصویر کشی نظر آتی ہے۔

☆☆☆☆☆

جدوجہد آزادی ہنداور اردو افسانے کے موضوعات

شاہین انصاری
پی ایچ۔ڈی (ریسرچ اسکالر)
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد، تلنگانہ

ہندوستان کی تاریخ میں کئی ایک تحریکیں ایسی ہے جو ادبی و سیاسی نقطہ نظر سے اہمیت کی حامل ہیں۔جن کے اثرات انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ دنیا کے ہر شعبہ ذات پر با آسانی دیکھے جاسکتے ہیں۔ان تحریکوں میں ۱۸۵۷ء کا ناکام انقلاب اہم مقام رکھتا ہے۔۱۸۵۷ء سے پہلے ایک ایسی قوم ہندوستان میں آکر بس چکی تھی جس نے تجارت اور کاروبار کو اپنے ناپاک ارادوں کے لئے استعمال کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے ہندوستان کو دیمک کی طرح چاٹنے لگی۔ ہندوستانی عوام کا اپنی من مرضی سے استحصال کرنے لگی۔ان تمام حالاتوں نے ہندوستانی عوام میں وطن عزیز کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لئے ایک جوش وولولہ پیدا کیا۔لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ میں بری طرح شکست ملنے کے بعد ہندوستانی عوام کے کچھ مخصوص طبقوں نے انگریزوں کے سامنے مکمل طور پر اپنی ہار تسلیم کر لی۔ ۱۸۵۷ء کا انقلاب پوری طرح ناکام رہا،جس کے سبب انگریزوں کی پکڑ ہندوستانی عوام اور ان کی سیاسی و سماجی زندگی پر حد سے تجاوز کر گئی۔انگریز حکمرانوں نے یہاں کی عوام کو انسان نہ سمجھ کر ان کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کرنا شروع کر دیا۔ان سبھی باتوں نے ہندوستان

کی عوام میں منفی و مثبت دونوں طرح کے اثرات مرتب کئے ۔جس نے ہندوستانی نوجوان نسل کو سیاسی اور سماجی کارکردگی کو نئے ضاویے سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے ہمکنار کرایا۔اس کے بعد ہی انسانی زندگی اور اردو ادب میں بھی متعدد تبدیلیاں رونما ہوئیں،جس نے ہر شعبہ ذات کی زندگی کو نئے سفر پر چلنے کو تیار کیا۔وقت کے بدلتے حالات نے اردو ادب کے موضوعات کے ساتھ ہی ساتھ آہستہ آہستہ انسانی زندگی کے اقدار بھی تبدیل کر دئے۔

۱۸۵۷ء کے غدر کی ناکامی نے ہندوستان کی سیاسی،سماجی،تہذیبی وثقافتی، معاشی اور اخلاقی زندگی کو پوری طرح گردگوں کر دیا۔ان تمام احساسات وجذبات کو اس دور کے تخلیق کاروں کی تحریروں میں با آسانی دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔

تاریخی اعتبار سے اردو افسانہ نگاری کی ابتدا بیسویں صدی کے سماجی وادبی شعور کی دین ہے ۔عصری تقاضے اور تیزی سے بدلتے سماجی ،سیاسی اور اخلاقی ضروریات کے تحت اردو افسانے کی ابتدا ہوئی۔اردو کی دوسری صنف کی طرح اردو افسانہ بھی اردو ادب میں مغربی ادب سے آیا۔مغربی ادب سے آئی ہوئی اس صنف کو انگریزی میں short story سے موسوم کیا جاتا ہے۔مغربی ادب میں پیش کردہ صنعتی تمدن نے ہمارے معاشرے اور ادب میں زبردست تبدیلیاں پیدا کیں۔زندگی کے اقدار شکست وریخت سے عملی طور پر کشمکش میں مبتلا تھیں۔انسانی وجود کی نئی ضرورتوں نئے تقاضوں نے تخلیق کاروں کے لئے اظہار خیال کی نئی نئی راہیں ہموار کیں۔اردو افسانے کا ابتدائی دور جہاں مغربی ادب کے اثرات سے متاثر ہے وہیں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہندوستانی سماج میں قصہ کہانی کی روایت

کوئی نئی بات نہیں تھی بلکہ وہ قصہ کہانی کے فن سے بخوبی آشنا تھے۔ کیونکہ اردو ادب میں ابتدائی دور سے ہی مثنوی اور داستان کا رواج معاشرے میں عام تھا۔ اردو میں افسانے کی ابتدا سے پہلے بھی ہندوستانی عوام کہانی کے تصور سے پوری طرح باخبر تھی۔

اردو افسانے میں ہمیں سامراجی طاقتوں کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار دیکھنے کو ملتا ہے۔ اردو افسانوں میں کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اردو افسانہ نگاروں نے اپنی تحریریوں کے ذریعے ملک کی عوام کے دلوں میں بغاوت کی آگ بھڑکانے کی بھرپور کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ بعض افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں سے جس طرح انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کو للکارا اس کی مثال شاید ہی کسی ہندوستانی صنف میں ملے گی۔ ان کے علاوہ دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی اہل وطن کے دل میں جذبہء آزادی بیدار کی۔ ابتدائی دور کے افسانہ نگاروں میں راشد الخیری، پریم چند اور سلطان حیدر جوش کے یہاں کھوئی ہوئی آزادی کا ماتم اور غلامی کے خلاف جذبہ ہائے نفرت کا اظہار کثرت سے ملتا ہے۔

اردو افسانے نے جدوجہد آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ افسانہ نگاروں نے اپنے سیاسی ماحول سے متاثر ہوکر ایسے افسانے لکھے ہیں جن میں اس دور کے سیاسی ہیجانات اور اثرات بے حد نمایاں ہیں، جذبہء حصول آزادی سے دلوں کو روشناس کرانا ان افسانوں کا موضوع اور مقصد نظر آتا ہے۔ معاشرہ کی اس شکست کا اثر ادب پر بھی پڑا اور اس بات پر خصوصی زور دیا گیا کہ افسانے کے ذریعے زندگی کی کشمکش کو پیش کیا جائے۔ اردو افسانے کی باقاعدہ ابتدا سے پہلے کچھ تخلیق کاروں نے انشائیے نما افسانے تحریر کئے جن کو کسی نے مضمون کہا تو کسی نقاد نے انشائیہ

نما افسانہ کہا۔لیکن اردو میں باضابطہ طور پر پہلی بار راشد الخیری نے افسانے تحریر کئے، جن کو افسانہ نگاری کے میدان میں افسانے کا بنیاد گزار ہونے کا صرف حاصل ہے۔ان کا پہلا افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' مخزن لاہور دسمبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا۔اسی افسانے کو انہوں نے اپنے پہلے افسانوی مجموعے ''مسلی ہوئی پتیاں'' کے پہلے ایڈیشن میں ۱۹۳۷ء میں شائع کیا۔یہ خط کی تکنیک میں لکھا گیا عمدہ اصلاحی افسانہ شمار کیا جاتا ہے۔

راشد الخیری میں افسانے لکھنے کا جنون اپنے پھوپھا ڈپٹی نذیر احمد کی تحریروں سے پیدا ہوا تھا۔راشد الخیری نے افسانے کی دنیا میں ایک خاص مقصد کے ساتھ قدم رکھا تھا۔اپنے افسانوں سے ہندوستانی عوام اور نوجوان نسل و غیر تعلیم یافتہ طبقے میں انقلاب اور اصلاحی لہر بیدار کرنا چاہتے تھے۔انہوں نے مسلمانوں کے متوسط طبقے کے مسائل بالخصوص عورتوں کی تعلیم و تربیت اور حقوق نسواں کے لئے زبر دست افسانے پیش کئے ہیں۔انہوں نے زندگی میں ہونے والے تغیر کو اپنی افسانہ نگاری کا نصب العین بنا لیا تھا۔اسی لئے ان کو مصور غم کے لقب سے نوازا گیا ہے۔ان کے افسانوں نے حب الوطنی اور انگریزی حکومت کے خلاف اپنی نفرت کا ویگل پھونکا تھا۔افسان ''سیاہ داغ'' مکمل طور پر جلیا والا باغ کے پس منظر میں لکھا گیا۔اس افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''عدل و رحم شہر کی چار دیواری سے کوسوں دور بھاگ چکا تھا۔مسلح دستہ نے گولیوں کے بوچھاڑ شروع کی، الیاس آباد کا دولہا، بیوہ کا لال جو، رو رو کر کہہ رہا تھا ہم کچھ نہیں کہتے۔فقط ہمارے بچے حوالے کر دو، اپنی درخواست کے جواب میں فیر کی آواز سنتا ہے

اور دیکھتا ہے کہ چہرے سے خون بہنے لگا۔صداقت کا پتلا اور
اسلام کا عاشق ،وطن کا شیدا قدم پیچھے نہیں ہٹاتا اور کہتا ہے کہ:۔
اس خون کے ہر قطرے سے وطن پرست جماعت
پیدا ہوگی، یہ خون ضائع نہ جائے گا اور عنقریب وہ وقت آئے گا
ملک اس خون پر خود قربان ہوگا۔''

(افسانوی مجموعہ،شہید مغرب،ص،۶۳)

یہ افسانہ ۱۹۱۹ء میں جنگ عظیم اول کے خاتمے کے بعد رسالہ ''انقلاب'' میں شائع ہوا تھا، اس کے بعد افسانوی مجموعے ''شہید مغرب، ۱۹۲۹ء میں شامل کیا گیا۔اس افسانے کی فضا سے محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے ہندستان کی آزادی کا خواب دیکھا اور دیکھنے پر مجبور بھی کیا۔راشد الخیری کو اردو افسانے کا ایک معتبر نام تسلیم کیا جاتا ہے۔

جدوجہد آزادی ہند میں موضوعاتی سطح پر ابتدائی افسانہ نگاروں میں راشد الخیری کا ذکر کیا جائے اور اردو افسانے کے بے تاج بادشاہ منشی پریم چند کو کیوں کر نظر انداز کیا جائے۔اس دور کے افسانہ نگاروں میں سرفہرت ان کا نام شامل کیا جاتا رہا ہے۔ابتدائی دور میں جب بھی کوئی فن پارہ ہمارے ادب کا حصہ بنتا ہے تو اس کی تعمیری و تشکیلی عناصر میں پختگی نہیں پائی جاتی ہے۔وہ تخلیق اپنے فنی لوازمات پر پوری نہیں اترتی ،اس لئے افسانے کی ابتدا میں جب راشد الخیری نے اردو افسانے کے میدان میں تجربات کئے تو ان میں افسانوی فضا اتنی جاندار نظر نہیں آتی جو فنی نقطہ نظر سے مکمل ہو۔اس کے بعد جب پریم چند کا پہلا افسانہ ''دنیا کا انمول رتن'' ۱۹۰۸ء میں

شائع ہوا تو یہ افسانہ زبان و بیان کی لحاظ سے افسانہ نگاری کے زیادہ قریب تر تھا اس لئے بعض نقادوں نے ''دنیا کا انمول رتن'' کو اردو کا پہلا افسانہ اور پریم چند کو پہلا افسانہ نگار تسلیم کیا ہے۔ اردو ادب کی افسانوی تاریخ میں ابتدائی دور کے لکھنے والوں میں پریم چند کا تخلیقی سفر کافی طویل اور اتار چڑھاؤ بھرا نظر آتا ہے۔ انہوں نے افسانے کی تین دہائی کا منظر نامہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے فن و ہنر کا لوہا منوایا ہے۔ افسانوں کے ہر دور میں نئے موضوعات اور تجربات کا نیا اور انوکھا منظر نامہ پیش کیا ہے۔ پریم چند کا پہلا افسانوی مجموعہ ''سوز وطن'' پانچ کہانیوں پر مبنی تھا، جو ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔ ان میں شامل افسانوں کے ذریعے لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان افسانوں میں 'دنیا کا سب سے انمول رتن، عشق دنیا، حب وطن، میرا وطن ہے۔ اس مجموعے میں شامل بیشتر افسانوں میں انگریز حکومت کے خلاف بغاوت اور حب الوطنی کا جذبہ کارفرما ہے۔ افسانہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' کے اقتباس سے حب الوطنی اور وطن کے لئے قربان ہونے کی محبت صاف نظر آتی ہے:۔

> ''آخر عاشق غم خوار ایک بزرگ کی رہنمائی میں ہندوستان آتا ہے جہاں اسے ایک میدان میں جنگ کا منظر نظر آتا۔ یہاں اسے کئی بہادر نوجوان خون میں لت پت تڑپتے ہوئے نظر آئے۔ وہ اس منظر سے دہل گیا۔ آگے بڑھ کر دیکھا تو ایک نوجوان کے سینے سے خون ابل رہا تھا اور وہ دم توڑنے کو تھا۔ دلفگار نے اس سے پوچھا ''اے جواں مرد تو کون ہے'' جواں مرد نے یہ سن کر آنکھیں

کھولیں اور دلیرانہ لہجے میں بولا:

''کیا تو نہیں جانتا میں کون ہوں۔کیا تو نے آج اس تلوار کی کاٹ نہیں دیکھی؟ میں اپنی ماں کا بیٹا اور بھارت کا لخت جگر ہوں''۔۔۔۔۔۔۔

(افسانوی مجموعہ،سوز وطن،ص،۳۰،۳۱)

یہی وہ زمانہ ہے جب پریم چند وطن عزیز کی جدو جہد آزادی کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیتے ہیں۔ پریم چند نے اس طرح کے کئی شاہکار افسانے یاد گار چھوڑے ہیں۔'جن میں' آشیاں' برباد، ڈامل کا قیدی''''آخری تحفہ''جیل''، ''سہاگ کی ساڑی''، بارات وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

خواجہ حسن نظامی نے بھی جنگ جدو جہد آزادی ہند سے پیدا ہونے والے مسائل پر خوب ہنر مندی سے افسانے تخلیق کئے ،اس حوالے سے ان کا مجموعہ ''بیگمات کے آنسو'' مغلیہ خاندان کے ساتھ ہی پورے ہندوستان کی المناک داستان بن کر ابھرتی ہے۔اس کے بعد دوسرا افسانوی مجموعہ''غدر دہلی کے افسانے '' کے نام سے منظر عام پر آیا۔اس دور کے دوسرے افسانہ نگاروں میں اوپندناتھ اشک ،حکیم یوسف ،حامد اللہ افسر اور میر ناصر علی اہمیت کے حامل ہیں ۔جن کے افسانوں میں بدلتے ہوئے موضوعات پائے جاتے ہیں۔

ہندوستان کی تاریخ میں جہاں ۱۸۵۷ء کا غدر اور جدو جہد آزادی ہند کی اہمیت ہے اسی طرح جدو جہد آزادی ہند میں اردو افسانے کی رومانی تحریک کے افسانوی موضوعات کی بھی اہمیت مسلم ہے۔اردو افسانے کے بدلتے موضوعات

میں رومانی تحریک کا اہم کردار رہا ہے۔رومانی تحریک کے بنیادگزار سجاد حیدر یلدرم نے اپنے افسانوں میں عورت کے حسن و جمال کی پرکشش تصویر پیش کی ہے۔حسن و عشق ہی ان کے افسانوں کا موضوع رہا ہے۔جب کی ان کے زیادہ تر افسانے دوسری زبان سے ترجمہ کردہ تھے۔اسی دور کے دوسرے اہم افسانہ نگار نیاز فتح پوری کی رومانیت کا مرکزی نقطہ تخیل آرائی سے عبارت ہے۔یہ حسن و جمال کا مشاہدہ خود اپنی آنکھوں سے کرتے ہیں اور کائنات کے ذرے ذرے میں فطرت کا حسن دیکھتے ہیں اور اسے ہی اپنی تحریروں قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔نیاز فتح پوری کے افسانے ایسے دور کی تخلیق ہیں جسے اردو میں نثر لطیف کا دور کہا جاتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے اور جدو جہد آزادی کے بعد ہندستانی عوام میں مایوسی، بے یقینی ، بے عملی کا دور دورہ تھا۔اردو کے افسانہ نگار اپنے افسانوں کے ذریعے ہندوستانیوں کے دلوں میں سوچنے سمجھنے کا جذبہ پیدا کررہے تھے کہ مغربی تہذیب ہمارے یا ہماری آنے والی نسل کے لئے کسی بھی طرح مفید نہیں ہے،جس کا اثر افسانہ نگار سلطان حیدر جوش کے یہاں نمایاں طور پر ملتا ہے۔جوش کے موضوعات عام طور سے مشرقی روایات کی بازیافت سے ماخوذ ہیں۔ان کے افسانوں میں عورتوں کی تعلیم وآزادی نسواں کی جدو جہد دیکھائی پڑتی ہے۔رومانی تحریک کے افسانہ نگاروں میں مجنوں گورکھپوری،حجاب امتیاز علی تاز اور نذر سجاد حیدر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

بیسویں صدی کی ابتدا کے وقت ہی ادب میں نئے رویے و رجحانات سامنے آنے شروع ہو گئے تھے۔اردو میں رومانی اور حقیقت پسندی جیسے رجحانات ایک ہی ساتھ ابھرے بیسویں صدی کے آغاز ہی سے ہندوستان میں ارتقاء پانے

والے سیاسی وسماجی حالات نے اردو ادب خصوصی طور پر اردو افسانے کو زیادہ متاثر کیا۔ ملکی و بین الاقوامی حالات نے پورے معاشرے کو ایک ہیجان انگیز کیفیت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ رومانی تحریک سے وابستہ کئی افسانہ نگار حقیقت نگاری کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر جدوجہد آزادی ہند کے مرتب کردہ اثرات کی طرف بیباک انداز میں کھل کر طنز کیا اور موجودہ انگریز حکومت کے خلاف بغاوت کی چنگاری بھڑکائی۔ حقیقت نگاری کی ابتدا سے پہلے افسانوں میں وہ بے باکی کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں جو اس دور کے افسانہ نگاروں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

اردو افسانے کے موجد اور حقیقت نگاری کے نقیب کہے جانے والے منشی پریم چند نے اپنی تحریروں کے ذریعے معاشریے کی اصلاح اور لوگوں میں اپنے حقوق کے لئے لڑنے اور اپنے وجود کو قائم رکھنے کی تعلیم دی۔ اردو افسانے میں حقیقت پسند موضوعات کی شروعات پریم چند سے ہوئی۔ ان کے ابتدائی دور کے افسانوی مجموعے سے لے کر آخری افسانوی مجموعے ''واردات'' تک ہر ایک افسانے میں ہندوستانی عوام کو غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی ضرورت اور عوام کے دوسرے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کو پیش کرتے ہوئے انہوں نے کبھی بھی حقیقت سے انحراف نہیں کیا۔ افسانہ ''بڑے بابو'' میں ہندو مسلم تناؤ بڑھانے والے عناصر پر طنز کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ افسانہ ''عجیب ہولی'' میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انگریز حکمران ہندوستانی باشندوں سے کس قدر نفرت کرتے ہیں۔

رومانی تحریک اور حقیقت نگاری کے رجحانات اردو افسانے کی تاریخ اور جدوجہد آزادی ہند میں اہمیت کے حامل ہیں۔ ان تحریکوں نے آنے والے تخلیق

کاروں کے لئے، زمانے کی موجودہ صورت حال کو جاننے و سمجھنے کے لئے راہیں ہموار کیں۔ان میں ایک نیا قسم کا جوش و جرات پیدا کی اور اس دور کے سلگتے ہوئے موضوعات اور ان سے پیدا ہونے والی ذہنی اور اخلاقی کشمکش کو پیش کرنے کا حوصلہ پیدا کیا اور ان کی سب سے جیتی جاگتی مثال ۱۹۳۲ء میں منظر عام پر آنے والے افسانوی مجموعے ''انگارے'' کی ہے۔اس میں چار تخلیق کاروں کی تخلیقات شامل ہیں، جس نے اردو ادب اور اس دور کے فرسودہ مذہبی اداروں اور استحصالی رسومات پر کھل کر طنز کیا، جس کے بنا پر اس کو نظر آتش کر دیا گیا تھا۔اس افسانوی مجموعے میں رشید جہاں، سجاد ظہیر، احمد علی اور محمود الظفر کے افسانے شامل تھے۔ان کے یہ افسانے سنسنی خیز اور جوش و ولولہ پیدا کرنے والے تھے، جن میں جنسیات کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔اس مجموعے کی مختصر کہانیوں نے ہندوستان کے قدامت پرستوں کو بڑے حوصلہ مند طریقے سے چیلنج کیا اور مستقبل میں آنے والے افسانہ نگاروں (منٹو، کرشن چندر، بیدی، عصمت، احمد ندیم قاسمی، حسن عسکری اور عزیز احمد) کے لئے روشن خیالی اور جدید فکر کی ایک نئی زمین تیار کی۔

جدو جہد آزادی ہند اور اردو افسانے کے بدلتے موضوعاتی پس منظر میں سب سے اہم کام اس تحریک نے ادا کیا جس کا شمار اردو کے ساتھ دنیا کی ادبی تحریکوں میں کیا جاتا ہے۔جسے اردو ادب میں ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک سے موسوم کیا جاتا ہے۔یہ تحریک اپنے اشتراکی نظریہ کے لئے مشہور ہوئی۔اس تحریک کے زیر اثر لکھے گئے ادب کا تعلق انسانی زندگی کے قریب ہونا طے کیا گیا تھا۔''ادب برائے زندگی'' کے تحت ہی افسانے تخلیق کرنے تھے۔اس دور کے افسانہ نگاروں نے

حقیقت پسندی کے ساتھ عام انسانی زندگی کے مسائل کو موضوع بحث بنایا۔ جدوجہد آزادی ہند کے اثرات سے متاثر ہو کر اس تحریک کے زیر اثر زیادہ افسانے لکھے گئے۔ ترقی پسند تحریک نے ہندوستان کی عوام کی ان سماجی و سیاسی برائیوں اور مسائل کو افسانے کا موضوع بنایا، جو آج سے پہلے صرف حسن و عشق کے قصوں کی بنا پر نظر انداز ہو رہے تھے۔ اسی نقطہ کو مد نظر رکھتے ہوئے ترقی پسند تحریک کی پہلی کل ہند کانفرنس میں پریم چند نے اپنے خطبہ میں کہا تھا کہ ''ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا''۔ ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ خوبصورتی دنیا کی ہر شے میں موجود ہے ہمیں اپنی پرانی فرسودہ روایت سے الگ ہٹ کر نئے موضوعات پر قلم اٹھانی ہوگی۔ عشق و عاشقی کے تصور سے باہر جھانکنے کی ضرورت ہے، دنیا کی ان خوبصورت شے کو دیکھنے اور تلاش کرنے کے لئے نظر نہیں نظریہ بدلنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ہی پریم چند نے اپنے افسانوں میں ہندوستانی عورتوں کا کھیتوں میں کام کرنا اور ان کے ساتھ ہونے والے جنسی و نفسیاتی استحصال کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ جدوجہد آزادی ہند سے کس طرح ہر طبقے کے لوگوں کی زندگی مشکل و اجیرن بن گئی ہے۔ اردو کے افسانہ نگاروں نے زمین داروں کی زور زبردستی اور استحصال کو پیش کرتے ہوئے اس دور کے جیتے جاگتے ہندوستان کی مکمل تصویر ہمارے سامنے ظاہر کر دی ہے۔ پریم چند عملی طور پر کانگریس کی تحریک سے وابستہ تھے اور ان کے افسانوں میں سیاسی موضوعات بالخصوص آزادی کی حمایت کا موضوع بار بار آتا ہے۔ ''ستیہ گرہ'' ایک ایسی کہانی ہے جس میں ایک طرف بنارس میں کانگریس کی بائیکاٹ کی تحریک اور حکومت سے تکرار کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ اردو افسانے کے موضوعات و

مقصدیت کے لحاظ سے ایک نئی روح پھونک دی گئی۔اس دور کے افسانہ نگاروں کی فہرست کافی طویل ہیں۔بعض اہم افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، بیدی، منٹو، عصمت ،ممتاز مفتی ،اور احمد ندیم قاسمی اہمیت کے حامل ہیں جن کے افسانوں کے موضوعات ہر دور کے مختلف اور منفرد رہے ہیں۔

کرشن چندر کے افسانوی موضوعات میں کافی وسعت پائی جاتی ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں کشمیر سے تعلق رکھنے والے مسائل کے ساتھ جدو جہد آزادی ہند سے پیدا ہوئے موضوعات کو بھی قلم بند کیا ہے۔کرشن چندر نے جدو جہد آزادی ہند سے پہلے اور بعد میں بھی سیاسی وسماجی مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے۔آزادی سے قبل ان کے مشہور افسانوں میں ''زندگی کے موڑ پر''،''ان داتا''،''کالو بھنگی''،اہم ہیں۔کرشن چندر کے افسانوی موضوعات میں کافی وسعت اور تنوع پایا جاتا ہے۔ان کے افسانوی فضا میں پیشاور کے بازار اور میلوں،امرتسر کے گلی کوچوں اور کشمیر کے باغوں کی دل فریب منظر کشی کے ساتھ ان کی زندگی کی کشمکش اور اتار چھڑاؤ کو اس خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ اس کی دوسری مثال اردو ادب میں مشکل سے ملے گی۔

کرشن چندر کے دوسرے افسانے بھی جدو جہد آزادی ہند کی روداد بیان کرتے ہیں۔جن میں پشاور ایکسپریس، ہم وحشی ہیں، دوسری موت، امرتسر آزادی سے پہلے امرتسر آزادی کے بعد، جیکسن، ایک طوائف کا خط، لال باغ، اندھے اور دل کا چراغ وغیرہ افسانے اہمیت کے حامل ہیں۔

ان کے افسانوی مجموعے ''ہم وحشی ہیں'' کے بیشتر افسانے قابل تعریف ہیں، لیکن ''امرتسر آزادی کے بعد''میں جدو جہد آزادی ہند کے بعد کی موجودہ

صورت حال کی عکاسی فنی چابکدستی سے کی گئی ہے۔اس افسانے کی کہانی ایک کردار کے سہارے بیان کی گئی ہے۔آزادی ہند کے بعد کس طرح سے لوگوں میں انسانیت مر چکی تھی اور ہندستانی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آتے ہیں۔اس کی صاف تصویر اس افسانے میں دیکھی جاسکتی ہے۔افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

''پہل بلوچ سپاہیوں نے کی ۔پندرہ آدمی فائر سے گر گئے ۔یہ تکشیلا کا اسٹیشن تھا۔بیس آدمی اور گر گئے ۔یہاں ایشیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی تھی اور لاکھوں طالب علم اس تہذیب وتمدن کے گہوارے سے کسب فیض کرتے تھے۔پچاس اور مارے گئے۔''

(افسانوی مجموعہ،ہم وحشی ہیں،ص،۶۵)

ترقی پسند تحریک کے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ منٹو کے افسانے کی فضا کا مطالعہ کرتے وقت عام قاری ان کے پیش کردہ کوٹھے تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا ہے۔بعض افسانہ نگاروں کے تمام موضوعات عام قاری سے تعلق رکھنے والے نہیں ہوتے ہیں،حیات اللہ انصاری بھی بہت کوشش کے بعد بھی اپنے افسانوی فضا میں زیادہ ہم آہنگی اور وسعت پیدا نہیں کر سکے۔کرشن چندر اور احمد ندیم قاسمی میں موضوعاتی مماثلت دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ کرشن چندر اردو ادب کا ایسا افسانہ نگار ہے جس سے ہر قاری کو دلچسپی ہوتی ہے۔کرشن چندر ایک کامیاب اور منفرد افسانہ نگار تھے۔جن کی شہرت اور مقبولیت ملک کی سرحدوں کو پار کر کے افسانوی دنیا میں اس طرح پھیل گئی کہ ان کو''ایشیا کا عظیم افسانہ نگار''تسلیم کیا جانے لگا۔

سعادت حسن منٹو نے اپنے افسانوں میں جنسیات کے موضوع کو پیش کیا ہے۔ان کے بیشتر افسانوں پر فحش نگاری کے الزامات لگائے گئے جو کافی حد تک درست ہیں۔ان کے مشہور افسانوں میں ٹھنڈا گوشت ،کالی شلوار، میرا نام رادھا وغیرہ ہیں۔''تماشا'' منٹو کے افسانوں کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو انقلابی جوش سے بھرا ہوا اشتراکی نظریات سے وابستگی کی دلیل ہے۔

اسی دور کی خواتین افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی کا بھی نام اہمیت کا حامل نظر آتا ہے جن کے افسانوں کے موضوعات میں رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ان کے ابتدائی دور کے افسانوں میں مسلم گھرانوں کی عورتوں اور ان کے متعلق مسائل بیان کئے ہیں، جو ہمیشہ سے گھروں کی چار دیواریوں میں دب کر سسکتے سسکتے دم توڑ دیتے نظر آتے ہیں۔عصمت نے بھی افسانوں میں جدوجہد آزادی ہند کو موضوع بحث بنایا ہے۔ان کے مقبول افسانوں میں ''بھول بھلیاں''، ''چھوئی موئی''، ''چوتھی کا جوڑا''، تل اور لحاف اہم ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے بیشتر افسانہ نگاروں کے افسانوں میں جدوجہد آزادی ہند سے پیدا ہونے والے مسائل کو اردو افسانوں میں بخوبی پیش کیا ہے۔جدوجہد آزادی ہند کی کوشش سے ایک اہم مسلہ وطن عزیز کو دو حصوں میں تقسیم ہونے کا المیہ بن کر ابھرا جس نے پورے ملک میں فرقہ وارانہ فساد کی بنیاد ڈالی تھی۔ایک وہ وقت تھا جہاں ہندو مسلم اور سکھ ایک ساتھ مل کر اپنے وطن عزیز کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے میں ایک دوسرے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر انگریز حکومت کے خلاف اعلان جنگ کا نعرہ بلند کرتے نظر آئے وہیں دوسری طرف تقسیم ہند کے المیہ

نے ان ہندوستانی قوموں کوایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا کرایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا۔ جدو جہد آزادی ہند سے پیدا شدا مسائل میں یہ بھی ایک اہم موضوع بن کرابھرا۔افسانہ نگاروں نے فسادات اورخون خرابے کواپنے افسانوں میں بخوبی پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی۔اس حوالے سے کرشن چندر کا افسانہ ہم وحشی ہیں''، منٹو کا ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، ''انتظار حسین کا ''اجودھیا''، عصمت چغتائی کا ''جڑیں''، قرۃ العین کا ''جلا وطن''، جیسے افسانوں میں اس دور کے خون ریزی اور نسل کشی کی مکمل داستان صفحہ قرطاس پرانسانی خون سے لکھی گئی معلوم ہوتی ہے۔جدو جہد آزادی ہند کے اثرات ترقی پسند تحریک سے تقسیم ہند کے المیہ تک اردو افسانے کی تاریخ پر چھائے رہے۔جدو جہد آزادی ہند کے بعد کے افسانوں میں بھی ان موضوعات کوموضوع بحث بنایا جاتا رہا ہے۔

جدو جہد آزادی ہند کی تحریک ایک فعال تحریک تھی جس میں ہر مذہب اور وقوم کے لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور جدو جہد کے ساتھ ہندوستان کوانگریزوں سے آزاد کرانے کی بھرپور کوشش کی۔جدو جہد آزادی ہند میں اردو ادب کے ہر میدان نے اپنی خدمات انجام دیں، جسے کسی بھی صورت میں فرموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

حوالہ جات:۔

۱) راشد الخیری، افسانوی مجموعہ، سوز وطن، ص، ۶۳ (مطبوبہ محبوب المطابع برقی پریس، دہلی)

۲) پریم چند، افسانوی مجموعہ، سوز وطن، ص، ۳۰، ۳۱ (تہذیب نو پبلیکیشنز، الہ آباد، ۱۹۸۰ء)

۳) کرشن چندر، افسانوی مجموعہ، ہم وحشی ہیں، ص، ۶۵ (ایشیا پبلیشر، دہلی، ۲۰۰۲)

☆☆☆☆☆

جدوجہد آزادی ہنداور اردو ادب

محمد زکریا محمد اسماعیل،
ناندیڑ، صوبہ مہاراشٹرا۔

آزادی روشن جذبوں، معطر آرزوؤں اور کیف آگیں خوابوں کی منور تعبیر نہیں تو کیا ہے۔ یہ وہ رنگین دنیا ہے جس کی پہنائی نیلگوں آسماں کی بے کراں وسعتوں کو بھی شرماتی ہے۔ آزادی قلب انسانی پر ملکہ بن کر راج کرتی ہے جس کے ملکوتی حسن و جمال پر دل و جان فدا ہوتے چلے جاتے ہیں اور پھر ادباء و شعراء اسے اپنی ساحری سے ایسا جمیل تر بنا دیتے ہیں کہ مخلوق اس کے قدموں پر پروانہ وار نچھاور ہو جاتی ہے۔ اس کے فیض سے خود اعتمادی، عزت نفس اور سرفرازی عطا ہوتی ہے اور قومیں سرفروشی کا قرینہ اور عزت سے جینا سیکھتی ہیں۔ اسی لیے خدا کا سب سے بڑا انعام اور انسان کے سب سے محبوب جذبے کا نام آزادی ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے تو جذبہ آزادی محبوب الجذبات ہے۔ انسان شہکار خداوندی ہے تو آزادی عظیم عطیہ خداوندی ہے۔ لیکن یہ امر باعث حیرت ہے کہ خدا نے انسان کو جس شرف و عظمت سے نواز کر دنیا میں بھیجا اس کو خود انسان نے انسانیت سے دور رکھنے کی کوشش کی ہے۔ انسانوں کو آزادی کی نعمتوں سے محروم رکھنے اور غلامی کی لعنت کو رواج دینے والا بھی خود انسان ہی ہے۔ جب ہم انسانی زندگی کی معلوم تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو غلامی کی تاریک سیاہ رات دور دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ آزادی کے حقیقی معنی اس کے مقصد اور حدود

غیر متعین ہیں ۔کسی بھی فرد اور معاشرے کے درمیان ربط وتعلق اور حقوق وفرائض کے اعتبار سے آزادی کے مختلف خیالات تصور کیے جاتے ہیں ۔

انیسویں صدی میں بھی جان سٹوارٹ مل نے بھی آزادی کی قدر و قیمت اور اس کے مضمرات پر روشنی ڈالی ہے۔مل کے خیالات کو جوہر یہ ہے کہ جو آزاد نہیں وہ انسان نہیں ہے۔جس کو ہم پوری آزادی دینے سے انکار کرتے ہیں اس کو ہم پورا انسان نہیں سمجھتے ۔اس کے نزدیک آزادی انسان کی ان خاصیتوں میں سے ہے جن کے بغیر وہ انسان نہیں ہوسکتا کیونکہ یہی تمام خاصیتوں کو حرکت میں لاتی ہے انسان کو خدا نے سمجھ دی ہے لیکن اگر وہ اپنی سمجھ سے کام نہ لے یا دوسرے اسے کام نہ لینے دیں تو اس میں اور دوسرے جانوروں میں کوئی خاص فرق نہیں رہتا۔غیر معمولی ذہانت کے اشخاص صرف آزاد فضا ہی میں سانس لے سکتے ہیں۔انسانی تہذیب وتمدن جنگ اور امن کی مخلوط فضا سے عبارت ہے۔اور اس جہاں کو کوئی خطہ بھی اس کشمکش سے خالی نہیں ہے۔غیر مہذب قدیم معاشرے اور جدید دور کی مہذب اقوام کبھی گرم جنگ اور کبھی سرد جنگ کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔مختلف جنگوں کے درمیان وقفہ خاموشی کو امن کا نام دیا گیا اور کبھی لاکھوں انسانوں کے کشتوں کے پشتے لگا کر اسے جنگ برائے امن قرار دیا گیا۔تاریخ انسانی میں رزم اور بزم کی اس آنکھ مچولی میں ادب نے ہمیشہ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں اور حاضریں اور غائبین تمام کے لیے کچھ مناظر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیے اور صرف محفوظ نہیں کیے بلکہ ظالم اور مظلوم کے چہروں کے خدوخال واضح کرنے کی کوشش کی ۔

ہندوستان کی تحریک آزادی دراصل ۱۸۵۷ء ہی سے شروع ہوگئی تھی اور بیسویں صدی میں ایک نئے موڑ سے آشنا ہوئی ۔جنگ آزادی کے اس طویل عرصے

میں شعرا نے اپنا فرض بخوبی ادا کیا۔ مولانا محمد علی جوہر، اقبال، ظفر علی خان اور حسرت موہانی سمیت بیسوں شعرا نے اپنی قوم میں حب الوطنی، جذبہ آزادی کی تڑپ اور غیرت ملی کو زندہ بیدار کیا۔ یہ بات حق ہے کہ قومی شاعر جب امن کا قصیدہ لکھتا ہے تو ایک ایک لفظ کو گل یاسمین کا مظہر بنا دیتا ہے اور جب وہ جبر و استبداد کی ہجو سرائی پر اتر تا ہے تو اس کے نوک قلم سے چنگاریاں برسنے لگتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی اور جہاں پر بھی جدوجہد آزادی کی تحریکیں شروع ہوئیں اس وقت ادباء و شعرا کی قلم تلوار بن گئی اور شعراء نے اپنے شعلہ بیانیوں سے حیات قومی کی تجدید کر کے حالات کا رخ موڑ کر رکھ دیا۔

ادب سیاست کا امام ہے دنیا کے بہت سے انقلابات ادب کے اشاروں پر برپا ہوئے ہیں۔ جرمن، فرانس، ترکی، مصر، امریکہ اور روس کے جو انقلابات رونما ہوئے ہیں ان میں زبان و ادب کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ خود ملک ہندوستان کی حکومتیں بدلنے میں ادب نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ادب کے اشارے پر حکومت کی بساطیں الٹ دی گئی ہیں اور اس ضمن میں شاعروں کو فوقیت حاصل رہی ہے جنہوں نے پر جوش ہنگامی نظمیں لکھ کر اپنے زمانے کا نقشہ ہے بدل دیا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کی لڑائی بھی ادب کے سہارے ہی لڑی گئی۔

اردو شاعری میں مزاحمتی رنگ بخوبی نظر آتا ہے۔ جعفر زٹلی، نظیر اکبر آبادی، سودا، قائم وغیرہ کی نظموں، ہجویات اور شہر آشوبوں میں عصری شعور کی بھرپور غمازی کی گئی ہے۔ ان کے ہاں ظلم و جبر، استحصال، آمریت اور طوائف الملوکی کے خلاف ایک موثر احتجاج موجود ہے۔ سرسید، حالی، شبلی، آزاد اور نذیر احمد وغیرہ نے مولانا محمد علی جوہر اور چکبست وغیرہ نے لوگوں کے دلوں میں احساس غلامی کو بیدار کیا اور ایک نیا ولولہ اور تڑپ پیدا کر کے حصول آزادی کی شاہراہ پر گامزن کر دیا۔ ظفر علی خاں کی

شاعری تحریک آزادی کی ایک منظوم داستان کا درجہ رکھتی ہے۔ علامہ اقبال کی نظموں نے مسلمانوں میں آزادی کا جوش و جذبہ پیدا کیا اور خواب حقیقت کا روپ اختیار کر گئی۔ حسرت موہانی بھی آزادی کامل کے خواہاں تھے اور اپنی حق گوئی میں بے مثل تھے انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں، لیکن سامراجی حکومت کے خلاف تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

البرٹ کامیو کے مطابق آج کا ادیب ماضی کی نسبت زیادہ باخبر اور باضمیر ہے اور وہ کسی صورت بھی لاتعلقی کا لبادہ نہیں اوڑھ سکتا۔ پابلو نیرودا کا کہنا ہے کہ ماضی یا حال کا کیا ذکر، شاعر ہمیشہ ہی سے اس منصب پر فائز ہے کہ وہ کشمکش زندگی سے بے نیاز نہیں رہ سکتا اور زندگی کی مثبت اقدار کی پشت پناہی اس کا اولین فریضہ ہے۔ کارل مارکس کے نزدیک انسانی وقار اسی صورت میں برقرار رہ سکتا ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کو انسانی وقار کی بقاء کے لیے استعمال میں لائے بصورت دیگر وہ اپنے وجود کے انکار کا مرتکب ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے مطابق:

> ''حقیقت یہ ہے کہ ہر دور کے اہل قلم وطن کی محبت میں معاشرے کے دیگر طبقوں سے کسی لحاظ سے بھی کم نہیں رہے ہیں۔ یہ آج کی بات نہیں بلکہ تاریخ گواہ ہے کہ ہر دور میں ادیبوں نے قلم سے وطن کا قرض چکانے کی کوشش کی ہے اور یہ کوشش ہمیشہ خلوص اور نیک نیتی پر مبنی رہی ہے۔ قومی نقطہ نظر سے جب ادب کے کردار اور ادیب کے فرائض کا مطالعہ کریں تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے لے کر آج تک ادیب کسی بھی

اپنے فرائض سے غافل نہیں رہا۔ مہذب معاشرے ہمیشہ اپنے
ادیبوں کا احترام کرتے اور انہیں ان کا جائز مقام دیتے ہیں جس
کے معاوضے میں ادیب ان کے لیے قطب نما کا کام کرتا ہے
، بادبان بنتا ہے اور تاریکی میں ستارہ بن کر دمکتا ہے۔'' [1]

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ بحیثیت مجموعی شعراء نے کبھی بھی اپنے وقار اور آزادی کا سودا نہیں کیا۔ انہوں نے حق گوئی و بے باکی کا علم ہر حالت میں بلند رکھا۔ لفظ اور قلم کی حرمت کی پاسداری میں ان کے ہاتھ قلم بھی ہوئے لیکن پسپائی کے جادے ان پر ہمیشہ بند رہے۔ ان کا دامن مصلحت، لالچ یا مفاد سے آلودہ نہیں ہوا۔ انہوں نے عزیمت اور مزاحمت کا راستہ اختیار کر کے ظلم اور جبر کے آگے بند باندھنے کی حتیٰ المقدور کوشش کی ۔ عالمی ادب میں مزاحمتی ادب کا ایک بڑا ذخیرہ ادیبوں اور شاعروں کی جدوجہد کو سلام پیش کرنے کے لیے کافی ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کے مطابق:

''مزاحمتی ادب ہمیشہ شعوری کاوش کا نتیجہ اور انسانی جدوجہد کے
مثبت رخ کا آئینہ قرار دیا جاتا ہے۔ مزاحمتی ادب کی اصطلاح کا
اطلاق استعمار کی گرفت میں جکڑے یا استعماری اثرات میں
اسیر معاشرے کے باشعور فن کار کی مصلحت سوزی، بآواز بلند حق
کی گواہی اور آنے والے کل کو اجلا اور روشن بنانے کے خواب کا
اعتبار پیدا کرنے کی تخلیقی کاوش پر ہوتا ہے۔ تاہم یہ امر واقع ہے
کہ مزاحمتی ادب نے نہ صرف انسانی تہذیب و ثقافت کی بنیاد

رکھی بلکہ اس کی زندگی کا خراج بھی ادا کیا۔تخلیق کار انسانی ضمیر کا سب سے بڑا محافظ ہے اور یہ ضمیر آدمیت کی سب سے بڑی دلیل ہے جب کہ غلامی کی ہر صورت سیاسی، معاشی ،فکری اور ثقافتی ،انسانیت کی تذلیل ہے یہی وجہ ہے کہ ہر باشعور یا باضمیر تخلیق کار فطرتاً آزاد ہوتا ہے اور غلامی مسلط کرنے کی صورت اور ہر کوشش کے خلاف مزاحمت کرتا ہے۔''[۲]

جبر اور ناامیدی کے اس طویل دور میں جس نے دلوں میں آس اور جدوجہد کے دیپ جلائے رکھے اسے معاشرہ ادیب اور شاعر کے نام سے جانتا ہے۔شاعر یا ادیب پر حقائق سے گریز کا الزام بھی لگایا گیا لیکن وقت نے یہ ثابت کیا کہ وہ نہ صرف لمحہ موجود سے باخبر ہوتا ہے بلکہ اسے پردہ افلاک میں مستور حقائق اور حوادث کا ادراک بھی بخوبی ہوتا ہے۔جب سامراجیت نے اپنے پنجے گاڑے تو محکوم اقوام کے شعراء نے صحیح معنوں میں دیدہ بینائے قوم ہونے کا ثبوت دیا۔شعرا نے حال کے جبر کا مقابلہ کرنے کا درس بھی دیا،قوم کے ماضی کے دلفریب کارناموں کو بھی اجاگر کیا اور ایک تابناک مستقبل کو خوشخبری بھی سنائی۔دراصل شاعر یا ادیب کا فریضہ ہی روشنی پھیلانا ہے۔بہت سے شعراء نے آزادی کی تحریکوں میں عملی جدوجہد کی اور متعدد نے اس مقدس راستے پر چلتے ہوئے اپنی جانیں بھی قربان کردیں۔

حالی نے مقدمہ شعروشاعری میں شعر کی تاثیر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دنیا کی تاریخ میں سیاسی مشکلات میں شعر سے بڑھے بڑھے کام لیے گئے۔انھوں نے ایتھنز کی مثال دی ہے

کہ سولن کی شاعری کی تاثیر سے ایک شکشت خوردہ قوم میدان میں دوبارہ کود پڑی اور مگرا والو کو شکست فاش ہوگئی۔ اس کے علاوہ لارڈ بائرن کی مشہور نظم نے اہل یورپ کو بیدار کیا اور یونان نے ترکی پر فتح حاصل کر لی۔ غرض یورپ میں لوگوں نے شعر سے بہت کام لیے ہیں۔ [۳]

نثری ادیبوں میں ڈپٹی نذیر احمد، پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، سجاد ظہیر، عزیز احمد، وغیرہ نے نثری ادب کے ذریعے براہ راست اور بالواسطہ طور پر جدوجہد آزادی کے فروغ کی مساعی نظر آتی ہے۔ ڈراما نگاروں میں 'فرنگی اور ہندوستانی طرز حکومت'، نانا صاحب، امراؤ علی کا ڈرامہ 'البرٹ بل'، مولانا ظفر علی خاں صاحب کا ڈرامہ 'جنگ روس و جاپان'، اصغر علی نظامی کا ڈرامہ 'قومی دلیر'، وغیرہ نے بھی عوامی جدوجہد آزادی کے جذبہ کو فروغ دیا ہے۔ شعرا اور ادباء نے آزادی اور جمہوریت کی جدوجہد میں ہمیشہ مظلوم اور محکوم اقوام کا ساتھ دیکر ان میں جذبہ آزادی پیدا کیا ہے۔ جس سے ادیب، ادب اور جدوجہد آزادی کے مابین گہرے رشتے کا پتہ چلتا ہے۔

حوالہ جات:

۱) مشمولہ، جوش کا نفسیاتی مطالعہ اور دوسرے مضامین۔ ڈاکٹر سلیم اختر، لاہور۔ ص ۱۴۴۔

۲) عالمی مزاحمتی شاعری۔ مشمولہ ماہ نو، لاہور۔ ۱۹۸۸، ص ۳۳۔

۳) مقدمہ شعر و شاعری۔ مولانا الطاف حسین حالی، لاہور: ۲۰۰۵، ص ۸ تا ۱۴۔

☆☆☆☆☆

جدوجہد آزادی ہند میں الہلال کا کردار

سیدہ فاطمہ النساء اسماء
ریسرچ اسکالر ساتاواہنا یونیورسٹی
کریم نگر تلنگانہ

ہندستان کی جدوجہد آزادی میں جن مسلم رہنماؤں نے اُردو صحافت کے ذریعے قومی زندگی میں انقلاب برپا کیا ان میں ایک نابغہ شخصیت مولانا آزاد کی ہے مولانا ابوالکلام آزاد ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے وہ بہ یک وقت ادیب، شاعر، مفسر، مذہبی رہنما، انقلابی صحافی، عظیم مجاہد آزادی اور سماجی اصلاح کار تھے۔ان کی شخصیت ایک گلدستہ کے مانند تھی۔جس میں کئی قسم کے پھول مہکتے تھے۔ان کے افکار، خیالات، احساسات ونظریات اوران کی زندگی کے روشن پہلو ہمارے لئے مشعلِ راہ ہیں۔

مولانا آزاد شروع ہی سے ہندوستان کی آزادی اور باہمی ہم آہنگی کے علمبردار رہے ''الہلال'' مولانا آزاد کا وہ کارنامہ ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ۔جس کو اردو صحافت کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔یہ ایک ایسا اخبار تھا جس نے سیاسی شعور اور قومی جذبات کو بیدار کر کے ملک میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔اس اخبار کے ذریعے خوابیدہ مسلمانوں کو نیند سے جگانہ چاہتے تھے۔ قوم کو ایک نئی سوچ وفکر دینا اور قوم کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔مولانا آزاد پہلے مسلم

رہنماء تھے جنھوں نے اپنی زورقوت کے ساتھ الہلال کے ذریعے ہندوستان کو متحدہ قومیت کا تصور پیش کیا۔ الہلال کے آغاز کے بارے میں نیاز فتح پوری رقم طراز ہیں۔

> ''مولانا کا رجحان سیاست کی طرف کب اور کیوں ہوا اس کی صحیح تاریخ متعین کرنا مشکل ہے ہم سمجھتے ہیں کی اس کی ابتداء اس وقت ہوئی جب مصر کے جامعہ ازہر میں انھیں جمال الدین افغانی اور عبدہ کی تحریک کے مطالعے کا موقع ملا۔اس کے بعد جب وہ ہندستان آئے یہ چنگاری اپنے سینے میں لے کر آئے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی وحدت و تیزی بڑھتی گئی اور آخر کار جوالہ بن کر''الہلال'' کی صورت میں ہمارے سامنے آئی۔''

(بحوالہ نیاز فتح پوری ''چند ہم عصر اکابرین کی نظر میں''،مضمون مشمولہ''ایوان اُردو کا مولانا آزاد نمبر''ص323،2014ء)

مولانا آزاد کی ہمہ جہت شخصت کی طرح''الہلال'' بھی تنوع اور انفرادیت کا حامل تھا۔جس میں ہر طرح کے موضوعات شامل تھے ۔جیسے سیاسی ،سماجی،معاشی،سائنسی،تاریخی،غرض ہر قسم کے مضامین شائع ہوتے تھے۔اور ان کا مخصوص انداز تحریر جو قارئین کو جھنجھوڑ جھنجوڑ کر بیدار کر سکتا تھا جس میں کلام پاک کی تعلیم اور تصورات کو اس انداز سے قارئین کے سامنے پیش کیا گیا کہ وہ کلام اللہ کا کلام ہی نہیں بندوں کا عمل صالح بھی بن گیا۔''الہلال'' کی ایک ایک عبارت میں

ایک بجلی کی کڑک اور چمک جو بحر دل کی موجوں میں ایک اضطراب پیدا کر دیتی ہے جیسے اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

''میں وہ صور کہاں سے لاؤں جس کی آواز چالیس کروڑ دلوں کو خواب غفلت سے بیدار کرے۔ میں اپنے ہاتھوں میں وہ قوت کیسے پیدا کروں کہ ان کی سینہ کوبی کے شور سے سرگشتان خواب موت سے ہوشیار ہو جائے''

(بحوالہ عبدالرزاق ملیح آبادی ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی''ص 41، حالی پبلیشنگ ہاؤس دہلی 1958ء)

مولانا آزاد کا خطیبانہ اندازِ تحریر اور دانش ورانہ قیادت کے ذریعے انہوں نے سوئے ہوئے معاشرے میں زندگی کی تڑپ پیدا کر دی اور ان میں ایسی حرکت پیدا ہوئی کہ وہ ایک بار پھر حیات نو کا خواب دیکھنے لگے۔ مولانا آزاد جنگ آزادی کے روح رواں ہی نہیں بلکہ انگریزوں کے خلاف لڑنے والے حوصلہ مند سپہ سالار تھے ان کے مضامین میں قوم کی ذہنی بیداری، ہندو مسلم اتحاد، حب الوطنی اور دیگر سماجی، معاشرتی و مذہبی مسائل موجود ہوتے۔ ان کی تحریروں میں توازن اور تسلسل نظر آتا ہے جملے بڑے بڑے ہوتے ہیں لیکن ربط و آہنگ میں ذرا بھی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ بلند سے بلند مضامین کو بھی اتنے دلنشیں انداز میں بیان کرتے تھے کہ موضوعات کی خشکی کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہوتا۔ الہلال کے ذریعے مذہب اور اخلاق کے معاملے میں بھی عقل اور دماغ کے بند دروازے کھولے اور ان کی آواز

عوام کی زندگی میں گونجی۔مولانا آزاد الہلال کے ذریعے صرف مسلمانوں کو ہی نہیں ہندوؤں کو بھی جگانا اور اتحاد قائم کرنا چاہتے تھے۔جواہر لال نہرو کا اقتباس دیکھئے۔

''مولانا ابولکلام آزاد اپنے ہفتہ وار ''الہلال'' سے مسلمانوں کو ایک نئی زبان میں مخاطب کیا یہ ایک ایسا اندازِ خطاب تھا جس سے ہندوستانی مسلمان آشنا نہ تھے۔وہ علی گڑھ کی قیادت کے محتاط لہجے سے واقف تھے۔سرسید،محسن الملک،نذیر احمد اور حالی کے انداز بیاں کے علاوہ ہوا کا کوئی زیادہ گرم جھونکا اُن تک پہنچا ہی نہ تھا ''الہلال'' مسلمانوں کے کسی بھی مکتبِ خیال سے اتفاق نہیں رکھتا تھا بلکہ وہ ایک نئی دعوت اپنی قوم اور ہم وطنوں کو دے رہا تھا''

(بحوالہ علی جواد زیدی ''مولانا آزاد کا صحافتی سفر''،مضمون مشمولہ ''مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے''مرتبہ خلیق انجم،ص413 ' اُردو اکادمی دہلی 2003ء)

اُردو صحافت میں الہلال کا جو کردار ہے۔وہ آج تک کسی کو بھی حاصل نہیں۔مولانا آزاد کا مقصد آزادی وطن کے حصول اور اس کی بقاء کے لئے ہندو مسلم اتحاد ہی سب سے اہم تھا۔اس اخبار کے ذریعے مولانا آزاد نے ہم وطنوں کو متحد کر کے قومی دھارے میں لانے کی کوشش کی اور قومیت کا پیغام دیا۔اس اخبار کے ذریعے انگریزی حکومت کے خلاف بہت سی باتیں تحریر کی جاتی تھیں۔جس نے

برطانوی حکومت کی جڑیں ہلا ڈالیں۔مولانا آزاد کی تحریروں کا اصل مقصد مسلم عوام کو سیاسی شعور سے آشنا کیا جائے۔اپنی تحریروں کے ذریعے بجلی بھی گراتے تھے اور موتی بھی لٹاتے تھے۔انھوں نے مسلمانوں کو یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ ملک کی آزادی میں حصہ لینے اور ہندستان کے دوسرے باشندوں کے ساتھ ساتھ شانہ بہ شانہ کھڑے ہونے کا جذبہ پیدا ہو۔ہندستانی مسلمانوں کو ان کے تمام سیاسی وغیر سیاسی معتقدات و اعمال میں اتباعِ شریعت کی تلقین کی۔سیاسی،سماجی اور تہذیبی مسائل پر اظہار خیال کیا۔انہوں نے الہلال کے ذریعے جو للکار پیدا کی وہ بالکل نئی چیز تھی۔ان کے مضامین سارے ملک میں تہلکہ مچادیتے تھے علمی و فلسفیانہ اصطلاحات بھی قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔ان کی تحریریں اردو ادب کا بیش قیمت سرمایا ہیں۔انہوں نے سائنس اور جدید تعلیم کے علاوہ ملک کی تہذیب وثقافت کے فروغ میں اہم کارنامے انجام دیے۔الہلال کے مضامین کے تعلق سے محمد رفیق ملک لکھتے ہیں۔

> ''الہلال کا وجود اُردو صحافت میں ایک عظیم الشان انقلاب تھا اس نے اپنی زندگی کے تھوڑے ہی عرصے میں قوم کے مذہبی و سیاسی معتقدات میں انقلاب پیدا کر دیا اور اس کے ساتھ ساتھ اُردو ادب کی بیش بہا خدمت انجام دی۔الہلال کی انقلاب انگیز دعوت سے متاثر ہوکر مولانا محمود الحسنؒ کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ ''ہم سب اصلی کام کو بھولے ہوئے تھے الہلال نے یاد

دلا دیا''

''(بحوالہ محمد رفیق ملک،مشمولہ''انتخاب الہلال''از مولانا آزاد، ص3,4،ادبستان حمید برادرس لاہور،1958)

''الہلال'' نے بڑے بڑے ذی علم اور قد آور حضرات کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ان کے مضامین میں جہاں سیاسی مضامین کی کثرت،زبان و بیان کی مرصع کاری کے ساتھ ساتھ جوش وخروش اور شاعرانہ علوئے مرتبت کا جلوہ بکھیرتے ہیں۔انہوں نے اپنی تحریروں میں کبھی کسی کی تضحیک بھی نہیں کی،نہ کسی کی دلآزاری ان کے ہاں فرد سے زیادہ اہم قوم تھی۔ان کا اسلوب سب سے منفرد تھا۔ان کی تحریروں نے ملت کے منجمد لہو کو گرم اور رواں دواں کر دیا مردہ دلوں میں نئی جان ڈال دی۔وہ لفظ و معنی کے باہمی رشتے سے واقف تھے۔موضوع کے اعتبار سے اظہارِ بیان کے لئے الفاظ کا انتخاب کرتے۔مولانا آزاد کی تحریروں اور انداز بیاں کی خوبیوں سے متاثر ہو کر حسرت موہانی کہتے ہیں۔

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظمِ حسرت میں کچھ مزہ نہ رہا

☆☆☆☆☆

جدوجہد آزادی ہنداور مولانا محمد علی جوہر

عبدالعزیز۔ کے
ریسرچ سکالر، شعبۂ اردو، علاقائی مرکز کوئی لانڈی
جامعہ سری شنکراچاریہ برائے سنسکرت، کالڈی، کیرالا

رئیس الاحرار مولانا محمد علی تخلص جوہر کسی تعارف کے محتاج نہیں، جن کا نام ایک بے باک، حق گو، بلند پایہ شاعر بے مثال صحافی، شعلہ بیاں مقرر ہندو مسلم اتحاد کے نقیب، تحریک خلافت کے مشعل بردار اور جنگ آزادی کے عظیم رہنما کی وجہ سے صفحہ تاریخ ہند پر ہمیشہ درخشاں ستارے کی مانند چمکتا رہے گا۔

تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون کے معروف چہرہ مولانا محمد علی جوہر 10 دسمبر 1878 میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم دارالعلوم دیوبند سے حاصل کی جب کہ اعلی تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے منسلک ہوئے۔ بعد ازاں ماڈرن ہسٹری آشنائی کے مقصد لنکوئن کالج داخلہ لیا۔ ہندوستان واپسی کے بعد وہ 1898 سے میں آکسفورڈ میں رامپور اسٹیٹ کے ایجوکیشن ڈائریکٹر بنائے گئے۔ وہ صرف مجاہد آزادی ہی نہیں تھے، ایک مقبول، صحافی، اسکالر اور شاعر بھی تھے۔ انھوں نے 'دی ٹائمس'، 'دی مانچسٹر گارجین'، 'دی آبزرور جیسے مقبول اخبارات میں نہ صرف مضامین لکھے بلکہ کلکتہ سے 1977 میں دی کامریڈ کے نام سے ہفتہ وار انگریزی اخبار بھی شروع کیا جس نے بہت جلد

شہرت حاصل کر لی۔ 1913 میں انھوں نے دہلی سے ہمدرد' کے نام سے اردو روزنامہ بھی شروع کیا جو سے بے باک خبروں اور بے خوف تحریروں کے سبب لوگوں کی پسند بن گیا تھا۔ ہندوستان کی آزادی کیلیے انھوں نے صرف قلم کا ہی سہارا نہیں لیا، اپنی تقریروں اور تحریکوں سے بھی انگریزوں کی مخالفت کرتے رہے۔ 1930 میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے مقصد سے جب وہ انگلینڈ گئے تو انھوں نے واضح لفظوں میں کہا کہ تم انگریز میرے ملک کو آزاد نہیں کرو گے تو میں واپس نہیں جاؤں گا۔ بالآخر 4 جنوری 1931 میں لندن میں ہی ان کا انتقال ہوا۔

عظیم مجاہد آزادی اور بلند آہنگ شخصیت مولانا محمد علی جوہر پر اردو اور انگریزی میں بہت سی کتابوں اور لاتعداد مضامین اور خاص نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے باوجود مولانا محمد علی جوہر کی ہمہ گیر شخصیت کے کئی پہلو سامنے آنے سے رہے ہیں۔ ہندوستانی تاریخ میں ان کے اہم مقام کا تعین بھی نہیں ہوسکا۔ انھوں نے اپنی تحریر و تقریر سے تحریک آزادی وطن میں ایک ایسی روح پھونکی جس سے ہندوستانیوں میں خود اعتمادی جرات اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی سیاسی، صحافتی، ادبی، علمی اور تاریخی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔ زیر مطالعہ ایک تاریخی کتاب ہے۔ جس میں مرتب ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی صاحب نے "مولانا محمد علی کی حیات و خدمات" کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرنے والے متفرق مضامین کو اکھٹا کیا ہے۔ ابتدائیہ کے بعد مولانا محمد علی کی سیاسی زندگی، ان کی سیاسی زندگی کی ابتدا، علی گڑھ میں مشاعرہ کی بنیاد، مسلم لیگ سے تعلق، وغیرہ کی تفصیل ہے۔ اس کے علاوہ مولانا کی تصانیف، شاعری کا تجزیہ، سیاسی سرگرمیاں اور مولانا کے خطوط کے عکس بھی

شامل کتاب ہیں۔ جدوجہد آزادی میں سرگرم حصہ لینے کے جرم میں مولانا کی زندگی کا کافی حصہ قید و بند میں بسر ہوا۔ تحریک عدم تعاون کی پاداش میں کئی سال جیل میں رہے۔ 1919ء کی تحریک خلافت کے بانی آپ ہی تھے۔ تحریک ترک موالات میں گاندھی جی کے برابر شریک تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی آپ ہی کی کوششوں سے قائم ہوئی۔

''آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے۔ ہمارا مقصد مکمل آزادی حاصل کرنا ہے۔ ہم اس سے کم کسی شے پر رضامند نہیں ہو سکتے۔''

محمد علی جوہر کا یہ قول غلامی کی زنجیر توڑنے کے لئے اس بارود سے کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ ساتھ ہی ان کی۔ زندگی کے مقاصد کا عکاس بھی ہے۔ متحرک، با مقصد اور اتنا باعمل انسان کے اقوال ہوائی نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنے آہدف کے لئے جان کی بازی بھی لگا دینے سے گریز نہیں برکرتے۔ یہی وجہ ہے کہ جوہر کی تمام زندگی اسی مقصد کے زد لئے وقف رہی۔ جسے نہ نواب رامپور کی قید اور نہ انگریزوں کا تشدد روک سکا۔ آج ہم جس آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں اس کی تحریک 1930ء تک مارا مقصد گاندھی جی کے بعد یا ساتھ محمد علی جوہر کی ہی مرہون منت اس سے ہے۔ جنھوں نے مل کر انگریزوں کی پالیسی ''ہندو مسلمانوں کو لڑاؤ اور راج کرو'' کو ان دونوں قوموں میں کے لئے اتحاد کی فضا پیدا کر کے زمیں بوس کر دیا۔ چند انگریزوں ہی ان کی کے ٹکڑوں پر عیش کرنے والوں کے علاوہ تمام ہندوستانی مقصد اور اتحاد و یگانگت کے رشتے میں بندھ کر جنگ آزادی کی وہ اپنے آگ کو شعلوں میں بدلنے لگے۔ جس کے نتیجے میں ریز نہیں برطانوی حکمراں اس ہندو مسلم اتحاد سے کس قدر خوف قصد کے زدہ، ہراساں اور پریشان تھے اس کا اندازہ

سر ونسٹائل راور نہ سرل کی اس رائے سے اچھی طرح کیا جا سکتا ہے۔

مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مہاتما گاندھی کے ساتھ مسلسل دورے کر رہے تھے اور ہر جگہ عظیم ایثان جلسے ہوتے تھے۔ آدمیوں کی کثرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ مولانا محمد علی کی تقریروں سے بڑا جوش وخروش پیدا ہوتا تھا۔ گاندھی جی کی عظمت آسمان کو چھو رہی تھی۔ شہروں میں تقریباً روزمرہ جلسے ہوتے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع ہوتے تھے۔ جن میں مقامی لیڈر تقریر کرتے تھے اور عوام وخواص ہر ممکن قربانی کے لئے تیار تھے۔ پورا ملک بغاوت پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اس منظر کو جس نے دیکھا وہی اس کا اندازہ کر سکتا ہے۔ اب خلافت اور سوراجیہ تحریک ایک دوسرے میں خلط ملط ہو گئی تھی۔ خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء ہند کے جلسے ہوتے تھے اور ان میں تو گرمی ہی گرمی تھی لیکن اب خلافت کے حصول کا ذریعہ بھی سوراجیہ قرار دیا گیا اور کل ملک کی نگاہ ملک کو غلامی سے آزاد کرانے پر لگی ہوئی تھی۔ کانگریس کی اہمیت روز بروز ترقی کرتی جا رہی تھی۔ مولانا محمد علی مذہبیت، دینداری، ایثار وقربانی جیسے محاسن اعلی سے مزین تھے اور وہ نظر بندی سے نکلنے کے بعد ہی ہندوستان کے مسلم لیڈر بن گئے تھے۔ جب وہ مہاتما گاندھی کے ساتھ ہندوستان کا طوفانی دورہ کر رہے تھے تو ہر جگہ مہاتما گاندھی کی جی کے ساتھ محمد علی زندہ باد کے نعرے بھی لگتے تھے اور اللہ اکبر ہندو مسلم دونوں پکارتے تھے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکی کی خلافت عثمانیہ کی تائید میں ہندوستانیوں کی جانب سے ہندوستانی انگریزی حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لئے 1919ء میں ایک تحریک کا آغاز ہوا جسے ''خلافت مومنٹ'' کا نام دیا گیا۔ ہندوستان کی جدوجہد

آزادی میں بھی باوجود ایک مذہبی تحریک ہونے کے خلافت مومنٹ نے اہم حصہ ادا کیا۔ 1920ء کی لندن کانفرنس کے موقع پر اس تحریک کو کافی اہمیت حاصل ہوئی تھی۔ مولانا محمد علی جوہر نے خلافت مومنٹ میں راست حصہ لیا اور انگریزوں کے غضب کی وجہ سے انہیں چار سال جیل میں گذارنا پڑا۔ مولانا جوہر کے ہمنواؤں میں ان کے بھائی شوکت علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، بیرسٹر جان، محمد جونیجو، حسرت موہانی، شیخ شوکت علی صدیقی، سید عطا اللہ شاہ بخاری، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر حکیم اجمل خان جیسی نامور شخصیتیں شامل تھیں۔ ان سب سے مل کر ''آل انڈیا خلافت کمیٹی'' قائم کی۔ اس تنظیم کا مرکز شہر لکھنؤ کو بنایا گیا اور صدر دفتر نواب شوکت علی صدیقی کے مکان کے احاطہ میں قائم کیا گیا۔ کمیٹی کے قیام کا اہم مقصد مسلمانوں میں سیاسی اتحاد برائے تحفظ خلافت تھا۔ 1920ء میں خلافت کمیٹی کا منشور شائع کیا گیا جس میں انگریز حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ خلافت کا تحفظ کرے۔ تمام ہندوستانی مسلمانوں سے بھی اس منشور کے ذریعہ اپیل کی گئی کہ وہ خلافت تحریک سے جڑ جائیں اور انگریزی حکومت کو خلافت عثمانیہ کے بچاؤ کیلئے آگے آنے کی ترغیب دیں۔ جدوجہد آزادی میں خلافت قائدین کی مدد سے مہاتما گاندھی کو ہندو مسلم اتحاد کو منظّم کرنے میں آسانی ہوئی اور تحریک آزادی میں اس ہندو مسلم اتحاد کی وجہ سے کافی جوش پیدا ہوگیا گاندھی جی، مولانا محمد علی کو کافی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور انہیں مسلمانوں کا ایک اہم قاید تسلیم کرتے تھے۔ مولانا علی جوہر کی ایماء پر ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خان جیسے اہم مسلمان قائدین گاندھی جی کے قریبی حلقہ میں شامل ہوگئے۔ اور ان تمام کی کوششوں سے ہندوستانی مسلمان

جدوجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ انہی قائدین نے ملکر 1920ء میں مسلمانوں کیلئے ''جامعہ ملیہ اسلامیہ'' کا قیام عمل میں لایا تا کہ مسلمانوں میں تعلیمی اور سماجی بدلاؤ آسکے علی برادران کی سارے ملک میں اس قدر مقبولیت بڑھ چکی تھی کہ ہندوستان کے دیہی علاقوں میں بھی دیہاتی عورتیں چکی پیستے وقت علی برادران کی تعریف میں یہ گیت گاتی تھیں جس کا مکھڑا تھا ''بولی اماں محمد علی کی۔ جان بیٹا خلافت پہ دے دو''۔

پھر کچھ ہی دنوں میں کانگریس خلافت جوڑی نظر بد کا شکار ہوگئی مسلم لیگ اور ہندو مہا سبھا جیسی تنظیموں نے خلافت کمیٹی کی مخالفت شروع کر دی۔ ہندو مذہبی اور سیاسی قائدین نے خلافت تحریک کو اسلامی بنیاد پرستی ٹھہرایا اور اس کی کھل کر مخالفت شروع کر دی۔ دوسری جانب کئی مسلم قائدین نے بھی انڈین نیشنل کانگریس میں بنیاد پرستی کے اضافہ کو محسوس کرنا شروع کر دیا اور اس طرح کانگریس خلافت اتحاد میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ ان وجوہات کی روشنی میں علی برادران بھی گاندھی جی اور کانگریس سے دوری اختیار کرنے لگے۔ علی برادران گاندھی جی کی عدم تشدد کی پالیسی سے بھی ناراض نظر آنے لگے۔ اس افراتفری میں مسلمان تین حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک حصہ کانگریس کے ساتھ دوسرا خلافت تحریک کے ساتھ اور باقی مسلمان مسلم لیگ کیساتھ جڑ گئے۔

خلافت تحریک نے جو ایک بہت ہی کم مدت تک کارکرد رہی ہندوستانی جدوجہد آزادی میں ایک اہم حصہ ادا کیا۔ کانگریس سے مسلمانوں کو قریب کرنے میں معاون رہی اور انڈین نیشنل کانگریس کو مولانا آزاد، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خان جیسے نامور مسلم قائدین کا اثاثہ دیا جنہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو تحریک

آزادی سے جوڑے رکھا اور آزادی کے بعد بھی آزاد ہندوستان کا مسلمانوں کو ایک اہم ستون ٹھہرایا۔ خلافت کمیٹی کے اصل روح رواں مولانا محمد علی جوہر جنہیں موجودہ نسل فراموش کر چکی ہے۔ ایک عظیم قائد، دانشور، صحافی، شاعر اور بہترین صلاحیتوں کے حامل تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے آپ چھٹویں مسلمان صدر تھے۔ آل انڈین مسلم لیگ کے بانیوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے آپ اس جماعت کے صدر کے عہدہ پر بھی فائز رہے۔ اس طرح یہ ایک وقت دو مختلف نظریات کی سیاست جماعتوں کی صدارت کے منصب پر فائز رہنے کا اعزاز مولانا محمد علی جوہر کو حاصل ہے۔

انھوں نے ایک بہترین قلمکار اور شعلہ بیان مقرر تھے۔ صحافتی میدان میں آپ نے اردو ہفتہ وار ''ہمدرد'' اور انگلش اخبار'' کامریڈ'' جاری کیا۔ آپ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے بانیوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ مسلم لیگ سے ابتداء ہی سے منسلک رہے۔ مسلم لیگ کے تاسیسی اجلاس منعقدہ 1906ء میں آپ شریک تھے اور 1918ء میں آپ نے بحیثیت صدر اس تنظیم کی خدمت انجام دی۔ 1923ء میں آپ نے انڈین نیشنل کانگریس کے صدر کی ذمہ داری سنبھالی۔

ان کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ آپ نے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے دوران تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمیں ہمارا ملک چاہئے۔ میں یہاں سے آزادی کے پروانہ کے ساتھ لوٹوں گا یا یہیں پر مر جاؤں گا''۔ مولانا کا یہ قول صحیح ثابت ہوا اور آپ نے وہیں اپنی آخری سانس لی۔ آج کی نوجوان ہندوستانی نسل کو سوائے مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو اور بھگت سنگھ کے کوئی دوسرا مجاہد آزادی یاد ہی نہیں جو ہم سب کیلئے ایک لمحہ فکر ہے۔

محمد علی جوہر نے ہندوستان کے کسان، مزدور، اور دیگر عوامی لوگوں کو آزادی کے لڑائی میں حصہ لینے کے لیے آمادہ کیا۔ اس لیے وہ ہندو مسلمان دونوں قوموں کی آنکھوں کا تارہ بن چکے تھے۔ جس کے نتیجے میں 1923ء میں ان کو کانگریس کا صدر اس وقت منتخب کیا گیا جب وہ جیل کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے۔ اس وہدے پر فائز رہتے ہوئے گاندھی جی کو "مہاتما" اور باپو لکھا، خدکو ان کا نیازمند سمجھا تا کہ اتحاد باہمی قایم رہیاور ازادی کی لڑائی پر آنچ نہ آئے۔

جب 25 دسمبر 1919ء کو مولانا قید سے آزاد ہوئے تو گھر جانے کے بجائے انھوں نے سیدھا امرتسر کا رخ کیا۔ یہاں مولانا کا پر جوش استقبال ہوا اور کانگریس کے اجلاس میں انھوں نے نہایت جذباتی و ولدوز انداز میں کہا۔ میں کہتا ہوں اس آزادی کے لئے مسٹر تلک کو پھر سے جیل جانا چاہئے۔ مجھے دوبارہ عمر بھر کے لئے نظر بند ہونا چاہئے مسز اپنی بیسینٹ کو پھانسی پر چڑھ جانا چاہئے، مگر اس قسم کے نظام کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہونا چاہئے۔ جیسا کہ پنجاب میں ہوا۔ آزادی کا پروانہ نہیں ملا۔ جس کے درد سے لندن میں ہی ۴ جنوری 1931ء کو محمد علی جوہر عالم جاودانی کی طرف کوچ کر کے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور 24 جنوری 1931ء کو قبلہ اول بیت المقدس میں سپرد خاک ہو گئے۔ 1931ء تک آزادی نہیں ملی لیکن مولانا کی تقریروں، اشعار اور جلسوں کی گونج 15 اگست 1947ء تک لوگوں کے دلوں کو گرماتی رہی۔ جس کے نتیجے میں ملک آزاد ہوا۔ ملک کی سبھی نامور شخصیات نے خراج عقیدت پیش کیا۔

غرض کہ جوہر کے سیکڑوں اشعار جنگ آزادی میں جوہر اور ان کی ملت

کے اغراض و مقاصد کو بیان کر رہے ہیں۔ یہ صرف دعوی ہی نہیں بلکہ حقیقت میں جو ہر کی زندگی ہی نہیں بلکہ موت بھی ان کے ارادوں اور حسرت کی مصداق رہی۔ ان کی زندگی کے آخری تین مہینے ان کی زندگی کا نتیجہ پیش کر رہے ہیں۔ انگلینڈ میں جب گول میز کانفرنس ہونا طے پایا تو وائسرائے نے خصوصی طور پر محمد علی جوہر کو بھی دعوت نامہ بھیجا اور اس میں شرکت کے لئے کہا۔ مولانا نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔ یہ کانفرنس 12 نومبر 1930ء کو شروع ہوئی، اسی کانفرنس میں جوہر کی آخری تقریر ہوئی اور لندن میں ہی انھوں نے آخری سانس بھی لی۔

الغرض تحریک خلافت میں گاندھی جی کی اہم نمائندگی، انگریزی فوج میں مسلمانوں کو بغاوت پر آمادہ کرنا، ہندو مسلمانوں کے درمیان اس حد تک ہم آہنگی پیدا کرنا کہ جلسوں جلوسوں میں گاندھی جی کی جے اور محمد علی جوہر زندہ باد اور اللہ اکبر کے نعرے ساتھ ساتھ لگنا اس طرح پھوٹ ڈالو راج کرو' کے خواب کو چکنا چور کر کے انگریزی حکومت کو مجبور کر دینا کہ وہ ہندوستان کی آزادی کا اعلان کریں۔ گویا کہ یہ آزادی جوہر کے انتقال کے سولہ سال بعد حاصل ہوئی لیکن گاندھی جی کے بعد اس حصولِ آزادی کا سہرا محمد علی جوہر کے سر ہی رہے گا۔ کیوں کہ جو فضا انھوں نے بنائی تھی، جو حصول آزادی کا پودا انھوں نے لگایا تھا وہی بار آور ہو کر جشن آزادی کا محور بنا۔

☆☆☆☆☆

جدوجہد آزادی ہند اور مولانا ابوالکلام آزاد

ڈاکٹر سید علیم اللہ حسینی
صدر شعبہ اردو، انجمن ڈگری کالج، بیجاپور

11 نومبر 1888ء میں جس بطلِ جلیل نے مکہ مکرمہ کی مقدس سرزمین پر اپنی آنکھیں کھولی تھیں، دنیا اسے مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے جانتی ہے۔ باشندگانِ ہند کو یہ حق پہنچتا ہے کہ ان کی یومِ پیدائش ''یومِ تعلیم'' کے نام سے معنون ہو، کیونکہ وہ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم رہ چکے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد صرف وزیر تعلیم ہی نہیں، بلکہ مجاہدِ آزادی بھی تھے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مجاہدینِ آزادی کی اگلی صف میں بھی سب سے آگے تھے۔ کسی شاعر نے ایک شعر کہا ہے:

گلشن پرست ہوں، تجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نبھا کئے جارہا ہوں

ایسے لگتا ہے کہ شاعر نے اسی شخصیت (مولانا ابوالکلام آزاد) کو سامنے رکھ کر ان کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو پیش کیا ہے، گلشن پرستی میں انہوں نے صرف ''گل'' کو ہی سینے سے لگائے نہیں رکھا، بلکہ کانٹوں کو بھی اپنے دامِ محبت میں الجھائے رکھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی صفات عالیہ کا تذکرہ چھیڑا جائے تو مختصر مضمون کافی نہیں ہوگا۔ جس شخصیت پر عقیدت مندوں نے عقیدت کے پھول نچھاور کئے ہوں اور معاندین و ناقدین نے عناد و نقد کے تیروں سے اس کا سینہ چھلنی

کر دیا ہو، اس کا تذکرہ بقول شاعر:

'سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کیلئے'

مولانا ابوالکلام آزادؔ ایک بے باک صحافی تھے۔ بے باکی کے بغیر صحافت بے معنی چیز ہے۔ موجودہ دور میں صحافت کے رنگ وروپ ہمارے سامنے ہیں۔ وہ ایک ایسے بے باک صحافی تھے جو حق کی سربلندی کے لئے کسی حد پر رکنے والے نہیں تھے۔ انگریزوں کی مضبوط جمی جمائی حکومت پر اپنے اخبار ''الہلال'' کے ذریعے وہ تیر ونشتر داغتے کہ انگریز بلبلہ اٹھتا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ الہلال اخبار کو بند کر دیا گیا۔ اس کا پریس ضبط کیا گیا۔

ابوالکلام، ابوالکلام ہی تھے۔ ایک شعلہ بیان مقرر، شعلہ صفت انشا پرداز، اپنی تقریر اور تحریر کے ذریعے پورے ملک میں آگ لگا دی تھی۔ انگریزوں کے کسی قسم کے تعاون، اپنے حقوق کی بھیک مانگنے کی پالیسی کے سخت مخالف تھے۔ باشندگانِ ہند کو انگریزوں سے مکمل عدمِ تعاون اور عدمِ اشتراک کا سبق پڑھایا۔

1939ء میں وہ دوبارہ کانگریس کے صدر بنائے گئے۔ جنگِ عظیم دوم کے پُرآشوب حالات میں تحریکِ آزادی کی قیادت کی۔ سبھاش چندر بوس کی انقلابیت، نہرو کی اشتراکیت، گاندھی کے آئیڈیلزم کے درمیان مولانا آزادؔ کی وہ واحد شخصیت تھی جو اعتدال کی راہوں پر قائم اور اس کی داعی رہی۔ مولانا ایک وفاقی حکومت کے قیام کے خواہاں تھے جس میں دفاع، خارجہ پالیسی اور کمیونکشن کے علاوہ تمام اختیارات صوبوں کے پاس ہوں۔ مولانا آزاد کی رائے کو اس وقت مان لیا جاتا تو تقسیم کے دردناک سانحہ سے بچا جا سکتا تھا۔ آخر تک متحدہ ہندوستان کے لئے لڑتے

رہے مگر زمانے نے زمانے سے آگے سوچنے والے اس قائد کی ایک نہ سنی، تقسیم کا سانحہ پیش آ گیا۔ ہندو مسلم اتحاد کے اس عظیم داعی کا ایک چھوٹا سا اقتباس یہ ہے:

''آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اترے، اور قطب مینار پر کھڑے ہوکر یہ اعلان کردے کہ سوراج 24 گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان، ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہوجائے تو میں سوراج سے دستبردار ہوجاؤنگا مگر اس سے دستبردار نہ ہونگا۔ کیونکہ سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوتی تو ہندوستان کا نقصان ہوگا، لیکن ہمارا اتحاد جاتا رہا تو عالم انسانیت کا نقصان ہے''۔

ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں یہ عقیدہ پوری تاریخ آزادی میں کسی کے یہاں نہیں ملتا۔ اردو کا ان کا اپنا رسالہ ''الہلال'' جس نے پورے ہندوستان میں، یعنی اس وقت کا غیر منقسم ہندوستان، ایک طوفان برپا کردیا۔ اس کی اشاعت گیارہ ہزار کے قریب ہوگئی تھی، اس وقت رسالوں کی اشاعت پانچ سو یا چھ سو سے آگے نہیں جاتی تھی۔ پنڈت نہرو نے اپنی آپ بیتی ''ڈسکوری آف انڈیا'' میں اس رسالے کی بڑی تعریف کی ہے۔ لکھا ہے کہ:

'' اس رسالے کی بڑے بوڑھوں نے تیوری چڑھائی مگر نوجوانوں کے دلوں میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا''

جب اخبار الہلال کا انگریزوں کی حکومت نے گلا گھونٹ دیا تو 1915ء میں مولانا نے 'البلاغ' شروع کیا مگر وہ ایک سال سے زیادہ چل نہیں سکا۔ برٹس

گورنمنٹ نے مولانا کو رانچی جیل میں نظر بند کیا۔ جہاں سے وہ 1920ء میں رہا ہوئے۔ جیل کے انہی ایام میں انہوں نے قرآن کریم کی مشہور عالم تفسیر ''ترجمان القرآن'' کے 23 پارے مکمل کئے۔ ماہرین قرآنیات نے اس تفسیر کے بارے میں لکھا ہے کہ مولانا آزاد نے قرآن کی عربی متن کو اردو ئے متن کے قالب میں ڈھالا ہے۔ مولانا آزاد کا یہ غیر فانی کارنامہ ہے۔ ایک اردو دانشور اور صاحب طرز ادیب نے مولانا آزاد کا سراپا اور شخصیت کا خاکہ کچھ اس طرح کھینچا ہے۔

''سروقد، کتابی چہرہ، ذہانت کی روشنی سے منور آنکھیں، چہرے پر علم کا جلال، حاضر دماغ، حاضر جواب، فطانت کا مجسمہ، مثالی حافظے کے مالک، ادبیات، دینیات، فلسفہ اور منطق کے ماہر، تصوف، حکمت اور شاعری میں کامل، عربی مادری زبان، فارسی روزمرہ کے استعمال کی چیز اور اردو گھر کی لونڈی، علاوہ ازیں کئی زبانوں میں دخل، حسن پرست، موسیقی کے عاشق، سفید چنبیلی چائے کے دلداہ، خوش ذوق، خوش پوش، دل کش، وجیہہ ایسا کہ ''دیکھنے والا'' دیکھتا ہی رہے، وسیع القلب، روادار، آزادئ رائے کے قائل، ایمان دار اور زبردست اخلاقی قوت کے مالک''، یہ تھے مولانا آزاد جس کے سر پر قوم نے ''امام الہند'' کی دستار باندھی، دوسری طرف ''شوبوائے'' کا خطاب بھی ملا، ان کو ملت نے بہ نظر تشکیک دیکھا، برادران وطن نے اپنانے میں تامل کیا۔

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہیکہ مسلمان ہوں میں

ان کی گردن میں شک کے پھولوں کے ہار ڈالے گئے، عدم اعتماد کی سند سے سرفراز کیا۔ لیکن اس مردِ مومن نے اخلاقِ نبوی ﷺ کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہی کہا کہ:

''خدا انہیں معاف کرے، کیونکہ وہ جانتے نہیں کہ کیا کر رہے ہیں''۔

قوم پرست مسلمانوں میں وہ سب سے آگے تھے۔ اپنا سیاسی مسلک سوچ سمجھ کر اختیار کیا تھا۔ سیاست کی پرخار وادی میں سوچ سمجھ کر قدم رکھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس وقت کثیر تعداد کو ان کا اختیار کیا ہوا موقف صحیح نہیں لگا۔ مولانا اپنی ذاتی صلاحیت کے زینہ سے بلند ترین مسند پر پہنچے۔ گاندھی جی نے اپنے اعتماد اور اعتبار کا تاج ان کے سر پر رکھا۔ پنڈت نہرو نے ان کے مشوروں کو مقدم جانا۔ ان کی رفاقت پر فخر کیا۔ کانگریس کی قیادت کا بار ان کے کندھوں پر اس وقت تھا جب کہ آزادئ ہند کی تاریخ کا سب سے پیچیدہ زمانہ تھا۔ جب کہ آزادئ ہند کے ساتھ ساتھ تقسیم ہند کے فلک شگاف نعرے بلند ہو رہے تھے، اس وقت کے حالات کا جائزہ جذبات کی عینک سے نہیں بلکہ دور اندیشی کی دوربین سے لیا۔ انہوں نے گلیوں کوچوں میں گونجتے نعروں پر دھیان نہیں دیا بلکہ نوشتۂ دیوار کو پڑھا۔ قوم کو اس راستے کی طرف رہنمائی کی جو ایک صحیح راستہ تھا مگر وہ اس وقت نامنظور اور نامقبول رہا۔ مگر تاریخ نے جب ورق پلٹا، سیاست کی گردش نے ثابت کر دیا کہ صحیح راستہ اور مسئلہ کا صحیح حل وہی تھا جو ابوالکلام بہ بانگِ دہل کہہ رہے تھے۔ جب طوفان سر سے گزر چکا، ناخدا جب کشتی کو چھوڑ کر محفوظ جزیرے میں چلے گئے، پھر پریشاں حال قوم نے اسی درخت کے سائے میں پناہ لی جسے وہ اکھاڑ کر پھینکنا چاہتے تھے۔ پھر بھی انہوں نے قوم کو گلے لگا لیا۔ ان کے زخم پر مرہم رکھا۔ انہیں دلاسہ دیا اور ایک نئی زندگی کی شروعات کیلئے ان کے حوصلوں کو بلند کیا۔ میں اس وقت مولانا کی تقریر کا چھوٹا سا اقتباس آپ کے گوشِ گذار کروں گا جو انہوں نے آگرہ کے کانگریس اجلاس میں کہا تھا:

''ہندوستان کے لئے، ہندوستان کی آزادی کیلئے، صداقت اور حق پرستی کے بہترین فرائض ادا کرنے کے لئے، ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتفاق ضروری ہے، ہندوستان کی سات کروڑ مسلمان، 22 کروڑ ہندو بھائیوں کیساتھ مل کر ایسے ہو جائیں دونوں مل کر ہندوستان کی ایک قوم اور ایک نیشن ہو جائیں''۔

موجودہ حالات کے تناظر میں ذرا سوچئے، اگر ہمارے قائدین اس طرح کی عالی ظرفی کا مظاہرہ کریں تو ہندوستان جنت نشان بن جائے گا۔ ''جگت گرو'' کے منصب پر بھی فائز ہوسکتا ہے۔

آزادئ ہند کی خوشی کے ساتھ تقسیم کا درد مولانا آزاد کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ کانگریس کی حکومت تشکیل پا چکی تھی، کانگریس کے مرکزی رہنما ہونے کے باعث، مرکزی کابینہ میں شامل کئے گئے، آزاد ہندوستان کے اولین وزیر تعلیم بنادیئے گئے۔

بحیثیتِ ہندوستان کے اولین وزیر تعلیم ان کی تعمیری خدمات لائق تحسین ہیں۔ انہوں نے آزاد ہندوستان کے شاندار مستقبل کیلئے سائنس، ٹکنالوجی اور میڈیکل سائنس کی تعلیم کے لئے بہترین ادارے قائم کرنے میں اپنی بے پناہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ تعلیم کے میدان میں آج ہم جتنی ترقیاں دیکھ رہے ہیں ان کی بنیادیں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے ہی رکھی تھیں۔ آج کے دور میں تعلیم کا جو ماحول ہو رہا ہے، سائنس اور ٹکنالوجی کو نصاب سے خارج کرنے کی صدائیں آرہی ہیں۔ اس پر گفتگو لاحاصل ہے۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، مولانا آزاد کی سیرت کے امتیازی پہلو پر

تعمیر حیات لکھنو میں ایک مضمون لکھا تھا جو 10 تا25 جنوری 1978ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ مولانا نے لکھا ہے کہ:

''خدا نے ان کو ذہین پیدا کیا، جب وہ پیدا ہوئے تو ذہین پیدا ہوئے ، وہ جینیس تھے ، اگر ہمارے ملک کے دو چار ایسے آدمیوں کی فہرست تیار کی جائے جن پر جینیس کا لفظ صحیح طور پر صادق آتا ہے۔ میں پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا آزاد کی جگہ اس میں محفوظ رہے گی''۔

یہ خدا کی دین تھی ، انہیں صفات کے ساتھ وہ پیدا کئے گئے تھے۔ مگر ہمارے لئے ان کی زندگی میں یاد رکھنے اور سبق لینے کی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک اعلیٰ کیرکٹر کے انسان تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد متعین کیا کہ خدا کی مرضی کے مطابق ان کو کام کرنا ہے۔ اپنے مذہب کی ہدایت کے مطابق کام کرنا ہے۔ جن سچائیوں پر ان کا یقین جم گیا تھا ان کو انہوں نے پیش کیا۔ اس سے انہیں کوئی مطلب نہیں کہ لوگ خوش ہوتے ہیں یا ناخوش۔ غرض، مذہبی عقاید میں سیاسی خیالات میں، انہوں نے جس چیز کو صحیح سمجھا ہمیشہ ببانگ دہل کہا اس کی بالکل پرواہ نہیں کی کہ اس کا نتیجہ اور ردعمل کیا ہوگا۔

علم وحکمت کا یہ آفتابِ عالم تاب 22 فروری 1958ء کو ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ جامع مسجد دہلی احاطے میں اردو بازار کی طرف مرحوم کی قبر ہے۔ اللہ مولانا آزاد مرحوم کی خدمات کو قبول فرمائے اور سیئات سے درگذر فرمائے۔ آمین ثم آمین

☆☆☆☆☆

جدوجہد آزادیِ ہنداور مولانا ابوالکلام آزاد

عارف این
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو،
علاقائی مرکز، کوئی لانڈی، کالی کٹ

جدوجہد آزادی میں اردو ادب نے تحریک آزادی کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اردو ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے گراں قدر خدمات انجام دیے ہیں۔ اردو ہی وہ واحد زبان تھی جس نے تحریک آزادی کی روح کو ابتداء سے آخر تک غذا پہنچائی۔ اس وقت کے شعرا اپنی جذباتی شاعری سے، صحافیوں نے اپنے زور قلم سے ،ادیبوں نے اپنی تخلیقات سے اور قائدین نے اردو زبان کی بے مثال اظہار قوت سے تحریک آزادی میں روح پھونک دی۔ پروفیسر شارب ردولوی صاحب نے لکھا ہے ''ہندوستان کی جنگ آزادی دو ہتھیاروں سے لڑی گئی۔ ایک اہنسا اور دوسرا اردو زبان ہے۔'' اردو زبان ہی نے ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ دیا اور محبان وطن کو اسی زبان نے 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' جیسا ترانہ عطا کیا۔ حسرت موہانی، ابو الکلام آزاد، رام پرساد بسمل، چک بست وغیرہ نے اپنے زور قلم کی بدولت ہندوستان کی آزادی میں حصہ لیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد، ملک کی آزادی میں جن کی خدمت کو فراموش نہیں کیا سکتا۔ جو بیک وقت متعدد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ادب، مذہب اور سیاست میں قابل قدر مقام حاصل تھا۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی ملک وقوم کی خدمت اور اس

کی فلاح وترقی کے لیے وقف کردی۔ مولانا ۱۱/نومبر ۱۸۸۸ء کو مکہ معظّمہ کے ایک علمی گھرانے میں ہوئے۔ ان کا اصل نام محی الدین احمد تھا۔ تاریخی نام فیروز بخت، لقب ابوالکلام آزاد، تخلص آزاد تھا۔ ان کے والد مولانا خیرالدین ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہجرت کر کے کئی سال تک عرب ممالک میں رہے۔ ان کی شادی عالیہ بیگم سے ہوئی جن کا تعلق ایک بنگالی خاندان سے تھا اور جو مدینہ میں مقیم تھا۔ مولانا نے چودہ برس تک ابتدائی مشرقی علوم اپنے والد محترم مولانا محمد خیرالدین سے حاصل کی۔ مولانا کے والد ۱۸۹۵ء میں بغرض علاج ہجرت کر کے مکہ معظّمہ سے واپس ہندوستان آئے اور کلکتہ شہر میں مستقل سکونت اختیار کی۔

مولانا کی مادری زبان عربی ہونے کے باوجود بھی اردو میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ بیک وقت سنجیدہ شاعرانہ مزاج، مفکر اسلام، بلند پایہ مقرر، مثالی صحافی اور ایک بہترین مفسر قرآن بھی تھے گویا کہ مولانا اپنے آپ میں ایک انجمن تھے۔ مولانا آزاد کی شخصیت میں تمام تر قائدانہ صلاحیت موجود تھی۔ ان کے کم عمری میں علمی معرکہ آرائیوں کے حوالہ سے سروجنی نائڈو نے کہا تھا کہ پیدائش کے وقت ان کی عمر پچاس سال تھی۔ وہ کافی ذہین اور بے پناہ فطری صلاحیتوں کے مالک تھے۔ جس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ انہوں نے پندرہ سال کی عمر میں اپنے علمی و سیاسی سفر کا آغاز کیا اور ماہانہ جریدہ ''لسان الصدق'' جاری کیا۔ ابوالکلام آزاد نے اپنی تمام صلاحیتیں ملک کی خدمت میں لگادی۔ ان کا دل قوم پرستی اور حبِ وطن کے جزبہ سے شرشار تھا۔ ذات پات، اونچ نیچ اور چھوڑے بڑے کی تفریق سے باہر نکل کر قوم کو آزادی اور اتحاد کا احساس دلانا چاہتے تھے۔ ان کی غیر معمولی صلاحیتیں، وطن سے ان کی بے پناہ محبت اور ملک کے لیے ان کی قربانیاں ہندوستانی عوام کے لیے ایک شاندار اور تابناک مثال ہے۔

مولانا نے ملک کی آزادی کی جد وجہد میں بہت اہم رول ادا کیا۔مولانا آزاد کا بنیادی مقصد ملک کو برطانوی حکومت سے آزادی دلانا تھا۔۱۹۰۵ء سے ۱۹۲۰ء تک وہ برطانوی استعمار کی مخالفت کرنے والی اندرون ملک، بیرون ملک کی مختلف تحریکوں سے وابستہ رہے۔۱۹۰۶ء میں انھوں نے ڈھاکہ میں مسلم لیگ کے پہلے اجلاس میں شرکت کی لیکن لیگ کی برٹش راج سے وفاداری کی پالیسی ان کے نقطۂ نظر سے یکسر مخالف تھی۔ چنانچہ انہوں نے بنگال کے ایک تشدد پسند انقلابی گروہ میں شرکت اختیار کی۔اس انقلابی گروہ میں مولانا آزاد ایک ہی مسلم تھے اس لئے دوسرے اراکین ان کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے لیکن مولانا کی عملی شرکت سے ممبئی اور شمالی ہند کے کئی شہروں میں حفیہ انجمنوں کا قیام عمل میں آیا تو پھر ان پر پورا بھروسہ کیا جانے لگا۔شیام سندر چکرورتی،آروبندھ گھوش کا تعلق اس گروہ سے تھا اس لیے آزاد سے ان کا ربط رہا۔ ہندوستان کی انقلابی تحریکوں سے ربط کے بعد عربی زبان پر عبور رکھنے کی بناء پر ترک اور عرب انقلابی تحریکوں سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے مصر، ترکی، عراق،فرانس کا سفر کیا اور جمالالدین افغانی جیسے انقلابیوں سے صحبت رہی۔

مولانا آزاد ہندو مسلم قومی اتحاد کے خواہاں تھے۔ان کی خواہش تھی کہ مسلمان قوم بھی سیاست میں عملی طور پر حصہ لے،اس کے لیے انھوں نے مسلسل طور پر کوششیں کیں۔اس وقت ایسے ایک سیاسی افکار ہوئے ہیں کہ مسلمانوں جنگ آزادی سے دور رکھنا۔اس فکر سرسید احمد خان کو بھی تھے۔اصل میں مولانا آزاد سرسید کی تمام تحریروں سے بے حد متاثر تھے۔لیکن مسلمانوں کو سیاست سے دور رکھنے پالیسی کے سخت خلاف تھے۔لہذا انھوں نے رسالہ الہلال میں سرسید کی اس نظریہ کی شدید مخالفت کی اور مذہب کا سہارا

لیتے ہوئے اپنا نظریہ لوگوں کے درمیاں رکھا۔ آزاد نے الہلال میں لکھتے ہیں:

''اسلام آزادی کا علمبردار ہے لہذا مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے مذہب کی تعلیم پر عمل کرتے رہیں دوسری قوموں کے ساتھ مل کر آزادی کی تحریک میں بڑ چڑھ کر حصہ لیں''

(رسالہ الہلال، کلکتہ دسمبر ۱۹۱۸)

اس طرح بھی لکھتے ہیں کہ:

''یاد رکھیے کہ ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے، مگر آپ کے لیے ایک فرض دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ''

(رسالہ الہلال، کلکتہ دسمبر ۱۹۱۸)

الہلال میں آزاد کا یہ اعلان جنگ آزادی کا رخ ہی بدل کر رکھ دیا۔ اس اعلان کے بعد مسلمانانِ ہند نے نہایت گرم جوش کے ساتھ سیاست میں حصہّ لینا شروع کر دیا۔ جب سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم دینے کی کوشش کی اس وقت مولانا مسلمانوں کو جنگ آزادی میں حصّہ لینے کے لیے آگے کیا۔

آزاد کا ہتھیار ان کے رسالے تھے۔ جس کے ذریعے انھوں نے اپنے خیالات عوام تک پہنچائے۔ ملک کے لیے وہ صحافی بن گئے۔ ۱۹۱۲ء میں اردو ہفتہ وار 'الہلال' شروع کیا۔ اس میں انھوں نے برطانوی راج کو نسلی امتیاز برتنے اور سارے ہندوستان میں عام آدمی کی ضرورتوں کو نظر انداز کرنے پر شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ ہندوستانی قوم پرستی کے نظریات کو اپناتے ہوئے ان کی اشاعتوں کا مقصد

نوجوانِ مسلم کو آزادی اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے کی حوصلہ افزا کرانا تھا۔

ملک میں ہندو مسلم اتحاد کے لیے انھوں نے آخری لمحے تک کوشش کی۔ وہ تقسیمِ ہند کے شدید مخالف تھے اور وہ ملک کی آزادی پر ہندو مسلم قومی اتحاد کو ترجیح دیتے تھے۔ اس ضمن میں ان کا یہ قول قابل ذکر ہے:

''آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بلندیوں سے اتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑا ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج چوبیس گھنٹوں کے اندر مل سکتا ہے بشرط یہ کہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوگی تو یہ ہندوستان کا عظیم نقصان ہوگا۔ لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو عالم انسانیت کا نقصان ہوگا''

الہلال میں انہوں نے مسلم سیاستدانوں پر بھی تنقید کی جو قومی مفاد کے مقابل فرقہ وارانہ مسائل پر توجہ مرکوز کر رہے تھے اور آل انڈیا مسلم لیگ کی فرقہ وارانہ علحدگی کو مسترد کر دیا۔ اپنے وقت کی عام مسلم رائے کے برخلاف آزاد نے 1905ء میں تقسیم بنگال کی مخالفت کی اور انقلابی سرگرمیوں میں تیزی سے سرگرم رہے۔

ان کے تحریروں بھی ایک بڑا جہاد تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے رسالہ الہلال نے ملک بھر میں مقبولیت حاصل کر لی۔ الہلال میں ادبی، علمی، سیاسی اور تاریخی مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ سماجی، تہذیبی مسائل پر اظہار خیال ہوا کرتا تھا۔ مختصراً طور پر کہا جاسکتا ہے کہ الہلال نے اردو صحافت کو ایک نیا راستہ دکھایا۔ الہلال ہندوستان کا پہلا اخبار تھا جس نے ہندوستانی مسلمانوں کو ان کے سیاسی اور غیر سیاسی مقاصد کی

تکمیل اور اپنے اعمال میں اتباع شریعت کی تلقین کے ساتھ ساتھ ادبی، سماجی، علمی، سیاسی اور تاریخی مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ اس اخبار کے ذریعہ انگریزی حکومت کے خلاف بھی بہت سی باتیں تحریر کی جاتی تھیں۔ دھیرے دھیرے انگریزی حکومت اس سے بیزار ہوتے گئے اور الہلال کو بند کر دیا۔

''الہلال'' کے بند ہو جانے کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد نے ''البلاغ'' نام کا دوسرا اخبار جاری کیا۔ اس اخبار کا نام بدل دیا گیا تھا لیکن دونوں کا مقصد ایک ہی تھا۔ اس میں ادب، تاریخ، مذہب اور معاشرت کے مسائل بیان کئے جاتے تھے۔ البلاغ کو مذہبی تبلیغ کا ذریعہ بھی بنایا گیا۔ جنگ آزادی کی طویل جدوجہد میں جو شعلہ بیان مقرر پیدا ہوئے ان میں مولانا آزاد کا نام سرفہرست ہے۔ مولانا ایک بے باک مقرر تھے۔ وہ کسی موضوع پر بات کرتے تو ان کا ایک ایک حرف پروقار اور پرجلال ہوا کرتا تھا۔ اس دور میں آزاد خلافت ایجی ٹیشن کیلئے اپنی حمایت میں بھی سرگرم ہوئے تاکہ سلطنت عثمانیہ ترکی کے موقف کا تحفظ کیا جا سکے، جسے دنیا بھر میں مسلمانوں کے لیے خلیفہ کا درجہ حاصل تھا۔ ہندوستان بھر میں آزاد کی مقبولیت میں اضافے پر برطانوی حکومت نے اُن کی دوسری اشاعت کو بھی ممنوع قرار دیتے ہوئے انھیں گرفتار کر لیا۔ کئی صوبوں کی حکومتوں نے اپنے پاس ان کو داخلے سے منع کر دیا اور آخر کار آزاد کو رانچی کی ایک جیل میں منتقل کیا گیا جہاں وہ یکم جنوری ۱۹۲۰ء تک مقید رہے۔

مولانا آزاد اپنی رہائی پر دوبارہ سیاسی ماحول میں واپس ہو گئے اور اس بار برطانوی راج کے خلاف غصے اور بغاوت کے احساسات سے پُر تھے۔ ۱۳ اپریل

۱۹۱۹ء کو امرتسر کے جلیاں والا باغ میں غیر مسلم ہندوستانیوں پر انگریزوں کی فائرنگ کے ذریعے ہلاکت پر سارے ہندوستان میں جذبات بھڑکے ہوئے تھے۔ ہندوستان کی بڑی سیاسی پارٹی 'انڈین نیشنل کانگریس' گاندھی جی کی قیادت میں آئی، جنھوں نے سارے ہندوستان میں جوش وخروش پیدا کیا تھا جب انھوں نے چمپارن اور کھیڑا کے کسانوں کی قیادت کرتے ہوئے ۱۹۱۸ء میں برطانوی حکام کے خلاف کامیاب بغاوت کی تھی۔ گاندھی جی نے خطہ کے عوام کو منظّم کیا اور ستیہ گرہ کا اختراعی طریقہ پیش کیا جس میں مکمل عدم تشدد اور خود اکتفائی کے ساتھ اجتماعی سیول نافرمانی کو جوڑا گیا۔

کانگریس کا جائزہ لینے کے بعد گاندھی جی نے خلافت جدوجہد کی حمایت بھی چاہی تاکہ ہندو مسلم سیاسی تفرقے کو ختم کرنے میں مدد ملے۔ مولانا آزاد اور علی برادران (مولانا محمد علی اور شوکت علی) نے کانگریس حمایت کا پُر جوش خیر مقدم کیا اور عدم تعاون کے پروگرام پر مل جل کر کام کرنے لگے۔ مولانا آزاد کانگریس میں شامل ہوگئے۔ یہ دور مولانا آزاد کی اپنی زندگی میں نمایاں تبدیلی والا رہا۔ ساتھی خلافت قائدین ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خان اور دیگر کے ساتھ مولانا آزاد شخصی طور پر گاندھی جی اور اُن کے فلسفہ کے قریب ہوئے۔ تینوں نے مل کر جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کی بنیاد ڈالی، جو اعلیٰ تعلیم کا ادارہ رہا، جس کا انتظام برطانوی مدد یا کنٹرول کے بغیر پوری طرح ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں تھا۔ مولانا آزاد اور گاندھی جی دونوں مذہب کے تئیں گہرا جذبہ رکھتے تھے اور آزاد نے اُن کے ساتھ گہری دوستی استوار کرلی۔ ذاتی طور پر عدم تشدد پر گہرے ایقان کے ساتھ آزاد ہم عصر قوم پرستوں جیسے جواہر لال نہرو، چترنجن داس اور سبھاش چندر بوس کے بھی قریب ہوگئے۔

۱۹۲۳ء میں مولانا آزاد سب سے کم عمر صدر کانگریس منتخب کئے گئے۔ انھوں نے ناگپور میں فلیگ ستیہ گرہ کے اہتمام کی کوششوں کی قیادت کی۔ وہ ۱۹۲۴ء یونیٹی کانفرنس، دہلی کے صدر رہے۔ آزاد نے ہندوستان کے طول وعرض کا سفر کرتے ہوئے گاندھی جی کے ویژن، تعلیم اور سماجی اصلاحات کو فروغ دینے کیلئے سرگرمی سے کام کیا۔ جلد ہی آزاد شعبہ سیاست میں حوصلہ بخش شخصیت بن گئے۔ وہ اہم قومی لیڈر کی حیثیت سے کانگریس ورکنگ کمیٹی کا حصہ بنے اور کئی مرتبہ جنرل سکریٹری اور صدر کے عہدوں پر فائز رہے۔ لکھنو میں ۱۹۳۶ء کے کانگریس سیشن میں آزاد کا سردار پٹیل، ڈاکٹر راجیندر پرساد اور سی راج گوپال چاری کے ساتھ سوشلزم کو کانگریس کے مقصد کے طور پر اپنانے کے تعلق سے اختلاف رائے ہوا۔ آزاد نے صدر کانگریس کی حیثیت سے نہرو کے انتخاب کی حمایت کی اور سوشلزم کی توثیق کرنے والی قرارداد کی تائید کی۔ اس عمل میں وہ نہرو، بوس، جئے پرکاش نرائن کے قریب ہوگئے۔ آزاد نے ۱۹۳۷ء میں نہرو کے دوبارہ انتخاب کی بھی حمایت کی۔ آزاد نے جناح اور مسلم لیگ کے ساتھ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۷ء کے درمیان کانگریس۔ لیگ اتحاد اور وسیع تر سیاسی تعاون پر بات چیت کی حمایت کی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں آزاد نے صدر کانگریس سبھاش بوس زیر قیادت کانگریس گروہ اور ان کے حامیوں کے درمیان ثالث کا رول ادا کیا۔ بوس کو گاندھی جی پر سخت اعتراض تھا کہ وہ انگریزوں کے خلاف ایک اور بغاوت شروع نہیں کر رہے ہیں، اور انھوں نے کانگریس کو گاندھی جی کی قیادت سے دور کرنا چاہا۔

آزاد، نہرو، گاندھی جی اور پٹیل کے درمیان پُر جوش اور جذباتی مذاکرات

کے بعد آخر کار 9 اگست ۱۹۴۲ء کو گاندھی جی نے انگریزوں کے خلاف ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک کا اعلان کیا۔ اس کی تائید میں آزاد ملک بھر میں ہزاروں لوگوں کو جمع کر کے ان کی ذہن سازی کرنے لگے۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد برطانیہ والوں نے اقتدار کو ہندوستانی ہاتھوں میں منتقل کرنے سے اتفاق کیا۔ تمام سیاسی قیدیوں کو ۱۹۴۶ء میں رہا کر دیا گیا اور آزاد نے نئے دستور ساز اسمبلی ہند کیلئے انتخابات میں کانگریس کی قیادت کی، جس نے ہندوستان کا دستور مدون کیا۔

ہندوستان کی تقسیم اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی پر پنجاب، بہار، بنگال، دہلی اور ملک کے کئی دیگر حصوں میں تشدد کی لعنت ساتھ آئی۔ بے شمار جانیں تلف ہو رہی تھیں۔ مولانا آزاد نے ہندوستان میں مسلمانوں کی حفاظت کی خاطر متاثرہ علاقوں کے دورے کئے۔ انھوں نے بڑے ہجوموں سے خطاب کرتے ہوئے امن وسکون برقرار رکھنے کا حوصلہ بڑھایا۔ بعد میں مولانا آزاد وزیر اعظم نہرو کے قریبی بااعتماد، حامی اور مشیر بنے رہے اور قومی پالیسیاں وضع کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ انھوں نے وزیر تعلیم کی حیثیت سے اسکول اور کالج کی تعمیر اور آفاقی ابتدائی تعلیم کو فروغ دینے کیلئے بچوں اور نوجوان دلتوں کی اسکولوں میں بھرتی کے قومی پروگرام بنانے میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ ہندوستانی پارلیمنٹ کے ایوان زیریں لوک سبھا کیلئے دو مرتبہ ۱۹۵۲ء (حلقہ رامپور، یوپی) اور ۱۹۵۷ء (حلقہ گرگاؤں، موجودہ ہریانہ) میں منتخب مولانا آزاد نے نہرو کی سماجی معاشی اور صنعتی پالیسیوں کے ساتھ ساتھ سماجی حقوق اور معاشی مواقع کو خواتین اور نادار ہندوستانیوں تک پہنچانے کی بھی حمایت کی۔ 'بھارت رتن' مولانا آزاد نے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں اپنی کتاب INDIA WINS FREEDOM لکھنے

پر توجہ دی، جو حرکت قلب پر حملے کے سبب اُن کے انتقال کے بعد شائع ہوئی۔

نظریہ پاکستان کے مولانا جتنے مخالف تھے اتنے ہی متحدہ قومیت کے حامی تھے۔ان کی نظر آزادی وطن کے حصول اور اس کی بقا کے لئے ہندو مسلم اتحاد ہی نسخہ کیمیا تھا۔انہوں نے دوقومی نظریہ کی شدید مخالفت کی اور ہندو مسلم دونوں ہی کو ہندوستان میں شیر وشکر بن کر رہنے کی تاکید کی۔انہیں اخوت ومحبت اور بھائی چارگی کا درس دیا۔

ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں مولانا نے اپنے تئیں کوشش جاری رکھی،انہوں نے ہر موقع پر قرآن کریم اور اسلامی اقدار اور روایات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہندوستان اور مسلمانوں کی تقدیر اور ان کا روشن مستقبل ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی میں مضمر ہے۔1923ء کے انڈین نیشنل کانگریس کے دہلی میں منعقدہ خصوصی اجلاس میں یہی حقیقت واضح کی تھی کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر آزادی بھی نہیں مل سکتی ہے۔

ملک کی آزادی ان کی زندگی کا اہم مقصد تھا۔جس وقت انگریز ہندوستان پر قابض تھے، انھوں نے الہلال جیسا رسالہ نکالا۔الہلال، البلاغ جیسے جریدوں کے ذریعے عوام کے اندر آزادی کیلئے قربانیوں کو پیش کرنے کا شعور بیدار کیا۔عوام کے اندر اپنے حقوق کو حاصل کرنے کی تڑپ پیدا کرنے کیلئے اپنی تحریروں کا بھرپور استعمال کیا،لیکن جب انگریز اس بات سے واقف ہو چکے تھے کہ مولانا کے رسالے ان کی سازشوں کا پردہ فاش کر رہے ہیں تو انگریزوں نے الہلال، البلاغ پر پابندی لگا دی۔لیکن مولانا نے اپنا عزم سفر جاری رکھا کبھی اپنے قدم پیچھے نہیں ہٹائے بلکہ اس نئی صبح کا وہ انتظار کر رہے تھے کہ ہندوستان ایک آزاد مملکت میں تبدیل ہو جائے۔بالآخر وہ سورج طلوع ہو ہی گیا اور انگریز ہندوستان چھوڑ کر واپس چلے گئے

لیکن اس گوری رنگت کے انگریزوں نے گنگا جمنی تہذیب کو مٹانے کیلئے جاتے جاتے اکثریت اور اقلیت کا مذہبی فرق بتا کر ہندو مسلم میں دراڑ ڈال دی جس کا پیش خیمہ ملک کی تقسیم ثابت ہوا۔ حالانکہ مولانا نے تقسیم ہند کے وقت بڑی بے باکی اور جرات سے اس بڑھتی کشیدگی کو ختم کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کی۔

تقسیم ہند کے بعد ۱۵/اگست ۱۹۴۷ کو ہندوستان دنیا کے نقشے پر ایک آزاد ملک کی حیثیت سے اور دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک نمودار ہوا۔ اسی آزاد ہند کے پہلے وزیر تعلیم مولانا آزاد منتخب کیے گئے۔ مولانا نے ۱۹۴۷ تا ۱۹۵۸ گیارہ سال تک وزارت تعلیم میں اپنی خدمات انجام دیں۔ ان گیارہ برسوں کے دوران مولانا نے تعلیمی اداروں میں اپنی گوناگوں صلاحیتوں سے تعلیم کو پروان چڑھایا۔ مولانا آزاد ملک کے پہلے وزیر تعلیم ہونے کے ناتے ان کے یومِ پیدائش پر ملک بھر میں یومِ تعلیم کا انتہائی تزک و احتشام سے جشن منایا جاتا ہے۔ انہوں نے زندگی کے آخری لمحات تک ملک وقوم کی خدمت کی۔ ۱۹۵۸ء میں تمام ہندوستانیوں کو الوداع کہتے ہوئے دہلی کی جامع مسجد اور لال قلعے کے درمیانی میدان میں ہمیشہ ہمیش کے لیے مادر وطن کی خاک اوڑھ کر سو گئے۔

☆☆☆☆☆

کتابیات:

۱۔ تاریخ ادب اردو : سیدہ جعفرہ

۲۔ ابوالکلام آزاد : عرش ملسیانی

۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور ہندوستانی قومی تحریک : ڈاکٹر اجے انوپم

☆☆☆☆☆

مولانا محمد علی جوہر کی غزلوں میں جذبہ حریت

تنویر کوثر، ریسرچ اسکالر
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد

غزل اردو شاعری کی بیحد مقبول صنف سخن ہے۔ وہ ہر دور میں ترقی کے منازل طئے کرتی ہوئی آگے بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ غزل مخالفین نے اس پر طرح طرح کے الزامات بھی لگائے پھر بھی غزل کی اثر انگیزی، اور مقبولیت میں کمی نہیں آنے پائی۔ غزل میں حقیقت کی عکاسی ہو، یا مبالغہ آرائی ہو، کسی حسین مناظر کی تصویر کشی ہو، یا محبوب کا سراپا ہو، حسن یا عشق کی واردات ہو، کوئی واقعہ ہو یا حادثہ ہو، غرض یہ کہ ہر طرح کے مضامین غزل میں حسن پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ غزل اردو شاعری میں اس وجہ سے بھی مقبول ہے کہ اس میں ایک ہی شعر میں مکمل مضمون کو سمو دیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کو غزل کی تنگ دامنی کا گلہ ہے مگر اردو کی ابتدا سے لیکر اب تک کون سا موضوع ہے جسے پیش نہیں کیا گیا۔ ہر طرح کے سماجی، سیاسی، معاشی، ثقافتی موضوعات پیش ہوتے رہے ہیں۔ تحریک آزادی میں بھی غزل نے اہم کردار ادا کیا۔ تحریک آزادی میں حصہ لینے والے مجاہدین نے جہاں اپنی جسمانی اور ذہنی قوت کو صرف کیا، وہیں قلم کے سپاہیوں نے بھی اپنا زور قلم آزمایا۔ یہ قلم کے سپاہی اپنی قوم کو اپنی شاعری میں مخاطب کرتے، انہیں حوصلہ دیتے، متحد کرتے، انہیں ان کی طاقت کا احساس دلاتے، سوئے ہوؤں کو بیدار کرتے۔

اردو غزل میں متعدد شعراء نے جدو جہد آزادی کو موضوع بنایا ہے۔علی سردار جعفری، معین احسن جذبی، حالی شبلی، حسرت موہانی، مجروح سلطان پوری، اقبال جیسے اہم شعراء نے اپنے اندر موجود انقلابی جذبات کو اپنی غزلوں کے ذریعے عوام تک پہنچایا۔ان شعراء کے انقلابی عناصر اور جذبۂ حریت نے جہاں اردو غزل کے دامن کو وسیع کیا وہیں تحریک آزادی میں اپنی خدمات بھی انجام دی، ان میں ایک اہم نام محمد علی جوہر کا ہے، جن کا نام ہندوستانی تاریخ میں قوم کے رہنما، مجاہد آزادی، بے باک صحافی اور شاعر کی حیثیت سے رقم ہے۔انہوں نے ملک کی آزادی کے لئے اپنے تمام ہنر کا استعمال کیا۔ایک رہنما کے طور پر قوم کو متحد کرنے کی کوشش کی، اور عوام کو ان کی طاقت کا احساس دلایا، انہیں غلامی کی زندگی سے نکلنے اور ملک کو آزاد کرانے کے لئے جدو جہد پر اکسایا۔مجاہد آزادی کے روپ میں انہوں نے وہ کارنامے انجام دئے کہ ان کی ہمت کی داد نہ صرف ہندوستانیوں نے بلکہ انگریزوں نے بھی دی ہے۔صحافی کے طور پر انہوں نے کامریڈ اور ہمدرد کے ذریعے عوام کو ملک کے حالات سے آگاہ کیا، انگریزوں کے منصوبوں کا پردہ فاش کیا، ہندوستانیوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔انگریزوں کے ظلم وستم، ان کی مکاری وعیاری سے خبردار کیا۔انہوں نے اپنی شاعری سے، تقریر وتحریر سے مجاہدین کے حوصلے بلند کئے۔قوم کے اس عظیم رہنما کی پیدائش رام پور میں ۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء میں ہوئی۔جب محمد علی جوہر دو سال کے ہوئے تو والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ان کی شخصیت کو نکھارنے، اور ان کی کردار سازی میں والدہ آبادی بیگم کا اہم کردار رہا۔جو باشعور، سلجھی ہوئی، باہمت خاتون تھیں۔

محمد علی کی بے باکی اور جذبہ حب الوطنی ان کے زمانہ طالب علمی سے عیاں تھی۔ جب وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تھے تو اپنی بے باکی اور حاضر جوابی کے لئے بہت مقبول تھے۔ اپنی اس حاضر جوابی کی وجہ سے وہ اپنے گروپ میں پسند کیے جاتے تھے۔ سجاد حیدر یلدرم محمد علی کے ہم جماعت تھے وہ لکھتے ہیں۔۔۔

''ہم دونوں انٹرنس کا امتحان پاس کر کے کالج کی کلاسوں میں آئے، یہاں پہنچ کر محمد علی کے کردار کی وہ خصوصیت نمایاں ہوئی جس نے دنیا میں محمد علی کو اپنے ہم عصروں میں سب سے علیحدہ کر دیا، یعنی آزادی رائے و آزادی عمل۔ وہ اکثر اپنے پروفیسروں سے اختلاف کرتے تھے۔ یونین میں ایسے مباحث پر تقریر کرتے تھے، جس جانب تقریر کرنا اکثر پروفیسروں کی چیں بہ چیں کا باعث ہوتا تھا۔'' [1]

محمد علی جوہر کو ملک کی آزادی کی تو فکر تھی ہی، انہیں ملک کے باشندوں کی تعلیم اور بہتر زندگی کی بھی فکر تھی اس لیے انہوں نے کئی اہم قدم اٹھائے، انہوں نے عوام کی بہتر تعلیم کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام میں اہم رول ادا کیا، آپ مسلم لیگ سے بھی منسلک رہے، مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے بھی اپنی خدمات انجام دی۔ اس وقت ملک میں جگہ جگہ جلسے ہو رہے تھے انہوں نے بہت سی تقریریں کیں، عوام انہیں پسند کرتی تھی ان کی باتوں کو مانتی تھی۔ محمد علی جوہر نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ملک کی آزادی اور عوام کی رہنمائی پر صرف کیا۔ انہوں نے جو کچھ کیا اپنے ملک اور قوم کی فلاح کے لیے کیا۔ وہ جو کچھ چاہتے اس کے لیے انگریزوں کے

سامنے ڈٹ جاتے۔انہیں انگریزوں کے ظلم وستم اور قید کی فکر نہیں تھی۔وہ تو ہر طوفانوں سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتے تھے۔

نہیں پالا پڑا تجھے ہم سخت جانوں سے
ذرا ہم بھی تو دیکھیں تری جلادی کہاں تک ہے [۲]
کچھ بھی وہاں نہ خنجر قاتل کا بس چلا
روح شہید رہتی ہے نعش و کفن سے دور [۳]

مولانا محمد علی جوہر کو بہ حیثیت صحافی اور مجاہد آزادی جو شہرت نصیب ہوئی وہ شہرت بہ حیثیت شاعر نہیں ملی۔مگر ان کی زندگی کے تمام پہلو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔انہوں نے قوم کی رہنمائی کی تو ان کی محبت اور حب الوطنی کے جذبے کے تحت، یہاں ان کا اصل مقصد بھی ملک کی آزادی تھا،وہ ایک نامور مقرر تھے،تو ان کی تقریریں بھی حصول آزادی کے لیے ہوتی تھیں،وہ ایک صحافی تھے تو انہوں نے صحافت کے ذریعے بھی آزادی کی راہیں ہموار کیں۔اسی طرح ان کی شاعری میں بھی حب الوطنی کا جذبہ نمایاں ہے،ان کی غزلیں ان کی شخصیت کی ترجمان ہیں۔جس طرح وہ مکمل آزادی کے خواہش مند تھے عوام میں بہادری اور قومی یکجہتی دیکھنا چاہتے تھے،اور قوم میں ہمت اور جذبہ حب الوطنی پیدا کر کے انہیں دشمنوں کے مدمقابل لانا چاہتے تھے،وہ تمام جذبے،خواہشیں،ان کی غزلوں میں نمایاں ہیں۔چند شعر ملاحظہ ہو۔

مہماں قفس کیا تری فریاد کریں گے
اتنی نہ اب خاطر صیاد کریں گے [۴]

حریت کامل ہے دلا بندگی حق
وہ تجھ کو غلامی ہی میں آزاد کریں گے
دورحیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد ۵

مولانا محمد علی جوہر کی غزلوں میں تحریک آزادی کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ان کی غزلوں میں ایک مجاہد آزادی کا سراپا نظر آتا ہے،اور غلامی کی زنجیروں سے نکلنے کی تڑپ دکھائی دیتی ہے۔وہ وطن عزیز کے لیے فکر مند ہیں اور قوم کے بہتر مستقبل کا بھی انہیں خیال ہے۔وہ خداوند کریم سے دعا گو ہوتے ہیں کہ ان میں ہمت برقرار رہے،اپنی منزل حاصل کرنے کے لیے جب وہ جدو جہد کریں تو آخر وقت تک کرتے رہیں،ایسا نہ ہو کہ منزل سامنے ہو اور وہ دشمن کے سامنے کمزور پڑ جائیں،دشمن کے ظلم کی تاب نہ لاکر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائیں۔۔

ہمت نہ ہار دے کوئی منزل کے سامنے
پروردگار یوں بھی کوئی ناتواں نہ ہو ۶

محمد علی جوہر اوروں کے لیے خداوند کریم سے ہمت کی دعا کر رہے ہیں کہ ایسا کوئی ناتواں نہ ہو جو منزل کے قریب پہنچ کر ہمت ہار جائے۔جو دعا وہ اپنی قوم کے لیے کر رہے ہیں اللہ تعالی نے اس نعمت کو انہیں کم عمری میں ہی عطا کر دیا تھا۔جو انکی زندگی کے آخر وقت تک ان کے ساتھ رہی۔وہ بیماری،جسمانی کمزوری،اور ضعیفی کی حالت میں بھی باہمت، بے باک،اور مرد مجاہد کی صف اول میں نظر آئے۔اس ہمت اور بے باکی نے انہیں بہت سالوں تک قید خانے کی زندگی دی۔قید خانے

میں بھی وہ مرد مجاہد کے کردار میں ہی نظر آئے۔ وقت کوئی بھی ہو، جگہ کوئی بھی ہو، وہ اپنا کام کرتے رہے۔ جب وہ عوام کی نظروں سے اوجھل قید میں ہوتے تو وہ اپنے قلم کا جوہر دکھاتے، لمبے لمبے خطوط لکھتے، جس میں وہ ملک کے حالات سے لیکر گھریلو زندگی سے متعلق باتیں کرتے، اپنے نظریات پیش کرتے، اور اپنے تازہ کلام بھی وہ خطوط کے ذریعے اپنے چاہنے والوں تک پہنچاتے۔ ان کے خطوط اور کلام دونوں ان کے جذبات و شخصیت کی نمائیندگی کرتے ہیں۔

میرے لہو سے خاک لالہ زار دیکھ
اسلام کے چمن کے خزاں میں بہار دیکھ
کیا عشق ناتمام بتلاؤں سرگزشت
دارو رسن کا اور بھی انتظار دیکھ [۷]

محمد علی قید خانے کی زندگی سے نہیں بلکہ اپنے وطن میں غلامی کی زندگی سے سخت نالاں تھے، وہ کسی بھی شخص خواہ وہ حاکم کیوں نہ ہو، کسی کی جی حضوری، غلامی، چاپلوسی کے بالکل بھی قائل نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب بھی جھکو خدا کے آگے جھکو، نہ کہ انگریزوں کے ڈر سے ان کی جائز نا جائز باتوں پر حامی بھرتے رہو، وہ مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے مسلمانوں کبھی وہ وقت بھی تھا کہ انسان (حضرت آدم) کا فرشتوں نے سجدہ کیا، مگر اب کیا مجبوری ہے، کیا کمزوری ہے کہ تم شیطانوں کی غلامی کر رہے ہو، کیا اسلام کی تاریخ سے ناواقف ہو، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے۔ مگر تم مشکلوں سے سامنا کرنے کے بجائے جلد ہی گھبرا جاتے ہو۔ اگر تمہیں اسلامی تاریخ سے واقفیت ہوتی تو تم مشکلوں کو بھی صبر شکر

کے ساتھ قبول کرتے۔

اے مسلماں تو تو مسجود ملائک تھا کبھی
پھر یہ شیطاں کی غلامی کیوں تری تقدیر ہے
کیا نہیں واقف ابھی اسلام کی تاریخ سے
انّ مع العسر یسرا ہی کی سب تفسیر ہے ۸

محمد علی جوہر کی غزل میں ایک مجاہد آزادی کا عکس ابھرتا ہے۔غزل کے ذریعے ہی وہ ہم وطنوں کو بیدار کرتے ہیں،ان کی اصلاح کرتے ہیں تاریخ اسلام کا ذکر کرتے ہیں تا کہ انہیں اس کا علم بھی ہو اور وہ سبق حاصل کریں۔وہ عوام کو قومی یکجہتی کے بندھن میں باندھ کر ان میں طاقت پیدا کر کے دشمنوں کے مدمقابل لانا چاہتے ہیں۔تا کہ فتح نصیب ہو۔قید خانے کی زندگی سے جو کچھ سیکھتے ہیں اس کا اظہار کرتے ہیں،ان کے لیے نظر بندی سحر کا توڑ نکلی جس سحر میں عوام پھنستی جا رہی تھی۔نظر بندی میں ہی انہیں احساس ہوا کہ انگریز ہندوستانی مجاہدین سے کس قدر ڈرے ہوئے ہیں۔وہ ان کی طاقت کو سمجھتے ہیں اس لیے انہیں بار بار نظر بند کراتے رہتے ہیں جنہیں قوم اپنا رہنما مان چکی ہے۔جن کی تقریر کا،تحریر کا،ان پر اثر ہوتا ہے۔محمد علی حقیقت کے عیاں ہو جانے سے خوش بھی ہیں،وہ اس بات پر بھی خوش ہیں کہ قفس میں آنے کے بعد عوام میں ہمت اور آ گئی۔کیوں کہ وہ ملک کی آزادی کے ساتھ ساتھ اپنے رہنماؤں کی آزادی کے لیے بھی آواز اٹھانے لگے ہیں۔اور جب قفس کا دروازہ ان کے لیے کھلا تو ان میں اور بھی آگے نکلنے کی طاقت پیدا ہو گئی۔۔شعر ملاحظہ ہو۔۔

یہ نظر بندی تو نکلی رد سحر
دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے
اب کہیں ٹوٹا ہے باطل کا طلسم
حق کے عقدے اب کہیں ہم پر کھلے
فیض سے تیرے ہی اے قید فرنگ
بال و پر نکلے قفس کے در کھلے

۹

محمد علی جوہر انگریزوں کو للکارتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے لیے قفس ،قید،نظر بندی یا ان کے ظلم وستم کا ان پر اتنا اثر نہیں ہوتا، کیوں کہ جو انسان غلام ملک میں پیدا ہوا ہو اسے غم ملے یا خوشی فرق نہیں پڑتا کیوں کہ سب سے بڑا غم تو غلام ملک میں پیدا ہونا ہے۔اس غم سے بڑا کوئی غم نہیں اس درد سے بڑا کوئی درد نہیں، ہماری زندگی میں کتنی بڑی خوشی کیوں نہ ہو غلامی کا درد تمام خوشیوں پر بھاری ہے۔وہ جس قدر حب الوطنی کے جذبے سے سرشار تھے اسے حاصل کرنے کے لیے بیماری اور کمزوری میں بھی ہر جدو جہد اور سفر کے لیے تیار رہتے۔ان کی زندگی کا آخری دو سال سخت علالت میں گزرا،علاج چلتا،ٹھیک ہوتے دوبارہ اپنے کام میں لگ جاتے۔کام کرنے کے سبب دوبارہ بیمار ہوتے علاج ہوتا صحت یابی ملتے ہی پھر اپنی جدو جہد شروع کر دیتے۔ان کی اس ہمت کا اور جذبہ حریت کا اندازہ ان کی گول میز کانفرنس میں شرکت سے لگایا جا سکتا ہے۔جب کانگریس پارٹی اور دیگر سیاسی ہستیوں نے اس کانفرنس کا بائیکاٹ کیا تو محمد علی جوہر نے اس کی ہمایت کی کیوں کہ وہ انگریزوں سے

ملکر اپنی مانگ رکھنا چاہتے تھے۔ جب کہ گول میز کانفرنس میں اس مریض ناتواں کے لیے شرکت کرنا نہایت مشکل کام تھا۔ کیوں کہ ان کی بیماری کے سبب ڈاکٹروں نے بھی انہیں سخت ہدایت دی تھی کہ وہ آرام کریں۔ لیکن جذبہ جوہر نے جو ہمت دکھائی کہ تمام ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں نے بھی اس گوہر کے جوہر کو پرکھ لیا۔ مگر اس وقت ان کی ہمت وحوصلے کی تعریف کرنے کے بجائے ان کے بعض ساتھی اور دیگر ہندوستانی ان سے ناراض ہو گئے کیوں کہ وہ انگریزوں سے نفرت کرتے تھے، اور ان کی کانفرنس میں شرکت کے قائل نہیں تھے۔ مگر محمد علی جوہر نے کانفرنس میں شرکت کرنے میں مصلحت سمجھی جو کہ ضروری تھی۔ محمد علی اپنے حامیوں کے ساتھ لندن پہنچ کر گول میز کانفرنس میں شرکت کیے۔ بیماری وکمزوری کے سبب انہوں نے صدر سے بیٹھ کر تقریر کرنے کی اجازت چاہی، اور جب بولنا شروع کیے تو بولتے ہی چلے گئے۔ اس طویل تقریر سے چند سطور ملاحظہ ہوں۔

> ''مجھے امید ہے کہ آپ مجھے اس طویل تمہید کے لیے جس میں میں نے اپنی بیماری اور عوارض اور دیگر زبانوں کا ذکر کیا ہے معاف فرمائیں گے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج جس ایک مقصد کے لیے میں یہاں آیا ہوں وہ یہی ہے کہ میں اپنے ملک کو صرف اسی حالت میں واپس جاؤں گا جب کہ آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو۔ میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا۔ میں ایک غیر ملک میں جب تک وہ آزاد ملک ہے مرنے کو ترجیح دوں گا۔ اور اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں

گے تو پھر آپ کو یہاں مجھے قبر کے لیے جگہ دینی پڑے گی۔'' ۱۰

محمد علی کی زبان سے ادا ہونے والے یہ الفاظ سچ ثابت ہوئے، خدا نے ان کی آخری خواہش پوری کر دی، اور انہوں نے غلام ملک کے بجائے آزاد ملک لندن میں ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو آخری سانس لی۔ وہاں سے انہیں تدفین کے لیے یروشلم لے جایا گیا۔ مولانا شوکت علی لکھتے ہیں۔۔

''محمد علی کا علاج صرف احتیاط، سکون اور پرہیز تھا۔ سب سے زیادہ آرام اور سکون کی ضرورت تھی مگر وہ کہاں نصیب ہوتی۔ مسلمانوں کی موت اور زیست کا سوال تھا۔ کس طرح خاموش رہتا۔ عمر بھر احتیاط کام کے وقت کی نہ تھی اب کیا کرتا اور پرہیز کون عمر بھر کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو قوت ۱۰ برس معمولی احتیاط کی زندگی بسر کرنے میں کام کرتی اس کو دس مہینے میں خرچ کر دیا، اور بی اماں مرحومہ کی طرح یہ طاقت خرچ کر کے میٹھی نیند سو گیا۔'' ۱۱

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے ۱۲

جس مرد مجاہد نے زندگی کے آخری ایام میں صرف وطن عزیز کے بارے میں سوچا، آزادی کے بارے میں سوچا، اسے زندگی نے زیادہ مہلت نہیں دی، مگر آزادی کے اس پروانے نے ملک عزیز کے لیے بڑی ہی برق رفتاری سے جو کام کرنا چاہا، کیا۔ انہیں اپنی زندگی کی فکر نہیں تھی، فکر تھی تو اپنے ملک اور عوام کی۔ وہ غلامی کی

زندگی سے بے زار تھے،انگریزوں کی مداخلت سے نالاں تھے،انہوں نے صاف الفاظ میں مکمل آزادی کی مانگ کی۔ان کے انتقال کے دوسرے دن گول میز کانفرنس کے اجلاس میں تمام ارکان نے دو منٹ خاموش کھڑے ہوکر اظہارغم کیا۔لارڈسینکی نے اپنی تقریر میں کہا کہ۔۔

''وہ اپنی قوم کے بڑے محبوب اور مقبول لیڈر تھے۔جس بات کو حق سمجھتے تھے اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دینے سے انہوں نے کبھی دریغ نہیں کیا۔'' ۱۳

اسی اجلاس میں لارڈ ریڈنگ اپنی تقریر میں کہتے ہیں۔۔

''اس وقت ہم جس محمد علی کا ماتم کر رہے ہیں اس کے حوصلے،خلوص،اور ہمت کی داد دینی چاہیے کہ انہوں نے صحت کی ماندگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انتہائی ضعف کے عالم میں یہاں آنا منظور کیا تاکہ اپنے وطن کی آئینی جنگ میں شرکت کر سکیں،وہ اس جنگ کو اگرچہ انجام تک نہ پہنچا سکے لیکن یہ کیا کم ہے کہ اس جنگ میں لڑتے لڑتے انہوں نے اپنی جان دے دی۔'' ۱۴

موت کا کارواں کبھی نہیں رکتا،انسان نہ چاہتے ہوئے بھی اس کارواں سے جاملتا ہے۔کسی کے دنیا چھوڑ جانے سے صرف اس کا خاندان غمگین ہوتا ہے،کسی کے انتقال پر اس کے دوست رشتے دار،پڑوسی سبھی ماتم کرتے ہیں۔کسی کی وفات پر پورا شہر غمزدہ ہوتا ہے۔مولانا محمد علی جوہر کے انتقال پر پورے ہندوستان پر غم کے

بادل چھائے تھے۔ان کی زندگی میں بھی ،اوران کے دنیا سے جانے کے بعد بھی لوگوں نے ان کی وفاداری، جاں نثاری، حب الوطنی کوسراہا ہے۔آج جب ان کی فہم و فراست، حب الوطنی، وجاں نثاری کے چرچے ہوتے ہیں تو لوگ ان کی صحافت کا حوالہ دیتے ہیں، ان کی تقریروں کا حوالہ دیتے ہیں، مگران کی غزلوں کو بھول جاتے ہیں جو کہ ان کی شخصیت کی ترجمان ہے۔جس میں ایک مجاہد آزادی کی للکار ہے، ایک باہمت سپاہی کا حوصلہ ہے، ایک رہنما کی نصیحت ہے، ایک عاشق کے جذبات و احساسات ہیں۔انہوں نے اپنے وطن سے عشق کیا تھا۔ان کے عشق میں وہ شدت تھی کہ پوری زندگی انہوں نے محبوب وطن پر صرف کر دی۔انہوں نے زندگی جی تو وطن عزیز کے لیے، اور وطن پر ہی اپنا سارا جاہ وجلال، قوت وتوانائی، فنا کر دی۔

حواشی

کتاب مصنف ،مرتب صفحات سن ناشر

۱۔حیات مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر محمد اعظم چوہدھری، ۲۳، ۲۰۰۱، اردو اکیڈمی سندھ کراچی

۲۔کلام جوہر، عبدالماجد، ۱۲۰، ۱۹۳۶، مکتبہ جامعہ دہلی

۳۔ایضا	ایضا	۸۳	ایضا	ایضا
۴۔ایضا	ایضا	۱۰۷	ایضا	ایضا
۵۔ایضا	ایضا	۷۹	ایضا	ایضا
۶۔ایضا	ایضا	۹۹	ایضا	ایضا
۷۔ایضا	ایضا	۱۰۴	ایضا	ایضا
۸۔ایضا	ایضا	۱۲۹	ایضا	ایضا

۹۔ایضا ایضا ۱۰۸ ایضا ایضا
۱۰۔سیرت محمد علی، مولانا خورشید علی صاحب مہر ،۶۶ ۱۹۳۱،آرمی پریس دریا گنج دہلی
۱۱۔مولانا محمد علی جوہر، پروفیسر سرور، ۲۲۴ ۱۹۴۱ کتاب خانہ پنجاب لاہور
کے یورپ کے سفر
۱۲۔کلام جوہر،عبدالماجد ۱۲۷ ۱۹۳۶ مکتبہ جامعہ دہلی
۱۳۔حیات مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر محمد اعظم چوھری ۲۷۴ ۲۰۰۱
اردو اکیڈمی سندھ کراچی
۱۴۔ایضا ایضا ۲۷۵ ایضا ایضا

☆☆☆☆☆☆☆

جدوجہد آزادی ہند اور چکبست کی شاعری

از: محمد اسمعیل محمد عبدالنعیم
شعبہ اُردو، وسنت راؤ کالے سینئر کالج، ناندیڑ

اردو زبان ابتدا سے ہی جمہوری اور انسانی اقدار کو پیش کرتی رہی۔ اردو زبان کا سارا ادبی و شعری سرمایہ اس بات کا گواہ ہے کہ اس میں ہندوستانی کلچر کے بہترین عناصر کی شمولیت ہے۔ اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے اعلیٰ انسانی قدروں کی ہر دور میں تبلیغ کی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اردو مشترکہ کلچر کی پیداوار ہے۔ ہند ایرانی کلچر کے خوبصورت عناصر و اجزا سے اس کی تشکیل ہوئی ہے اور اس کی شاعری اور ادب کی آبیاری میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں بلکہ تمام ہندوستانیوں کا حصہ ہے۔ ولی، میر، سودا، درد، آتش، ناسخ، ذوق، غالب، مومن، داغ، انیس، اقبال، فیض، شاد عظیم آبادی، جوش اور حسرت موہانی کے متوازی اور پہلو بہ پہلو دیا شنکر نسیم، پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت برج نرائن چکبست، درگا سہائے سرور جہاں آبادی، تلوک چند محروم، رگھوپتی سہائے فراق، کیفی، آنند نرائن مُلا، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، جگن ناتھ آزاد، کرشن موہن، رام لعل، جوگندر پال، بلراج کومل وغیرہ کے نام ادب کے اُفق پر روشن ہیں۔ چنانچہ اردو شاعری اور ادب سے معاشرے میں ہمیشہ امن اور شانتی، محبت و اخوت، انسانی ہمدری، انصاف و عدل، مساوات اور قوانین کی پابندی و پاسداری وغیر مثبت عناصر کی فضا پیدا ہوئی ہے۔

معاشرے میں امن وامان، محبت واخوت، انسانی ہمدری، انصاف وعدل، مساوات اورقوانین کی پابندی و پاسداری معشرے کونئی منزلوں سے روشناس کراتی ہے اس وقت کے معاشرے کی نئی منزل آزادی تھی۔آزادی ایسالفظ ہے جس کوآج ہم صرف محسوس کرسکتے ہیں اس سے محظوظ ہونے والے افرادشاید ہی آج موجود ہوں گے۔اس کی اہمیت وافادیت اوراس کی شدت تک موجودہ دورکاانسان نہیں پہنچ سکتا کیوں کہ انگریزوں کے دورِ حکومت میں جوقربانیاں دی گئیں جوتکالیف برداشت کی گئی اس کوصرف یادکیا جاسکتا ہے۔انگریزوں کے ظلم وجبر کوہندوستانیوں کے جذبات کومختلف فنکاروں نے اپنی تخلیقات میں سموکر جدوجہدِآزادی میں عملی طور پرشرکت کی جن میں حسرت موہانی، اکبرالہ آبادی، جوش ملیح آبادی، حالی سرور جہاں آبادی، تلوک چندمحروم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان شعرا کا دور ہندوستان کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس دور میں ہر ہندوستانی کا صرف ایک مقصد ملک کوآزادی سے ہم کنار کرانا تھا۔اس ماحول میں ایک عام ہندوستانی کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ کسی بھی سطح پر ملک کی آزادی کی تحریک میں شرکت کرے اسی ماحول نے اس وقت بہت بڑے بڑے مفکر، ادیب، فلسفی اورمجاہدآزادی کو پیدا کیا جنھوں نے اپنی کوششوں سے ملک کوآزادکرانے میں اہم رول ادا کیا جن میں ایک اہم نام پنڈت برج نارائن چکبست کا بھی ہے۔

پنڈت برج نرائن چکبست فیض آباد کے ایک خوشحال کشمیری برہمن خاندان میں 19 جنوری 1882ء کو پیدا ہوئے۔ان کا خاندان بعد میں لکھنوآ کرآباد ہوگیا۔ان کے والد کا نام پنڈت اُودِت نرائن چکبست تھا۔وہ شعر کہتے تھے۔ یقین ان کا تخلص تھا۔چکبست کم عمری ہی سے بے حد ذہین اور مطالعے کے شوقین تھے۔

انھوں نے قانون کی تعلیم پائی اور لکھنو کے ممتاز وکلا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ چکبست پر میر انیس کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ فراق گورکھ پوری کا خیال ہے کہ چکبست کی شاعری انیس کی انسان دوست شاعری کی توسیع ہے۔ چکبست نے قومی وطنی نظمیں بڑی تعداد میں لکھی ہیں مگر ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔ وہ صرف 44 برس کی عمر میں 12 فروری 1926 نکوفالج کے حملے سے انتقال کر گئے، ورنہ وہ بہت بڑے اور اچھے غزل گو بھی تھے۔ یہاں ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے؟ اِن ہی اجزا کا پریشاں ہونا

اگر درد محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا
نہ کچھ مرنے کا غم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

جنون حب وطن کا مزا شباب میں ہے
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے

چکبست کی شاعری کی ابتدا ہی حُب الوطنی اور قومی ہمدردی سے ہوتی ہے۔ انھوں نے بارہ تیرہ سال کی عمر ہی سے شاعری شروع کر دی تھی۔ ان کی پہلی نظم 'حُب قومی' کے عنوان سے ملتی ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ ان کا مذاقِ شعری پروان چڑھنے لگا اور ان کا مطالعہ و مشاہدہ بھی وسیع ہوا۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہر طرف قومی ہمدردی اور حُب الوطنی کا چرچا تھا۔ سرسید اور حالی ہندوستانیوں کی تعلیم اور ترقی کا صور پھونک چکے تھے۔ ان کے بعد کے تعلیم یافتہ نوجوانوں نے ان کی آواز میں آواز ملائی۔ انگریزوں کی ظالمانہ حکومت، ہندوستانیوں

کی ذلت ومحکومی سے تمام حسّاس فن کار وادیب دل برداشتہ تھے۔اندر ہی اندر آزادی کی آرزو کروٹ بدل رہی تھی اور ہندوستانیوں کے آپسی اتحاد واتفاق اور یک جہتی کی اہمیت سمجھ میں آرہی تھی۔مختلف طبقات میں ہم آہنگی اور یگانگت کی ضرورت شدّت سے محسوس کی جانے لگی۔ایسے دور میں اقبال، چکبست، جوش ملیح آبادی، سرور جہاں آبادی، تلوک چند محروم نے حُب الوطنی کے گیت گائے اور اتحاد واتفاق کی تعلیم کو اپنی شاعری سے عام کرنے کی کوشش کی۔چکبست نے ''خاکِ ہند'' کے عنوان سے جو نظم لکھی، وہ اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہے۔اس نظم کے دو بند ملاحظہ ہوں:

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی
اس خاک دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری
چین وعرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری
چشم وچراغ عالم تھی سر زمیں ہماری
شمع ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہر دانش اس وادی کہن میں

اس نظم میں بھی چکبست نے ہندوستان کے مشترکہ کلچر اور روایات کا ذکر خوب صورت انداز میں کیا ہے۔چکبست نے اپنے قومی ووطنی جذبات کا اظہار بھی موثر انداز میں کیا ہے۔ان کے اسلوب میں جذبے کا خلوص، زبان کی فصاحت اور فن کی چابک دستی بھی ہے۔

وطن پرستی ان کی شاعری کا ایک اہم جزو ہے۔اس تعلق سے ان کی نظمیں بہت مقبول ہوئیں جن میں وطن سے محبت کا جذبہ نمایاں نظر آتا ہے۔ان نظموں میں 'خاک ہند'، 'ہمارا وطن دل سے پیارا وطن'، 'وطن کا راگ'، 'حب قومی' اور 'ہوم رول' آج بھی اپنی اہمیت کے لیے مقبول ہیں۔نظم ''وطن کا راگ'' کے چند اشعار اس طرح ہیں:

زمین ہند کی رتبہ میں عرش اعلیٰ ہے
یہ ہوم رول کی امید کا اجالا ہے
مسز بسنٹ نے اس آرزو کو پالا ہے
فقیر قوم کے ہیں اور یہ راگ مالا ہے
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے
وطن پرست شہیدوں کی خاک لائیں گے
ہم اپنی آنکھ کا سرمہ اسے بنائیں گے

چکبست نے مرثیے بھی لکھے جو اس دور کے کئی قومی لیڈروں کے لیے خراجِ عقیدت ثابت ہوئے۔چکبست کا مقصد تھا کہ ان مرثیوں کے ذریعے وہ نوجوانوں میں اعلیٰ انسانی و اخلاقی خوبیاں پیدا ہوں۔گوکھلے، تلک وغیرہ کی موت پر ان کے جو مرثیے ہیں، وہ زبان و بیان، اندازِ خطاب اور اخلاقی خوبیوں کی تعریف و تحسین کے اعتبار سے قابلِ ذکر ہیں۔ان مرثیوں کے چند اشعار اس طرح ہیں:

مرثیہ بال گنگا دھر تلک

بیکسی چھاتی ہے تقدیر پھری جاتی ہے

قوم کے ہاتھ سے تلوار گری جاتی ہے
اٹھ گیا دولت ناموس وطن کا وارث
قوم مرحوم کے اعزاز کہن کا وارث
جاں نثار ازلی شیر دکن کا وارث
پیشواوں کے گرجتے ہوئے رن کا وارث
مرثیہ گو پال کرشن گوکھلے

وطن کو تو نے سنوارا کس آب و تاب کے ساتھ
سحر کا نور بڑھے جیسے آفتاب کے ساتھ
چنے رفاہ کے گل حسن انتخاب کے ساتھ
شباب قوم کا چمکا ترے شباب کے ساتھ
جو آج نشو ونما کا نیا زمانہ ہے
یہ انقلاب تری عمر کا فسانہ ہے

ان مرثیوں کو پڑھنے سے حب الوطنی، وسیع النظری اور خدمتِ قومی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ چکبست کی شاعری کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا وِژن (Vision) وسیع تھا۔ وہ تنگ دلی اور تنگ نظری سے کوسوں دور تھے۔ مختلف طبقات اور افراد میں باہمی محبت واُخوت کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ ان کی شاعری میں بھی ان کا یہ نقطہ نظر صاف دیکھائی دیتا ہے۔ پروفیسر منظر اعجاز نے ان سے متعلق لکھا ہے:

''چکبست مظاہر کے حُسن میں حقیقت کے جمال کا پرتَو دیکھتے

ہیں اور فطرت و انسانیت کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ چکبست دنیا کو ایک گھر یا کنبہ تسلیم کرتے ہیں اور پرستشِ وفا کو ہی انسانیت کی معراج تصور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک کعبہ و بت خانہ میں کوئی فرق نہیں بشرطیکہ وفا قدرِ مشترک ہو۔ یہی وہ اخلاقی نکتہ ہے جس پر چکبست مذہبی رواداری، وسیع المشربی، مساوات اور اُخوت جیسے قدری عناصر کو سمیٹ کر انسانیت کے معیار کی تعمیر و تشکیل کرتے ہیں۔''

(اقبال اور قومی یک جہتی، ص 217)

چکبست کے کلام کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے کلام کو ملک اور قوم کی سطح سے اوپر اٹھ کر بین الاقوامی سطح پر ہر قوم کی ترقی اور انسان کی عزت و عافیت اور امن و سلامتی کا خواہ ہیں۔ چکبست اور ان کے قبیل کے دیگر شعرا و مفکرین یہ مانتے ہیں کہ انسان کو رنگ و نسل، مذہب و زبان اور خطّے میں تقسیم نہیں کرنا چاہیے۔ سب کی انسانی حیثیت یکساں ہے۔ سب عزت و احترام، آزادی و مساوات، امن و سلامتی کے مستحق ہیں۔

انسانوں اور انسانی گروہوں سے امتیازی برتاو آپسی دشمنی اور منافرت کو جنم دیتی ہے۔ چنانچہ سارے عالم کے انسانوں کو وحدتِ آدم اور احترامِ آدمی کی تعلیم سے مزیّن کرنا چاہیے۔ جب ہی یہ دھرتی امن و سکون اور محبت و اُخوت اور تہذیب و تمدن کا حقیقی گہوارہ بن سکتی ہے۔ اقبال نے بہت پہلے ہی کہہ دیا ہے۔

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے

دھرتی کے باسیوں کی مُکتی پریت میں ہے

چکبست نے مروجہ روایتی انداز اختیار نہیں کیا اور بہت جلد اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ جو پیغام وہ ملک وقوم تک پہنچانا چاہتے ہیں، اس کے لئے موزوں ترین ذریعہ اظہار نظم ہی ہوسکتا ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیت کو قومی اور حب الوطنی کے جذبات سے معمور نظم گوئی پر مرکوز کردی اور اس طرح اُردو شاعری پر اپنا ایک دائمی نقش ثبت کردیا۔ ان کے بارے میں اثر لکھنوئی نے لکھا ہے:

''صرف چکبستؔ ہی وہ قومی شاعر ہے جس نے کل ہندوستان کے جذبات ونظریات کی بلاامتیاز تفریق مذہب ترجمانی کی ہے''۔

چکبستؔ نے اپنی نظموں میں وطن کی عظمت کا ذکر کرکے اہل وطن کو اس عظمت پر فخر کرنا بھی سکھلایا اور خاص کر تلخ یادوں کو بھلا کر اپنی شاعری کے ذریعہ ان دلوں میں نئی امنگ اور جوش پیدا کرنے کا حوصلہ دیا۔

چکبستؔ ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال انسان تھے، چکبستؔ کا انداز بیان سادہ ہونے کے باوجود اپنے اندر خاص دلچسپی رکھتا ہے۔ تشبیہ اور استعارہ جیسے شعری وسائل سے انہوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ مختصر یہ کی پنڈت برج نارائن چکبست ایک ترقی پسند اور آزاد خیال ایک انقلابی شاعر تھے۔ وہ اصلاحِ معاشرہ اور وطن کی فکر میں محو رہتے تھے۔ چکبست کا مشاہدہ بے پناہ تھا، انھوں نے غلامی کے دور دیکھے۔ ظلم وستم کے سارے معاملے جو انگریزوں نے رواں رکھے تھے سب پہ انکی دقیق نظر تھی، شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں قومیت ووطنیت کا عنصر غالب ہے۔

☆☆☆☆☆

تحریکِ آزادی ہند میں اردو رسائل واخبارات کا حصّہ

سراج انور محمد میراں، ریسرچ اسکالر
سوامی رامانند تیرتھ مراٹھواڑہ یونیورسٹی، ناندیڑ۔

ہندوستان کی جنگ آزادی میں اردو صحافت کا جو نمایاں اور قابل فخر رول رہا ہے وہ آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ جب بھی ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ رقم کی جائے گی اردو صحافت کی عظیم الشان قربانیوں کا ذکر ضرور کیا جائے گا۔ جنگ آزادی کے حوالے سے اردو صحافت اور اردو اخبار نومی کا باب قلم بند کیا جائے گا دہلی اردو اخبار، ہمدرد، زمیندار، الہلال، البلاغ، اردو معلّٰی اور صادق الا خبار کو بھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان اخبارات کے علاوہ دہلی (بانی سوامی شردھانند)، اتحاد، دہلی (ایڈیٹر مولانا مداد صابری) شیر پنجاب، لاہور (ایڈ پیٹ امر سنگھ) کیسری لاہور (ایڈیٹر شیام لال کپور)، پارس لاہور (ایڈیٹر کرم چند روزان ہند کلکتہ (ایڈیٹر مولانا عبدالرزاق ملیح آباد)، پیام حیدر آباد (ایڈیٹر قاضی عبدالغفار اجل، بمبئ (ایڈ مین معین الد بن حارث جامعی) اور متعدد دیگر رسائل و اخبار بھی تھے، جنہوں نے اپنی خدمات اور قربانیوں سے آزادی کی جدو جہد کو مضبوط کیا۔

اس تحریک نے اردو زبان اور اردو زبان نے اس تحریک کو اس قدر متاثر کیا کہ تیس اور چالیس کے دہائیوں میں تقریبا ہر سیاسی اور سماجی جماعت نے نہ صرف اردو میں اپنا اخبار نکالنا ضروری سمجھا۔ بلکہ اس باب میں پہل کی۔ آریہ سماج کے

پرتاپ اور ملاپ جمعیۃ العلماء کے الجمعیۃ اور سناتن دھرم کے ویر بھارت کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان کے بعد مسلم لیگ نے تنویر مجلس احرار نے یکے بعد دیگرے احرار: زمزم، پاسبان اور مجاہد۔ کالی پارٹی نے اجیت کمیونسٹ پارٹی نے قومی جنگ اور یونینسٹ پارٹی نے شہباز کے نام سے اردو میں سہ روزہ یا روزانہ اخبار نکالے۔ کانگریس نے 1945ء میں لکھنؤ سے پنڈت جواہر لال نہرو کی سرپرستی میں قومی آواز کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا جس نے اس کی مرکزی قیادت کی نمائندگی کے علاوہ اپنے صوبے کی اردو صحافت میں بڑھتی ہوئی فرقہ واریت کا کھل کر مقابلہ کیا۔ اس کے علاوہ کانگریس لیڈر پنڈت نہرو ہی کے ایما پر کانگریں مخالف مہاشہ کرشن کے فرزند ویر میندر نے 1946ء کے اوائل میں پنجاب کی راجدھانی لاہور سے روزنامہ جے ہند جاری کیا جس میں کانگریس کی تحریک آزادی کے ساتھ ساتھ نیتاجی سبھاش چندر بوس کے جہاد آزادی کے مشن کو نمایاں کیا گیا۔ آخر کار متعدد اردو صحافیوں کی کوششوں اور قربانیوں کے باعث 15 اگست 1947ء کو وہ دن آ گیا کہ تقریباً ساڑھے پانچ سو ریاستیں راجوں مہاراجوں کی مطلق العنان سے نکل کر ملک کے عوامی جمہوریہ کا حصہ بن گئیں۔ غلامی کا اندھیرا چھٹ گیا اور آزادی کا سورج طلوع ہو گیا۔ اس کے لئے اردو صحافت نے جو جاں فشانی جگر سوزی اور قربانی کی راہ اپنائی، وہ تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔ اس کے کاموں میں آزادی کی جدوجہد کی نہایت اہم تقریریں قرار دادیں اور یادداشتیں محفوظ ہیں آزادی کی کوئی صداقت پسند تاریخ اس کی خدمات کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ اسے فرقہ واریت کے اس رجحان سے مسلسل سابقہ رہا ہے فرنگی سامراج نے بڑی حکمت اور شاطری سے فروغ دیا لیکن یہ پیشتر حصول آزادی کے

لئے سرگرداں رہی۔

1857ء کے غدر نے سیاست، تاریخ، صحافت اور علم وادب جیسے تمام شعبہ زندگی میں ایک واضح تبدیلی پیدا کی۔ صحافت چونکہ اپنے مزاج اور طریقہ کار کے اعتبار سے عامتہ الناس اور گردوپیش کے حالات وکوائف کا عکاس ہوتی ہے اس لئے ہر سیاسی اور سماجی انقلاب اور تبدیلی کی مانند غدر 1857 سے پیدا شدہ حالات سے سب سے زیادہ صحافت اثر پذیر ہوئی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر کے ایسے نمائندہ اور قابل تقلید اخبارات جنہوں نے صحافتی خصائص اور لسانی قوت سے اردو صحافت اور صحافتی زبان کے ارتقا کو معراج کمال تک پہنچادیا، ان میں لکھنؤ سے شائع ہونے والا منشی نول کشور کا مشہور زمانہ اودھ اخبار (1858)، سرسید کا تہذیب الاخلاق (1870)، پنڈت قلندر رام کا اخبار عام ا (لاہور 1871ء) منشی سجاد حسین کا اخبار اودھ پنچ (1877) اور پنجاب سے شائع ہونے والا منشی محبوب عالم کا اخبار پیسہ (1887) وغیرہ خاص طور پر اہمیت کے حامل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ 1857ء کے بعد شروع ہونے والا صحافتی دور روزناموں کا دور انیسویں صدی صحافتی نقطہ نظر اس لیے بھی اہم ہے کہ اس دور میں اردو صحافت نے اپنا خدوخال پوری تراش وخراش اور آب وتاب کے ساتھ متعین کرلیا۔ جن کی بنیاد پر بیسویں صدی میں اس نے نئے تقاضوں کی تعمیل کی صلاحیت پیدا کرلی جو نئے عہد اور ایک نئے عالم گیر ماحول میں دوسری مدمقابل زبان کے اخبارات ورسائل کے ساتھ قدیم بہ قدم چلنے کے لئے ضروری تھا۔ اس عہد میں اردو صحافت کو فروغ والوں میں مولانا ظفر علی خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا حسرت موہانی جیسی

کثیر الجہات اور عبقری شخصیات شامل ہیں۔ جو بیک وقت ادیب، شاعر، خطیب اور سیاست داں بھی تھے۔ علاوہ ازیں اس عہد میں صحافت نے جغرافیائی حدود عبور کر کے عالم گیریت کے اصول وضوابط کی طرف گامزن ہونا شروع کیا۔ خاص طور سے انگریزی اخبارات ورسائل کا صحافتی معیار اردو اخبار کے لئے تقلید اور چیلنج کا مرجع ثابت ہو رہا تھا۔ بیسویں صدی میں خاص طور سے مولانا ظفر علی خاں کا زمیندار (1909)، مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال (1912ء) مولانا محمد علی جوہر کا ہمدرد (1913ء) اور آزاد کا البلاغ (1915ء) ایسے اردو اخبارات ہیں جنہوں نے اس دور میں اردو اخبار کا دامن موضوعات اور مواد کے ساتھ زبان واسلوب وانداز کے اعتبار سے وسیع سے وسیع تر کر کے ہم عصر اردو صحافت کو اس لائق بنا دیا کہ وہ عوام کے ہر طبقہ کی رہنمائی اور نمائندگی کر سکے۔ ان کے علاوہ بعد بیسویں صدی کے نصف اول اور ربع ثانی میں کئی اہم اخبارات سامنے آئے جنہوں نے صحافتی زبان کے ارتقا کے نقوش کو مزید واضح کیا۔ ان اخبارات میں ہمدم (لکھنو 1916ء)، 'پرتاپ (لاہور 1919ء)، 'سیاست (لاہور 1919ء)، ملاپ (لاہور 1923ء)، پیچ (دیلی 1919ء) ریاست (حیدرآباد 1924ء)، مولانا عبد الماجد دریابادی کا اخبار سچ (1925ء) الجمعیۃ (دہلی 1925ء) عبدالمجید سالک اور مولانا رسول مہر کا اخبار انقلاب (لاہور 1927ء)، 'مستقبل' (1928ء) 'سیاست حیدرآباد)، صدائے عام (پٹنہ 1938ء) اور 'قومی آواز (لکھنو 1945ء) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے کئی اخبارات نے آزادی کے بعد بھی اپنا وجود اور شناخت قائم رکھ کر ہم عصر اردو صحافت کو رنگ وآہنگ فراہم کیا۔ آزادی کے بعد نئی سیاسی صورت

حال سے ابھرنے والے نئے سماجی منظر نامے میں رسل وسائل آمد ورفت اور ترسیل و ابلاغ کی ترقی اور آسانیوں نے صحافت کو بڑے پیمانے پر متاثر کیا۔ اردو ہندی صحافت اور آزاد ہندوستان کے تناظر میں بات کی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ''اردو'' کو سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کیے جانے کے نتیجے میں ہندوستان کا لسانی ڈھانچہ ایک طرح کے تشکیل نو کے عمل سے دوچار ہوا، اگر چہ شروع میں عوامی اور علمی سطح پر ایسی کوئی واضح لسانی تبدیلی کا احساس مشکل تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ لسانی تبدیلی واضح طور پر محسوس کی جانے لگی اور حساس طبیعت واقع ہونے کی وجہ سے صحافت میں اس کے خدوخال زیادہ وضاحت کے ساتھ دیکھے جاسکتے ہیں۔

ابتدائی دور میں اعلیٰ شعری ذوق کی نشو ونما اور تہذیب وتربیت میں مولوی صاحب موصوف کی خدمات کا اعتراف ناگزیر ہے اور ''دہلی اردو اخبار کا ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے اردو صحافت کے ابتدائی دور میں اپنے عہد میں اردو صحافت کا ایک اعلیٰ نمونہ اور قابل تقلید مثالی معیار قائم کرنے والا یہ اخبار ہم عصر سیاسی صورت حال کے تمام اہم موضوعات پر بصیرت افروز اور بے لاگ اداریے بھی تحریر کرتا تھا۔ دہلی اردو اخبار کے اداریوں کو اگر ایک علاحدہ کتابی صورت میں یکجا کر دیا جائے تو اداریوں کے حوالے سے اس عہد کی اردو اخبار نومی اور صحافتی زبان کے رموز ونکات اور اس کے تشکیل وتعین کے محرکات، عوامل اور بنیادی خصوصیات کا اندازہ لگانا آسان ہو جائے گا۔ اردو میں صحافتی زبان کے ارتقا وتشکیل تعین میں اودھ اخبار کی عطایا کا فہرست میں اس زمانے کی سربرآوردہ شخصایت شامل تھیں۔ ایسی شخصیتیں جن کی تحریر میں اودھ اخبار میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتی تھیں، ان میں عبدالیم شرر،

رتن ناتھ سرشار، مرزا غالب، احمد حسن شوکت، مولانا جالب دہلوی، شیو پرشاد، مولوی غلام محمد خان تپش، احمد حسن شوکت، سید امجد علی، مرزا حیرت دہلوی کے نام بطور خاص شامل ہیں۔ منشی نور کشور کے اودھ اخبار میں کوئی سیاسی مسلک نہ ہونے کی وجہ سے اودھ اخبار کی صحافتی پالیسی معتدل اور غیر جانب داری کی حامل تھی۔ فرقہ وارانہ اور گروہ بندی سے عاری ہونے کے ناطے اودھ اخبار سماج کے ہر مذہب اور فرقے سے متعلق خبروں مکمل صحافتی اخلاقیات کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کرتا تھا۔

سرسید نے اخبار سائنٹفک سوسائٹی 1866ء اور اس کے بعد پندرہ روزہ تہذیب الاخلاق 1877ء کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ اردو میں صحافتی زبان کا ایک اعلی معیار قائم کیا بلکہ اردو کی صحافتی زبان کو اس وقت کی جدید ترین اور مقتدر صحافتی زبان کے ہم رتبہ کر دیا۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی تو باقاعدہ اخبار تھا لیکن تہذیب الاخلاق ایک اصلاحی پرچہ ہونے کے باوجود اس وقت کی صحافت کا مثالی نمونہ تھا۔ استدلالی زبان و بیان اور وضاحت اور قطعیت سے بھر پور اسالیب اظہار کو رواج دیا۔ انیسویں صدی میں اردو کی ادبی اور علمی صحافت کے لسانی رجحان کا تعین کرنے میں جو کارہائے نمایاں اخبار سائنٹفک سوسائٹی، انسٹی ٹیوٹ گزٹ، اور تہذیب الاخلاق نے انجام دیئے۔ اس عہد کے کسی دوسرے اخبار یا رسالے نے نہیں دیئے۔ تہذیب الاخلاق کا مقصد تعلیمی تحریک اور سماجی اصلاح تھا جبکہ اخبار سائنٹفک سوسائٹی کا مقصد ہندستانیوں کو مغربی علوم وفنون اور ایجادات وانکشافات سے اردو زبان کے ذریعہ روشناس کرانا تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے اخبار سائنٹفک سوسائٹی نے انگریزی مواد کا اردو ترجمہ کر کے شائع کیا۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کا رواج اگر چہ اردو

اخبارات میں پہلے ہی سے عام تھا مگر اس میدان میں بھی اخبار سائنٹفک سوسائٹی کی انفرادیت یہ ہے کہ اس کے تراجم کی زبان عامتہ الناس کی زبان کے قریب اور روز مرہ کے الفاظ ومحاورات سے مانوس تھی۔ اردو صحافت کو انیسویں صدی میں جن اخبارات نے تازگی، ندرت اور رنگارنگی عطا کی ان میں عبدالحلیم شرر کے ہفت روزہ مہذب جو یکم اگست 1890ء کو شائع ہوا تھا، کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے۔ ان کا ماہان مجلّہ دلگداز سے شرر کی گہری صحافت دینی اور سیاست، سماج اور ادب سے ان کی سنجیدگی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا ظفر علی خاں نے صحافت کو خطابت اور طنزیہ لب و لہجے سے ہمکنار کیا۔ انہوں نے سیاسی مسائل پر بلند آہنگی اور انقلابی اداریوں سے لوگوں کو متاثر کیا۔ زمیندار نے اپنے ادارے سے ملک مخالف عناصر کو للکارا اور ہندو مسلم اتحاد پر جم کر لکھا۔ مولانا ظفر علی خاں اور ان کے اخبار زمیندار کے لسانی ڈھانچے میں ان کی گہری علمی بصیرت اور رومانیت دونوں کا امتزاج متوازی طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ چونکہ انہوں نے ادب اور شاعری کا وسیع مطالعہ کیا تھا اور انگریزی ادب پر بھی انکی گہری نظر تھی اس لئے مزاج میں رچی بسی ہوئی رومانیت نے صحافت میں بھی جگہ پائی۔

زمیندار کی صحافتی زبان اور اپنے عہد کے صحافتی اسلوب میں ان کے مقام کو متعین کرنے کے لئے زمیندار کی درج ذیل عبارت بطور مثال پیش کی جاسکتی ہے جس میں مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار کے اجرا کا سبب اور اپنے والد بزرگوار کی جانب سے صحافت کے لئے دی جانے والی قربانیوں کا ذکر کیا ہے۔ سب سے پہلے اپنے اغراض ومقاصد کی تکمیل کے لحاظ سے اس نے ایک اخبار بنام زمیندار جاری کیا

اوراس کے اور یہ اپنی آواز جو گم کردہ راہ کارواں کے لئے بہ منزل بانگ درتھی۔ یہ آواز اول بہت ہی دھیمی اور مدھم تھی لیکن رفتہ رفتہ بہت بلند اور پاٹے دار ہوتی چلی گئی۔ پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ نے مولانا آزاد کی تحریروں میں اطلاعی اسلوب کی نشاندہی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

''مولانا آزاد نے الہلال، البلاغ، تذکرہ اور خطبات میں اطلاعی اسلوب یعنی بیانیہ انداز ہ تحریر سے کام لیا ہے، کیوں کہ وہ ایسا نہ کرتے تو جو مذہبی اور سیاسی پیغام وہ لوگوں تک پہنچانا چاہتے تھے وہ شاید نہیں پہنچا سکتے تھے۔'' صحافت کے تعلق سے مولانا آزاد کے بارے میں یہ بات بجا طور پر کی جاسکتی ہے کہ جس طرح شاعری کا شمار غالب کے امتیازات میں ہوتا ہے اسی طرح اردو صحافت کی شناخت مولانا آزاد کی ذات سے ہوتی ہے۔ مولانا نے اردو میں صحافت کے فن اور اس کی زبان کو جو وقعت اور وقار عطا کیا ہے اس کی مثال اردو صحافت کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ صحافت ان کے مزاج اور شخصیت کا اہم حصہ تھی اس لئے اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی ایام ہی سے انہوں نے اس فن کو پسندیدہ مشغلہ کے طور پر اختیار کیا اور اپنی علمی و ادبی لیاقت اور دانشوران شعور اور تخلیقی قوت کے ذریعہ اردو صحافت کو دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی صحافت کا ہم پلہ کر دیا لیکن سیاسی آزادی کے لئے جدو جہد، برطانوی اقدار کے ذریعہ اخبارات سے ضمانت طلبی کے سلسلہ کی مخالفت اور اخباروں کے دفاع کے لئے انڈین پریس ایسوی ایشن کا قیام مولانا کے یہ تمام کارنامے صحافت کے ساتھ ان کے لگاؤ اور سروکار کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کے دل و دماغ میں موجود ایک مثالی اور قابل تقلید صحافی کا تصور صحافت کے جس اعلی معیار کی طرف اشارہ کرتے ہیں وہ مولانا

کےعلاوہ کسی دوسرے صحافی کے یہاں نہیں ملتے۔

الہلال اور البلاغ، دونوں کا مقصد دین اسلام اور صراط مستقیم کی تبلیغ واشاعت اور مسلمانوں میں اصلاح و بیداری پیدا کرنا تھا، یہی وجہ ہے کہ الہلال کے بیشتر مضامین مذہبی اور اصلاحی نوعیت کے ہوتے تھے۔ مولانا آزاد کے اسلوب بیان کی انفرادیت کے بارے میں پروفیسر مرزخلیل احمد بیگ رقم طراز ہیں: مولانا آزاد نے جو اسلوب بیان اپنی تصنیفی زندگی کے آغاز میں اختیار کیا ہے اس کی مثال ان کے ہم عصروں میں بھی نہیں پائی جاتی۔ آزاد کے عہد میں ڈاکٹر ذاکر حسین خواجہ غلام السیدین، سید عابد حسین اور محمد مجیب جیسے دانشور موجود تھے جن کی گہری دلچسپی علم و ادب مذہب وسیاست اوتعلیم وتدریس کے مسائل سے تھی، لیکن ان میں سے کسی نے بھی مولانا آزاد کا سا اسلوب اختیار نہیں کیا۔ اسی عہد میں سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے عالم بھی موجود تھے، لیکن ان کے اسالیب میں بھی الفاظ کی وہ گھن گرج، باندآہنگی اور ادبی مرصع کاری نہیں پائی جاتی جو آزاد کے اسلوب کا امتیاز خاص ہے، بلکہ ان مصنفین کا اسلوب سادگی کی طرف زیادہ مائل تھا۔'' لیکن صحافی دیانتداری کے پہلو سے مولانا کے الہلال اور ابلاغ کا مطالعہ کرتے ہوئے جو بات قدم قدم پر گراں محسوس ہوتی ہے وہ مولانا کی جذباتیت ہے۔ اصولی طور پر جذباتیت صحافتی نثر کے لئے موزوں نہیں، لیکن اخبارات کا انسانی تنور اپنے عہد کی سیاسی صورت حال اور مدیر خبر نگار کے منشا و مقاصد کے اعتبار سے ہوسکتا ہے، مولانا آزاد کی صحافتی زبان کا مطالعہ بھی انہیں پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر کیا جانا چاہئے۔ الہلال ہندوستانی سیاست کے اس دور میں منظر عام پر آیا جب سیاسی منظر نامہ یکسر تبدیل ہو

چکا تھا۔ آزادی کی تحریک زور وشور پر تھی اور سماج کا اجتہائی شعور اور نفسیات جوش و جذبہ اور جارحانہ تیور لیے ہوئے بھی قوم اور سماج کو آزادی وطن کی خاطر آمادہ کرنے کے لئے جوش و جذبہ سے بھر پور باند و بانگ خطیبانہ اسلوب ضروری تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافیانہ زبان کو عموماً اور الہلال کے اسلوب نگارش اور اظہار بیان کو خصوصا غیر معروضی امر کہہ کر ایک ثانوی حیثیت دینے کی کوشش کی جاتی ہے حالانکہ الہلال کے صفحات اس بات کے شاہد ہیں کہ فن اخبار نویسی کے اعتبار سے اس کی خبروں میں کہیں کوئی لسانی، اسلوبیانی یا فنی عیب اور ثقالت نہیں ہے۔

جنوبی افریقہ میں ہندستانیوں پر ہونے والے مظالم اور زیادتیوں پر ہمدرد کا یہ تبصرہ ملاحظہ کیجئے جس سے اس کا منفرد انداز بیان واضح ہوتا ہے:

> ''اگر یونین جیک کے جھنڈے کے نیچے گورنمنٹ ہند کی نظروں کے سامنے اور ہماری آنکھوں کے روبرو ہمارے بھائیوں کی تذلیل وتحقیر ہوگی، ہمارے بھائیوں کی بیویوں کی بے حرمتی ہوگی، ہمارے بھائیوں کے بچوں سے جیل خانوں میں چہل پہل کی جائے گی صرف اس بنا پر کہ ہم کالے ہیں اور وہ گورے ہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وزارت کے اقتدار کو اس قدر صدمہ پہنچے گا جس کی تلافی مشکل ہوگی اور اس کے ایسے نتائج نکلنے کا اندیشہ ہے جس کو کوئی بہی خواہ مستحسن قرار نہیں دے سکتا۔''

ہمدرد نے اپنی تحریروں سے ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دیا۔ گاندھی جی کی کوششوں کو عوام الناس تک پہنچایا اور ہندوستانیوں کے دلوں میں ملک سے محبت کے

جذبے کو پروان چڑھایا تحریک آزادی کی حمایت میں کسی بھی طرح کے نقصان کی پروانہ کی اور انگریزوں کی نیتوں کو جگ ظاہر کیا۔ مجاہدین آزادی کی ہمت افزائی کی۔ ہمدرد کا مشن ملک کو متحد رکھنا، آزادی کے جذبے کو ابھارنا اور صحافت کے پلٹے کو معتبر بنانا تھا۔ اپنے اس مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اس وقت جس طرز اظہار، طرز اسلوب اور طرز بیان کی ضرورت تھی اسے اپنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ولولہ انگیز تحریروں کو جگہ دی گئی تو خطابت کا لہجہ بھی اختیار کیا گیا اور عوام کے جذبات کے پیش نظر فارسی اور اردو کے اشعار کا استعمال کیا گیا لیکن سادہ اور سلیس زبان ہمیشہ پیش نظر رہی۔ غرض کہ ہمدرڈ میں صحافتی زبان کو رائج کرنے کی کوشش کے باوجود جگہ جگہ خطابت اور جذبات نگاری کا انداز محسوس ہوتا ہے۔ اس لئے مجموعی طور پر ہمدرد کی زبان و بیان کو کسی حد تک ایک نئے صحافتی اسلوب سے تعبیر کر سکتے ہیں جس میں ادبیت کے ساتھ ساتھ سادگی اور سلاست بھی ہے۔ مولانا محمد جوہر کے ہمدرد کے بعد بیسویں صدی کے نصف اول اور ربع ثانی میں کئی اہم اخبارات سامنے آئے جنہوں نے صحافتی زبان کے ارتقا کے نقوش کو مزید واضح کیا۔

ان میں سے کئی اخبارات نے آزادی کے بعد بھی اپنا وجود اور شناخت قائم رکھ کر ہم عصر اردو صحافت کو رنگ و آہنگ فراہم کیا۔

☆☆☆☆☆

جدوجہد آزادی ہند اور اُردو شاعری

از: شیخ مزمل،

یشونت مہاودیالیہ، ناندیڑ

جب سے دنیا بنی ہے تب سے ہی انسان آزاد رہنا چاہتا ہے۔ یہ آزادی اُس کی ذہنی بھی ہوسکتی ہے معاشی بھی ہوسکتی ہے اور سماجی بھی ہوسکتی ہے ہر انسان اپنی زندگی آزادی سے گزارنا چاہتا ہے وہ کسی کا غلام بننا پسند نہیں کرتا کسی فرد یا ملک یا قوم پر کوئی آکر حکومت کرنے لگے جب وہ فرد یا ملک یا قوم اس کو پسند نہیں کرتی اور اُس کے خلاف اپنی آزادی کی آواز کو بلند کرتی ہے۔

ہندوستان کو سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا اس وجہ سے دیگر ممالک کی نظر ہمیشہ ہندوستان پر تھی۔ انگریز یہاں تجارت کے بہانہ آئے تھے اور بعد میں سازشیں رچ کر ہندوستان کو اپنا غلام بنالیا۔ اُس پر حکومت کرنے لگے اور ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے لگے جب ظلم حد سے زیادہ بڑھنے لگا تو ہندوستانیوں نے آزادی کی آواز بلند کی۔ 1857 کی جنگ آزادی کو ہندوستان کو پہلی جنگ آزادی کہا جاتا ہے جس میں کسانوں، مزدوروں، شاعروں، ادیبوں وغیرہ نے حصہ لیا۔ کسی نے اپنی بہادری کا مظاہرہ کرکے اپنی جان کی پرواہ کئے بنا انگریزوں کی کھل کی مخالفت کرنے لگے تو کئی شاعروں اور ادیبوں نے اپنے قلم کی طاقت دکھا کر انگریزوں کی مخالفت کی شاعروں اور ادیبوں نے اپنے قلم کے ذریعہ ہندوستانی بھائیوں کے حب الوطنی کے جذبے کو بڑھایا اور ہندوستان کی جنگ آزادی کی دعوت دی۔

جدوجہد آزادی ہند میں شاعروں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ایک اہم کردار ادا کیا۔شاعروں نے اپنی شاعری کا ایسا کمال دکھایا کہ قارئین کے دلوں میں آزادی کا جذبہ جاگ اُٹھا۔ایسے ہی ایک انقلابی شاعر جوشؔ ملیح آبادی ہے جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ مجاہدین آزادی کے دِلوں میں آزادی کے جذبے کو بھر دیا۔جوشؔ کا ایک انقلابی شعر ملاحظہ ہو۔

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

جوشؔ نے انگریزوں کے ساتھ کبھی سمجھوتے کی بات نہیں کی انہوں نے ہمیشہ ظلم وزیادتی کے خلاف آواز اُٹھائی ہے۔جوش کی شاعری میں نعرے بھی دیکھنے کو ملے ہیں نعرے کسی بھی نوجوان کو جگانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں جوشؔ کی شاعری میں انقلاب کی عناصر کے ساتھ ساتھ مظلوم طبقوں کی حمایت بھی موجود ہے۔ جوشؔ ظلم وستم کے سخت خلاف تھے۔اس لئے جوشؔ نے برطانوی حکومت کے ساتھ سخت رویہ اپنایا ہے۔جوشؔ کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قاری پر دیرپا اثر رکھتی ہے جس کی وجہ سے قاری سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔سوچنے کی وجہ سے قاری میں تغیر پیدا ہوتا ہے اور تغیر کا دوسرا نام انقلاب ہوتا ہے۔

جوش ایک وسیع فکر ونظریہ کے مالک تھے انہوں نے اپنی سوچ کو شاعری میں ایسے بہترین طریقے سے پرویا ہے کہ قاری اُس کو پڑھنے کے بعد جوشؔ جیسی سوچ کا مالک ہوجاتا ہے۔

جوشؔ جب دہلی میں قیام پذیر تھے تو اُن کی ملاقاتیں مختلف سیاسی رہنماؤں سے ہوئی۔اُن کی صحبت میں رہ کر جوشؔ نے انقلابی رنگ پکڑلیا۔ جوشؔ نے قوم کو بیدار کرنے

کے لئے شاعری سے بھی کام لیا، اور ہندوستانیوں کو اس بات کا احساس کرایا کہ اب ہم لوگ برطانوی حکومت کا اور ظلم وستم نہیں سہہ سکتے۔ جوشؔ کا خواب تھا کہ ہندوستان ان فرنگیوں کے قبضہ سے آزاد ہوجائے اور تمام ہندوستانی کھلی فضاء میں سانس لے سکے۔

جوشؔ کے اس پیغام سے اس قدر مجاہدین آزادی میں جذبۂ وطن جاتگا کہ وہ لوگ بنا اپنی جان کی پراہ کئے بغیر برطانوی حکومت سے لڑ گئے جوش نے اپنے کلام میں وہ اثر چھوڑا کہ مجاہدین آزادی نے جان زیادہ ملک کی آزادی کو ترجیح دی۔

جوشؔ کے جیسی انقلابی سوچ رکھنے والے اور ایک عظیم شاعر مولانا حسرت موہانی ہے جو انگریزوں سے بیٹھ کے بات کرنے کی بجائے لیسن کی طرح دنیا ہلا دینے کو ترجیح دیتے تھے حسرت ہمیشہ سے ہی برطانوی حکومت کے خلاف تھے۔ حسرتؔ اپنے قلم کے زریعے انقلاب برپا کرتے تھے حسرتؔ کی ایسی سرگرمیاں برطانوی حکومت کو پسند نہیں تھی اس لئے برطانوی حکومت نے حسرت کا پریس ضبط کرلیا اور اُن کے اوپر مقدمہ بھی چلایا تھا عدالت نے حسرت کو سزاء بھی سنائی۔ حسرتؔ کا جیل میں لکھا ہوا ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

جیل خانے کا سخت رویہ کوئی کسی کا یار نہیں
رام بانس کی کری مشقت چکّی سے انکار نہیں

آزادی ہند کی جدوجہد کے لئے کئی رہنماؤں کو جیل جانا پڑا جس میں مولانا حسرتؔ موہانی کا بھی ایک نام ہے جیل میں جو مجاہدین ہمراہی ہوئے تھے اُن کے ساتھ کافی ظلم وستم کیا جاتا تھا اُس دور میں رام بانس اور ہاتھی چنگاڑ جیسی سخت سزائیں دی جاتی تھی جس کو دیکھ کر انسان کی روح کانپ جاتی تھی۔ حسرتؔ کے

ساتھ بھی جیل میں بہت ظلم وستم کیا گیا۔لیکن حسرتؔ اپنے عزائم پر قائم ودائم رہے۔ اورانقلاب زندہ باد کا نعرہ دیا۔حسرتؔ نے اپنی زندگی کے چھ سال جیل میں گزارے تا کہ ہمارا ملک آزاد ہو جائے اور آنے والی نسلیں آزاد ملک میں سانس لے سکے۔ جیسے جیسے جدوجہد آزادی ہند تیز ہوتی گئی ادیبوں نے اپنے قلم کا کمال دکھانا بھی تیز کر دیا جس کی وجہ سے مجاہدین آزادی ہند کا حوصلہ اور جذبہ بڑھتا گیا اسی جذبہ کو بڑھانے والا بسمل عظیم آبادی کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

سرفروشی کی تمنّا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

بسمل عظیم آبادی کے اس شعر نے انگریزوں کی راتوں کی نیند اُڑادی تھی اورمولانا حسرتؔ موہانی کے انقلاب زندہ باد والے نعرے سے ہمارے مجاہدین آزادی کے جذبہ کو دیکھ انگریزوں نے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ اب وہ زیادہ دن ہندوستان میں نہیں ٹکنے والے ہیں ہندوستان کی آزادی کی تحریکیں اور تیز ہونے لگیں اور 15/اگست 1947ء کو ہندوستان آزاد ہو گیا۔

مختصراً یہ کہ جس طرح ہمارے آباواجداد نے ظلم وزیادتی کے خلاف اعلان جنگ کر کے اپنی جانوں کی بازی لگا کر اپنے جانوں کو قربان کر کے ہمارے پیارے ملک کو آزادی دلائی یہ بات ہمارے لئے قابل فخر ہے اور ہم کو اُن سے یہ سبق ملا ہے کہ ہر دور میں ہم سب ہندوستانیوں کو مل کر ظلم وزیادتی کے خلاف لڑنا ہوگا اور ہمارے پیارے ملک کی حفاظت کے لئے اپنی جانوں کو قربان کرنا ہوگا۔

☆☆☆☆☆

تحریک آزادیٔ ہند اور فن طنز و مزاح

سعید الرحمٰن انصاری،
ریسرچ اسکالر شعبہ اردو ممبئی یونیورسٹی

تحریک آزادی میں مجموعی طور پر اردو زبان و ادب کا کردار مسلم ہے اور اس باب میں اردو صحافت نے تو قائدانہ رول ادا کیا ہے، لیکن اس فن طنز و مزاح کو جب ہم آزادیٔ ہند سے جوڑ کر دیکھتے ہیں تو بادی النظر پہلا سوال یہ قائم ہوتا ہے کہ طنز و مزاح تو ہنسنے ہنسانے کا فن ہے آزادیٔ ہند جیسے پر آشوب، پر فتن و آزمائش بھرے دور میں اس فن کا کیا کام ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ جو دور جدو جہد آزادی کے شباب کا ہے وہی دور فن طنز و مزاح کے عروج کا بھی ہے۔ پہلی جہد آزادی سے پہلے طنز و مزاح کے منتشر نمونے ہمیں قدیم ہجویات، شہر آشوب و قصائد وغیرہ میں ملتے ہیں، اس کے بعد غالب کے خطوط کی اشاعت' ڈپٹی نظیر احمد کے ناول مراۃ العروس اور سر سید کے انشائیے نے اس فن کے فروغ میں مزید کام کیا۔ تاہم 1857 کے بعد جب دلی کی پرانی بساط پلٹی اور ایک نئے نظام نے ہندوستانی معاشرے کو اپنی گرفت میں لیا، حاکم قوم محکوم ہوگئی اور برطانوی سامراجیت کے زیر اثر تہذیبی' علمی و فکری غلامی کا احساس ستانے لگا' تو نتیجے میں خود احتسابی کا عمل شروع ہوا۔ ایسے حالات میں 1877 میں اودھ پنچ کا قیام عمل میں آیا۔ جس نے فن و طنز و مزاح کی با قاعدہ بنیاد ڈالی۔

اودھ پنچ کی طنزیہ ومزاحیہ تحریروں' کارٹونوں اور مختلف کرداروں جیسے حاجی بغلول، طرح دار لونڈی، احمق الدین وغیرہ نے وہ کام انجام دیا جو سنجیدہ تحریروں کے ذریعہ شاید اس وقت ناممکن تھا کیوں کہ اس پر آشوب عہد میں شکست خوردہ نفسیاتی کیفیت عام ہندوستانی عوام کا شعار بن چکی تھی۔ معمولی معمولی باتوں پر گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا جاتا۔ آزادی میں حصہ لینے یا کسی بھی طرح جدوجہد کرنے والوں کو علی الاعلان پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا جاتا' صحافتی آزادی کو سلب کر لیا گیا تھا اور اظہار خیال کی آزادی پر پہرہ بٹھا دیا گیا تھا۔ ایسے مشکل دور میں بھی اردو کے شعرا و ادبا آزادی ہند کی عظیم ذمہ داری سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹے' انھوں نے فن طنز و مزاح کو بطور ہتھیار استعمال کیا اور انگریزی مظالم کو بے نقاب کر کے عوام کو جدوجہد آزادی کے لیے ابھارا۔ یہ ایک ایسا خاموش ہتھیار تھا جس کی تہہ تک رسائی بغیر فن کی باریکیوں پر عبور کے' غیر ملکیوں کے لیے ممکن نہ تھا۔ بقول پرفیسر نثار احمد فاروقی:

''طنز و مزاح بے معنی ہنسی کا نام نہیں ہے یہ گہرے عرفان ذات یا معاشرے کے شعور سے پیدا ہوتا ہے۔''(۱)

اودھ پنچ کا اجرا منشی سجاد حسین کی ادارت میں ایسے وقت میں ہوا جب جدوجہد آزادی کی لو تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی انگریزوں کے مظالم کا دائرہ بھی بڑھتا جا رہا تھا فکر و عمل' نقل و حرکت کے ساتھ ہر چیز کی نگرانی اور مخبری کی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا محمد مرتضیٰ عرف مچھو بیگ عاشق ''اودھ پنچ'' میں 33 سال تک قلمی نام ''ستم ظریف'' سے مضامین لکھتے رہے۔ خود ''اودھ پنچ'' کے ایڈیٹر کے بارے میں ڈاکٹر ضیاء الدین فرماتے ہیں:

''منشی سجاد حسین نے طنز و مزاح کے پیرائے میں برطانوی حکومت کی کوتاہیوں اور بدعنوانیوں کا پردہ ایسے دور میں فاش کیا جب کہ سیاسی رہنماؤں کے لیے لب کشائی مشکل تھی انہوں نے انگریزوں کی عمل داری کی ان پالیسیوں کے خلاف لکھا جو عوام کے منافی تھیں یہ مضامین طنز و مزاح کے پیرائے میں لکھے گئے اس لیے قانون کی گرفت میں بھی نہیں آسکے اور استہزا بھی برقرار رہا۔'' (2)

اودھ پنچ اگرچہ ایک مزاحیہ اخبار تھا لیکن سنجیدہ اور سیاسی مسائل پر اس کا اپنا مخصوص نقطۂ نظر تھا۔ بے خوف و خطر اور مصلحتوں سے بالاتر ہو کر یہ جس بات کو سچ سمجھتا تھا طنز و مزاح کے پیرائے میں لکھتا تھا۔ وہ اپنے عصری سیاسی معرکہ آرائیوں اور سماجی خرابیوں سے بے خبر نہ تھا، سیاسی پنجہ آزمائی ہو یا سماجی مسائل کی عقدہ کشائی، یا پھر حکومت وقت کی بے جا مداخلت اور انگریزوں کے مظالم کو طشت از بام کرنا' اس نے اپنے طنز و مزاح میں جگہ دی۔

اس سلسلے کی ایک کڑی اکبرالہ آبادی بھی ہیں جنھوں نے شعری طنز و مزاح اور تحریفات کے ذریعہ معاصرانہ سماجی' سیاسی و معاشی مسائل کو موضوع بنایا، مغربی تہذیب و تمدن اور ان کی بے جا تقلید کرنے والوں کو ہدف ملامت بنایا اور انگریزوں کی حکومت اور طرز سیاست پر تنقید کی۔ ملاحظہ فرمائیں:

یہ بات غلط کہ ملک اسلام ہے ہند
یہ جھوٹ کہ ملک لچھمن و رام ہے ہند
ہم سب ہیں مطیع و خیر خواہ انگلش

یوروپ کے لیے بس اک گودام ہے ہند

اودھ پنچ کے طنز ومزاح کی روایت نے زور پکڑی، تو نئے لکھنے والے بھی سامنے آئے جن میں مہدی افادی محفوظ علی بدایونی، نیاز فتح پوری، سجاد یلدرم، سلطان حیدر جوش، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر اور ملا رموزی وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے جنھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں طنز ومزاح کے ذریعہ تحریک آزادی کی لو کو تیز کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد ''الہلال'' میں ایک کالم ''افکار وحوادث'' کے نام سے نکالتے تھے جس کی پیروی بعد میں ظفر علی خان نے ''زمیندار'' میں بھی کیا۔ طنز و مزاح کے باب میں مولانا آزاد کے اس کالم کا سیاسی لہجہ بڑا بے باک تھا جس کے ذریعہ مولانا ابوالکلام آزاد اکثر و بیشتر نازک سیاسی معاملات پر اپنے مخصوص انداز میں طنز کرتے تھے۔ گرچہ اس میں مزاح کا فقدان تھا لیکن طنز کے گہرے تیر کے سبب اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

> ''سب سے پہلے تو ہم اپنے تئیں مبارکباد دیتے ہیں کہ ہز آنر (سمر جیمز مسٹن) کی زبان مبارک بھی خدا کے لفظ سے نا آشنا نہیں، ستم زدگا دن کانپور کا ذکر کرتے ہوئے خدا انھیں یاد آ ہی گیا۔ الخ (3)

مولانا شبلی نے بھی ایک خاص انداز سے مسائل حاضرہ پر طنزیہ نظموں کا سلسلہ شروع کیا، ان کی یہ نظمیں زیادہ تر ''زمیندار، ہمدرد، اور الہلال میں چھپتی تھیں اور اپنی مخصوص جذباتی اپیل اور طنزیہ کیفیت کے باعث بہت مقبول تھیں، مثلاً ''کفران نعمت'' کے زیر عنوان شبلی نے لیگ پر جو طنز کی ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے

کہ طنز و مزاح کو حالات حاضرہ کے مطابق شعرا و ادبا نے بطور ہتھیار استعمال کیا ہے۔اس باب میں مولانا عبدالمجید سالک کو طنز و مزاح کے سلسلے میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے ان کا طنز بڑا شدید ہے ان کے طنز میں نہ صرف یہ کہ زہرناکی کا عنصر موجود ہے بلکہ مزاح کی فراوانی بھی ہے۔انھوں نے سیاسی واقعات کے مضحک پہلوؤں کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ بیان کیا ہے مثلاً 4 مئی 1937 کے ''انقلاب'' میں ''افکار و حوادث'' کے کالم میں انھوں نے لکھا ہے

> ''جب ہندوستان کے مسلمانوں کو کانگریس سے بدگمانی پیدا ہوگئی تو بعض مقامات پر کانگریسی ذہنیت کے مسلمانوں نے ایک نیا چولا بدلا،انھوں نے عام مسلمانوں کی ہم آہنگی تو اختیار کی لیکن کانگریس سے اپنا تعلق بڑی حد تک توڑ لیا اور آزاد مسلم پارٹی، مسلم انڈی پنڈنٹ لیگ،آزاد مسلم لیگ، ریڈیکل مسلم لیگ،مجلس احرار وغیرہ نام سے جماعتیں بنالیں۔یعنی کانگریس کے ہم آہنگ بھی رہے اور فرقہ وارانہ اصول پر قائم بھی ہوگئے۔ (4)

جنگ آزادی کے باب میں مولانا ظفر علی خاں کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔تحریک آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں کوئی بارہ سال قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی۔اپنے والد کے اخبار ''زمیندار'' کے وارث بنے تو اس اخبار کے ذریعہ انگریزی مظالم کا پردہ فاش کیا ہے اور ہر موڑ پر انگریزی حکومت کی مخالفت کی۔رولٹ ایکٹ اور سائمن کمیشن کے خلاف اس طرح صدائے احتجاج بلند کی۔

آگے لکھتے ہیں:

اگر ہندوستان کو نعمت آزادی کی حاصل ہو
تو مکھن توس کا برطانیہ میں کال ہو جائے

غالب کے شعر کی تحریف کرتے ہوئے حالات حاضرہ کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:

قید فرنگ و بند و زیست فرق سے بے بیاز ہیں
موت سے پہلے آدمی جیل سے باہر آئے کیوں

(7)

تحریک آزادی کے دوران طنز و مزاح کی یہ صورتیں دوسرے شعرا و ادبا کے یہاں بھی مل جاتی ہیں جو ہمیں گہرے غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں کہ کیسے جب انسان مایوسی کے اندھیرے میں گھر جاتا ہے تو اس کے جذبات کا اظہار اکثر طنز کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

اس مقالے میں تحریک آزادی کے سلسلے میں طنز و مزاح کی جو مرقع سازی کی گئی ہے وہ بطور نمونہ ہے۔ ورنہ تحریک آزادی میں دیگر فنون و اصناف کی طرح فن طنز و مزاح کا ایک بڑا حصہ ہے ہاں یہ اور بات ہے کہ کہیں طنز کا پلڑا بھاری ہے اور کہیں مزاح کا۔ اگر گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو بلا شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے ادیبوں نے اسے بطور ہتھیار استعمال کیا ہے ایک ایسا ہتھیار جس میں وقت کی ''آہ'' چھپی ہوئی ہے جسے گہرائی سے سمجھنے، محسوس کرنے اور غور فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

حواشی

(1) اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت/خالد محمود/اردو اکادمی دہلی۔ص:119

(2) تحریک آزادی اور اردو نثر/ڈاکٹر ضیاء الدین راجستھان وقف بورڈ۔ص:101

(3) اردو ادب میں طنز و مزاح/روزیر آغا/ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس علی گڑھ، 1990ء ص:377۔

(4) اردو ادب میں طنز و مزاح/روزیر آغا/ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس علی گڑھ، 1990ء ص:(386)۔

(5) کلام طنز و مزاح/فاروق ارگلی/فرید بک ڈپو لمیٹیڈ نئی دہلی۔ص:97

☆☆☆☆☆

جدو جہد آزادی ہند اور جوشؔ

سنمتر نوگھڑے
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، ممبئی یونیورسٹی، ممبئی

بھارت کی مختلف زبانوں میں اہم ترین زبان اردو ہے۔ ابتدا ہی سے اردو میں سماجی، سیاسی اور قومی جذبہ دیکھنے کو ملتا ہے، قومی رجحان قومی شعور کے پس منظر میں ابھرتا ہے۔ قومی یکجہتی اور تحریک آزادی کے لیے کئی شاعروں نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ جن میں شبلی نعمانی، علامہ اقبال، برج نراین چکبست، حسرت موہانی، مجاز لکھنوی، شمیم کرہانی، جگن ناتھ آزاد، تلوک چند محروم، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری، اور جوش ملیح آبادی کے نام قابل ذکر ہیں۔ جس دور میں غلامی اپنے عروج پر تھی، غربت اپنے افق پر، بے بسی مقدر میں اور لاچاری جسم میں لہو کی مانند جم چکی تھی، اس دور میں جوش ملیح آبادی نے اپنی شاعری کے ذریعے بھارتیوں میں آزادی کا جذبہ بیدار کیا اپنی شاعری کے ذریعے انھوں نے مُردوں کی بستی میں سانسیں بیچنے کا کام کیا۔ جیسے ان کے نام میں جوش ویسے ہی ان کی شاعری میں بھی جوش اور انقلاب تھا اسی بنیاد پر انہیں شاعر انقلاب اور شاعر شباب بھی کہا جانے لگا۔

غلام شبیر حسن خاں نام اور تخلص جوشؔ تھا۔ ان کے والد بشیر احمد خان بڑے شاعر تھے۔ جوشؔ جاگیردار خاندان میں پیدا ضرور ہوئے مگر انہوں نے جاگیردارانہ نظام کو ہمیشہ ظلم و استحصال کا سرچشمہ قرار دیا۔ حیدرآباد کے قیام کے دوران انہوں

نے نظام حیدرآباد کے خلاف نظم کہی جس کی وجہ سے انہیں حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ان کے دور میں سیاسی بیداری دیکھنے کو ملتی ہے۔وہ اس وقت کے بھارت کے ناسازگار حالت سے بخوبی واقف تھے۔ بھارت ورش کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔سرمایہ دارانہ نظام اور ظلم ڈھانے والوں کی سخت مخالفت کیا کرتے۔قوم کی پسماندہ حالت اور تہذیبی زوال سے بہت متاثر تھے۔جوشؔ کی باغیانہ شاعری میں خصوصاً سیکولر پہلو پایا جاتا ہے۔

بقول علی سردار جعفری:

''جوش سو فیصد رومانوی شاعر ہے،اوران کا انقلاب اور تخیل بھی رومانوی ہے۔جس کا اثر بہت زیادہ ہے اور انتہائی پر جوش ہے اور جذبات کے طوفان میں بہے جاتا ہے۔''

جوشؔ ہندوستانی نوجوانوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے پیغام دیا کہ ہندوستان کی آزادی میں فرقہ پرستی رکاوٹ بن رہی ہے جس کے لئے بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔آزادی کے بعد انہیں بھارت کی حکومت نے پدم بھوشن اعزاز سے نوازا۔جوشؔ نے حسن وعشق کے نغمے بھی گائے اور آزادی اور انقلاب کے ترانے بھی سنائے۔جوشؔ کی ایک نظم ''نظام نوع'' کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے ادب اور ماحول کے سینے کو انقلاب کی سرخی سے لبریز کر دیا تھا۔ بھارتیوں کے دل ودماغ میں آزادی کا جنون وجذبہ پیدا کیا تھا۔وہ ایک حوصلہ مند شاعر تھے ان میں قوم کو بیدار کرنے کا نیک جذبہ تھا۔ان کی شاعری کی بنیاد ہی سیکولرزم تھی جس میں وہ انسان کو صرف اور صرف انسان ہی سمجھتے۔وہ انسانیت کے شاعر ہیں اور ہمدرد دل کے مالک ہیں۔ان کا انداز دلکش ہے دلفریب بھی جو ہر

ایک کو اپنی طرف راغب کرتا ہے حقیقت نگاری جذبات نگاری انسانی زندگی کے ہر پہلو کی ترجمانی کرتے ہیں جمالیاتی پہلو بھی ان کی شاعری میں عروج پائے ہیں۔فکری اور فلسفیانہ پہلو بھی ان کی شاعری میں نمایاں ہیں۔اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جوشؔ ملیح آبادی کا شمار اردو کے مشہور شاعروں میں ہوتا ہے۔ جوشؔ کی سیاسی اور انقلابی شاعری کا زمانہ 1925ء کے بعد کا مانا جاتا ہے۔ پروفیسر محمود الٰہی کے مطابق ان کی پہلی سیاسی اور انقلابی نظم دسمبر 1921ء میں شائع ہوئی۔ جو تحریک خلافت کا زمانہ تھا جس میں بھارتی عوام بڑے جوش وخروش کے ساتھ گرفتار ہو رہے تھے۔

ہوئے ہیں قوم کے سردار داخل زنداں
خدا کرے انھیں پہنچے نہ دشمنوں سے گزند

گناہ یہ ہے پیرو ہے اپنے مذہب کے
خطا یہ ہے کہ وہ حکمِ خدا کے ہیں پابند

قصور یہ ہے کہ رکھتے ہیں دل میں قوم کا درد
یہ جرم ہے کہ ہیں بھارت کے نامور فرزند

بہت ہی طیش ہے اس بات پر حکومت کو
غلام ہو کے خیالات اس قدر ہیں بلند

مقدمات کا تماشا دکھا کے دنیا کو
کیا ہے مالک تھیٹر نے سب کو جیل میں بند

جوشؔ کا جذبۂ بغاوت ہے جو زندگی کے ہر موضوع پر چھایا ہوا ہے۔ جوشؔ کا دور انگریزی حکومت سے بغاوت کا دور تھا، کیونکہ اس دور میں برطانوی اقتدار بھارت پر پوری طرح تپ دق کی طرح پھیل چکا تھا جس کے زیر اثر ملک کے اندر سیاسی سماجی، معاشی و تہذیبی سطح پر بڑی مقدار میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جوشؔ نے اپنی شاعری کے ہر دور میں ان موضوعات پر کچھ نہ کچھ کہا ہے اور صرف کہا نہیں ہے بلکہ موثر طور پر کہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جوشؔ نے تقریباً ایک لاکھ اشعار کہے ہیں یہ کوئی ضروری نہیں کہ کمیتِ شعر سے شاعر کی حیثیت کا تعین کیا جائے انہوں نے ایسی نظمیں کہیں جو ان کی شاعری کو ابدی زندگی عطا کرتی ہیں۔ ان کی چند نظموں کسان ،صحن چمن ،شکست زنداں کا خواب، گرمی اور دیہاتی بازار، بدلی کا چاند، نقادو غیرہ میں ان کے جذبہ بغاوت کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ ان کا یہ جذبہ ہنگامی نہیں بلکہ آج بھی پایا جاتا ہے اور جب تک انسان کا استحصال ہوتا رہے گا اسے زندگی جینے کا موقع نہیں دیا جائے گا اس جذبے کی افادیت اور اثر آفرینی باقی رہے گی۔ جوشؔ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اس جذبے کو کبھی سرد نہیں ہونے دیا انہوں نے ہر موقع پر ایسے اشعار اور نظمیں پیش کی ہیں کہ انہیں آج تک شاعر انقلاب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اپنے ذہنی انقلاب سے جوشؔ کس طرح ملک کی انقلابی صورتِ حال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور پھر کس طرح ان کی انقلابی شاعری کو ان حالات سے غذا ملتی رہی ہے، کس طرح جوشؔ ملک میں آنے والے انقلاب کی طرف قدم بقدم بڑھتے

رہے ہیں وہ نقوش آج بھی گہری چھاپ چھوڑتے ہیں ان کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

اور

خواب کو جذبہ بیدار دیے دیتا ہوں
قوم کے ہاتھ میں تلوار دیے دیتا ہوں

ان کی نظموں میں ہمیں بغاوت کی گونج نہایت صاف سنائی دیتی ہے۔ ایسی گونج جو اپنی صدا سے فرنگیوں کے حوصلے چور چور کر کے رکھ دیے۔ ''شکست زندہ کا خواب'' میں تو ایسے اشعار ہیں جو انگریزی حکومت کو کھلا چیلنج دیتے ہیں ملاحظہ ہوں۔

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے، توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے سجدے میں پڑی ہیں تعبیریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں دوڑو کہ وہ ٹوٹی زنجیریں

جوشؔ ملیح آبادی کے کچھ اشعار ایسے ہیں جو 21ویں صدی کے ہی معلوم ہوتے ہیں وہ اشعار آج بھی اس فضا میں سانس لیتے ہیں کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

اٹھائے گا کہاں تک جوتیاں سرمایہ داروں کی
جو غیرت ہو تو بنیادیں ہلا دے شہر یاروں کی

ازل سے نوعِ انسانی کے حق میں طوقِ لعنت ہے
کسی ہم جنس کے چوکھٹ پے عادت سر جھکانے کی

نہ ہو معذور اگر مائل یہ نرمی بھی ہو سلطانی
کہ یہ بھی ایک صورت ہے غافل بنانے کی

گئے وہ دن کہ تو زنداں میں جب آنسو بہاتا تھا
ضرورت ہے قفس پر اب تجھے بجلی گرانے کی

جوشؔ انسانیت کے عاشق ہیں انھوں نے اپنے سماجی شعور کے تحت اپنے معاشرے کی بہت سی برائیوں اور مسائل کی تصویر کشی کی ہے ان کی قومی نظموں میں غلاموں، غریبوں، سرمایہ داروں، ساہوکاروں کی حقیقی تصاویر کھینچی ہیں۔ اپنی شاعری کی چنگاری کے ذریعے ایسی آگ لگائی جس نے برطانوی حکومت کی بنیاد ہلا کر رکھ دی۔

آیا وہ انقلاب آیا جاگو
فرمان شکستہ خواب آیا جاگو
اے ہند کے بدنصیب سونے والوں
سر پر وہ آفتاب آیا جاگو۔۔۔۔

☆☆☆☆☆

جدوجہد آزادی ہند اور مولانا ابوالکلام آزاد کا کردار

ڈاکٹر نورالنساء محمد سعدالدین صدیقی

ناندیڑ، مہاراشٹر

شہرت اور ہر دلعزیزی کا حصول موجودہ دور میں ممکن ہے کچھ آسان ہو گیا ہے لیکن شعبہ ہائے حیات کے چند پہلو ایسے بھی ہیں جہاں شہرت و مقبولیت، عزت وقار اور عوامی مقبولیت حاصل کرنے والی بعض شخصیات ایسی ہیں جن کی ہر دلعزیزی اور شہرت میں دن بہ دن اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ اگر چہ ان شخصیات کو گذرے ہوئے دس بیس دہائیاں گذر چکی ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا ہر لفظ ایک قول اور ہر قدم ایک پسندیدہ اور قابل تقلید عمل سمجھا گیا ہے اور آج بھی وہ شخصیات محترم اور مکرم ہیں۔ اردو ادبیات کی تاریخ پر دیانت دارانہ محتاط نظر ڈالیں تو مولانا ابوالکلام آزاد اردو ادب کے لئے بیش بہا دولت سے کم نہیں۔ مولانا ابوالکلام کو اس دنیا سے کوچ کئے ہوئے ایک طویل مدت گذر چکی ہے لیکن ان کا فن زندہ اور تابندہ ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا اصل نام محی الدین احمد، لقب ابوالکلام اور قلمی نام آزاد ہے۔ ان کا آبائی وطن دہلی تھا۔ مگر ولادت ۱۸۸۸ء میں مکّہ معظّمہ میں ہوئے۔ انتقال ۱۹۵۸ء میں دہلی میں ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ادب، مذہب اور سیاست میں قابل رشک مقام حاصل کیا۔ خطابت و صحافت میں ان کا رتبہ بلند ہے۔ ان کے مضامین اور اداریے قارئین کے دلوں میں ہلچل پیدا کر دیتے تھے۔ آزاد کی تحریریں اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ مولانا نے کم عمری سے سیاست اور صحافت کی

طرف توجہ کی۔ بیدار ذہن، شعلہ بار دہن اور جوہر بار قلم رکھتے تھے، اس لئے ان کی شہرت بہت جلد چاروں طرف پھیل گئی۔ آپ ملک کی آزادی سے بھی وابستہ ہو گئے۔ آپ کی زندگی کا نہایت بیش قیمت زمانہ جیل میں گذرا۔

تحریکِ آزادی کو تقویت دینے کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد نے یکے بعد دیگرے دو رسالے 'الہلال' اور 'البلاغ' جاری کئے۔ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو مولانا آزاد نے 'الہلال' نام سے رسالہ جاری کیا جس نے اردو صحافت میں انقلاب پیدا کر دیا۔ 'الہلال' میں سیاسی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو پریس ایکٹ نے دو ہزار کی ضمانت طلب کی۔ کچھ عرصے بعد یہ ضمانت ضبط کر کے دس ہزار کی ضمانت طلب کی۔ مولانا نے یہ رقم بھی جمع کر دی۔ حکومتِ بنگال نے جب دیکھا کہ مولانا پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا تو اس نے 'الہلال' پریس ضبط کر لیا اور مولانا آزاد کو بنگال سے نکلنے کا حکم دیا۔ مجبوراً مولانا آزاد رانچی چلے گئے۔ کچھ عرصے بعد حکومت نے مولانا کی نظر بندی کے احکام جاری کر دیے۔ اسی شہر میں مولانا آزاد کو فرصت اور ذہنی سکون ملا۔ انگریز حکومت کی نظر میں رانچی میں مولانا کا قیام سزا تھی جو انھیں بغاوت کے الزام میں دی گئی تھی لیکن مولانا کے لئے یہ بہت بڑی نعمت تھی۔ مولانا نے رانچی میں فرصت کو غنیمت جان کر 'ترجمان القران'، 'الصوٰۃ'، 'الزکوٰۃ' 'الحج' نامی فقہ اسلامی پر اہم رسالے لکھے۔ بقول مولانا آزاد ایک مدت سے جس فراغ خاطر اور آزادیِ فکر و عمل کو طبیعت ڈھونڈتی رہی، وہ ملی بھی تو جلاوطنی اور نظر بندی کی شکل میں۔

''دنیا نے جلاوطنی اور نظر بندی کی خبر سنی اور دل نے خلوت گزینی و گوشہ گیری کی دولت و سعادت پائی''۔

(جمشید قمر۔مولانا آزاد کا قیام رانچی۔احوال وآثار)

یکم جنوری ۱۹۲۰ کو مولانا آزاد کو رہا کر دیا گیا۔اس زمانے میں گاندھی جی خلافت تحریک کی رہنمائی کر رہے تھے۔مولانا گاندھی جی کے ساتھ ہو گئے۔مولانا آزاد نے دہلی ،کراچی ،بمبئی اور آگرہ میں خلافت تحریک کے حق میں تقریریں کیں۔۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ کو انھیں گرفتار کر لیا گیا۔یکم جنوری ۱۹۲۱ کو مولانا آزاد رہا ہوئے ۔مولانا آزاد نے کانگریس کا باقاعدہ رکن بن کر کام شروع کیا۔ ۱۹۱۳ میں کانگریس کا خاص سیشن ہوا جس کی صدارت مولانا آزاد نے کی ۔کانگریس کے اب تک جتنے صدر منتخب ہوئے تھے ان میں مولانا آزاد سب سے کم عمر تھے ۱۹۳۰ میں نمک ستیہ گرہ تحریک کے سلسلے میں مولانا آزاد کو ایک بار پھر گرفتار کر لیا گیا۔آپ ایک سال سے زیادہ جیل میں رہے۔۱۹۳۹ میں مولانا آزاد کانگریس کے باقاعدہ صدر منتخب ہوئے۔

۱۹۴۲ میں کانگریس نے برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ ہندوستان چھوڑ دے۔اس تحریک کا نام 'ہندوستان چھوڑ دو' تحریک تھا۔حکومت نے کانگریس کے تمام اہم رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔مولانا کو ۹ اگست ۱۹۴۲ کو گرفتار کر کے احمد نگر کی جیل میں بھیج دیا گیا۔۱۵ جون ۱۹۴۵ کو مولانا آزاد کو رہا کر دیا گیا۔احمد نگر جیل میں مولانا آزاد نے جو خطوط لکھے وہ بعد میں غبارِ خاطر کے نام سے شائع ہوئے۔

برطانوی حکومت نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں ایک کیبنٹ مشن ہندوستان بھیجا جائے۔یہ مشن ۲ اپریل ۱۹۴۶ کو دہلی پہنچا۔مولانا نے کانگریس کے صدر کی حیثیت سے کیبنٹ مشن سے بات کی اور آزادی کی شرطیں طے کیں۔۷ جولائی ۱۹۴۶ کو کانگریس کے بمبئی اجلاس کے موقع پر کانگریس کی

صدارت سے استعفیٰ دے کر اس عہدے کے لیے پنڈت نہرو کا نام پیش کیا۔ مولانا آزاد کا استعفیٰ منظور کر لیا گیا اور پنڈت نہرو کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ مولانا آزاد ۹ سال آٹھ مہینے قید خانے میں رہے۔ بقول مولانا آزاد ان کی زندگی کا ہر ساتواں دن قید خانے میں گزرا۔

مولانا آزاد کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ وہ ایک مذہبی رہنماء تھے۔ مذہب پر ان کی کئی کتابیں شائع ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ جنگِ آزادی کے مجاہد بھی تھے۔ اُن کا نام گاندھی جی اور پنڈت نہرو کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ گاندھی جی اور پنڈت نہرو مولانا آزاد کی دانشوری اور سیاسی بصیرت کے قائل تھے۔ تحریکِ آزادی کو تقویت دینے کے لئے مولانا آزاد نے دو رسالے جاری کئے جن کے نام 'الہلال' اور 'البلاغ' ہیں۔ ان میں مولانا آزاد کے اداریے اور مضامین شائع ہو کر سارے ملک میں تہلکہ مچا دیتے تھے اور انگریزوں کا ایوانِ حکومت لرز اٹھتا تھا۔ اس لئے بار بار رسالے کی ضمانت ضبط ہو جاتی تھی مگر مولانا آزاد کے پائے استقامت کو ذرا بھی جنبش نہیں ہوتی تھی۔ مولانا آزاد کی تحریر و تقریر دونوں جوش سے لبریز ہوتی تھی۔ جملے اکثر لمبے ہو جاتے تھے مگر ربط و تسلسل میں کمی آتی تھی نہ کہیں عبارت میں جھول پیدا ہوتا تھا۔ پنڈت نہرو نے ''ڈسکوری آف انڈیا'' میں لکھا ہے کہ آزاد نے یہ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اسلام اور انڈین نیشنلزم میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

(پنڈت نہرو ڈسکوری آف انڈیا صفحہ ۲۸۹)

مولانا آزاد کے مضامین میں عربی فارسی الفاظ کی کثرت پائی جاتی ہے، مگر اس اس سے زورِ بیان میں اضافہ ہوتا ہے۔ علمی اور فلسفیانہ اصطلاحات بھی جگہ جگہ

نظر آتی ہیں۔ دراصل علمیت مولانا آزاد کی شخصیت کا لازمی حصہ ہے اور ان کی تحریروں میں جلوہ گر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ قرآن وحدیث کے حوالے بھی مولانا آزاد کے تحریر میں پائے جاتے ہیں جس سے ان کی نثر بہت باوقار ہو جاتی ہے۔ مولانا آزاد ایک زبردست انشاء پرداز ہیں۔ مختلف اسالیب پر انھیں قدرت حاصل ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں بہت تاثیر ہے۔

'الہلال' کی باہمت اور حوصلہ بخش تحریروں سے ہر کوئی واقف ہے۔ اس ہفتہ وار رسالے نے مسلمانوں کے دلوں میں آزادی کا جوش اور جان و مال کی ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا کیا۔ باغیانہ تحریریں شائع کرنے کے جرم میں مولانا آزاد کو قید و بند کی صعوبتیں اٹھانی پڑی اور دوسری آزمائشوں سے بھی دوچار ہونا پڑا۔

'الہلال' میں مختلف عنوانات پر مضامین شائع کئے جاتے تھے ان میں سے ایک عنوان ''الحریت فی الاسلام'' بھی تھا۔ اس عنوان کے تحت جو مضامین اور خبریں شائع ہوتے تھے ان کا مقصد یہ تھا کہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہندوستان کے لوگوں کو زندگی میں حریت کے مقام و مرتبہ سے واقف (روشناس) کرایا جائے۔ اس بلند مقام تک پہنچنا ایثار و قربانی کے بعد ہی ممکن ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے 'الہلال'، 'البلاغ' میں وہ مضامین بھی قلمبند کئے ہیں جنھوں نے آزادی کی جدوجہد میں تیزی اور گرمی پیدا کی۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر اپنی کتاب 'تاریخِ ادب اردو' میں یوں رقمطراز ہیں۔

> ''اپنے ایک مضمون میں ''الہلال'' کی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا آزاد نے خود کو ''ہندوستان کی اسلامی تحریک کا داعی'' اور

''سیاسی مسلک میں انقلاب برپا'' کرنے والا شخص قرار دیا تھا''۔

(تاریخِ ادب اردو (ڈاکٹر سیدہ جعفر)، جلد سوم، صفحہ ۱۲۶)

مولانا ابوالکلام آزاد نے قرآنی آیات اور مذہبی احکام سے یہ ثابت کیا ہے کہ آزادی کی تحریک میں حصہ لینا اور غلامی کے خلاف جدوجہد مسلمانوں کا سماجی اور قومی فرض ہی نہیں ان کا مذہبی حق بھی ہے۔ اپنے ایک مضمون میں مولانا آزاد لکھتے ہیں۔

''یاد رکھیے ہندوؤں کے لئے ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے مگر آپ کے لئے ایک فرض دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ''۔

(تاریخِ ادب اردو ڈاکٹر سیدہ جعفر جلد سوم صفحہ ۱۲۷)

''الہلال'' اور ''البلاغ'' میں مولانا آزاد کی شخصیت ایک مصلح اور رہنما کی حیثیت سے اُبھرتی ہے، اس لیے ان ہفت روزہ رسالوں میں مولانا کی نثر میں خطابت یا تقریر کا انداز زیادہ ہے۔ دوسری نثری کتابوں میں مولانا کی علمی قابلیت، ذہانت اور دانشوری جلوہ گری نظر آتی ہے۔ مولانا آزاد کے ''الہلال'' کی انقلابی تحریروں نے برطانوی حکومت کی بنیادیں ہلانی شروع کر دی تھیں۔ برطانوی حکومت ''الہلال'' مین شائع ہونے والی مولانا آزاد کی تحریروں سے خائف ہوگئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کا ایک بڑا حصہ جدوجہدِ آزادی میں گذرا اور ان کا شمار ملک کے چوٹی کے قائدین میں ہوتا ہے۔ نوعمری کے دور سے ہی مولانا آزاد اپنی غیر معمولی ذہانت اور علم دوستی کی وجہ سیاردوادب میں ممتاز تصور کئے جاتے ہیں۔ مولانا آزاد کی تمام تر زندگی ملک اور قوم کی خدمت میں گذر گئی۔ آزادی سے قبل تحریکِ آزادی میں

سرگرم حصہ لیا، مسلمانوں کی قیادت کی۔ ہندو مسلم اتحاد کے لئے دل و جان سے کام کیا اور آزادی کی خاطر قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں چنانچہ محرومی کا جملہ دور کوئی دس سال پر محیط رہا ہے۔ مولانا آزاد کی تحریر اور تقریر دونوں جوش سے بھرپور ہوتی تھیں۔

غرض امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے تحریروں، اپنی تقریروں کے ذریعہ نہ صرف تحریکِ آزادی کو تقویت بخشی بلکہ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ بحیثیت ایک سیاسی لیڈر و مجاہدِ آزادیا پنی زندگی وقف کردی۔ کانگریس کی صدارت کے دوران اپنی سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا۔ بعد میں سائنس اور کلچر کی زائد ذمہ داری بھی انہیں سونپی گئے ۱۹۵۲ء میں جب پہلے انتخابات عمل میں آئیتو اس کے بعد مولانا آزاد نے وزیر تعلیم، قدرتی وسائل اور سائنسی تحقیقات کیا ہم ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ ۱۹۵۷ء کے دوسرے عام انتخاب کے بعد انہوں نے دوبارہ وہی عہدے سنبھالے۔ ملک کی آزادی کے بعد وزیر تعلیم کی حیثیت سے جدید تعلیم، سائنس اور ٹیکنالوجی کے علاوہ ملک کی تہذیب و ثقافت کے فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

حواشی

۱) تاریخ ادب اردو از ڈاکٹر سیدہ جعفر

۲) ڈسکوری آف انڈیا از پنڈت نہرو

۳) جمشید قمر مولانا آزاد کا قیام رانچی۔ احوال و آثار

☆☆☆☆☆

جدوجہد آزادی ہند اور چکبست کی قومی شاعری

ڈاکٹر محمد اقبال وانی
ہنڈوارہ، سری گر (جموں کشمیر)

بقول ڈاکٹر محمد زمان آزردہ:

''ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی جنگ یوں تو کئی محازوں پر لڑی گئی مگر اس جنگ میں جس ہتھیار کا استعمال سب سے زیادہ ہوا وہ زبان اردو ہے۔اس میں اردو صحافت اور اردو شاعری خاص طور سے 'نظم' پیش پیش ہے''

ہندوستانیوں میں آزادی کے جذبے کو ابھارنے کے لیے اور اپنے وطن کی سرزمین پر جو غاصب قبضہ کئے ہوئے تھے ان سے نفرت پیدا کرنے کے لیے جن نظم نگاروں نے حصہ لیا ان میں برج نرائن چکبست کا نام نامی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

بقول پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب:

''چکبستؔ نے مختلف موضوعوں پر نظمیں کہی ہیں مگر ان کی بنیاد جس جذبے پر قائم ہے وہ وطن کی محبت اور اہل وطن کی بہبود کی خواہش ہے۔چکبستؔ نے اپنی نظموں کے مجموعے کا نام ''صبح وطن'' رکھا ہے۔اس سے بھی اسی بنیادی جذبے کا اظہار ہو رہا ہے۔چکبستؔ حقیقی وطنیت اور صحیح قومیت کے علمبردار تھے۔''

چکبستؔ کی شاعری میں وطن پرستی خوب ملتی ہے۔ان کی شاعری مجاہدین

آزادی کے جذبات کو ابھارتی ہے۔خاص طور پر ان کی نظمیں مسلسل وطن پرستی کے گیتوں اور راگوں سے پُر نظر آتی ہیں۔ملک کی خدمت اور ملک پے جان دینے کے لیے ہر وقت تیار رہنے والے افراد کے نام برج نرائن چکبستؔ نے کچھ ایسے اشعار بھی کہے ہیں جو آج بھی ہمارے لیے درس وعبرت اور سبق آموز ہیں۔

ساحل ہند سے جرارِ وطن جاتے ہیں
کچھ نئی شان سے جانباز کہن جاتے ہیں
ان کی رگ رگ میں ہیں پیوست شجاعت کے چلن
ان کا میدان ہی ان کے لیے ماں کا دامن
جس گھڑی معرکۂ جنگ میں ہو تیغ علم
سورما لڑتے ہیں اس طرح پکار سے عالم
یا ظفر یاب تمہیں دیکھ کے دل ہو بشاش
آئے یا سوئے وطن خون میں ڈوبی ہوئی لاش

بقول محمد زماں آزردہ:

''چکبستؔ نے ایک طرف تو اچھے ماضی، زوال پذیر حال اور خوش آئند مستقبل کی نشاندہی کی اور دوسری طرف ایک تو وطن کے گیت گا کے لوگوں کے دلوں میں اس سے محبت پیدا کرنے کی سعی کی، دوسرے وطن پرست لوگوں پر نظمیں کہکر ان کے کارناموں کو سراہا اور تیسری طرف وطن کے دشمنوں کے غاصبانہ ارادوں اور منافقانہ عمل کی مخالفت کر کے لوگوں کے دلوں میں ان کی نفرت پیدا کر دی''

ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد، اتفاق، بھائی چارہ اور جذبے کے سامنے حکومت کے ہتھکنڈے ڈھیلے پڑ گئے۔ اس اتحاد و اتفاق کو ختم کرنے کے لیے انگریزوں نے Divide and Rule کی پالیسی اپنائی جو کافی حد تک موثر ثابت ہوئی۔ جس سے ہندوستان کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس اتحاد و اتفاق کو قائم رکھنے کے لیے چکبستؔ نے جگہ جگہ ہندو کو مخاطب کر کے اس کو صحیح بات سمجھانے کی کوشش کی اور جہاں موقع ملا خود مسلمانوں سے خطاب کیا کہ انہیں اس حیثیت کو سمجھ کے اپنی ہستی کو قائم رکھنا چاہیئے۔ چکبستؔ ہندو اور مسلمانوں دونوں قوموں کے نوجوانوں کو للکارتے ہوئے کہتے ہیں:

بھنور میں قوم کا بیڑا ہے ہندوؤں ہشیار
اندھیری رات ہے کالی گھٹا ہے اور منجدھار
اگر پڑے رہے غفلت کی نیند میں سرشار
تو زیر موج فنا ہوگا آبرو کا مزار

اسی طرح مسلم نوجوانوں کے خون کو گرماتے ہوئے کہتے ہیں:

دکھادو جوہر اسلام اے مسلمانوں
وقار قوم گیا قوم کے نگہبانوں
ستون ملک کے ہو قدر قومیت جانو
جفا وطن پے ہے، فرض وفا کو پہچانو
نبی کے خلق و مروّت کے ورثہ دار ہو تم
عرب کی شان حمیّت کے یادگار ہو تم

ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں تھیں۔ جنہوں نے جدوجہد آزادی کے لیے سب سے زیادہ قربانی دی۔ انہوں نے اپنے جذبہ اور ولولے سے حکومت کے ہتھکنڈوں کو پچھاڑ دیا۔ اس جذبے کو برقرار رکھنے کے لیے اور اس کو اور ہوا دینے کے لیے برج نرائن چکبستؔ براہ راست ان سے مخاطب ہوئے۔ ان اشعار کو دیکھکر لگتا ہے کہ چکبستؔ نے صرف مذہب کے نام پر درس نہیں دیا ہے بلکہ وہ آدمی کے دل کو موم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مرزا جعفر علی خان اثر بجا فرماتے ہیں:

> ''میرا عقیدہ ہے کہ صرف چکبستؔ ہی وہ قومی شاعر ہے جس نے کل ہندوستان کے جذبات اور ضروریات کی بلا امتیاز و تفریق مذہب ترجمانی کی ہے۔ وہ ہندو ہے اور اس کو ناز ہے کہ ہندو ہے۔ اس لیے کہ ہندو دھرم نے بڑے بڑے سُور بیر پیدا کئے' اسی طرح وہ مسلمانوں کو عزت کی نظر سے دیکھتا ہے کیوں کہ ان میں قاتل کو جام شربت دینے والے اور حق کی راہ میں سب کچھ لٹا دینے والے بھی ہوئے ہیں آپ اس کی ایک نظم بھی پیش نہیں کر سکتے جس سے ظاہر ہو کہ وہ ہندوؤں یا ہندو مذہب کو مسلمانوں یا اسلام سے بہتر سمجھتا ہے' بیشتر نظمیں ایسی ہیں جن میں فدائے ملک ہندوؤں کے ساتھ ان کے ہمسایہ مسلمانوں کا ذکر بالتزام ہے۔ اُس کے نزدیک دونوں ہند کی آنکھوں کے تارے ہیں۔''

چکبستؔ خود ایک سچے وطن پرست تھے اور سچے وطن پرست لیڈروں کی تعریف و توصیف کرتے ہیں۔ چکبستؔ نے وطن کی محبت سے سرشار لوگوں کا مرثیہ

کہہ کے غیرت قومی کو آواز دی۔ ان میں گنگا پرشاد ورما، گول کرشن گوکھلے، اقبال نرائن مسئلہ داد، بال گنگا دھرت تلک، گاندھی جی وغیرہ اہم ہیں۔ چکبستؔ گاندھی جی کو قوم کا سپائی اور بال گنگا دھر تلک کو قوم کی تلوار بتاتے ہیں۔

چکبستؔ کی شاعری ہماری تحریک آزادی کی اعتدال پسند اور مصلحانہ روش کی بہترین مظہر ہے۔ اردو شاعری کو تحریک آزادی کے اصلی رنگ اور صحیح مزاج سے آشنا کرانے کی اولیت شبلیؔ کے بعد چکبستؔ کو حاصل ہے۔ وہ نہ انتہا پسندوں کے ساتھ تھے نہ اعتدال پسندوں کے۔ وہ تلک کا اتنا ہی احترام کرتے تھے جتنا گوکھلے اور گاندھی کا۔ لیکن ان کی نکتہ سنج طبعیت نے تحریک آزادی کی ہندوستانی اعتدال پسندی، نرم گفتاری اور میانہ روی کو پالیا تھا۔ انہوں نے اپنی شاعری میں انھیں قدروں کو عام کیا ہے۔ ان کا یہ یقین کچھ ایسا غلط نہ تھا۔ کیوں کہ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہندوستان آزادی کی منزل تک پہنچا۔ چکبستؔ کے نزدیک ایک غلام قوم کے لیے وطن دوستی کی قدر سب قدروں سے اہم ہے اور ان کی شاعری کا قصر انھیں بنیادوں پر قائم ہے۔

چکبستؔ کی شاعری کا بڑا حصہ سیاسی اور وطنی قدروں کی ترویج کرتا ہے۔ وطن دوستی ان کے نزدیک ایمان کا درجہ رکھتی ہے۔ حالیؔ یا اقبالؔ اور چکبستؔ کی شاعری میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ حالیؔ یا اقبالؔ کے ہاں مذہب قدر اعلیٰ ہے جبکہ چکبستؔ اردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے وطن دوستی کو عظیم ترین قدر کی حیثیت سے اختیار کیا۔

☆☆☆☆☆



اردو ادب کے فروغ میں مذہبی ادب کا کردار

مرتبین

ڈاکٹر یس، محمد یاسر حافظ محمد سیفی عمری

Urdu Adab Ke Faroug mai Mazhabi Adab Ka Kirdar

اردو زبان و ادب کے ظرف میں بہت وسعت ہے۔ اسلامیات اور دیگر مذہبی لٹریچر کی اردو ادب میں بڑی اچھی کھپت ہوسکتی ہے، اس سے ہمارا ادب نہ صرف تازہ اور توانا بنے گا بلکہ زبان وادب سے عوام کی دلچسپی میں جو زبردست کمی دیکھنے کو مل رہی ہے یہ کمی بھی دور ہوجائے گی۔ آج مذہبی نظریات وتعلیمات میں عوام کی دلچسپی بڑھ رہی ہے، مذہب بے زاری کے بادل جو کمیونسٹوں کے گمراہ کن پروپگنڈہ سے عوام کے ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے وہ اب چھٹنے لگے ہیں۔ اردو ادب کو بھی ان زنجیروں سے چھٹکارا حاصل کرلینا چاہیے۔

پروفیسر قاضی حبیب احمد

9 788196 647209

Edited By:
Dr S. Mohamed Yassir
Hafiz Mohammed Saifi Oomeri

اردو ادب کے فروغ میں مذہب کا کردار

ڈاکٹر لیس محمد یاسر
حافظ محمد سیفی عمری

ناشر
شعبۂ اردو، سی عبدالحکیم کالج (خود مختار)
میل وشارم، ضلع رانی پیٹ، ٹمل ناڈو

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	:	اردو ادب کے فروغ میں مذہب کا کردار
مرتبین	:	ڈاکٹر یس محمد یاسر، حافظ محمد سیفی عمری
سنِ اشاعت	:	2023ء
صفحات	:	250
قیمت	:	300
ISBN	:	9 788196 647200
ناشر	:	شعبۂ اردو، سی عبدالحکیم کالج (خودمختار) میل وشارم، ضلع رانی پیٹ، ٹمل ناڈو موبائل نمبر: 9894014664

URDU ADAB KE FROUGE ME MAZHABI ADAB KA KIRDAR
Editors
Dr.S.MOHAMED YASSIR, HAFIZ MOHAMMED SAIFI OOMERI
Publisher
C.ABDUL HAKEEM COLLEGE (AUTONOMOUS)
MELVISHARAM - 632509 RANIPET DISTRICT,
TAMILNADU,INDIA

فہرست

شمار نمبر	مضامین	قلم کار	صفحہ
۱	عرضِ مرتب	حافظ محمد سیفی عمری	5
۲	مقدمہ	پروفیسر قاضی حبیب احمد	9
۳	اردو زبان وادب کے فروغ میں ادب کا کردار	پروفیسر خواجہ اکرام الدین	14
۴	اردو ادب کے فروغ میں مذہبی ادب کا رول	پروفیسر حدیث انصاری	22
۵	اردو زبان پر قرآن مجید کے اثرات	ڈاکٹر شیخ سعید احمد عمری	37
۶	اردو زبان میں قرآنِ کریم کی تفاسیر ایک مطالعہ	ڈاکٹر عظمی خاتون	45
۷	تفسیرِ اشرفی کا ادبی اعجاز	ڈاکٹر منظور احمد دکنی	52
۸	صحاحِ ستہ کے اردو تراجم کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر انیس الرحمٰن	56
۹	مذہبی تراجم کی تاریخ اور روایت	ڈاکٹر ابوبکر ابراہیم عمری	64
۱۰	اردو شاعری میں مناجات	ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری	70
۱۱	مذہبی ادب کے فروغ میں جامعہ دارالسلام کے فرزندان	ظہیر دانش عمری	81
۱۲	اردو ادب کے فروغ میں اسلامی ادب کا کردار	نذیر احمد عمری	90
۱۳	مذہبی ادب اور مولانا زاہد اعظمی عمری کی انشا پردازی	ڈاکٹر منیر الدین عمری	94
۱۴	'مرثیہ' اردو ادب کی ایک مذہبی صنف	ڈاکٹر امان اللہ	97
۱۵	اردو غزل میں تصوف، نمائندہ شعرا کے حوالے سے	معشوق احمد صدیقی	100
۱۶	اردو کے صوفی غزل گو شعرا	ڈاکٹر محمد آصف ملک	104
۱۷	اردو کے صوفی غزل گو شعرا	ڈاکٹر نذرین فاطمہ	111
۱۸	ولی کی شاعری میں تصوف	ڈاکٹر شیخ عمر آن	115
۱۹	'سکھ انجن' عارفانہ خیالات کی حامل مثنوی	ڈاکٹر نشاط احمد عمری	118
۲۰	مخزن العرفان میں مذہبی عناصر	ڈاکٹر محمد نقی اللہ خان	135
۲۱	مسدس حالی کا مذہبی تناظر	ڈاکٹر محمد ارشد ندوی	141
۲۲	مدوجزر اسلام میں اصلاحی رنگ	محبوب عالم	149

۲۳	مسدس حالی کا مذہبی تناظر	ڈاکٹر ایس ٹی نوراللہ	152
۲۴	مسدس حالی کا مذہبی تناظر	کے نادرہ بیگم	156
۲۵	کلام اقبال میں قرآنی تلمیحات	ڈاکٹر ایس محمد یاسر	159
۲۶	اقبال کی غزلوں میں قرآنی تلمیحات	گلزار احمد ماگرے	166
۲۷	علامہ اقبال کا اسلامی فلسفہ ایک مختصر جائزہ	ایس جی انیسہ بیگم	169
۲۸	اقبال کا تصورِ عشق اور مولانا روم	نثار احمد ڈار	172
۲۹	علامہ اقبال اور مولانا روم کا تصورِ عشق	ساجد منیر	175
۳۰	ڈپٹی نذیر احمد کی اسلام پسندی توبۃ النصوح کے حوالے سے	ڈاکٹر بشیرہ سلطانہ	178
۳۱	فسانہ مبتلا میں مذہبی اقدار	ارشد علی	181
۳۲	نسیم حجازی کے ناولوں میں مذہبی اقدار	کریم النسا	184
۳۳	تاریخی ناول 'صلاح الدین ایوبی' کا مختصر جائزہ	فوزیہ حبیب	187
۳۴	انتظار حسین کے ناولوں میں اساطیری پہلو کی عکاسی	شاہین انصاری	190
۳۵	امیر النسا کے افسانوں اور ناولوں میں اسلام پسندی	ڈاکٹر ایس محمد مدثر	194
۳۶	امجد حیدر آبادی کے کلام میں اسلام کی ترجمانی	ڈاکٹر محمد امین اللہ	199
۳۷	اردو زبان کے فروغ میں مذہبی صحافت کا رول	ڈاکٹر شیخ فاروق باشا عمری	203
۳۸	شہیب احمد کاف کے افسانوں میں اخلاقی رجحانات	ڈاکٹر ایم سعید الدین	208
۳۹	ستار فیضی کی شاعری میں مذہبی عناصر	ڈاکٹر محمد نثار احمد	215
۴۰	حفیظ جالندھری کا 'شاہنامہ اسلام' کا مختصر جائزہ	ڈاکٹر اے ایم مسعودہ تسکین	219
۴۱	حافظ کرناٹکی کی رباعیوں میں قرآنی آیات کی ترجمانی	ڈاکٹر کے ایچ کلیم اللہ	224
۴۲	اردو نعت کے فروغ میں غیر مسلم دہلوی شعرا کی خدمات	ڈاکٹر فضل الرحمٰن	229
۴۳	اردو کے غیر مسلم نعت گو شعرا	طارق پارے	232
۴۴	جماعت اسلامی کا مذہبی لٹریچر اور اردو کا فروغ۔۔	اشتیاق احمد	236
۴۵	اردو شاعری میں تصوف	نذیر احمد گنائی	243
۴۶	اردو ادب میں ہندوستانی تہواروں کا تذکرہ	ڈاکٹر شاہدہ مناف	247
۴۷	اردو میں مذہبی کتابیں	حافظ محمد سیفی عمری	249

عرضِ مرتب

زبان اظہارِ خیال کا وسیلہ ہوتی ہے، انسان اپنے جذبات، احساسات، خیالات اور عقائد کی نشر واشاعت میں زبان وادب کو ترسیل کا ذریعہ بناتا ہے۔ اردو زبان کا ادبی سرمایہ مختلف عقائد ومذاہب اور مسالک ومناہج کی تعلیمات اور افکار ونظریات سے بھرا پڑا ہے۔ سچ کہیں تو بہت سارے ادبا شعرا، مفکرین اور دانش وروں نے اپنی باتوں اور افکار کو تقویت دینے کے لیے مذہب کا سہارا لیا ہے۔

مذہبی کتابیں اپنی اپنی زبانوں میں ادبی شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں، ان کے اندر ادب کی گہرائی وگیرائی کے ساتھ فصاحت وبلاغت کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں، اور جگہ جگہ ایسے لطیف نکات ملتے ہیں کہ جن سے قبل اہلِ زبان ناواقف تھے۔ اگر چہ اردو زبان میں کوئی مذہبی یا آسمانی کتاب کا نزول نہیں ہوا لیکن یہ ایسی زبان ہے کہ اس میں تقریباً تمام ہی آسمانی کتابوں کے ترجمے ملتے ہیں۔ ایک زبان کا ادبی شاہکار دوسری زبان وادب کے لیے پُرکشش ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ مختلف مذہبی کتابوں کا اردو زبان میں نہ صرف ترجمہ ہوا، بلکہ ان کتابوں کی تفسیر وتشریح اور عصرِ حاضر میں اس کی تطبیق کی شکلیں اور مسائل کے حل وغیرہ پر قلم کاروں نے اپنے دل ودماغ کا عطر نچوڑ کر ادبی سرمایہ میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ غرض ادب کی تصویر وتشکیل میں مذہب کا کردار کافی اہم ہوا کرتا ہے۔ اردو زبان، لسانی اور ادبی اعتبار سے اولاً مذہب اسلام سے زیادہ قریب رہی ہے۔ اس کی تشکیل اور ترویج عربی وایرانی عوام، صوفیا، علماء، دانشوروں اور حکومتوں کے زیرِ سایہ ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کی ادبیات پر اسلامی عقائد اور نظریات کے اثرات کچھ زیادہ نظر آتے ہیں۔ اسی کے ساتھ اس کی تشکیل ہندوستان کی سرزمین سے ہوئی۔ اس لیے یہاں کے مذہبی نظریات کے ساتھ عالمی مذاہب کے عقائد وافکار کے اثرات کو بھی اس نے قبول کیا ہے۔

زبان کی ترویج میں مذہبی عقائد بھی اہم ہوتے ہیں۔ یہ ادیب کے نقطۂ نظر کو جنم دیتے ہیں۔ وہ اپنے فکری زائچہ اور ماحول کی مناسبت سے یا تو اس کی حمایت میں کھڑا ہو جاتا ہے یا پھر اس کی مخالفت کا علم بلند کر دیتا ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اردو زبان وادب کے آغاز سے ماضی قریب تک اس کا رشتہ مذہب سے چولی دامن کا رہا ہے، اردو ادب میں بہت ساری نظمیں، غزلیں، مثنویاں، افسانے، ناول اور ڈرامے وغیرہ مذہبی واقعات سے اور تاریخ سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔

ایڈورڈ ڈائموک Edward Dimock اپنی کتاب The Literatures of India: An

Introduction میں لکھا ہے:

''ماضی قریب تک متحدہ ہندوستان کے ادب میں مذہب کو الگ کرنا کافی مشکل امر ہے ،اس کی وجہ معاشرہ پر مذہبی اقدار کا تسلط نہیں، بلکہ ہندوستانیوں کی زندگی کے ہر پہلو میں مذہب کا رچ بس جانا ہے''۔

زبان سے مذہب کو الگ کرنا، یا مذہب سے زبان کو خارج کرنا دونوں سعی لا حاصل ہیں، اور ایسا کرنا مذہب وادب دونوں کے لیے نقصان دہ ہوگا۔ اردو کے آغاز سے اب تک شعرا واد با نے مذہبی تعلیمات اور افکار وخیالات کے سہارے اردو کے دامن کو وسعت دی ہے، چنانچہ ضرورت ہے کہ اس کو وسیع سے وسیع تر کیا جائے۔ سید عابد حسین لکھتے ہیں:

''وہی عقائد پائیدار ثابت ہوتے ہیں، جنھوں نے کائنات کی توجیہ میں کسی نہ کسی مافوق ہستی کا سہارا لیا ہے۔ غرض ادب کا مقصد یہی ہے کہ اس میں صحیح اور صالح اخلاقی اقدار پیدا کیے جائیں، اور وہ اخلاقی اقدار اصل مذہبی ہوں گے''۔ (تعمیری ادبی تحریک، ص:۱۱۲)

''اردو کے فروغ میں مذہبی ادب کے کردار'' پر ایک اہم سیمینار، سی عبدالحکیم کالج میل وشارم میں ۲۸ فروری اور یکم مارچ ۲۰۲۲ کو قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، وزارتِ تعلیم، حکومتِ ہند (NCPUL) کے مالی تعاون سے منعقد ہوا۔ اس سیمینار میں بہت سارے اہم مقالے پیش کیے گئے۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر احباب کی خواہش تھی کہ ان مقالات کا ایک مجموعہ ترتیب دیا جائے۔ چنانچہ سی عبدالحکیم کالج کی انتظامیہ نے اس کی اجازت بخوشی دے کر ہمارا تعاون فرمایا۔ اس کے لیے ہم انتظامیہ، پرنسپل اور شعبہ اردو کے بے حد ممنون ومشکور ہیں۔

مقالوں کی ترتیب اور فہرست سازی میں موضوع کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ طوالت کے پیش نظر سے کئی مقالوں میں حذف وتلخیص سے کام لینا ناگزیر ہوگیا۔ چوں کہ حسبِ وعدہ تمام مقالوں کو شاملِ اشاعت کرنا ضروری تھا اس لیے موضوعات میں تکرار کے باوجود ان مقالوں کو جگہ دی گئی ہے۔ ہاں اس بات کی بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ مواد میں تکرار باقی نہ رہے۔ اس کے باوجود چند جگہوں پر تکرار کو باقی رکھنے پر مجبور ہونا پڑا۔ امید کہ یہ مجموعہ اس موضوع کی وسعت کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ ہمیں اس بات کا شدید افسوس ہے کہ کئی قیمتی مقالے بروقت موصول نہ

ہونے کی وجہ سے اس کتاب کی زینت نہیں بن سکے۔

ہم استادِ محترم پروفیسر قاضی حبیب احمد صاحب کے سراپا ممنون ہیں جنہوں نے اپنی ناگوناگوں مصروفیات کے باجود اس مجموعے کے لیے ایک وقیع مقدمہ تحریر فرمایا۔ مولانا سید وصی اللہ بختیاری صاحب عمری اور مولانا رفیع کلوری صاحب عمری کے بھی شکر گزار ہیں جنھوں نے قدم قدم پر رہنمائی کرتے ہوئے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ مولوی سید اسماعیل عمری اور برادرِ مکرم مولوی ظہیر دانش عمری کا بھی مشکور ہوں جنھوں کتاب کے سرِ ورق اور حسنِ ترتیب میں بھرپور تعاون فرمایا۔ جزاھم اللہ خیرا فی الدارین۔ سیمینار کی رپوتاژ منسلک ہے۔

شعبۂ اردو، سی عبدالحکیم کالج (خودمختار) میل وشارم میں قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، وزارتِ تعلیم، حکومتِ ہند (NCPUL) کے مالی تعاون سے دو روزہ قومی سیمنار بعنوان ''اردو کے فروغ میں مذہب کا رول'' کا انعقاد عمل میں آیا۔ افتتاحی تقریب کا آغاز ٹھیک دس بجے ہوا۔

افتتاحی اجلاس کی صدارت الحاج ضیاالدین احمد، جنرل سکریٹری میل وشارم مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی نے کی۔ مہمانانِ خصوصی کے طور پر پروفیسر خواجہ اکرام الدین JNU نئی دہلی اور پروفیسر قاضی حبیب احمد مدراس یونی ورسٹی نے شرکت کی۔ حسبِ روایت اجلاس کا آغاز قرأتِ کلامِ پاک سے ہوا۔ کالج کے طلبہ نے دلکش آواز میں نعتِ شریف پیش کی۔ استقبالیہ کلمات کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ایس۔ ساجد نے ادا کئے۔ دورانِ تقریر انہوں نے کہا کہ ساہوکار سی عبدالحکیم صاحب جن کے نام سے یہ کالج موسوم ہے، اپنے دور کی عظیم شخصیت تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے ایک جلسے کی صدارت بھی سی عبدالحکیم صاحب نے کی تھی، جس میں مولانا مودودی اور دیگر اہم معزز شخصیات موجود تھیں۔ اس سے ان کے قد کا پتہ چلتا ہے۔

افتتاحی اجلاس میں دوسرا خطاب پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے فرمایا۔ انہوں نے کہا کہ اس کالج کو قائم ہوئے نصف صدی گزر چکی ہے۔ اب اس کو ڈیمڈ یونی ورسٹی ہو جانا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ اس سیمینار میں شرکت ان کی خوش بختی ہے۔ پروفیسر قاضی حبیب احمد نے اپنے خطاب میں کہا کہ سیمنار کا موضوع بہت ہی عمدہ ہے۔ اس موضوع پر سیمینار کے انعقاد سے فکر ونظر کے نئے زاویے ملیں گے۔ سیمینار کا کلیدی خطبہ راجستھان سے تشریف فرما پروفیسر حدیث انصاری نے پیش کیا۔ آخر میں سیمینار کے کنوینر اور شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر ایس محمد یاسر نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

چائے کے وقفے کے بعد پہلی نشست کا آغاز ہوا جس کی صدارت پروفیسر حدیث انصاری نے کی۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر حکیم رئیس فاطمہ، ڈاکٹر امان اللہ، ڈاکٹر امین اللہ اور ڈاکٹر شیخ مفتی کلیم اللہ عمری مدنی شامل تھے۔ مقالہ نگاروں نے اپنے

گراں قدر مقالے پیش کئے۔اس سیشن کے آخر میں پروفیسر حدیث انصاری نے تمام مقالوں پر تبصرہ کیا۔

اس سیشن کے بعد ظہرانے کا انتظام کیا گیا۔اس کے بعد دوسری نشست کا آغاز ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر قاضی حبیب احمد نے کی۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر ابوبکر ابراہیم فارس عمری، ڈاکٹر سعید الدین، زبیدہ موریکل، ڈاکٹر محمد منظور دکنی، ڈاکٹر ایس. محمد مدثر، ڈاکٹر مسعودہ تسکین نے اپنے مقالے پڑھے۔صدر اجلاس ڈاکٹر قاضی حبیب احمد نے ان کے مقالوں پر تبصرہ پیش کیا۔ تیسری نشست کی صدارت پروفیسر قاضی ضیاء اللہ نے کی۔ مقالہ نگاروں میں انور ہادی، محبوب خان محبوب، سید امداد عمری، غوثیہ بیگم وغیرہ نے اپنے مقالے پیش کئے جن پر ڈاکٹر ضیاء اللہ صاحب نے تبصرہ کیا۔اس نشست کے ساتھ پہلے دن کا سیمینار اختتام کو پہنچا۔

دوسرے دن سیمینار کا آغاز صبح ٹھیک ساڑھے نو بجے عمل میں آیا۔سیمینار کی چوتھی نشست کی صدارت پروفیسر خواجہ محمد اکرم الدین نے کی۔مقالہ نگاروں میں پروفیسر شمس الہدیٰ دریابادی، ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری، ظہیر دانش عمری، ڈاکٹر فاروق باشاہ عمری، ڈاکٹر نشاط احمد عمری، حافظ محمد سیفی عمری، حافظ نذیر احمد عمری اور مولانا محمد منیر الدین عمری نے اپنے مقالے پیش کیے۔تمام مقالوں کے بعد نشست کے صدر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے اپنے تاثرات پیش کئے اور مقالات پر تبصرہ کیا۔چوتھی نشست کے معاً بعد پانچویں اور آخری نشست کا آغاز عمل میں آیا۔پانچویں نشست کی صدارت پروفیسر قاسم علی خان نے کی۔مقالہ نگاروں میں ستار فیضی، ڈاکٹر نثار احمد، ڈاکٹر کلیم اللہ، ڈاکٹر نقی اللہ نقی گرم کنڈوی، ڈاکٹر شیخ نوراللہ نور، محترمہ تزئین جمال، ڈاکٹر بشیرہ سلطانہ، محترمہ راکعہ نازنین، ڈاکٹر ابرار احمد، نظیر احمد اور سردار ساحل نے پیش کیے۔نشست کے اختتام پر پروفیسر قاسم علی خان نے مختصر تبصرہ پیش کیا اور اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔پانچویں نشست کے بعد پُرتکلف ظہرانے کا انتظام رہا۔

اختتامی اجلاس ٹھیک تین بجے شروع ہوا جس کی صدارت عالی جناب ملک شرف الدین صدر، میل وشارم مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی نے فرمائی۔مہمانِ خصوصی کے طور پر ڈاکٹر محمد نعیم الرحمٰن نائب چیرمین، تمل ناڈو اسٹیٹ اردو اکیڈیمی، چینائی موجود رہے۔مہمانِ اعزازی کی نشستوں پر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین اور پروفیسر شمس الہدیٰ دریابادی جلوہ افروز ہوئے۔ان کے علاوہ شہ نشین پر ڈاکٹر ایس.اے۔ساجد پرنسپل سی.عبدالحکیم کالج، جناب ایس.زیڈ.ابرار احمد کر سپانڈنٹ اور سیمنار کنوینر ڈاکٹر ایس.محمد یاسر موجود رہے۔تمام مقررین نے دورانِ تقریر اس سیمینار کی کامیابی پر مبارکباد پیش کی۔شرکاء میں سے حافظ محمد سیفی عمری، ڈاکٹر وصی اللہ بختیاری عمری اور دیگر نے تاثرات پیش کئے۔سیمینار کے اس اختتامی اجلاس کا اختتام ''ترانہ ہندی'' پر ہوا۔

مقدمہ

پروفیسر قاضی حبیب احمد

سابق صدر، شعبہ عربی، فارسی واردو، مدراس یونی ورسٹی

زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا لیکن مذہب کی تو کوئی زبان ہوتی ہے۔ زبان نہ ہوتو اس مذہب کا پرچار کیسے ہو؟ برصغیر ہندو پاک میں مسلمانوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت اور تفہیم وتشریح کے لئے اردو زبان کا خاص طور پر انتخاب کیا ہے۔ برصغیر ہندو پاک میں مسلمانوں کی تہذیب اور ثقافت اردو زبان کے ساتھ وابستہ ہے۔ برصغیر ہند وپاک میں مختلف زبانیں بولنے والے مسلمان آباد ہیں۔لیکن بیشتر مسلمانوں کی زبان اردو ہے۔ اسی طرح کچھ ہندوؤں سکھوں، پارسیوں، عیسائیوں اور دیگر مذہب کے لوگوں نے بھی اردو کو اپنی مادری زبان بنایا ہے۔لیکن جس حیثیت سے مسلمانوں نے اردو زبان کو اپنایا ہے اس کی نوعیت جداگانہ ہے۔ اردو کے ساتھ مسلمانوں کا جذباتی رشتہ ہے اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی بعض لوگ اس کا برملا اظہار نہیں کرتے۔ اردو ادب کا ایک ادنی طالب علم ہونے کی حیثیت سے اس حقیقت کے انکشاف میں مجھے کوئی عار نہیں کہ برصغیر ہندو پاک میں اسلامی تحریکوں اور اسلامی لٹریچر کی نشر واشاعت سے دانستہ یا نادانستہ طور پر اردو زبان کو فائدہ پہنچا ہے۔ اردو میں مذہب اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کا لٹریچر بہت کم ہے۔ اس کے لئے محمد حسین آزاد، وحیدالدین سلیم وغیرہ نے تحریک بھی چلائی تھی تا کہ غیر مسلموں کو اس زبان کے اپنانے میں غیریت معلوم نہ ہو۔لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ اردو اور ہندی کو ملا کر ہندوستان میں ایک عام زبان یعنی ''ہندوستانی'' بنانے کی تحریک چل رہی تھی۔ اب جب کہ یہ تحریک ناکام ہو چکی ہے۔ ہندی اور اردو نے اپنے لئے الگ الگ راہیں منتخب کر لی ہیں تو ہمیں ابھی انہیں خطوط پر سوچتے رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

گذشتہ آٹھ صدیوں میں زبان کی جو کیمیائی ترکیب تیار ہوتی رہی ہے اس میں صوفیاء، علماء اور اسلامی تحریکوں کے علم برداروں نے نادانستہ طور پر حصہ لیا ہے۔ برصغیر ہندو پاک میں اٹھنے والی اسلامی تحریکوں سے اردو زبان وادب کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ اس زاویہ نگاہ سے تحقیق ضروری ہے۔ جہاں تک ادبی تخلیق کا سوال ہے تحریک آزادی، تقسیم وطن، ہجرت کے مسائل، فرقہ وارانہ منافرت غرض سیاسی، تاریخی سماجی اور معاشی مسائل کو لے کر لکھا گیا۔ اسی طرح ایک اہم شعبہ مذہب بھی ہے۔ ادب کے تخلیق کار مذہب کو سنجیدہ موضوع بنا کر لکھ سکتے ہیں۔ ہر زبان میں مذہبی لٹریچر کو

خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ سنسکرت، ہندی، تمل اور دیگر زبانوں کے لٹریچر اصنام واساطیر اور دیومالائی تذکروں سے بھرے پڑے ہیں۔ ان زبانوں کے تخلیق کار اپنی مذہبی معتقدات اور رسومات، مذہب سے وابستہ کلچر اور رہن سہن کے اظہار میں عار محسوس نہیں کرتے۔ انگریزی زبان میں بھی مذہبی لٹریچر کو خاص اہمیت ہی حاصل نہیں ہے بلکہ افسانوی ادب میں بھی لامحالہ مذہبی موضوعات استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس میں مذہب پر ایک طرف طنز واستہزا ہے تو دوسری طرف ایسے ناول بھی موجود ہیں جن میں مذہبی خیالات پورے ادب واحترام سے پیش کئے گئے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان زبانوں کے ادیبوں نے عوام کے معتقدات، رجحانات اور خواہشوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ بلکہ زمانہ کی ایک اہم قدر یعنی مذہب کو ادب کا موضوع بنایا۔ جو ادب زمانہ کی ترجمانی نہیں کرتا وہ بے معنی ہے۔ مجھے یہاں بڑے افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اردو ادب پر اکثر مذہب بے زاری کا رجحان غالب رہا۔ ترقی پسندوں نے دقیانوسیت، رجعت پسندی اور استحصال کا نام لے کر مذہب کا کلی طور پر رد کیا۔ مولوی، ملا، موذن، اور عام مسلمانوں کو بھی جو اسلام پسند ہیں نشانۂ ملامت بنایا گیا۔ اس میں کسی طرح کا استثنیٰ نہیں تھا اور یہ روایت بعد میں غیر ترقی پسند ادیبوں میں بھی چلتی رہی۔ اردو ادیبوں کی یہ ریت جادہ اعتدال سے باہر ہے۔

تنقید، نکتہ چینی اور طنز ادب میں اسی حد تک روا ہے جب تک وہ اعتدال کی میزان پر برقرار رہے اور ناقد معاملے کی پوری جانکاری رکھتا ہو طنز کی تہہ میں ہمیں اگر سچائی، خلوص اور سنجیدگی نہ ملے تو وہ محض تنقیص اور استہزا ہے۔ مولویوں پر ہمارے ادبی نقادوں کی چوٹیں اکثر خلوص پر مبنی نہیں ہیں۔ ادیب تو انسان دوست ہوتا ہے۔ طوائفوں تک سے اسے ہمدردی ہوتی ہے۔ افلاس زدہ، پریشان حال مولویوں کے طبقہ سے انھیں ہمدردی کیوں نہیں ہے۔ ایک مذہب سے علاقہ کیا انھیں انسانی دائرہ سے نکال باہر کرسکتا ہے؟ ہمارا یہ طرز عمل یقیناً تشویش ناک ہے۔ آج بھی اگر ہمارے افسانہ نگار اور ناول نگار مولویوں کی مفلسی، کس مپرسی، بے چارگی اور بدحواسی کا سنجیدگی اور خلوص سے جائزہ لیں اور مذہب دشمنی سے بالاتر ہوکر سچائی کے ساتھ لکھیں تو وہ ناول اور افسانے تیار ہوں گے جو ہمارے فکشن کو چار چاند لگا دیں گے۔

زندگی کے ہر شعبہ میں ریاکار ہوتے ہیں لیکن اس کی پاداش میں مولوی کے منصب ہی کو عبث بتانا ناانصافی ہے اور یہی ہمارے افسانہ نگاروں، ناول نگاروں، انشاء پردازوں اور نقادوں نے کیا۔ ترقی پسندوں نے مولویوں کے خلاف اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے تھے لیکن دیگر ادیبوں نے بھی بغیر تحقیق

کے ان باتوں کو تسلیم کیا اور گمراہ ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کا وہ طبقہ جو مذہب کی کم جانکاری رکھتا تھا مولویوں اور ملاؤں سے توحش محسوس کرنے لگا۔ مولوی اور ملا پہلے ہی سے کمزور اور مظلوم ہوتے ہیں اب ان ادیبوں کے تازیانوں سے اس طبقے کی حالت اور خراب ہو رہی ہے۔ اچھے برے کردار ہر شعبہ زندگی میں ملتے ہیں۔ مولویوں میں بھی ملتے ہیں۔ صرف مولویوں کو مطعون بنانا کہاں کا انصاف ہے۔ مولوی چور نہیں ہوتا چور مولوی ہو جاتا ہے۔ مولوی کا منصب قابل احترام ہی ہوتا ہے۔ اس کردار پر بہت گفتگو ہو سکتی ہے۔ ذرا سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ہر زبان کے ادب میں کمزور اور مظلوم کا ساتھ دیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے بعض ادیبوں کی ملاؤں کے خلاف محاذ آرائی سے دکھ ہوتا ہے۔ جو تنقید مبنی بر اعتدال نہیں ادب میں بے راہ روی کے لئے راہ دیتی ہے۔ بدقسمتی سے مذہب اور مذہبی کرداروں کے تعلق سے ہمارے اکثر ادیبوں کا موقف اسی بے راہ روی کا شکار ہے۔ ہر اچھے برے مذہبی کردار کو ہدف ملامت بنانے کے بجائے قابل اعتراض کرداروں کے انتخاب میں انصاف سے کام لیا جاتا جیسے ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناول ''ایامیٰ'' میں ایک کردار کو اپنے خاص ظریفانہ انداز میں عمدہ تنقید کا نمونہ بنایا ہے اور ایک ریاکار مولوی کے تصنع اور بناوٹ کی قلعی کھولی ہے۔

> ''جس طرح مرثیہ خوانوں کے ساتھ بسوریے لگے رہتے ہیں کہ ذاکر صاحب نے گنگنانا شروع کیا اور بسوریے لگے دھاڑیں مارنے اسی طرح واعظوں کے ساتھ بھی مجلس وعظ کے گرم کرنے کے لئے چند بنائے ہوئے مرید خاص ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب منبر پر تشریف رکھتے ہیں جیسے کوئی بادشاہ تخت سلطنت پر اور ان میں سے کوئی پنکھا جھل رہا ہے.... کبھی لال لال دیدے نکال کر بیچ بیچ میں موقعہ بے موقعہ سبحان اللہ بھی کہہ اٹھتا ہے۔ ایک کے پاس اگلدان ہے۔ دوسرے کی تحویل میں صراحی، تیسرے کی بغل میں (پہلے تو شبہ ہوا کہ کوئی کتاب ہوگی پھر معلوم ہوا کہ نہیں) حضرت کی نعلین ہیں اور چوتھا اور ہے جو پس پشت منبر کے قریب حضرت کی جریب اس شان سے لئے کھڑا ہے جیسے ہارون عصائے موسیٰ.....''

ڈپٹی نذیر احمد نے ریاکار واعظ کا جو خاکہ اڑایا ہے اس کا پیرایہ ظریفانہ سہی مگر خلوص پر مبنی ہے۔ اس پورے منظر کی تہہ میں ایک درد چھپا ہے اور یہ درد ہمیں اس طبقہ کی اصلاح کے لئے چیخ چیخ کر تقاضا کر رہا

ہے۔خوبی کی بات یہ کہ نذیر احمد کو اس پیشہ کے بارے میں گہری معلومات حاصل ہیں۔اس لئے ہمارے ادیبوں کو پہلے مولوی اور ملا کے کرداروں کا گہرا مطالعہ اور ان کی زندگیوں کے قریب پہنچ کر معلومات جمع کرنا چاہئے۔اس طرح کی تنقید صحت منداور فائدہ مند ہوگی۔

اردو ادب کے خزانے کو مالا مال بنانے والے ادیبوں اور شاعروں میں ان مولویوں اور ملاؤں کا بہت بڑا حصہ شامل ہے۔اس کے علاوہ اسلامی لٹریچر تیار کرنے والوں میں بے شمار صاحب طرز ادیب اور شاعر پیدا ہوئے ہیں مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالسلام سندیلوی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا ابوالاعلی مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا عامر عثمانی، مولانا منظور نعمانی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا وحیدالدین خاں وغیرہ اسلامی قلمکاروں کی کہکشاں کے ستاروں کا شمار مشکل ہے۔حیرت کی بات یہ ہے کہ ان میں سے ایک بھی نام اردو ادب کی تاریخ میں نمایاں نہیں ہے۔ حالانکہ اردو ادب کی تاریخ میں اسلامی لٹریچر اور علمائے دین کی ادبی خدمات کے زیر عنوان ایک بسیط و مفصل باب کا اضافہ ہوسکتا ہے خاص طور سے اردو زبان کی نثری اسلوبیات کا خانہ ان علمائے کرام کے تذکرے کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔

اردو ادب میں دیگر زبانوں کے ادب کی طرح اسلامی ادبیات کے عنوان سے ایک الگ صنف قائم کرنی چاہئے۔مذہب کو شجر ممنوعہ سمجھ کر اس پر چوٹیں کرنے کے بجائے عوام کی اس مقبول ترین قدر کو ادبی قدر بنانا چاہئے جس طرح ہم دنیا کے دیگر ازموں اور تحریکوں کے نظریات کو فراخ دلی سے اپنی تخلیقات کا حصہ بناتے ہیں اسی طرح اسلامی نظریات کا بھی خندہ پیشانی سے استقبال ہونا چاہئے۔اردو زبان وادب کے ظرف میں بہت وسعت ہے۔اسلامیات اور دیگر مذہبی لٹریچر کی اردو ادب میں بڑی اچھی کھپت ہوسکتی ہے اس سے ہمارا ادب تازہ اور توانا بنے گا زبان وادب سے عوام کی دلچسپی میں جو زبردست کمی آرہی ہے یہ کمی بھی دور ہوجائے گی کیونکہ آج مذہبی نظریات سے عوام کی دلچسپی بڑھ رہی ہے مذہب بے زاری کے جو بادل کمیونسٹوں کے گمراہ کن پروپگنڈہ سے عوام کے ذہنوں پر چھارہے تھے وہ اب چھٹنے لگے ہیں اور اردو ادب کو بھی ان زنجیروں سے چھٹکارا حاصل کرلینا چاہیے۔یہ چند معروضات جو شدید بھی ہیں اور کسی قدر

تلخ سچائی پر مبنی ہیں مگر ہمارے ادیبوں کی نام نہاد روشن دماغی کی آڑ میں ایک بڑی یک طرفہ روش کے خلاف آواز اٹھانا ضروری ہے۔

اس موضوع پر سی عبدالحکیم کالج ،میل وشارم نے ایک قومی سیمینار منعقد کیا۔ یہ موضوع بہت حد تک فکری تھا اور کچھ تحقیقی بھی۔اس مذاکرے میں پیش کئے گئے بیشتر مقالے تحقیقی ہیں۔ کچھ فکری مضامین بھی شامل ہیں۔مسرت کی بات ہے کہ مقالوں کو عزیزان گرامی ڈاکٹر محمد یاسر اور محمد سیفی عمری نے کتابی صورت میں ترتیب دے کر شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔اللہ کرے کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ارباب اردو ادب اس اہم ادبی مسئلے کی طرف توجہ دیں۔اس سلسلے میں غور وفکر کے لئے مزید مذاکرے منعقد ہوں اور بحث ومباحثہ کے بعد کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی جائے۔

اردو زبان وادب کے فروغ میں مذہبی ادب کا کردار

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

دنیا کے کسی بھی زبان اور ادب کے فروغ میں کئی عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔اردو زبان وادب کے فروغ کے حوالے سے عام طور پر یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ بازار، دربار اور خانقاہ وہ سماجی ادارے ہیں جس نے شمالی ہند میں رائج بولی کو زبان کا درجہ عطا کیا۔اس زبان میں تخلیقی ادب کا سلسلہ دکنی سے ہی شروع ہوا۔ان تین عناصر کو لسانی علوم کی ماہر بنیاد محرکات میں شمار کرتے ہیں۔خانقاہ سے مراد وہ مذہبی ادارے اور افراد مراد ہیں جنھوں نے تبلیغ وارشاد کے لیے اسی عوامی زبان کو اپنایا اور بتدریج یہ ادبی محاسن سے مزین ہوئی۔

زبانوں کی ارتقا کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔الفاظ سے جملوں کی ساخت تک کی اگر بات کریں تو اس میں صدیاں گزرتی ہیں تو کوئی ایک ایسی شکل نکل کر سامنے آتی ہے جو اپنے مآخذ سے بالکل جدا شکل ہوتی ہے۔جیسے ہم سب جانتے ہیں کہ سنسکرت تمام ہندستانی زبانوں کی ماں ہے جن کا تعلق ہند آریائی خاندان السنہ سے ہے۔لیکن آج سنسکرت اور اردو کو صوری اور معنوی اعتبار سے دیکھیں تو حیرت ہوتی اور تسلیم کرنا مشکل ہے۔خیر یہ ایک بالکل الگ بحث ہے میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ زندہ زبان کی سب سے بڑی شناخت یہ ہے کہ اس میں مستقل تغیر وتبدل کا عمل جاری وساری رہے اور جس کے بولنے والے موجود ہوں۔۔۔اسی تغیر وتبدل کو ہمیں سمجھنا ہوگا تاکہ ہم یہ آسانی سے سمجھ سکیں کہ اردو کے ارتقا میں مذہبی ادب نے کیا کردار ادا کیا ہے۔

لیکن اس قبل اجمال میں یہ جان لینا ضروری ہے کہ ادب کیا ہے؟ ادب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تحریر کی اعلیٰ شکل جس میں احساسات وتجربات، مشاہدات، تفکرات اور تخیلات کو جمالیاتی انداز میں پیش کیا گیا ہو وہ ادب ہے۔کہا جاتا ہے کہ ''شعر وادب تفسیر زندگی بھی ہے اور تصویر زندگی بھی'' ادب کے متعلق دو نظریئے ہیں ایک ادب برائے ادب اور دوسرا ادب برائے زندگی ہے۔دونوں نظریات کے تحت ادب لکھا گیا ہے اور لکھا جارہا ہے۔لیکن عام طور پر اسی ادب کو اہمیت حاصل ہے جو زندگی کی عکاس بھی ہو اور زندگی کے لیے مشعل راہ بھی ہو، قدر و قیمت اسی ادب کی ہے جو نہ صرف زندگی کی تصویر دیکھا جائے

بلکہ زندگی کرنے کے راستے بھی دکھائے۔لیکن ادب محض زندگی اور تہذیب وتمدن کی عکاسی ہی نہ کرے بلکہ اس میں مسرت وبصیرت کی ایسی آمیزیش ہو جو جمالیاتی حظ بخشتی ہو، جو تفریح ذہن ودل کے ساتھ بصیرت کا ادراک کراتی ہو ایسی ہی تحریریں ادب کے زمرے میں آسکتی ہیں۔

اردو میں تخلیقی ادب کا آغاز دکن سے ہوتا ہے اور بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دکن میں اردو کے ابتدائی نمونے صوفیائے کرام کے ہیں کیونکہ انھوں نے اسی عوامی زبان کو رشد وہدایت اور تبلیغ دین کے لیے استعمال کیا۔خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اور ان کے سلسلے کے صوفیا نے جو رسالے مرتب کیے وہ خالصتاً مذہبی تھے۔معراج العاشقین جس کو اردو کا پہلا نثری نمونہ کہا جاتا ہے اس کو پڑھیں تو اندازہ ہوگا کہ اس کی زبان اس کے عہد کی عوامی زبان سے قریب تر ہے۔بات صرف دکن کی ہی نہیں بلکہ جس علاقے میں صوفیا موجود تھے انھوں نے وہیں کی زبان کو وسیلہ اظہار بنایا۔

مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری علیہ الرحمہ نے شمالی علاقے کی عوامی زبان میں تبلیغ کے لیے عملی طور پر جو طریقہ اختیار کیا وہ بہت دل پذیر ہے لیکن ان کی زبان کا ایک اسلوب ملاحظہ ہو:

''جو کچھ فلانے کے پنڈ پران میں ہوئے، راہ کا باٹ کا، کُوّے کا، پوکھر کا، اندھیاری کا، اجیالی کا، چوٹ کا پھیٹ کا، کیے کا، کرائے کا، بھیجے کا، بھیجائے کا، لانگھے کا، اُلکھین کا، دیو، دانو، بھوت پریت، راکس بھوکس، ڈائن ڈکن، سب دور ہوئے بحق لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ''

تمام مصحف کا معنی الحمد اللہ میں ہے مستقیم، ہور الحمد اللہ کا معنی بسم اللہ میں ہے قدیم، ہور تمام بسم اللہ کا معنی بسم اللہ کے ایک نقطے میں رکھیا ہے کریم۔سج دیکھ، خاطر لیا اتال، حدیث بھی یوں آئی ہے کہ العلم نقطۃ وکثر ھاجُھّال یعنی علم ایک نقطہ ہے، جاہلاں اسے بڑھائے، جہالت کو اس حد لگن لیائے۔ہور فارسی کے دانشمنداں، جنوں سمجھتے ہیں باتاں کے بنداں، انوں کوں یوں بھایا ہے، انوں میں بھی یوں آیا ہے کہ ''اگر درخانہ کس است، یک حرف بس است۔'' ہور گوالیر کے کے چاتراں، گُن کے گُراں، انوں بھی بات کو کھولے ہیں، یوں بولے ہیں۔

پوتی تھی سو کھوٹی بھئی پنڈت بھیا نہ کوئے ایکھی اچھّر پیم کا پھیرے سو پنڈت ہوئے

قدرت کا دھنی سہی، جو کرتا سو سب وہی۔خدا بڑا، خدا کی صفت کرے کوئی کتیک، وحدہٗ لا

شریک۔ ماں نہ باپ، اپیں آپ پروردگار، سنسار کا سُر جنہار۔ جیتی جکو ئی قدرت دھرتا ہے، صفت اُس کی اپنے پُرتے کرتا ہے۔ وو بے حد، اُس کی صفت کوں کاں ہے حد، احد، صمد، لم یلد ولم یولد۔ بیت

کسے ہے جو خدا کی صفت کی حد پاوے ہر ایک بال کو کوں گر سَو ہزار جیب آوے

قرآن پاک کے ترجمے کا ابتدائی نمونہ:

نمونہ ملاحظہ ہو: شاہ رفیع الدین

''یہ کتاب نہیں شک بیچ اس کے راہ دکھاتی ہے۔ واسطے پرہیزگاروں کے وہ جو ایمان لائے ہیں ساتھ غیب کے اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور اس چیز سے کی دی ہے ہم نے ان کو خرچ کرتے ہیں اور جو لوگ کے ایمان لائے ہیں ساتھ اس چیز سے کہ اتاری گئی ہے طرف تیری اور جو کچھ اتاری گئی ہے پہلے تجھ سے اور ساتھ آخرت کے وہ یقین رکھتے ہیں یہ لوگ اوپر ہدایت کے ہیں۔ پروردگار اپنے سے اور یہ لوگ وہی ہیں جو چھٹکارا پانے والے''۔

(سورۃ بقرہ)

کربل کتھا:

''آہ حضرت یعقوب کے بارہ فرزند تھے۔ ایک یوسف جدا ہوا تھا، روتے روتے آنکھیں مبارک نابینا ہوئیں۔ لیکن حسین مظلوم کی آنکھوں کے آگے علی اکبر سا نوجوان اور علی اصغر سا تشنہ دھان، قاسم سا پُر ارمان اور برادران، ذی شان، ھفد نفر ذبح ہوئے، صبر کیا اور دم نہ مارا اور آپ بھی اپنا سر یہ تسلیم رضا دیا'' (کربل کتھا، ص ۹۴۔۰۵)

شاعری

اب اگر ابتدائی عہد کی شاعری پر غور کریں تو پہلا نمونہ تو ہمیں خسرو کے یہاں ہی ملتا ہے۔ غور کریں تو یہ دور ادب و زبان پر وہ ہندستانی روایت کے غلبے کا دور ہے۔ اس میں نہ صرف اسلوب بیان بلکہ روایت بھی ہندوی ہے۔ خدا، رسول، بزرگ، اولیا سب کے سب ہندوی ملبوس میں نظر آتے ہیں۔ لہذا شریعت اور صوفیانہ واردات کے سارے مراحل ہندوی لباس میں ہی طے ہوتے ہیں۔

دوہا:

اس دور میں دوہے زیادہ ملتے ہیں۔ دوہا بنیادی طور پر بھکشوؤں کی روایت ہے۔ لیکن اس کو صوفیوں

نے اپنے پیغامات کے لیے پروان چڑھایا۔

''دوہے کی ایک مخصوص ہیئت ہے وہیں ایک انفرادیت، اس کی ڈکشن بھی ہے۔ گیت کی مانند اس کے اسلوب پر بھی ہندی رنگ غالب ہے۔ عربی و فارسی کی بھاری بھرکم اصطلاحات سے گریز کیا جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ شاید یہ ہو کہ امیر خسرو اور بھگت کبیر نے اس صنف سُخن کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا جو بہ ذات خود ہند اسلامی تہذیب کے پروردہ تھے۔ ابتدائی طور پر دوہے کو مذہبی و اخلاقی موضوعات کے بیان کے لیے استعمال کیا گیا چنانچہ بھگتی تحریک میں دوہے کو مذہب سے ماورا ہو کر انسانیت سے پیار کا پیغام پھیلانے کے لیے استعمال کیا گیا۔ اسی طرح صوفیاے کرام نے بھی دوہے کے ذریعے باہمی محبت و آشتی کو فروغ دیا۔''

خسرو جن کو ہندوی کا پہلا شاعر کہا جاتا ہے ان کو سنیں:

خسرو ایسی پیت کر جیسے ہندو جوے　　پوت پرائے کارنے جل جل کوئلا ہوے

خسرو دریان پریم کا الٹی واں کا دھار　　جو اتراسو ڈوب گای جو ڈوبا سو پار

رَینی چڑھی رسول کی سو رنگ مولا کے ہات　　جس کے کپرے رنگ دئے وا کے دھن دھن بھاگ

خسرو رین سوہاگ کی جاگی پی کے سنگ　　تن میر و من پیو کو دوؤ بھئے اک رنگ

کبیر کہتے ہیں کہ:

چکی نائیں دیکھتی گہیوں ہے یا گھن　　وہ تو جانے پیسنا، ایک ہی اُس کا گن

خیال

صوفیا کے یہاں یا ''تصوّف میں خیال سے مراد خیالِ حق ہے یعنی جو خواب یا بیداری میں تصور کرے یا دیکھے۔ (لکھنؤ) ادنیٰ طبقے کا ایک ادبی فن جس میں لوگ فی البدیہہ اشعار کہہ کر دائرے پر گاتے تھے۔

''قدیم راگوں کی ایک قسم۔ استادان فن دھرپد کے بعد خیال کو اہمیت دیتے ہیں۔ موسیقی نے جب ترقی کی تو دھرواا اور پد کے ملاپ سے دھرپد پیدا ہوا۔ اس کے چار حصے

ہیں: استائی، انترا، سنچاری اور ابھوگ۔ اس میں خدا کی حمد کے کچھ بول ہوتے ہیں۔ پندرھویں صدی میں جونپور کے شاہان شرقیہ میں سے سلطان حسین شرقی نے خیال ایجاد کیا۔ پہلے خیال کے دھرپد کی طرح چار حصے ہی تھے۔لیکن بعد میں صرف استھائی اور انترا ہی رہ گئے۔'' ویکی پیڈیا

جکری:

اب ایک ایسی صنف کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کا ذکر بہت کم ہی ہوتا ہے۔اس صنف اک تعلق بھی قدیم اصناف میں ہوتا ہے بلکہ اردو کے ابتدائی دنوں کا شعری اسلوب جس نے اردو شاعری کو مہمیز کیا اس کو جکری کہتے ہیں۔

"جکری شاعری کی وہ قدیم صنف ہے جس نے شمالی ہند کے صوفیا کی مجالس میں چودھویں، پندرھویں صدی میں بہت مقبولیت حاصل کی تھی۔''جکری''ذکری کی بگڑی ہوئی شکل ہے اوراس کا ماخذ''ذکر'' ہے۔ جکری ایک ایسی صنف سخن تھی جس میں بنیادی طور پر ذکر خدا، رسول اللہ ﷺ، ذکر پیر ومرشد، ذکر تجربات باطنی اورواردات روحانی کواس طرح نظم کیا جاتا تھا کہ انھیں بآسانی گایا بھی جاسکے۔"

جمیل جالبی''جکری'' کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''جکری (جکری، ذکری کی گُجری شکل ہے) میں بنیادی طور پر ذکرِ خدا، ذکرِ رسول، ذکرِ پیرومرشد، ذکرِ تجربات باطنی وواردات روحانی کواس طور پر ایسے اوزان اور ایسے عام فہم الفاظ میں لکھا جاتا تھا کہ اسے گایا بھی جاسکے اور سازوں ہر بجایا بھی جاسکے۔جکری کی حیثیت مختصر راگ اور راگنیوں کے ان بولوں کی تھی جنھیں گا بجا کر لوگوں کے اندر عالمِ وجد و سرور پیدا کیا جاسکے۔اس میں عشق ومحبت کے جذبات بھی ہوتے تھے اور ایسے ناصحانہ مضامین بھی جن سے مریدوں اور طالبوں کی ہدایت ہوسکے، ہیئت کے اعتبار سے جکری، بھجن اور گیت ہی کی ایک شکل ہے جس میں دوہروں کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔"

جکری کے نمونے ہمیں صرف اردو کے ابتدائی دور میں صوفیاے کرام کے ہاں ہی ملتے ہیں۔اردو زبان کی ابتدائی نشوونما میں صوفیا کرام نے اہم کردار ادا کیا۔اگرچہ اس سے ان کا مقصد اردو زبان وادب کی خدمت نہیں تھا۔ان کا بنیادی مقصد اسلام کی ترویج تھا۔مقامی لوگوں کی بولی

ہونے کے ناتے انھوں نے اردو کو ذریعہ تبلیغ بنایا۔ان کی کاوشوں سے اردو بالواسطہ متاثر ہوئی اور پھلتی پھولتی رہی۔

بہ طور نمونہ شیخ بہاالدین باجن کی جکری کی تین سطور ملاحظہ ہوں:

عقدہ:

کیوں نہ لاؤں چندنا　　اب ماہ ہریالا نبا

پین:

شہ جولایا چندنا　　چوباچولہ مہو کے

بوئی جو آئی نواسہ　　کی میرا جیورا ہو کے

قاضی محمود دریائی کی جکریوں میں یہی اسلوب دکھائی دیتا ہے۔ان کی جکری کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

مجہ درسن سائیں کا بھاوے　　چنت میری اور ناوے

جب ہنس مکھ آپ دکھلاوے　　سب سکھیاں باوری لاوے

چھپ چانا آ بچار جاوے　　اس روپ کا وے کھیا

دیکھ تاروں تیج نہ سھیا　　کر بیٹھ سورج مکھ رھیا

منگل بدلا برھست آرے　　سکر سنیچر یار جوھارے

راہ گسیا ئیں لون اُتارے　　قاضی محمد مرے من بھایا

چاہ وچایلند ھا پیر میں پایا　　ان محمود کون میت ملایا

ولی نے کہا کہ:

عشق میں لازم ہے اول ذات کو فانی کرے　ہو فنا فی اللہ دائم یا دیزدانی کرے

ولی کوں نہیں مال کی آرزو　خدا دوست نئیں دیکھتے زرطرف

سراجؔ اورنگ آبادی کی مستزاد، مستزادِ الزام کی بہترین مثال ہے کہ اس کے مستزاد مصرعے کو حذف کر دیا جائے تو کلام معنوی لحاظ سے نامکمل رہے گا۔ بہادر شاہ ظفرؔ کی تخلیق یہ مستزاد غزل اپنی مثال آپ ہے۔ملاحظہ کیجیے:

جو عرش سے ہے فرش تلک آدمی میں ہے　دیکھ آنکھ کھول کر

کیا کیا نہیں ہے اس میں کہ سب کچھ اسی میں ہے　پر چاہیے نظر

دل اپنا پہلے زنگ کدورت سے صاف کر ماننداٰئینہ
پھر تو بہ غور دیکھ کہ اس آرسی میں ہے کیا حُسن جلوہ گر
تو ڈھونڈتا ہے جس کو چھپا وہ تجھی میں ہے پر تو ہے بے خبر
افشائے رازِ عشق نہ کر کہہ، کے جی کی بات پردہ ہی خوب ہے
جی ہی میں رہنے دے جو کچھ کہ جی میں ہے خاموش اے ظفر

رفیع سودا کے دیوان میں ''رُباعیات مستزاد'' کے عنوان کے تحت رباعی مستزاد کی مثال وجود ہے۔ایک رباعی ملاحظہ ہو:

دُنیا کی طلب میں دین کھو کر بیٹھے ہو کر گم راہ
کرنا ہی نہ تھا جو کام سو کر بیٹھے اے عقل تباہ
ہے عارضی خانہ جسم خاکی سودا بے شبہ وشک
سو مالک ہی اس کے آپ ہو بیٹھے سبحان اللہ

ابتداً اُردو میں اس صنف کا رواج دسویں، گیارھویں صدی ہجری میں رہا۔اُردو سی حرفی کی ابتدائی مثالیں دکنی شاعری میں ملتی ہیں۔شاہ علی جیو گام دھنی، معظم بیجاپوری، شاہ برہان الدین جانم، شاہ امین الدین اعلیٰ، شاہ کریم اور شیخ محمود خوش دہاں نے سی حرفیاں لکھی ہیں۔شاہ برہان الدین جانم کی سی حرفی سے دو اشعار:

الف: ایمان اللہ پرواں سب جگ نپایا ایسی قدرت بہُ بھانت رچیا آپس آپ چھپایا
ب: بہروپ ان ایسا کیتا باقی اپنا کھیل بازی کھیلے آپ کھلاوے بہبودر چنا میل

معظم بیجاپوری کی سی حرفیوں کا ذکر ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''تاریخ ادب اُردو'' میں کیا ہے۔اس ضمن میں انھوں نے جیو گام دھنی، میرانجی شمس العشاق، برہان الدین جانم اور امین الدین اعلیٰ کی سی حرفیوں کا ذکر کیا ہے۔انھوں معظم کی ایک سی حرفی بھی بہ طور مثال پیش کی ہے:

الف: احد میں مخفی تھا سو شوقوں باہر آیا حرف حرف میں روپ بدل کر نیم کا گھنگٹ لایا
ب: باندا رشتہ روزِ اوّل سوں عشق محبت سارا کل میں جن کوں حق نے کیا پیتم پیارا

قصیدہ در منقبت حضرت امیر المومنین اسد اللہ الغالب علیؓ ابن ابی طالب:

یارو مہتاب و گل و شمع بہم چاروں ایک ہیں کتاں بلبل و پروانہ یہ ہم چاروں ایک

ہے مجھے ابر و ہوا شیشہ و جام اب کہ ہوئی　　گریہ و نالہ دل دیدہ نم چاروں ایک
یار اگر کلبۂ احزاں میں نہ ہووے تو ہمیں　　خلوتِ شمع دل و داغِ الم چاروں ایک
آہ کس کس سے بچے دل کہ ہوئے ہیں تیرے　　غمزدۂ ناز و ادا عشوہ صنم چاروں ایک
شاہ مرداں تری خلقت جو نہ ہوتی منظور　　ہوتے عنصر نہ کبھی مل کے بہم چاروں ایک
ماہِ نو پشت فلک قوس و قزح تیر شہاب　　بارِاحساں سے ترے رکھتے ہیں خم چاروں ایک

محسنؔ کاکوری نے پانچ(۵)نعتیہ قصائد لکھے جن کے عنوانات گلدستۂ کلامِ رحمت،ابیاتِ نعت،مدیحِ خیرالمرسلین،نظمِ دل افروز اورانیسِ آخرت۔ان قصائد میں سے''مدیحِ خیرالمرسلین''کو بہت قبولِ عام حاصل ہوا جس کا سبب اس کی منفرد طرزِ ادا ہے۔?'مدیحِ خیرالمرسلین''کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو محسنؔ کاکوروی کی قادرالکلامی کو ظاہر کرتے ہیں:

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل　　برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سرو قدانِ گوکُل　　جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طولِ امل
خبر اُڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی　　کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
کیا جھکا کعبے کی جانب کو ہے قبلہ بادل　　سجدہ کرتا ہے سوئے یثرب و بطحا بادل
بحرِ امکاں میں رسولِ عربی دُرّ یتیم　　بحرِ امکاں میں رسولِ عربی دُرّ یتیم
ہفت اقلیم میں اس دیں کا بجایا ڈنکا　　تھا تری عام رسالت کا گرجتا بادل

اردو ادب کے فروغ میں مذہبی ادب کا رول

پروفیسر حدیث انصاری

اردو زبان کے ادبی سرمائے نے مختلف مذاہب کے عقائد اور نظریات کا اثر قبول کیا ہے۔ مختلف مذاہب اور نظریات کے حاملین نے اسے اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ لیکن اردو زبان، لسانی اور ادبی اعتبار سے اولاً مذہب اسلام سے زیادہ قریب رہی ہے۔ اس کی تشکیل اور ترویج عربی، ایرانی عوام، صوفیا، علماء، دانشوروں اور حکومتوں کے زیر سایہ ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کے ادبیات پر اسلامی عقائد اور نظریات کے اثرات کچھ زیادہ نظر آتے ہیں۔ اسی کے ساتھ اس کی تشکیل خالص ہند کی سرزمین سے ہوئی۔ اس لیے یہاں کے مذہبی نظریات کے ساتھ عالمی مذاہب کے عقائد اور نظریات کے اثرات کو بھی قبول کیا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر ایک نے اپنے اعتقاد اور نظریہ کی بنیاد پر ادب کی تخلیق کو اپنا منہج بنایا۔ ہر ایک نے اپنے عقائد اور نظریات کی ترویج و اشاعت کا کام ادب کو آلۂ کار بنا کر کیا۔ حقیقت نگاری کا دم بھرتے ہوئے اصلاح و تعمیری نقطۂ نظر کو فوقیت دینے کا دعویٰ کیا مگر یہ بھی سچائی ہے کہ جس طرح انفرادی اور اجتماعی شخصیت کی تعمیر میں یہ خود ساختہ عقائد و نظریات کے دائرے میں وقت کے ساتھ بنتے اور بکھرتے رہے۔ ان میں وہ صلاحیت کبھی پیدا نہیں ہو پائی جو پوری انسانیت کی ذہنی و فکری آسودگی کا واحد نسخہ کیمیا بن کر فرد، معاشرہ، سماج، سیاست، تہذیب کی ترتیب و تنظیم کر سکے۔ اخلاق و کردار، اخوت و مساوات کا ایک صالح تعمیری مینارۂ نور بن کر انسانیت کی آبیاری کر سکے۔ بلکہ اپنے نیم خام اصول کی ترویج کے مسابقت اور مبارزت میں سبھی ایک دوسرے میں خامیاں اور کمیاں تلاش کرتے رہے۔

یہاں یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ زبان اور اس کے ذریعہ وجود میں آنے والا ادب قدرت کی طرف سے انسان کو عطا کیا جانے والا ایک عظیم اور بیش بہا عطیہ ہے۔ بغیر اس زبان اور ادبی سرمائے کے روئے زمین کی مختلف مخلوقات میں انسان کی شناخت معدوم ہوتی۔

اردو زبان اور اس کے ادبی سرمائے کی اپنی ایک مخصوص تاریخ ہے۔ بلاشبہ اس کے فروغ میں مذہبی ادب کی بہت بڑی حصے داری ہے جسے ہمیشہ نظر انداز بھی کیا گیا ہے۔ مگر ہر مذہب اور نظریات کے حاملین کے انفرادی کاوشوں کی حصے داری بھی نظر آتی ہے۔ مگر سچائی یہ ہے کہ ان کی شمولیت سے رفتار ادب اور سمت ادب میں افراط و تفریط کے سبب رکاوٹیں بھی پیدا ہوئیں۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ عقائد اور نظریات کی تنگ دامنی کے گلہ کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔

اس کانفرنس کا موضوع گفتگو 'اردو ادب کے فروغ میں مذہبی ادب کا رول' ہے۔ یہ موضوع اپنے آپ میں بڑا جامع اور وسیع موضوع ہے۔ ساتھ ہی فی زمانہ منفرد معنوی نوعیت کا حامل بھی ہے۔ یہ صرف ایک موضوع نہیں ہے بلکہ یہ کئی جامع موضوعات کا مجموعہ ہے اور جب تک ان تمام موضوعات کی بنیادی صورتوں، اغراض و مقاصد کا صالح تعمیری علم نہ ہو تب تک متذکرہ موضوع کی اصل غرض و غایت اور مقصدیت تک رسائی حاصل کرنا ممکن نہیں ہوسکتا ہے۔

ان تمام موضوعات اور ان سے وابستہ پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے مختصراً اس محفل میں اپنے خیالات کو پیش کی کوشش کی ہے۔ اس لحاظ سے اس گفتگو کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) کائنات (۲) انسان (۳) مذہب (۴) زبان (۵) ادب

یہی وہ پانچوں موضوعات ہیں جہاں سے انسانی گروہ کے درمیان اتفاق رائے اور اختلاف رائے کے دروازے کھلتے ہیں۔ فطری حقیقت اور صداقت سے دور اپنی پسند اور ناپسند میں عقلی، منطقی اور فلسفیانہ دلائل کے ذریعہ خود گمراہ ہوئے اور انسانی آبادی کے بڑے گروہ کو بھی گمراہی اور تاریکی فکر کے دریا میں بہا لے گئے۔ لیکن وہ طبقۂ انسان جنھوں نے ان موضوعات کی فطری، تعمیری اور صالح صورتوں سے حقیقت تک رسائی حاصل کی، اس طبقہ سے وابستہ لوگ آج بھی بغیر کسی صلہ اور آرزو کے گلستانِ انسان اور گلستانِ ادب کی حسن ترتیب و تنظیم کے ساتھ فروغ دینے میں منہمک ہیں۔

یہاں پر میں ماضی کے تاریخی حقائق کی طرف آپ کی متوجہ مبذول کرنا چاہوں گا اور اپنی بات کو 'ذلک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین'' کی روشنی میں پیش کروں گا۔ اردو ادب کے ادبی سرمائے کا ازلی رشتہ تخلیق کائنات، تخلیق آدم اور ذالک الکتاب لاریب فیہ.. سے ہوتے ہوئے آج کی دہلیز تک پہنچا ہے۔ اور یہ دریائے ادب آپ سب کے صالح افکار و نظریات کی شمولیت کے ساتھ مستقبل میں بھی رواں اور جاری رہے گا۔ اگر ہم ذالک الکتاب لاریب فیہ سے اس کے منظّم تاریخی سفر ارتقاء پر غور کرتے ہیں تو اس کی ڈیڑھ ہزار سالہ منظّم صالح تعمیری تاریخ کے روشن اوراق ہماری نگاہوں کو خیرہ کرتے ہیں۔ ہمارے جذبات، عزم، حوصلے اور ذوقِ عمل کو مہمیز لگاتے ہیں۔ ان ایام میں دنیا تمام طرح کے علوم و فنون اور ایجادات کا گہوارہ بنی ہے۔ ان میں مذہب اور ادب بھی شامل ہیں۔ مذہب نے ہمیشہ فلاح انسانیت کو اولیت دی ہے۔ علوم و فنون کی تمام ترقیات اور انکشافات و ایجادات کو مذہب کی صالح تعلیمات، پاکیزہ اخلاق سے ذوقِ عمل کی تحریک و تقویت ملتی رہی۔ قرونِ اولیٰ میں ساتویں صدی عیسوی سے سترہویں صدی عیسوی تک۔ سائنس، آرٹ اور فنون لطیفہ کی تمام تر ترقیات اسلام اور اسلامی

تعلیمات کے زیر سایہ ہوئیں۔ یہ ایسی تاریخی سچائی ہے جسے مٹایا نہیں جاسکتا ہے۔ جب تک انسانی کارواں انفرادی اجتماعی، سماجی اور معاشرتی اعتبار سے راہِ مستقیم پر آگے بڑھتا رہا تب تک علوم وفنون اور زندگی کے تمام شعبوں میں توازن قائم رہا۔ مگر اس کے بعد دنیا جب اسلام کی صالح ہمہ گیر رہنمائی سے محروم ہوگئی اور علوم وفنون کی ترقیات کے توازن اور انسانیت پاکیزہ اخلاق کے وصف سے خالی ہوگئی۔ شر و فساد کی یخ بستہ ہواؤں میں انسانی معاشرت گرفتار ہوتی چلی گئی۔ آج انسانی معاشرت اور سماج میں مسائل اور الجھنوں کے اتنے انبار لگ چکے ہیں کہ ظاہری طور پر زندگی پر رونق نظر آرہی ہے مگر انسانی اقدار کا جنازہ بردوش ہے۔ اس صورت حال کو یہاں تک لانے میں دوسرے علوم وفنون کی طرح ادب نے بھی ایک اہم کردار نبھایا ہے۔ اٹھارہویں صدی میں جب یورپ کا تمدن اپنے مادی وسائل کی بدولت دنیا پر غالب ہونے لگا تو وہاں دوسرے علوم وفنون کے ساتھ ادب بھی متاثر ہوا۔ یورپی ادب میں مواد، ہیئت اور موضوع کے لحاظ سے جو تبدیلیاں ہوئیں اس نے انفرادی اور اجتماعی اذہان کے فکر کے دھارے کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ دنیائے ادب پر مغربی تصورات کا تسلط قائم ہوگیا۔ اس ادبی طوفان کی موجوں نے اردو کے قصرِ ادب کو بھی زد پہنچائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری صدیوں کی مستحکم قدریں پارہ پارہ ہونے لگیں۔ یورپ کی سیاسی بالادستی نے صرف قصر سلطانی کو ہی مسمار نہیں کیا بلکہ اس کی یلغار سے قصر علوم وفنون کی قدریں بھی مرعوبیت کی شکار ہوگئیں۔ شکست خوردگی، زوال وانتشار کے سبب ذوقِ عمل اور جوشِ عمل کا کارواں صراطِ مستقیم کے ساتھ پیروی مغربی کو بھی اپنانا شروع کردیا۔

یہ بڑا نازک اور بحرانی دور تھا۔ ادب وتہذیب، معاشرت وسیاست کی وحدت اور اس کا حسین مستحکم نظامِ خیال، حقیقی خوش گوار زندگی کی معنویت سے یکسر الگ ہو چکا تھا۔ خلوصِ وفا پر مبنی تہذیبی رشتے ایک دوسرے سے بے تعلق ہوکر روحانی طہارت سے خالی ہو چکے تھے۔ اخلاق وکردار، فکر وخیال اور ذوقِ عمل کی مروجہ اقدار کے سنگ ریزے سے تعمیر موجودہ معاشرتی ڈھانچہ جسم بے روح ہو چکا تھا۔ ماضی کی طہارت نفسی اور جوشِ عمل میں انسانیت سوز نئی اقدار کی مدافعت کی قوت اس میں باقی نہیں تھی۔ انفرادی، اجتماعی اور معاشرتی خواہشات وضروریات اپنے قدیم تہذیبی اداروں سے متصادم ہورہے تھے۔

تہذیبی اور اقداری بحران کے ایسے دور میں اقبال کی اور دیگر اہل ایمان قلم کاروں کی آمد سے منہدم ہوتے قصر ادب کو سہارا ملتا ہے۔ اقبال کی دورس نگاہوں نے معاملے کی سنگینی کو بھانپ لیا۔ اس دور میں اقبال کا قیام یورپ میں کئی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہیں سے اقبال کے انداز فکر میں نیا انقلاب پیدا ہوا۔ یہ انقلاب خالص اسلامی افکار ونظریات پر مبنی تھا۔ انھوں نے خود کو یورپ کے خود ساختہ خداؤں،

وحدت الوجود اور عجمیت کے اثرات سے دور کر کے قرآن کریم کی آغوش میں پناہ لی۔ اقبال قرآن کریم کی وسعتوں میں اس قدر غوطہ زن ہوئے کہ آخری گھڑی تک اس اتھاہ سمندر سے باہر آنے کا خیال تک پیدا نہیں ہوا۔ اور اسی نسخۂ کیمیا کے ذریعہ وہ بیمار انسانیت خصوصاً ہندوستانیوں، ایرانیوں اور عجمیوں کا علاج کرنے اور ان کی رگوں میں قوت وعمل کا صالح خون دوڑانے میں مصروف ہو گئے۔

یہاں چند حضرات کے ذہن میں یہ سوال ابھر رہا ہوگا کہ ماضی کی تاریخ کا اعادہ کیوں کیا جا رہا ہے؟ بات مذہبی ادب پر ہونی چاہیے اور خالص اس مذہبی ادب پر، جس پر قصر اردو ادب کا جاہ وجلال ہے۔ ان سوالوں کے جواب کا ماضی کی ادبی تاریخ سے گہرا رشتہ ہے۔

قرآن حکیم نے اپنے نزول کے ایام میں جب صالح ادب عالیہ کا تصور پیش کیا تو اپنے زمانے کا موثر .....ادب اپنی طاقت کے ساتھ دفاع میں حملہ آور ہو گیا۔ قرآن حکیم نے اس پورے منظر کو سورۃ الشعراء میں عبرت کے طور پر آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا۔ 'افاک اثیم' کے ذریعہ ان کے کردار کو واضح کر دیا کہ بدکاری اور بہتان طرازی ان کی اصل پہچان ہے۔ ان کے خیالات اور جذبات ان کے اعمال پر غالب ہوتے ہیں۔ ان کا ہر فعل اخلاقی فساد پر مبنی ہوتا ہے۔ چنانچہ ان سے افادی اور تعمیری ادب کی تخلیق نہیں ہو سکتی ہے۔ ان کے کردار واعمال کی تصویر کشی "یتبعھم الغاؤن"، "فی کل وادٍ یھیمون" اور "ھم یقولون مالا یفعلون" سے کی ہے۔ اس بیان اور کلیہ سے اس بات کا ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ اسلام اپنے ارتقائے تاریخ کے ہر دور میں ادب کی طاقت کو پیغام رسانی کا ذریعہ بنایا ہے۔ باطل افکار وخیالات، طرز عمل اور فساد اخلاق کو ختم کرنے کے لیے پاکیزہ ادب کا استعمال کیا ہے۔ انبیاء کو عطا کیے گئے تمام صحیفے اور کتابیں نہ صرف اپنے اپنے دور میں زور ادب کے لحاظ سے معیاری تھیں بلکہ آج بھی ان کی ادبی قدر وقیمت سکۂ رائج الوقت ہے۔ قرآن میں جو ادبی کنایے، استعارے اور تمثیلیں بیان کی گئی ہیں۔ مختلف انسانی کرداروں کی جو تصویر کشی کی گئی ہے۔ دعاؤں میں اظہار جذبات کے جو اسالیب اختیار کیے گئے ہیں۔ مناجاتوں کی نغمگی میں انسانی جذبات کو جس طرح جلوہ گر کیا گیا ہے۔ اس پورے سرمایۂ ادب کی اعجازی شان کے آگے انسانی کاوشیں سر تسلیم خم کر دینے پر مجبور ہیں۔ اس طرح انبیا کے خطبات اور پند ونصیحت پر مبنی جامع کلمات ادب عالیہ کے لافانی نقوش ہیں۔

تخلیق ادب اور اظہار وبیان کے لیے قرآن اور انبیاء کے فرمودات نے جو خطوط کھینچے ہیں۔ خیالات وجذبات، حوادث وتاثرات، اخلاق وکردار، تمدنی اقدار اور تاریخی روایات میں خیر وشر کی جو حد بندی اور تقسیم کی ہے اور جو معیار اور کسوٹی قائم کیا ہے ان میں انسانی بقا اور ثبات کا نسخۂ اعظم ہے۔ شعراء

اورادباء کوقرآن کے قائم کیے ہوئے ادبی اصولوں کومعیار ورہنما بنانا چاہیے۔اسی میں انسانیت کی فلاح و بہبود ہے۔ "**فاما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض**". جونظریہ،خیال،فن، پیغام،تحریک مجموعی طور پر انسانیت کی فلاح و بہبود کا ضامن ہو، بقا، استحکام اور دوام اسی کوملتی ہے۔ قرآن کے ادبی موضوعات اوراسالیب سے اس بات کا بھی ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ شاعراورادیب کا کردارواخلاق پاکیزہ ہونا چاہیے۔اگرایسانہیں ہے، وہ قوانین الٰہی سے بےتعلق اورفواحش پرستی میں مبتلا ہے۔اس سے نہ تواثر قبول کرنا چاہیےاورنہ ہی اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔کیونکہ اس کی تخلیقات میں کردار اور خیالات کی آمیزش ہوتی ہے۔اورگھٹیا خواہشات کی مظہر ہوتی ہے۔زندگی کے چند جزئی پہلوؤں کو ہمہ گیر بنا کر پیش کیا گیا ہوتا ہے۔صالح،تعمیری ادب کے مقابلے میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ایسی تخلیقات انسان کا تعلق اور رشتہ اللہ سے الگ کردیتی ہیں۔یہ تہذیب وتمدن کی تباہی کا باعث بنتی ہیں۔صاحب ایمان شاعراورادیب کبھی بھی اس روش کواختیارنہیں کرسکتا ہے۔

صاحب ایمان ادیب اورشاعر ہمیشہ قرآنی سرچشمۂ فکر سے ادبی رہنمائی حاصل کرتا ہے۔اس کاقلم باطل افکاروخیالات کے ردمیں شمشیر برہنہ ہوتا ہے۔جوزندگی انسانیت اورتہذیب کیلیے مہلک ہوتے ہیں۔وہ صرف انھیں خیالات وجذبات، روایات واقدار،تہذیب وتمدن، اشخاص وکردار کی تائید کرتا ہے۔جن میں ساری انسانیت کی فلاح وبہبود موجود ہو۔وہ "**قولو للناس حسنا**" کے رازہائے پنہااورقوت ہمہ گیری سے واقف ہوتا ہے۔وہ گفتار میں،کردار میں اللہ کی برہان ہوتا ہے۔ان کاقلم ان کی طرز گفتگو " **وقول معروف** (**محمد** : ۲۱) **و قلن قولا معروفا** (**الاحزاب**: ۳۱) کی مکمل تفسیر ہوتا ہے۔یہ تمام خصائص جب کسی تخلیقی سانچے میں ڈھلتے ہیں تو مثالی فن پارے بن جاتے ہیں۔اس کے برخلاف ''لہوالحدیث'' کے پرستار شاعروں اورادیبوں کی جماعت ہے۔جن کی تحریریں اورگفتگولوگوں کوجادۂ فلاح سے ہٹانے کا کام کرتی ہیں۔ ان کے جذبات وتاثرات سے کھوکھلی تفریح کے سوا انسان کو کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ان کے ادب پاروں سے دماغ وذہنی تعیش کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔

قرآن میں انسان کے تمام فطری مسائل سے بحثیں موجود ہیں۔فرد واحد سے لے کراجتماعی زندگی کے تمام پیش آنے والے جذبات، اخلاقی پہلوؤں کو بیان کردیا ہے۔گفتار وکردار اورقلم کی تحدید کردی ہے۔ان مباحث کے بیان کے لیے ایک معیاری اسلوب بہ طورنمونہ ومثال انسانیت کے سامنے رکھ دیا ہے۔حضرت یوسفؑ کی سرگذشت بیان کرتے ہوئے جنسی مسئلے کا ذکر کیا ہےلیکن طرز اسلوب سے یہ واضح کردیا ہے کہ اس میدان میں تقاضائے احتیاط کیا ہونا چاہیے۔حیا کے سرحدی خطہ کی کیسے حفاظت کی جانی چاہیے۔یہاں

طرز اسلوب کے اس اعلیٰ معیار سے کام لیا ہے اور ان بے جا تفصیلات سے اجتناب کیا ہے جن سے جنسی جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں زلیخا کی داستانِ معاشقہ کو مہذب و پاکیزہ کنایہ کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ ایسے مسائل کے بیان میں بے جا تفصیل نہایت خطرناک ہوتی ہے۔

قرآن انسان کی زندگی کے تمام شعبوں کی ترقی وفلاح و بہبود کا محافظ اور ضامن ہے۔ اس کی ہمہ گیریت اور آفاقیت سے برگشتہ کچھ لوگ اسے صرف عبادت کی چند رسموں کے حصار میں دیکھتے ہیں۔ وہ ہدایت سے دور ہیں۔ قرآن اور انبیاء کے ذریعہ جو اسلامی تعلیمات دی گئی ہیں وہ صرف عبادتوں کی رسموں تک محدود نہیں ہیں۔ ان میں ترک دنیا کا درس نہیں ہے۔ بلکہ انسانی فطرت کے ایک ایک تقاضے کو توازن کے ساتھ اپنے نظام میں جگہ دیا ہے۔

جس طرح انسان کو 'احسن تقدیم' کا مجسم نمونہ بنایا ہے۔ اس احسن تقویم میں حسن جمال اور ذوقِ جمال کے تمام عنصر کو بھی شامل کر دیا ہے۔ قرآن اور اسلام کے حسنِ جمال اور ذوقِ جمال کا مقصود یہ ہے کہ پوری انسانی زندگی حسن و جمال سے مزین ہو جائے۔ وہ خیالات و جذبات میں، بول چال میں، وضع قطع میں، میل جول میں، نشست و برخاست میں، سیرت و کردار میں، نظام تمدن کی مجموعی حیثیت میں حسن و جمال کا مرقع بنایا ہے۔ اس نے مقاصد نبوت کی عزیمت میں تزکیہ کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ یہاں تزکیہ سے مراد صالح پاکیزہ زندگی کی آراستگی سے ہے۔ اسلام صرف دکھاوے کے آرٹ تک ہی مظاہرہ جمال کو محدود نہیں کرتا ہے بلکہ وہ حیات انسانی کے جملہ شعبوں پر اس کو پھیلاتا ہے۔ وہ صرف جسم کو مزین کر دینے پر مطمئن نہیں ہوتا ہے۔ وہ روح کی خوبصورتی، پاکیزگی کا طلب گار ہے۔ وہ زینت، صفائی، نفاست، طہارت اور سلیقے کا بھی تقاضا کرتا ہے۔ وہ زندگی کو حیاتِ طیبہ کی روشنی میں گزارنے کا متقاضی ہے۔ وہ مسکراتے چہرے اور میٹھی گفتگو کو صدقہ قرار دیتا ہے۔ پیغمبر انسانیت نے دنیا کے تمام فرسودہ مذہبی نظریات اور معیاروں کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ دنیا کی تین چیزیں نماز، عورت اور خوشبو مجھے زیادہ پسند ہیں۔ ان چیزوں کی پسند سے ذوق جمال کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

صالح زندگی اور صالح معاشرہ کی حسن ترتیب و تنظیم میں اسلام نے ہر جگہ کچھ حد بندی قائم کی ہیں۔ چنانچہ ذوقِ جمال کی نشوونما کے ساتھ یہاں بھی حد بندیاں قائم کی ہیں۔ ان حدود کو عائد کرنے کی اصل غرض و غایت انسانیت کو اندھی لذتیت اور تعیش سے پاک رکھنا ہے۔ بال جبریل کی غزلوں کے چند اشعار میں ان تاثرات کی کارفرمائی دیکھیں۔

سینہ روشن، ہو تو ہے سوزِ سخن عین حیات ہو نہ روشن، تو سخن مرگِ دوام اے ساقی!

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی
اب کیا جو فغاں میری پہنچی ہے ستاروں تک تو نے ہی سکھائی تھی مجھ کو یہ غزل خوانی

متذکرہ بیان کی صورت میں جو آپ کے روبرو پیش کیا ہے اس پس منظر میں کہہ سکتے ہیں کہ مذہب اور ادب کا رشتہ ہمیشہ سے قائم رہا ہے۔ اردو کے فروغ میں بھی تمام مذاہب کے علاوہ مذہب اسلام کی سب سے زیادہ حصہ داری ہے۔ اردو زبان کے تشکیلی دور کے بعد جو تحریریں ہمارے سامنے آتی ہیں ان میں اسّی فیصد مذہب اسلام کے موضوعات سے گہرا تعلق اور رشتہ ہے کیونکہ قرآن نے فلاح انسانیت کی جو تعلیم دی ہے اور سیرت طیبہ کے ذریعہ صالح معاشرہ کی ترتیب و تنظیم جس اصولی زاویے سے کی ہے ان تمام فرمودات کا تعلق ادب عالیہ کے اعلیٰ اور معیاری اظہارِ بیان سے ہے کیونکہ انسان، مذہب، زبان اور ادب کا باہمی رشتہ ایسا ہے کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں کی رہنمائی کرتا ہے اور انسان کی فلاح و کامیابی کا درس بلیغ و عظیم دیتا ہے۔ ان تمام تعلیمات کو قرآن اور احادیث نبوی کے اعلیٰ معیاری ادبی پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ ان اظہار بیان میں لفظیات کا استعمال استعارے، کنایے، تشبیہات کے اہتمام میں اس قدر جاذبیت اور تاثر کی سحر انگیزی ہے کہ دل خود بخود کھنچے چلے جاتے ہیں۔ یہ چشمۂ ادب، عربی فارسی کے ذریعہ ہوتے ہوئے براہِ راست اردو کی کشت ادبیات کو سیراب کیا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ادب سے انسانی زندگی کے موضوعات اور مسائل کو الگ کر دیا جائے تو ادب کا وجود صفر ہو جائے گا۔ اسی کے ساتھ ادب کا حقیقی انبساط اور استحکام مذہب کے ساتھ وابستہ ہے۔ مذہب انسانی زندگی کے متنوع مسائل کو موضوعات کی صورت میں مواد فراہم کرتا ہے۔ مذہب انسانی زندگی کو بہتر اور خوش گوار بنانے کا جذبہ و فکر عطا کرتا ہے۔ بہتر زندگی اور صالح معاشرہ اس کا اولین مقصد ہوتا ہے۔ اس کلیہ سے یہ بات واضح اور ثابت ہوتی ہے کہ زندگی کا بناؤ اور سدھار جن اقدار پر منحصر ہے ان سے بے نیاز ہو کر کوئی ادب اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا ہے۔ کائنات اور انسانی زندگی کے پس پردہ ایک ایسا نظام ہے جو ان سب کو فلاح و بہبود کے ساتھ قائم رکھے ہوئے ہے۔ اسی نے ہمیں نطق و گوئی، عقل سلیم، فہم و ادراک کے ساتھ آزادیٔ غور و فکر اور اظہار کی قوت دے کر، قول و فعل کی نگہہ داشت کر رہا ہے۔ ہم اسے تسلیم کریں یا نہ کریں۔ کائنات، انسان، مذہب اور ادب کے موضوع پر جس قدر غور و فکر کے نظریات میں اختلاف ہے اسی سے اس کی حقیقت کا بھی انکشاف ہوتا ہے۔ اگر ان موضوعات کے تمام مختلف فیہ نظریات کا تجزیہ کریں تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ انسانیت کی فلاح و بہبود کا مسئلہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے یہ انسان

کے ساتھ وجود میں آیا ہے۔ان پر ماضی میں بھی غور وفکر ہوا ہے اور صرف آج ہی نہیں بلکہ مستقبل میں بھی غور وفکر کا محتاج رہے گا۔ارتقائے زندگی کے ساتھ ہر عہد میں خود انسان ہی انسانی مسائل کو حل کرنے کی کوششیں کی ہیں اور ادب انھیں کوششوں کا ترجمان رہا ہے۔اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مرورِ ایام کے ساتھ روئے زمین پر، ادب کے سلسلے میں مختلف ممالک میں اختلافات رونما ہوئے ہیں۔وہ مقاصد کے اختلافات نہیں تھے بلکہ صرف اور صرف غور وفکر میں نقطۂ نظر کا اختلاف تھا۔اسلام کا اردو میں مذہبی ادب اسلام کے اس نقطۂ نظر کا توسیعی علم بردار ہے جس میں انسانی زندگی کے مسائل کو حل کرنے کا نسخۂ کیمیا ہے۔اردو کا مذہبی سرمایۂ ادب ان خصوصیات کا حامل بھی ہے۔

دل بینا بھی کر خدا سے طلب آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں
اک جنوں ہے کہ باشعور بھی ہے اک جنوں ہے کہ باشعور نہیں
(بال جبریل،غزل۲۰)

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر کرتے ہیں خطاب آخر، اٹھتے ہیں حجاب آخر
احوالِ محبت میں کچھ فرق نہیں ایسا سوز وتب وتاب اول، سوز تب وتاب آخر
تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا کہہ ڈالے قلندر نے اَسرارِ کتاب آخر
(بال جبریل،غزل۲۹)

موضوع گفتگو چونکہ مذہبی ادب ہے۔اردو کا مذہبی ادبی سرمایہ اس اعتبار سے اپنی ایک شناخت رکھتا ہے۔اس نے دنیا کے دیگر مذاہب کے مقابلے میں اسلام سے براہِ راست استفادہ کیا ہے۔اس کا مذہبی ادبی سرمایہ بھی تمام اصنافِ سخن پر محیط ہے۔اس اعتبار سے اگر ہم اس سرمایہ کو اگر اسلامی ادب کے نام سے موسوم کریں تو لوگوں کو تعجب نہیں ہونا چاہیے اور نہ کسی کشمکش میں مبتلا ہونا چاہیے کہ اس نام سے ادب کا دائرہ محدود ہو جائے گا اور صرف ایک ہی نقطۂ نظر کا نمائندہ ادب کہلائے گا۔اس کی وسعت اور ہمہ گیریت پر حرف آئے گا۔اس ضمن میں میرا یہ استدلال ہے کہ ادب اگر زندگی کی گوناگوں مسائل کی تفسیر اور تنقید کا نام ہے تو تفریق اپنے آپ ظاہر ہو جاتی ہے۔کیونکہ حقائق پر مبنی گوناگوں مسائل کی تفسیر اور تنقید کسی خاص نقطۂ نظر سے ہی ہوتی ہے۔کوئی بھی آزاد خیال ادیب، زندگی پر جب بھی غور وفکر کرے گا کسی نہ کسی خاص زاویۂ نگاہ کے پس منظر اور پیش منظر کے خطوط پر کرے گا۔وہ اس زاویۂ نگاہ کی روشنی میں تجزیہ کرے گا جس کا وہ پابند ہوگا۔انسانی حیات وکائنات کا کوئی خاص تصور رکھتا ہوگا۔اس کا مطالعہ ومشاہدہ اسی پیمانے کی روشنی میں نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرے گا اور اسی کے مطابق عام انسانی مسائل سے بحث کرے گا۔

انسانی حیات وکائنات سے متعلق اسلام کا اپنا ایک خاص نقطۂ نظر ہے۔اس کے اصول اور ضابطے بھی بالکل واضح ہیں۔ چنانچہ اس نقطۂ نظر کا حامی اسلامی ادیب بھی وہی کرتا ہے۔ وہ زندگی کے تمام تصورات کو مسترد کر کے روئے زمین پر آباد انسانی مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ انسانی فلاح واقدار کی کامیابی کا انحصار اسی اسلامی نقطۂ نظر کو سمجھتا ہے۔ یہ حقیقت سب پر واضح ہونی چاہیے کہ انسان کی اصلی حیثیت کیا ہے۔اس کی تخلیق کے اغراض کیا ہیں۔ یہ سوال بے معنی ہوگا کہ انسان کی بھلائی کس چیز میں ہے۔اس بنیادی سوال کو نظر انداز کر کے انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے جو بھی نظریہ پیش کیا جائے گا وہ گمراہ کن ہوگا۔ ماضی قدیم سے لے کر آج کی دہلیز تک جو بھی تحریکیں وجود میں آئیں وہ انسانی تخلیق کے اصل غرض کی ناواقفیت کے سبب اب تک وہ منزل سے دور ہیں۔

اردو میں اسلام کا مذہبی ادبی سرمایہ تفسیر قرآن، توضیح الاحادیث، فقہ اور تاریخ پر پھیلا ہوا ہے۔اس سرمایے میں انسانی اخلاقی قدروں کی تعمیر اور انسانیت کی فلاح و بہبود کا حکیمانہ نسخہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کسی ایک فرد یا جماعت کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ روئے زمین پر آباد تمام انسانیت کے لیے عام ہے۔ان میں خواہشات نفسانی اور بے جا تفریح کے اجزاء کی شمولیت بالکل نہیں ہے۔اس مذہبی ادبی سرمایہ کا مقصد بے جا تفریح کی نفی اور دائمی اخلاقی قدروں کی تعمیر پر منحصر ہے۔اس اعتبار سے ادب کی جامعیت، افادیت اور اہمیت دیگر ادبی اثاثے کے مقابلے میں بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ وہ لوگ جو ادب کو محض تفریح کا سامان تسلیم نہیں کرتے ہیں ان کا بھی یہ ماننا ہے کہ اگر ادب انسانیت کی فلاح و بہبود کا مقصد رکھتا ہے تو وہ اخلاقی اقدار سے آزاد نہیں ہوسکتا ہے۔ جو لوگ اخلاقی قدروں کو ضروری اور دائمی تصور نہیں کرتے ہیں تاریخ شاہد ہے ان کے خود ساختہ نظریاتی قدروں سے انسانیت ہمیشہ ظلم واستبداد کا شکار ہوئی ہے۔ یہ معاملہ اس وقت زیادہ سنگین ہوجاتا ہے جب کسی انسان یا جماعت کو دوسری جماعت پر حکومت اور فرمانروائی کی قدرت حاصل ہوتی ہے۔اقتدار اور طاقت کے نشہ میں ہمیشہ اس نے اپنے فاسد نظریات اور پسند و ناپسند کو، دوسروں کو ان کا پابند بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ کشمکش آج بھی جاری ہے جسے آپ دیکھ اور محسوس کر رہے ہیں۔ یہ صورتِ حال خود اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کی بنائی تمام قدریں اور خیر وشر کے تمام معیار اصلاً غلط ہیں۔ کیونکہ ان معیار میں کامل غیر جانب داری کا فقدان ہے۔آج ہر ذی شعور انسان اپنی کھلی آنکھوں اور دماغ سے دیکھ رہا ہے کہ تسخیر فطرت کے باوجود پرسکون، صالح، پاکیزہ معاشرہ اور انسانیت کا خواب روئے زمین کے کسی حصے میں شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا ہے۔قدروں کی پامالی سے بستیوں سے دھواں اٹھ رہا ہے اور زخمی انسانیت کا جنازہ بردوش ہے۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا　　زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

اسلام کا مذہبی ادب قرآنی تعلیمات اور احادیث نبوی پر مبنی ہے۔ یہ ادب ہمیں آفاقیت کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ نظامِ حیات ہمیں قرآن سے ملا ہے۔ یہ نظامِ حیات، کائناتی اور آفاقی ہیں۔ ملک وملت، قوم ووطن اور رنگ ونسل کی حد بندیوں سے آزاد ہے۔ یہ ہمہ گیر ہے۔ یہ تمام ابن آدم اور انسانیت کے لیے ہے۔ اسلام نے انسانیت کے مرتبے کو بلند کیا ہے۔ انسان انسان میں فرق نہیں رکھا ہے۔ بین الاقوامی وحدت واخوت کی تعلیم دیتے ہوئے امام الانبیاء حضرت محمد ﷺ کا ارشاد ہے:

''میں کالے اور گورے اور سرخ وسفید سب کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں''۔

یہ وحدت ابن آدم اور احترامِ آدمیت وانسانیت کے اصول پر زندگی کو اسلامی نظام میں مربوط کرنے کی تلقین تھی۔ نبی کریم ﷺ کا خطبۂ حجۃ الوداع بھی اس آدمیت کی عظمت کو بیان کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''انسانو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے۔ اور تمھیں جماعتوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا تاکہ تم پہچانے جاسکو، تم میں زیادہ عزت اور بزرگی والا خدا کے نزدیک وہی ہے جو خدا سے زیادہ ڈرنے والا ہے''۔

''نہ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی عجمی کو عربی پر، نہ کالا گورے پر افضل ہے اور نہ گورا کالے پر، ہاں بزرگی اور فضیلت کا اگر کوئی معیار ہے تو صرف تقویٰ ہی ہے''۔

یہ تھا وہ عالمگیر اخوت ووحدت اور بین الاقوامی انسانیت کی قدروں کا بنیادی منشور جس کے سہارے دنیا میں صلح وآشتی اور امن وسکون کا دور دورہ ہوا اور آئندہ بھی ہوگا۔

عہد حاضر میں آزادی اور عالم گیر انسانی برداری کا تصور ابھر کر سامنے آرہا ہے۔ انھیں آج کی عظیم قدروں کی صورت میں پیش کیا جارہا ہے۔ بڑی سے بڑی سیاسی، سماجی اور ادبی تحریکیں اور ترقی یافتہ ادبی نظریے اسے اپنانے اور پیش کرنے میں فخر محسوس کررہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ قدریں عمل کی دنیا میں کہاں پائی جاتی ہیں؟ آج پورے کرۂ ارض پر وحدت انسانی کی قبا رنگ ونسل اور زبان ووطن، عقائد ونظریات کے ہاتھوں پارہ پارہ ہے۔ یہ دونوں قدریں صرف اسلامی نظام زندگی میں دستیاب ہیں۔ آج کے عہد کی سیاست وادب کا فلسفہ جس شئے کی تلاش میں سرگرداں ہیں وہ اسی اسلامی منشور میں موجود ہے۔

خطبۂ حجۃ الوداع انسانیت کی عظمت، وحدت اور اخوت کا چارٹر قیامت تک اور اس کے بعد کے لیے ہے۔ عرفات کے میدان سے حضرت محمد ﷺ کے خطبے سے صدیوں تک کے لیے انسانیت کا وقار بحال ہوا ہے۔ یہ خطبہ حقوقِ انسانی کے تحفظ کا علمبردار ہے۔ اقوام متحدہ کا منشور بھی اسی جذبۂ انسانیت

کے زیر اثر ظہور پذیر ہوا ہے۔ اقوامِ متحدہ کا منشور خطبۂ مبارک سے ہی ماخوذ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا آفاقی پیغام احترامِ آدمیت، آزادی اور عالم گیر برادری تمام دنیا میں پھیل چکا ہے۔ اقوامِ متحدہ اور ادبی نظریات کا تجربہ بھی آفاقی حاکمیت کے نظریے کی طرف کشاں کشاں جا رہا ہے۔ لیکن انسانیت کی مشکلات کو حل کرنے سے پہلے یہ امر ملحوظ خاطر رکھ کر سمجھنا ضروری ہے کہ اس کائنات کا خالق کون ہے؟ انسان کا خالق کون؟ نظامِ کائنات کس کے قبضۂ قدرت میں ہے؟ ان سارے سوالوں کے جواب قرآن اور حجۃ الوداع کے خطبے میں موجود ہے۔

اصلی حاکم سب کا اللہ ہے جس نے انسان کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا۔ اور انسان کو انسان کے برابر بنایا۔ اسلام نے انسانیت کے اصولوں پر جب کہ تمام دنیا میں غلامی کی لعنت پھیلی ہوئی تھی۔ ایک ایسی اسٹیٹ بنادی جس میں آقا اور غلام ایک ہو گئے۔ جس میں اللہ اکبر کی آواز عربوں کے شہر مکہ سے ایک حبشی نے بلند کی۔ اپنے عقائد اور نظریات سے حضرت محمد ﷺ ایک ابدی پیغام تمام انسانیت کے لیے لائے اور اس کا نمونہ پیش کیا کہ کس طرح مختلف قومیں رنگ و نسل کی تفریق کے بغیر پُر امن طور پر زندگی بسر کرتی رہیں اور کئی ملک اور متعدد براعظم ایک ساتھ خلافت کے زیر سایہ پھلتے پھولتے رہے۔ ہر شخص اس عالمی ریاست کا شہری تھا۔ ہر فرد آزاد تھا۔ کسی کو بھی نقل و حرکت کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ ملکوں اور قوموں میں کسی پاسپورٹ کا نظام نہیں تھا۔ دنیا کا ہر فرد زمین کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں جا سکتا تھا آباد ہو سکتا تھا۔ چونکہ حکومت ربانی تھی۔ ایک اللہ کے احکام کی حکومت تھی۔ وحدت کے اس عالم گیر عقیدے اور نظریے میں سارے اختلافات مٹ جاتے ہیں۔

اردو میں اسلام پر مبنی مذہبی ادب اسی احترامِ آدمیت، آزاد اور عالم گیر انسانی برادری کا توسیعی حصہ ہے۔ اردو میں اسلامی مذہبی ادب متذکرہ قدروں کا علم بردار ہے۔ اسے بخوبی علم ہے کہ فرد، فرد کی شخصیت کی نشو و نما آزادی کے بغیر ممکن نہیں ہے اور انسانیت کے مسائل اور درد کا علاج اس وقت تک نہیں ہو سکتا ہے جب تک ایک انسان دوسرے انسان کو اپنا جیسا ہی نہ سمجھے۔

یہی مقصود فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ وخوں کی توڑ کر ملت میں گم ہو جا نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی
اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ مِلَل ، حکمتِ افرنگ کا مقصود! اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم!
مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم!

انسانی خود ساختہ عقائد اور نظریات پر مبنی تحریکیں، اصلاح روح اور اصلاح دل کا دعوی کرتی ہیں۔ اخلاقیات اور عمرانیات کو موضوع گفتگو بناتی ہیں۔لیکن خواہشاتِ نفسانی کے شیریں جام، انھیں کب گمراہ کر جاتا ہے۔ پتہ ہی نہیں چلتا ہے اور وہ اس خود ساختہ دلدل میں گرفتار ہو کر انسانیت کے لیے عذاب کا باعث بن جاتے ہیں کہ صدیوں تلک اس سے نجات پانا مشکل ہو جاتا ہے۔اس سلسلے میں 'لوتھر' ی تحریک Reformation کی مثال دی جاسکتی ہے۔اس کی تحریک نے سیاسی رنگ اختیار کر لیا تھا اور عقیدے کی حکومت، یعنی عیسائیت کے عالمگیر اخلاق کی جگہ قومی اخلاقیات کے مختلف نظام نے لے لی تھی۔یعنی 'لوتھر' کی تحریک سے نام نہاد نیشنلزم کو فروغ ہوا تھا۔جس کا انجام دنیا نے جنگ عظیم کے سانحہ کی صورت میں دیکھ لیا ہے۔اس لیے اس سانحہ سے سبق لے کر اسلام کے مدنی نظام کے نفاذ پر غور وفکر کرنا چاہیے۔ اسلام کی عالم گیر انسانی اخوت کے جملہ اجزاء کو قائم رکھنے کی اہمیت اور ضرورت پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہر تحریک اور نظریہ اپنا ایک ادب پیش کرتا ہے۔موضوعات کا انتخاب کرتا ہے۔اس کے ذریعہ افراد اور جماعتوں کی ذہن سازی کرتا ہے۔انھیں اپنا موافق بناتا ہے۔

> ''اسلام کی زندگی میں ہر ایک عہد میں مذہب نے فلسفے کی راہبری کی ہے۔صرف اسی لیے اخلاقیات اور انسانی اعمال روشنی حاصل کرتے ہیں۔لیکن جب مذہب کمزور پڑ جاتا ہے اور اپنا اصلی جوش ختم کر بیٹھتا ہے تو قوم میں مذہبی رہنما غائب ہو جاتے ہیں اور روحانی لیڈرشپ صرف اہل فقہ کے پاس رہ جاتی ہے۔اور ان فقیہوں کے لیے روایت ہی راہبری کا ستارہ بن جاتی ہے لیکن فلسفہ کہتا ہے کہ میرا راہبر ستارہ تو عقل ہے۔تم دائیں ہاتھ جاؤ میں بائیں ہاتھ کو جاؤں گا۔'
>
> مذہب اور فلسفہ دونوں انسان کی روح پر اپنا دعویٰ کرتے ہیں اور اسے اپنی طرف لانے کی کوشش کرتے ہیں جب یہ کشمکش جاری ہوتی ہے تو ٹھوس تجربہ مثبت سائنس کو جنم دیتا ہے۔ روایت تاریخ ہے اور عقل تاریخ کا طریقۂ کار۔ دونوں ایک روحانیت سے معمور دل کی طرف بڑھتے ہیں۔ مذہب ایک مثبت سائنس ہے۔جس مدعا دل کو روحانیت سے معمور کرنا ہے۔ (خطبات اقبال:ص۱۶۰)

اسلام کے مذہبی ادب کی قدر و قیمت کا انحصار اس کے متنوع موضوعات پر منحصر ہے۔کیونکہ کسی بھی ادب کی قدر و قیمت کا تعین اسی میزان پر ہوتا ہے۔اس کے موضوعات زندگی کے تمام مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔اس میں اخلاقیات، عمرانیات، سماجیات، سیاست، روحانیت سب کچھ موجود ہے۔اس

اعتبار سے اس کا معیار گراں مایہ، مثالی اور رہبر انسانیت ہے۔

اردو میں اسلامی نظریاتِ زندگی کے پس منظر میں خامہ فرسائی اور فکری اظہار کرنے والے شعراء اور ادباء کو یہ امر ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ ان کی تحریریں اور تخلیقات محض پند اور نصیحت کے خانے میں سمٹ کر نہ رہ جائیں، کیونکہ ادب فن لطیف ہے یہاں منطقی استدلال کی گنجائش نہیں ہے۔ ادب کے خاص اصول اور ضوابط ہیں۔ ادب کا سارا اظہار بیان مرقع کشی، منظر کشی، رمز، کنایہ، استعارہ اور طرز ادا کے پرکشش اظہار کا مرہون منت ہے۔ ان کا پابند ہونا لازمی ہے۔ ادب میں اس سے نئی اور دلکش ہیئت وجود میں آتی ہے۔ تجربات کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ ان کے بغیر تخلیقات کا معیار کم ہو جاتا ہے۔ ادب میں ان متذکرہ اجزاء سے بے اعتنائی قابل قبول نہیں ہے۔ اس کے بغیر کسی فن پارے میں دلکشی پیدا نہیں ہو سکتی ہے۔

ہند کی سرزمین پر تاریخی ادوار کے اعتبار سے اگر اردو میں مذہبی اسلامی ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس وقت کے علماء و مشائخ کی مجالس سے علمی بحثوں کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن ہمیں خاطر خواہ مذہبی تحریروں کا اعلیٰ معیاری کام کا سراغ نہیں ملتا ہے۔ کیونکہ اردو زبان کا یہ تشکیلی دور تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہند کی سرزمین پر عہد اکبری میں قرآن باترجمہ پڑھنے کا رواج نہیں تھا، نہ ہی یہاں تفاسیر موجود تھیں۔ مذہبی ادب اور تحریروں پر تحقیقی نگاہ رکھنے والوں کا متفقہ کہنا ہے کہ شرح حدیث تو یہاں کے علماء کے کتب خانوں میں بھی دیکھنے میں نہیں آتی تھیں۔ یہاں تک کہ احادیث کی صحاح ستہ بھی اکناف ہند میں عام طور پر دستیاب نہیں تھیں۔

عرصۂ دراز کے بعد شیخ عبدالحق محدث دہلوی حرمین شریفین تشریف لے گئے۔ وہاں کی علمی مجالس اور محدثین سے کسب و استفادہ کیا۔ اس سفر سے انھیں معلوم ہوا کہ کنز ہی علوم اسلامیہ کی کل کائنات نہیں ہے۔ فقہ اسلامی کے اصل ماخذ تو اور ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ترویج حدیث کے لیے ابتدائی قدم اٹھائے اور 'مشکوٰۃ شریف' کا ترجمہ کیا۔ ان کے بعد یہ سلسلہ آگے بڑھا۔ مجدد الف ثانی اور پھر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی بھرپور کوششوں سے فقہ کے ساتھ ساتھ قرآن و سنت کی جانب امت کی توجہ مبذول ہوئی۔ اس کے بعد شاہ اسمٰعیل دہلوی، شاہ محمد فاخر زائر الہ آبادی، سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی، نواب صدیق حسن خاں وغیرھم کی مساعی جمیلہ سے یہاں کی مذہبی فضا میں خاطر خواہ تبدیلی آئی، ان کے علمی کاموں سے لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ اس کی شہرت اکناف عالم میں حجاز و مصر تک پہنچ گئی۔ علامہ رشید رضا مصری جیسے بالغ نظر محقق کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ علمائے ہند کی کاوشوں سے سارے عالم میں از سر نو حدیث رسول ﷺ کا غلغلہ عام ہوا ہے۔

اٹھارہویں صدی میں قرآن اور احادیث نبوی ﷺ اور تاریخ وفقہ کی کتابوں کے تراجم کے ذریعہ بڑے پیمانے پر دینی ادب کی ابتدا ہو چکی تھی۔ لیکن اس کی رفتار بہت آہستہ تھی۔ انیسویں صدی میں اس میں زود رفتاری آئی لیکن سیاسی انتشار کے سبب خاطر خواہ کامیابی نظر نہیں آتی ہے۔ لیکن اسی سیاسی اور سماجی انتشار میں مذہبی ادب کے فروغ کی شاہ راہ تیار ہوئی۔ اس صدی کے نصف آخر میں جن لوگوں نے مذہبی ادب کی طرف توجہ دی ان کے توسط سے ایک ایسا طبقہ اور ایسی جماعت وجود میں آئی جس نے بیسویں صدی میں مذہب کو وہ بلندی عطا کی جس کی نذیر آج اور کل بھی پیش کی جائے گی۔ انیسویں صدی کے مذہبی ادب کی کہکشاں کے میر کارواں سرسید احمد خاں تھے۔ ان کے رفقاء میں مولانا محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی وغیرھم نے دیگر علوم وفنون کے علاوہ اپنے مذہبی افکار ونظریات اور تحریروں سے ادب وفن کی جو آبیاری کی ہے وہ ہمارا عظیم سرمایۂ ادب ہے۔ ان کا مخصوص مطالعہ آج کی دہلیز پر ہونا چاہیے۔ جس کی ابتدا آج کے کانفرنس سے ہو رہی ہے۔

بیسویں صدی کے مذہبی ادب کا افق، ادباء کی کہکشاں سے تابناک ہے۔ ان کی فہرست طویل ہے۔ اس کہکشاں کے روشن ستارے غلام احمد پرویز (وفات 1958ء)، ابوالاعلیٰ مودودی (وفات 1979ء)، مولانا عبداللہ سندھی، مولانا ثناءاللہ امرتسری، ڈاکٹر حمیداللہ، اشتیاق حسین قریشی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا جعفر شاہ پھلواری، صباح الدین عمر، شاہ معین الدین، ابوالحسن علی ندوی، سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، وغیرھم نے دینی موضوعات پر اردو زبان میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی مذہبی ادبی تحریروں کا آغاز الجمعیت دہلی اور ترجمان القرآن دکن سے ہوا۔ لیکن ادبی شہرت معارف، نگار، مخزن، اور الجمعیۃ کے خالصتاً دینی مضامین سے ملی۔ 'الجہاد فی الاسلام' ان کی مایۂ ناز ادبی کتاب ہے۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ 'تفہیم القرآن' ہے۔ جو علمی دنیا کو معارف قرآنی سے متعارف کراتا ہے۔ مولانا نے اپنی ادبی تحریروں کے ذریعے مذہب کو زندگی کے پورے نظام پر منطبق کر کے اللہ کی خالقیت اور حاکمیت کے تصور کو فروغ دیا۔ مولانا کے اجتہادی افکار، سماجی وسیاسی نظریات پر اعتراضات بھی ہوئے لیکن اختلاف پر توجہ نہ دے کر اپنا مرکزی موقف اسلوب کی شائستگی سے جوڑے رکھا۔ مولانا مودودی کے بعد ان کے مذہبی افکار ونظریات کو معیاری ادب کی شکل میں پیش کرنے میں پروفیسر خورشید احمد، گلزار احمد مظاہری، نعیم صدیقی، اسعد گیلانی کی تصنیفات نے اہم رول ادا کیا ہے۔

اردو کے مذہبی ادب کو ایک نئے زاویئے سے استحکام عطا کرنے میں مولانا ثناءاللہ امرتسری کی خدمات کا ذکر بھی از حد ضروری ہے۔ انھوں نے آریہ سماج اور عیسائیت کی تبلیغی کوششوں کو مناظرانہ قوت

سے روکا۔قرآن اور احادیث کی صحیح تعلیمات کو لوگوں کے دلوں میں راسخ کرنے کی کوشش کی۔سات جلدوں پر مشتمل ان کی تفسیر 'تفسیر ثنائی' کے نام سے مشہور ہے۔ان کی تفسیر سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ دیانند سرسوتی کی دل آزار کتاب 'ستیارتھ پرکاش' کا مدلل جواب مولانا نے 'حق پرکاش' سے دیا۔دنیا کا کوئی بھی ادب ہو،خلوص اور صداقت اس کے بنیادی اجزاء ہوتے ہیں۔اگر ادب کا تعلق زندگی سے ہے تو بغیر حق ،خلوص اور صداقت کے وہ جسم بے روح کی طرح ہے۔کوئی بھی تحریر اگر ان اجزاء سے خالی ہیں تو وہ اعتبار کی نگاہ سے گر جاتی ہیں۔ادیب اور شاعر کا قول وفعل اور کردار خلوص صداقت اور عالم گیر اخوت کا آئینہ صفت ہونا ضروری ہے۔اس کی تخلیقات میں اس کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے۔اس اعتبار سے اسلام کا مذہبی اردو ادب اپنی شخصیات کا عکس و آئینہ ہے۔انھوں نے اپنے افکار وخیالات اور قول و کردار سے اپنی تحریروں کو فی کل وادٍ یھیمون اور یقولون مالا یفعلون' کے الزام سے بچائے رکھا۔جس کا درس قرآن نے دیا ہے۔

اس مختصر سی تحریر اور گفتگو میں موضوع سے متعلق جس طرح کی بات ہونی چاہیے تھی نہیں ہو پائی ہے۔مجھے اس تشنگی اور کمی کا احساس ہے۔کیونکہ یہ موضوع 'اردو ادب کے فروغ میں مذہبی ادب کا رول' کئی صدیوں کی تاریخ پر مشتمل ہے۔اس کے جمع وتدوین کے لیے اور اظہار خیال کے لیے وقت درکار ہے۔امید کرتا ہوں کہ باقی کے اجلاس میں الگ الگ زاویے سے اس پر جامع بحث ہوگی۔



اردو زبان پرقرآن مجید کے اثرات۔ایک سرسری جائزہ

ڈاکٹر شیخ سعید احمد عمری، وانم باڑی

کسی بھی زبان وادب کے وجود کے کچھ عوامل واسباب ہوتے ہیں۔جن میں سماجی ومعاشرتی تعلقات، سیاسی وحکومتی نظم وضبط معاشی وتعلیمی ضرورتیں قابل ذکر ہیں۔اردو زبان وادب کے وجود میں بھی کم وبیش اس طرح کے اسباب کارفرما نظر آتے ہیں۔اسی طرح کسی زبان وادب کے فروغ کے بھی کچھ عوامل واسباب ہوتے ہیں۔ان میں سرفہرست دین ومذہب علمی افکار ونظریات اور تہذیب وتمدن ہیں اردو زبان وادب کا فروغ بھی ان عوامل کا مرہون منت ضرور ہے۔انگریزی زبان وادب پر بائیبل کے اثرات ،سنسکرت زبان وادب پرویدوں کے اثرات اور تامل زبان وادب پر ترکورل اور مذہبی کتابوں کے اثرات اگر ہوسکتے ہیں تو اردو زبان وادب پر قرآن اور اسلام کے اثرات کیوں نہیں ہوسکتے چنانچہ یہ اثرات نہ صرف اردو زبان میں الفاظ کے ذخیرے تک محدود رہے نہ نحو وصرف کے قواعد ہی میں منحصر ہوئے اور نہ بلاغت وعروض کی شکلوں میں ہی پوشیدہ رہ سکے بلکہ اردو کے اصناف سخن اور اردو تنقید تک پھیل گئے۔اس چھوٹے سے مقالے میں انہی بعض اثرات کا جائزہ لیا گیا جو سب سے پہلے ترجمہ قرآن مجید کی راہ سے اردو زبان وادب پر مرتب ہوئے

ترجمہ کی اہمیت اور افادیت:

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ترجمہ ہی وہ ذریعہ ہے جس کے واسطے سے کسی بھی زبان وادب میں موجود علوم وفنون کے خزانوں کو دوسری زبان وادب میں منتقل کیا جاتا ہے۔اگر ترجمہ نگاری کا فن نہ ہوتا تو دنیا کے بے شمار اہل علم وفن، مورخین، مفکرین ،فلاسفہ ،معلمین، محققین اور موجدین کی کاوشیں اور تحریریں پوری دنیائے انسانیت کی میراث کیسے بن سکتی تھیں۔مگر ترجمہ کا فن بڑی مہارت اور ریاضت کا متقاضی ہے کیوں کہ ایک زبان اور ادب سے دوسری زبان وادب میں معانی ،مضامین مطالب اور معلومات کو اس طرح منتقل کر دینا کہ اصل اور ترجمہ کا فرق مٹ جائے کوئی آسان بازی نہیں۔اس کے لئے ایک طرف مترجم کو دونوں زبان وادب کے ذخیرے پر گہری نظر ودسترس ہونی چاہئے تو دوسری طرف دونوں زبانوں کے مابین الفاظ وکلمات تراکیب وتعبیرات ،اسالیب میں یکسانیت یا مماثلت یا کم از کم مقاربت کی ضرورت پڑتی ہے۔

پھر ترجمہ کے اثرات، ترجمہ کی زبان وادب پر بھی مرتب ہونے لگئے ہیں۔ترجمہ کی راہ سے بے شمار جدید الفاظ وکلمات ، اصطلاحات ، محاورے ، کہاوتیں ،تشبیہات ،استعارے ،تلمیحات اور ضرب الامثال اس زبان میں جنم لینے لگتے ہیں اور اسکی میراث بن جاتے ہیں نیز ترجمہ میں اصلیت کی شان بر قرار رکھنے کے لئے اس زبان کے اسلوبِ بیان وطرز ادا میں تبدیلیاں بھی کرنی پڑتی ہیں۔کیوں کہ ترجمہ صرف ایک زبان کے الفاظ کو دوسری زبان میں نقل کر لینے کا نام نہیں بلکہ ترجمہ میں اہل زبان کے افکار وخیالات بلکہ جذبات واحساسات تک کو بھی اسی ترتیب سے منتقل کرنا پڑتا ہے۔

قرآن مجید کی زبان اور اس کا موضوع:

قرآن مجید آخری آسمانی کتاب ہے جسے اللہ تعالی نے اپنے آخری رسول حضرت محمد ﷺ پر نازل فرمایا۔نیز یہ کتاب رہتی دنیا تک پوری بنی نوع انسانیت کے لئے مکمل کتاب ہدایت ہے۔قرآن مجید کے مخاطب اولین چونکہ عرب بنے اس لئے اسکا ایک رنگ مقامی ہے مگر اس کے مخاطب تمام بنی آدم ہیں اور اسمیں ان کے لئے انسانیت کی بنیاد پر آفاقی ،زندہ جاوید اور دائمی اصول واحکام زندگی ہیں۔اس لئے اس کے اندر زمان ومکان سے بے نیازی وبالاتری کا بھی رنگ ہے۔

قرآن مجید چونکہ بنیادی طور پر دین اسلام کا دستور وآئین ہے۔اس لئے زندگی کے ہر شعبے ومعاملے میں اس نے مکمل رہنمائی کی اسی طرح قرآن مجید چونکہ عالم الغیب والشہادۃ کا کلام ہے اس لئے اس کے موضوعات کی کثرت ووسعت کا حتمی اندازہ نہیں کیا جاسکتا چنانچہ اس نے انسان کی ذات اور کائنات کے گوشوں بلکہ زندگی اور موت سے متعلق اتنے راز ہائے سربستہ وا کئے کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے بلکہ ہر سائنسی تحقیق اس پر مہر تصدیق بھی ثبت کرتے چلی جاتی ہے۔

قرآن مجید کے لئے جس زبان وادب کا حسن انتخاب ہوا وہ دنیا کی ایک ترقی یافتہ زبان تھی بلکہ اس زبان پر عربوں کو اتنا ناز تھا کہ وہ اپنے آپ کو عرب اور دوسروں کو عجم یعنی گونگا کہہ کر پکارتے تھے پھر قرآن مجید ان کے سامنے نہ صرف عربی زبان میں نازل ہوا بلکہ اس زبان وادب کا معجزہ بن کر ان کے لئے ایک چیلنج بن گیا۔اسکے الفاظ وکلمات کا حسن انتخاب اسکی تعبیر کی سادگی وپرکاری اسکے مضمون واسلوب کا حسن تناسب اسکے معانی ومضامین میں مقامیت کے دوش بدوش آفاقیت ،طرز بیان میں وقار کے ساتھ حلاوت ،الغرض قرآن مجید کی زبان وادب کی ایسی تاثیر کہ روح کی گہرائیوں میں اتر جائے ایک ناقابل انکار حقیقت بن گئی۔

قرآن مجید چونکہ آفاقی انسانی اور ابدی پیغام لیکر آیا تھا اس لئے وہ انسانی آبادی کے ہر حصے تک

پہنچا۔ چنانچہ جب دین اسلام کی آمد ہندوستان میں ہوئی تو قرآن مجید ان کا مخاطب بنا اور یہاں کی مقامی زبانوں میں بھی اسکے ترجمے کی ضرورت پیش آئی۔ فارسی زبان کے بعد اردو زبان میں ترجمہ کی روایت شروع ہوئی بلکہ یوں اگر کہا جائے کہ اردو زبان کو پھر یہ شرف حاصل ہوا کہ اس میں بہت زیادہ اسکے ترجمے بلکہ تفسیریں لکھی گئیں۔

ترجمہ قرآن مجید کے سلسلے میں عام طور پر تین شکلیں نظر آتی ہیں۔

لفظی ترجمہ: یہ وہ ترجمہ ہے جس میں لفظ بہ لفظ ترجمہ کیا جاتا ہے جسے تحت اللفظ ترجمہ بھی کہا جاتا ہے اور جس کے جملوں میں کلمات کی ترتیب کو اصل کے مطابق رکھنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اسطرح کے ترجموں میں نمایاں نام شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی کے ترجمہ کا آتا ہے۔ اگر چہ اس طرح کے ترجمے بہت سے لوگوں نے کئے۔

<u>بامحاورہ ترجمہ:</u> یہ وہ ترجمہ ہے جس میں لفظ بہ لفظ ترجمہ تو کیا جاتا ہے۔ مگر جملوں میں کلمات کی ترتیب میں ترجمہ کی زبان کی ساخت کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے۔ نیز ترجمہ کی زبان کے محاوروں اور اسالیب کا بھی پاس ولحاظ رکھا جاتا ہے۔ اسطرح کے ترجموں میں بھی نمایاں نام شاہ عبدالقادر دہلوی کے ترجمہ کا ہے اگر چہ یہ ابتدائی کوشش ہے۔ جسکی وجہ سے آپ نے قرآنی کلمات کی ترتیب کو ساتھ رکھنے کی بھی سعی کی ہے لیکن بعد کے ترجموں میں قرآنی کلمات کی ترتیب ترجمہ کی زبان کی ترتیب سے زیادہ موافق ہوتی چلی گئی۔

<u>آزاد ترجمانی</u>: یہ وہ ترجمہ ہے جس میں عبارت اور مفہوم کے شعور واحساس کو زیادہ مدنظر رکھتے ہوے اسلوب بیان ومحاوروں اور ضرب الامثال میں کچھ آزادی برتی جاتی ہے۔ اس میں نمایاں نام مولانا مودودیؒ کی تفہیم القرآن کا ہے۔ اگر چہ مولانا نے ہر جگہ آزاد ترجمانی نہیں بلکہ بامحاورہ اور لفظی ترجمہ کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔

یہی ترجمہ کی عموما تین قسمیں ہیں جن میں کمی بیش اردو زبان میں ترجموں کی کثرت کا باعث ہوی نیز اس کثرت میں اردو کا لسانی ارتقاء بھی ایک اہم عامل کی حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ کوئی بھی زبان ہو چالیس پچاس سال کے بعد اپنی چاشنی اور اثر اندازی کھو دیتی ہیں انسانی تمدن کے ارتقاء سے سماج کے میل ملاپ سے اور علوم وفنون کے تنوع وتوسع کی وجہ سے بعض الفاظ وترکیبیں متروک ہو جاتی ہیں۔ انکی جگہ نئے الفاظ اور نئی ترکیبیں پالیتی ہیں۔ مزید برآں بعض مخالفین کی جانب سے کچھ غلط ترجمے بھی ہوئے اور کاروباری مقاصد کے تحت کچھ نئے ترجمے بھی سامنے آتے رہے بلکہ ان نثری ترجموں کے علاوہ ترجمہ

قرآن کے سلسلے میں کچھ منظوم ومقفّٰی ترجمے مکمل اور نامکمل شکل میں بھی سامنے آتے رہے۔الغرض ان ترجموں کی کثرت سے ہر دور اور ہر ذوق میں جہاں زبان وادب کی تصویر نظر آتی ہے وہیں ہر ترجمے کی جزوی تبدیلیاں اردو زبان وادب پر اپنا اثر بھی ڈالتی نظر آتی ہیں۔

ترجمہ قرآن مجید کی راہ سے اردو زبان پر جو اثرات مرتب ہوے اسکی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ ذیل میں صرف تین پہلوؤں سے ان اثرات کا ایک سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔یعنی الفاظ وکلمات ، ترکیب وتعبیر، موضوعات ومعلومات۔

(الف)الفاظ وکلمات کے ذخیرہ میں بیش بہا اضافہ:

شروع میں قرآن مجید کے الفاظ وکلمات کی نزاکت اور کثرت اردو ترجمہ کی راہ میں ایک چیلنج بن کر سامنے آئی۔کیوں کہ قرآن مجید کی زبان خود نہایت وسیع الاطراف زبان تھی جسکے پاس ہر چیز کے لئے ‘ہر صفت کے لئے ‘ہر پہلو اور ہر مرحلے کے لئے الگ الگ الفاظ وکلمات تھے جو مترادفات کے نام سے معروف ہیں لیکن دراصل یہ مختلف خصوصیات اور صفات کے الگ نام تھے چنانچہ مترجمیں نے قرآنی کلمات اور الفاظ کی نزاکت کے پیش نظر تین صورتیں اختیار کیں لیکن بعد میں انہیں صورتوں کی بدولت اردو زبان کے الفاظ وکلمات کا دائرہ بھی وسیع تر ہوتا چلا گیا۔نیز ان میں دقت اور نزاکت بھی آنے لگی۔

۱۔قرآنی کلمات کے ترجمہ کے لئے اردو زبان میں موجود اور غیر موجود متعدد زبانوں کے کلمات کا استعمال کیا گیا اور تقریب مفہوم کی کوشش کی گئی۔اسطرح کے الفاظ وکلمات کی اچھی خاص تعداد ہے۔اس لئے ان کی مثالوں کی ضرورت نہیں۔

۲۔بعض کلمات قرآن کی ترجمانی تو ہوئی مگر اصل کلمات والفاظ قرآنیہ بھی ساتھ ساتھ راء ہوگئے۔جیسے :والد(باپ)،والدہ(ماں)،ابن(بیٹا) بنت(بیٹی)،برّ(خشکی)، بحر(تری)، خمر(شراب)،لیل ونہار(شب وروز)، شفاعت (سفارش)،ابتلاء(آزمائش)صداق (مہر)زنا (بدکاری)،فحش (بے حیائی)، دیت (خون بہا)ولادت (پیدائش)،ہلال(نیا چاند)، بدر(مکمل چاند)،شمس(سورج)،قمر(چاند)رضاعت(شیر خوارگی)تجارت(کاروبار وبیوپار)،رہن(گروی) ،شہادت (گواہی)صلوٰۃ (نماز) صیام (روزہ) عبادت (بندگی)طہارت (پاکیزگی)وغیرہ۔

۳۔بعض کلمات کی ترجمانی مشکل تھی کیوں کہ انکی حثیت اصطلاح کی سی تھی تو وہی الفاظ استعمال ور ائج ہوگئے۔جیسے ایمان،اسلام،احسان،جنت،جہنم،دعوت،،ہجرت،جہاد،معروف،منکر،نبی،رسول، اعتکاف،حج،عمرہ،زکوۃ،کفارۃ،فدیہ،قصاص،قصر،اتمام،دنیا،آخرت،وصیت،میراث،ترکہ،نکاح

،طلاق رجوع،خلع ،عدت،حمل، ولی وغیرہ۔

(ب)تعبیر وترکیب میں انقلابی تبدیلی:

قرآن مجید کی تعبیر زندگی سے بھرپور ہے۔جس میں معانی مجسم اورافکار وخیالات احساس کا جامہ پہنے ہوئے نظر آتے ہیں تو محسوسات چلتے پھرتے ملتے ہیں ویسے عربی زبان کے علم البیان کا یہ باب بڑا شاندار ہے مگر قرآن مجید نے اسے درجۂ اعجاز تک پہنچادیا۔

یوں تو کسی بھی بات یا مطلب کے افہام وتفہیم کے تین درجے ہوتے ہیں۔

۱۔ذہنی وعقلی: جس میں مجرد الفاظ اور راست تعبیر ہوا کرتی ہے۔یہ عموماً عملی وفکری موضوعات میں اختیار کی جاتی ہے۔

۲۔حسی وجسمانی: جس میں کسی بھی مفہوم ومراد کو محسوسات کے پیکر میں پیش کیا جاتا ہے۔اس کا تعلق زیادہ تر ادبی مضامین میں ہوتا ہے۔

۳۔خیوی وحرکی: جس میں کسی بھی مطلب ومضمون کو اس طرح حرکت وزندگی کے لباس میں پیش کیا جاتا ہے کہ قاری اور سامع اپنے آپ کو ناظر اور شریک سمجھنے لگتا ہے۔یہ اسلوب زیادہ تر خطابی مضامین میں ملتا ہے۔

قرآن مجید نے عموماً دوسرے اور تیسرے درجے کو اختیار کیا جس کی وجہ سے اس کی تعبیر کی چاشنی اور دلپذیری ناقابل انکار حقیقت بن گئی یہ قرآنی تعبیر کا یہ پہلو بھی اردو ترجمہ نگاروں کے لئے شروع میں ایک چیلنج بن کر آیا کیوں کہ اردو زبان کی تعبیر اس اعلی درجے پر اس وقت فائز نہیں تھی پھر بھی مترجمیں نے ایمانداری کے ساتھ اس تعبیر کی ہو بہو عکاسی کرنے کی کوشش کی جو شروع میں کچھ نامانوس سی نظر آئی پھر رفتہ رفتہ اردو زبان میں ایسے سرایت کر گئی کہ اردو کی تعبیریں بھی زندگی سے بھرپور اور تاثیر سے مالا مال نظر آنے لگیں چنانچہ ذیل میں قرآنی آیات سے اس کی کچھ مثالیں نقل کی گئی ہیں یہ کس قدر دل نشین اچھوتی اور عمدہ تعبیریں ہیں انہیں غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔

افکار وخیالات کی دنیا ہو یا معنویات ونظریات کا عالم ہو،انسان کے فہم وادراک میں یہ آسانی سے نہیں آتا اس لئے قرآن مجید نے انہیں محسوسات کا پیکر دیا جسکی چند مثالیں ذیل میں درج ہیں۔

۱) أُولَئِکَ عَلٰی هُدیً مِن رَّبِّهِم (البقرة : ۲،۵)

وہ اپنے رب کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت پر متمکن ہیں۔

۲)أُولَئِکَ الَذِی اشتَرَو الضَّلالَةَ بِالْهُدَی (البقرة :۱۶)

انہوں نے ہدایت کے عوض گمراہی خرید لی۔

۳)یَنْقُضُونَ عَهْدَ اللّٰهِ (البقرة:۲۷)

وہ اللہ کے عہد و پیمان کو توڑ دیتے ہیں۔

۴)یَنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْهِ (البقرة :۱۴۳)

ایڑی کے پل پلٹ جائے۔

۵)وَلاتَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ (البقرة:۱۶۸)

شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔

۶)اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا(البقرة :۲۵۰)

ہم پر صبر انڈیل دیجئے۔

۷)لَفَتَحْنَا عَلَیْهِم بَرَکَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالاَرْضِ (الاعراف:۹۶)

تو ہم ان پر آسمان وزمین کی برکتیں کھولدیتے۔

۸)وَلَمَّاسَکَتَ عَن مُّوسَی الْغَضَبُ (الاعراف:۱۵۴)

جب موسی کا غصہ چپ (فرو) ہوا۔

۹)ثُمَّ نُکِسُوْا عَلٰی رُؤُسِهِمْ (الانبیاء :۶۵)

پھر وہ اپنے سروں کے بل اوندھے ہوگئے۔

۱۰)اتَّخَذُوْا اَیْمَانَهُم جُنَّةً (المنافقون :۷)

انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنالیا۔

اسی طرح قرآن مجید کی تعبیر نے محسوسات کو زندگی کا جامہ پہنا دیا جسکی چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔

۱)فَوَجَدَا فِیْهَا جِدَارًا یُرِیْدُاَن یَنقَضَّ (الکهف:۷۷)

دونوں نے اس میں ایک دیوار پائی جو پھٹا چاہتی تھی۔

۲)بَلْ مَکْرُ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ (سبا:۳۳)

بلکہ رات اور دن کی سازش۔

۳)لاالشَّمْسُ یَنْبَغِی لَهَااَن تُدْرِکَ الْقَمَرَو.لاالَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ(یسین :۴۰)

نہ سورج کے لیے زیب دیتا ہے کہ چاند کو جالے اور نہ رات دن سے آگے بڑھنے والی ہے۔

۴)فَاِذَا اَنْزَلْنَاعَلَیْهَاالْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ (حم السجدة:۳۹)

ہم نے جب اس پر پانی اتارا تو وہ جھوم اٹھی اور پھول گئی۔

۵)فَمَابَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْاَرْضُ(الدخان : ۲۹)

ان پر آسمان اور زمین نے آنسو نہیں بہائے۔

۶)حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا(محمد:۴)

یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار (نیچے) رکھ دے۔

۷)اذ ا ارسلنا عليهم الريح العقيم (الذايات : ۴۱)

جب ہم نے ان پر بانجھ ہوا بھیجی۔

۸)تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ (الملک:۸)

قریب ہے کہ جہنم غصہ سے پھٹ پڑے۔

۹)اِنَّانَخَافُ مِن رَّبِّنَايَوْمًاعَبُوْسًاقَمْطَرِيْرًا(الدهر:۱۰)

ہم اپنے پروردگار کی طرف سے ایک نہایت ترش رودن کا خوف رکھتے ہیں۔

۱۰)وَالصُّبْحِ اِذَاتَنَفَّسُ (التكوير:۱۸) اور صبح کی (قسم) جب وہ سانس لے۔

(ج) معلومات وموضوعات کے دائرہ کی وسعت اور نیرنگی:

کسی بھی زبان کی زندگی کی ضمانت اسکی وسعت وشمولیت ہے کیوں کہ جب تک وہ ہر چیز ہر مطلب اور ہر معاملہ کی تعبیر اور ادائیگی پر قدرت رکھے اسے کوئی خیر آباد نہیں کرتا۔قرآن مجید جب ہدایت کا انسائیکلوپیڈیا بن کر آیا تو اس نے زندگی کا کوئی موضوع ایسا نہیں چھوڑا جس سے اس نے تعرض نہ کیا ہو چنانچہ وہ بہ یک وقت الٰہیات وطبعیات،نفسیات وتشریعات،اخلاقیات اور کونیات کی کتاب تھی تو اس کا مقصد بھی بہ یک وقت دعوت وتبلیغ،تعلیم وتشریع اور تزکیہ وتربیت تھا۔انسانی جذبات وافکار ہوں یا احساسات وانفعالات یا عبادات وریاضت ہو یا تعلقات ومعاملات ہوسب کی اس نے نہ صرف رہنمائی کی بلکہ صحیح توجیہ کی۔زندگی کے تمام شعبوں کو اس نے اپنے کتاب میں جگہ دی خواہ وہ نجی وانفرادی ہوں یا اجتماعی ومعاشرتی یا سیاسی وحکومتی معاشی ومالی ہوں یا قومی وبین الاقوامی۔

قرآنی موضوعات کی اس ناپیدا کنار وسعت نے بھی ابتداء مترجمین کو ایک چیلنج پیش کیا تو یہاں بھی شروع میں مترجمین نے مضامین واسالیب جوں کا توں ترجمہ کرنے کی سعی کی لیکن اس کے بعد خود اردو زبان نے ان موضوعات اور اسالیب کے تعدد اور تنوع کو اپنے دامن میں بھر لیا۔پھر کیا تھا اردو زبان کی وسعت وشمولیت میں ایسا اضافہ ہوا کہ وہ بین الاقوامی زبانوں کی صف میں آ کھڑی ہوگئی۔

ونزلنا علیک الکتاب تبیانا لکل شئی(النحل : ۸۹) اور ہم نے آپ پر اس کتاب کو ہر چیز کا مکمل بیان بنا کر نازل کیا۔

مافرطنا فی الکتاب من شئی .(**الانعام**:۳۸) ہم نے اس کتاب میں کسی چیز کی کمی نہ رکھی۔

چنانچہ آج اردو لٹریچر میں اسالیب وموضوعات کی وسعت قرآن مجید کی رہین منت ہے۔کوئی بھی علم ہو یا فن یا کوئی بھی موضوع ہو یا مطلب اردو زبان اسکی ادائیگی سے قاصر نہیں خواہ معاملہ شعر ونظم کا ہو یا نثر نگاری کا۔تاریخ نویسی سے لیکر سائنسی اختراعات واکتشافات تک کی ترجمانی کے لئے وہ یکساں قادر الکلام نظر آتی ہے۔وہ بھی بالکل وضاحت،قطعیت اور سلاست کے ساتھ۔

الغرض دنیا کی متعدد زبانوں اور ادبوں کی طرح اردو زبان وادب پر دین ومذہب کے اثرات ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔اگر دنیا کے علوم اور انسانیت پر قرآن واسلام کے اثرات ہو سکتے ہیں تو اردو زبان وادب پر قرآن مجید کے اثرات کیوں نہیں ہو سکتے۔دنیا کے غیر متعصب اہل علم وفن نے انسانی زندگی پر قرآن اور اسلام کے اثرات کی ہمہ گیری اور پائیداری کا اقرار واعتراف کیا ہے بلکہ آج علم وفن کی ترقی اسی قرآن اور اسلام کی بدولت ہے جس کے اقرار سے ترقی کے دوش بدوش سکون وآشتی،خوشی وخوشحال بھی دنیائے انسانیت کو ماضی میں ملی تھی۔

قرآن مجید کی زبان وادب نے دنیا کی متعدد زبانوں اور ادبوں پر اپنے اثرات چھوڑے ہیں تو اردو زبان وادب اس سے کیسے مستثنی ہو سکتی ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو زبان وادب پر قرآن مجید کے اثرات کا تفصیلی وتحقیقی جائزہ لیا جائے خواہ وہ ترجمے کی راہ سے مرتب ہوے ہوں یا تفسیر کی راہ سے۔نظم کی صورت میں ہوں یا نثر کی صورت میں۔سچ تو یہ ہے کہ آج اردو زبان حکومت کی سرپرستی،معاشی وکسب کی وابستگی اور علوم وفنون کی بوقلمونی سے دستبردار ہونے کے باوجود اگر زندہ وتابندہ ہے خواہ وہ کتابوں وتحریروں کے اندر ہی کیوں نہ ہو وہ قرآن اور اسلام سے اسکی وابستگی کی بدولت ہے۔



اردو زبان میں قرآن کریم کی تفاسیر۔ایک مطالعہ
(''تفسیر القرآن وھدیٰ الفرقان'' کے خصوصی حوالے سے)

ڈاکٹر عظمیٰ خاتون فلاحی
شعبہ سنی دینیات (اے۔ایم۔یو) علیگڑھ

۱۸۵۷ء کے انقلابی حالات کے بعد سرسید احمد خان (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء) کی شخصیت مسلمانانِ ہند کے لئے مسیحا سے کچھ کم نہیں تھی۔انکی سیاسی، سماجی، قومی اور علمی خدمات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔وہ مصلح اور معمارِ قوم تھے جنہوں نے مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونکی اور عزم و ہمت کے ساتھ اٹھنے کا حوصلہ دیا۔سرسید نے جس معاشرے میں آنکھیں کھولیں وہاں سیاسی اور اخلاقی انحطاط کے پہلو بہ پہلو عقل پرستی کی موجیں آب وتاب کے ساتھ رواں دواں تھیں ۔اس نازک صورتحال سے نکلنے کے دو راستے تھے :ایک یہ کہ عقل پرستی کسی طرح بھی وحی کا مقابلہ نہیں کرسکتی کیونکہ عقل پرستی کا دائرہ کار حواس خمسہ اور تجربات تک محدود ہے لہذا اس کو اسلامی مسلمات میں دخل اندازی کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔

دوسرا یہ کہ ان عقل پرستانہ افکار ونظریات کو جوں کا توں اپنا کر دینی عقائد ومسلمات کو حتی الامکان اس میں ڈھال لیا جائے ۔سرسید نے اسی راستے کا انتخاب کیا۔غرض سرسید، جو دین اسلام کی بقا اور امت مسلمہ کی طرف سے یہ بھاری فرض چکانے کے لئے اٹھے تو اس کی ابتداء قرآن کریم کی تفسیر سے کی۔یہی آپ کی تفسیر نگاری کا اصل محرک اور پس منظر تھا،لیکن صد افسوس اس تفسیر میں علوم جدیدہ کو تو مشرف بہ اسلام نہ کرسکے البتہ دینی عقائد ومباحث کو تحریف وتاویل کے تمام زاویوں سے گزار کر علوم عقلیہ کے مطابق کردیئے۔

سرسید احمد کی یہ تفسیر جو تشنہ تکمیل ہے،اسکی چھ جلدیں ہیں جو سورہ فاتحہ سے سورہ اسراء تک محیط ہیں، یہ سرسید کے بقیدِ حیات رہتے علی گڑھ کالج سے شائع ہوئیں،ساتویں جلد سورہ کہف سے سورہ طٰہٰ تک انکی وفات کے بعد علی گڑھ بک ڈپو نے شائع کی لیکن اس تفسیر کے نہج کو سمجھنے کے لئے انکی کتاب مکاتبات الخلان فی اصول التفسیر وعلوم القرآن کا مطالعہ ضروری ہے اس میں انہوں نے اپنی تفسیر کے اصولوں کو متعین کردیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے:

پہلا تفسیری اصول: ''عقل اور نقل میں تعارض کی صورت میں عقل کو ترجیح

حاصل ہوگی''۔[۱]

سرسید نے معتزلہ کے اس اصول کو اپنی تفسیر میں جا بجا استعمال کر کے دینی عقائد کے پورے ڈھانچے کو تبدیل کر کے رکھ دیا اور ملائکہ جنات وشیاطین، جنت وجہنم، حشر ونشر، رویتِ باری تعالیٰ وغیرہ میں تحریف اس لئے کر دی کہ یہ چیزیں عقلی معیار پر پوری نہیں اترتیں کیونکہ عقل یہ تسلیم کرنے سے قاصر ہے کہ ملائکہ، جنات وشیاطین انسانوں سے میل جول رکھنے والی مخلوق ہو اور نظر نہ آئے۔

جنت وجہنم کے قبول کرنے میں تحریف:

جہنم کے وجود کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ: **هذه جهنم التی کنتم توعدون**۔[۳]

(یہ وہی جہنم ہے جس سے تم کو ڈرایا جاتا رہا۔)

سرسید احمد خان جنت وجہنم دونوں کے وجود کا انکار کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

''یہ مسئلہ کہ بہشت اور دوزخ دونوں بالفعل مخلوق وموجود ہیں، قرآن سے ثابت نہیں''۔[۴]

فرشتہ، شیطان اور جن کی تاویل:

فرشتوں کے انکار سے نہ صرف اسلام کے بنیادی ارکان کی نفی ہوتی ہے بلکہ قرآن وسنت کے اثبات کا انکار لازم آتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ:

من کان عدو الله و ملائکته و رسله و جبرئیل و میکال فان الله عدو للکافرین ۶

(جو کوئی مخالف ہو اللہ کا یا اس کے فرشتوں کا یا اس کے پیغمبروں کا یا جبرئیل کا اور میکائیل کا تو اللہ تعالیٰ ایسے کافروں کا مخالف ہے۔) اسی طرح ایک حدیث بھی اس سلسلے میں ایک حدیث میں موجود ہے۔ آپ فرشتوں کا انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہم بھی جبرائیل اور روح القدس کو شئی واحد تجویز کرتے ہیں، مگر اس کو خارج از خلقت انبیاء جداگانہ مخلوق تسلیم نہیں کرتے، بلکہ اس بات کے قائل ہیں کہ خود انبیاءؑ میں جو ملکہ نبوت ہے اور ذریعہ مبدئے فیاض سے ان امور کے اقتباس کا ہے جو نبوت یعنی رسالت سے علاقہ رکھتے ہیں وہی روح القدس ہے اور وہی جبرائیل ہے''۔[۸]

اس عبارت میں سرسید نے اس بات سے انکار کیا کہ جبرائیلؑ کوئی خارجی وجود ہے بلکہ ان کے نزدیک یہ رسول علیہ السلام کی طبیعت میں ودیعت کردہ ایک ملکہ نبوت کا نام ہے۔ سرسیدؒ رؤیتِ باری تعالیٰ کے متعلق کہتے ہیں:

''خدا کا دیکھنا دنیا میں نہ ان آنکھوں سے ہوسکتا ہے اور نہ ان آنکھوں سے جو دل کی آنکھیں کہلاتی ہیں اور نہ قیامت میں کوئی شخص خدا کو دیکھ سکتا ہے''۔ ۹

قرآنِ کریم کی مندرجہ ذیل آیت کی آپ تاویل کرتے ہیں

واذ أخذنا میثا قکم ورفعنا فوقکم الطور. ۱۰

رفع کوہ طور کے بارے میں سرسید احمد خان نہ صرف اس کا انکار کرتے ہیں بلکہ آیت کی غلط تاویل بھی کرتے ہیں اور اس کے علاوہ مفسرین کرام کا مذاق اڑاتے ہوئے اس واقعہ کو لغو اور بیہودہ قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''مفسرین نے اپنی تفسیروں میں اس واقعہ کو عجیب وغریب واقعہ بنا دیا ہے اور ہمارے مسلمان مفسر عجائبات دور کا ہونا مذہب کا فخر اور اس کی عمدگی سمجھتے تھے اسلئے انہوں نے تفسیروں میں لغو اور بیہودہ عجائبات (یعنی معجزات) بھر دی ہیں بعضوں نے لکھا ہے کہ کوہ سینا کو خدا ان کے سروں پر اٹھا لایا تھا کہ مجھ سے اقرار کرو نہیں تو اسی پہاڑ کے تلے کچل دیتا ہوں یہ تمام خرافات اور لغو اور بیہودہ باتیں ہیں''۔ ۱۱

ان کا دعویٰ ہے کہ پہاڑ کو ان کے سروں پر لا کھڑا نہیں کیا گیا تھا بلکہ وہ پہاڑ آتش فشانی کے سبب لرز رہا تھا اور یہود کو محسوس ہو رہا تھا کہ گویا پہاڑ ان کے سروں پر گر پڑے گا۔

معجزات:

سرسید کا بنیادی اصول یہ ہے کہ خدا کے کلام میں اور کام (Word of God and Work of God) میں کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا اور قرآن میں کوئی بات مافوق عقل انسانی نہیں ہے۔ قانون فطرت (Law of nature) سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے لہذا مافوق الفطرت کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس اصول سے بہت سارے وہ مسلمہ مفہومات زد میں آجاتے ہیں جس پر امت اسلامیہ کا اجماع ہے۔ اسی بنا پر سرسید معجزات کو نہیں مانتے یا اپنے نظریے کے مطابق اس کی تاویل کرتے ہیں کیونکہ معجزات، عادت جاریہ سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔ سرسید کہتے ہیں کہ معجزات اور کرامات کو وہ نہ صرف اس لئے تسلیم نہیں کرتے کہ وہ خلافِ عقل ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ وہ قرآن مجید کی آیات کے خلاف ہے جیسا کہ سورہ روم آیت ۳۰ فطرت الله التی فطر الناس علیها ،لا تبدیل لخلق الله اور سوره احزاب آیت ٦٢ سنت الله التی قد خلت من قبل ولن تجد لسنة الله تبدیلا ۔

خدا کا بنایا ہوا قانونِ قدرت اس کا عملی وعدہ ہے کہ اسی طرح ہوا کرے گا۔ پھر اگر اس کے برخلاف

ہوتو خلف وعدہ اور کذب، خدا کی ذات پاک پر لازم آتا ہے جس سے اس کی ذات پاک ہے اسی لئے سر سید واقعہ معراج کے قبول کرنے میں تحریف کرتے ہیں۔

''ہماری تحقیق میں واقعہ معراج ایک خواب تھا جو رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تھا''۔[۱۲]

سرسید احمد خان کا دوسرا تفسیری اصول:

''اس دنیا کا ہر فعل تعلیل وتسبیب کے ہمہ گیر قانون پر استوار ہے''[۱۳]

سرسید اس اصول کو قانون فطرت سے تعبیر کرتے ہیں۔اس نظریہ کی بنیاد پر انہیں نیچری کہا جاتا ہے۔سرسید نے اس اصول سے سب سے پہلی تحریف معجزات وکرامات پر کی کیونکہ اہل وسنت والجماعت کے نزدیک یہ تمام امور علت ومعلول کی قید سے آزاد ہوکر خرق عادات کے طور پر اس دنیائے آب وگل میں وجود پذیر ہوتے ہیں۔لیکن سرسید خود ساختہ قانون فطرت کے پیش نظر ان خرق عادات امور کو تسلیم نہیں کرتے ،ان کا دعویٰ ہے کہ قرآن مجید میں کسی معجزے کا ذکر نہیں۔ان کے نزدیک ذرہ سے لے کر پہاڑ تک،قطرہ سے لے کر سمندر تک کوئی چیز اس سے مستثنیٰ نہیں،کائنات کے ہر حصہ میں اسی قاعدے اور قانون کی حکمرانی ہے، یہ ایسا اٹل قانون ہے کہ اس کا انحراف خدا بھی نہیں کرسکتا۔

اس لئے سرسید حضرت عیسیٰ ابن مریمؑ ،کے بن باپ کے ولادت کے قائل نہیں ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش قانون فطرت کے مطابق والد کی موجودگی میں ہوئی تھی۔[۱۵] اسی طرح وہ ان کے معجزات (تکلم فی مھد ،خلق طیر،تبری ءالاکمہ والابرص، واذتخرج الموتی ،اخبارعن الغیب) کی تاویل عادت جاریہ کے مطابق کرتے ہیں۔وہ رفع عیسیٰؑ سے وفات عیسیٰؑ مراد لیتے ہیں اور حضرت موسیٰؑ کے معجزات (عصا کا اژدھا ہوجانا اور ید بیضا) کو قوت نفس انسانی اور تصرف قوت متخیلہ کا سبب کہتے ہیں۔اور دیگر معجزات (آیات) کو بھی عادت جاریہ سے تعبیر کرتے ہیں۔فرعون اور آل فرعون کے غرق فی البحر کے تاریخی واقعہ کی تاویل طوفانی ہواؤں کا اور سمندر کے مدجزر یعنی جوار بھاٹے کا سبب کہتے ہیں۔سرسید اسی طرح تمام انبیاءؑ کے معجزات کو عام واقعات کی طرح توجیہ وتاویل کرتے ہیں۔

سرسید کا تیسرا تفسیری اصول:

احادیث کی روایت بالمعنی:

''آپ کے ہاں تفسیر کے لئے احادیث نبویہ،آثار صحابہ کرامؓ اور مفسرین کے اقوال کی چنداں حاجت نہیں۔''[۱۶]

چنانچہ سرسید کی معتبر سوانح ''حیات جاوید'' جسے علامہ شبلی نعمانیؒ نے ''مدلل وحی'' قرار دیا۔اس میں

الطاف حسین حالی لکھتے ہیں کہ:

''پس انہوں نے جیسا کہ عمرؓ سے منقول ہے: ''حسبنا کتاب اللہ'' کہہ کر اپنے جدید علم کلام کا موضوع اور اسلام کا حقیقی مصداق صرف قرآن مجید کو قرار دیا اور اس کے سوا تمام مجموعہ حدیث کو اس دلیل سے کہ ان میں کوئی حدیث مثل قرآن کریم کے قطعی الثبوت نہیں ہے اور تمام مفسرین کے اقوال و آراء اور تمام فقہاء، مجتہدین کے قیاسات و اجتہادات کو اس بنا پر کہ ان کے جواب وہ خود علماء مفسرین اور فقہاء مجتہدین ہیں نہ کہ اسلام، اپنی بحث سے خارج کر دیا، اسی اصول کو ملحوظ رکھ کر سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔'' ۱۷

سرسید کا چوتھا تفسیری اصول:

سرسید نے صفات باری تعالیٰ کو عین ذات باری تعالیٰ قرار دے کر معتزلہ کی ہم نوائی کی ہے اور اصول تفسیر میں اسے ایک اصل کے طور پر ذکر کیا ہے جبکہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک صفات باری تعالیٰ واجب الوجود کے مفہوم سے زائد ہیں عین ذات باری تعالیٰ نہیں ہیں۔

خدا کے بارے میں نظریہ: اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں فرماتا ہے کہ: اس کا پسندیدہ دین اسلام ہے۔لیکن سرسید مذہب کے بارے میں کہتے ہیں:

''جو ہمارے خدا کا مذہب ہے وہی ہمارا مذہب ہے، خدا نہ ہندو ہے نہ عرفی مسلمان، نہ مقلد نہ لامذہب، نہ یہودی نہ عیسائی، وہ تو پکا چھٹا ہوا نیچری ہے۔'' ۱۸۔

ایک دوسری جگہ رقم طراز ہیں:

''نیچر خدا کا فعل ہے اور مذہب اس کا قول، سچے خدا کا قول اور فعل کبھی مخالف نہیں ہوسکتا اسی لئے ضروری ہے کہ مذہب اور نیچر متحد ہو'' ۔۱۹

وحی و نبوت کی حقیقت:

سرسید کہتے ہیں کہ نبوت کوئی عہدہ یا منصب نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے منتخب کر کے دیدیتا ہے۔اس سلسلے میں وہ رقم طراز ہیں:

''نبوت ایک فطری چیز ہے ہزاروں قسم کے ملکات انسانی ہیں، بعض دفعہ کوئی خاص ملکہ کسی خاص انسان میں از روئے خلقت و فطرت کے ایسا ہوتا ہے کہ وہ اس کا امام یا پیغمبر کہلاتا ہے، لوہار بھی اپنے فن کا امام یا پیغمبر ہوسکتا ہے، شاعر بھی اپنے فن کا امام یا پیغمبر ہو سکتا ہے، ایک طبیب بھی اپنے فن کا امام یا پیغمبر ہوسکتا ہے'' ۔۲۰

احکام دین کی جدید تاویلات:

سرسید نے احکام قرآن کی تاویل احادیث اور اجماع سے آزاد ہوکر اپنے مخصوص فکر کے مطابق کی ہے۔سرسید کے نزدیک احکام دو قسم کے ہوتے ہیں: (۱) اصلی اور (۲) حفاظتی۔ان کے مطابق کعبہ کی طرف منھ کر کے نماز پڑھنا اسلام کا کوئی اصلی حکم نہیں ہے۔احرام کو وحشیانہ لباس اور مناسک حج میں سے اکثر طریقوں کو عہد جاہلیت کی یادگار کہتے ہیں۔کہتے ہیں کہ اسلام نے کوئی قربانی تقرب الی اللہ یا بطور کفارہ گناہ مقرر نہیں کی۔بیت اللہ کے بارے میں سرسید کی رائے ملاحظہ ہو:

''جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس پتھر کے بنے ہوئے چوکھونٹے گھر میں ایسی متعدی برکت ہے کہ جہاں سات دفعہ اس کے گرد پھرے اور بہشت میں چلے گئے یہ ان کی خام خیالی ہے ،اس چوکھونٹے گھر کے گرد پھرنے سے کیا ہوتا ہے اس کے گرد تو اونٹ اور گدھے بھی پھرتے ہیں تو وہ کبھی حاجی نہیں ہوئے''۔ ۲۱

اور مزید لکھتے ہیں:

''کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا اسلام کا کوئی اصلی حکم نہیں ہے،نماز میں سمت قبلہ کوئی اصلی حکم مذہب اسلام کا نہیں ہے''۔ ۲۲

سرسید کے مطابق قرآن مجید سے جو حکم پایا جاتا ہے وہ یہی ہے کہ ایک بیوی ہونی چاہئے۔تعدد ازواج کی اجازت بیوی کے مریضہ اور عقیمہ ہوجانے پر ہے ان کے نزدیک عدل میں قلبی میلان بھی شامل ہے۔۲۳

نسخ کا مسئلہ یعنی ایک حکم قرآنی کی دوسرے قرآنی حکم سے تنسیخ کرنا،جس کی خود قرآن میں توثیق کی گئی ہے۔ما ننسخ من آیۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا۔الم تعلم ان اللہ علیٰ کل شئ قدیر۲۴ سرسید کے یہاں آیت کے لفظ سے قرآن کی آیت مراد نہیں ہے بلکہ موسوی شریعت کے احکام مراد ہیں جو شریعتِ محمدی میں داخل ہوگئے ہیں یا جن احکام شریعت موسوی کو یہودیوں نے بھلا دیا تھا وہ مراد ہیں ان کے قول کے مطابق قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں۔۲۵

سرسید احمد خان قرآن میں ناسخ و منسوخ کو نہیں مانتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ:

''ہم نے تمام قرآن میں کوئی ایسا حکم نہیں پایا اور اس لئے ہم کہتے ہیں کہ قرآن میں ناسخ و منسوخ نہیں ہے''۔۲۶

حوالہ جات:

۱۔ سرسید احمد خان، التحریر فی اصول التفسیر، ص ۱۵۔۳۱

۲۔ القرآن الکریم، سورہ آل عمران، آیت ۱۳۳

۳۔ القران الکریم، سورہ یٰس، آیت ۶۳

۴۔ سرسید احمد خان، تفسیر القرآن، رفاہ عام سٹیم پریس، لاہور، ص ۴۵۔۴۷

۵۔ تفسیر القرآن، سورہ البقرہ، ص ۴۴

۶۔ القرآن الکریم، سورہ البقرہ، آیت ۹۸

۷۔ الصحیح البخاری، ج ۱، ص ۲۱

۸۔ تفسیر القرآن، ص ۱۴۳ تا ۱۴۶

۹۔ تفسیر القرآن، سورہ اعراف، ص ۲۰۴

۱۰۔ القرآن الکریم، سورہ البقرہ، آیت ۶۳

۱۱۔ تفسیر القرآن، ص ۱۲۲۔۱۲۳

۱۲۔ تفسیر القرآن، ص ۱۰۱۔۱۰۴

۱۳۔ التحریر فی اصول التفسیر، ص ۸۔۲۱

۱۴۔ تفسیر القرآن، سورہ بنی اُسرائیل، ص ۱۰۳۔۱۰۴

۱۵۔ تفسیر القرآن، سورہ آل عمران، ص ۱۴۔۱۵

۱۶۔ التحریر فی اصول التفسیر، ص ۲۷

۱۷۔ حیات جاوید، بحوالہ سرسید کی کہانی ان کی اپنی زبانی، طلوع اسلام، لاہور، ص ۵۷

۱۸۔ مقالات سرسید، مجلس ترقی ادب، لاہور، ج ۱۵، ص ۱۴۷

۱۹۔ ضیاء الدین لاہوری، خودنوشت، جمعیۃ پبلی کیشنز، ص ۵۶

۲۰۔ تفسیر القرآن، ص ۳۱۔۳۲

۲۱۔ تفسیر القرآن، ص ۲۷۳۔۲۷۴

۲۲۔ اُیضا، ص ۲۰۱۔۲۰۷

۲۳۔ سرسید احمد خان، خطبات احمدیہ، ص ۲۳۸۔۲۴۰

۲۴۔ القرآن الکریم، سورہ البقرہ، ص ۱۰۶

۲۵۔ تفسیر القرآن، ص ۱۷۵

۲۶۔ تفسیر القرآن، ص ۱۸۳

سید التفاسیر المعروف بہ تفسیر اشرفی کا ادبی اعجاز

ڈاکٹر منظور احمد دکنی
شعبۂ اردو و فارسی، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ

مولانا مدنی میاں قبلہ کی تفسیر، تفسیرِ اشرفی اکیسویں صدی عیسویں میں اردو زبان میں لکھی جانے والی اہم ترین تفسیر ہے۔ اس تفسیر کے ذریعے مولانا نے عصری تقاضوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک اہم ذمہ داری کو پورا کیا ہے۔ اس کام سے جہاں اہلِ ایماں کو فکری تازگی ملتی ہے وہیں صوفیانہ افکار اور دعوتِ دین کے لئے حوصلہ و رہنمائی بھی حاصل ہوتی ہے۔

ربع صدی کی محنت شاقہ سے مولف نے اپنے پدرِ محترم محدث اعظم ہند کے خوابوں کی تعبیر کی ہے۔ محدث ہند نے اپنے سلیس ترجمہ کی مقبولیت کے بعد تفسیر کا ارادہ فرمایا اور تین پاروں کی تفسیر بھی فرما چکے تھے کہ اس دنیا سے چل بسے۔ آپ کے پردہ فرمانے کے بعد مریدین اور متعقدمین نے مدنی میاں قبلہ سے اسی نہج پر اسے مکمل کرنے کی گزارش پر اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ دس جلدوں پر مشتمل یہ تفسیر محدث اعظم ہند کے ترجمہ اور پہلے پارہ تک کی تفسیر کی اساس پر ہی ترتیب و تدوین کے مراحل سے گزر چکی ہے۔ تفسیر کی ترتیب و اسلوب میں مولف کی جانفشانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی اس سعی کو بڑی سادہ اور سلیس انداز میں قرآن شناسی کی طرف رغبت دلانے کی ایک کامیاب کوشش قرار دی جاسکتی ہے۔ اس سلسلہ میں ''منظور ہے گزارش احوال واقعی'' میں مدنی میاں قبلہ فرماتے ہیں:

> ''اس میں معتبر تفاسیر کا خلاصہ پیش کردیا گیا ہے اور فنی بحثوں کو نہیں چھیڑا گیا ہے۔ اختلافی احکام و مسائل میں فقہ حنفی کی رو سے وضاحت کی گئی ہے اور دلائل سے ممکنہ حد تک احترام کیا گیا کیونکہ مقصد صرف قرآن کی تفہیم ہے۔ لہذا نہ اس قدر اختصار ہے کہ معانی واضح نہ ہوسکیں اور نہ اس قدر تفصیل کہ آیات کی تفہیم سے اس کا تعلق نہ ہو۔''

مدنی میاں قبلہ نے جہاں اپنی ولولہ انگیز تقریروں سے عام مسلمانوں کے فکر و ذہن کو جھنجھوڑنے کی کوشش کرتے ہیں وہیں انہوں اپنی تحریروں سے بھی عام و خاص کو متاثر کیا ہے۔ حضرت کی تحریری خدمات میں تفسیر اشرفی ان کا اہم کارنامہ ہے۔ اس تفسیر میں اصول تفسیر کے ساتھ ساتھ عصری تقاضوں کا بھی کماحقہ خیال رکھتے ہوئے نہایت لگن، تحقیق، جستجو کے ساتھ ربع صدی کے عرصہ میں اس کی تدوین فرمائی

ہے۔تفسیرِ اشرفی میں قرآنی آیات کی تشریحات میں سیرت النبی ﷺ، احادیث، سیرت صحابہ اور اکابر صوفیہ کرام کے اقوال سے استفادہ کیا گیا ہے۔اس تفسیر میں کسی بھی مضمون یا موضوع کی تشریحات کو مربوط ومبسوط طرز میں اختصار اور جامعیت کے ساتھ بات کی تکمیل کی گئی ہے جس سے اس پوری سورت کا پسِ منظر اور پیش منظر سامنے آجاتا ہے اور بعض مقامات پر معنوی اور موضوعی مناسبات اور ربط بیان کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔مولانا کے یہاں جس درجہ کا علمی تبحر، دقتِ نظر اور تدبر وتفکر پایا جاتا ہے اس کے برخلاف انہوں نے آیات کی تشریحات میں ایجاز واختصار اور جامعیت کی آئینہ داری کرتے ہوئے سلیس وسادہ زبان میں اپنے دلائل پیش کئے ہیں تاکہ عام انسان بھی اس سے استفادہ کر سکے۔چنانچہ ضیاالرحمٰن علیمی ،تفسیر اشرفی کے سادہ بیانی پر یوں گویا ہیں کہ:

> ''کلام الٰہی کے تفسیری اثاثہ میں یہ ایک شاندار اضافہ ہے اور خاص طور سے ان لوگوں کے لئے مفید ہے جو سیدھے اور سہل انداز میں قرآن کے معانی ومفاہیم کو سمجھنا چاہتے ہیں اور اس کے تفصیلی عملی مباحث میں نہیں پڑھنا چاہئے۔''

سید التفاسیر پر ایک تجزیاتی نگاہ ڈالتے ہوئے اس کی ادبی حیثیت کی شناخت ممکن ہے۔مولانا نے معتبر روایتوں سے اپنی تفسیر لطیف میں وجدانی اور عرفانی کیفیات، وسعتِ فکر، تخیل کی پرواز، الفاظ کی مینا کاری، اسلوب کی جدت، فن کی ندرت، غرض تفسیر اشرفی میں تمام تر ادبی خوبیاں بھی جلوہ گر ہیں۔

تکرار، تضاد اور مناسبات لفظی:

آیات ربانی کی تشریحات میں مولف اصغر نے لفظوں کی تکرار سے ایک آہنگ پیدا کیا ہے۔گویا اس صنعت کا خوبصورت استعمال انہوں نے نثر پاروں میں کرتے ہوئے ادبی اعجاز کی مثال پیش کیا ہے۔اسی طرح تضاد بھی ان کے یہاں مل جاتا ہے۔رعایتِ لفظی کا استعمال بھی ان کی ادبی اعجاز کی شان ہے۔کئی آیات کی تشریحات میں موصوف نے مناسبات لفظی کے ذریعے زبان میں ندرت اور خوبی پیدا کرنے کی سعی جمیل کی ہے۔

تراکیب ومرکبات:

علامہ مدنی میاں کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے اسی لئے انہوں نے اپنی استعداد کا بھرپور استعمال کیا ہے انہوں اپنی تشریحات وتاویلات میں تراکیب ومرکبات کا خوبصورت استعمال کیا ہے انہوں نے فارسی اور ہندی زبان کا اثر بھی قبول کیا ہے اور اپنی تشریحات میں اپنے دور کی سلاست اور رواں زبان کا استعمال کیا ہے جو عصری زبان سے مطابقت رکھتی ہے۔ان کے تفسیری مطالعہ سے یہ بات

روشن ہوتی ہے کہ وہ اپنے عہد کی زبان استعمال کی ہے۔زبان کی ایک ساخت ہوتی ہے جو ہر عہد میں قائم رہتی ہے تاہم اس کے اسلوب میں تبدیلی آجاتی ہے۔مفسر کی تشریحات سے زبان کا دریا بہنے لگتا ہے۔لہذا حضرت مدنی میاں کے یہاں زبان کی ساخت میں حسن موجود ہے اور یہ حسن روزمرہ اور بول چال کی زبان کے استعمال کی وجہ سے آیا ہے۔تفسیر اشرفی سے چند مرکبات اور تراکیب کی مثالیں ملاحظہ فرمائیں: عالم خاک، صاحبانِ منصب، قلبی کارروائی، عالم افضل، مومنِ بے عمل، وراثتِ انبیاء وغیرہ۔

الفاظ کا انتخاب واستعمال:

کسی بھی نثر پارے میں انتخاب الفاظ اور ان کا صحیح اور مناسب استعمال اہمیت رکھتا ہے۔سید التفاسیر میں بھی ایسی مثالیں مل جاتی ہیں۔اس کے علاوہ علاقائی (ہندی) لفظیات کا بھی استعمال ملتا ہے اور یہ علاقائی الفاظ اردو کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔

حسن ورعنائی:

علمائے اہلِ حق کا خیال ہے کہ جس طرح تراجم کے باب میں کنز الایمان کو لاریب کی حیثیت حاصل ہے اور زبان وادب کا خزینہ ہے۔اسی طرح تفسیری نقطۂ نظر سے حضور والا کی تفسیرِ بالا شان کو بھی اسی زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔قرآن اللہ رب العزت کا کلام بلاغت ہے۔اس کا ہر لفظ معانی کا ایک جہان ہے اس کے آہنگ، صوتی حسن اور حسن وخوبصورتی میں جمال وجلال، شان وشکوہ، اور ترنم وتغنم وغیرہ جلوہ فگن ہیں۔قرآن خوانی کرنے والے اس کے اعجاز سے واقف ہیں۔ یہ اعجاز خوش الحانی ہے۔اس طرح اس کی قرأت کی جائے تو اس میں ترنم کا احساس ہوتا ہے اور سامع پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے۔ یہ کیفیت اگر تراجم اور تفاسیر میں بھی پائی جائے تو یہ مولف کی قابلیت اور ادبیت پر دلالت کرتی ہے۔اردو میں اس کیف وسرور کو زبان کی شگفتگی اور شادابی کہتے ہیں۔اس احساس کا تعلق جمالیات ہوتا ہے۔ادبی اعتبار سے جمالیات اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔چنانچہ تفسیر اشرفی میں جمالِ احساس کی شگفتگی، شائستگی اور رعنائی کی جلوہ گری سورۂ تکویر، سورۂ الانفطار کی ابتدائی آیات کی تشریحات سے ملاحظہ فرمائیں:

> بساطِ آفاق سے / اس کے نور کا انبساط / پھیلانا زائل ہوگیا / نیچے گر پڑے / یا / بے نور ہوگئے / زمیں سے اکھڑ کر / فضا میں اڑنے لگے۔۔۔

س طرح بے شمار سورتوں میں احساس جمال وجلال کی شگفتگی کی مثالیں مل جاتی ہیں۔

جیسا کہ اہل علم ودانش اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ عربی زبان کی یہ انفرادیت ہے کہ اس میں ایجاز واختصار کے لحاظ سے رئیس زبان رہی ہے۔اس طرح عربی زبان کا یہ ایجاز فارسی زبان کے راستہ اردو زبان میں درآیا۔لہذا اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے زبان کی تنگ دامنی کے باوجود اپنی تحریروں میں اختصار اور جامعیت کی نادر مثالیں قائم کی ہیں۔اس سلسلہ میں جب ہم تفسیر اشرفی کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں بھی ایجاز واختصار کی مثالیں مل جاتی ہیں۔درج ذیل مثالیں سورۂ طارق،سورۂ غاشیہ اور سورۂ شمس کی ابتدائی آیات کی تشریحات کو راقم نے نثری شاعری کے طرز پر پیش کیا ہے۔ان مثالوں سے سے مولفِ مکرم کی تفسیری مہارت،اردو زبان پر قدرت سے ان کا ادبی اعجاز نمایاں ہوتا ہے:

رات کو ظاہر ہونے والے /تارے / ہم تمہیں بتارہے ہیں / ہمارے سوا / تمہیں / کون بتاسکتا ہے / کہ /رات کو / نمودار ہونے والے تارے / تارے کی حقیقت کیا ہے؟ / تو یہ رات کا آنے والا /جو اپنی شعاعوں سے /ظلمتوں کو چاک کرتا ہے۔۔۔۔۔۔

تفسیر اشرفی کے سرسری مطالعہ سے یہ بات مترشح ہورہی ہے کہ اس کے کئی ادبی زاویئے ہیں اور ہر زاویہ ایک کتاب کی متقاضی ہے جیسے ایجاز واختصار، روزمرہ، محاورہ، انتخاب الفاظ، ادبی معنویت، فصاحت وبلاغت،علوم وفنون، وغیرہ وغیرہ۔غرض تفسیرِ اشرفی میں ادبی جواہر پارے موجود ہیں۔اس کا اپنا اسلوب اور منہج بھی ہے اور امتیازی شان وشوکت بھی۔قصہ مختصر تفسیر اشرفی میں اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی حقیقی شان کی غماز اور زبان وبیان اور ادبی اعجاز کا مرقع کہلائی جاسکتی ہے۔

صحاحِ ستہ کے اردو تراجم کا تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر انیس الرحمٰن

اسسٹنٹ پروفیسر (گیسٹ) شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

برصغیر میں اردو تراجم کا آغاز اٹھارہویں صدی عیسوی سے ہوا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کا زوال بھی ہوا۔ اس کی جگہ اردو زبان نے اپنے قدم جمانے شروع کئے۔ علماء نے اس حقیقت کا ادارک کیا کہ فارسی زبان کا زوال ہو چکا ہے۔ اور اردو زبان باہمی ربط ومعاملات کا ذریعہ بن چکا ہے، اس لیے انہوں نے وقت کے تقاضے کو دیکھتے ہوئے اسلامی تعلیمات کو اردو کے قالب میں ڈھالنا شروع کیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے فرزندوں کے ذریعہ کئے جانے والے قرآن کے اردو تراجم بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں، جیسے شاہ رفیع الدین کا اردو ترجمہ ۱۷۸۸ء اور شاہ عبدا القادر دہلوی کا اردو ترجمہ ''موضح القرآن'' ۱۷۹۰ء میں منظر عام پر آئے، شاہ رفیع الدین کا ترجمہ لفظی اور بامحاورہ ہے جب کہ شاہ عبد القادر نے مفہوم کی ترجمانی اور وضاحت کو ترجیح دی ہے۔ قرآن کے یہی اردو تراجم کتب حدیث کو بھی اردو میں منتقل کرنے کا محرک بنے۔

عرب ممالک سے تجارت اور علمی وفود کی آمد کے ساتھ علمی میدان میں حدیث سے تعلق وشغف اور شوق وجستجو میں اضافہ ہوا، جس کے نتیجہ میں حدیث کی خدمت کے بہت سے نئے گوشے معرض وجود میں آئے اور خاص طور پر حدیث کی کتابوں کی شروح، ان پر تعلیقات وحواشی کا اضافہ اور اس فن میں جدید تحقیق سے متعلق خدمات وجود میں آئیں۔ اس دور میں شاہ محمد اسحاق، سید نذیر حسین محدث دہلوی، شاہ عبدالغنی مجددی، شاہ قطب الدین دہلوی اور احمد علی محدث سہارنپوری کے نام قابل ذکر ہیں۔

علم حدیث میں نذیر حسین دہلوی اور شاہ عبدالغنی کے تلامذہ سے پیش رفت ہوئی، جن کے ذریعہ حدیث کی اردو خدمات انجام پائیں وہ بلا واسطہ یا بالواسطہ انہیں دونوں کے شاگردوں کی کاوشیں ہیں۔ اہل حدیث مکتبہِ فکر کے جن علماء کے ذریعہ اس فن کو فروغ حاصل ہوا، وہ سب بھی کسی نہ کسی طرح سید نذیر حسین دہلوی سے رشتہ تلمذ رکھتے ہیں۔ اس طرح شاہ عبدالغنی مجددی کے بعد شارحین حدیث احناف اور اہل حدیث کے دو الگ الگ مکتبہ فکر میں بٹے ہوئے نظر آتے ہیں، جن کا تحقیق وتشریح کا انداز بھی الگ

ہے، سید نذیر حسین دہلوی نے دہلی میں سالہا سال حدیث کا درس دیا۔ ان کے درس سے جلیل القدر شارحینِ حدیث پیدا ہوئے۔ جن میں مولانا عبدالمنان وزیرآبادی کے بہت سارے تلامذہ پنجاب میں مصروف درس وافادہ تھے۔ ان میں سید عبدالغفور غزنوی امرتسری (مصنف مشکوٰۃ الانوار التسہیل) شمس الحق عظیم آبادی (مصنف غایۃ المقصود) حافظ عبداللہ غازی پوری، مولانا ابراہیم آروی (مصنف طریق النجاۃ) اور مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری (مصنف تحفۃ الاحوذی) ہیں۔

کتب احادیث کے اردو تراجم کا آغاز

کتبِ حدیث کے اردو تراجم کا آغاز خرم علی بلہوری سے ہوتا ہے ان کے بعد کرامت علی جونپوری، قطب الدین دہلوی کے نام نمایاں ہیں، جنہوں نے کتب احادیث کے اردو تراجم کے کام کو بخوبی انجام دیا۔ ان کے بعد مولانا بدیع الزماں (م ۱۹۰۷ء) اور مولانا وحید الزماں (م ۱۹۲۰ء) دونوں بھائیوں نے صحاح ستہ کے تراجم کا بے نظیر کارنامہ پیش کیا، اور اس کے ساتھ ہی اردو میں حدیث کی تالیف وترجمہ کا ایک سیلاب سا آ گیا، ان مترجمین اور علوم کی سرپرستی کرنے والوں میں نواب صدیق حسن خاں (م ۱۸۹۰ء) مولانا عبدالاول غزنوی (م ۱۹۱۴ء) عبدالغفور غزنوی (م ۱۹۲۵ء) قابل ذکر ہیں۔

تحفۃ الاخیار ترجمہ مشارق الانوار: حدیث کی مشہور کتاب مشارق الانوار کا اردو میں سب سے پہلا ترجمہ ہوا۔ مولانا خرم علی بلہوری (م ۱۸۴۴ء) اس کے مترجم ہیں، جو شاہ ولی اللہ کے تربیت یافتہ تھے، یہ ترجمہ ۱۸۳۳ء میں مکمل ہوا اور ۱۸۳۶ء میں مطبع محمدی لکھنؤ سے شائع ہوا، میرے علم کے مطابق ہندوستان میں اس سے قبل کوئی بھی کتبِ حدیث اردو میں شائع نہیں ہوئی تھی۔ مصنف نے مسلمانوں کو تعلیماتِ نبوی سے باخبر کرنے کے لیے مشارق الانوار کا اردو ترجمہ کیا جو بے حد مقبول ہوا۔ کتاب کی زبان وطرز بیان اس زمانہ کے لحاظ سے نہایت عام فہم اور آسان ہے، لیکن موجودہ زمانہ کے اعتبار سے اس میں قدامت آ گئی ہے۔

> ''ترجمہ اردو مشارق الانوار (مولانا خرم علی) ہی کو یہ شرف حاصل ہے کہ کتب حدیث کا سب سے پہلا اردو ترجمہ یہی تحفۃ الاخیار ہے، مولانا خرم علی بلہوری کا سال وفات ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ء ہے۔'' (مقالہ، ہندوستان میں علم حدیث، ابو یحیی نوشہروی، ماہنامہ معارف دسمبر ۱۹۴۷ء حصہ دوم جلد ۶۰ شمارہ ۷ تا ۱۲، صفحہ ۴۴۷)

انوار محمدی ترجمہ شمائل ترمذی: اردو زبان میں حدیث کا دوسرا ترجمہ ''انوار محمدی'' ہے۔ یہ شمائل ترمذی کا اردو ترجمہ ہے اس کے مترجم مولانا کرامت علی جونپوری (م ۱۸۳۷ء) ہیں۔ یہ ترجمہ مطبع شوکت

المطابع میرٹھ سے ۱۸۳۶ء میں شائع ہوا۔اس ترجمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی زبان قدیم ہونے کے ساتھ ساتھ سادہ اور سلیس ہے۔

''شمائل ترمذی مشہور ومعروف اور حدیثوں کی کتاب میں مختصر اور بہت صحیح ہے کہ اس میں فقط وہ حدیثیں ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کے قد وقامت کی کیفیت اور ان کی ساری پاک فضیلتیں اور نیک سیرتیں مذکور ہیں اور اسی واسطے یہ حدیث کی بہترین کتابوں میں گنی جاتی ہے۔''

(اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ، ڈاکٹر محمد ایوب، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۸۸، صفحہ ۲۵۸)

مظاہر حق ترجمہ مشکوٰۃ المصابیح: اردو زبان میں حدیث کا تیسرا ترجمہ ''مظاہر حق'' ہے۔ یہ مشکوٰۃ کا ترجمہ ہے، اس کے مترجم نواب قطب الدین خان دہلوی (م ۱۸۷۲ء) ہیں۔ حالانکہ اس ترجمہ کی ابتداء شاہ محمد اسحاق دہلوی نے کی تھی۔ بعد میں نواب قطب الدین خاں نے کچھ تبدیلی کے ساتھ اسے بہتر بنانے کی کوشش کی، اس کا پہلا نسخہ ۱۲۶۷ھ میں شائع ہوا اور آخری مرتبہ مطبع محمدی نے کانپور میں نہایت عمدہ کتابت وطباعت اور کاغذ پر چھاپی ہے۔

(مقالہ، اردو میں تراجم حدیث، سید محبوب رضوی، ماہنامہ برہان، اکتوبر ۱۹۴۲ء، جلد ۹، صفحہ ۲۹۴)

مشکوٰۃ الانوار التسہیل ترجمہ مشارق الانوار: یہ شرح مولوی عبد الغفور غزنوی امرتسری (م ۱۹۲۵ء) نے اردو میں لکھی جو مطبع فاروقی دہلی سے شائع ہوئی تھی، مصنف نے اس میں مشارق کو مشکوٰۃ کے نہج پر مرتب کیا تھا۔ (تذکرۃ المحدثین، ضیاء الدین اصلاحی، دار المصنفین اعظم گڑھ ۲۰۱۳، جلد ۳، صفحہ ۳۷)

یہ کتاب چھوٹی مشکوٰۃ بن گئی بلکہ مشکوٰۃ پر بھی فوقیت لے گئی، کیوں کہ یہ کتاب مختصر ہے اور اس کی تمام حدیثوں کی صحت پر اتفاق ہے، اس میں کوئی حدیث ایسی نہیں جو غیر معتبر ہو، بخلاف مشکوٰۃ کے اس میں ہر قسم کی حدیثیں مذکور ہیں۔ صحیح بھی اور ضعیف بھی۔ ۱۸۵۰ء میں حسب وخواہ یہ کتاب تمام ہوئی اور مشکوٰۃ الانوار تسہیل مشارق الانوار اس کا نام مقرر کیا۔

(مقالہ ہندوستان میں علم حدیث، ابو یحیی امام نوشہروی، جنوری ۱۹۴۸ حصہ ۳ جلد ۶۱، صفحہ ۶۰)

ان کتب احادیث کے تراجم کے بعد صحاح ستہ کے اردو تراجم اسی سلسلہ کی کڑی ہیں۔ صحاح ستہ کے اردو تراجم عوام الناس کے فائدے کے لیے تحریر کیے گئے اور یہ اردو تراجم وقت کے ساتھ ساتھ منظر عام پر آئے۔ ان مترجم میں مولانا وحید الزماں (م ۱۹۲۰ء) کا نام سرفہرست ہے۔ انہوں نے کتب حدیث کی شروحات کو عروج تک پہنچایا، انہوں نے صحاح ستہ اور مؤطا امام مالک کے اردو میں ترجمے کئے۔ ان کا

اسلوب ترجمہ آسان اور عام فہم ہے۔ان کی تحریر کردہ شروحات درج ذیل ہیں۔

۱۔ **الھدی المحمود ترجمه سنن ابی داؤد** مکمل اردو: علامہ وحیدالزماں، مطبع صدیقی لاہور، ۱۸۸۳ء

۲۔ **رؤض الربی من ترجمه المجتبی عن سنن نسائی** اردو علامہ وحیدالزماں، مطبع صدیقی لاہور، ۱۸۸۵ء

۳۔ **جائزه الشعوذی ترجمه جامع الترمذی** علامہ وحیدالزماں، مطبع صدیقی لاہور، ۱۸۸۶ء

۴۔ **کشف المغطا فی ترجمه مؤطا امام مالک** مولانا وحیدالزماں، یہ مؤطا امام مالک کا اردو ترجمہ، اصح المطابع کراچی سے ۱۸۷۵ء میں شائع ہوا۔ اس کی سندیں حذف کردی گئیں ہیں۔ ترجمہ عام فہم زبان میں ہے اور ۷۹۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

(مجموعہ مقالات، علوم الحدیث، مطالعہ وتعارف، مقالہ علماء اہل حدیث ہند کی خدمات حدیث از مستقیم سلفی، مرتب رفیق احمد رئیس سلفی، جمعیت اہل حدیث ہند، ۱۹۹۹ء صفحہ ۴۶۰)

۵۔ **المعلم ترجمه صحیح مسلم** (چھ جلدیں) علامہ وحیدالزماں، مطبع صدیقی لاہور، ۱۸۸۸ء

۶۔ **رفع العجاجة شرح ابن ماجه:** علامہ وحیدالزماں، مطبع صدیقی لاہور، ۱۸۹۲ء

۷۔ **تسهیل القاری ترجمه صحیح البخاری مع شرح فتح الباری ونیل الأوطار** : اس کے شارح مولانا وحید الزماں ہیں۔ یہ پانچ جلدوں پر مشتمل بامحاورہ اور جامع شرح ہے، جو ہندوستان میں اردو میں پہلی مرتبہ لکھی گئی اور ۱۸۹۵ء میں مطبع صدیقی لاہور سے شائع ہوئی۔

۸۔ **تیسیر الباری ترجمه وشرح صحیح بخاری:** پیش نظر شرح مولانا وحیدالزماں کا عظیم شاہکار ہے، یہ الگ الگ پارہ میں اصل عبارت کے ساتھ ہے۔ اس میں ہر حدیث کے مقابل مطلب خیز بامحاورہ ترجمہ میں مطالب کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ حدیث کا مطلب خوب ذہن نشین ہوجاتا ہے۔ ساتھ ہی حدیث کی معتبر شروح مثلاً فتح الباری (ابن حجر) الکواکب الدراری (علامہ کرمانی) عمدۃ القاری (بدرالدین عینی) ارشاد الساری (قسطلانی) وغیرہ سے مرتب کرکے لکھی گئی ہے۔ صحیح بخاری کا یہ ترجمہ اپنی مثال آپ کہا جاسکتا ہے۔

صحیح البخاری کی اردو شروحات

صحیح بخاری کی دوسو سے زائد شرحیں لکھیں گئیں۔بعض علماء نے اس کے ترجمے کئے اور بعض نے اس کا اختصار کیا (یعنی اسناد حذف کردیں اور مکررات کو نکال دیا) ان میں سے چند اردو شروح درج ذیل ہیں۔

فیض الباری اردو ترجمہ فتح الباری: یہ برصغیر میں صحیح بخاری کی جلیل الشان شرح فتح الباری کا مکمل اولین اردو ترجمہ ہے، علامہ ابوالحسن سیالکوٹی نے فتح الباری کے تیس پاروں کو دس ضخیم جلدوں میں مرتب کیا۔ یہ شرح ۱۹۷۰ء میں پہلی مرتبہ منظر عام پر آئی۔ اور مطبع محمدی لاہور سے شائع ہوئی۔

(فیض الباری، محمد ابوالحسن سیالکوٹی، مکتبہ اصحاب الحدیث، لاہور طبع دوم، ۲۰۰۹ء صفحہ ۷)

نصرۃ الباری ترجمہ صحیح بخاری: محمد عبدالاول غزنوی اس کے شارح ہیں، یہ شرح مطبع انوار الاسلام امرتسر سے ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی۔ یہ شرح قدیم طرز پر لکھی ہوئی ہے جس میں عربی عبارت کے ساتھ ہی اردو ترجمہ موجود ہے۔ کتاب کی کوئی فہرست، مقدمہ یا تعارف موجود نہیں ہے۔

مرزا حیرت دہلوی کا ترجمہ صحیح بخاری، یہ شرح کرزن پریس دہلی سے ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ دس دس پاروں کی تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ جس میں اصل عبارت نہیں ہے صرف احادیث کی تشریح ہے، یہ زبان و بیان کے لحاظ سے اپنے دور کے تمام ترجموں سے اچھا ہے، اس کی پہلی جلد میں ۲۵۰۱ حدیثیں، دوسری جلد میں ۲۰۰۱ اور تیسری جلد میں ۲۴۰۸ احادیث شامل ہیں۔

فیوض الباری شرح صحیح بخاری، مولانا محمد محمود نے یہ اردو شرح تصنیف کی ہے جس میں عربی و فارسی شرحوں کی تلخیص بہت عمدگی کے ساتھ کی گئی ہے، اس میں احادیث کی جمع و تدوین اور جامع تاریخ بھی ہے، ۱۹۵۸ء میں یہ شرح مکمل ہوئی۔

نزھۃ القاری شرح صحیح البخاری: یہ علامہ شریف الحق امجدی کی صحیح بخاری کی اردو شرح ہے، یہ نو جلدوں پر مشتمل ہے، یہ شرح مصنف کی محنت و کاوش کا نتیجہ کہی جاسکتی ہے، جو اردو داں طبقہ کے لیے نہایت مفید ہے۔

مختصر صحیح بخاری : نویں صدی ہجری کے محدث ابوالعباس زین الدین احمد زبیدی (م ۸۹۳ء) کی کتاب ''التجرید الصریح لاحادیث الجامع الصحیح'' کا اردو ترجمہ ہے، اس کا اردو ترجمہ شرف ابن ابراہیم گوجرانوالہ (پاکستان) نے کیا ہے۔

خیر الجاری شرح صحیح البخاری: یہ شرح صحیح بخاری کی مختصر جامع و مکمل شرح ہے، اس

کے شارح صوفی سرور شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور ہیں، یہ تقریباً ساٹھ شروحات بخاری کا جامع خلاصہ ہے، جو چھ جلدوں پر مشتمل ہے، یہ اردو زبان میں مکمل ومختصر ایسی شرح ہے جو اپنے اختصار کے باوجود اپنے اندر علامہ عسقلانی، علامہ عینی، علامہ کشمیری اور دیگر علماء کے علوم کو سمیٹے ہوئے ہے۔

تفہیم البخاری عربی متن مع اردو شرح: اس کے شارح ظہور الباری اعظمی قاسمی نے انجام دیا، اس میں عام فہم شرح زمانہ کی ذہنی سطح کے مطابق کی گئی ہے، فقہی مذاہب کی ترجمانی اور محدثین وفقہاء کے اختلافات کی دل آویز وضاحت کی گئی ہے۔

تشریحات بخاری: مولانا محمد عبدالقادر قاسمی نے اس کو مرتب کیا، اس میں مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا سید حسین احمد مدنی، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کے افادات شامل ہیں۔ بشیر القاری یہ غلام جیلانی میرٹھی کی نامکمل اردو شرح ہے۔ ترجمہ وتشریح صحیح بخاری اس کے مترجم محمد داؤد ہیں۔

نصر الباری اس شرح کے مؤلف مولانا عثمان غنی ہیں جو مولانا حسین احمد مدنی کے شاگرد ہیں۔ **انعام الباری دروس بخاری**، یہ شرح مولانا تقی عثمانی کے افادات کا مجموعہ ہے۔ **الخیر الساری فی تشریحات البخاری** اس شرح میں مولانا محمد صدیق ملتانی کے افادات کو یکجا کیا گیا ہے۔ **تقریر بخاری** یہ شرح شیخ الحدیث مولانا زکریا کے افادات کا مجموعہ ہے۔ **ابواب وتراجم بخاری** مولانا ادریس کاندھلوی نے اسے تالیف کی اس میں ابواب وتراجم سے متعلق مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ **امداد الباری** اس کے شارح مولانا عبدالجبار اعظمی ہیں۔ **تجرید البخاری** اس کے مصنف علامہ عبدہ المصری ہیں اور اس کا اردو ترجمہ مولانا عبدالدائم جلالی نے کیا ہے۔ **جامع الدراری** مولانا عبدالجبار اعظمی کی صحیح بخاری کی اردو شرح **امداد الباری** کی تلخیص ہے۔ **فضل الباری** از مولانا فضل حق دلاوری۔ **نصرۃ الباری** از مولانا ستار دھلوی. **ترجمہ صحیح بخاری** از مولانا امیر علی لکھنوی۔ **ترجمہ صحیح بخاری** از مولانا عبدالتواب ملتانی۔ **مرآۃ البخاری** افادات عبدالملک نور پوری۔ **توفیق الباری** از پروفیسر عبدالکبیر محسن۔ عرفان الباری از افادات مولانا فخر الدین۔ **اسعاد القاری** از افادات مفتی عبداللہ خاں مظاہری۔ زبدۃ البخاری از محمد رفیق آغا۔ درس بخاری از مولانا نعمت اللہ اعظمی۔ انوار الباری از مولانا سید احمد رضا۔ تقریر بخاری شیخ سہارنپوری مرتب مولانا محمد شاہد۔ درس بخاری افادات مولانا شبیر احمد۔ غنیۃ القاری ترجمہ ثلاثیات البخاری از نواب صدیق حسن خان۔ ترجمہ کتاب الادب المفرد البخاری از مولانا ابراہیم آروی۔ **ترجمۃ الادب المفرد** مولانا ابونصر عبد الغفار۔ صحیح بخاری شریف تحقیق وتخریج از محمد محی الدین جہانگیر۔ نعمت الباری فی شرح صحیح بخاری از غلام

رسول سعیدی۔ارشادالقاری ازمفتی رشیداحمد کراچی۔کشف الباری ازمفتی محمد ادریس حسین مفتی دارالعلوم دیوبند۔تقریر بخاری افادات مولانا حسین احمد مدنی مرتب مولانا کفیل احمد۔**عین الجاری** ترجمہ بخاری ازمولانا ہدایت اللہ لکھنوی۔عطاء الباری شرح صحیح بخاری ازمولانا محمد عطاء المنعم۔

مسلم شریف کی اردو شروحات

المعلم الترجمہ :صحیح مسلم کا یہ اردو ترجمہ نواب وحیدالدین خان نے انجام دیا۔آغا رفیق بلند شہری نے صحیح مسلم شریف کامل اردو کے نام سے ایک ترجمہ کیا۔نفع المسلم مولانا اکرام علی بھاگلپوری اس کے شارح ہیں۔**نعمت المنعم** مقدمہ مسلم ازمولانا نعمت اللہ اعظمی۔ترجمہ صحیح مسلم ازمولانا عبدالدائم جلالی۔ **فیض الملہم** ازمولانا نعمان احمد۔عمدۃ الملہم مقدمہ مسلم ازمولانا محمد طاہر۔فیض المنعم ازمفتی سعید احمد۔تفہیم المسلم ازمولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی۔ **فیض الملہم** مقدمہ مسلم مولانا اسلام الحق۔**انعامات المنعم** ازمحبوب احمد۔ **تفہیم المسلم** ازمولانا زکریا اقبال۔ **تحفۃ المنعم** ازمولانا فضل محمد یوسف زئی۔**انعام المنعم** مولانا عبدالاول غزنوی۔

ترمذی شریف کی اردو شروحات

انوار محمدی ترجمہ شمائل ترمذی :اردو زبان میں ترمذی شریف کا یہ پہلا ترجمہ ہے، اس کے مترجم مولانا کرامت علی جونپوری ہیں۔ترمذی شریف کامل اردو شارح نذیر الحق قادری۔ **توضیح الترمذی** یہ افادات مولانا مدنی ہے۔ **جائزۃ الشعوذی** علامہ وحیدالزماں اور علامہ بدیع الزماں کا اردو ترجمہ ہے۔

درس ترمذی : یہ ترمذی شریف کی اردو میں سب سے مشہور شرح ہے جو مولانا تقی عثمانی کے افادات کا مجموعہ ہے۔**معارف ترمذی** ازقاضی سعید الرحمٰن۔ **المسک الزکی** ازمولانا اشرف علی تھانوی. **تحفۃ الالمعی** مفتی سعید احمد پالنپوری کے افادات کا مجموعہ ہے ان کے علاوہ بھی بہت سارے شروحات اور تراجم ہیں۔

ابوداؤد شریف کی اردو شروحات

السعی المحمود یہ شیخ الحدیث مولانا زکریا کے افادات کا مجموعہ ہے۔ **الدر المنضود** شارح نواب وحیدالزماں. **تشریح المنضود** مترجم مولانا نورالاسلام۔**زبدۃ المقصود** مؤلف ابوعبد القادر محمد طاہر رحیمی۔ **بحر المنن** مترجم مولانا محمد یحیی پالن پوری۔ **افضل المعبود** یہ شرح مولانا خلیل احمد سہارنپوی کی **بذل المجہود** پر مبنی ہے اس شرح کے مترجم پروفیسر منظور احمد ہیں۔ان کے علاوہ بھی

مزید شروحات ہیں۔

سنن ابن ماجہ کی اردو شروحات

رفع الحاجه شارح مولانا وحید الزماں۔**سنن ابن ماجه** مترجم عبدالحکیم اختر شاہ جہاں پوری۔ **رفع الحاجه** مترجم مولانا عبدالسلام بستوی۔ **مفتاح الحاجه** شارح مولانا محمد بن عبداللہ علوی۔ **شرح سنن ابن ماجه** از مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی۔**شرح سنن ابن ماجه** از عبدالصمد حسین آبادی۔**مصباح الزجاجه** افادات مولانا ریاست علی بجنوری۔**شرح سنن ابن ماجه** شیخ الحدیث مولانا محمد علی۔**شرح سنن ابن ماجه** مولانا شریف الدین احمد۔ان کے علاوہ مزید شروحات ہیں۔

سنن نسائی کی اردو شروحات

مولانا وحید الزماں کی لکھی ہوئی **شرح سنن نسائی** جسے کلاسیکل پرنٹرس دہلی نے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا۔سنن نسائی اردو از حافظ محمد امین لاہور۔**شرح سنن نسائی** از مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی۔

ان کے علاوہ بھی صحاح ستہ کے بے شمار شروحات و تراجم ہندو پاک میں منظر عام پر آئے جو سب کے سب بے نظیر ہیں۔خدا محدثین وعلماء کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور اس حدیث کا مصداق بنائے،آپ ﷺ نے فرمایا:"**نضر اللّٰه إمرأ سمع مقالتی فوعاها و حفظها و بلغها**"

(سنن ترمذی،باب ماجاء فی الحث علی تبلیغ السماع، حدیث۲۵۸۲)

مذہبی تراجم کی تاریخ اور روایت

ڈاکٹر ابوبکر ابراہیم عمری

انسان جس کا تعلق دنیا کے کسی بھی گوشے سے کیوں نہ ہو وہ اپنے دین اور مذہب کے تئیں حساس ہوتا ہے۔ اس کا یہ خیال ہوتا ہے کہ اُس کا مذہب سچا ہے۔ اسی دین کی پیروی کرنے سے خدا خوش ہوگا۔ نتیجتاً بندہ خدا کی جنت کا مستحق ہو۔ چنانچہ وہ اپنی یہ ذمہ داری سمجھتا ہے کہ تمام انسانوں تک اپنے اس مذہب کو پہنچانے کی ہر ممکن سعی کرے۔ اگر لوگ اس زبان سے واقف نہیں ہیں جس میں اس کی مذہبی کتاب موجود ہے تو وہ عوام کی زبان میں انہیں منتقل کرنے کی کوشش کرتا رہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عبد الحق اپنے مضمون ''مذہبی تصانیف کے تراجم'' میں رقمطراز ہیں:

> ''ترجمے کے محرک عوامل میں بہت سے اسباب کارفرما ہوتے ہیں ان میں ایمان وعقیدہ یا فکر ونظر کی اشاعت کا رجحان سب سے زیادہ حاوی ہوتا ہے۔ انسانی کمزوری ہے کہ اپنے افکار سے عالم کو روشناس ہی نہیں کرانا چاہتا بلکہ منوانا بھی چاہتا ہے۔ یا اپنے حلقہ خیال کو وسیع تر بنانے کی مہم جوئی میں سرگرداں اور خدمتِ دین یا خدمت خلق کے ذوق سے سرشار ہوتا ہے۔ اس مخصوص لٹریچر کی نشر واشاعت میں پوری تن دہی سے مصروف کار دکھائی دیتا ہے۔ دوسرا محرک جذبہ مال ومنافع بھی ہے۔ مادی ضرورتوں سے بھرپور اس دنیا میں سود وزیاں سے بے نیاز نہیں رہا جاسکتا۔ افراد اور اداروں کی نظر بازار اور عوام کی قوت خرید پر ہوتی ہے اصل کتاب کے موضوع اور مبادیات پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ سنسنی خیز کتابیں بھی اسی زمرے میں آتی ہیں جن پر بعض وقت کئی ناشرین کی توجہ ہوتی ہے۔''

(ترجمہ کا فن اور روایت، پروفیسر قمر رئیس، تاج پبلیشنگ ہاؤس دہلی 1976ء ص:244)

مندرجہ اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مذہبی تراجم کے پیچھے یہ عموماً یہ دو محرک کارفرما ہیں۔ جس کی وجہ سے کوئی بھی عہد مذہبی ترجمہ سے خالی نہ رہا۔ حالانکہ ابتدا مذہبی ترجمہ کو قابل جرم عمل گردانا گیا تھا۔ مذہبی صحائف کے متعلق یہ خیال شدت سے پایا جاتا تھا کہ اس کے الفاظ بھی مقدس ہیں اور انہیں کسی اور زبان میں منتقل نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ جن لوگوں نے اس طرح کی کوششیں کی انہیں شدید مخالف کا سامنا کرنا پڑا۔ بقول مرزا حامد بیگ ولیم ٹنڈیل جو بائیبل کا پہلا انگریزی مترجم ہے، صرف ترجمہ کے

جرم میں اسے پھانسی کی سزا دی گئی، اور اس کی لاش کو دھکتی ہوئی آگ کے نذر کر دیا گیا۔ خود قرآن کے اولین ترجموں کے سلسلے میں بھی ینگ نظر مذہبی لوگوں کا رویہ کافی منفی رہا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو بھی اس طرح کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن انہیں دو محرکات کی بنا ہر کسی عہد میں یہ مذہبی ترجمے کا عمل جاری رہا۔

عالمی سطح پر مذہبی تراجم

پچھلے دو ہزار برسوں کے دوران بائبل کے عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید کو 426 زبانوں میں منتقل کیا گیا اور عہد نامہ جدید کا ترجمہ دنیا کی 1100 زبانوں میں ہو چکا ہے، جب کہ اس عہد نامہ جدید کے بعض اجزا 2403 زبانوں میں دستیاب ہیں (انسائیکلو پیڈیا آف ٹرانسلیشن، ص 21)

بائبل عہد نامہ قدیم کے ترجمے کی ابتدا تین صدی قبل مسیح میں ہوئی جب کہ عبرانی سے یونانی زبان میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔ ایک روایت کے مطابق 72 یہودی علما نے مل کر 72 دنوں میں یہ کام مکمل کیا۔ (ایضاً ص 21)۔ اس کے بعد بائبل کے ترجمے میں دوسرا اہم نام سینٹ جیروم کا ہے جسے 383 عیسوی میں پوپ دماسوس نے بائبل کے عہد نامہ جدید کو لاطینی زبان میں منتقل کرنے کی ذمہ داری تفویض کی۔ سینٹ جیروم نے 406 عیسوی میں یہ کام مکمل کیا۔

انیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی یورپ کے باہر دنیا کی مختلف زبانوں میں بائبل کے ترجموں کا کام بڑی تیزی کے ساتھ شروع ہوا۔ 1800 کی صدی کو بائبل ترجموں کے لیے ایک مشنری عہد کہا جا سکتا ہے۔ اس صدی کے دوران برمی، چینی، بنگالی، سنسکرت، مراٹھی، ہندی، اردو، فارسی، عربی، سیامی، مایا، سواحلی جیسی زبانوں کے علاوہ دیگر سینکڑوں زبانوں میں بائبل کا ترجمہ کر دیا گیا۔ اس وقت دنیا بھر کی مختلف زبانوں میں بائبل کے ترجمے کے لیے کئی ادارے قائم ہیں جو اس کام کو انجام دے رہے ہیں۔

اسلام کی اصل کتاب قرآن مجید کے ترجمے کا کام بعض روایتوں کے مطابق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دور ہی میں شروع ہوا تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف بادشاہوں، جیسے رومی شہنشاہ ہرقل، مصر کے حاکم مقوقس اور ایران کے کسریٰ کو جو خطوط بھیجے تھے ان میں قرآن کی آیت بھی لکھی تھی جس کا ترجمہ ان بادشاہوں کی مقامی زبانوں میں کسی نہ کسی نے کیا ہوگا۔ روایات کے مطابق قرآن کا پہلا ترجمہ عباسی خلافت کے عہد میں فارسی زبان میں کیا گیا۔ یہ ترجمہ بنیادی طور پر تشریح کی صورت میں تھا۔

رابرٹ آف چیسٹر نے نے پہلی مرتبہ لاطینی زبان میں قرآن کا مکمل ترجمہ کیا یہ ترجمہ 1143ء مطابق 537ھ میں کیا گیا۔ البتہ اس ترجمہ کا مقصد تبلیغ نہیں بلکہ اسلام کے عقائد کا ابطال اور تردید کرنا

تھا۔انگریزی کا پہلا ترجمہ 1649 میں الیگزینڈر راس نے کیا جو راست عربی سے نہیں بلکہ فرانسیسی کے ترجمہ قرآن سے کیا گیا اس فرانسیسی ترجمہ کے مقاصد بھی لاطینی ترجمے کی طرح معاندانہ تھے۔(ایضاً،ص 230)اس کے بعد سے قرآن کا ترجمہ دنیا کی تقریباً تمام ہی زبانوں میں ہوا اور کئی زبانوں میں اس کے ایک سے زائد تراجم کیے گئے۔ ہندوستان میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے موضح القرآن کے نام سے قرآن کا فارسی ترجمہ کیا۔اور انہی کے صاحب زادے قرآن کے اولین اردو مترجمین میں شمار کیے جاتے ہیں۔زمانہ حال میں قرآن مجید کے تراجم کے حوالے سعودی حکومت کا ادارہ ''مطبع ملک فہد'' کام کر رہا ہے۔ یہ ادارہ قرآن مجید کو دنیا میں موجود تمام زبانوں سے ترجمے کا کام کر رہا ہے۔

بدھ مت کے مقدس سوتر شائد گوتم بدھ کی موت کے بعد پہلی صدی قبل مسیح میں لکھے گئے۔ یہ پالی زبان میں لکھے گئے تھے۔تاہم انہیں علاقائی اور سنسکرت زبان میں بھی لکھنے کا آغاز ہوا اس طرح اسی وقت ترجمہ کا بھی آغاز ہوا۔جب ہندوستان کے باہر نکل کر چین اور دیگر ممالک تک پھیل گیا تو وہاں بدھ مت کے صحائف کو ان کی زبانوں میں منتقل کرنے کا کام شروع کیا گیا۔چین میں ترجمے کی یہ اولین لہر دوسری صدی عیسوی میں شروع ہوئی جس میں بدھ مت کے سوتروں کو چینی زبان میں منتقل کیا گیا۔اس کے بعد چین میں ترجمے کی زبردست تحریک چلی جو حکومت کی سرپرستی میں تقریباً نو صدیوں تک جاری رہی۔(ایضاً،ص369)

ہندو مذہبی کتابوں میں مہابھارت، رامائن، بھگوت گیتا اور پرانوں کو پہلے سنسکرت سے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں منتقل کیا گیا پھر اس کے بعد انہیں دنیا کی دیگر زبانوں میں منتقل کرنے کا کام بھی ہوا۔

اردو میں مذہبی تراجم

اردو زبان برصغیرِ ہند کی پیداوار ہے۔ ہندوستان صدیوں سے مختلف اقوام کی آمد کے باعث تکثیری نوعیت کا سماج بن چکا ہے۔قدیم زمانے سے یہ مختلف مذاہب کا گہوارہ رہا اور تاریخ کے مختلف ادوار میں دنیا کے مختلف اقوام اور مذاہب نے اس سرزمین کو اپنا مسکن بنایا۔اس وقت یہاں پر جتنے مذاہب پائے جاتے ہیں ان تمام کا لٹریچر اس زبان میں منتقل کیا گیا۔

انجیل کے تراجم

ہندوستان میں انجیل کے ترجمے کی روایت یورپی اقوام کی ہندوستان آمد کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔یوروپی اقوام اپنے مذہب کی تبلیغ کے سلسلے میں نہایت مستعد تھے۔نوآبادیاتی دور میں یوروپی اقوام

جہاں بھی گئے وہاں انہوں نے اپنے مذہب کو مقامی لوگوں کے لیے قابل رسائی بنانے کی غرض سے بائبل کا مقامی زبانوں میں ترجمہ کرنے کا کام شروع کیا۔ ہندوستان میں انجیل کا پہلا اردو ترجمہ ڈنمارک کے پادری بنجامن شلٹز نے 1739ء میں شروع کیا اور 1741 میں مکمل کیا۔ اور یہ ترجمہ 1848ء میں شائع ہوا۔ (مغرب سے نثری تراجم: مرزا حامد بیگ، مقتدرہ قومی زبان، لاہور ص:113)

یہاں یہ بات غور کرنے کی ہے کہ اردو زبان میں شاہ رفیع الدین کے مکمل ترجمہ قرآن سے پہلے انجیل کا اردو ترجمہ مکمل ہو چکا تھا۔ شاہ رفیع الدین کا ترجمہ قرآن 1776ء میں مکمل ہوا جب کہ انجیل کا ترجمہ اس سے 35 سال قبل 1741ء میں مکمل ہو چکا تھا۔

انجیل ہی کا دوسرا اردو ترجمہ ''کالنبرگ'' کا ہے جو 1750ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ ان دو تراجم سے قبل ولندیزی سفیر ''جان جوشوا کیٹلر'' نے اپنی کتاب ''صرف ونحو ہندوستانی'' (مطبوعہ: 1715ء کلکتہ) میں انجیل کا ایک حصہ ''دعائے ربانی'' کا اردو ترجمہ شامل کیا تھا۔ جو بعد میں مستقل کتابچہ کی شکل میں شائع ہوا۔ (ایضاً، ص:113)

1804ء میں پادری ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے چند ہندوستانی پنڈتوں کی مدد سے اناجیل کا ترجمہ کیا جو 1805 میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ (ایضاً، ص:113)

سن 1811ء میں پادری ہنری مارٹن نے پہلی بار سیرام پور مشن کے تحت بائبل کا اردو ترجمہ جناب مرزا فطرت کی مدد سے کیا۔ اور یہ ترجمہ سن 1808ء میں اختتام کو پہونچا، اس کا خط دیوناگری رسم الخط ہے جو 650 صفحات پر مشتمل ہے۔ (ایضاً، ص:108) بعد میں اسی ترجمہ کو بنیاد بناتے ہوئے پادری ''بولی'' نے ہندی ترجمہ کی بنیاد رکھی۔ (ایضاً، ص:113) اردو ترجمہ کے بارے میں رام بابو سکسینہ (تاریخ ادب اردو) کا بیان تا حال معتبر خیال کیا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ 1814ء میں مکمل ہوا اور 1819ء میں شائع ہوا۔ (ایضاً، ص:114)

ہندو مذہبی کتابوں کے اردو تراجم

اردو زبان میں ہندوستان کے دیگر مذاہب کی بھی تمام اہم کتابوں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ وید، پران، مہابھارت، بھگوت گیتا، رامائن وغیرہ کے ترجمے ہوئے۔ چاروں ویدوں کے خلاصے کا ترجمہ الکھ دھاری عرف منشی کنھیا لال نے الکھ پرکاش کے نام سے کیا جو 1861ء میں شائع ہوا تھا۔ رامائن کے مکمل اور نا تمام ترجموں کی تعداد تقریباً بیس ہے جب کہ گیتا کے تراجم کی تعداد ان سے بھی زائد ہے۔ (ترجمہ کا

فن اور روایت، پروفیسر قمر رئیس، تاج پبلیشنگ ہاؤس دہلی 1976ء ص 267)

اسلام کے مذہبی تراجم

زبانِ اردو میں اسلام کے مذہبی تراجم کے حوالے سے گفتگو کریں گے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ جب اس زبان کا معرضِ وجود ہوا اسی وقت سے اس میں مذہبی تراجم کی روایت جاری ہے۔ اس زبان کا پہلا مذہبی رسالہ سید محمد حسینی المروف خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی ''معراج العاشقین'' کو سمجھا جاتا ہے۔ یہ کتاب 1422ء سے قبل کی گئی تحریر ہے۔ جہاں تک اردو ترجمہ کا معاملہ ہے اس سلسلے میں سب سے اولین ترجمہ شاہ میراں جی خدانما کا ''تمہیدات ہمدانی'' کو قرار دیا جاتا ہے۔ محققین کی رائے کے مطابق اس ترجمہ کا پہلا نسخہ 1603ء میں لکھا گیا تھا۔ شمس اللہ نے اپنی کتاب ''تاریخ زبان اردو یعنی اردوئے قدیم'' میں لکھا ہے کہ حضرت خواجہ بندہ نواز کے نبیرہ سید محمد عبداللہ حسینی نے شیخ عبدالقادر جیلانی کے رسالہ 'نشاط العشق' کا دکنی میں ترجمہ کیا تھا اور اس کی شرح بھی لکھی۔ آپ کا عہد احمد شاہ بہمنی کا عہد ہے۔ انہوں نے فہرست کتب خانہ ٹیپو سلطان کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس کا ایک نفیس نسخہ اس کتب خانے میں موجود تھا۔ (تاریخ زبان اردو، شمس اللہ قادری ص ۲۴)۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد جنید ذاکر نے اپنی کتاب اصطلاحی مطالعے میں اپنی تحقیق کی بنیاد پر سید عبداللہ حسینی کے اسی ترجمہ ''نشاط العشق'' کو اردو کا پہلا ترجمہ قرار دیا ہے جو تمہیدات ہمدانی سے تقریباً دو سو سال قبل بہمنی دور حکومت میں کیا گیا تھا۔ (اصطلاحی مطالعے، ڈاکٹر محمد جنید ذاکر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوز، 2015، ص 26)

شمالی ہندوستان میں اردو کی نشوونما و فروغ کے بعد قرآن مجید کا پہلا ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ کے فرزند مولانا شاہ رفیع الدین نے 1776ء میں کیا۔ یہ قرآن مجید کا اولین اردو ترجمہ ہے۔ جیسے جیسے اردو زبان ترقی کے منازل طے کرتی رہی دیگر تخلیقات و تراجم کے ساتھ ساتھ قرآن اور دیگر مذہبی کتابوں کے ترجموں کی روایت بھی عہد بہ عہد آگے بڑھتی رہی۔ ایک تحقیق کی رو سے آج تک مکمل قران کے ایک ہزار ایک سو سے زائد اردو تراجم ہو چکے ہیں۔

مسلمانوں کی مذہبی کتابوں میں احادیث شریفہ کا بڑا اونچا مقام ہے۔ اسلام کے بنیادی ماخذات میں قرآن مجید کے بعد اسی کو اولیت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں علمائے اسلام نے احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے تقریباً تمام ہی مجموعوں کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق علم حدیث اور فن حدیث میں عرب سے زیادہ عجم نے خدمات انجام دیں ہیں۔ اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ احادیث کی سب سے

مستند تسلیم کی جانے والی کتابیں جنہیں صحاح ستہ کہا جاتا ہے، اور جن کے مقام کو پوری علمی دنیا تسلیم کرتی ہے، اس کے مؤلفین اور مصنفین سب کے سب عجمی یعنی غیر عرب ہیں۔ علم حدیث کے سلسلے میں بالخصوص برصغیر کی خدمات کا اعتراف عرب دنیا کے علما و اسکالروں نے بھی کیا ہے۔ مثال کے طور علامہ رشید رضا صاحبِ 'تفسیر المنار' نے ان الفاظ میں برصغیر کے علما کی خدمات حدیث کا ذکر کیا ہے:

''اگر ہمارے علماء ہند اس علم کی جانب توجہ نہ دیتے تو مشرق سے علم حدیث ختم ہو جاتا'' (مقدمہ مفتاح کنوز السنہ، طبع دوم، سہیل اکیڈمی، لاہور)

زبان عربی میں حدیث اور فن حدیث پر جتنا بھی کام ہوا ہے، اس کا وافر حصہ اردو زبان میں بھی منتقل کیا جا چکا ہے اور فی الحال کام مزید تیزی سے جاری ہے۔ بعض امہات الکتب کے دسیوں تراجم ہو چکے ہیں۔ مثلا (۱) صحیح بخاری شریف کے بیس سے زائد تراجم (۲) صحیح مسلم شریف کے آٹھ سے زائد (۳) سنن ابوداود شریف کے دس سے زائد (۴) سنن ترمذی کے پانچ سے زائد (۵) سنن نسائی کے چار سے زائد (۶) سنن ابن ماجہ کے چھ سے زائد تراجم ہیں۔ علاوہ ازیں زبان اردو میں حدیث اور فن حدیث پر جو مستقل کتابیں لکھی گئیں ہیں ان کی تعداد لامتناہی ہے۔ فقہ جو کہ کسی بھی معاشرت اور سماج کے اصول و مبادی پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کی اہمیت اور ضرورت کے پیش نظر اس کا بھی ترجمہ بڑی حد تک اردو میں ہو چکا ہے۔

غرض دنیا کے زندہ اقوام نے اپنے مذاہب کی تبلیغ و اشاعت میں ترجمہ کا بڑا سہارا لیا ہے۔ اور اس راہ میں بڑی قربانیاں بھی پیش کیں ہیں۔ ابتدائی ادوار میں مترجموں کو شدید تنقید کا نشانہ بنانے کے سوا، انھیں شہر بدر کیا گیا، علاوہ ازیں بعض مترجموں کو زندہ جلا بھی دیا گیا۔ آج یہ فن جس عروج پر پہونچا ہے اس کے پیچھے یہ ساری قربانیاں کارفرما ہیں۔ مغرب اور مشرق میں ترجمہ ایک فن اور شعبہ کے طور پر ابھر رہا ہے۔



اردو شاعری میں مناجات

ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری
شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج برائے ذکور (خودمختار)، کڈپہ

انسان خدا کے تصور اور مذہب کے احساس سے مربوط رہتا ہے۔ یہ ایک فطری داعیہ بھی ہے اور انسانی فطرت کا تقاضا بھی۔ عبادت اور بندگی کے جذبات کی تسکین کے لیے بارگاہِ خداوندی میں جبینِ نیاز کو خم کرنا اور اس کی جناب میں خشوع و خضوع کے ساتھ تذلل و تعبّد اختیار کرتے ہوئے، اسی کی خشیت و مشیت پر ایقان و ایمان کے ساتھ، اس کے جبر و قدر کے فیصلوں پر تسلیم و رضا کا خوگر ہو کر، اسی سے استعانت کا سوالی ہونا، ودیعتِ فطرتِ انسانی اور بندگی کا تقاضا ہے۔

کسی بھی زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ البتہ جس سماج میں زبان بولی جاتی ہے اس کا مذہب ضرور ہوتا ہے۔ زبان کے لسانی مزاج اور تشکیلی نظام میں اس مذہب کے اثرات پائے جاتے ہیں جس سماج میں اس زبان کی تشکیل ہوئی اور جس سماج میں اس زبان کا استعمال کیا جاتا ہے۔ زبان میں مروج محاورات، تلمیحات، تعبیرات اور روزمرہ پر بھی مذہب کے راست اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

شاعری میں خدا کا تصور مختلف حیثیتوں سے جلوہ گر ہوتا ہے۔ خدا کی عبادت کا فطری جذبہ، خدا کی عظمت کا تصور اور اس سے استمداد و استعانت اور اس کی عبادت و اطاعت، آرادھنا اور پرستش کا شعور بنی نوع انسان میں ہمیشہ سے رہا ہے۔ ع: زشوقِ بندگی پروردگارے کردہ ام پیدا۔

مناجات، عربی لفظ نجویٰ سے مشتق ہے۔ لفظی معنی سرگوشی، کانا پھوسی اور ہمکلامی کے ہیں، اصطلاحاً دعاء، التجا، عرضِ مدعا، معروضہ، عرض معروض، وغیرہ۔ عام طور پر وہ اشعار جن میں خدا کی حمد و تعریف اور اپنی عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے دعاء اور التجا کرنا اور طلبِ نجات کے لیے اپنی بندگی کے جذبات و احساسات کو منظوم دعاء کی شکل میں پیش کرنا مناجات ہے۔ مناجات ایک موضوعی صنفِ سخن ہے اور کسی بھی شعری ہیئت میں کہی جاسکتی ہے۔ عام طور پر مناجات میں خدا کی بارگاہِ قدس میں دعا مانگی جاتی ہے۔ اردو میں مناجات کو ایک مستقل صنفِ سخن کی حیثیت حاصل ہے۔ اگر مناجات کو مستقل صنف تسلیم کرنے میں تامل ہو، تب بھی مناجات، کم از کم حمدیہ شاعری کا ایک جزو ضرور ہے۔

انسان اپنی حاجت روی، کے لیے ضرورت کی تکمیل اور تکلیف و مصیبت سے نجات کے لیے خدا کے حضور دست بدعا ہوتا ہے۔ یہاں دست بدعا محاورتاً ہے، کوئی ضروری نہیں کہ وہ دست دعا بلند کرے، کیوں کہ

اس کے دل سے بلند ہونے والی صدا خود دعا بن کر نکلتی ہے۔ خواہ وہ صدائے دل، زبان سے ادا ہو یا نہ ہو، رشتہ عبد و معبود کا احساس اس کی جانب توجہ مبذول کرانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ بسا اوقات جذباتِ عبودیت زبان سے ادا ہو جاتے ہیں اور کبھی صرف دل کی زبان سے ادا ہوتے ہیں اور عرشِ معلیٰ تک پہنچتے ہیں۔ دعا و مناجات کے پس منظر میں یہ یقین و اعتقاد بھی ہوتا ہے کہ دعا و مناجات جس سے کی جا رہی ہے وہ قبول کرنے والا، سننے والا، کارساز، دادرس ہے۔

اردو کی شعری روایات میں شروع ہی سے حمد و مناجات اور نعت و منقبت ایسے مذہبی موضوعات ملتے ہیں۔ اردو کے ابتدائی زمانے میں بھی صوفیائے کرام نے اس جانب توجہ مبذول فرمائی۔ پھر اردو شاعری میں حمد و مناجات اس طرح رواج پا گئے کہ شعری روایات کا حصہ بن گئے۔ حمد و مناجات و نعت و سلام و منقبتِ ائمہ وغیرہ' یہ سب عناصر کچھ اس طرح مروّج ہوئے اور تمام شعراء کے یہاں ایسا التزام پایا گیا کہ انہیں شعری روایات' بالخصوص مثنوی کا ایک لازمی جزو سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ عام طور پر اردو مثنویوں کی ابتداء میں حمد و مناجات کے موضوعات ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر مجید بیدار نے اپنے مقالہ 'دکنی مثنویوں میں مناجات' میں احسن القواعد کے مؤلف مولوی نجف علی خان کے حوالے سے لکھا ہے کہ مناجات مثنوی کا لازمی جزو ہے۔

مناجات کے ساتھ حمد کو لازمی تصور کیا جاتا ہے۔ حمد و مناجات اور منظوم دعاؤں میں بندگی اور عبودیت کے جذبات، تذلل و تواضع، عجز و انکسار کے احساسات، خداوند قدوس کی کبریائی اور عظمت کا اقرار و اعتراف، محبتِ الٰہی اور خشیتِ خداوندی کی ملی جلی کیفیات، دنیا کے مسائل، زندگی کے مصائب، زمانے کی شکایات، آہ و زاری، بکاء و گریہ، کے ایسے عالم میں قلبِ محزون کی صدائے حزیں، دلِ مغموم کی فریاد، دنیا کے مصائب و آلام کا ذکر، حاجت روائی کے لیے دعائیں، ترحم اور رحمتِ الٰہی کی طلب، چشمِ نم کی فریاد، اشک شوئی کی آس، اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ حمد میں مناجات کا رنگ ایک اندرونی لہر کے طور پر موجود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حمد اور مناجات میں کوئی حد فاصل مقرر نہیں کی جا سکتی۔

حمد اور مناجات کا یہ جو سلسلہ ہے، اردو شاعری میں، شروع ہی سے رہا ہے، قدیم دکنی مثنویوں میں بھی مناجاتیں ملتی ہے۔ حمدیں ملتی ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کے دیوان میں کئی مناجاتیں ہیں، جن میں ایک مناجات بہت مشہور ہے جس کی ردیف 'یا سمیع' ہے۔ اس مناجات کے دو شعر:

مناجات' میرا تو سن یا سمیع! منجے خوش توں رک رات دن یا سمیع
میرا شہر لوگاں سوں' معمور کر رکھیا جوں توں دریا میں من یا سمیع

معروضۂ پیشتر کہ مثنوی میں مناجات کو لازمی جزو کے طور پر اختیار کیا گیا ہے۔ دکن کی تمام مثنویوں میں مناجات کی روایت ملتی ہے۔ قدیم شاعر فائز دہلوی کی چودہ مثنویوں میں ایک مثنوی خاص مناجات کے عنوان سے لکھی ہے۔ شاہ حاتم نے بھی اپنی مثنویوں کی ابتدا حمد و مناجات سے کی ہے۔

نظیر اکبر آبادی کے دیوان میں ایک مسدس 'الٰہی نامہ' موجود ہے جس کا یہ مصرعہ ضرب المثل ہے... ''آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا''۔

میر حسن نے سحر البیان میں حمد و مناجات اور نعت و منقبت کی روایت کی پاسداری کی ہے۔ حمد کے چند اشعار کے بعد، میر حسن ملتفتِ مناجات ہو کر کہتے ہیں:

الٰہی! میں بندہ گنہگار ہوں گناہوں میں اپنے گرفتار ہوں
مجھے میرے پروردگار کہ ہے تو کریم اور آمرزگار
پر اک عرض یہ ہے کہ جب تک جیوں شرابِ محبت کو تیری پیوں
سوا تیری الفت کے اور سب ہے ہیچ یہی ہو نہ ہو اور کچھ اینچ پینچ
کسی سے نہ کرنی پڑے التجا تو کر خود بخود میر یحاجت روا
جیوں آبرو اور حرمت کے ساتھ رہوں میں عزیزوں میں عزت کے ساتھ

مثنوی سحر البیان کے بعد دبستانِ لکھنؤ کی دوسری اہم مثنوی گلزارِ نسیم ہے۔ دیا شنکر نسیم اپنی مثنوی گلزارِ نسیم میں حمد و مناجات کے ضمن میں کہتے ہیں:

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری ثمرہ ہے قلم کا حمد باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر حمدِ حق و مدحتِ پیمبر
ختم اس پر ہوئی سخن پرستی کرتا ہے زباں کی پیش دستی
یا رب! مرے خامہ کو زباں دے منقارِ ہزار داستاں دے

پنڈت جگن ناتھ خوشتر اپنی منظوم رامائن کی ابتدا ان اشعار سے کرتے ہیں:

خدایا! نام کو آوری دے قلم میں جلوہ بال و پری دے

دبستانِ دہلی کے نمائندہ شاعر حکیم مومن خان مومن اپنی مثنوی بمضمون جہاد میں حضرت سید احمد شہید اور ان کے رفقاء کی تحریک جہاد کے پس منظر میں کہی گئی ہے۔ اس مثنوی کی ابتدا میں پورے خلوص اور والہانہ جذبہ شوق شہادت کے ساتھ کہتے ہیں:

پلا مجھ کو ساقی! شرابِ طہور کہ اعضا شکن ہے خمارِ فجور

کوئی جرعہ دے دیں فزا جام کا کہ آ جائے بس نشہ اسلام کا
برنگ ِ مئے ایماں کو آ جائے جوش نہ اپنا رہے اور نہ دنیا کا ہوش
پئے تشنہ جامی سبو در سبو پیوں شوق سے ملحدوں کا لہو
یہی اب تو کچھ آ گیا ہے خیال کہ گردن کشوں کو کروں پائمال
بہت کوشش جاں نثاری کروں کہ شرع پیمبر کو جاری کروں
دکھا دوں بس انجام الحاد کا نہ چھوڑوں کہیں نام الحاد کا

مولانا الطاف حسین حالؔی کی مثنوی 'مناجات بیوہ' کے تذکرہ کے بغیر مناجات کا تذکرہ نامکمل ہوگا۔اس مناجات کی ادبی قدر و قیمت' اہمیت وافادیت اور سماجی سروکار بے مثال ہے۔مناجاتِ بیوہ سے چند حمد ومناجات کے اشعار:

اے سب سے اول اور آخر! جہاں تہاں سے حاضر اور ناظر!
اے بالا ہر بالا تر سے!! چاند سے، سورج سے، ابر سے!
اے سمجھے بوجھے بن سوجھے! جانے پہچانے بن بوجھے!
سب سے انوکھے سب سے نرالے!! آنکھ سے اوجھل دل کے اجالے!!

انیسویں صدی کے اوائل میں ایک غیر مسلم شاعر جگرؔ بریلوی اپنی مثنوی 'پیامِ ساوتری' کا حمد و مناجات سے یوں آغاز کرتے ہیں:

اے خالقِ مہر و ماہ و اختر بنیاد بشر ہے آرزو پر
ہر چند ہے بے ثبات دنیا مجبور ہوں کچھ کروں تمنا
رہ سکتی نہیں زبان خاموش ہاں کھول دے میرے دیدہ ہوش
اے خالقِ جوہرِ معانی! سرچشمۂ فیضِ خوش بیانی!!
رحمت سے مجھے نہال کر دے دامانِ سخن گہر سے بھر دے

منشی جگن ناتھ خوشترؔ کہتے ہیں:

مناسب ہے بشر کو وقت ِ حاجات کرے درگاہِ باری میں مناجات
وہی حاجت روائے دو جہان ہے کرم فرمائے عالم ، بے گماں ہے
وہی آمرزگار ہر خطا کا ہے وہی روزی دہِ شاہ وگدا ہے

مثنویوں میں حمد ومناجات کے دفتر کے دفتر موجود ہیں۔جیسا کہ عرض کیا گیا' قدیم مثنویوں میں

مناجات کا التزام منجملہ لوازم تصور کیا جاتا تھا۔ پروفیسر مجید بیدار نے اپنے مقالے 'دکن کی مثنویوں میں مناجات' میں تفصیل سے مثنویوں کا ذکر کرتے ہوئے مناجات کے اشعار رج کئے ہیں۔

فی الواقع' دعا و مناجات میں شاعر کے جذبات اور باطنی احساسات صاف محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ مناجات میں عبدیت اور عبودیت کے جذبات کا عروج دیکھا جاسکتا ہے۔ اس میں جذبات کی صداقت ہوتی ہے۔ یہاں حمد و مناجات گوئی کو فن کے ساتھ عبادت بھی تصور کیا جاتا ہے۔ عام طور پر مناجات میں سرگوشی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ خدا سے ہمکلام ہونے کے شرف کا احساس شاعر میں شعوری طور پر موجود ہوتا ہے۔ خدا سے ہمکلامی کا شرف حاصل کرنے کے لیے شاعر مناجات میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کا استعمال کرتا ہے۔

مناجات کے ساتھ حمد کو لازمی تصور کیا گیا ہے۔ عام طور پر حمدیہ کلام میں مناجات کے اشعار شامل ہوتے ہیں۔ حمد و مناجات اور منظوم دعائیں' اردو کی طرح دیگر زبانوں میں بھی پائی جاتی ہیں' لیکن اردو میں حمد و مناجات اور نعت و منقبت پر مشتمل کلام وافر مقدار میں متواتر و متداول پایا جاتا ہے۔

حضرت شاہ کمالؔ، دکنی کے آخری دور کے صوفی شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں حمدیہ شاعری کے ساتھ ساتھ مناجاتیں بھی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان مناجاتوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں اثر آفرینی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان کے یہاں مناجات کے رنگ کا اندازہ لگانے کے لیے ان کی ایک مناجات کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے:

دل کو تیرا خیال دے یا رب روز و شب ماہ و سال دے یارب
رہبری کر مجھے بہ راہِ ہُدیٰ عافیت از ضلال دے یارب
ارتکابِ حرام سے رکھ دُور اِکتسابِ حلال دے یارب
بزم گاہ رجال میں تیرے جا بصف نِعال دے یارب

مناجات کے ساتھ حمد کو ایک لازمہ تصور کیا جاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر مناجات میں حمد ہو لیکن مناجات میں پہلے حمدیہ اشعار کہے جاتے ہیں۔ بندگی کے جذبات، خدا کی حمد و ثنا اور عاجزی و انکساری، بندگی و وارفتگی میں خدا کے حضور شاعر جو کچھ کہنا چاہے کہہ سکتا ہے۔

سراجؔ اورنگ آبادی کی ایک مناجات کے چند شعر:

الٰہی مجھے دردِ بے داغ دے مرے چشم میں کحلِ مازاغ دے
صفِ عاشقانِ میں نہ کر منفعل رواں کر مرے چشم سیں خونِ دل

عطا کر مجھے اشکِ گرم، آہِ سرد غمِ عشق میں مجھ کوں دے رنگ زرد
اگر گناہ گار ہوں رحم کر گنا ہوں پہ میرے نہ کر توں نظر
الٰہی مجھے محرمِ راز کر خزانے حقیقت کے سب بازکر

خواجہ میر دردؔ کہتے ہیں:

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا حقا کہ خدا وند ہے تو لوح و قلم کا
جس مسندِ عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے کیا تاب گزر ہووے تعقل کے قدم کا
ہے خوف اگر جی میں تو ہے تیرے غضب کا اور دل میں بھروسا ہے تو تیرے ہی کرم کا

ایک جگہ فصیح الملک داغؔ دہلوی حمد میں کہتے ہیں:

عدوئے سامری فن دیکھے اعجازِ رقم میرا عصائے موسوی ہے حمدِ خالق میں قلم میرا
برنگ بوئے گل ہے ہر نفس یادِ الٰہی میں قیامت تک بھرے گی دم نسیمِ صبح دم میرا
مجھے آباد کرتا ہے ، مجھے برباد کرتا ہے خدایا دین و دنیا میں ، کرم تیرا ، ستم میرا

حضرت مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی ایک بڑے صوفی اور صاحبِ حال شاعر گزرے ہیں۔ان کا مجموعۂ کلام 'عرفانِ محبت' کے نام سے شائع ہو چکا ہے، نیز 'فیضانِ محبت' کے نام سے بھی ایک کتاب ہے۔ ان کا ایک شعر ہے:

قربان وہ کر دیتا ہے جنت کی بہاریں پاتا ہے جو قسمت سے مناجات کا عالم

مناجات میں بندگی کے جذبات کی تسکین اور عبادت واطاعت کے ذوق کی تشفی ہوتی ہے۔مولانا احمد پرتاپ گڑھی کہتے ہیں کہ مناجات اور انابت کی توفیق ہی اصل کرامت ہے۔

کرم سے اپنے بخشی مجھ کو توفیقِ انابت یہ وہ دولت ہے جو واللہ رشک صد کرامت ہے

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ممتاز فرزند حضرت مولانا محمد ثانی حسنی ندوی کے یہاں مناجات کا رنگ نہایت نرالا اور منفرد ہوتا ہے۔ان کی مناجات میں داخلی کیفیات اور ان کا سوزِ دروں چھلکتا ہے۔ان کی مناجاتیں، ماضی قریب میں نہایت مشہور ہوئیں کہ ان کے کلام کو خوش گلو افراد نے ریکارڈ کروایا اور یہ صوتی ذخیرہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔مسدس کی ہیئت میں ایک مناجات کے چند بند درج ذیل ہیں:

اے خدا مالکِ آسمان و زمیں صاحب لوح و کرسی و لوح و قلم
ذکر تیرا مبارک حیات آفریں جانفزا، دل کشا، دلکش دلنشیں
پاک تیری صفت، پاک تیرا ہے نام تو ہمارا ہے مالک ترے ہم غلام

ہم کو یا رب زبانِ گہر بار دے ہم کو حسنِ یقیں، حسنِ کردار دے
صدق و اخلاص دے، درد و ایثار دے چشمِ بینا دے اور قلبِ بیدارے
کر ہمیں خوبرو، خوش دل وخوش کلام تو ہمارا ہے مالک ترے ہم غلام
ہر نفس آبِ کوثر کا ساغر ملے لذتِ دیدِ روئے منوّر ملے
ہم کو جنت میں قرب پیمبر ملے تیرے دیدار کا لطف اکثر ملے
سلسبیل اورسنیم کے بخش جام تو ہمارا ہے مالک ترے ہم غلام
اے خدا تیرے لطف و کرم پر نثار تیری رحمت پہ ہر ہر قدم پر نثار
عرش و کرسی و لوح و قلم پر نثار تیرے محبوب شاہِ ام پر نثار
اس مناجت کو کر دے مقبول عام تو ہمارا ہے مالک ترے ہم غلام

جانشینِ شبلی، سیرت نگارِنبوی، علامہ سید سلیمان ندوی سے اہلِ علم وادب بخوبی واقف ہیں۔ وہ ایک خوش فکر شاعر بھی تھے لیکن ان کی شخصیت کے دیگر پہلو شاعری پر غالب آ گئے تھے۔ سید سلیمان ندوی کا تخلص، رمزی تھا۔ ان کے کلام میں کئی مناجاتیں موجود ہیں۔ ان کی ایک مناجات کا شعر اور ایک مشہور مناجات، بعنوان: 'مناجاتِ سلیمان بدرگاہِ رحمان' پیش خدمت ہے:

زبان میری بنا دے یا الٰہی! ترجمان دل زبان سے ہو وہی اظہار جو کچھ ہو بیان دل

مناجاتِ سلیمان بدرگاہِ رحمان- (علامہ سید سلیمان ندوی)

صدقِ احساس کی دولت، مرے مولا دے دے غمِ امروز بھلا دے، غمِ فردا دے دے
دھن کچھ ایسی ہو، فراموش ہو اپنی ہستی دلِ دیوانہ و سودائی شیدا دے دے
اپنے میخانے سے اور دست ِکرم سے اپنے دونوں ہاتھوں میں مرے ساغر و مینا دے دے
کھول دے میرے لیے علمِ حقیقت کے در دلِ دانا، دلِ بینا، دلِ شنوا دے دے
قول میں رنگِ عمل، بھر کے بنا دے رنگیں لبِ خاموش بنا کر، دلِ گویا دے دے
دلِ بے تاب ملے، دیدہ پر آب ملے تپِ آتش مجھے دے دے، نمِ دریا دے دے
دردِ دل سینے میں، رہ رہ کے ٹھہر جاتا ہے جو نہ ٹھہرے مجھے وہ درد خدایا دے دے

استاذ الاساتذہ حضرت علامہ شاکر نائطی، جامعہ دارالسلام عمرآباد کے شیخ الادب تھے۔ ان کی ایک مناجات کے چند شعر پیش خدمت ہیں:

سب کچھ ہے یہی یارب! سرمایۂ ایماں دے مجھ بے سروساماں کو، فکرِ سروساماں دے

اترے نہ حوادث کی، ترشی سے نشہ جس کا　　وہ بادہ عرفاں دے، وہ بادۂ عرفاں دے
جو مجھ کو ڈبو جائے، دریائے حقیقت میں،　　کشتی کے لیے ایسا، ہنگامۂ طوفاں دے
ظلمت کدۂ دل میں، اک آگ سی لگ جائے،　　داغوں کی سیاہی کو، اب نورِ چراغاں دے
دنیا کی تمنائیں ہیں وجہ پریشانی،　　شاکرؔ ہے ترا یارب! اپنا اسے ارماں دے

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن زاہد اعظمی عمری کے یہاں داخلیت کی عجیب کیفیات میں حمد و مناجات کا رنگ ملاحظہ فرمائیے کہ:

مرے رب ! تو ربِ قدیر ہے، تری شان، شانِ عظیم ہے　ترا لطف سب پہ ہے بے کراں، ترا فیض، فیضِ عمیم ہے
تو ہی بیکسوں کا ہے آسرا، نہیں تجھ سا کوئی بھی دوسرا　نہ تو کوئی تیرا شریک ہے، نہ ہی کوئی تیرا سہیم ہے
ہوں اسیرِ رنج و غم و بلا، ہے نفس نفس مرا، ابتلا　نہیں تجھ سے درد، نہاں مرا، تو خبیر ہے، تو علیم ہے
کوئی ہم عناں ہے، نہ ہم سفر، کوئی زادِ راہ، نہ راہ بر　مرے حالِ زار پہ کر نظر، تو رؤف ہے، تو رحیم ہے
ترا بندہ، زاہدِ بے نوا، ہے سراپا معصیت و خطا　اسے بخش دے تو مرے خدا، تو رحیم ہے، تو کریم ہے

ڈاکٹر طفیل احمد مدنی کی حمد و مناجات کے چند شعر ملاحظہ کیجیے:

سکونِ قلب و مداوائے رنج و غم کے لیے　　کہوں میں حمدِ خدا بخشش و کرم کے لیے
ادب سے مانگتے رہیے دعا کرم کرم کے لیے　　سلیقہ چاہیے اظہارِ کرب و غم کے لیے
فقط تو ہی تو سزاوار حمد ہے یا رب!　　ہے کون جو نہیں جویا، ترے کرم کے لیے
تری ثناء میں سبھی کچھ تو لکھ گئے ہیں لوگ　　کہاں سے لاؤں، نئی بات میں قلم کے لیے
یہ میرا جو کہ جو ہے جلوہ گاہ حسن ازل　　کہیں جگہ نہیں اس میں کسی صنم کے لیے
کہیں رہوں یہ تمنا ہمیشہ رہتی ہے　　کہ تیرا در ہو میسر جبین خم کے لیے
زمانہ ہو گیا یا رب طواف کعبہ کو　　تڑپ رہا ہے یہ دل پھر ترے حرم کے لیے
یہ خشک موسم بے آب ہے بہت ہی سخت　　گداز قلب کی دولت دے چشم نم کے لیے
الٰہی قبضہ قدرت میں کیا نہیں تیرے　　ملے دوا کوئی مجھ کو مرے الم کے لیے
بلا حساب دے یا رب طفیلؔ عاصی کو　　حساب شرط نہیں ہے، ترے کرم کے لیے

سیدہ خیر النساء بہترؔ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی والدہ ماجدہ تھیں۔ طبیعت کی موزونی نے ان کی دعاؤں کو منظوم شکل میں ڈھال دیا۔ دعائیں، مناجات کے قالب میں منتقل ہو گئیں۔ ان کے کلام میں مناجات ہی کا رنگ غالب ہے۔ انہوں نے اپنی تمام آرزوؤں، امنگوں، امیدوں اور تمناؤں کو

رب العزت کی بارگاہ میں دعاؤں کی شکل میں منظوم قالب میں مناجات کے پیرایہ میں ڈھال دیا تھا۔ان کا مجموعۂ کلام 'کلیدِ بابِ رحمت' کے نام سے بہت مشہور ہے۔ان کا مجموعۂ کلام پہلے بابِ کرم کے نام سے شائع ہوا۔پھر اس کا انتخاب 'کلیدِ بابِ کرم' کے نام سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے پیش لفظ کے ساتھ مکتبۂ اسلام،لکھنؤ سے شائع ہوا۔

ان مناجاتوں کا انتخاب مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے کیا ہے۔اپنے پیش لفظ میں انہوں نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دعاء اور مناجات کا ایسا ذوق بخشا کہ ان کے دل کو دعاء کے بغیر سکون نہیں ملتا تھا۔ان کو اللہ تعالیٰ نے رجوع وانابت الی اللہ کی دولت سے نوازا تھا۔ان کو وہبی وفطری طور پر وہ بے چینی اور خلش عطا فرمائی جو دعا کے لیے محرک بنتی تھی، پھر جب تک وہ دل کھول کر دعا نہ کرلیتیں ان کے بے چین دل کو تسکین نہ ہوتی۔ان کو ہر دعا پر اعتماد اور اللہ تعالیٰ کی رحمت پر ناز بھی بہت تھا۔دعاء میں اللہ تعالیٰ ان سے وہ مضامین ادا کرواتا جو اہلِ یقین اور اہلِ قلوب کا خاصہ ہیں۔ان کی طبیعت شروع سے بہت موزوں تھی۔اس لیے وہ مسنون دعاؤں کے علاوہ اپنی دعاؤں کو منظوم پیرایہ میں مناجات کی شکل میں ہوتیں۔ان مناجاتوں میں وہ اپنا مدعا پیش کرتیں اور اپنے مالک کے سامنے فریاد کرتیں۔یہ مناجاتیں درد و اثر سے لبریز ہوتیں۔علاوہ ازیں ان کے کلام میں مناجاتوں کے علاوہ ملتزم پر کہی گئی مناجاتوں کی بھی ایک معتدبہ تعداد موجود ہے۔

مولانا سید عبدالحئ حسنی' صاحبِ گلِ رعنا ونزہۃ الخواطر کی دختر سیدہ امۃ اللہ تسنیم تھیں۔مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی ہمشیرہ تھیں۔نیک اور صالح خاتون تھیں۔انہیں شعر گوئی اور مناجات کا ذوق اپنی والدہ ماجدہ سے ملا تھا۔ان کی والدہ سیدہ خیر النساء بہتر ہی کی طرح ان کی مناجاتیں نہایت سوز وگداز، سادگی اور تاثیر سے بھری ہوئی ہیں۔

انہوں نے اپنی بندگی کے جذبات کو منظوم دعاؤں اور مناجاتوں کی شکل میں منتقل کر دیا۔ان مناجاتوں کو مقبولیت حاصل ہوئی۔بہت سی خواتین کو ان دعاؤں اور مناجاتوں میں اپنے دل کی صدا اور اپنی دعاؤں کا عکس ملتا ہے۔بہت سی خواتین' اہتمام کے ساتھ ان مناجاتوں کو پڑھتی ہیں۔

امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کو لکھنے پڑھنے اور تصنیف وتالیف کا ذوق اپنے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحئ حسنی مصنف گل رعنا سے ورثہ میں ملا تھا۔ان کے یہاں' حمد ومناجات پر مشتمل کلام کی ایک وافر مقدار موجود ہے جو معیار اور داخلیت نیز اظہار کی برجستگی اور خوش سلیقگی میں اپنی مثال آپ ہے۔

تری ذات' اعلیٰ صفات ہے،ترا نام' آبِ حیات ہے تری یاد' وجہِ نجات ہے،تری شان' جلّ جلالہٗ

ترا فضل، فضلِ عظیم ہے، ترا لطف، عمیم ہے ۔۔۔ تری ذات، ذاتِ کریم ہے، تری شان، جلّ جلالہٗ
تجھے واسطہ اپنی ہی ذات کا، مجھے کر دے ایسے صفات کا ۔۔۔ جو سبب ہوں میری نجات کا، تری شان، جلّ جلالہٗ

ان کی مناجاتوں کے چند متفرق اشعار درج ذیل ہیں:

دین و دنیا کی بھلائی دے مجھے ۔۔۔ اور بچا ہر اک برائی سے مجھے
اے خدا! تسنیم کو کر سرخرو ۔۔۔ دین و دنیا میں رہے با آبرو

ایک مناجات میں کہتی ہیں:

بیٹھی ہوں در پہ آج میں پروردگار کے ۔۔۔ نکلیں تمام حوصلے، امیدوار کے

مناجات میں فریاد اور دردِ دل سنانے کا یہ انداز ہوتا ہے:

اے مرے رب! دلِ مضطر کی دعائیں سن لے حال، زارِ دلِ بیکل، جو سنائیں، سن لے

ایک مناجات کے یہ تین شعر ملاحظہ کیجیے:

فقیروں کی صورت صدا کر رہے ہیں ترے در پہ بیٹھے، دعا کر رہے ہیں
تو اب اپنا وعدہ، وفا کر الٰہی کہ ہم اپنا وعدہ، وفا کر رہے ہیں
بہت منتوں سے بڑی عاجزی سے ترے رحم کی، التجا کر رہے ہیں

ایک مناجات میں کہتے ہیں:

کب سے کھڑی ہوں یارب! امید کے سہارے یہ دن نہ جانے میں نے کس طرح سے گزارے
بے چین و مضطرب دل، جا کر کسے پکارے وہ کون ہے جو حالت، بگڑی ہوئی سنوارے

ایک مناجات:

ہے باب یہ کرم کا، خالی نہ پھیر یا رب ۔۔۔ لائی ہوں آج شکوۂ بیداد
سن لے فریاد رس! مری فریاد ۔۔۔ یارب دررحمت پر دیتی ہوں صدا کب سے
سائل ہوں ترے در کی ۔۔۔ کرتی ہوں دعا کب سے

اردو میں حمد و مناجات پر مشتمل ایک وقیع ذخیرہ موجود ہے۔ حمد و مناجات پر مشتمل کلام، ہر مذہب وملت سے تعلق رکھنے والے شعراء کے یہاں ملتا ہے۔ صرف مسلم شعراء ہی نہیں بلکہ دیگر مذاہب کے پیروکار شعراء کے یہاں بھی، جب وہ مناجات کہتے ہیں، تو فطری بیساختگی، تصنع سے پاک اسلوب اور جذبات و کیفیات کے عمدہ اظہار پر مشتمل داخلیت کا آئینہ دار کلام ملتا ہے۔ اگر اردو میں مناجات پر مشتمل شعری مجموعوں کو یکجا کیا جائے تو ان کی تعداد سینکڑوں میں ہوگی۔ ایسے شعراء جو صرف مناجات اور مذہبی و

صوفی کلام کہتے ہیں، ان کے علاوہ بھی تقریباً ہر شاعر کے یہاں مناجات پر مشتمل اشعار مل جاتے ہیں۔ ہر شاعر جو مناجات کہتا ہے، گویا خدا سے ہمکلام ہوتا ہے اور اسے بندگی کی معراج سمجھتا ہے۔

'اردو شاعری میں حمد و مناجات'، اس موضوع پر ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کا مقالہ موجود ہے۔ 'اردو شاعری میں حمد و مناجات پر چند معروضات' کے نام سے ڈاکٹر محمد حسین مشاہد رضوی کی ایک کتاب ہے جس میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی اور دیگر شعراء کی مناجاتوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے کہ ان مناجاتوں کی ادبی قدر و قیمت کے باعث ان کی جانب التفات ضروری ہے۔

'اردو میں حمد کا ارتقاء' کے نام سے طاہر حسین احمد طاہر سلطانی کا ایک مقالہ موجود ہے۔ ایک اور مقالہ 'اردو شاعری میں حمد و مناجات کی روایت' پر ایک مقالہ ڈاکٹر سعدیہ حسن نے لکھا ہے۔

عالمی رابطہ ادب اسلامی' ندوۃ العلماء لکھنؤ کی جانب سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی سرپرستی میں ایک سیمینار منعقد کیا گیا تھا، ان تمام مقالات کو سہ ماہی کاروانِ ادب، لکھنؤ کے پہلے شمارے میں شائع کیا جا چکا ہے۔ 'اردو میں حمد و مناجات' کے نام سے سہ ماہی قرطاس' ناگپور کی جانب سے اردو میں حمد مناجات حصہ اول و حصہ دوم' بزم اردو لائبریری ڈاٹ نیٹ پر دستاب ہیں۔



مذہبی ادب کے فروغ میں ممتاز فرزندان جامعہ دارالسلام عمرآباد کا کردار

ظہیر دانش عمری
پی ایچ ڈی اسکالر، مانو، حیدرآباد

جامعہ دارالسلام عمرآباد جنوب ہند سے تعلق رکھنے والا ایسا ادارہ ہے جس سے تمام مسلمان بلاتفریق مذہب وملت مستفید ہوتے ہیں۔اس کی بنیاد خلوص پر رکھی گئی ہے۔اگر یہ خلوص نہ ہوتا تو اس ادارہ کی عمر تقریباً ایک صدی ہرگز نہ ہوتی۔یہاں کے فارغین دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں اور مختلف شعبۂ ہائے حیات میں اپنے کارنامے پیش کررہے ہیں۔جامعہ دارالسلام عمرآباد میں نظم ونسق، وقت کی پابندی اور شریعت کی پاسداری کی ایسی تعلیم دی جاتی ہے کہ جسے کوئی بھی فراموش نہیں کرسکتا۔فرزندان جامعہ ہر میدان میں اپنے کارناموں سے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں اور چھوڑ رہے ہیں۔تحریری میدان ہو کہ تقریری میدان ان کی خدمات سے کوئی بھی شعبہ خالی نہیں ہے۔

اردو زبان کا بہت بڑا ذخیرہ مذہبیات پر مشتمل ہے۔مذہبی ادب کو اردو سے خارج نہیں کیا جاسکتا کیونکہ مذہب زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔اگر مذہبی ادب کو اردو ادب سے خارج کردیا جائے تو ادب کا بہت بڑا نقصان اور خسارہ ہوگا۔صوفیائے کرام اور علمائے کرام نے دینی احکامات، اصلاح معاشرہ، تفاسیر قرآن، تراجم حدیث وشروحات کی تصنیف میں اپنے وقت کا بہت بڑا حصہ صرف کیا اور ہر شخصیت نے اپنے اپنے لحاظ سے اس میں کچھ نہ کچھ ندرت پیش کرنے کی کوشش کی۔

فارغین جامعہ دارالسلام میں وہ ممتاز شخصیات جنہوں نے اپنی قیمتی مذہبی کتابوں سے علمی دنیا کو منور کیا ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

مولانا یوسف کوکن عمری، مولانا ابوالبیان حماد عمری، مولانا جلال الدین انصر عمری، مولانا حفیظ الرحمٰن اعظمی عمری، مولانا ثناء اللہ عمری، حبیب الرحمٰن اعظمی عمری، مولانا ابراہیم ہنچالی، شیخ کلیم اللہ عمری اور مولانا منیر الدین عمری۔

مولانا یوسف کوکن عمری جامعہ کے فارغین میں سے ایسے عبقری تھے جو نئی زبانیں سیکھنے کے بڑے شوقین تھے۔عبقری کے لفظ کا اطلاق فارغین جامعہ میں سے کسی شخصیت پر ہوتا ہے تو وہ مولانا یوسف کوکن عمری رحمہ اللہ ہیں۔سید سلیمان ندوی کی زیر نگرانی دارالمصنفین میں آپ نے تحریری تربیت حاصل کی اور

امام ابن تیمیہ پر ایسی شاندار اور ضخیم کتاب لکھی کہ اس سے بہتر کتاب امام صاحب پر آج تک نہیں لکھی گئی ہے۔خانوادۂ قاضی بدرالدولہ میں انہوں نے بہت محنت کی اور بہت سے نادر مخطوطات کا تعارف، گمشدہ شخصیات کا تعارف کروایا کہ جن کے نام سے علمی دنیا ناواقف تھی۔ یہ کتاب خود آج کل نایاب ہے۔جس کی طبع ثانی کی اشد ضرورت ہے۔

جامعہ دارالسلام سے فراغت کے بعد کوکن صاحب جب دارالمصنفین تشریف لے گئے تو سید صاحب نے ان کا امتحان لیا جس کا تذکرہ حافظ کوکن نے یوں کیا ہے:

''پہلے پہل سید صاحب نے کوکن صاحب کی علمی قابلیت کا امتحان لیا۔انہوں نے کئی ایک سوالات کئے کوکن صاحب ہر ایک سوال کا تشفی بخش جواب دیتے گئے پھر انہوں نے سوال کیا کہ کیا آپ نے معلقات سبع پڑھی ہے؟ اور اس کے چند اشعار پڑھ کر سنانے کو کہا ۔کوکن صاحب نے طرفہ اور امرء القیس کے اشعار سنائے، پھر حکمت وفلسفہ کے متعلق بھی سوالات کئے گئے لیکن کوکن صاحب نے صاف کہہ دیا کہ ان کو اس قدیم حکمت وفسلفہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے سید صاحب نے بتایا کہ یہ چھٹی صدی ہجری کی بھول بھلیاں ضرور ہیں مگر ان کا مطالعہ کر لینا بھی ضروری ہے۔تاکہ آگے چل کر کچھ کام آسکے۔اس کے بعد کوکن صاحب کو معارف کی فائل مطالعے کے لئے دی گئی ،کوکن صاحب کی محنت کو دیکھ کر سید صاحب بہت مسرور ہوئے''

(یادگار یوسف کوکن، از: افضل العلماء حافظ کوکن، ص: ۳۵۔۳۶)

کوکن صاحب کی دیگر تصانیف میں قابل ذکر کتابیں مولانا باقر آگاہ، قربی، بحرالعلوم وغیرہ ہیں جن کی بنیاد پر بعد کے محققین نے قلم اٹھایا مگر ان کی تحقیق میں کچھ اضافہ نہ کر سکے۔

مولانا حکیم عبدالوہاب ظہوری عمری جامعہ کے نہایت لائق وفرزند رہے ہیں جنہوں نے طب کے میدان میں داد تحقیق دی ہے۔جامعہ سے فراغت کے بعد نظامیہ طبی کالج حیدرآباد سے طبیب ماہر کی ڈگری لی وہیں مددگار پروفیسر بعدہ پروفیسر پھر پرنسپل کی حیثیت سے کام کیا۔اس فرزند جامعہ کو جو شہرت ملنی تھی نہ ملی۔ان کی تصنیفات کے صرف نام گنوا دیتا ہوں:

تدوین دستور اسلامی، اسلامی تصوف، اسلام اور موجودہ اقتصادی مشکلات، انسان کہاں ہے ،اسلامی طرز حکومت، عالمگیر اسلامی فیصلے، اسلام میں روحانی زندگی کا تصور اور جمہوری دنیا میری نظر میں۔

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی عمری مدنی جامعہ کا ایسے فرزند جلیل ہیں جنہوں نے کفر وشرک کی تاریکیوں

میں آنکھیں کھولیں ،لیکن قسمت ان سے بہت بڑا کام لینا چاہتی تھی جس کی وجہ سے اللہ تعالی نے انہیں نور ہدایت سے سرفراز فرمایا۔انہوں نے جامعہ دارالسلام میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد الجامعۃ الاسلامیہ، مدینہ منورہ کا رخ کیا ،وہاں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہاں کے شعبہ کلیۃ الحدیث کے صدر بنے اور حدیث کے باب میں ایسا کارنامہ انہوں نے سرانجام دیا کہ بہت سے پیدائشی مسلمانوں کو اس نوعیت کا کام کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔جس طرح قرآن کریم ایک کتاب کی شکل میں ہے اسی طرح تمام صحیح احادیث ایک کتاب میں ہونی چاہئیں اس کے لئے انہوں نے اپنی زندگی کے بیس سال سے زائد اس کام کے لئے لگائے اور تقریباً ۱۲ جلدوں میں تمام صحیح احادیث کو جمع کر دیا جس کا اردو ترجمہ بہت جلد جامعہ دارالسلام سے شائع ہونے والا ہے۔حدیث کے ساتھ ساتھ انہوں نے قرآن کریم پر بھی بے مثال تصنیف کئی برسوں کی محنت کے بعد قرآن انسائکلو پیڈیا کے نام سے لکھی ہے جس میں قرآن کریم کے چھ سو موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے بارے میں خود مولف یوں ارشاد فرماتے ہیں:

> ''میری یہ کتاب شاید اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو کسی مسلمان کے قلم سے قرآنی آیات، صحیح احادیث، صحابہ وتابعین اور دیگر ائمۂ دین ومجتہدین کے اقوال کی روشنی میں کسی بے جا تاویل یا تحریف کے بغیر دین کی اصل وصحیح تعلیمات کو پیش کرنے کی غرض سے تیار کی گئی ہے''۔(راہ حق کا مسافر ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی عمری، مرتب محمد رفیع کلوری عمری، ناشر: ادارہ تحقیقات اسلامی، جامعہ دارالسلام عمر آباد، ص:۲۱۲)

اس کے علاوہ آپ کو حرمِ نبوی میں آپ کو حدیث کی تین کتابوں کا درس دینے کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔

مولانا محمد عمران اعظمی انصاری عمری مرحوم فن ترجمہ کے مثل شہسوار رہے ہیں۔انگریزی، اردو، عربی اور فارسی کے ایسے ماہر کہ ان زبانوں میں نہ صرف نثر بلکہ شاعری بھی کرتے رہے ہیں۔حیدرآباد کے دائرۃ المعارف کے شعبہ تصحیح میں نے انہوں نے مدت مدید کام کیا اور تین درجن سے زائد عربی کتابیں ترتیب وتصحیح کے بعد شائع فرمائیں۔ان کی ایڈٹ کردہ کتابوں میں 'نظم الدرر' بہت اہمیت کی حامل ہے جو ۲۲ جلدوں پر مشتمل ہے۔شاعری میں طبیعت ایسی رواں پائی تھی کہ کسی صاحب کی ہجو میں عربی زبان میں ایک ہزار شعر لکھ دئے بعد میں انہیں احساس ہوا کہ میں خواہ مخواہ کی محنت کی ہے، اگر یہی محنت کسی تعمیری کام

میں کرتا تو میرا فائدہ ہوتا یہ سوچ کر انہوں نے ''الفیہ فی مدح النبی''لکھی۔یعنی نبی کریم کی شان اقدس کو ایک ہزار اشعار میں بیان کیا۔اس میں بیس اشعار ایسے ہیں جن میں نقطے والے حروف استعمال نہیں کئے گئے ہیں۔

''یہ کتاب نہ پڑھیں'' ان کی مزاحیہ نظم ونثر پر مشتمل کتاب ہے۔جامعہ دارالسلام میں طالب علمی کے دور میں انہوں نے بہت سے خط میرے نام لکھے جن میں مزاحیہ انداز بیان ہر سطر سے ٹپکتا ہے۔

جناب علیم خان فلکی نے عمران اعظمی کی شخصیت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''عمر آباد سے فارغ اس مولوی، عالم فاضل کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ بنیادی طور پر پہلے ادیب ہیں یا شاعر،فلسفی ہیں کہ مورخ،مزاح نگار ہیں کہ مترجم۔یہ کہنا اور بھی مشکل اس وقت ہوجاتا ہے جب آپ غلطی سے ان سے ملنے ان کے گھر چلے جائیں۔تنگ وتاریک کمرے میں جہاں بہادر شاہ ظفر کو قید تنہائی میں آخری ایام میں رکھا گیا تھا آپ کو ایک کرسی پر بٹھا کر اپنی تخلیقات کا ڈھیر آپ کے سامنے لگاتے جائیں گے۔ اور آپ کے ورق الٹنے تک پلنگ کے نیچے سے صندوق گھسیٹ کر اس میں سے بے شمار مطبوعہ مضامین اور غیر مطبوعہ کلام آپ کے گود میں رکھدیں گے،اس کی پرواہ کئے بغیر کہ قدرت نے آپ کو پچاس نہیں صرف دو ہی آنکھیں دی ہیں۔وہ اپنی تخلیقات سے آپ پر مسلسل حملہ آورہ ہوتے رہیں گے''(ماہنامہ شگوفہ،مدیر:مصطفیٰ کمال،نومبر ۲۰۱۱ء ص:۲۷،مضمون:عمران اعظمی ۔۔شورکرتا ،بڑبڑاتا،آگ برساتا فقیراز:علیم خان فلکی)

مولانا حبیب الرحمٰن زاہد اعظمی عمری نے اپنی حیات کا زیادہ تر وقت جامعہ دارالسلام کے لئے وقف کردیا تھا۔آپ ماہنامہ راہ اعتدال کے ابتداء سے اپنی وفات تک مدیر رہے ہیں۔بطور مدیر انہوں نے جو اداریے لکھے ہیں،ان میں امت کے لئے تمام حالات میں رہنمائی کا سامان موجود ہے۔کبھی آپ نے درس قرآن لکھا تو کبھی درس حدیث۔نثر ونظم میں آپ ماہر تھے۔غزل ایسی ڈوب کر کہتے کہ اس میں غم کا سمندر ٹھاٹیں مارتا ہوا محسوس ہوتا۔تحریر وتقریر میں طلباء جامعہ کی مسلسل رہنمائی کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔اس مرد مجاہد نے جامعہ دارالسلام کے طلباء کو سجانے اور سنوارنے میں جتنی محنت کی ہے،اس پر اسے سلام کرنے کو جی چاہتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے جو دینی مقالات ومضامین تحریر کئے ہیں ان میں جو گہرائی وگیرائی ہے۔وہ کثیر المطالعہ اشخاص کو ہی میسر آتی ہے۔

ایک زمانے تک روزنامہ سالار میں ہفتہ وار مضامین کا سلسلہ آپ نے شروع کیا تھا جو مہینے کی مناسبت سے ہوا کرتا تھا اوران کا انتظار مساجد کے خطباء کو شدت سے رہتا تھا۔ ماہنامہ راہ اعتدال کے نہایت معیاری خصوصی نمبرات اس بات کی گواہی دیں گے کہ دین کے ساتھ ساتھ ادب اور زبان و بیان کی باریکیوں پر آپ کتنی گہری نظر رکھا کرتے تھے۔

''وادی اخضر کا پھول'' کے نام سے ایک عربی ناول مولود علی الفطرہ (شیخ حسین حسون) کا اردو ترجمہ آپ نے کیا تھا جو پہلے پہل ماہنامہ ذکری میں قسط وار شائع ہوا۔ بعدازاں یہی کتاب جناب خواجہ معین الدین سردار ساحل نے قومی کونسل کے تعاون سے شائع فرمائی۔ اس میں کہانی غیر محسوس انداز میں آگے بڑھتی ہے اور قاری کو فطری انداز میں توحید کے اسباق سکھاتی ہے۔

''چمن جامعہ کے باغباں'' کے نام سے ایک مختصر تصنیف بھی آپ نے لکھی ہے جس میں جامعہ کے اساطین کا دلنشین تذکرہ ملتا ہے۔

مولانا کی وضع داری، سلیقہ مندی، خوش اخلاقی اوران کے مزاج کے بارے میں جاننا ہے تو آپ کی شخصیت پر مرتب کی گئی کتاب ''شمع وفا مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی عمری'' ضرور پڑھیں۔ اس کتاب سے ایک اقتباس دے کر آگے بڑھوں گا جس میں قلماروں کے لئے مولانا نے ایک نصیحت فرمائی ہے جو ہم سب کے لئے مشعل راہ ہے، فرماتے ہیں:

> ''قلم کاروں کو قرآن مجید اور احادیث کا کچھ حصہ ترجمے کے ساتھ روزانہ پڑھنے کو اپنے اوپر فرض کر لینا چاہئے، مضمون نگاری میں بنیادی چیز تخیل ہے، فکر و خیال اگر پختہ ہو، اور آدمی حالات حاضرہ پر منطبق کرنا سیکھ لے تو پھر افکار وخیالات خود بخود الفاظ میں ڈھل جاتے ہیں، قرآن وحدیث سے بڑھ کر صاف شفاف اور اعلیٰ فکر کہاں مل سکتی ہے۔ بد قسمتی سے علماء کرام سوائے قرآن وحدیث کے سب طرح کی چیزیں پڑھ لیتے ہیں'' (شمع وفا مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی عمریؒ، مرتب: محمد رفیع کلوری عمری، مضمون: خضر راہ کی وفات، مضمون نگار: محمد رفیع کلوری عمری، ص: ۱۲۰)

مولانا رفیع کلوری عمری نے مولانا کی شخصیت پر جو مضمون لکھا ہے بہت ہی وقیع عمدہ اور قابل مطالعہ ہے آپ کی شخصیت کو آپ نے بہت قریب سے دیکھا ہے اس لئے ان کی باتوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا حکیم محمد یعقوب اسلم عمریؒ شاعری، خاکہ نگاری، افسانہ، تنقید نگاری اور دینی، علمی وفکری لکھ کر اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا ہے۔ بنیادی طور پر انہوں نے بہت سی درسی کتابیں تیار کیں اور اردو کے طالب

علموں کے لئے بڑی سہولت فراہم کی ۔اردو گرامر،اردو گائیڈ،اردو خطوط اور مضامین، پہاڑی فارمولے اور ضروری معلومات۔''مٹی کی خوشبو'' کے نام سے سوانحی خاکوں کا مجموعہ بھی قابل ذکر ہے۔آپ کی مذہبی کتابوں میں ''رسول عربی''بہت عمدہ نعتیہ شعری مجموعہ ہے۔جس کے بارے میں علامہ حفیظ الرحمٰن اعظمی عمری مدنی تحریر فرماتے ہیں:

> ''آپ کی تصانیف میں نعتوں کا ایک مجموعہ ہے۔کہنے کو تو یہ مختصر سی چیز ہے۔لیکن اس کا مقصد اور محرک عظیم تر ہے۔نوجوان ذہنوں کو اس کے ذریعے بڑے حکیمانہ طریقے سے اسلام کی تعلیمات اور پیغمبر اسلام کی محبت سے قریب تر کرنا ہے''(نقوش جامعہ،ص:۳۵۸۔۳۵۹)

مولانا عزیز الحق عمری کا طالب علمی کے زمانے میں زیادہ تر وقت لائبریری میں صرف ہوتا تھا تصنیف وتالیف کے میدان سے آپ کو بڑا شغف رہا ہے۔اردو،عربی،فارسی اور ہندی کے ماہرانہ دسترس آپ کو حاصل تھی۔قرآن کریم کا ہندی ترجمہ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔آپ کی دیگر مذہبی کتابوں میں قابل ذکر کتابیں یہ ہیں:علمی تقریریں،سود اور اسلام،ترجمہ ادب الخلاف،ترجمہ تلبیس مردود،ترجمہ کتاب الجنائز البانی،ترجمہ طریقۃ المتقین،ترجمہ صلوۃ التراویح البانی اس کے علاوہ آپ نے درسی کتابوں کے بھی ترجمے کئے جن میں سے چند کے نام یوں ہیں:دور الفرائد نوٹ شرح العقائد،اصحاب المعلقات، مجال الادب۔

مولانا ایک عرصے تک مجلّہ نوائے اسلام دہلی میں نوائے قرآن کے نام سے درس قرآن لکھا کرتے تھے۔

مولانا اسلم شاد عمریؒ وہ سپوتِ جامعہ ہیں،جنہوں نے سب سے پہلے جامعہ کی ادبی خدمات پر سری وینکٹیشورا یونیورسٹی تروپتی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔آپ کی اسی کتاب کو نقوش جامعہ کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔جامعہ دارالسلام میں اپنی وفات تک تدریسی خدمات انجام دی ہیں۔تدریس کے فن میں بڑے ماہر تھے۔چٹکیوں میں درس گاہ کو زعفران زار بنا دیتے تھے۔نقوش سیرت اور نقوش صحابہ میں انہوں نے بہت ہی منفرد چیزیں جمع کی ہیں۔

استاذ الاساتذہ مولانا ابوالبیان حماد عمری کا نام جامعہ دارالسلام عمرآباد میں کئی نسلوں کی تربیت کی ہے۔سب سے پہلے آپ نے ابن حجر عسقلانی کی کتاب ''المنبہات'' کا اردو ترجمہ کیا۔اس کے بعد آپ کی شاعری کے بہت سے مجموعے شائع ہوئے جیسے نغمات حمد ونعت،بانگ حرا۔ایک سفرنامہ سفرنامہ حجاز و ایران کے نام سے بھی لکھا جس میں آپ نے اپنے مشاہدات کو قلمبند کیا ہے۔آپ کی نعت گوئی کے

حوالے سے بات کرتے ہوئے تابش مہدی لکھتے ہیں:

''میں مولانا ابوالبیان حماد کو کم و بیش چالیس برس سے پڑھ رہا ہوں۔ میں نے اخبارات و رسائل کے ذریعے بھی ان سے استفادہ کیا ہے اور شعری و مذہبی محفلوں اور نجی ملاقاتوں میں انھیں سننے سنانے کے مواقع میسر رہے ہیں۔ ان کی حمدیہ و نعتیہ شاعری بھی نگاہ سے گزرتی رہی ہے اور غزلیہ و نظمیہ شاعری بھی۔ میں نے اُنھیں جب بھی پڑھا یا سنا ہے یا جو کچھ بھی پڑھا یا سنا ہے یہ بات شدّت کے ساتھ محسوس کی ہے کہ ان کے کلام میں آتش خانوں کی آنچ بھی ہے اور شعری روایت کے صنم کدوں کا نور بھی۔ ان کی شاعری میں قدیم کلاسیکی رچاؤ بھی ہے اور جدید شعری رجحانات کی چمک بھی، اور شعری و فنّی قدروں کا احترام بھی۔ لیکن ان سب کے ساتھ ساتھ ہم کسی بھی موڑ پر ان کی شاعری کو اپنے عہد کے نشیب و فراز اور سرد و گرم حالات سے یکسر عاری نہیں کہہ سکتے۔ گرد و پیش میں رونما ہونے والے واقعات، معاصر المیے، زمانے کے اِحساسات بل کہ انسانی زندگی کے وہ تمام مسائل جو اُن تک پہنچے ہیں ان کی شاعری میں کسی نہ کسی پہلو سے موجود ملتے ہیں۔ ان کا یہ رویّہ ان کی غزلوں میں بھی نظر آتا ہے اور نظموں میں بھی۔'' (زندگی نو، دہلی)

مولانا جلال الدین انصر عمری جماعت اسلامی کے امیر رہ چکے ہیں۔ آپ نے اسلامی معاشرت پر بڑی ہی دلنواز کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ بالخصوص انہوں نے موجودہ دنیا کو درپیش مسائل کا حل اسلام میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی قابل ذکر تصانیف یوں ہیں: اسلام کا عائلی نظام، اسلام کی دعوت، انسان اور اس کے مسائل، عورت اسلامی معاشرے میں، خدا اور رسول کا تصور اسلامی تعلیمات میں، مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ، اسلام میں خدمت خلق کا تصور، غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق، اسلام میں عورت کے حقوق، اسلام انسانی حقوق کا پاسبان۔ تجلیات قرآن، اوراق سیرت، قرآن کا نظام خاندان، مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں، خاندان کی اصلاح اور اولاد کی تربیت، بچے اور اسلام، غیر اسلامی ریاست اور مسلمان، کمزور اور مظلوم اسلام کے سائے میں، دولت میں خدا اور بندوں کا حق، انفاق فی سبیل اللہ، صحت و مرض و اسلامی تعلیمات، اسلام اور مشکلات حیات، ہندوستان میں اسلام کی دعوت۔

الغرض مولانا نے اسلام کے متعلق مختلف موضوعات پر کھل کر نہایت مدلل انداز میں سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اپنی بات دلائل و براہین کی روشنی میں پیش کی ہے۔

علامہ حفیظ الرحمٰن اعظمی عمری تحریر وتقریر میں یکساں قدرت رکھتے ہیں۔متعدد عربی کتابوں کا اوئل عمری میں ہی انہوں نے عربی سے اردو میں تراجم کئے ۔آپ مدینہ یونیورسٹی کے پہلی بیچ کے فارغ ہیں۔دعوت اور مدینہ بجنور میں بھی کام کر چکے ہیں۔'ارض حرم میں پہلا قدم' حرمین میں گزرے ہوئے دنوں کی یاد تازہ کرتی ہے ۔جس میں جذبہ بھی ہے اور خلوص بھی۔اس کتاب میں آپ کی انشاء پردازی پورے عروج پر نظر آتی ہے۔اس مہارت سے اپنی یادوں کو پیش کرتے ہیں کہ قاری یوں محسوس کرتا ہے کہ گویا وہ بھی ان کا ہم سفر ہے ان کی انگلی پکڑ کر ان کی یادوں کے سفر میں ان کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہے۔

'صدائے دل' آپ کے مذہبی خطبات کا مجموعہ ہے جبکہ 'متاع قرآن' دروس قرآن کریم کا مجموعہ۔قرآن کریم سے بڑا گہرا تعلق ہے۔مدراس میں عموماً تراویح کے بعد درس قرآن دیتے ہیں۔ہر بار کچھ نہ کچھ نئے نکتے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔میرے اساتذہ میں اپنے اساتذہ کرام کو جس والہانہ انداز میں یاد فرمایا ہے یہ ان کا خاصہ ہے۔

'صدائے دل' سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جس میں آپ فارغین جامعہ کو خطاب کرتے ہیں:

''عزیز طلباء!وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا وہ ہوا کے دوش پر اڑتا چلا جاتا ہے۔جو بدنصیب وقت کی قدر نہیں کرتے وقت انہیں نظر انداز کر کے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔حدیث شریف میں رسول نے فرمایا''پانچ نعمتوں کو ان کے زوال سے پہلے محبوب جان کر بھرپور فائدہ اٹھالو''(حاکم ،صحیح)اس حدیث کی روشنی میں عرض کروں گا کہ آپ جب تک یہاں ہیں یہ لائبریری آپ کے سروں پر سایہ فگن ہے۔اس کے دروازے آپ کے لئے ماں کی آغوش کی طرح کھلے ہوئے ہیں۔کل آپ سند فراغت لے کر اپنے گھروں کو واپس ہو جائیں گے پتہ نہیں وہاں کیا ماحول ہوگا۔کتابیں ہوں گی کہ نہیں۔مطالعے کے لئے آپ ترس جائیں گے۔اس لئے یہاں جی بھر کر سیراب ہونے کی کوشش کریں۔کتابوں کی ہر اچھی بات ذہن و دماغ پر نقش کرلیں ،اپنی ڈائریوں میں محفوظ کرلیں،آئندہ آپ کی تحریر وتقریر میں یہی حوالے جان بھریں گے۔مطالعے کا جو چسکہ آپ یہاں سے لے کر جائیں گے وہ آپ کو کہیں بھی نچلا نہیں بیٹھنے دے گا،کتابوں کے حصول پر آپ کو اکسائے گا اور کنویں سے پانی نکال کر ویرانے میں پھول کھلانے کے قابل بن جائیں گے۔کتاب کے بغیر متعلم اور معلم کی زندگی اس سپاہی کے مانند ہوگی جو نہتہ بے سرو سامان محاذ میں خودکشی کی طرف آگے بڑھ رہا ہو''(۸۔صدائے دل،ص:۶۹)

مولانا ثناء اللہ عمری ایم اے عثمانیہ کافی محنتی اور ذہین تھے بچپن سے لکھنے لکھانے کا شوق تھا۔جب آپ درجہ سوم کے طالب علم تھے تب ماہنامہ 'غنچہ' بجنور، میں 'القراۃ الرشیدۃ' کے درس ''التھاون'' کا ترجمہ شائع

ہوا۔اس کی ہمت افزائی کے طور شیخ الحدیث مولانا حافظ عبدالواجد رحمانی عمری نے چائے پلائی۔آپ کا امتیاز یہ ہے کہ آپ نے مولانا آزاد کی دو کتابوں کا اردو سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔قرآن کریم سے آپ کو خاص لگاؤ رہا ہے۔جس کی وجہ سے انہوں نے 'امثال القرآن'، 'قرآن اور دعا' نامی کتابیں تالیف فرمائیں۔خطبات کا مجموعہ صدائے منبر' کے نام سے دو جلدوں میں مرتب کیا۔

آپ نے کچھ عرصہ دائرۃ المعارف میں مصحح کی حیثیت سے کام کیا۔پھر مچھلی پٹنم کے ہندو کالج میں لکچرر کی حیثیت سے کام کیا ،اور جم کر کام کیا۔ پڑھانے کے ساتھ ساتھ وعظ و نصیحت کی محفلوں میں سرگرم عمل رہے۔خاکہ نگاری کے فن میں کمال درجہ مہارت حاصل ہے۔مجھے یاد آنے والے ،نذرانۂ اشک، کہکشان جامعہ ان کے خاکوں کے یادگار مجموعے ہیں۔آپ کی مرقع نگاری پر ڈاکٹر سید فتح اللہ بختیاری نے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔

اپنے ذوق تذکرہ نویسی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''تاریخ قوموں اور ملکوں کی داستان ہے۔اور تذکرہ وسوانح اشخاص و افراد کی زندگی کی کہانی۔دونوں ہی فن پرانے ہیں۔اتنے ہی پرانے جتنا انسانی تمدن پرانا ہے۔ناچیز مولف کو ان فنون سے بڑی دلچسپی طالب علمی ہی کے زمانے سے چلی آرہی ہے۔اور اس نے اردو، عربی اور انگریزی زبانوں میں تاریخ وتذکرہ کی کتابیں بڑے شوق اور شغف سے پڑھی ہیں اور بار بار پڑھی ہیں۔اسی بار بار کی تکرار سے میرے شوق خامہ فرسائی اور ذوق خاکہ نویسی کو مہمیز ملی ہے ۔میں پچھلے انیس بیس برسوں سے اس کوچہ کا رہ نورد ہوں۔اس مدت میں میں نے سو سوا سو سوانحی مضامین اور خاکے لکھے اور مختلف مجلّات و جرائد میں چھپوائے اسی ذوق تذکرہ نویسی نے مجھ سے دو سوانحی کتابیں بھی لکھوائیں'' (نقوش جامعہ، از: مولانا اسلم شاد عمری مرحوم، ص: ۳۵۰)

اخیر میں رب کریم کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ بلبلان جامعہ چمن جامعہ میں اپنے قیمتی تصانیف کے ذریعہ اضافہ کرتے رہیں آمین! شکریہ



اردو ادب کے فروغ میں اسلامی ادب کا کردار

نذیر احمد عمری
ریسرچ اسکالر، مظہر العلوم کالج، آمبور

مذہب ایک ایسی حقیقت ہے، جو ابدی، سرمدی اور عالم گیر ہے۔ اس کی رہ نمائی سے زندگی کا کوئی گوشہ مستثنیٰ نہیں ہے۔ اسی کی رہ نمائی سے تہذیب وثقافت کی تشکیل بھی ہوتی ہے۔ ادب کا دائرہ بھی اس کی رہ نمائی سے باہر نہیں۔ زندگی ایک کل ہے، جس کے تمام اجزاء ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ ادب بھی انسانی زندگی کا ایک پہلو ہے اور اس طرح سے وہ بھی اس کل کا ایک جزء ہے۔ اس لیے ادب کے تصورات کو بھی مذہبی ہدایات کا پابند ہونا چاہیے۔

ادیب اگر خود راستہ اور منزل سے آگاہ نہ ہو تو ہزاروں افراد کی منزل بھی اپنی غلط رہ بری کی وجہ سے کھوٹی کرسکتا ہے۔ وہ سماج میں فساد کا سبب بن سکتا ہے اور تخریب کا علم بردار بھی بن سکتا ہے۔ اس لیے ادیب انسانیت کا دوست بھی ہوسکتا ہے اور دشمن بھی، رہ بر بھی بن سکتا ہے اور رہ زن بھی۔ ع

سینہ روشن ہو تو سوز سخن عین حیات ہو نہ روشن تو سخن مرگ دوام اے ساقی

ادب کا اسلام سے گہرا رشتہ ہے بلکہ صحیح معنوں میں وہی ادب عظیم کہلانے کا مستحق ہے، جس کی روح اسلامی تعلیمات کی مغایر نہ ہو۔ عظیم ادب وہی ادب ہے، جس کا مضمون بھی مؤدب ہو اور پیرایۂ اظہار بھی۔ اس کے خلاف جو بھی ہوگا وہ کم تر ادب کہلائے گا۔ اسلام صرف عقائد کا مجموعہ نہیں، بلکہ یہ مکمل تہذیب بھی ہے۔ اور ادب وشاعری پر محیط بھی ہے۔ اسلام نے ادب وشاعری کو جلا بخشی اور اس سے اصلاح وتعمیر کا کام لیا۔ اسلام نے قلب ونظر کی تطہیر کا کام ادب سے لیا۔ پروفیسر گب نے Legacy of Islam میں اس کا پورا اعتراف کیا ہے۔ اس کے مقابلے میں دور جدید کا ادب مغربی ادب ہے، جس کی تہذیب کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا تھا۔ ع

فسادِ قلب ونظر ہے فرنگ کی تہذیب کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید ضمیر پاک وخیالِ بلند وذوق لطیف

جس قوم کی تہذیب ان خصوصیات کی حامل ہو وہ شعر وادب کا ناپاک دفتر ہی پیدا کرسکے گی۔ اس کے مقابلے میں صالح وتعمیری ادب وہ ہوگا جو صالح زمین اور صالح آب وہوا میں پروان چڑھا ہو۔ یہ ادب حیات آمیز بھی ہوگا اور حیات آموز بھی بلکہ حیات افروز بھی۔ اس میں زندگی کے تمام پہلوؤں کا

تذکرہ ہوگا۔اس میں ذکر چاند کا بھی ہوگا اور ستاروں کا بھی ، پھولوں کا بھی اور چشمِ غزال کا بھی، شراب طہور کا بھی اور آبِ انگور کا بھی، خودی کا بھی اور خدا کا بھی۔لیکن اس طرح کہ بحیثیت مجموعی ان سے معاشرے میں خیر کے اقدار کا فروغ ہو۔

ادب جب اسلامی اقدار وافکار سے ہم آہنگ ہوجاتا ہے وہ اسلامی ادب کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔اسلامی ادب کے دائرہ میں ہر صنف آجائے گی۔غزل ، افسانہ، انشائیہ، ادب لطیف، ناول اور ڈرامہ وغیرہ ادب کی ہر صنف اس کی وسعت میں شامل اور اس کے دائرہ میں داخل ہوجاتی ہے۔

جولوگ اسلام کی مقرر کردہ پابندیوں سے آزادرہ کر سالہا سال سے جمالیات اور فنون کے دائرے میں آوارہ گردی کرتے رہے ہیں اور کھلی چھوٹ کے عادی ہوچکے ہیں ان کے سامنے جب اسلام کی گنتی کی چند پابندیاں آتی ہیں،تو ان کا دل بیٹھ جاتا ہے اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ جیسے تمام راستے بند ہوگئے۔ لیکن جن لوگوں کا ذوقِ جمال اور ولولۂ تخلیق اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ اصولی ومقصدی حدود کے اندر رہ کر بھی تگ ودو کے نت نئے راستے نکال لیتا ہے۔وہ کبھی اس بدگمانی میں مبتلا نہیں ہوتے کہ اسلام کے معنی ہیں ذوقِ جمال کی نفی اور ادب وشعر کا خاتمہ! وہ یہ فارمولا بنا کر پلے نہیں باندھ لیتے کہ جو کوئی مسلم ہو وہ ادیب نہیں ہوسکتا،تاوقتے کہ اپنے اسلام کو دائرۂ ادب کے باہر نہ چھوڑ آئے۔

اسلامی ادب اتنا ہی پرانا ہے، جتنا پرانا خود اسلام ہے۔ ہر دور میں ایسے ادیب پائے گئے ہیں،جن کے فکر اور جذبات نے اسلام سے گہرا اثر قبول کیا اور اس کے قدرتی نتیجے کے طور پر ان کی نگارشات: شعر، قصہ اور مضامین۔حیات وکائنات کا ایک ایسا مطالعہ سامنے لائے ہیں، جسے اسلامی کہا جاسکتا ہے۔بعض افراد نے حیات وکائنات کی بنیادی گتھیاں سلجھانے کی کوشش میں فلسفہ وتصوف کے موضوعات سے تعرض کیا ہے۔کسی زندہ ضمیر نے اپنے سماج کے ناپسندیدہ رجحانات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔کسی نے روحِ کائنات سے قرب اور برادران انسانیت کی محبت سے پیدا ہونے والی داخلی کیفیات کا اظہار کیا ہے تو کسی نے حق وباطل کی آویزش میں حق کی حمایت میں نعرے بلند کیے۔بعض شعرا نے رسول اکرم ﷺ کی مثالی شخصیت کا والہانہ مطالعہ کیا ہے اور قوم کو قرن اول کی مثالی اسلامی زندگی کی طرف واپسی کا پیغام دیا ہے۔کہانیوں کے ذریعے درس اخلاق بھی دیا گیا ہے۔اور اخلاقی قدروں کی پامالی کے بھیانک شخصی اور سماجی نتائج کا ماتم بھی کیا گیا ہے۔ (ادب اسلامی،ص:۹)

اسلام نے تاریخ کے ہر دور میں ادب کی طاقت کو اپنا پیغام سنانے اور باطل افکار کو شکست دینے کے لیے استعمال کیا ہے۔ چناں چہ تمام کی تمام آسمانی کتابیں نہ صرف اپنے اپنے زمانے میں زور ادب کے

لحاظ سے معیاری ہیں، بلکہ آج بھی ان کی ادبی قدر و قیمت دلوں سے خراج اعتراف وصول کرتی ہے۔ فوق الطبعی اور ازلی صداقتوں کو انسانی دل ودماغ پر آشکارا کرنے کے لیے کنایات واستعارات کے جونمونے آسمانی ادب میں پیش کیے گئے ہیں اور انجیل اور قرآن میں جو ادبی تمثیلیں بیان کی گئی ہیں اور مختلف انسانی کرداروں کی جو تصویریں کھینچی گئی ہیں، نیز دعاؤں میں جذبات کے اظہار کے جو اسالیب اختیار کیے گئے ہیں اور خصوصا زبور کی مناجاتوں کی نغمگی میں انسان کے اونچے اور گہرے احساسات کو جس طرح جلوہ گر کیا گیا ہے اس پورے سرمایۂ ادب کی اعجازی شان کے آگے انسانی کاوشیں سرِتسلیم خم کرنے پر مجبور ہیں۔ اسی طرح اسلام کو پیش کرنے والے انبیاء کے خطبات اور جامع کلمات آسمانِ ادب پر ستارے بن کر جگ مگا رہے ہیں۔

ادب کو اسلامی یا غیر اسلامی قرار دینا کچھ لوگوں کے لیے تعجب کا باعث ہوگا۔ لیکن ادب اگر زندگی کی تفسیر وتنقید کا نام ہے تو یہ تفریق خود بخود رونما ہو جاتی ہے۔ تفسیر وتنقید کسی خاص نقطۂ نظر ہی سے ہوگی۔ کوئی ادیب خواہ کتنا ہی آزاد خیال ہو، زندگی پر جب بھی نظر ڈالے گا کسی نہ کسی زاویۂ نگاہ کا پابند ہوگا۔ حیات وکائنات کا کوئی خاص تصور رکھتا ہوگا۔ اور اسی کے مطابق عام انسانی مسائل سے بحث کرے گا۔ اسلامی ادیب بھی یہی کرتا ہے۔ وہ زندگی کے تمام جاہلی تصورات کو مسترد کر کے اس دنیا میں انسان کی حیثیت کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اور انسان کی فلاح کو ان اقدار میں منحصر سمجھتا ہے جو اسلام نے پیش کی ہیں۔

ہر انسان کی زبان اس کی زندگی کے تقاضوں اور محسوسات کو ظاہر کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ اور اس کی زندگی کے تقاضے اور محسوسات اس کے ثقافتی اور مذہبی پہلوؤں سے بھی گہرا ربط رکھتے ہیں۔ اس طرح کسی بھی قوم کی زبان اس کی ثقافت اور مذہب کی بھی آئینہ دار بن جاتی ہے۔ انسانی زندگی کے یہ دونوں پہلو یعنی مذہب اور ثقافت انسانی زندگی سے اس طرح جڑے ہوے ہوتے ہیں کہ ان سے علاحدہ نہیں کیے جاسکتے۔ یہ کم زور پڑ سکتے ہیں، لیکن ختم نہیں ہوتے۔ ثقافتی پہلو اپنی مختلف متنوع شکلوں میں ہر قوم وملک میں عیاں ملتا ہے۔ اور مذہبی پہلو کو دیکھا جائے تو وہ بھی ہر قوم وملک کے افراد کی زندگی میں ملے گا۔ حتی کہ ایک ملحد شخص کے یہاں بھی اس کے دینی وقلبی تردد میں ملتا ہے جو مذہب کے انکار سے پیدا ہونے والے خلاء کے احساس کو دبانے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ بہر حال ثقافت اور مذہب کے اثرات کسی قوم میں جس طرح کے اور جس مقدار میں بھی ہوں اس قوم کی زبان کی تعبیر وطرز ادا میں جھلکتے اور نمایاں ہوتے ہیں۔ بلکہ زبان کے متعدد الفاظ اور محاورے پہلے ثقافت اور مذہب کے مطالب کے ظاہر کرنے کے لیے

وضع ہوتے ہیں، پھر وہ عام استعمال میں دیگر مطالب کے لیے رائج ہوجاتے ہیں۔ اور اس طرح بھی زبان کا دائرہ بتدریج وسیع ہوتا جاتا ہے۔ زبان سے ثقافت و مذہب کا ایسا قدرتی تعلق وربط ہونے کی صورت میں کسی بھی قوم کو اس کی ثقافت و مذہب سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا ہے۔ چناں چہ کسی ایسی زبان کو جو کسی قوم کی زندگی کی ترجمان بن چکی ہو، نظر انداز کر کے اس کی طاقت اور روح کو ختم کر دینا در اصل اس قوم کے تشخص اور خصوصیات کو ختم کر دینا ہے۔ البتہ کسی زبان کی تبدیلی اگر خود مرور زمانہ اور حوادث روزگار کے اثر سے ہو تو وہ تبدیلی تبدیلی نہیں بلکہ زبان کی وسعت وترقی کا باعث ہوتی ہے اور یہ اس قوم کے احساسات وتصورات کے بتقاضائے وقت بدلنے اور بڑھنے کی علامت ہوتی ہے۔ (غبار کارواں۔ص:۱۲۳،۱۲۴)

بہر حال زبان جب ادب کے مرحلہ میں پہونچے تو ادب کا وہ پہلو ہم کو حاصل ہو، جو ہماری زندگی کی شعوری ضرورتوں، ہماری اخلاقی و دینی قدروں اور ہمارے جذبات کی مناسب کیفیتوں کے اظہار کا مناسب ذریعہ بن سکے۔ اسی لیے تعلیم ومطالعہ میں کس طرح کا ادب ہمارے لیے سازگار ہے اور کس طرح کا ناسازگار ہے، اس کے لیے صحیح فیصلہ کرنا، اپنی اور اپنی ملت کی بڑی خدمت ہے۔

❁❁❁

مذہبی ادب اور مولانا زاہد اعظمی عمری کی انشاپردازی

ڈاکٹر منیر الدین عمری
استاد جامعہ دارالسلام عمرآباد

''انشاپردازی'' جذبات نگاری کا کارگر عنصر ہے۔اس کے لیے الفاظ کا ذخیرہ ہونا انتہائی ضروری ہے۔جس کے پاس الفاظ کا جتنا زیادہ ذخیرہ ہوگا،الفاظ کے ساتھ کھیلنے اورانھیں برتنے کا جتنا بہترفن جانے گا وہ اتنا ہی اچھا انشاپرداز کہلائے گا اور الفاظ کو اسی سلیقے کے ساتھ استعمال کرے گا۔ان کا مقام و مرتبہ اتنا ہی اونچا ہوگا،ان کے تحریر کی قدر و قیمت اتنی ہی زیادہ ہوگی اوران کی کتابوں سے اتنا ہی فائدہ اٹھایا جائے گا۔مشاہیر ادب میں رشید احمد صدیقی، ڈپٹی نذیر احمد، مہدی افادی ،مولانا ابوالکلام آزاد اورمولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہ ایسی ہی مایہ ناز شخصیات ہیں جن کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہیں اور کثرت سے ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے، کیوں کہ ان کی نثر نگاری میں ادبیت ہے، چاشنی ہے اوردلوں کوموہ لینے والا انداز بیان ہے،وغیرہ۔

مولانا حبیب الرحمٰن زاہد اعظمی عمری مرحوم انہی قدآور قلم کاروں میں سے ہیں جنھیں قدرت نے مطالعہ کا بہترین ذوق اورتحریر کا معیاری فن عطا کیا تھا۔ابتدا ہی سے آپ نے خوب مطالعہ کیا اور شاعری کے ساتھ ساتھ مضمون نویسی میں بھی خوب طبع آزمائی کی۔آپ کے مضامین دیگر موضوعات کے علاوہ مذہبی ادب پر بھی خاصی مقدار میں موجود ہیں۔آپ کی تحریر کا لب ولہجہ دور حاضر میں لکھنے والے ادیبوں سے منفرد ہے۔اسلوب نہایت معیاری اور ادبی ہے۔زبان میں لچک،شیرینی اور چاشنی پائی جاتی ہے۔ طرزِ نگارش میں فکروفن کا حسین امتزاج ہے۔علاقائی اور مذہبی ادب میں انشاپردازی کی روایات کوآپ نے چار چاند لگایا ہے۔آپ کے قلم سے اعلی درجے کے دینی مضامین صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوے ہیں۔اس طرح آپ نے بیسوی صدی کے ایک ممتاز دینی وعلمی اور تحقیقی مضمون نگار کے طور پر اپنی پہچان بنائی ہے۔

آپ ایک بہترین استادِ فن شاعر بھی تھے،لیکن طبعی مناسبت آپ کو مضمون نویسی سے زیادہ تھی۔آپ کا سفرِ نگارش ۱۹۵۶ء میں شروع ہوا،جس میں روز افزوں ترقی ہی ہوتی رہی۔آپ کا پہلا مضمون ''سہ روزہ دعوت'' دہلی میں ''ہمارے علماء اور تقاضائے وقت'' کے عنوان سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا جو دین و مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔آپ کے سارے مذہبی مضامین میں بھی ادب وانشاپردازی کی روح کارفرما ہے ،تاہم آپ کی انشاپرداز شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ آپ نے ۲۵ سال تک جمعیت ابنائے

قدیم، جامعہ دارالسلام، عمرآباد کے ترجمان ماہنامہ ''راہِ اعتدال'' کی زمامِ ادارت سنبھالی تھی، جو دینی و مذہبی رسالہ ہے۔ اس طویل عرصے میں ہر مہینہ آپ کا ایک پُرمغز اداریہ ''حرفِ اعتدال'' کے نام سے رسالے کی زینت بنتا رہا، جو حالات کی عکاسی کے ساتھ ساتھ گاہے بگاہے مذہبی بھی رہا کرتا تھا۔

مضامین لکھتے ہوے ابتدا ہی سے آپ نے اس بات کا خیال رکھا کہ مضمون چاہے مذہبی ہو یا ادبی زبان و بیان معیاری اور ادبی ہوں۔ چناں چہ آپ کے رشحات قلم سے شائع ہونے والے دینی مضامین کی زبان و بیان بھی ادبی ہے۔

آپ کے اکثر مضامین خالص مذہبی ہیں تاہم ادب و انشا سے معمور ہیں۔ توحید کی طاقت اور اس کے اثرات کا ذکر کرتے ہوے پندرہ روزہ ''جریدہ ترجمان، دہلی'' میں آپ رقم طراز ہیں:

> ''یہ توحید ہی تھی جس نے بنی اسرائیل کو غلامی کے بندھن سے آزاد کیا۔ اور فرعونیوں کے خوف سے شہر چھوڑ کر چلے جانے والے موسیٰؑ کو پھر انہی فرعونیوں پر غلبہ اور اقتدار دیا..... یہ توحید ہی کا کرشمہ تھا جس نے عرب جیسی حقیر اور بے مایہ قوم کو ایران و روما جیسی عظیم الشان سلطنتوں سے ٹکرا دیا۔ (جو کبھی انہی عربوں پر حکومت کے خواب دیکھ رہی تھیں) ایک دوسرے کے دشمن عربوں کو گلے ملا دیا۔ خونخوار اور درندہ صفت عربوں کو انسانیت اور ہمدردی کا پیکر بنا دیا۔ لٹیروں اور راہزنوں کو جہاں بان اور جہاں آرا بنا دیا۔ مفلس اور غریب عربوں کے قدموں پر بڑے بڑے شہنشاہوں کے تخت و تاج ڈال دیئے۔ وہ قوم جو کبھی تہذیب و تمدن کے نام سے بھی آشنا نہ تھی اسی قوم کو ساری دنیا کے لیے تہذیب و تمدن کا وہ اعلیٰ نمونہ بنا دیا جس کی نظیر پیش کرنے سے تواریخ عالم آج تک قاصر ہیں۔ اونٹ اور بکری چرانے والوں کو اسی (۸۰) سال کے اندر آدھی دنیا کا خود مختار حکمراں بنا دیا۔'' (ہفت روزہ جریدہ ترجمان، دہلی: ص ۶، ۷، ستمبر ۱۹۹۴ء)

اسی طرح آپ کا ایک مضمون ''فضائلِ صیام و برکاتِ ماہِ رمضان'' کے عنوان سے مجلّہ ''اہل حدیث، آثار اور سالار'' تینوں میں شائع ہوا ہے۔ جس میں آپ رمضان کی پر بہار رات کا منظر کھینچتے ہوے لکھتے ہیں:

> ''رمضان المبارک کی پر کیف راتوں کا منظر بھی کس قدر روح پرور اور ایمان افروز ہوتا ہے، جب کہ اللہ کے نزدیک بندے اپنے رب کے حضور عجز و انکسار کی تصویر بنے

ہوے مسجدوں میں صف بستہ نظر آتے ہیں۔

پیشانیاں سجدہ ریز ہیں۔تلوے اور ہتھیلیاں زمین بوس ہیں۔ ہر کوئی مجسم خشوع وخضوع بنا ہوا ہے۔آقا سے مناجاتیں ہو رہی ہیں، رب کائنات سے ہم کلامی اور راز و نیاز کا شرف حاصل کیا جا رہا ہے۔ایک طرف اجر وثواب، رحمت ورافت اور لطف وعنایت کی امید کے غنچے دل میں کھل رہے ہیں،تو دوسری طرف یہ خدشہ بھی دامن گیر ہے کہ کہیں ہم سے کوئی ایسی لغزش اور بے ادبی یا گستاخی سرزد نہ ہو جائے جو اس کی ناراضی کا باعث بن جائے۔ ہماری دانش مندی کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ ہم اس قیمتی فرصت اور نادر موقع کو غنیمت جانتے ہوے اس پکارنے والے کی پکار پر لبیک کہیں جو ہمیں برابر آواز دے رہا ہے: یا باغی الخیر اقبل ویا باغی الشر اقصر یعنی اے بھلائی کے طلب گار آگے بڑھ اور کسی قسم کی تاخیر مت کر اور اے برائی کے طلب گار برائی سے باز آجا''۔(ماہ نامہ مجلۂ اہل حدیث، شکراوا، فرید آباد: ص۴/، اپریل/۱۹۸۶ء)

غرض زاہد اعظمی نے مذہبی مضامین کے ذریعے بھی اردو ادب کے فروغ میں جو کردار ادا کیا ہے اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔



''مرثیہ''اردو ادب کی ایک مذہبی صنف

ڈاکٹر امان اللہ.ایم. بی
مدراس یونی ورسٹی

اردو شاعری میں مذہبی افکار وخیالات کا سب سے زیادہ اظہار مرثیہ میں کیا گیا ہے حالانکہ حمد اور نعت میں بھی سرتاسر مذہبی خیالات ہی پیش کئے جاتے ہیں لیکن مرثیہ اپنی وسعت ، کیفیت و تاثیر اور امیجری کے سبب ایک اہم صنف ادب تسلیم کی گئی ہے۔حمد یا نعت کو خالص مذہبی چیز سمجھا گیا ہے لیکن مرثیہ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کا مذہب اور ادب دونوں سے برابر کا علاقہ ہے۔اس کا موضوع مذہبی ہوتے ہوئے بھی اس میں ادب وانشا کی ایسی لطافتیں پائی جاتی ہیں کہ شاید ہی اردو شاعری کی کسی دوسری صنف کو یہ نصیب ہوں۔

مرثیہ وہ اہم صنف سخن ہے جس نے ہماری شاعری کے دامن کو وسعت دی اور ایک فرو مایہ زبان میں ایسا بیش قیمت شعری ذخیرہ فراہم کردیا جو ترقی یافتہ زبانوں کے لئے بھی باعث رشک ہے۔مرثیے کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس میں بیک وقت تمام شعری اصناف سما گئی ہیں۔مثلاً مثنوی میں جس طرح واقعات تسلسل کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں بعینہ یہی صورت مرثیے میں ہوتی ہے۔ مراثی میں حضرت امام حسین اور ان کے اعزہ ورفقاء کے محاسن اس طرح بیان کئے جاتے ہیں کہ موضوع کے اعتبار سے مراثی کے ان حصوں کو قصائد کہا جاسکتا ہے۔مراثی سے ایسے سیکڑوں شعروں کا انتخاب کیا جاسکتا ہے جن پر غزل کے شعروں کا گمان ہوتا ہے کیوں کہ وہ مرثیے کا جز ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی مکمل اکائیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عرب کی شاعری میں مرثیے کو خاص درجہ حاصل رہا ہے۔عربی مراثی اپنے سوز وگداز اور اپنی قوت تاثر کے باعث دلوں میں ولولہ، جوش اور انتقام کی آگ روشن کردیتے تھے۔زمانہ جاہلیت کے بعد زمانۂ اسلام میں مراثی کو مزید ترقی حاصل ہوئی اور کئی مرثیے اپنی فصاحت و بلاغت اور سوز وگداز کے باعث مشہور ہیں۔فارسی میں بھی مرثیوں کا رواج تھا اور ان پر عربی مراثی کے اسلوبِ بیان کا بہت کافی اثر ہوا۔چنانچہ محقق طوسی کے زمانہ میں شہادت حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق پر درد فارسی مرثیے لکھے گئے۔مرثیہ نگار حصول ثواب کی خاطر مرثیہ لکھتے رہے۔ابتدا میں شاعر کا رویہ ضرور یہی رہا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس رویے میں تبدیلی ہوتی گئی اور مرثیہ نگار اظہارِ کمال کی طرف متوجہ ہوتے گئے۔انھوں نے زیادہ سے زیادہ شعری وسائل سے کام لیا۔لفظوں کے انتخاب اور ان کے دروبست پر توجہ کی۔حسب ضرورت تشبیہ، استعارہ، صنائع ، بدائع کا استعمال، مرقع نگاری کی بہترین مثالیں پیش کیں اور

اس صنف کو پیکرِ حسن و جمال بنا دیا۔

زبان بنیادی طور پر ابلاغ و ترسیل کا وسیلہ ہوتی ہے۔اس لئے کوئی بھی صنفِ سخن ہو اس کی لسانی اہمیت کا تعین کرنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کے تخلیقی سرمائے نے ہمیں جو ذخیرۂ الفاظ اور اسالیب بیان فراہم کئے ہیں ان سے زبان کی قوتِ اظہار میں کیا اضافہ ہوا ہے۔ جہاں تک مرثیے کا تعلق ہے اس کی لفظیات اتنی وسیع اور متنوع ہیں ایک ضخیم تہذیبی فرہنگ مرتب ہو سکتی ہے۔ یہ فرہنگ ستر ہویں، اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی مشترک ہندوستانی تہذیب کا ایک ایسا نگارخانہ ہوگی جس کی سیر کر کے ہم اس دور میں استعمال ہونے والے ساز و سامان، ظروف، اسلحہ، پارچہ جات، سواریوں، حرب و ضرب کی اصطلاحوں سے روزمرہ، محاورات اور ضرب الامثال کے بارے میں پوری واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔

''ادب میں کوئی صنف اس وقت تک عظیم نہیں بن سکتی جب تک کہ اس کا موضوع عظیم نہ ہو۔''

اگر گوئٹے کا یہ مقولہ سچ ہے تو پھر اردو شاعری کے اصناف میں مرثیہ ایک ایسی صنف ہے جس کے تعلق سے ہم دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اس کا موضوع عظیم ہی نہیں بلکہ عظیم تر ہے کیونکہ شہادت امام حسین کا واقعہ ہے جسے دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ یہ تاریخ انسانیت کا وہ باب ہے جس کو سنہری حروف میں لکھا جانا چاہیے۔حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی بنی نوع انسان کے لئے ایک نمونہ ہے اور واقعاتِ کربلا خیر و شر کے درمیان ایک تصادم اور یہ حادثہ ہمارے لئے درس عبرت ہے۔اس عظیم موضوع کے لئے انیسؔ نے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ نہایت شاندار و پرشکوہ ہے۔ الفاظ کی موزونیت، محاوروں اور روزمرہ کی خوش اسلوبی، بیان میں جوش، یہ اور اس قسم کی دیگر باتیں ہیں جو انیسؔ کی انفرادیت میں داخل ہیں۔انیسؔ کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے دبستانِ لکھنؤ کی تقدیر بدل دی جن باتوں کی وجہ سے دبستانِ لکھنؤ بدنام ہوا انیسؔ نے انھیں خصوصیات کو اختیار کر کے اس دبستان کو عز و شرف عطا کیا۔ دبستان لکھنؤ کی ساری خامیاں انیسؔ کے ہاں خوبیوں کے روپ میں ملتی ہیں۔

صالحہ عابد حسین کا کہنا ہے کہ

''لوگوں کے ذہنوں میں عام طور پر یہ خیال بیٹھا ہوا ہے کہ مرثیہ صرف رونے اور رلانے کے لئے ہوتے ہیں۔ یوں تو ابتدائی زمانے کے مرثیوں تک میں شہیدانِ کربلا کی زندگی کے واقعات بیان کئے جاتے تھے اور مثالی کرداروں اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کی حامل ہستیوں سے دنیا کو متعارف کرایا جاتا تھا۔ وہ بجائے خود اخلاقی تربیت کا ایک ذریعہ کہا جا سکتا ہے۔'' (انیسؔ کے مرثیے۔مقدمہ از صالحہ عابد حسین ص ۵۱)

اعلیٰ شاعری کی بنیاد اخلاقی چٹان پر رکھی جاتی ہے۔ جو شاعری بدلتے ہوئے سیاسی و معاشی ریت کے تودے پر رکھی جاتی ہے وہ لمحاتی ہوتی ہے۔ اعلیٰ شاعری سے ہر مذہب وملت اور ہر عمر کے لوگ نہ صرف مسرت حاصل کرتے ہیں بلکہ وہ اپنی بصیرت میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔ اعلیٰ شاعری زمان ومکان میں رہ کر بھی ان سے پرے رہتی ہے۔ اس کا مقصد انسانیت کی فلاح ہوتا ہے۔ وہ اپنی شاعری سے قاری کے دل میں متضاد جذبات ابھارتا ہے اور کبھی دردناک واقعہ یا بھیانک منظر کو اس سلیقہ سے پیش کرتا ہے کہ اس سے قاری کے دل میں دکھ درد کی ٹیس اٹھتی ہے اور کبھی حیرت و ہمدردی کا جذبہ ابھرتا ہے۔ شاعری جذبات اور احساسات کا کھیل ہے۔ یہ داخلی بھی ہے اور خارجی بھی جس میں وزن وآہنگ، مواد وموضوع اور ان کے تحت اور بہت ساری باتیں اس خوبی اور توازن سے جمع ہو جاتی ہے کہ شعر میں شعریت آجاتی ہے۔ یہی اچھے شعر کی پہچان ہے۔ معمولی شاعر اخلاقی مضامین شاعری کے احاطے میں لا کر انھیں خشک اور غیر دلچسپ بنا دیتا ہے۔ لیکن ایک اعلیٰ پاہ کا شاعر انھیں مضامین کو اس سلیقہ سے پیش کرتا ہے کہ لطف مضامین باقی رہنے کے علاوہ قاری پر بھی ان کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ میر انیسؔ کے مرثیوں میں اخلاقی مضامین اس طرح جگہ پا گئے ہیں جس طرح انسان میں روح۔ یہ اسی طرح فطری ہیں جس طرح بہار میں پیڑ سے پتے نکل آتے ہیں۔ ان کے اس قسم کے اشعار بے جوڑ غیر فطری اور خشک نہیں ہیں بلکہ اپنی جگہ جادو جگا دیتے ہیں۔

> ''تعلیم اخلاق اور انسانی قدروں کی متعدد مثالیں مرثیے میں ملتی ہیں جن کے نتیجہ میں ذہن انسانی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ معنی کے اعتبار سے ایک ایک مصرع سے گویا اصول اخلاق کا ایک ایک سمندر جھلکتا ہے۔'' (میر انیسؔ بحیثیت رزمیہ شاعر از ڈاکٹر اکبر حیدری ص ۶۰۲)

حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے ساتھی حق گو اور امر بالمعروف کے پابند تھے۔ ان کا جنگ کرنا اور صلح کرنا، زندہ رہنا اور مرنا سب خدا کے لئے تھا۔ لڑائی میں اپنی طرف سے پہل کرنا ان کے نزدیک شیوۂ مردانگی نہیں تھا اور انھوں نے شر وفساد کو ہر طرح دبانے کی کوشش کی۔ اس کی کئی مثالیں مرثیوں میں موجود ہیں۔ لہذا ہم وثوق کے ساتھ کہ سکتے ہیں کہ مرثیہ ہی اردو شاعری کی وہ صنف ہے جس میں اسلامی نظریات کو زیادہ بہتر طریقے سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

اردو غزل میں تصوف نمائندہ شعرا کے حوالے سے

معشوق احمد صدیقی
ریسرچ اسکالر، کروشترا یونیورسٹی

شاعری کی تمام اصناف میں رنگ تصوف نمایاں ملتا ہے لیکن صنفِ غزل میں مضامین تصوف کی کثرت ہے۔صوفیانہ افکار و خیالات غزل کے مزاج سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔غزل نے صرف حسن و عشق اور اس کے معاملات و کیفیات کی ترجمانی ہی تک خود کو محدود نہیں رکھا۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس نے دوسرے موضوعات کو اپنایا ہے اور اس سلسلہ میں تصوف اس کے لئے ایک بہت بڑا سہارا بن گیا ہے۔اردو غزل میں ہمہ گری، وسعت تنوع اور رنگا رنگی، اعلیٰ جمالیاتی شعور، حیات و کائنات کے مسائل پر غور و فکر کی دعوت اور فلسفیانہ گہرائی کے ساتھ سوز و گداز تصوف کی عنایتیں ہیں، تصوف نے اردو غزل کو گہرائی اور سنجیدگی سے آشنا کیا۔اور اردو غزل میں نئے الفاظ اور نئے علامتیں داخل ہوئیں جس کی بنا پر اردو غزل میں حیرت انگیز وسعت پیدا ہوگئی۔ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

> ''تصوف نے غزل کی صنف کو حیات و کائنات کے مسائل سے آشنا کیا اور اس طرح اس میں ایک فلسفیانہ مزاج پیدا ہوا ہے۔''

اردو شاعری روزِ اول سے ہی تصوف سے ہم آغوش رہی ہے۔اردو شاعری میں تصوف کے اثر انداز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اردو شاعری فارسی شاعری سے براہِ راست متاثر ہوئی۔ فارسی شاعری میں صوفیانہ خیالات کی ترجمانی، حقائق و معارف کی آگہی، واردات قلبی کی اثر پذیری، مشاہدات کی جلوہ سامانی کی اتنی شدت اور کثرت تھی کہ اردو زبان و ادب اس سے دامن نہ بچا سکی اور اردو شاعری میں بھی وہ خیالات فنی تقاضوں کے ساتھ داخل ہوئے۔سعدیؔ، حافظؔ، عراقیؔ، امیر خسروؔ اور جامیؔ کی فارسی غزلوں میں جو عشقِ حقیقی کی چوٹ، درد و قرب، والہانہ کیف و کم، مظاہر خداوندی اور داخلی کوائف کی کیفیات نظر آتی ہیں۔ان ہی شعرا حضرات سے اردو غزل بھی متاثر ہوئی۔اردو غزل نے جب فارسی غزلوں کا رنگ و آہنگ اختیار کیا اور اس کی تشکیل اور تعمیر ہوئی تو اس میں تصوف کے آب و گل سے خمیر تیار ہوا۔اور پھر غزل میں تصوف کے مسائل اس کثرت سے ادا کئے گئے ہیں کہ اگر صوفیانہ اشعار کو خارج کر دیا جائے تو سرمایہ شاعری نصف سے زیادہ باقی نہ رہے گا۔

اردو شاعری اور تصوف کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اردو کے بیشتر شعرا نے کسی نہ کسی شکل میں مسائل تصوف پر غور کرتے رہے۔ اردو شاعری میں صوفی شعرا کی فہرست مرتب کرنا بجائے خود ایک بڑا تحقیقی کام ہے۔ لہذا بطور مثال چند منتخب صوفی شعرا کی غزلیات میں تصوف کے اثرات کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

شمس الدین محمد ولؔی

ولی نے جس زمانے میں اردو شاعری شروع کی اور ان کی شاعری پروان چڑھی وہ ماحول خالص صوفیانہ تھا اور ولؔی کا خاندان بھی خدا ترسی اور تصوف کے اعتبار سے مشہور تھا۔ اس لئے ان پر خاندان کا بھی اثر تھا۔ حضرت نور الدین سہروردی سے ارادت کا بھی فیضان تھا حضرت سعد اللہ گلشن کی عقیدت کا بھی ثمرہ تھا اور خود درمند دل لے کر آئے تھے۔ اس لئے عشق حقیقی کی آگ میں تپ رہے تھے۔ اس لئے ولؔی کی اردو شاعری کو اسی نے دو آتشہ بنایا۔ ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی لکھتے ہیں:

> ''ولؔی کو تصوف سے گہری دلچسپی تھی۔ ان کی غزلوں میں جو عشق کی اعلیٰ اقدار اور پاکیزگی و معصومیت ملتی ہے وہ تصوف ہی کی وجہ سے ہے۔ اسی کے اثرات ہیں کہ معرفت و عرفان اور حیات و کائنات کے مسائل انکی غزلوں میں دکھائی دیتے ہیں۔''

ذیل میں نمونے کے طور پر چند اشعار درج ہیں۔

پاکبازوں سے یہ ہوا معلوم عشق مضمون پاکبازی ہے
عارفاں پہ ہمیشہ روشن ہے کہ فن عاشقی عجب فن ہے

عشق کر اے دل سدا تجرید کی عاشقی ہے ابتدا توحید کی

ولؔی کی شاعری میں دو نمایاں پہلو مجاز و حقیقت ہیں لیکن ولؔی کے کلام کا بیشتر حصہ ایسا ہے جہاں اس نے تصوف کو تغزل کے رنگ میں اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ مجاز و حقیقت کا امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

شغل بہتر ہے عشق بازی کا کیا حقیقی کا مجازی کیا

ولؔی نے اور بھی بہت سے مسائل تصوف بیان کئے ہیں۔ صوفی شاعری کی حیثیت سے ولؔی کا مقام بلند ہے۔ ولؔی کی شاعری میں فنا اور بقا، عرفان الٰہی توکل و قناعت، وحدت الوجود، عشق حقیقی اور عشق مجازی غرض کہ تمام صوفیانہ خیالات کی جلوہ گری ہے۔ ولؔی کی صوفیانہ غزلیں اس حقیقت کی ترجمان ہے۔

سراج اورنگ آبادیؔ:

سراج اورنگ آبادی کی شاعری میں مختلف النوع صوفیانہ رنگ ہے۔ ان کی تصوفانہ شاعری میں

عشقیہ اور غنائی شاعری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ اور سراجؔ اردو کے اولین صوفی شاعر قرار دئے جا سکتے ہیں۔ جن کی شاعری میں صوفیانہ رنگ اور فنی اظہار کی پوری آمیزش موجود ہے۔

شریعت کے مذہب کی منزل دکھا طریقت کے شرب کی محفل دکھا

عشق کے موضوع کے ساتھ سراجؔ کی شاعری میں تصوف اور اخلاق و فلسفہ ہے، مذہبی تجربات اور انسانی تجربات مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔

راہ خدا پرستی اوّل ہے خود پرستی ہستی میں نیتی ہے اور نیتی میں ہستی
کرتی ہی ہر بلندی آخر کوں عزم پستی شراب معرفت پی کر جو کوئی مجذوب ہوتا ہے

خواجہ میر دردؔ:

خواجہ میر دردؔ اردو شاعری میں صوفی شاعر کی حیثیت سے بلند و بالا ہیں اور اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ میر دردؔ اردو شاعری میں تصوف کے امام کہلاتے ہیں۔ دردؔ کی صوفیانہ شاعری میں صرف اُن کا مسلک تصوف ہی نہیں ہے بلکہ وارداتِ قلبی، عرفان الٰہی اور حال و قال کی تمام کیفیتیں ہیں ان تمام سے ان کا گزر رہا ہے۔ دردؔ نے جس طرح مضامین معرفت و سلوک و تصوف کو شاعری میں سمویا ہے اس کی مثال اردو شاعری میں ملنی بہت مشکل ہے۔ ان کا اردو کلام حافظؔ کے دیوان کی طرح سراپا انتخاب ہی نہیں بلکہ معرفت سے بھی اسی طرح لبریز ہے۔ مرزا علی لطفؔ ''گلشن ہند'' لکھتے ہیں:

'' اگرچہ ان کا دیوان بہت مختصر ہے لیکن سراپا درد و اثر ہے۔''

فلسفہ اور تصوف دردؔ کی شاعری میں بڑی رچی ہوئی صورت میں موجود ہے۔ دردؔ نے اپنی غزلوں میں تصوف کے روایتی تصور کو پیش نظر رکھنے کے علاوہ اس باب میں نئی باتیں بھی کی ہیں۔ دردؔ نے تصوف کے تمام مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ دردؔ نے اپنی وارداتِ قلبی کے ذریعہ اردو شاعری کو تصوف کے مختلف نکات سے روشناس کیا ہے۔ توحید و معرفت کی اصطلاح تصوف کا اہم ترین موضوع ہے۔ دردؔ کہتے ہیں۔

اس مسند عزت پر کہ تو جلوہ نما ہے کیا تاب گزر ہوئے تعقل کے قدم کا
ہے خوف اگر جی میں تو بس تیرے غضب سے اور دل میں بھروسا ہے تو ہے تیرے کرم کا

صوفیا کے نزدیک معرفتِ حق دراصل معرفتِ ذات سے عبارت ہے۔ دردؔ نے مختلف مقامات پر اس صورت حال کو بیان کیا ہے۔

حجاب رُخ یار تھے آپ ہی ہم کھلی آنکھ جب، کوئی پردہ نہ دیکھا

معشوق حقیقی تک رسائی کا راستہ فنائے ذات کی منزل سے ہوکر گزرتا ہے۔ خدا تک پہنچنا سالک کا اپنی حقیقت کو پانا ہے لیکن اپنی حقیقت کا انکشاف اپنی ہستی یا خودی کو فنا کیے بغیر ممکن نہیں ۔

اہل فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے لوحِ مزار بھی مری چھاتی پہ سنگ ہے

دنیا کی بے ثباتی، قناعت، درویشی، عقل کی نارسائی، عشق کی رہنمائی، عظمت انسانی، بقا اور فنا، مکان ولا مکاں، توکل اور فقر اخلاقی تعلیم، وحدت الوجود اور وحدت الشہود میر درد کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔

نظر میرے دل کی پڑی درد کس پر جدھر دیکھتا ہوں وہی رو پرو ہے
مانند حباب آنکھ تو اے درد کھلی تھی کھینچا نہ پھر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

درد کے تصور عشق کے مطابق عشق ہی سے نظامِ کائنات قائم ہے۔ عشق ہی انسان کو علویت بخشتا ہے جب عشق کی حکمرانی قائم ہوتی ہے تو انسانی اقدار پروان چڑھنے لگتی ہے ۔

یا رب یہ کیا طلسم ہے ادراک و فہم یاں دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے
اے درد چھوڑتا ہی نہیں مجھ کو جذب عشق کچھ کہربا سے بس نہ چلے برگِ کاہ کا



اردو کے صوفی غزل گو شعراء

ڈاکٹر محمد آصف ملک

بابا غلام شاہ بادشاہ یونی ورسٹی راجوری۔۱۸۵۲۳۴ جموں وکشمیر

غزل نے دنیا و مافیہا کے مضامین جہاں اپنی آغوش میں سنبھالے ہیں، وہیں آفاقِ عالم سے پرے عرش کی روشن سامانیوں یعنی تصوف کو بھی اپنے دامنِ دل میں ایک خاص مقام دیا ہے۔ دیگر اصنافِ شاعری کی طرح اردو غزل نے بھی روایات، رسومات، تعبیرات، ترکیبات اور مضامین کا تتبع کیا ہے، جس طرح فارسی شاعری نے عرفانِ ذات اور عرفانِ نورِ مطلق سے اپنی شاعری کو جلا دی ہے اسی طرح اردو شاعری اور بالخصوص اردو غزل نے علوِ تخیل، علوِ معانی کے ساتھ ساتھ عرفانِ ذات اور عرفانِ حسنِ کامل پر اصرار کیا ہے۔ ہمارے یہاں اردو غزل میں بعض شعرا نے تصورِ وجودی، شہودی، کشفی، باطنی، اور علمی تصوف کو اپنی زندگیوں میں برتا بھی ہے اور ان تصورات کو اشعار میں ڈھالا بھی ہے۔ لیکن زیادہ تر ایسے اردو غزل گو شعرا ہیں، جنہوں نے صرف علمی حد تک یا تصوف برائے شعر گفتن کے تحت متصوفانہ مسائل و تصورات کو اپنی غزل کا حصہ بنایا ہے۔ حالاں کہ اردو شاعری میں ابتدا ہی سے خواہ شاعری رہی ہو یا نثر دونوں پر تصوف کا غلبہ رہا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ تصوف کے اثرات جدید شاعری میں آتے آتے کم ہوتے گئے، یہاں تک کہ جدید تر غزل میں ڈھونڈنے سے اگر کوئی متصوفانہ مزاج کا شعر مل جائے تو غنیمت ہے۔ کلاسیکل اردو غزل اور وہ جدید غزل جو کلاسیکل غزل کی پیروی کرتی رہی ہے اس میں قریب ہر بڑے اور اچھے شاعر کے یہاں تصوف کی واردات، کیفیات، اصطلاحات، تصورات اور مسائل ملتے ہیں، جن میں ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، میر تقی میر، سودا، خواجہ میر درد، مرزا مظہر جان جاناں، غالب، آتش، آسی غازی پوری، امیر مینائی، داغ، اصغر گونڈوی، فانی، اقبال، حسرت، فراق، اور جگر مرادآبادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن ان شعرا کی حیات و کلام کو اگر اس نظریے سے دیکھا جائے کہ کشفی، باطنی اور عملی تصوف کن کن کی شاعری اور زندگی میں رچا بسا ہے تو ان میں سے چند ہی شعرا کا نام وثوق سے لیا جا سکتا ہے اور وہ نام ہیں مرزا مظہر جان جاناں، خواجہ میر درد، اور آسی غازی پوری۔ دیگر شعرا کے یہاں علمی تصوف، تصوراتِ تصوف، اصطلاحات و تعبیرات و تصوراتِ تصوف اور مسائل تصوف تو دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن وہ شعرا عملی تصوف سے تہی دامن رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی نے بہت صحیح

بات کہی ہے کہ:

" اردو کے تین شاعروں کے بارے میں کسی قدر وثوق کے سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ صوفی بھی ہیں اور شاعر بھی، وہ ہیں مرزا مظہر جان جانا، خواجہ میر درد اور آسی غازی پوری۔،،

(اردو شاعری اور تصوف، ص:۶۴۔۶۶۳)

تصوف دراصل ابتدا میں خدا کی عبادت خضوع کے ساتھ خالص اس کی رضا مندی کے لیے ادا کرنے کا نام تھا، عملی اور دلی حضور پر مبنی تصوف یا احسان کہلاتا تھا، بعد میں تصوف کو باضابطہ ایک فلسفے کی شکل دے دی گئی، اس طرح فلسفۂ تصوف میں حقیقت الحقیقت یا حقیقت اعلیٰ، وجود وشہود، وحدت و کثرت، حیات وکائنات، روح ومادہ، فنا وبقا، خیر وشر، کشف وباطن اور ہستی ونیستی کی بحثیں شامل ہوگئیں ۔مسائلِ تصوف اور اس کی باطنی کیفیات میں حسن وعشق اور وصل وہجر کے جذبات و واردات کلیدی حیثیت رکھتے ہیں، ان مسائل میں الجھنے کے سبب بعض کراہتیں بھی انسانی زندگی میں راہ پا گئیں، بعضوں نے مذہب کی ظاہری رسوم واعمال کی نفی کی اور محض خدا کے حضور، دل کی موجودگی، اس کی یاد میں غور وفکر اور مختلف باطنی کیفیات میں مست الست ہو جانا ہی عرفانِ ذات اور عرفانِ حسنِ مطلق قرار دیا۔اس طرح عملی اور حقیقی صوفیا بہت تھوڑے اور علمی تصوف کے حامل عمل سے عاری صوفیا اور شعرا زیادہ ہو گئے ۔اس صوفی نما تصورات کے اثرات راست طور پر سماج پر پڑے، جس کے سبب سماج بے عملی کا شکار ہو گیا، نتیجتاً ہماری حیثیتیں ہم سے چھن گئیں اور ہم غلامی میں مبتلا ہو گئے ۔اس بے عملی، سرد مہری اور غلامی کی تشخیص علامہ اقبال نے کی اور انہوں نے تصوف میں در آئی کراہتوں کے خلاف آواز بلند کی ۔انہوں نے فلسفیانہ پیرائے میں وحدت الوجود اور ان کراہتوں کے مدِ مقابل تصورِ زماں، تصورِ خودی کو پیش کر کے ساری زندگی ان کے اور وحدت الشہود کے فروغ کے لیے سعی کی ہے۔خود علامہ اقبال وحدت الوجود سے تائب ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مجھے اس امر کا اعتراف کرنے میں کوئی شرم نہیں کہ میں ایک عرصے تک ایسے عقائد و مسائل کا قائل رہا جو بعض صوفیہ کے ساتھ خاص ہیں اور جو بعد میں قرآن شریف پر تدبر کرنے سے قطعاً غیر اسلامی ثابت ہوئے ۔مثلاً شیخ محی الدین ابنِ عربی کا مسئلۂ وحدت الوجود۔،،(بحوالہ:اقبال شاعر ومفکر، ص:۸۷)

اب ہم ان شعرا اور ان کے کلام پر بات کرتے ہیں جنہوں نے متصوفانہ نظریات وتصورات کو اپنی غزل کا حصہ بنایا ہے۔

ولؔی دکنی (۱۶۶۸۔۱۷۴۱ء) کلاسیکی غزل کے بنیادگزار ہیں، ان کی شاعری میں دو اہم اور نمایاں پہلو نکھر آتے ہیں، ایک مجاز اور دوسرا حقیقت، یہ دونوں عنصر کہیں الگ الگ اور بعض مقامات پر ملے جلے ادب میں نظر آتے ہیں۔ حقیقی عنصر دو حصوں پر منقسم ہے ایک حصہ نظامِ تصوف کی تدریجی منزلوں اور راہِ سلوک کی ہدایات سے متعلق ہے جب کہ دوسرا حصہ جذب و مستی اور شوق سے متعلق ہے۔ ولؔی نے اپنی غزلیات میں تصوف کی مختلف واردات و کیفیات کو زیادہ تر مجازی لفظیات، ترکیبات، تعبیرات اور اصطلاحات میں ڈھالا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مجاز سے حقیقت کی طرف سفر کرنے کے قائل ہیں:

شغل بہتر ہے عشق بازی کا کیا حقیقی و کیا مجازی کا
اے ولؔی ! عیشِ ظاہری کا سبب جلوۂ شاہدِ مجازی کا
در وادیِ حقیقت جن نے قدم رکھا ہے اول قدم ہے اس کا عشق مجاز کرنا

ولؔی دکنی زیادہ تر وجودی اور حضوری مسائل پر توجہ دیتے ہیں، جمالِ محبوب کا مشاہداتی تجربہ اور تصور کا اظہار مجازی لفظیات و تعبیرات میں کرتے ہیں، انہوں نے محبوبِ حقیقی کی صفات کو رخسار، زلف، شیشہ و پری، نقاب، پردۂ انسان، مطلعِ انوار، شمع رو، حسن، آئینہ اور آتشِ عشق جیسی لفظیات میں کیا ہے۔

سراؔج اورنگ آبادی (۱۱۲۸ھ۔۱۱۷۷ھ) اورنگ زیب کی وفات کے چند سال بعد پیدا ہوئے، ان کی پیدائش کا زمانہ قریب ۱۷۱۴ء ہے۔ یوں تو کلاسیکی ادب کا زمانہ ولؔی سے شروع ہوتا ہے، یعنی ۱۷۰۰ء سے ۱۸۶۹ء تک کا عہد کلاسیکی ادب کہلاتا ہے، اسی عہد میں سراج اورنگ آبادی بھی آتے ہیں۔ اگرچہ ان کی غزل کلاسیکی غزل کی مکمل پیروی نہیں کرتی لیکن بہت حد تک وہ کلاسیکی ادب کے دائرے میں آتی ہے۔ سراؔج پر قریب بارہ سال کی عمر میں جذب و مستی کی کیفیت طاری ہوئی اور وہ بے اختیار فارسی زبان میں شعر کہنے لگے۔ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

> "سراؔج اب سے کوئی ۲۶۱ سال پہلے ۱۱۲۸ ھجری میں اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں پیدا ہوئے یہ سن عیسوی کے حساب ۱۷۱۴ء کے قریب کا زمانہ ہے یعنی اورنگ زیب کے انتقال کے چند سال بعد سراؔج پیدا ہوئے اور بقول عبدالقادر سروری ۱۱۷۷ھجری میں انتقال کیا۔ بارہ برس کی عمر میں متداولہ علوم کی تعلیم مکمل کی۔
>
> اسی زمانے میں جذب و مستی کی کیفیت طاری ہوئی اور بے اختیار فارسی اشعار موزوں ہونے لگے۔ حالتِ جذب میں گھر سے نکل کھڑے ہوتے، رات رات بھر صحرا نوردی کرتے اور کبھی شاہ برہان الدین غریب کے مزار پر وقت گزارتے۔ چشتیہ سلسلے کے ایک

صوفی بزرگ شاہ عبد الرحمٰن سے بیعت ہوئے۔اسی زمانے میں اردو شاعری شروع کی۔،،(تعارف: انتخاب سراج اورنگ آبادی)

اسی جذب ومستی کا اثر سراجؔ کی شاعری پر نظر آتا ہے، سراجؔ اورنگ آبادی کی غزل میں زیادہ تر توحیدِ وجودی اور ہستی ونیستی کے تصورات ملتے ہیں۔جس طرح ان کی ذات پر جذب ومستی کا عالم طاری رہا ہے اسی طرح ان کی غزل میں بھی متصوفانہ مسائل اپنی اَور متوجہ کرتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ سراجؔ کو صوفی شاعر کہا جاتا ہے، مزاجاً اور عملاً وہ صوفی تھے لیکن ان کی شاعری پر متصوفانہ مسائل کا غلبہ نظر نہیں آتا، ہاں ان کی شاعری میں عرفانِ ذاتِ باری اور منازلِ سلوک میں استعمال ہونے والی مختلف اصطلاحات : مثلاً ساقی، مہ خانہ، دیدار، آئینہ، شرابِ شوق، زیارتِ کعبہ وغیرہ کا وفور نظر آتا ہے۔ان وصفوں کو سراجؔ کے درج ذیل شعروں میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

مجھ پر اے محرمِ جاں پردۂ اسرار کوں کھول خوابِ غفلت سیں اٹھا دیدۂ بیدار کوں کھول
شربتِ دیدار کا ہوں تشنہ لب آرزوے چشمۂ زمزم نہیں
گر نظر آوے مجھے خواب میں وہ نقشِ قدم صورتِ آئینہ چشمِ زلیخا سمجھوں
مدت سوں تھا زیارتِ کعبہ کا مجہ کوں ذوق تیری بھواں کوں دیکھ کر قرباں ہوا ہوں میں

مرزا مظہر جان جاناں (۱۷۰۰ء۔ ۱۷۸۰ء) اوصافِ حمیدہ کے حامل تھے، صاف گوئی اور صداقت ان کا طرہ امتیاز رہا ہے۔انہوں نے جو کچھ محسوس کیا، جس کا مشاہدہ کیا، یا سوچا اور جس کا تجربہ ہوا اس کا راست طور پر انہوں نے استعارتی زبان میں اظہار کیا ہے۔وہ ایک اچھے عالم تھے، انہوں نے ظاہری اور باطنی علوم کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔دین ودنیا، حقیقت اور مجاز دونوں اسرار ورموز، ان کے دل پر آئینہ تھے۔تصوف سے گہری وابستگی کے سبب ان کا کلام متنوع مضامین کا حامل ہے، ان کے یہاں عشقیہ مضامین میں اکہرا پن نہیں بلکہ معانی کا تنوع ہے، ان کے یہاں بظاہر تو عشقِ مجازی کا بیان ہے لیکن صاحبِ معرفت اس میں حقیقت کے رموز کا عرفان رکھتا ہے، اس طرح عشقیہ مضامین کی واردات اور احساسات کی معنویت میں صاحبِ عرفان غوطہ زن ہو جاتا ہے۔مرزا مظہرؔ کی ذات وہ ذات ہے جو شاعر بھی تھے اور صوفی بھی، اس طرح وہ صوفی شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔اردو شعر وادب میں، مرزا وحدت الوجود کے قائل تھے لیکن ان کا کلام بہت تھوڑا دستیاب ہے۔ان کے یہاں وجودی، حضوری، اور جمالِ محبوبِ حقیقی کے جلوؤں کی کیفیات کا احساس ہوتا ہے۔

وقت ہے ماہ رو کے آنے کا فکر کر شمع کے بجھانے کا

آزاد ہو رہا ہوں دو عالم کی قید سے مینا لگا ہے جب سے کہ مجھ بے نوا کے ہاتھ
گر گل کو گل کہوں تو ترے رو کو کیا کہوں بولوں نگاہ کو تیغ تو ابرو کو کیا کہوں

خواجہ میر درد (۱۷۱۹ء۔۱۸۷۵ء) اردو کے ایسے شاعر ہیں جو خود صوفی بھی تھے اور شاعر بھی، بل کہ ان کے والدِ گرامی خواجہ محمد ناصر عندلیب بھی شاعر اور صوفی بزرگ تھے۔ درد نے اپنے والدِ گرامی کی آغوشِ تصوف میں تربیت پائی تھی، درویشانہ تعلیم کے سبب وہ تصوف کے رنگ میں رنگ گئے، والدِ گرامی کی وفات کے بعد ۲۲ سال کی عمر میں فقر و تصوف کی مسند پر جلوہ نشیں ہوئے، تصوف اور شاعری، صبر و توکل، استغنا و قناعت، خوداری، ریاضت و عبادت ان کا شیوار ہا ہے۔ فلسفۂ تصوف میں دو تصور وحدت الوجود اور وحدت الشہود بڑے اہم رہے ہیں، درد دیگر مسائلِ تصوف کے ساتھ ساتھ وحدت الشہود کے قائل اور سنتِ محمدیہ کے پیروکار رہے ہیں۔ خواجہ میر درد کے کلام میں انہیں تصورات کی جھلک جا بجا نظر آتی ہے، سالک جن وارداتِ قلبی سے راہِ سلوک میں گزرتا ہے ان کیفیات کو بھی کلامِ درد میں محسوس کیا جا سکتا ہے:

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے میرا ہی دل ہے وہ، کہ جہاں تو سما سکے
اِطفاے رازِ عشق نہ ہو آبِ اشک سے یہ آگ وہ نہیں، جسے پانی بجھا سکے
دونوں جہاں کو روشن کرتا ہے نور تیرا اعیاں ہے مظاہر ظاہر ظہور تیرا
ہے جلوہ گاہ تیرا کیا غیب کیا شہادت یاں بھی شہود تیرا واں بھی شہود تیرا
متفق آپس میں ہیں اہل شہود درد آنکھیں دیکھ باہم ایک ہیں

ان کے علاوہ آسی غازی پوری صوفی شاعر گذرے ہیں، دیگر شعرا جو بعض کلاسیکی شاعری سے تعلق رکھتے ہیں جیسے میر تقی میر، آتش، غالب، مومن، بہادر شاہ ظفر اور بعض وہ شعرا جو جدید عہد سے متعلق ہیں جیسے حالی، اصغر گونڈوی، فانی، اقبال، فراق، اور جگر مرادآبادی وغیرہ یہ سب صوفی شاعر تو نہیں ہیں لیکن ان کے کلام میں صوفیانہ مسائل، علمی تصوف کے ساتھ ساتھ مجازی لفظیات و تعبیرات، حقیقی معانی پر بھی منطبق ہوتی ہیں اور ان کے یہاں اخلاقیانہ اور فلسفیانہ اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔ میر تقی میر کے یہاں متصوفانہ اشعار بھی ہیں اور کسی حد تک صوفیانہ مزاج بھی ہے، ہستی و نیستی، تصورِ وجودی اور قضا و قدر پر مبنی کلام موجود ہے۔ غالب کے یہاں بھی مسائل تصوف اور معرفت کے متعلق کافی تعداد میں اشعار موجود ہیں، حقیقت یہ ہے کہ غالب کے یہاں تصوف برائے شعر گفتن کی حد تک درست ہے لیکن عملی زندگی بالکل اس کے برعکس ہے۔ اصغر گونڈوی ایک ایسے شاعر ہیں جن کو صوفی شاعر تصور کیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں وہ صوفی شاعر نہیں ہیں بلکہ ان کی شاعری اور خیالات میں طہارت شامل ہے جس کے سبب وہ تصوف کے

قریب ہیں۔رہی بات اقبالؔ کی تو وہ بھی صوفی شاعر نہیں لیکن انہوں نے مسائلِ تصوف کے ساتھ ساتھ زیادہ اصرار تصوف اور معرفت کے مسائل اور اصطلاحات کی اصلاح پر کیا ہے، ابتدا میں اقبالؔ بھی غالبؔ کی طرح وحدت الوجود کے قائل رہے ہیں، لیکن بعد میں وحدت الشہود پر ایمان لے آئے، اس کو فروغ بھی دیا۔ یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ اولاً غالبؔ نے روایتی طور پر وحدت الوجود کے مسائل کو شعروں میں ڈھالا ہے لیکن روایت سے انحراف کرتے ہوئے انہوں نے وحدت الوجود کے نظریے پر سوال بھی اٹھائے ہیں ،اسی کو بعد میں اقبالؔ نے اجمال سے تفصیل کی طرف بڑھتے ہوئے وحدت الشہود کے فروغ کے لیے، خودی، تصورِ زمان ومکان اور عشق اور مردِ مومن جیسے تصورات کو منفرد انداز میں پیش کیا (تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے) یہاں پر صرف کلاسیکل اور جدید شعرا کے غزلیہ کلام سے مثالیں پیش ہیں جن سے غزل کا صوفیانہ مزاج سمجھ میں آ سکتا ہے:

(میر تقی میرؔ)

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر　　دِل صاف ہو ترا، تو ہے آئینہ خانہ کیا ؟
صوفیوں کو وجد میں لاتا ہے ، نغمہ ساز کا　　شبہہ ہو جاتا ہے، پردے سے تری آواز کا
روح ، قالِب ہَے جدا کرتا ہے، قالِب روح سے　　ایک ادنا سا کرشمہ ہے یہ تیرے ناز کا
فصلِ کل ہے ، لوٹیے کیفیتِ مَے خانہ آج　　دَولتِ ساقی سے مالا مال ہَے ، پیمانہ آج

(آتشؔ)

دیکھیں گئے مومن ! یہ ہم ایمانِ بالغیب آپ کا　　اس بتِ پردہ نشیں نے جلوہ ، گر دکھلا دیا
اتنی کدورت اشک میں ، حیراں ہوں ، کیا کہوں ؟　　دریا میں ہے سراب ؟ کہ دریا سراب میں
اے حشر ! جلد کر تہہ و بالا جہان کو　　یوں کچھ نہ ہو، امید تو ہے اِنقلاب میں
مومن ! یہ عالم اس صنمِ جاں فزا کا ہے　　دِل لگ گیا جہانِ سرا سر خراب میں

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض غزل گو شعر، اشاعر ہونے کے ساتھ ساتھ صوفی بھی تھے اور بعض شاعر تو تھے لیکن وہ عملی صوفی نہیں تھے اس کے باوجود ان کی غزل میں تصوف کے مطالعہ کا نچوڑ یا غزل میں صوفیانہ مزاج موجود ہے۔ دراصل تصوف تو احسان کا نام ہے، جس میں باری تعالیٰ کی عبادت مخلص اور بہ تمام وکمال دل کی حضوری کے ساتھ ادا کرنے کا نام ہے، بعد میں عجمی تصوف کی کارفرمائی نے تصوف کو فلسفہ بنا دیا، اس خالص تصوف میں ایرانی اور ویدانتی عناصر شامل ہو گئے جس کے سبب باری تعالیٰ کے

وجوداوراس کی صفات کومختلف مجازی لفظیات وتعبیرات اورترکیبات میں پیش کیا گیا،عشقِ مجازی کوعشقِ حقیقی کا زینہ قرار دیا گیا،شراب کوشرابِ معرفت اور نشے کوعرفان کا مظہر کہا گیا،زلف،رخسار،آئینہ،دل، مہ، میخانہ،ساقی اور گیسوے تابدار وغیرہ کو باری تعالیٰ کی مختلف صفات اور سالک کی گوناگوں کیفیات سے تعبیر کیا۔حق یہ ہے کہ انہیں متصوفانہ تعبیروں،ترکیبوں اوراصطلاحوں کے سبب اردوغزل کی معانی اور تخیل میں علوئیت پیدا ہوئی ہے۔



اردو کے صوفی غزل گو شعراء

ڈاکٹر نذرین فاطمہ
بندہ یونیورسٹی فار ایگریکلچر اینڈ ٹکنالوجی

شاعری کی اصطلاح میں غزل اس صنف سخن کو کہتے ہیں جس میں مختلف مضامین مسلسل یا غیر مسلسل طور پر بیان کیے جائیں ۔اس میں حسن و عشق ،فلسفہ،تصوف، معرفت الٰہی ،روحانیت ، مذہب ،سماجیات ،اخلاقیات اور اصلاحی صلاحیت غرض زندگی سے متعلق ہر طرح کے خیالات اور مسائل کا بیان موجود ہے۔

تصوف ایک ایسا علم ہے جو خالق و مخلوق کے مابین کے حجابات کو اٹھا دیتا ہے اور عبد کو معبود کا جلوہ دکھا کر فنا فی اللہ کے درجے تک پہنچا دیتا ہے اور اس کا قلب نور الٰہی سے ایسا منور ہو جاتا ہے کہ ''ہمہ اوست'' کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ یہی وہ جذبہء عشق الٰہی ہوتا ہے جس کی بنا پر کائنات کی ہر شے میں اسے جلوۂ معبود دکھائی دیتا ہے،اور اسی بنا پر رنگ و نسل ،قوم و مذہب اور ذات و پات کی تفریق سے بالاتر ہو کر وہ انسان دوستی اور انسانی محبت کی راہ اختیار کرتا ہے،محبت کی تعلیم دیتا ہے اور عشق حقیق کا سبق پڑھاتا ہے۔

فارسی شاعری کے اثرات صوفیائے اکرام کے ذریعہ ہندوستان تک پہونچی ،اور شروع سے ہی موزوں طبع صوفیائے اکرام نے شعر کو بھی اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔خواجہ معین الدین چشتیؒ اور ان کے سلسلہ کے خلفا اور مریدین نے اس عمل کو جاری رکھا۔سلطان التارکین ،صوفی حمید الدین ناگوریؒ خلیفہ ثانی خواجہ معین الدین چشتی اور حضرت بابا فرید جیسی شخصیات کا کلام تو تصوف کا خزانہ ہے۔صوفیاے کرام کے اسی مسلک میں جب ہم حضرت امیر خسرو مرید خاص خواجہ نظام الدین اولیاء تک پہونچتے ہیں تو عشق الٰہی اور تصوف کے اثرات فارسی شاعری سے اردو شاعری کی جانب منتقل ہوتے نظر آنے لگتے ہیں، چنانچہ دکن میں جب دکنی زبان کے نام سے اردو شاعری نے آنکھ کھولی تو صوفیائے کرام کی سرپرستی کا اس کو شرف حاصل ہوا ۔دکنی زبان میں تصوف کے منظوم رسائل مرتب کیے جانے لگے۔ اگرچہ والیان دکن بالخصوص گولکنڈہ کے قطب شاہی اور بیجاپور کے عادل شاہی حکمرانوں کے درباروں میں اردو شاعری عشق حقیقی کی عکاسی سے بھٹکنے لگی تھی،مگر وہاں بیشتر شعراء کے کلام پر تصوف کا رنگ چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ان میں ایسے شعراء بھی شامل تھے جو عملی طور پر طریقت کے کسی نہ کسی مسلک سے وابستہ تھے۔

شمالی ہند میں ولی دکنی کو اردو شاعری کا بابا آدم کہا جاتا ہے ،ولی نے برسوں خانقاہوں سے درسِ معرفت حاصل کیا اور شاہ گلشن سے مرید بھی تھے،لہٰذا تصوف سے ان کا گہرا لگاؤ تھا۔ولی ایک عہد ساز

شاعر تھے جنھوں نے امکانات کے وسیع راستے ،اپنے بعد میں آنے والے شعراء کے سامنے کھول دیے جس میں عشق کی اعلی اقدار اور پاکیزگی و معصومت ملتی ہے۔ وہ فلسفہء وحدت الوجود کے قائل تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ کائنات میں اللہ کی ذات اصل ہے باقی سب اس کی پرچھائیاں ہیں۔ بطور مثال چند اشعار ملاحظہ ہوں:

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا
شغل بہتر ہے عشق بازی کا کیا حقیقی و کیا مجازی کا

محمد حسین آزاد ولی سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

''ایک زبان کو دوسری سے ایسا بے معلوم جوڑ لگایا کہ آج تک زمانے کئی پلٹے کھائے مگر پیوند میں جنبش نہیں آئی۔'' (آب حیات، محمد حسین آزاد)

میر تقی میر کا شمار اردو کے صف اول کے صوفی شعراء میں کیا جاتا ہے۔ ان کو عشق و تصوف ورثے میں ملا تھا۔ انھیں شروع سے ہی لذت دنیا سے بے نیاز اور عشق مولا میں سرمست ہونے کی تعلیم ملی۔ ان کی صوفیت کا عکس ان کی زندگی میں صاف نظر آتا ہے۔ میر کے شعری جواہرات میں توحید، جبر و قدر، معرفت وغیرہ تصوف کے مختلف مسائل ایک کامل صوفی کی طرح ادا کیے ہیں۔ بطور مثال کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

خوش رہا جب تلک جیتا رہا میر معلوم ہے قلندر تھا
شکر کیا اس کی کریمی کا ادا بندے سے ہو ایسی اک ناچیز مشت خاک کو انساں کیا

امیر مینائی کا تعلق ایک صوفی بزرگ شاہ مینا کے خاندان سے تھا۔ تصوف کی نسبت کے سبب امیر کی غزلوں میں تصوف اور اخلاقی مضامین کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

مشرب صلح کل ہے اے زاہد دیر میں بھی حرم کا سایہ ہے

محسن کاکوروی کا زیادہ تر حصہ نعتیہ کلام غزلوں کی شکل میں ہے ان کی نعتوں میں غزل کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ انھوں نے خواب میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بھی حاصل کی۔ لہٰذا بچپن سے لے کر اپنی تمام عمر شاعرانہ صلاحیتوں کو محبت رسول میں صرف کر دیا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

ہے تمنا نہ رہے نعت سے تیری خالی نہ میرا شعر نہ قطعہ نہ قصیدہ نہ غزل

اسداللہ خان غالب کے یہاں فکر و فن کا امتزاج مثالی ہے۔ فلسفہ و تصوف ان کی رگ و پے میں ہے۔ غالب تصوف میں وحدت الوجود کے نظریے سے وابستہ تھے۔ وہ مذہبی تنگ نظری اور تعصب کے

شکار نہیں تھے۔انھوں نے تصوف کو صرف مابعد الطبیعاتی عقیدے کے طور پر ہی نہیں اپنایا تھا، بلکہ اسے اخلاقی برتاؤ اور انسانی دوستی کا مظہر سمجھتے تھے۔ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بیگانگی خلق سے بے دل نہ ہو غالب کوئی نہیں تیرا تو میری جان خدا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

آل احمد سرور غالب کی شاعری سے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''غالب کے یہاں ایک پیگن (PAGAN) لہر ہے جو وحدت الوجود کے نظریے میں آسودگی پاتی ہے، مگر اپنے دور میں عام مزاج کے خلاف ارضیت، روایت شکنی، آزادی ذہن اور تشکیک کی علمبرداری کرتے ہیں۔(''رسالہ سہ ماہی،''ادیب''مضمون پروفیسر آل احمد سرور، ص ۲۱، شمارہ ۳۔۴، ۱۹۹۲ء)

اقبال سے پہلے اردو غزل نا امیدیوں اور مایوسیوں کی آماج گاہ بنی ہوئی تھی ،اقبال نے اسے امیدوں اور امنگوں کی جولان گاہ بنا دیا۔اقبال نے غزل کو قوم کی مسیحائی کے لیے استعمال کیا۔ان کی شاعری کا لہجہ ایسا بلند آہنگ ہے کہ اس میں ندائے آسمانی کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ان کے یہاں عشق حقیقی کی مثالیں جا بجا موجود ہے۔بطور مثال ملاحظہ ہو:

خدائے ذات مولا ہوں ،شہید عشق احمد ہوں فنا میں کس لیے ہوتا، قضا کیوں کر مجھے آتی

آخری دور کے کلام میں اصغر گونڈوی کی صحبت کے اثر اور ترک مے نوشی کے بعد ان کے کلام پر تصوف کا رنگ چھا گیا تھا۔مثال کے طور پر ایک شعر ملاحظہ ہو:

اے رحمت تمام میری ہر خطا معاف میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا

حسرت موہانی کا شمار دور جدید کے صوفی شعراء میں کیا جا سکتا ہے۔انھوں نے اردو غزل کو نئی زندگی عطا کی ۔وہ خالص غزل کے بے باک شاعر ہیں ۔ان کے یہاں عشق مجازی اپنی تمام وارداتوں اور دلکشیوں کے ساتھ موجود ہے اور عشق حقیقی کی پاکیزگی بھی کیف و سرور کی خوشبو بکھیرتی نظر آتی ہے۔ان کی شاعری میں سادگی اور درویشانہ مشرفیت تھی۔وہ لکھتے ہیں:

سیہ کار تھے با صفا ہو گئے ہم تیرے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم
فنا ہو کر راہ محبت میں حسرت سزا وار خلد بقا ہو گئے ہم

اصغر گونڈوی خوش اخلاق انسان تھے۔ان کی زندگی میں مذہبیت کی بڑی لطیف شان ،تصوف کی روحانی سرشاری نے مزاج میں شگفتگی، زندہ دلی اور رنگینی پیدا کر دی تھی۔تصوف سے ان کا گہرا تعلق تھا۔

تصوف اور فلسفہ کے مضامین کو بڑے وصف اور شاندار پیرائے میں فرماتے ہیں:

اصغؔر نشاط روح کا ایک کھل گیا چمن جنبش ہوئی جو خامۂ رنگیں نگار کو

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز کے اس دور میں اردو غزل جب کہ تصوف کی گہرائی، عشق کا سوز واثر، مضامین کی وسعت، معنی کی کثرت اور خیال کی آرائی سے خالی نظر آتی ہے۔ آسؔی کی شاعری اور ان کے نرالے انداز تغزل سے اردو شاعری ''غزل میر'' کے رتبہ کو پہنچ جاتی ہے۔

مثال کے لیے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

ان آنکھوں کو جب سے بصارت ملی ہے سوا تیرے کچھ میں نے دیکھا نہیں ہے

ہوں گناہ گار مگر حسرت دیدا رنہ پوچھ جلوہ تیرا ہو تو دوزخ بھی ہے جنت مجھ کو

اعلیٰ حضرت احمد رضاؔ خان نے اردو کی تمام شعری اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلام میں زیادہ تر تغزل کا رنگ نظر آتا ہے۔ اعلیٰ حضرت امام اہل سنت، شاعری میں یکتائے روزگار اور امام وقت ہیں۔ آپ کی شاعری میں جہاں عشق کی وارفتگی اور سرمستی ہے، وہیں ایمان کی حلاوت اور مٹھاس، ادب و احترام کے تمام لوازمات بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری عشق حقیقی کے جام سے لبریز نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں شاعری برائے شاعری کی جگہ شاعری برائے عبادت کی مثالیں جا بجا موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے چند اشعار ملاحظہ ہو:

جس کو اس کے مکاں کا پتہ مل گیا بے نشاں، بے نشاں، بے نشاں ہو گیا

ہم ہیں ان کے وہ ہیں تیرے تو ہوئے ہم تیرے اس سے بڑھ کر تیری سمت اور وسیلہ کیا ہے

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب ہم اردو کی متصوفانہ غزل گوئی کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح تصوف شریعت کے بغیر نامکمل ہے، ٹھیک اسی طرح ہمارے ادب میں بھی غزل اپنے تخیل میں تصوف کی پاکیزگی، عشق حقیقی کے بغیر نہ صرف ادھوری ہے بلکہ خام خیالی ہے، عشق مجازی باوجود اپنی تمام تر ظاہری دل بستگیوں کے تخیل میں گہرائی اور وہ مواد فراہم نہیں کر سکتا جو عشق حقیقی کا خاصہ ہے۔ بیان میں مجازیت کے ساتھ اگر حقیقت نہ ہو تو شعریت لطف سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس لیے اگر خانقاہی سلسلہ کے صوفی شعراء کو نظر انداز کر دیا جائے۔ انھیں اردو ادب کی تاریخ میں شامل نہیں کیا جائے تو یہ ادب کا نقصان ہے، کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ ان شعراء نے اردو شاعری کو تصوف کے خزانے سے مالا مال کیا ہے، اور بالخصوص اردو غزل پر تصوف کے گہرے اثرات نقش کیے ہیں۔ ❁❁❁

ولؔی کی شاعری میں تصوف

ڈاکٹر شیخ عمران

وسنت راؤنا یک گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز، ناگپور مہاراشٹر

ولؔی کو اردو شاعری میں بڑا اونچا مقام و مرتبہ حاصل ہے جس کے وہ حقدار ہیں۔ ولؔی ایک حسن پرست شخصیت کے حامل تھے۔ اؔن کی شاعری کا بیشتر حصہ مشاہدہ و محسوسات پر مشتمل ہے۔ ولؔی نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اس کا راست اظہار اپنی غزلوں میں کیا ہے۔ ولؔی کے کلام میں جو اجتہادی شان پیدا ہوئی اس نے انہیں ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا کہ لوگ انہیں اردو شاعری کا باوائے آدم کہنے لگے۔ اردو غزل میں جہاں ولؔی کی انفرادیت کا سوال ہے تو انہوں نے تصوف و فلسفہ جمال کے ذریعے اردو غزل کو ایک نئے رنگ و آہنگ سے روشناس کرایا ہے۔ ولؔی دکنی اپنی شاعری میں جہاں عشق مجازی کی بہترین عکاسی کی ، وہیں عشق حقیقی کے دامن کو بھی تھامے رکھا۔ ولؔی کی شاعری اسلامی تصوف کے اسرار و رموز سے سرشار ہے۔

تصوف کو معرفت کا علم بھی کہا جاتا ہے۔ تصوف کی اساس تزکیہ نفس اور اطاعت الٰہی پر ہے۔ اطاعت الٰہی کا دوسرا نام شریعت اور عشق و محبت کا دوسرا نام طریقت ہے۔ ادب کو فروغ دینے میں صوفیائے اکرام کا موثر کردار رہا ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی تعلیمات کو عام کرنے اور اپنا پیغام عوام تک پہنچانے کے لیے انہوں نے جس زبان کا دامن تھاما وہ اردو ہی تھی۔ ''تصوف'' اردو شاعری کا اہم موضوع رہا ہے۔ اردو کے کم و بیش سبھی شاعروں نے عشق حقیقی اور عشق مجازی کے پیرائے میں شاعری کی اور شہرت پائی۔

ولؔی دکنی اگرچہ بنیادی طور پر عشق و محبت کے شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں لیکن ہم یہ بات فراموش نہیں کر سکتے ہیں کہ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ تصوف کا ہے۔ ولؔی کا یہ کمال ہے کہ ان کے یہاں تصوف کے مختلف رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انداز بیان شاعرانہ و متصوفانہ ہے۔ ولؔی کے قول و فعل نے یہ ثابت کیا ہے کہ تصوف کی پاکیزگی ہماری زندگی کو بھی پاکیزہ کر سکتی ہے۔ سیدہ جعفر ولؔی کے متعلق لکھتی ہیں:

> ''اتحاد، رواداری اور محبت کا جو درس ولی کو صوفیانہ تعلیمات سے ملا تھا وہ اپنے ہم وطنوں، دوستوں اور رفقاء سے جذباتی لگاؤ اور ذہنی ہم آہنگی کی صورت میں ان کے کلام

میں موجزن نظر آتا ہے۔ ہندوستانی روایات ، ہندوستانی رسوم و رواج ، اساطیر ، مقامی ماحول اور پوری ہندوستانی معاشرت کا پرتو ولی کے اشعار میں واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔'' (ولی دکنی تصوف، انسانیت اور محبت کا شاعر، مرتبہ گوپی چند نارنگ ، ۲۰۰۵ نئی دہلی، ص ۳۹)

ولؔی کے یہاں تصوف میں خشکی و بے کیفی کے بجائے نزہت ، لطافت اور تخیلی رنگینی موجود ہے۔ توحید، عشق رسول ﷺ، قناعت، قلندری، درویشی وغیرہ کا ذکر ولؔی کی شاعری میں جگہ جگہ نظر آتا ہے جس کی روشنی میں ہم ولؔی کی شاعری میں تصوف کے عناصر بخوبی تلاش کر سکتے ہیں۔ ان کے اشعار سے ان کی شخصیت کے پہلو کا اندازہ ہوتا ہے:

الٰہی! رکھ مجھے تو خاک پا اہل معانی کا کہ کھلتا ہے اسی صحبت سے نسخہ نکتہ دانی کا

ولؔی کے یہاں عشق اور تصوف ایک دوسرے سے الگ نہیں۔ ان کی متصوفانہ شاعری میں نظریہ عشق اور عشقیہ شاعری میں تصوف کی چھاپ نظر آتی ہے اور یہی امتزاج ولؔی کو دیگر شاعروں سے ممتاز کرتا ہے۔ جس زمانے میں ولؔی شعر گوئی کی جانب مائل ہوئے وہ تصوف یا بھکتی کا زمانہ تھا۔ ہر طرف صوفیانہ ماحول تھا۔ اس ماحول سے ولؔی بے حد متاثر تھے۔ ولؔی کو تصوف سے گہرا لگاؤ تھا۔ مذہبی گھرانے سے وابستہ ہونے کے باعث اس کے اثرات بھی ولؔی کے یہاں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ولؔی، صاحبِ علم و کمالات تھے۔ ان کے یہاں صبر و قناعت، تصرف و معرفت کے اکثر مضامین ملتے ہیں۔ اس عہد میں تصوف اخلاق و تہذیب کا ایک جز تھا۔ دلی میں ولی دکؔنی کی ملاقات صوفی بزرگ شاہ گلشن سے ہوئی، آپ کی شخصیت و کردار سے ولؔی بے حد متاثر ہوئے۔ ولؔی دکنی کی شاعری عشق مجازی سے عشق حقیقی تک پہنچی ہے۔ اردو کے بہت سے شعرا نے تصوف پر مبنی شاعری کی ہے لیکن ولؔی اس میدان میں دوسروں سے منفرد نظر آتے ہیں۔ ولؔی کی انفرادیت کا اظہار نہ صرف ان کی زبان یا ان کے کلام میں ہوتا ہے بلکہ اس کا اعتراف بعد آنے والی نسلوں نے بھی کیا اور آج بھی ولؔی کی عظمت کا سکّہ رائج ہے۔ ولؔی دکنی کی صوفیانہ شاعری کے متعلق شارب ردلوی لکھتے ہیں:

''بحیثیت ایک صوفی شاعر ولؔی ایک خاص اہمیت کے مالک ہیں۔ اس زمانے کے مزاج میں تصوف رچا بسا ہوا تھا۔ اخلاق اور فکر پر وہی چھایا ہوا تھا، تصوف میں علمیت اور بلند مذاقی کا معیار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ولؔی نے بڑی خوبی اور کامیابی کے ساتھ تصوف کے مسائل کو اشعار کا جامہ پہنایا ہے۔ ان کے صوفیانہ خیالات صرف غزل کے اشعار تک ہی

محدود نہیں بلکہ مثنویوں میں بھی اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔'' (مطالعہ ولی، ڈاکٹر شارب ردلوی، ۱۹۷۲ء دہلی، ص۔۴۵)

اپنی شاعری میں ولؔی نے جگہ جگہ فلسفیانہ خیالات، تصوف کی باریکیوں اور حیات و کائنات کے رموز کی طرف اشارے کیے ہیں۔ان کی نگاہ میں عشق ایک عجیب فن ہے جس کا سمجھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ولؔی کو یہ ملکہ حاصل ہے کہ وہ صاف اور واضح انداز میں کہنے سے گریز کرتے ہیں۔رمز و ایما کے پردے میں وہ بہت کچھ کہہ جاتے ہیں جس کے لیے دقت نظری درکار ہے:

عارفاں پر ہمیشہ روشن ہے کہ فن عاشقی عجیب فن ہے

اردو کے بیشتر شاعروں نے ایک شہر سے دوسرے شہر ہجرت کی۔جیسے غالبؔ کو معاشی حالات کی بہتری کے لیے سفر کلکتہ کرنا پڑا۔اسی طرح میرؔ کو ان کے حالات نے مجبور کیا کہ وہ آگرہ سے دہلی اور پھر دہلی سے لکھنو جائیں۔ولؔی ان سے منفرد ہیں ولؔی کا سفرِ گجرات ایک الگ اہمیت کا حامل تھا۔جب وہ عنفوان شباب کو پہنچے تو گجرات کا سفر کیا۔حصولِ علم کے لیے اسلامی نظریے کہ مطابق وہ دور دراز علاقوں کا سفر کے قائل تھے۔جب وہ گجرات پہنچے تو وہاں کی فضاء سے بے حد متاثر ہوئے، اس فضاء نے ولؔی کا دل موہ لیا۔وہاں جس شخصیت سے ولؔی نے فیض حاصل کیا وہ حضرت شاہ نور الدینؒ ہیں۔ولؔی نے آپ کی نگرانی میں تصوف کے متعلق علم حاصل کیا، حضرت شاہ نور الدینؒ کے فیض نے ولؔی کی دنیا بدل دی۔نہ صرف وہ یہاں علم کی دولت سے مالا مال ہوئے بلکہ انھیں احساسِ تحفظ بھی پیدا ہوا۔

ولؔی کی شاعری کا مجموعی جائزہ لینے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ ولؔی کی شاعری تصوف سے لبریز ہے۔ولؔی نے جس انداز سے تصوف کو اپنی شاعری میں برتا وہ قابل تقلید ہے۔اردو میں صوفیانہ شاعری کی بنیاد کو مستحکم کرنے میں ولؔی دکنی کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔



''سکھ انجن'': عارفانہ خیالات کی حامل مثنوی

ڈاکٹر نشاط احمد عمری

اسسٹنٹ پروفسر یونورسٹی آف حیدرآباد

سید میراں شاہ ابوالحسن قادری کے نام کے متعلق تذکروں میں کوئی اختلاف نہیں ہے، ''تذکرہ محبوب الزمن''، ''صحیفہ اہل ہدیٰ''، ''مشکوٰۃ النبوۃ'' اور ''تذکرۂ اولیاء بیجاپور'' میں شاہ ابوالحسن قادری کا نام ایک ہی طرح سے تحریر کیا گیا ہے۔ دکن میں اس نام کے بعض اور بزرگ بھی گزرے ہیں۔ قربی ویلوری متوفی ۱۱۸۲ھ کا نام بھی سید شاہ ابوالحسن تھا ''تفصیل المراتب فی المراقب'' کے مصنف کا نام بھی سید ابوالحسن قادری تھا اور ان کا تخلص بھی خاموش تھا۔

شاہ ابوالحسن قادری کا وطن بیدر تھا اور ان کے والد برہان الدین حبیب اللہ تھے۔ شاہ غلام علی نے مشکوۃ النبوۃ میں ان کے والد کا نام عبدالقادر یوسف تحریر کیا ہے۔ شاہ غلام علی نے مکاشفہ قادریہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ سید عبدالقادر ''سبعہ قادریہ'' میں سے تھے انہوں نے ترک وطن کر کے بغداد سے ہندوستان کا رخ کیا تھا اور بیدر جو اس زمانے میں علوم وفنون کا مرکز بنا ہوا تھا پہنچے تھے۔ سید عبدالقادر نے بیدر میں مستقل بود و باش اختیار کر لی تھی۔ ڈاکٹر زور رقم طراز ہیں کہ حبیب اللہ کا شکر بیدر کے سربرآوردہ شیوخ اور علماء میں ہوتا تھا۔ بدرالدین حبیب اللہ نے سرزمین شنگرف بیدر ہی میں زندگی گذاری اور یہیں آسودہ خاک ہوئے۔ ابوالحسن قادری کا سلسلہ ندب بارہ واسطوں سے سید عبدالقادر جیلانی تک پہنچتا ہے۔ حبیب اللہ کے تین صاحبزادے تھے بڑے صاحبزادے شاہ ابوالحسن قادری تھے۔ دوسرے شاہ مصطفٰے قادری کے ساتھ ہجرت کر کے بیجاپور چلے آئے تھے۔ شاہ ابوالحسن قادری کے چھوٹے بھائی شاہ قاسم قادری نے والد کے انتقال کے بعد شمالی ہند کا سفر اختیار کیا تھا کچھ عرصہ بعد جب شاہ قاسم اپنے وطن پہنچے تو معلوم ہوا کہ دونوں ترک وطن کر کے بیجاپور چلے گئے ہیں شاہ قاسم بھی بیجاپور پہنچ گئے اس طرح شاہ ابوالحسن قادری تمام خاندان بیدر سے بیجا منتقل ہوگیا۔ شاہ ابوالحسن قادری کے خانوادے نے دکن میں تعلیم وتلقین کا جو کام انجام دیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔

شاہ ابوالحسن قادری کے پانچ فرزند تھے اور سب ہی علوم ظاہری و باطنی سے بہرہ مند تھے پانچوں بیٹے اپنے والد کے مرید اور خلیفہ تھے اور ابوالحسن کی طرح ہمیشہ ذکر و شغل میں مصروف رہا کرتے تھے۔ان پانچوں صاحبزادوں کی اولاد بیجاپور کنکال، مدکل اور تالی کوٹ میں آج بھی موجود ہے۔بیجاپور کے بلند پایہ علماء و مشائخین میں شاہ ابوالحسن کا شمار ہوتا تھا۔وہ بڑے متقی اور شریعت کے پابند انسان تھے۔انہوں نے اپنے والد سے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔بچپن ہی سے وہ مشائخ دین اور علمائے کرام کی صحبتوں سے فیض یاب ہوتے رہے۔شاہ ابوالحسن قادری کی روحانی قوتوں کو جال بخشنے میں پیر محمد لطف اللہ بن شیخ موسیٰ کا اہم رول رہا۔ابوالحسن قادری نے اپنی تمام عمر لوگوں کی رہنمائی و رہبری میں گذار دی۔وہ اپنے روحانی تصرفات اور زہد و تقویٰ کی بنا پر بیجاپور، بیدر اور اطراف و اکناف کے سارے علاقوں میں کافی مقبول و مشہور ہو گئے تھے۔اس وقت بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ سریر آرائے سلطنت تھے۔سید محی الدین صحیفہ اہل ہدیٰ میں رقم طراز ہیں کہ جس نے بھی آپ کی دست بوسی کی وہ مرتبہ ولایت کو پہنچا۔ابوالحسن تارک دنیا عابد تھے۔

شاہ ابوالحسن قادری ۲۴ ربیع الثانی ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ کو اس دار فانی سے کوچ کیا۔مصنف ''صحیفہ اہل ہدیٰ'' سید محی الدین قادری ابن سید محمود قادری نے شاہ ابوالحسن کا سن وفات درج ذیل ابیات میں پیش کیا ہے۔

بوالحسن بود کعبہ مقصود — می نمودند نہ فلک پا بوس
ہادی و رہنمائے عالم شد — از کرامات دو جہاں زرکوس
نقل چوں کرد دار فانی را — ہر دو عالم بماند دو افسوس
گفت ہاتف بوصف تاریخش — زیب پیرائے جنت الفردوس

۱۰۴۵ھ مطابق ۱۶۳۵ء

رمبھا پور میں جو رمبھا دیوی کے نام سے مشہور ہے شاہ ابوالحسن ابدی نیند سو رہے ہیں۔یہ مقام گول گنبد کے جنوب میں واقع ہے اور گول گنبد کی بلندی سے صاف نظر آتا ہے۔

شاہ ابوالحسن قادری کی صرف ایک مثنوی ''سکھ انجن'' یا آنکھ مچانی'' ہے جس کو پروفیسر سیدہ جعفر نے مفصل مقدمے کے ساتھ لطف الدولہ اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتما ۱۹۶۸ء میں شائع کیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی ایک اور نظم ہے جس کا نام ''توصیف'' ہے۔ یہ نظم مختصر ہونے کے باوجود خاصی دلچسپ اور پرکشش ہے۔ محمد اکبرالدین صدیقی نے بعنوان '' کچھ دکنی کلام'' مضمون مشمولہ رسالہ نوائے ادب ممبئی۔ جولائی ۱۹۶۶، میں متعارف کرایا ہے۔ ''توصیف'' میں شاہ ابوالحسن قادری نے محبوب کا سراپا بڑے خوبصورت دلکش پیرائے میں پیش کیا ہے۔ نظم کو حسین تشبیہات اور دلفریب استعاروں نے رنگین اور پرلطف بنا دیا ہے۔ شاہ ابوالحسن کی یہ نظم اپنی اک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اس مناسبت سے بھی یہ نظم ہمارے کلام کلاسیکی ادب کے ذخیرے میں اہمیت کی حامل ہے۔ اس نظم کا آغاز اور اختتام اس طرح سے ہے۔

ابتداء:

اے گلابی رنگ کے گلوں بدن گل رخن، پستہ دہن، گل پیراہن

اختتام:

آلٹکی چال سیں دل کے صحن اے مرے دل کی لگن جیو کے جیون

شاہ ابوالحسن کی متصوفانہ مثنوی ''سکھ انجن'' یا آنکھ مچولی'' دکنی شاعری میں اپنی رمزیاتی اور ایمائی اسلوبکی بنا پر اہمیت کی حامل ہے۔ بقول ڈاکٹر زور یہ مثنوی اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ دکن کی چند قدیم ترین مثنویوں میں سے ہے اور اس کا کوئی اور نسخہ ادارۂ ادبیات اردو کے سوا اب تک کسی اور کتب خانہ میں دستیاب نہیں ہوا ہے۔

کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں ''سکھ انجن'' کے دو نسخے مخزونہ ہیں۔ ایک مخطوطہ نمبر ۵۳۲ ہے جو ۱۱۹۱ء کا مکتوبہ ہے۔ دوسرا مخطوطہ نمبر ۵۳۳، ۱۲۱۰ء کا مکتوبہ ہے یعنی انیس سال بعد تحریر کردہ ہے۔ ۱۱۹۱ء کا مکتوبہ نسخہ اہتمام کے ساتھ نقل ہوا ہے۔ عنوانات اور عربی آیتیں سرخ روشنائی میں لکھی گئی ہیں۔ حاشیہ پر بھی قرآن شریف کی آیتیں، حدیثیں، مثنوی مولانا روم کی ابیات وغیرہ کثرت سے لکھی گئی ہیں۔ یہ

سب متن کی اردو ابیات کی تشریح اور توضیح کے لیئے قلمبند ہوئی ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود مصنف نے اپنے بیانات کی وضاحت کے لیئے حاشیہ لکھا تھا اور کاتب نے اسی کے نسخہ سے نقل کیا ہے۔اس کے رقیمے میں کاتب نے لکھا ہے ''بموجب فرمایش اسد محمد خاں سلمہ اللہ تعالےٰ''۔یہ نسخہ ۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسرا نسخہ جو مکتوبہ ۱۲۱۰ء کا ہے یہ نسخہ زیادہ صاف ہے اور اس میں وہ تمام آیات واحادیث وغیرہ خود متن ہی میں لکھی گئی ہیں۔ جو نسخہ ۵۲۳ میں حاشیہ پر درج ہیں۔اس میں بھی عنوانات اور عربی وفارسی تحریریں سرخ روشنائی میں لکھی گئی ہیں۔ یہ نسخہ ۱۸ اوراق پر مشتمل ہے۔''سکھ انجن'' کی سنہ تصنیف کے متعلق قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا دشوار ہے چوں کہ شاہ ابوالحسن کا انتقال ۱۰۴۵ھ مطابق ۱۶۳۵ء میں ہوا تھا قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ تصنیف ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء یا اس سے قبل کی ہوسکتی ہے۔مثنوی سکھ انجن ۱۴۰۸ ابیات پر مشتمل ہے۔ یہ اعتبار زبان اس میں فارسیت کا غلبہ نہیں ہے بلکہ بھاشا اور سنسکرت کے اثرات نمایاں ہیں۔

سکھ انجن

سید میراں شاہ ابوالحسن قادری اپنی اس مثنوی کو نرم دم گفتگو کے انداز میں شروع کرتے ہیں۔ وہ بڑے اچھے اور سلجھے ہوئے انداز میں ایک کھیل کی طرف دعوت دیتے ہیں۔وہ کھیل ہے ''آنکھ مچانی'' کا یہ کھیل ظاہری حسیات سے کنارہ کش ہوکر باطن پر توجہ کا متقاضی ہوتا ہے اور روحانی عرفان پر اختفام پذیر ہوتا ہے۔

ابوالحسن قادری اس مثنوی کے ذریعے لوگوں کو خاص کر اس کھیل کی طرف دعوت دیتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ کھیلوں میں کوئی ایسا اپناؤ جس سے حقیقی ہدف کو پاسکیں چونکہ یہ کھیل معروفت سے تعلق رکھتا ہے صاحب کتاب اس کھیل کو موضوع بحث بنا کر دراصل تصوف کی طرف دعوت دیتے ہیں کیونکہ تصوف اور اس کھیل کا تعلق بہت رہی ہے۔صاحب کتاب نے تصوف کے لطیف مسائل کو اس کھیل کے پیرائے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہتے ہیں:

آو میرے پیارے کھیلیں آوک ھیلیوں میں کچ کھیل بناؤ

کھیل میں ایسا کھیل ہودے پیاملن کا میل ہودئے
من میں چھُنے جپنے میں دستا ہے اور اپنے میں
چھپنے جپنے کا سو کھیل آنک مچانی کڑوا تیل

سکھ انجم میں شاہ ابوالحسن نے تصوف کے مسائل کو تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے۔ایک انوکھے کھیل آنکھ مچانی سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ جب تک طالب اشیاء کے ظواہر نقش ونگار صورت اور کمیت کے احساس سے اپنی ذات کو ارفع نہ کرے ظرف مکان سے نجات نہ حاصل ل کرے وہ سلوک ومعرفت کے راستے کو نہیں پاسکتا حصول حق تک رسائی کی پہلی شرط نفی ذات ہے اور اس کے لئے ''وذاکر ربک اذانسیت'' کے طور طریقے اپنانا چاہئے۔آنکھ مچانی کا حاصل یہ ہیکہ جب تک ذات عینی سے بے خبر نہ ہوجائیں عالم ملکوت عیاں نہ ہوگا۔شاہ ابولاحسن نے ان لطیف مسائل کو عام بول چال کے انداز میں کھیل کے پیرائے میں یودں بیان کیا ہے۔

کھیل میں ایسا کھیل ہووے پیا ملن کا ملن ہو وے
جس کوں ی کھیل سوجے گا پیو کے مارگ بوجے گا
جس جپنے میں چھپنا ہوئے چھپنا اس کا سپنا ہوئے
چھپنے جپنے کا سو کھیل آنک مچانی کڑوا تیل
آنک مچانی کھیل کھلائے پیو پائے کا میل ملائے

ان اشعار میں ابوالحسن نے بتایا ہے کہ کھیلوں میں ایسے ہونا چاہئے جس میں پیا (معشوق) کا ملن ہو اور جس کسی کو اس کھیل کا خیال آئے گا اور اپنے معشوق تک رسائی حاصل کرلے گا اور جس کے جپنے میں چھپنا ہوئے اس کا چھپنا سپنا ہوئے گا۔اور یہ چپنے جپنے کا کھیل ہے اور یہ کھیل ہیںکھ مچانی۔آگے اس کھیل کی کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ایک انوکھا کھیل ہے اس میں حصہ لینا ہر کسی کے بس کی بات نہیں اس کھیل کی دوسری حوبی یہ ہے کہ اس میں ہم اپنیپ کو دیکھ سکتے ہیں اس طرح اس معشوق کے علامات کا ظہور ہوتا ہے جو اپنے نفس وجان میں مخفی ہے۔یہاں ابوالحسن نے ''وفی انفسکم افلاتبصرون''''

وہومعکم این ماکنتم'' کی طرف توجہ منعطف کرنا چاہتے ہیں کہتے ہیں

یو کھیل نیارا اہے لوگ آپ کوں آپس میں دیکھو
چھوتے موٹھ کھیلن سچ مچہ ہوئے سچ مچہ کھیلیں برائے

جس چیز کو ہم جتنی شدت کے ساتھ چاہتے ہیں اس کا ذکر اتنا ہی کثرت سے کرتے ہیں ''ومن احب شئی اکثر ذکرہ'' اور وصل کی تمنا دل میں لئے رہتے ہیں آنکھ مچانی یا مراقبہ اس کے مترادف ہے۔ اس کی مثال شاہ ابوالحسن یوں بیان کرتے ہیں کہ خواب کی حالت میں انسان اپنے خاکی بدن کے لئے بے خبر ہو جاتا ہے اور مثالی جسم فعلی ہو جاتا ہے۔ یہی حال مراقبے یا آنکھ مچانی کا ہے وہ کہتے ہیں:

من میں جپنے سپنے میں دستاہے اوچھپنے میں

ظاہری آنکھ کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے ''لاتدرکہ الابصار'' مراقبہ میں انسان بصیرت کو بروئے کار لاتا ہے۔ اسے اس سرمے کی ضرورت ہوتی ہے، کہتے ہیں

مراقبے کا انجن ہووے جب تو نیناں اس میں دھوئے
پاوے تب سکھ انجن دوں فرتقب انہم مرتقبوں
سکھ انجن ہو لاؤ نینا سرمہ ہے اوطور سینا
پیو دیکھن کا انجن ہے او دوتن کا دل پچھن ہے او

مراقبے کو صاحب کتاب وصل کی پہلی منزل کردانے ہیں حدیث احسان ''ان تعبداللہ کانک تراہ وان لم تکن تراہ فانہ یراک'' بعض صوفیاء کا یہ نظریہ ہے کہ پہلے حصے میں مشاہدے اور بعد کے حصے میں مراقبے کے رموز ونکات کو بے حجاب کیا گیا ہے۔ دکن کے ایک صوفی شاعر شاہ کمال نے سبعہ صفات کے بارے میں رقمطراز میں:

آٹھ ساتوں لپردے دیکھی پیو کی صورت ہے پن جس کے مانع میں پن جس کی موت

جب تک ''ہے پن'' اور ''میں پن'' کا کیال رہے گا دوئے باقی رہے گی اور عاشق ومعشوق کے درمیان حجاب حائل رہیں گے۔ سات صفات (حیات، علم، ارادہ، سماعت، بصارت اور کلام) جب تک

''دوئی پن'' کا خیال باقی وساری رہے گا۔ وجود مطلق کا وصال نہ ہوگا اور مادیت کے سلاسل سے آزادی نہیں مل سکے گی کہتے ہیں

تن من جیو پیو مل یک ہویں دوئی پن کوں یاں سب کھویں

''التوحیواسقاط الاضافات'' کی حقیقت کو پاسکیں گے جب سالک اس مقام پر فائز ہوتا ہے تو اپنی واردات اور کلام سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر منصور نے انا الحق اور بایزید بسطای نے ''سبحانی ما اعظم شانی'' اور جنید بغدادی نے ''لیس فی جبتی ما سوا اللہ'' کہا تھا عبدالقدوس گنگوہی کہتے ہیں

من نی گویم ان الحق یاری گوید بگو چوں نگو یم چوں مراد لداری گوید بگو

شاہ ابوالحسن نے قرب کی تنا و وصال کا اظہار اس طرح کیا ہے

دیو پیا پیو جیتورے پیوسنگ اپنی مبتورے

میت پیاجب آدے بات رین اندھیری ہوئے بشرات

عرفان کے لئے تین مراتب ہیں پہلا ما سوا اللہٖ سے بصارت ملتفت کر کے سالک ذات مطلق کے تصور میں گم ہو جائے دوسرا یہ کہ مراقبے سے حق کے مشاہدہ کی سعی کرے تیسرا یہ کہ جانفشانی کی راہ اختیار کرے کہتے ہیں:

سونا جپنا مرنا سو تینو پودل دھرنا سو

مرنے آگے کامرنا سو ہے آپس کے سرنا

یہاں مرنے آگے کا مرنا ''مونوا قبل انتموتوا'' سے مستعار لیا گیا ہے۔ صوفیاء کی اصطلاح میں نفس خاکی سے گزرنا شہادت مبداء ہے نفس مثال سے گزرنا شہادت عمدا ہے اس طرح روح سے گزرنا شہادت وجداء ہے اور آخیر میں شہادت شہداء کا مقام ہے جس کے تعلق سے صوفیاء گوش گذار ہیں کہ ''لا رب ولا عبد'' صاحب کتاب اس منزل کا حال اس طرح رقمطراز ہیں کہ:

سالک جب آپہنچے یاں جینا مرنا اس کا واں

یعنی سالک اپنی ذات سے فنا اور وصل حق سے دائم رہ جاتا ہے۔ صاحب کتاب ''آنکھ مچانی'' کو وصل حق کا ذریعہ گردانتے ہیں اس اعلیٰ وارفع مقام و مرتبہ کے تعلق سے عرض کرتے ہیں۔

تب کھیل ایسا جم جاوے ملا اعلیٰ یاں خم کھاوے
مل کھیلیں یوں جھوم پیاسیں سک پاویں ٹک اپنے جیسا میں

صاحب کتاب اپنی اس مختصر مثنوی میں اپنی صوفیانہ تصورات کی طرف توجہ دلائی ہے مثال کے طور پر یہ نکتہ کہ سالک اپنے سفر کا آغاز حدود شریعت سے کرتا ہے پھر طریقت پھر حقیقت پھر معرفت کی منزلیں فے کرتا ہوا راہ توحید کا پتہ لگاتا ہے منزل وحدت تک رسائی کے لئے ناسوت، ملکوت، جبروت اور لاہوت سے گذرتا ہے۔ دکنی صوفیاء نے اس تفصیلی بحث کو احتصاراً یوں بیان کیا ہے کہ پانچ راستے چار منزل اور ایک مقام مذکور ماسبق چار منزل کے بارے میں صاحب مثنوی رقم طراز ہیں:

چاروں حسب پیودیوے ہات کڑوا ہو رہے سب نبات

اہل تصوف تمام کائنات کہ آثار اللہ سمجھتے ہیں مجاز سے حقیقت تک رسائی کے مختلف درجات کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ سالک اثر سے نظر ملتفت کرے اور فعل پر مرکوز کرے اس قسم سے صفت تک رسائی حاصل کریاور پھر وجود مطلق کی طرف رجوع ہوا اہل تصوف کی اصطلاح میں یہ ''عرج'' کہلاتا ہے اس قسم سے ذات سے اثر تک رسائی ''نزول'' کہلاتی ہے صاحب مثنوی اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ:

عروج نزول میں بار پارکر ایسی نت مہم سار پار کر

شاہ ابوالحسن وحدت الوجود کے حامی ہیں اور کہتے ہیں کہ تمام مظاہر قدرت میں ذات واجب الوجود موجود ہے وہی تمام چیزوں میں جاری وساری ہے وہ اس نظریہ کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

آپی کھیل ہو کھیل مچایا دای کے ہاتھوں آنکھ مچایا
آپی پھولپاں ہوکر آیا اپنے سر پرآپ چڑھایا

صوفیائے کرام نے ذکر حق کے دو مناھج پر اپنا زور صرف کیا ہے پہلا ''مقید'' اور دوسرا ''مطلق''، مقید میں اسم کا ذکر ہوتا ہے جب کہ مطلق میں ''یافت سمیٰ'' کا خیال مقصود ہوتا ہے جیسے حق سے حق پہچانا جاتا ہے جیسا کہ حدیث رسول میں منقول ہے ''عرفت ربی بربی'' اس مثنوی میں اسم کے ذکر کی تلقین ہے اور کلمۂ ''کن'' کے تعلق سے وہ کہتے ہیں:

ازل میں کاں تھا کہ توں دیر کن والست بن نئیں تھا غیر

کلمہ اس دن تھا موجو د بولن ہارا خود معبود

شاہ ابوالحسن کہتے ہیں کہ تمام مخلوقات علم حق میں تھے اور علم الہیہ وصور علمیہ ثابت تھے اس وقت تمام کائنات عدم میں تھی اور حکم رب کن سے عدم سے وجود میں آئے وہ کہتے ہیں:

ان نے بولیا ہے یولا ہست ہوا ہے ادیاں آ
ایسی ہستی کو نیست نہ کو مشرک ملحد ہونا رہو

اللہ کی صفت جلال ہے جس کے ذریعے مخلوق ہست سے نیست ہوتی ہے جب کہ اس کی دوسری صفت جمال ہے جس کے ذریعہ مخلوق ہست سے نیست کی طرف گامزن ہوتی ہے۔ اور تمام کائنات ان دوصفات کے درمیان ہے اس مثنوی میں اس مسئلے کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں صاحب مثنوی کہتے ہیں کہ سالک کو صراط مستقیم کی نشاندہی سے کریز کرنا چاہیے۔ حقیقت کی بازیافت اس کا اولین مقصد ہونا چاہئے۔ ایک بوند کی آرزو یہی ہوتی ہے کہ وہ دریا میں گھل مل جائے اس لئے معرفت کے اسرار کی جستجو ضروری ہے جو حقیقت ورموز سے آشنا ہیں ان پر لازم ہے کہ وہ اسرار کی واقفیت کے ذریعے کائنات کی حقیق جانیں قولِ ربانی ہے ''الرحمٰن فسئل بہ خبیرا'' تو ابوالحسن قادری کہتے ہیں:

جانے ہون تے جو جو پیارے ان جانے کو پوچھو پیارے
آنکھ مونچ کر کیوں چلنا راہ پیو کوں کیوں چل ملتا واہ

آیت قرآنی ''ادع الی شبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنہ'' کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ اوروں کو وعظ و نصیحت کے ذریعے حقائق معارف کی طرف مبذول کریں اس نکتہ کو ابولاحسن نے آنکھ مچانی کھیل کے ایک حصے کی تمثیل سے یوں بیان کی ہے:

سکیو ں کوں دے ہانک بلائی چھپورے آؤ چور بلائی

آنکھ مچانی کے کھیل کی طرف دعوت دینا دراصل معرفت صراط مستقیم اور راہِ حق کی طرف لوگوں کو بلانا ہے۔

شاہ ابوالحسن نے مثنوی میں آیات احادیث تلمیح حکایات اقوال اور پہیلی بھی شامل ہے۔ جس سے اس کے جمالیاتی ثیر اضافہ ہوگیا ہے، مسائل کی تفہیم کے لئے مولانا روم کے اشعار کی فشریح وتوضیح کی ہے اس طرح حضرت شاہ شرف الدین یحیٰ منیری کے مراسلہ کا اقتباس فقل کیا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق ابو

بکر شبلی اور امام غزالی کے اقوال کے مفعد پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر فیلانی کی حکایت بھی بڑے دلنشین انداز میں تحریر کی ہے۔

درود کے فائدے کے متعلق کہتے ہیں کہ اس سے نفس انسانی پاک، منزہ ہوتا ہے۔ جب کوئی درود پڑھتا ہے تو وہ درود پنچھی بن کر اڑتا ہوا سات آسمان طے کرتا ہے پھر حوض کوثر میں غوطہ لگا کر اڑتا ہے تو اس کے ہر پر سے ایک بوند پانی سے ایک ملک بنتا ہے اور دونوں جہاں میں اس کہ جھلک موجود رہتی ہے۔ محشر کے دن بھی اس کی فھلک موجود رہتی ہے۔ اس بندے کی خاطر جو درود پڑھا اس پر استغفار بھیجتے ہیں اور اس بندے کے گواہ رہتے ہیں۔ ''صلواۃ اللہ علی النبی والہ وسلم'' اس کی برکت کے نور سے سارا عالم عیاں ہوا۔ دیاں شاہ صاحب درود کے معاملے میں غلو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ صحیح احادیث سے ان کے بیان کی توثیق نہیں ہوتی،

جب کوئی کریوں پڑے درود پنکھی ہوکر اوڑے درود
سات آسمانان طے کرجائے کرثر میانے غوطہ کھائے
غوطہ کھا جب پنکھی اڑے ہر پرسیں یک بوند جھڑے
ہر بوند کا یک ملک ہوا دو جگ میانے جھلک ہوا
جھلک آوے روز حشر اوس بندے کی حاطر کر
پڑتے ہیں دو استغفار گورہ بندے کا ہے اخبار
صلاۃ اللہ علی النبی والہ وسلم کہو سب ہی
اس کی برکت ستیں نور عالم پر سب کیا ظہور

دوسری طرف درود پڑھنی میں احتیاط پر تنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر ''صلی علیٰ'' کے ''ص'' کو ''س'' سے پڑھتے ہیں تو اس سے معنی بدل جاتے ہیں اوور صلوۃ بھیجنے کے بجائے شمشیر کھینچنے کے ہوجاتے ہیں اس سے ہم دوزخی بن جاتے ہیں۔ اور ہم کو دوزخ سے دور رہنا چاہے۔ آگے درود کے پڑھنے میں اور احتیاط برتنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر وعلی آل کو والا کہیں گے تو اس سے ہماری جہالت اور لاعلمی ظاہر ہوتی ہے۔

پن یو درود ایسا ہے سب بند گیوں میں ایسا ہے
عجب ریا کا سنیں قید جوں پڑتے تیوں ہے امید
لیکن اس میں دو جاگا مشکل ایسا آلا گا
پڑنے میں توں کافر ہوئے پڑنا سارا اپنا کھوئے
صاد کی جاگا سیں لاتے ابدا دوزخ یوں پاتے
ایسی غلطی پڑنانا دوزخ میں پڑ لڑنا نا
وعلی آل کوں والا کئیں جلد میں پڑکوں بھلاکئیں
علت جائے پن عادت کاں جاتی ہے کو اے بھایاں
تعظیم بدل پڑین علی علی بدل جاہوئے بلا
جلد پڑنے سے لفظ علی ہوجاتاہے حرف ولا
وعلی ولا کو رکھو نکال والہ سلم پڑو سنبال
ہوئے کاتب درود قبول شفیع ہو آئیں گے اے رسول

پھر حضرت بایزید بسطامی کی ایک حکایت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ابلیس اپنے مکروفریب سے خدارسیدہ لوگوں کو بھی گمراہ اور پریشان کرنے کی سعی بسیار کرتا ہے۔اس لئے اس کے جھانسے میں نہیں آنا چاہئے۔

ایک مرتبہ شیطان اپنا سر نیچے کئے کہیں جارہا تھا بایزید نے اس سے سوال کیا کہ تو کون ہے اور کہاں جارہا ہے اس نے جواباً عرض فرمایا کہ میں ایک عاشق ہوں پھر تھوڑی دیر بایزید سے گفتگو کرنے کے بعد اوجھل ہوگیا۔پھر ایک حسین وجمیل کے بھیس میں نمودار ہوا اور زاروقطار رونے لگا بایزید نے اس عورت کو زاروقطار روتے ہوئے دیکھا تو ان کا دل پسیج گیا اور اس کا حال دریافت کیا اس نے کہا اب راستہ طے کرنے کی طاقت نہیں اگر کوئی مجھے میری منزل تک پہنچادے تو میں اس کی شکرگذار رہوں گی۔بایزید نے کہا تو میرے کاندھے پر بیٹھ جا تو اس نے حکم کی تعمیل کی اور اپنی اوڑھنی ان کے منہ میں ڈال کر لگام بنایا ایک لمبی مسافت طے کرنے کے بعد بایزید بسطامی نے اس کے گھر کا پتہ پوچھا تو اس نے کہا یہیں میرا گھر اور میں

عاشقوں کے ساتھ رہتی ہوں اتنا کہہ کر وہ کاندھے سے اتری اور غائب ہوگی۔اس کے بعد شاہ ابوالحسن نے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی حکایت پیش کی ہے۔ایک رات حضرت غوث اعظم عبادت وریاضت میں منہمک تھے ستانے کی غرض سے آپ نے تھوڑی دیر توقف کیا۔اتنے میں شیطان پہنچا نا اور غیب سے آواز نکالا کہ اے میرے عزیز غریب نواز آج تو جس کو طلب کرے گا وہ تجھے مل جائے گی۔حضرت عبدالقادر جیلانی نے لاحول پڑھا اور ابلیس بھاگ گیا صاحب کتاب کہتے ہیں:

بندے ہو گے یاں باتاں سب گذری اس دھاتوں کی شب
ایسے قطب ان کا یو حال بعضوں کا یاں کیا ہے مجال

اس کے بعد صاحب مثنوی اصلی اور نقلی پیروں کا فرق واضح کرتے ہوئے لہتے ہیں کہ آدمی کو مرشد کی تلاش وجستجو کرنی چاہئے تا کہ وہ صراطِ مستقیم پر چل سکے ورنہ وہ لوگ نچلے درجے کے اعمال کے ذریعے طرح طرح کے ڈھونگ وکرتب رچاتے ہوئے لوگوں کو اپنے کرامات کا معتقد بناتے ہیں غالبًا صاحب مثنوی اجے پال جوگی کی طرف اشارہ کیا ہے ابراہیم عادل شاہ اس کا معتقد تھا ابوالحسن کے سمجھانے پر اس کے باز آ گیا تھا اور مذکورہ بالا اشخاس کو وہ بازی گروں سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے سحر سے اجتناب کرنا چاہئے۔

ابوالحسن کہتے ہیں:

ہم سے اس وقت کے پیراں نائب ابلیس کئی پیراں
جاہل ناداں بے پیراں چال اس کی پرنم حیراں
بھاں متی کا کھیلیں کھیل پانی کا کرد کھلائیں تیل
یاہوں جوتش گڑبر کے پل میں گڈری ہوئیں لڑکے
گریہ گاروڑی ہو رکھ بول غیب کے باتاں دیئوں کھول
گاڑوڑی ہو سانپ نچائیں بھنگ پلاکر آنکھ مچائیں
یوچھند ابلیس کے ہیں سب ان کے حق میں وہ ہی اب
گاڑوڑی لنگ نرسو پوجیں سل کے باتاں پل میں بوجیں

امراء کے گرہات پھنسیں گے ڈھنگ گنوابے ڈھنگ دیں گے

پیر کامل سے کلمہ کے حقائق سمجھنے کی دعوے دیتے ہوئے کہتے ہیں:

کلمے میں کئی کل ہیں پیارے اوکل کامل سوں پارے
جب وہ کل تجہ آوے ہات مکھ دکھلائے نفی اثبات
عارف کامل کن جن ہے دل میں ابلیس کی فن ہے

مذکورہ بالا اشعار میں قرآنی آیت ''**ویثبت اللہ الذین امنوا بالقول الثابت فی الحیوۃ الدنیا و فی الآخرۃ'' الم تر کیف ضرب اللہ مثلا کلمۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء توتی اکلھا کل حین باذن ربھاویضرب اللہ الامثال للناس لعلھم یتذکرون.ومثل کلمۃ خبیثۃ کشجرۃ خبیثۃ اجتثت من فوق الارض مالھا من یثبت اللہ الذین امنوا بالقول الثابت فی الحیوۃ الدنیاء والاخرہ** کی طرف اشارہ ہے۔

اس مثنوی کے دوران مطالعہ اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ابوالحسن کے پیش نظر وہ معتقدین اور مریدین بھی تھے جن کی مذہبی معلومات وسیع نہیں تھیں کلمہ طیبہ کا مقام واہمیت درعد کی قدر ومنزلت اور ذکر کی خوبیاں وفوائد کا بیان وہ اس طریقے سے کرتے ہیں کہ معمولی پڑھا لکھا بھی اس کے معنی کی پنہایوں کو پاسکے پھر آگے کہتے ہیں کہ اگر تم لوگ بھی حق کی باتیں سننا اور آنکھ مچولی کا کھیل کھیلنا چاہو تو ابوالحسن کو یاد کرلو کیونکہ وہ اس کھیل کا نابغہ روزگار ہے وہ تمہاری بہت اچھی فہبری کرے گا۔

جھوم کھیل جب کھلاؤ پیارء ابو الحسن کو بلاؤ پیارے
خم کھا جھومر کھیلیں او رحمت تجھ پر ریلیں او
مل کھیلیں یوں کھوم پیاس سک پائیں ٹک اپنے جیا میں

ابوالحسن فرماتے ہیں کہ آنکھ مچانی کھلنے کے لئے ''سکھ انجن'' کا مطالعہ بے حد ضروری ہے یہ دکھ انجن چشم کے لئے سرمہ طور سے کچھ کم نہیں اس لئے کہ اس کے پڑھنے سے حق معرفت کے رموز واسرار عیاں ہوتے ہیں اور مطالعہ کرنے والے کو بصیرت کا نور عطا کرتا ہے۔

سکھ انجن یولاؤ نینا سرمہ ہے اوطور سینا

پیو دیکھن کا انجن ہے او دوتن کا دل پچھن ہے او

صاحب تصنیف اپنی مثنوی کو مستحکم کرنے کے لئے جابجا مذہبی تلمیحات، قرآنی آیات، احادیث رسول اور صحابہ کے اقوال اور تصوف کے میدان کے شاہسوار علماء کے اقوال وغیرہ کو بڑے اچھے اور برجستگیسے پیش کی ہے۔قرآن کے وہ آیات جن سے صاحب مثنوی نے استفادہ کیا ہے ۔

۱ .**فسئلو اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون**

جانے ہوں تو بوجو پیارے ان جانے تو پوچھو پیارے

۲۔نحن اقرب الیہ من حبل الورید کی تفسیر میں ابوالحسن کہتے ہیں:

پیر شہ رگ تے پیو ہے پیو کوں پاتا سوجیو ہے

جو پیو پائے جیپنے میں جیپنا پیئو کوں اپنے میں

۳۔اللہ نور السموات والارض مثل نورہ کمشکوٰۃ فیھا مصباح المصباح فی زجاجۃ الزجاجۃ وکانھا کوکب دری یوقد من شجر مبٰرکۃ زیتونۃ لاشرقیہ ولاغربیہیکا دزیتھا یضیئ ولولم تمسہ نارنور علیٰ نور یھدی اللہ لنورہ من یشاء ویضرب اللہ الامثال للناس واللہ بکل شئ علیم کی تفسیر میں ابوالحسن کہتے ہیں:

قبل کیا ہے سوسن سے رہے لعل گوہر سب چن کے رے

نور پنے کے شیشے میں تھا وحدت میں عزت سیں

جب او شیشہ زیتوں پر قدرت سے وہاں تھا ادھر

اوس سیں نوراں ٹپکے جائیں جو جاگے سوا سماکوں پائیں

ہر بندے پر نازل ہوئے جو کوئی پچھلی رات نہ سوئے

لا لا اون کے سراونڈ لیں و نوراں آنکھوں کوں موندیں

۴. **یاایھا الذین امنو التقواللہ و کونوا مع الصدقین** کی تفسیر میں ابوالحسن یوں فرماتے ہیں:

جب کہیں اون کی صحبت میں بیٹھے گا تو فرصت میں

باتاں سارے گن لئیو فعلاں سارے چن لئیو

قال اللہ یا قال رسول ہووے اوس مجلس میں قبول

۵ .**فتمنو الموت ان کنتم صادقین** کی تفسیر میں ابوالحسن کہتے ہیں:

زندگی کے دن سب گے رے اب تو مرنا یو ہے رے
گورے سرکا باگ گیا جوں کالے سرکا ناگ آیا یوں
یعنی دن گئے زندگی کے سب رات آئی ہے مرنے کی اب
کرو بھلائی بھلے ہو جیئو پیو کے ہاتوں مد بھر پیو

وہ احادیث جنہیں صاحب تصنیف نے اپنی مثنوی میں استعمال کیا ہے مثلا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب'' اس حدیث کو ابوالحسن نے اس طرح بیان کی ہے

آنکھ مونچ آنا کڑوا ہے پیو کی راہ کا نڈوا ہے
سونا جپنا مرنا سو تینو پودل دھرنا سو

دوسری حدیث: النوم اخت الموت'' اس حدیث کو اطوالحسن نے اس طرح استعمال کیا ہے۔

نیند تو موت کی ہے ہو بھان ناحق سے جاوے گی پران

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا قول: مارایت شیئا الا ورایت اللہ فیہ کو صاحب مثنوی نے اس طرح کہا ہے:

ہر یک نفی سیں لے اثبات ہرئیں میں او ہے تیوں بول

شیخ ابوبکر شبلی کا قول: **صیانت العاب من زویہ الغیر شرک لان الغیر این نفی الغیر اثبات الکفر و اثبات الغیر محض العرفان**، کو ابوالحسن نے اس طرح کہا ہے:

نفی کو نفی نہیں کہنا اثبات نفی میں لے رہنا
نفی سو نفی ہے نفی نفی جو کوئی نفی کی اوہی نفی

امام غزالی نے ''مختصر احیائی علوم کا ایک اقتباس ہے '' **لا یجری علی تسان اھل التحقیق اربع کلمات عنی و عندی ولی ولنا انت لا انا و لا غیر**'' کی طرف ابوالحسن نے اشارہ اس طرح کیا ہے

یوں ہو رہے بن عارف نہیں نار ہے گایاں تو ہوا میں

تلمیح:

ایک رات حضرت بایزید بسطامی نے دودھ نوش فرمایا تھا جس کی بنا پر انہیں پیٹ میں درد لاحق ہوا

لوگوں مے ان سے دریافت کیا ماجرا کیا ہے تو انہوں نے کہا دودھ پینے کی وجہ سے پیٹ میں درد ہوا حالانکہ انہیں کہنا چاہئے تھا بلکہ انہیں یہ کہنا تھا کہ ''اللہ کے حکم سے ایسا ہوا''، اس واقعے کی طرف ابوالحسن اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

دیاندا یوں ذو المنن اذکر لیلۃ اللبن
یعنی جب اب دود پیا کر یاد اس میں شرک کیا

لوگاں بس یوں بول اوٹھیا دود پینے سے پیٹ چھٹیا
یو شرک نہیں ہے کیا بول یو کہیا تھا غازت غول
با یزید سن یو افسوس کھایئے شرمندگی میں سیس نوایئے

ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی تصنیف تاریخ ادب جلد اول میں مثنوی ''سکھ انجن'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''شاہ ابوالحسن قادری کی مثنوی سکھ انجن میں کوئی بات نہیں ہے جو اس دور میں موضوع یا اسلوب کے اعتبار سے انہیں ممتاز کوتی ہو''

ڈاکٹر جمیل جالبی کے بیان سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ انہوں نے شاہ ابوالحسن کی ''سکھ انجن'' کا طایرانہ مطالعہ کیا ہے۔ حالانکہ شاہ ابوالحسن قادری نے اس مثنوی کے ذریعہ یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس طرح بچے آنکھ مچانی کے کھیل میں آنکھیں بند کر کے اپنے اطراف و اکناف سے بے خبر ہو جاتے ہیں اسی طرح طالب کو اپنی مقصد برآری کے یعنی قرب الٰہی کے حصول کے لئے تمام مادی علایئق سے خود کو منقطع کر لینا ہوگا۔ لہذا اسی مقصد براری اور قرب الٰہی کے عوامل شاعر نے اس مثنوی میں نظمایئے ہیں اور تصوف کے اسرار و اغراض کو آنکھ مچولی کے کھیل کے ذریعہ سمجھانے کا نیا انداز اپنایا ہے۔ یہ مثنوی دکنی ادب کے سرمایے میں اپنے رمزیہ اور علامتی اسلوب، اپنی عمیق معنویت، ایمائیت اور اچھوتے طرز کی بنا پر غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔

۱) سخاوت مرزا (مضمون) مشمولہ رسالہ اردو ادب۔ شمارہ: ۳۔ ۱۹۶۵ء۔ ص ۵
۲) نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو۔ ص ۲۶۷
۳) سیدہ جعفر، پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر تاریخ ادب اردو جلد دوم۔ ص ۴۲۴ بحوالہ عبدالمجید صقی۔ مقدمہ تاریخ دکن۔ ص ۸۳

۴) عبدلاقادرسروری،علی گڑھ تاریخ ادب اردو،تیسرا باب،ص ۱۸۵
۵) بھوگ ہل مخطوطہ نمبر ۴۳۱،مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ۔ص ۶
۶) سیدہ جعفر، پروفیسر گیان چندجین، پروفیسر تاریخ ادب اردو جلد دوم۔ص ۴۲۵ بحوالہ نصیر الدین ہاشمی دکن میں اردو۔ص ۶۲۷
۷) سخاوت مرزا (مضمون) مشمولہ رسالہ اردو ادب۔۱۹۶۵ء
۸) سخاوت مرزا (مضمون) مشمولہ رسالہ اردو۔ص ۵
۹) نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اردو۔ص ۶۲۷
۱۰) سیدہ جعفر، پروفیسر چندجین، پروفیسر تاریخ ادب اردو۔ص ۴۲۶
۱۱) جمیل جالبی، ڈاکٹر تاریخ ادب اردو جلد اول۔ص ۱۵۶
۱۲) عبدالقیوم مرتب تاریخ ادب اردو جلد اول۔ص ۳۳۸
۱۳) عبدالقیوم مرتب تاریخ ادب اردو جلد اول۔ص ۴۲۹
۱۴) عبدالقادرسروری،علی گڑھ تاریخ ادب اردو تیسرا باب۔ص ۱۸۵
۱۵) مخطوطہ نمبر ۱۸۶۶ تصوف اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد۔
۱۶) مخطوطہ نمبر ۱۹۴ تذکرہ اورنٹیل مینوسکرپٹ لائبریری حیدرآباد۔ص ۴۹۳
۱۷) تذکرہ مخطوطات۔ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد جلد سوم۔ص ۶۳
۱۸) سیدہ جعفر، پروفیسر سکھ انجن مقدمہ۔ص ۷۔۶
۱۹) زور۔ڈاکٹر تذکرہ مخطوطات۔ادارہ ادبیات اردو جلد سوم۔ص ۶۳
۲۰) سیدہ جعفر، پروفیسر سکھ انجن مقدمہ۔ص ۴۶
۲۱) سیدہ جعفر، پروفیسر گیان چندجین، پروفیسر تاریخ ادب اردو جلد دوم۔ص ۴۵۹
۲۲) زور، ڈاکٹر تذکرہ اردو مخطوطات۔ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد جلد سوم۔ص ۶۲
۲۳) جمیل جالبی، ڈاکٹر تاریخ ادب اردو، جلد اول۔ص ۲۳۱

جامئ دکن حضرت شاہ کمال کے دیوان مخزن العرفان میں مذہبی عناصر (مثنوی چکی نامہ کے ضمنی حوالے سے)

ڈاکٹر محمد نقی اللہ خان تقی گرم کنڈوی

ضلع پریشد اردو ہائی اسکول، پنگنور، آندھرا پردیش

ہندوستان کے علاقۂ دکن کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ یہاں صوفیائے کرام نے اردو زبان کو اپنے ترسیل کی زبان کے طور پر اختیار کیا۔ اس علاقہ میں اردو میں تصوف کے افکار اور تعلیمات کو پیش کرنے کا سلسلہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے بھی کافی پہلے سے قائم ہے۔ تصوف و معرفت کے کاملینِ نے اردو زبان میں اپنے تعلیمات کو پیش کیا۔ اس طرح کے بہت سے سلسلے علاقۂ دکن میں پائے گئے ہیں، جنہوں نے اپنی پاکیزہ نفوس کے ذریعہ مردہ دلوں میں حیاتِ جاوید پھونک ڈلی۔ ایسا ہی ایک سلسلہ علاقۂ دکن میں حضرت شاہ میر اولیاء اور آپ کے اولاد و احفاد کے ذریعہ جاری و ساری ہوا، جس کے سب نمایاں گلِ سرسبد حضرت شاہ کمال علیہ الرحمہ نہایت ممتاز اور فائق ہوئے۔ آپ کے والدِ ماجد حضرت سید شاہ جمال الدین بخاری قادری نے بھی اپنے فیوض و برکات سے علاقۂ دکن کے سنگلاخ علاقوں کی آبیاری کی اور چٹیل میدانوں میں محبتوں اور عقیدتوں کے گلہائے رنگارنگ کی مہک سے مشامِ جان کو معطر کر کے وادئ لالہ زار بنا دیا۔ حضرت سید شاہ کمال الدین حسینی بخاری قادری المعروف بہ حضرت شاہ کمال دومؒ نے اپنے برادرِ بزرگوار سے والدِ ماجد کی امانتیں اور اجازتیں و خلافتیں حاصل فرمائیں۔ لہٰذا اِس سلسلۂ ذھب کی ایک روشن و درخشندہ کڑی حضرت شاہ کمال ہیں، جنہوں نے اپنے برادر محترم حضرت سید شاہ میر اوّل کی اسلامی تشریحات، دینی تعلیمات، آپ کی روحانی تلقینات، آپ کی صوفیانہ تعبیرات اور آپ کی صحبتِ بابرکت میں حاصل ہونے والے فیوض و برکات کو نہایت علمی، تحقیقی اور استدلالی انداز میں پیش کیا۔

حضرت شاہ کمال (ولادت ۱۱۲۰ھ - وفات ۱۲۲۴ھ) کا شمار بارہویں صدی ہجری کے اولیائے اکابرین، صوفیائے کاملین اور مجددینِ دینِ مبین کے زمرہ میں ہوتا ہے۔ جیسا کہ یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ آپ سلطان ٹیپو کے معاصر تھے۔ لہٰذا، اس عہد کے پرآشوب حالات میں آپ نے سب سے پہلے سلطنتِ خداداد میسور کی بقا و استحکام کی خاطر سری رنگا پٹنم میسور کا دورہ فرمایا۔ آپ نے دربارِ میسور کے امراء و روساء اور فوجِ شاہی کو اصلاحِ باطن، تزکیہ نفس اور شوقِ شہادت کی دعوت دی، چنانچہ آپ کی دعوتِ

عام سے ایک عالم مستفیض ہوا اور آپ کی مساعیٔ جمیلہ سے سلطان کے حق میں رائے عامہ ہموار ہوئی۔

'مخزن العرفان' حضرت شاہ کمالؔ علیہ الرحمہ کے اردو دیوان کا نام ہے۔ یہ دیون ایک ایسا خزانہ ہے، جس میں عرفان ومعرفت اور تصوف وطریقت کے لاکھوں خزانے پائے جاتے ہیں۔ درحقیقت' مخزن کا ہر ایک شعر ایک ایسا خزانہ ہے جس میں لاکھوں گنجینے محفوظ ہیں۔

فی الحقیقت 'مخزن العرفان' دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس دیوان میں حضرت شاہ کمال نے اپنی غزلوں کے علاوہ دیگر تمام اصناف میں طبع آزمائی کئے ہوئے کلام کو بھی شامل کیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر 'مخزن العرفان' ایک ایسا حسین گلدستہ ہے جس میں علم وادب بھی ہے، اور فقہ وشریعت بھی۔ اس میں جہاں علوم و معارف کے ٹھاٹیں مارتے ہوئے دریا موجزن ہیں' وہیں علمِ کلام اور فلسفہ کے مسائل ومباحث بھی غوطہ زن ہیں۔ اس میں ایک طرف' فقہ وشریعت کی جلوہ نمائی ہے تو دوسری طرف دین واسلام کی جلوہ گری بھی ہے۔ شریعت کی ظاہر داریاں بھی ہیں اور طریقت کی باطن آرائیاں بھی ہیں۔ اس میں جہاں احکاماتِ شرعِ مبین ہیں' وہیں تلقیناتِ سلف صالحین بھی ہیں۔ اس میں عقائدِ اسلامی کی تشریح وتوضیح بھی ہے اور ارکانِ اسلامی کی تعبیر وتفہیم بھی ہے۔ اس میں اگر ایک طرف راہِ سلوک ومعرفت کے مسائل بیان کئے گئے ہیں' تو دوسری طرف تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن کے آداب بھی بتائے گئے ہیں۔ قرآنی آیات بھی ہیں اور احادیثِ شریفہ بھی ہیں۔ صوفیائے کرام کے ملفوظات بھی ہیں اور حکمائے اسلام کے مکتوبات بھی ہیں۔

'مخزن العرفان' میں جہاں قرآنیات کی جلوہ سامانیوں کی نیرنگیاں نظر آتی ہیں' وہیں تفسیرِ قرآنی کی جھلکیاں بھی ہیں۔ الفاظ کے الفاظ جہاں قرآنِ حکیم سے ماخوذ ہیں' وہیں فقروں کے فقرے احادیث نبویہ سے لئے گئے ہیں۔ الغرض 'مخزن العرفان' ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں تمام علومِ اسلامی کی روح اور فلسفۂ وحدانیت کی اساس پائی جاتی ہے۔ خدا ترسی اور خدا پرستی کا جہاں ذکر ملتا ہے' وہیں خدا شناسی کے اسرار ورموز بھی ملتے ہیں۔

'مخزن العرفان' کی شاعری وارداتِ عشقِ حقیقی کی شاعری ہے۔ اس میں عشقِ مجازی کا کوئی گذر نہیں۔ اسی طرح اس میں ایک فطری بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ 'مخزن العرفان' کی شاعری میں سراسر آمد ہے آورد نہیں۔ اس میں عام طور پر داخلیت پائی جاتی ہے۔ البتہ کہیں کہیں خارجیت بھی نظر آجاتی ہے۔ خود حضرت شاہ کمال اپنے کلام کو کلامِ نغز قرار دیتے ہیں۔

کمالؔ الدین! کلامِ نغز تیرا حلاوت میں عنب ہے یا رطب ہے

مخزن العرفان میں غزلیات کے علاوہ دیگر اصناف بھی خالص دینی، مذہبی اور اصلاحی نوعیت کے

موضوعات پر مشتمل ہیں ۔حمد ومناجات میں عشقِ الٰہی کی جلوہ گری نظر آتی ہے تو نعت وسلام پر مشتمل شاعری میں ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ عشق ومحبت اور فنا فی الرسول کے کیفیات و جذبات کا اظہار ہے۔آپ کے کلام میں شامل منقبت اور منقبتی شاعری میں سلسلہ کے اکابرین و بزرگان سے اظہارِ محبت وعقیدت اوران کے رشد وہدایات کو عام کرنے کا بے پایاں جذبہ ملتا ہے۔

مخزن العرفان میں حمد ومناجات ،نعت وسلام ،منقبت وقصائداور مثنوی ورباعیات کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن میں مذہبی موضوعات اوراصلاحی تعلیمات کو پیش کیا گیا ہے۔

انسانی معاشرہ کی تشکیل اور صالح ترین افرادسازی ہی اسلام کا مقصود ومطلوب ہے، جسے صوفیائے کرام نے بخوبی سمجھا اور پہچانا ہے، کسی بھی طرح کے امتیاز وتفریق کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دین ومذہب ،قوم وملت ، رنگ ونسل کا کبھی فرق نہیں کیا گیا۔کسی زبان یا تہذیب کی بنیاد پر امتیازی سلوک نہیں کیا گیا، کسی کی امیری وغریبی میں بھید بھاؤ نہیں رکھا گیا۔اسی لئے ہم مخزن العرفان میں جگہ جگہ مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ آپ نے مقامی وعلاقائی زبانوں کے الفاظ کو بھی اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔

صالح انسانی معاشرہ کی تشکیل وتعمیر کے لئے تصوف وسلوک نے ہمیشہ کلیدی اور اساسی کردار نبھایا ہے۔انسان کے باطن کی خرابیوں کو جب تک درست نہیں کیا جاتا ،سماج میں اصلاح نہیں ہوسکتی ۔اندرون میں تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے،اسی لئے صوفیائے کرام نے قلب کو قلبِ سقیم سے قلبِ سلیم بنانے کے لئے اپنی تمام تر توجہات کو صرف کر دیا ہے۔حضرت شاہ کمال کے اردو دیوان 'مخزن العرفان' کے مطالعہ سے بھی یہی پتا چلتا ہے کہ آپ نے اپنی غزلوں کے ذریعہ انسانی مزاج سے کبر۔تکبر۔نخوت۔انانیت۔ عجب۔ریاء۔حسد۔بغض۔نفاق۔کینہ۔عداوت۔بیر۔تنفّر۔جیسی روحانی بیماریوں اور دل کے روگوں کو ختم کرنے کے لئے اپنی عرفان وحکمت بھری شاعری کے ذریعہ ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔

قدیم دکنی ادب میں بہت سی اصنافِ سخن مروج تھیں ۔لیکن آج ان اصنافِ سخن میں متداول شعراء کا کلام دستیاب نہیں ہے۔ایسی اصناف میں' ضیافت نامہ،نورنامہ،معراج نامہ اور چکی نامہ اہمیت کے حامل ہیں۔

حضرت شاہ کمال کا چکی نامہ جنوبی ہند میں بہت مقبول اور معروف ہے۔آپ نے اپنے چکی نامہ میں اسرارِ معرفت اور رموزِ طریقت کو احسن طریقے سے بیان کر دیا ہے۔شریعت کے احکام بھی اس چکی نامہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ یہ چکی نامہ مثنوی کی ہیئت میں ہے۔اس چکی نامہ کو دکن میں' خاص طور پر جنوبی ہندوستان میں بہت زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہے۔چکی نامہ عام طور پر جنوبی ہند کی خواتین کو

زبانی یاد ہوتا ہے اور اکثر و بیشتر شادی بیاہ کے مواقع پر ترنم سے بھی پڑھا جاتا ہے۔اس مثنوی میں کل 35 اشعار ہیں۔ یہ مثنوی پہلی مرتبہ 1331ھ میں شائع ہوئی۔

محققِ دکنیات پروفیسر محمد نسیم الدین فریس نے اپنی کتاب ''تحقیقات'' (دکنی شعر و ادب پر تحقیقی مضامین) میں ''دکنی چکی ناموں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' کے عنوان سے جن چکی ناموں کا جائزہ پیش کیا ہے،ان میں حضرت شاہ کمال کا چکی نامہ بھی شامل ہے۔

چکی نامہ کے بارے میں پروفیسر محمد نسیم الدین فریس لکھتے ہیں:

''قدیم دکنی معاشرہ میں چکی کے گیتوں کا بہت رواج تھا۔مشینوں کے عدم ایجاد ہونے کے باعث اس دور کی عورتوں کو روز چکی پیسنی پڑتی اور وہ اس پر مشقت کام کے بار کو گیتوں کے ذریعہ ہلکا کرتی تھیں۔صوفیاء نے جو انسانی فطرت کے بڑے گہرے نباض ہوتے ہیں، اس رواج سے خوب استفادہ کیا اور نہایت چابک دستی سے چکی کے گیتوں میں تصوف کی تعلیمات سمو دیں تاکہ عورتیں چکی پیستے ہوئے ان گیتوں کو گائیں اور اپنے دل میں خدا کی یاد تازہ کریں۔اس طرح ان صوفی شعراء نے ان گیتوں کے ذریعہ مذہبی باتوں سے موانست پیدا کروانے کی کوشش کی۔اور چکی کی تمثیل کے پردے میں مشاہدۂ حق کی گفتگو، مسائل تصوف کا بیان اور معرفت کے اسرار و غوامض کی تشریح وضاحت کی۔''

(تحقیقات،ص:۲۷)

حضرت شاہ کمالؒ کے چکی نامہ کے تعلق سے حضرت سید شاہ میر قادری شہہ میری (سجادہ نشین، آستانۂ شہہ میریہ،تلپول) یوں رقم طراز ہیں:

''مثنوی میں بظاہر خواتینِ دکن کی شیریں زبان میں شادی کے رسم ورواج کا ذکر ہے۔ لیکن درحقیقت اس مثنوی کا مرکزی خیال مسئلۂ وحدت الوجود ہے۔اس میں یہ روایت مشہور ہے کہ ایک مرتبہ آپ حضرت خواجہ رحمت اللہ المشہور بہ باب رسول سے ملنے کی خاطر رحمت آباد شریف (ضلع نیلور) تشریف لے گئے تھے۔اس وقت حضرت گھر پر موجود نہیں تھے۔حسبِ معمول حضرت شاہ کمال نے حضرت کے گھر کہلا بھیجا کہ کمال آیا ہے اور سلام عرض کرتا ہے۔خواجہ صاحب کی اہلیہ محترمہ حضرت سیدہ حبیب النساء المعروف بہ اماں جی صاحبہ نے کہلا بھیجا میرا بھی سلام کہو اور یہ بھی کہو کہ آپ کی آمد پر بہت خوشی ہوئی۔کمال تو آئے ہو مگر کیا کمال لائے ہو۔یہ جواب سن کر آپ نے اسی وقت برجستہ فی البدیہہ یہ چکی

نامہ لکھا اور اس کو اماں جی صاحبہ کی خدمت میں تحفہ بھیجا کہ کمال یہ کمال لایا ہے۔ خواجہ صاحبہ کے گھر میں محترمہ اماں جی صاحبہ کو چکی نامہ بہت پسند آیا۔ بہت خوش ہوئیں اور دعائیں دیں۔ الغرض یہ مثنوی رموز و اسرار، مستی و سرشاری اور جذبات و کیفیات سے معمور ہے، اور اس میں توحیدِ وجودی کا حل موجود ہے۔''

چکی نامہ-صوفیائے کرام کے ہاں ایک مقبول صنف تھی۔ اردو کے ادب کے عوامی پہلو سے واقف کار بخوبی جانتے ہیں کہ اردو زبان کی سب سے پہلے سرپرستی کرنے والے صوفیائے کرام تھے، جن کے پیشِ نظر انسانی اقدار اور محبتِ انسانیت کے تصورات تھے۔ انہوں نے اپنے پیغام کو عام فہم عوامی زبان میں پیش کیا، اردو زبان' صوفیائے کرام کے دعوت و تبلیغ کی زبان بنی۔

عوام میں مقبولِ عام ادب یا عوامی ادب' میں صوفیائے کرام کی تحریریں سب سے پہلے جلوہ گر ہوئیں۔ قدیم دکنی ادب کے دستیاب ذخیرہ میں ہمیں بہت سے ایسے شعراء کا کلام ملتا ہے' جو مسند نشینِ دعوت و ارشاد تھے اور انسانیت کی رہنمائی و رہبری کے لئے انہوں نے اپنے افکار و خیالات کو عوامی لب ولہجہ میں آسان زبان میں پیش کیا۔

صوفیائے کرام نے دکنی ادب میں جن مقبولِ عام اصناف کو اختیار کیا اور پروان چڑھایا' ان کی ایک الگ فہرست ہے، لیکن چند قابلِ ذکر شعری اصناف یہ ہیں: سہیلا، جکری، سکھ سہیلا، تسبی، ارشاد نامہ، معراج نامہ، پند نامہ، ضیافت نامہ اور چکی نامہ وغیرہ۔

اِن شعری اصناف کے مختلف مواقع متعین ہیں' جن میں ان منظومات کو پڑھا جاتا ہے اور ایک مخصوص لَے اور آہنگ بھی ان کے لئے متعین ہے۔ اس طرح ان ناموں کو پڑھنے کا ایک مخصوص کلچر زمانۂ قدیم سے مروج ہے۔ آج بھی علاقۂ رائل سیما اور جنوبی ہند کے مختلف علاقوں میں چکی نامہ حضرت شاہ کمال کو خواتین شادی بیاہ کے موقعہ پر اور دیگر مواقع پر بڑے اہتمام سے پڑھتی ہیں۔

چکی نامے' درحقیقت چکی پیسنے کے وقت' ذہن کو کام کاج سے ہٹا کر کسی علمی و دینی شغل میں مصروف کرنے کی شعوری کوشش ہے۔ موضوع کے اعتبار سے اس میں کافی تنوع پایا جاتا ہے، لیکن یہ ضروری ہے کہ علامتی و استعاراتی فضا اس میں قائم ہو اور مضامین میں پند و نصائح، ذکرِ خداوندی، انسان کی حقیقت، دنیا کی بے ثباتی، آخرت کی اہمیت اور عرفانِ ذات اور خالقِ کائنات وغیرہ موضوعات ہی پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ معارف، اسرار و حکم اور رموزِ تصوف و عرفان کو پیش کیا جانا بھی ضروری ہے۔

حضرت شاہ کمالؒ کے عہد میں قدیم دکنی شعری روایات موجود تھیں۔ جن کا تتبع کیا جانا اس عہد کے

مقتضائے شاعری کے موافق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اس عہد کی مروجہ اصناف پر طبع آزمائی کی۔ ضیافت نامہ، معراج نامہ اور چکی نامہ اسی عہد کے مروج اسالیبِ اظہار تھے۔

اردو کی مختلف شعری اصناف بھی ہندوستانی مزاج اور ذہن وتہذیب اور ثقافتی عناصر سے ممزوج اور مالامال ہیں۔ اسی طرح کی ایک شعری صنف 'چکی نامہ' بھی ہے۔

حضرت شاہ کمال کے زیرِ بحث چکی نامہ میں ہندوستانی رسم ورواج اور یہاں کی شادی بیاہ کی رسموں کا بیان کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے پس منظر ہی میں یہاں کی تہذیبی قدروں کو ابھارا گیا ہے۔ خاص طور پر زمانۂ قدیم میں جس طرح خواتین چکیاں پیستی تھیں، اور اس دوران جس طرح کے گیت گایا کرتی تھیں، اس تمام سیاق وسباق کو چکی نامے میں استعمال کیا گیا ہے۔

خاص طور پر دولہا اور دلہن کے درمیان محبت اور مودت کے رشتے کو استوار کیا گیا ہے۔ ہندوستانی سماج میں شادی اور بیاہ ایک مستقل تہذیبی ادارہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

چکی نامۂ شاہ کمال کی شرح کے مرتب ڈاکٹر غیاث اقبال نے بجا طور پر لکھا ہے کہ حضرت شاہ کمال نے اپنے چکی نامہ کو اسرار ورموز اور تصوف وسلوک کی تفہیم کے لیے اختیار کیا ہے۔ چکی نامہ میں خواتین کے مزاج اور معیار کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس کی تصنیف کے معرضِ وجود میں آنے کی وجہ بھی یہ رہی کہ حضرت خواجہ رحمت اللہ نائب رسول اللہ کی اہلیہ محترمہ کی خدمت میں بطورِ تحفۂ کمال پیش کیا گیا۔

چکی نامہ میں چکی اور اس کے لوازمات کے ذریعہ تصوف کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر غیاث اقبال نے پروفیسر غلام رسول کی شرح چکی نامہ کے ابتداء میں اس ضمن میں لکھا ہے:

> ''حضرت شاہ کمال کا واقعی کمالِ فن تھا اور وصفِ تخفیفِ خیال کی اعلیٰ سرشت کی خواتین کی سمجھ بوجھ کا اندازہ کرتے ہوئے اسراری والٰہیاتی فکر کے عمیق نکات کو تمثیلی پیرایہ میں بیان کیا۔ یعنی حقیقی مفاہیم کے مختلف پہلوؤں کو مجازی اجسام دے کر اور ان اجسام کے تعلق حرکت یا تصادم سے حقیقی معنی سہیل اور قابلِ فہم انداز میں طشت از بام کرنے کی مستحسن سعی فرمائی۔ جیسے چکی کا جسم اور اس جسم کے مختلف اجزاء، ان اجزاء کا حقیقت سے رشتہ اور رشتوں کے انضمام سے خلق ہونے والی کیفیتِ ارتکاز، اس سے پیوستہ مفہومِ کل، یعنی احدیت، واحدیت اور ذاتِ حق کا تصور نیز عینیت اور غیریت کا مفہوم۔'' (ڈاکٹر غیاث اقبال؛ چکی نامہ معہ شرح، ص:۵،۶)



مسدسِ حالی کا مذہبی تناظر

ڈاکٹر محمد ارشد ندوی

دہلی یونیورسٹی، لودھی روڈ، نیو دہلی ۳

خواجہ الطاف حسین حالی (1837 تا 1914) کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ صنف شعور کو پہنچے تو ان کی زندگی منجدھار میں تھی۔ قیام دہلی کے دوران ان کی ملاقات شیفتہ سے ہوئی اور انہی کی سرپرستی میں غالبؔ تک رسائی ہوئی۔ ان دنوں حالی نے بھی شعر و شاعری شروع کر دی تھی، مشقِ سخن میں تھوڑی پختگی آنے کے بعد فارسی اور اردو میں غزل لکھ کر غالب سے اصلاح لی، ان دنوں حالی 'خستہ' تخلص کرتے تھے۔ حالی کا کلام دیکھ کر فرطِ مسرت سے جھوم اٹھے۔ اس امر واقعہ کو صالحہ عابد حسین یوں بیان کرتے ہیں۔

> ''اس سترہ اٹھارہ سال کے لڑکے کے ابتدائی کلام کو دیکھ کر وہ پھڑک گئے، انہوں نے وہ جوہر قابل پرکھ لیا جو آگے چل کر ایک دنیا مسحور کرنے والا تھا۔ انہوں نے حالی سے کہا 'میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے''[1]

غالب کے اس جذباتی تبصرے نے حالی کے اندر ایک ہلچل سی پیدا کر دی، شاعری کی طرف ان کی رغبت دن بدن بڑھتی چلی گئی، شعری و ادبی محفلوں میں شرکت بھی ہونے لگی۔ انقلاب 1857ء کے حالات رونما ہونے کے بعد حالی کئی سال پانی پت میں حصول علم میں مصروف رہے، کسب معاش کی فکر نے پھر دہلی کی جانب رختِ سفر باندھنے پر مجبور کیا۔ دہلی تباہ و برباد ہونے کے باوجود علم و فن اور شعر و سخن کا چرچۂ عام بنا ہوا تھا۔ حالی دہلی آئے تو شعری ذوق پھر سے تازہ ہو گیا۔ اس دوران حالی مختلف اصناف شاعری میں قسمت آزمار ہے تھے۔ ابتدائی دور میں غزل کی جانب ان کا رجحان زیادہ تھا، روایتی شاعری ہونے کے باوجود انہوں نے وحدت بیان اور ندرت ادا کو نہ چھوڑا لیکن رفتہ رفتہ ان کے مزاج میں اس شاعری سے کوفتگی ظاہر ہونے لگی کیونکہ ان کے وہم و خیال میں غزل بے وقت کی راگنی تھی اسی وجہ سے انہوں نے غزل کو 'سنڈاس' سے بدتر قرار دیا۔

وہ شعر اور قصاید کا ناپاک دفتر عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
ہوا علم دیں جس تاراج سارا وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا

حالی کے مزاج اور بے وقت کی شاعری نے ان کی آنکھوں میں چمک پیدا کی ،خواب غفلت کی شاعری سے بیدار ہوئے ،نئی سوچ اور فکر کے ساتھ اخلاقی ،تہذیبی وتمدنی شاعری پر دھیان دیا۔عہد شباب میں ہی شاعری کے ان نقائص پر ان کی نگاہ گئی جو مروجہ تھی ،اپنی ابتدائی شاعری کے حوالہ سے حالی خود لکھتے ہیں کہ:

''البتہ شاعری کی بدولت چندروز جھوٹا عاشق بننا پڑا۔.... غزل کہی تو پاک شہدوں کی بولیاں بولیں ۔قصیدہ لکھا تو بھاٹ اور بادخوانوں کے منھ پھیر دیے ۔غرض نامہ اعمال ایسا سیاہ کیا کہ کہیں سفیدی باقی نہ چھوڑی ۔بیس برس کی عمر سے چالیسویں سال تک تیلی کے بیل کی طرح اسی ایک چکر میں پھرتے رہے اور اپنے نزدیک سارا جہاں طے کر چکے ۔جب آنکھیں کھلیں تو معلوم ہوا کہ جہاں سے چلے تھے اب تک وہیں ہیں''۔2

حالی کے احساس شعور نے قدیم روایت سے انحراف کرنے پر اکسایا کیونکہ حالی کی تربیت میں غالب ،شیفتہ اور انجمن پنجاب کی ملازمت کا بڑا ہاتھ ہے ۔ان صحبتوں کا اثر یہ ہوا کہ ان کے مزاج میں بلند خیالی ،اعتدال پسندی ،سلاست وروانی اور افادی پہلو ان کی زندگی کا پیش خیمہ بن گئی ۔اسی وجہ سے ان تمام کمزوریوں کو اپنی شاعری کے ذریعے اپنے ہی انداز میں دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ۔پنجاب گورنمنٹ بکڈپو لاہور میں انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہونے والی عبارت ،درست کرنے پر معمور ہوئے ۔مغربی ادبیات سے دلچسپی اور استفادے کا بھرپور موقع ملا ،اسی دوران انجمن پنجاب کے زیر اہتمام مولانا محمد حسین آزاد اور پروفیسر کرنل ہالرائڈ کی زیر سرپرستی مشاعروں میں نظموں کی طرف مائل ہوئے ۔یہیں سے عصری تقاضوں کا احساس ،متنوع مضامین اور اظہارِ اصلیت پر زور دینا شروع کیا۔خارجیت کے مقابلے حقیقت کو موضوع بنایا ،ان نظموں میں قومی شعور اور اصلاحی پہلو کا اثر خوب دکھتا ہے ۔ان کی چار نظمیں برکھا رت ،نشاط امید ،حب وطن ،مناظرۂ رحم وانصاف ،اسی دوران کی کاوش ہیں ۔یہ وہ نظمیں ہیں جو روایتی دستور سے ہٹ کر تھیں ۔

ان تمام چیزوں کے پیچھے جس عظیم شخصیت نے ان کو متاثر کیا وہ سرسید تھے ۔جس نے 'تہذیب الاخلاق' کے ذریعے قوم وملت کے لئے اصلاحی کام ،مسلمانوں کو مغربی علوم وفنون کی جانب رغبت دلائی ،حالی ان کے کارناموں سے بہت متاثر تھے ۔حالی سرسید کے ہم خیال ہی نہیں بلکہ اپنے قلم سے ان کی تحریک کی پُرزور حمایت بھی کی ،جس وقت حالی اینگلو عربک اسکول میں مدرسی کے فرائض انجام دے رہے تھے اس وقت سرسید نے ان کو ترغیب دلائی ،جس سے حالی کی غیرت جاگی اور قدم خود بخود ان کی طرف

کھینچے چلی آئی۔اس کا تذکرہ وہ یوں کرتے ہیں کہ:

''ناگاہ دیکھا کہ ایک خدا کا بندہ (سرسید احمد خان) جو اس میدان کا مرد ہے ایک دشوار گزار راستے میں رہ نورد ہے.... اس کی نگاہ اِدھر بھی پڑی اور اپنا کام کر گئی۔بیس برس کے تھکے ہارے خستہ و کوفتہ اسی دشوار گزار راستہ پر پڑ لیے۔زمانے کا نیا ٹھاٹھ دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہو گیا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی... قوم کے ایک سچے خیر خواہ نے آکر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوان ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑے شرم کی بات ہے''۔3

اس طرح سرسید کے ایما اور تحریک کے زیر اثر حالی نے مکمل طور پر نظموں کی جانب رخ کیا۔شاعری میں افادیت کے ساتھ ساتھ قومی، مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور مسلمانوں کی تنزلی پر نئی تکنیک کے ذریعے عصری تقاضوں کو عوام تک پہچانے میں بھرپور توجہ مرکوز کی۔مربع مخمس، مسدس، ترجیع بند، ترکیب بند اور مثنوی وغیرہ میں مختلف موضوعات کے دریعے نئے راستے تراشے۔اور اپنی نظموں میں جدت ادا کی بنا ڈالی۔

1879ء میں انگلیو عربک اسکول میں مدرسی کے دوران سرسید کی فرمائش پر اپنی نظم ''مد و جزر اسلام'' کے نام سے لکھی جو بعد میں 'مسدس حالی' کے نام سے بہت مشہور ہوئی اور اس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔مسد حالی کا مذہبی تناظر کا جائزہ لینے سے قبل مسدس کے تحریر میں آنے کے محرکات او راسباب و علل کا اظہار از حد ضروری ہے۔تاکہ مسدس کا جائزہ مذہبی تناظر میں بآسانی لیا جاسکے۔حالی ایک تہذیب یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کی پرورش مذہبی گھرانے میں ہوئی ہے لیکن ملک کے حالات سیاسی، سماجی، تہذیبی ہر اعتبار سے دگرگوں ہے۔کئی صدیوں سے مسلم حکمرانوں کی حکومت قائم تھی، عالمگیر اورنگ زیب کے زمانے تک مغلوں کا پرچم بلند رہا لیکن اس کے بعد تخت و تاج کے حرص و ہوس نے عظیم الشان سلطنت کی بنیادیں ہلا دی وہیں دوسری جانب برٹش گورنمنٹ کے آلہ کاروں نے زوال آمادہ شاہی نظام کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔بالآخر مغلیہ سلطنت کا زوال ہوا، دوسری طرف انگریزی حاکمانہ اقتدار کی آمد، ملک پر انقلاب کی گھٹا چھا رہی تھی، مسلمانوں پر انگریزوں کا جابرانہ تسلط، قتل و غارت گری کا بازار گرم، مشرقی تہذیب و تمدن، تعلیم و تربیت اور مذہبی رواداری انحطاط پر تھیں۔حالی نے کیا خوب نقشہ کھینچا ہے۔

ادھر ہند میں ہر طرف تھا اندھیرا کہ تھا گیان گُن کا لدا یاں سے ڈیرا

ہوا ہر طرف موجزن تھی بلا کی گلوں پر چھری چل رہی تھی جفا کی
عقوبت کی حد تھی نہ پرسش خطا کی پڑی لُٹ رہی تھی ودیعت خدا کی

ایسے حالات میں حالی کی نشو ونما ہوئی۔ یہ تمام حرکات وسکنات اُن کے نظروں کے سامنے تھیں، لیکن حالات سازگار نہ ہونے کے سبب ابتدائی دور میں حالی نے اس جانب توجہ نہ دی، شعور میں پختگی کی آمد کے بعد مسلمانوں کی زبوں حالی دیکھی نہ گئی جس نے ان کے دلوں کو جھنجھوڑ دیا۔ حالی ان عوامل سے بہت زیادہ دل برداشتہ ہو گئے کیونکہ ان کی طبیعت میں حساسیت اور جذباتیت کا پہلو بہت نمایاں تھا۔ عبادت بریلوی حالی کے مذہبی افکار ونظریات کے حوالہ سے اپنے مضمون 'منظومات حالی' میں لکھتے ہیں کہ:

''حالی کے خاندان کی پشت پناہی پر مذہب اور اس کی اقدار تھیں۔ ان اقدار نے انہیں راہ راست سے نہیں ہٹنے دیا۔ چنانچہ حالی کی شخصیت پر مذہب کے اثرات بڑے گہرے اور ہمہ گیر نظر آتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس صورت حال کو پیدا کرنے میں ان مختلف مذہبی تحریکوں کو بھی خاصا دخل ہے جو ان دنوں مولانا سید احمد بریلوی (رائے بریلوی) اور مولانا فضل حق خیر آبادی کے زیر اثر لوگوں کے دلوں میں گھر کر رہی تھیں..... مذہب کو قومی زاویہ نظر سے دیکھنے اور برتنے کا رجحان عام ہونے لگا تھا، مسلمانوں کی زبوں حالی کے احساس نے اس رجحان کو کچھ اور بھی ہوا دی تھی..... اور حالی بھی اس سے متاثر ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں''۔4

قیام دہلی اور نواح دہلی کے دوران ان کی زندگی میں انقلاب کا واقعہ رونما ہوا، ہر طرف افراتفری کا ماحول تھا کیونکہ مسلمان غیروں کے زیر اقتدار رہنے کو تسلیم نہیں کر پا رہے تھے اسی لئے مسلمان سیاسی و معاشی بحران کے شکار تھے۔ عبادت بریلوی مزید ان حالات سے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''مسلمانوں کی ذہنی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ وہ مغلوں کے سامنے کسی اور نظام حکومت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ غدر کا واقعہ ایک حد تک اس صورت حال کا نتیجہ بھی تھا ... مسلمانوں کی اس ذہنی کیفیت نے انہیں کہیں کا نہیں رکھا اور معاشی و معاشرتی اعتبار سے پستی میں گرتے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی اہمیت کھو دی تھی''۔5

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سیاسی، سماجی، علمی اور مذہبی اقدار و روایات کی پامالی حالی کی نظروں سے اوجھل نہیں تھی۔ وہیں دوسری جانب نئے سماج وتہذیب کا سورج طلوع ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ جس سے حالی و سرسید ماضی کی بازیافت کے زیر اثر نئے افق سے خوب متاثر تھے۔ اس طرح حالی اپنے ابتدائی دور میں وہ

کام نہ کر سکے جو 1879ء میں ملکی مسائل اور مسلمانوں کی زبوں حالی کو دیکھتے ہوئے مذہبی تناظر میں مسلمانوں کو اس ظلمت کدے سے نکالنے کی تگ ودو میں مصروف ہو گئے۔

حالی کا یہ مسدس کئی معنوں میں اہمیت کے حامل ہے۔ دراصل یہ نظم اصلاحی پہلو کے پیش نظر لکھی گئی ہے جو مسدس کی ہیئت میں ہے۔ حالی چونکہ عالم دین تھے، ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ عالمی مسلمانوں کو بھی بھنور سے نکالنے کی سعی کر رہے تھے۔ راقم کی کوشش ہوگی کہ مذکورہ موضوع کے تحت مسدس میں مذہبی روایات کی روشنی میں چیزوں کو تلاش کرے۔ حالی 'مد وجزر اسلام' کا آغاز حمد وثنا کے بعد حکمت و دانائی کی بات کرتے ہیں۔ 'کلمتان غریبتان فاحتملوھما' کے تحت عامۃ المسلمین کے لئے یہ پیغام 'حکمت کی بات جو نادان کے منہ سے نکلے اسے مان لو اور نادانی کی بات جو دانا و عقلمند کے منھ سے نکلے اس سے درگزر کرلو' کا درس دیتے ہیں۔ حالی نے مسدس کا آغاز رباعی سے کیا ہے جس میں اسلامی عظمت و رفعت اور مسلمانوں کے عروج وزوال کا نقشہ ابھرتا ہے۔

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے　　اسلام کا گر کر نہ ابھر نا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد　　دریا کا ہمارے جو اُ ترنا دیکھے

رباعی کے بعد باقاعدہ مسدس کی ہیئت میں نظم کی ابتدا ہوتی ہے۔ جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا 'ما انزل اللہ داءً اِلّا انزل لہ شفاءً (اللہ تعالیٰ نے کوئی بیماری ایسی نازل نہیں کی جس کی شفا نہ اتاری ہو۔ بخاری) کے تحت اس پہلے بند کے ذریعے مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا میں کوئی بھی بیماری ایسی نہیں جس کا علاج نہ ہو، بقراط کے فلسفے سے مسدس کی ابتدا کی ہے تاکہ مسلمانوں کو اپنے تئیں سنجیدہ اور 'لاتقنطوا من رحمۃ اللہ' کی جانب دعوت ہے۔

کسی نے یہ بقراط سے جاکے پوچھا　　مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا
کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا　　کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
دوا اور پرہیز سے جی چرائیں　　یوں ہی رفتہ رفتہ مرض کو بڑھائیں

کیونکہ ایک عظیم سلطنت کے خاتمہ کے بعد مسلمانوں کی شناخت اور ان کی اپنی پہچان خطرے میں پڑتی دکھائی دی، ان کے سروں پر اب کسی بادشاہ کا سایہ نہ تھا، بے یار و مددگار کے شکنجے میں ہر کوئی اپنے آپ کو غیر محسوس کر رہا تھا۔ اسی جانب حالی نے ان مسلمانوں کو جھنجھوڑتے ہوئے خواب غفلت سے بیدار ہونے کی تاکید کی ہے اور 'من عرف نفسہ' کے مصداق، اپنے اسلاف کے طریق کار کو اپنانے کی تلقین کی ہے کہ تم کیا تھے اور کیا ہو گئے۔

یہی حال دنیا میں اس قوم کا ہے　　بھنور میں جہاز آ کے جس کا گھرا ہے
نہیں لیتے کروٹ مگر اہلِ کشتی　　پڑے سوتے ہیں بے خبر اہلِ کشتی
کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم　　ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

افسوس مسلمانوں نے اپنی شناخت ختم کر دی، غفلت ان کا شیوہ بن چکا ہے۔ ذلت و رسوائی ان کی تقدیر کا حصہ ہے۔ جانوروں جیسی زندگی پر خوش و خرم ہیں۔ اللہ نے انہیں عقل سلیم عطا کیا تھا جس سے دین برحق کی اطاعت کے بجاء اسے بدنام کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ انہیں اس بات کا احساس بھی نہیں ہے کہ وہ ''اِن الدین عنداللہ الاسلام'' کے سچے خیر خواہ ہیں۔

پر اس قوم غافل کی غفلت وہی ہے　　تنز ل پہ اپنے قناعت وہی ہے
نہ افسوس انہیں اپنی ذلت پہ ہے کچھ　　نہ رشک اور قوموں کی عزت پہ ہے کچھ
بہائم کی اور ان کی حالت ہے یکساں　　کہ جس حال میں ہیں اسی میں ہیں شاداں

جب کہ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ مذہب اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ مذہب اسلام رواداری، امن و سلامتی اور احترام انسانیت کا درس دیتا ہے۔ یہ دنیا کا واحد مذہب ہے جس نے امن و آشتی کا پیغام دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وحشی اور بہائم جیسی زندگی گزارنے والے انسانوں کے ساتھ دشمنوں کو بھی 'المسلم اخ المسلم' کے تحت اپنا بھائی تسلیم کرتا ہے۔ یہی مذہب ہے جس نے آپس میں تفرقہ بازی سے ہٹ کر گداؤں کو بھی شاہ و سلطاں بنایا ہے۔ حالی کا یہ انداز دیکھیں:

وہ دیں ہے جس نے اعداء کو اخواں بنایا　　وحوش اور بہائم کو انساں بنایا
درندوں کو غمخوار دوراں بنایا　　گڈریوں کو عالم کا سلطاں بنایا

حالی نے اسلام سے قبل جزیرۃ العرب کی زمانہ جاہلیت کے خصائل کو بڑی خوبصورتی اور حق گوئی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ جزیرہ عرب جو دنیا سے بالکل الگ تھا اس کے باشندے صحرانشیں تھے جو تمدن سے ناواقف، ترقی سے بے بہرہ ور، آب باراں پر ان کی زندگی کا انحصار تھا۔ بت پرستی، آگ، ہوا، پانی، کواکب، تثلیث، طلسم و کاہن کے سحر میں ہر کوئی گرفتار تھا۔ خدا کے علاوہ ہبل، لات، منات، عزّی، صفا، نائلہ وغیرہ ان کے گھروں کا بت جدا جدا تھا۔ قتل و غارت گری ان کا پیشہ تھا۔ معمولی باتوں پر قبیلوں کے مابین سالہوں سال جنگ لازم تھی۔ ان کی نیکیوں پر بدیاں حاوی تھیں۔ بیٹیوں کی پیدائش باعثِ شرمندگی تھی، رحم مادر ہی میں مار دیا جاتا یا پھر زندہ درگور کر دیتے تھے۔

عرب جس کا چرچہ ہے یہ کچھ وہ کیا تھا　　جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا

تمدن کا اس پر پڑا تھا نہ سایا ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا
قبیلے قبیلے کا بت اک جدا تھا کسی کا ہُبل تھا کسی کا صفا تھا
وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے درندے ہوں جنگل میں بے باک جیسے

بالآخر غیرت حق کی غیرت حرکت میں آئی ۔رحمت خداوندی نے پہلوئے آمنہ سے رحمت اللعالمین ،فقیروں کا ماویٰ وملجا،اللہ کے رسول ﷺ مبعوث ہوئے ۔حالی نے جدت ادا کا بہترین نمونہ پیش کرتے ہوئے آمدرسول ﷺ اوراس کے فضائل وخصائل کے ساتھ ساتھ شریعتِ الٰہی کا سبق ان کو پڑھایا۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا اور اک نسخہ ٔ کیمیا ساتھ لا یا
سبق پھر شریعت کا ان کو پڑھایا حقیقت کا گران کو ایک اک بتایا
کہ ہے ذات واحد عبادت کے لائق زبان اور دل کی شہادت کے لائق

کلمۃ الحق کی آواز بلند ہوئی ۔ ہرطرف 'من الظلمٰت الی النور' کا بول بالا ہوا۔ مذہب اسلام سے متاثر ہونے والوں کا جوق درجوق اسلام میں داخلیت کا سبب بنا۔حالی نے وحدانیت کی حقانیت کا اظہار بڑی جرأت مندانہ انداز میں کیا ہے۔

کیا امّیوں نے جہاں میں اُجالا ہو ا جس سے اسلام کا بو ل بالا
بتو ں کو عرب اور عجم سے نکالا ہر اک ڈوبتی ناؤ کو جا سنبھالا
زمانہ میں پھیلائی توحید مطلق لگی آنے گھر گھر سے آواز حق حق

مذہب کو جاننے اور پرکھنے، خیراور شر کے مابین تمیز کرنے والی چیز علم ہے۔علم حاصل کرنا ہر مرد وزن پر لازم ہے۔اللہ نے انسانوں کے لیے سیکھنے اور سکھانے کے عمل کو اولیت قرار دیتے ہوئے قرآن کی پہلی آیت 'اِقرا بسمِ ربک الذی خلق... علّم الانسان مالم یعلم' نازل کی۔حالی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

سکھائے معیشت کے آداب ان کو پڑھائے تمد ن کے سب باب اُن کو
یہ کہہ کر کیا علم پر ان کو شیدا کہ ''دو رحمت سے سب اہلِ دنیا''
مگر دھیان ہے جن کو ہر دم خدا کا ہے تعلیم کا یا سدا جن میں چرچا

جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کی بات ہے وہ ملک اور حالات کے پیش نظر تنگ دستی کے شکار ہو چکے تھے ۔محکوم قوم بن کر رہ گئے ۔صاحب علمِ شریعت اور دانش کا فقدان، محدث ومفسر کے محفلِ چراغاں اب ناپید ہیں

۔علمائے دین اب علماء سو بن چکے ہیں، گنہگار ہندوں کی تحقیر اور مسلمان بھائیوں کی تکفیر ان کا طریقۂ کار ہے۔قرآن وحدیث پر عمل نہ کر کے اندھی تقلید پر آمادہ ہیں۔تعصب پسندی کے شکار ہر خاص وعام ہیں جو نمرود اور فرعون کو بھی پیچھے چھوڑ آئے۔باہمی اتحاد واتفاق ان کے درمیان برائے نام تھے۔

ان تمام چیزوں سے حالی بد دل ہو چکے تھے۔قوم کے اندر ایمانی حرارت پیدا کرنا چاہتے تھے۔انہیں مذہب اسلام کی فرضیت کا احساس دلانا چاہتے تھے۔آپس میں باہمی اتحاد واتفاق 'واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولاتفرقوا' کا پیغام ہر عام وخاص میں عام کرنا چاہتے تھے۔مسلمانان قوم سے خطاب کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

ہمارا یہ حق تھا کہ سب یار ہوتے مصیبت میں یاروں کے غمخوار ہوتے
جب الفت میں یوں ہوتے ثابت قدم ہم تو کہہ سکتے اپنے کو خیر الامم ہم
اگر بھولتے ہم نہ قولِ پیمبر کہ ہیں سب مسلمان باہم برادر

مسدس حالی ایک ایسی کتاب ہے جو زندہ جاوید ہے۔دردمندانہ اقوال دلوں کو مسحور کرتی ہیں۔مردہ قوم کے مرض کو سامنے رکھ کر حالی نے اسلام کے بھولے ہوئے اصولی شعائر کو بڑے اچھوتے اور نرالے انداز میں بیان کیا ہے۔اس نظم کی اہمیت اس بات سے بھی ہے کہ سرسید نے اپنے تمام کارناموں کے مقابلے حالی کی مسدس کو فوقیت دی اور خدا کے حضور اس مسدس کا ذکر اس انداز میں کیا ہے جس کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں کہ ''خدا جب حشر میں مجھ سے پوچھے گا کہ 'دنیا سے کیا لایا؟ تو میرا جواب ہوگا کہ 'حالی سے مسدس لکھوالایا ہوں'' یقناً یہ نظم شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔

حواشی:

۱ صفحہ نمبر 28۔یادگار حالی، تذکرہ خواجہ الطاف حسین حالی۔انجمن ترقی اردو ہند دہلی 1986۔
۲ صفحہ نمبر 8۔مسدس حالی، خواجہ الطاف حسین حالی، مکتبہ اشاعت القرآن دہلی۔2002
۳ صفحہ نمبر 9۔مسدس حالی، خواجہ الطاف حسین حالی، مکتبہ اشاعت القرآن دہلی۔2002
۴ صفحہ نمبر 68۔سہ ماہی رسالہ اردو، حالی نمبر، جلد 3، انجمن ترقی اردو کراچی، پاکستان۔1952
۵ صفحہ نمبر 70، سہ ماہی رسالہ اردو، حالی نمبر، جلد 3، انجمن ترقی اردو کراچی، پاکستان۔1952

حالی کی نظم "مسدس مدوجزر اسلام" میں اصلاحی رنگ

محبوب عالم

ریسرچ اسکالر، یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد

ایک ادیب سماج کا نباض ہوتا ہے، سماج میں جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے اس کو صفحے قرطاس پر لاتا ہے۔ ہر دور کے شعراء نے اپنے زمانے کی روداد کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے لیکن ناہیے اور طریقے سب کے الگ الگ ہوتے ہیں۔ سماج کے بدلتے احوال اور کیفیات کا ذکر بھی ہماری شاعری میں موجود ہے۔ پرانی تہذیب کے مٹتے نشان، رشتوں کی پامالی، مایوسی، کمزوری اور بے کسوں پر ظلم و جبر اور استحصال ان تمام چیزوں کو ہمارے اردو شاعروں نے اپنی شاعری کے ذریعے لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ ادب کا شمار فنونِ لطیفہ میں ہوتا ہے اور اس میں جمالیاتی عنصر موجود ہے، اس سے انسان سکون اور اطمنان حاصل کرتا ہے۔ یہ سکون و اطمنان بھی انسان کا معاشرتی اور سماجی جز ہے۔ اس لیے شاعری کے فن کے ساتھ موضوع کا انتخاب سماج کی دین ہے۔ اردو کے بڑے شاعروں میں میر، غالب، انیس و دبیر، اقبال، ناسخ، جوش، فانی، حسرت اور اکبر سے لے کر حالی اور بعد کے تمام شاعروں نے اپنی شاعری کے ذریعے سے قوم کی اصلاح و بیداری کا کام کیا ہے۔ ہر زمانے میں کچھ ایسی تحریکیں وجود میں آئی ہیں جو قوم میں پھیلی برائی، خرافات، توہمات، پرانے خیالات، بدعقیدگی، بدعت و خرافات کو دور کرنے کے لیے کمر بستہ ہوئے اور ان تحریکوں میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے یہ کوشش کی کہ ان کی قوم میں جو خرافات اور برائی فروغ پا گئی ہے وہ دور ہو جائے اور وہ قوم ترقی کے راستے پر گامزن ہو سکے اور ان کا مستقبل تابناک ہو۔ مسلم قوم میں سرسید نے اس کے لیے کافی محنت کی اور مسلمانوں کی تعلیم کے لیے الگ الگ طریقے اختیار کئے۔ مسلمانوں کے اندر جو رسومات و خرافات اور مذہبی تشدد پیدا ہو گئی تھی۔ اس کو دور کر کے جدید تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے انتھک کوشش کی اس کے لیے انھوں نے بہت سی کتابیں بھی لکھیں جیسے" تبین الکلام" اور قرآن کی تفصیل وغیرہ جس کے ذریعے مسلم قوم میں بیداری پیدا ہو اور خرافات اور بدعت سے دور ہوں۔ اسی طرح مولانا حالی نے اپنی شاعری میں مسلمانوں میں پھیلی ہوئی برائی، شرک و بدعت کو دور کرنے اور انھیں بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالی کی شاعری میں توحید کا عنصر غالب ہے انھوں نے اپنی شاعری میں مسلم قوم کو اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ وہ اپنے اندر سے

شرک و بدعت کو ختم کریں اور وہ دقیانوسی خیالات جوان کی بے راہ روی کے راستے پر لے جاتے ہیں، اس سے دور ہوں اور توحید کا دامن تھامیں اور الگ الگ میلوں ٹھیلوں اور رسوم و روایات سے اپنے اندر بیداری پیدا کریں جو سماج کی ضروریات کا حصہ ہیں۔ اسلام کا صحیح علم ان کو ہو قرآن و حدیث کی صحیح جانکاری مسلمانوں میں پیدا ہو، اسلام کے نام پر جو میلے ٹھیلے اور مزاروں وغیرہ پر جو برائیاں پنپ رہی ہیں اس کا خاتمہ ہو۔ ان تمام چیزوں سے مسلمان پستی کی طرف جاتا ہے۔ مسلمانوں کو اسلام کے اصل روح کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور توحید پرست ہونا چاہیے جسے حالی نے اپنی شاعری میں الگ الگ جگہوں پر پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہو جس میں مسلمانوں میں پھیلے ہوئے شرک و بدعت اور سومات موجود ہیں۔

جہاں مختلف ہوں روایات باہم کبھی ہوں نہ سیدھی روایت سے خوش ہم
جسے عقل رکھے نہ ہرگز مسلم اسے ہر روایت سے سمجھیں مقدم
سب اس میں گرفتار چھوٹے بڑے ہیں سمجھ پر ہماری یہ پتھر پڑے ہیں

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
کہے آگ کو اپنا قبلہ تو کافر کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پر دن رات نذریں چڑھائیں شہیدوں سے جاجا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

مسدس کے ان اشعار میں مولانا حالی نے مسلمانوں پر طنز بھرے لہجے میں یہ بات کہی ہے کہ آج مسلمان اتنا بگڑ چکا ہے کہ اس کے اندر خرافات، شرک و بدعت، اور ایسے رسومات پیدا ہو گے ہیں جو غیر قوموں سے بھی بڑھ کر ہے۔ مسلمان اپنے آپ کو ایک اللہ کو ماننے والا کہتا ہے اور اس کی عبادت کرنے والا بتاتا ہے لیکن آج مسلمان اس حد تک شرک و بدعت میں مبتلا ہو چکا ہے کہ وہ غیر قوموں کے برابری میں پیچھے نہیں۔ اگر غیر قوم بت کی پوجا کرتی ہے تو کافر کہلاتی ہے تو مسلمان بھی مخلوق کو خدا بنائے ہوے

ہے۔مزاروں اور مردوں سے منت وسماجت کرتے ہیں اور انھیں اپنے نفع ونقصان کا مالک سمجھتے ہیں۔ اسلام کی توحید ہے جسے یہ بھول چکے ہیں۔اس لیے مولانا حالی مسلمانوں کو اس طرف راغب کرنا چاہتے ہیں کہ وہ صحیح اسلام کی طرف رجوع کریں اور اپنے آپ کو توحید پرست بنائیں۔

مخالف کا اپنے اگر نام لیجیے تو ذکر اس کا ذلت خواری سے کیجیے
کبھی بھول کر طرح اس میں نہ دیجیے قیامت کو دیکھوگے اس کے نتیجے
گناہوں سے ہوتے ہو گویا مبرا مخالف پہ کرتے ہو جب تم تبرا

مندرجہ بالا اشعار میں بھی مولانا حالی نے مسلمانوں پر اپنے غم وغصے کا اظہار کیا ہے اور بتایا ہے کہ ایک اللہ، ایک قبلہ اور ایک قرآن کو ماننے والے آپس میں ایک دوسرے کے جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں اور سب میں ایک دوسرے کے لیے نفرت بھری ہوئی ہے، بغض وعناد اور کینہ ہے۔گویا مسلمانوں میں ایثار ومحبت اور بھائی چارگی وغیرہ ختم ہوچکی ہے جو اسلام کا اصل مقصد تھا وہ مسلمانوں سے دور ہو چکا ہے ان میں فرقہ بندی پنپ چکی ہے۔ یہ آپس میں اس طرح سے لڑ رہے ہیں کہ آج اسلام پر دوسرے لوگ ہنس رہے ہیں۔سب نے اسلام کے مقصد کو اور پیغام کو بھلا دیا ہے اور اپنے من مطابق اسلام کو پیش کررہے ہیں۔اس طرح مولانا حالی نے نظم ''مسدس مدوجزر اسلام'' میں مسلمانوں کی ان تمام برائیوں کو اجاگر کیا ہے جس کی بنا پر ان میں اختلاف وانتشار ہے اس کی وجہ سے مسلمان آج ہر جگہ ذلت کی زندگی گزار رہے ہیں، ہر جگہ مارے اور کاٹے جارہے ہیں۔انھوں نے توحید کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے اور شرک وبدعت اور خرافات میں گھر چکے ہیں۔مولانا حالی نے مسلمانوں کی اصلاح کے طور پر یہ اشعار کہے ہیں۔مسلمانوں سے ہمدردی اور محبت ہونے کی وجہ سے انھوں نے اپنے غم وغصے کا اظہار کیا ہے اور انھیں راہِ راست پر لانے کی کوشش کی ہے۔



'مسدس حالی' کا مذہبی تناظر

ڈاکٹر ایس۔ٹی۔نوراللہ

گیسٹ فیکلٹی، شعبۂ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج، پلمنیر

شمس العلما مولانا الطاف حسین حالؔی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں ہی حاصل کی۔ اس کے بعد ان کے ماموں میر قربان علی کی بیٹی اسلام النساء سے شادی کر دی گئی۔ سسرال مال و دولت والی تھی۔ ملازمت تلاش کرنے کی کوئی عجلت نہیں تھی اس لیے مزید تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔ چنانچہ انھوں نے فارسی کی تعلیم سید جعفر علی اور عربی کی تعلیم مولوی ابراہیم حسین انصاری سے حاصل کی۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد معاش کی فکر دامن گیر تھی۔ ملازمت کی تلاش میں دہلی آئے۔ یہاں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ نے انھیں اپنے بچوں کا استاد مقرر کر دیا۔ دہلی کے نامور رئیسوں میں شیفتہ کا شمار تھا۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ حالؔی کو شیفتہ کے ساتھ رہنے سے بہت فائدہ ہوا۔ غالبؔ سے شیفتہ کا کافی قریبی تعلق تھا۔ ان ہی کے ذریعہ حالؔی کی غالب تک رسائی ہوئی۔

شیفتہ کے انتقال سے حالؔی کو بڑا صدمہ پہنچا۔ روزی روٹی کا ذریعہ بھی بند ہو گیا۔ تلاش معاش میں وہ کئی جگہ ہوتے ہوئے آخر کار لاہور پہنچے۔ وہاں انھیں پنجاب گورمنٹ بک ڈپو، لاہور میں ملازمت مل گئی اور مسودوں کی تصحیح کے کام میں مشغول ہو گئے۔ یہاں انھیں انجمن پنجاب کے مشاعروں میں بھی شریک ہونے کا موقع ملا۔ ان مشاعروں کے لیے حالی نے کئی عمدہ نظمیں لکھیں۔ مثلاً ''برکھا رُت''، ''نشاطِ اُمید''، ''مناظرۂ رحم و انصاف'' اور ''حبِ وطن'' وغیرہ وغیرہ۔ یہ نظمیں اردو شاعری کے لیے ایک بیش قیمتی سرمایہ ثابت ہوئیں۔ لاہور میں چار سال قیام کے بعد وہ ۱۸۷۵ء کو لوٹ آئے اور دلی کے اینگلو عربک اسکول میں فارسی عربی کے معلم کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔

سرسید احمد خان سے حالؔی کی ملاقات سائنٹیفک سوسائٹی کے ایک جلسے میں شیفتہؔ نے کرائی تھی اور سر سید کا اثر حالی پر اسی زمانے سے ہونا شروع ہو گیا تھا۔ سرسید کو بھی پہلی ملاقات میں ہی حالؔی کی صلاحیتوں کا علم ہو گیا تھا۔ سرسید نے حالؔی کا تعارف حیدر آباد کے سر سلیماں جاہ سے کرایا۔ انھوں نے حالی کے لیے ۷۵ روپیہ ماہانہ مقرر کر دیا۔ حالی کو مالی آسودگی حاصل ہوئی تو وہ اپنے وطن پانی پت میں ہی تصنیف و تالیف کے کاموں میں مشغول ہو گئے۔

الطاف حسین حالی ۱۸۸۰ء میں علیگڑھ آئے اور مدرستہ العلوم کا معائنہ کیا تو انہیں یقیں ہوگیا کہ اگر ہندوستانی مسلمانوں کا کھویا ہوا وقار و مرتبہ واپس انہیں مل سکتا ہے تو اسی سرزمین سے ممکن ہوسکتا ہے۔انھوں نے کالج کی ٹرسٹی شپ قبول فرمائی۔اس کے علاوہ سرسید کے جدید تعلیم کے منصوبے کی بھی انھوں نے تائید کی اوراس کام میں ہرممکن مدد کی۔تعلیم کے سلسلے میں ان کے افکار وخیالات بالکل وہی تھے جوسرسید کے تھے۔

حالی کے کارنامے نثر ونظم دونوں پر محیط ہیں۔انھوں نے بڑی دل آویز غزلیں کہیں۔اور نئے انداز کی نظمیں بھی لکھیں۔ایک طرف تو مقدمہ شعروشاعری لکھ کر تنقید کی بنیاد ڈالی اور دوسری طرف حیاتِ سعدی، یادگارِ غالبؔ اور حیاتِ جاوید جیسی بلند پایہ سوانح عمریاں لکھ کر اردو میں سوانح نگاری کو عام کیا۔یہ تینوں کتابیں حالی کی عرق ریزی اور دیانت داری کا بہترین نمونہ ہیں۔سرسید کی فرمائش پر ''مسدسِ مد وجزرِ اسلام'' لکھ کر حالی نے مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔سرسید نے حالی سے فرمائش کی تھی کہ وہ قوم کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچتے ہوئے ایک ایسی نظم لکھ دیں جو قوم کا مرثیہ ہو۔یہ بالکل نئے انداز کی شاعری تھی۔خود حالی کو بھی اس کا احساس تھا۔چنانچہ وہ ''مسدس مدوجزر اسلام'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''زمانے کا نیا ٹھاٹھ دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہوگیا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی۔یاروں کے ابھاروں سے دل نہ بڑھتا تھا،ایسے موقع پر قوم کے ایک خیرخواں سرسید نے آکر ملاقات کی اور غیرت دلائی کہ حیوانِ ناطق ہونے کا دعوہ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان کچھ کام نہ لینا بڑے شرم کی بات ہے۔قوم کی حالت تباہ ہے،عزیز ذلیل ہوگئے ہیں،شریف خاک میں مل گئے،علم کا خاتمہ ہوچکا،دین کا صرف نام باقی ہے،افلاس کی گھر گھر پکار ہے،اخلاق بالکل بگڑ گئے،تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔رسم ورواج کی بیڑی ایک ایک پاؤں میں پڑی ہے۔جہالت اور تقلید سب کے گردن پر سوار ہے،امراء جو قوم کو بہت فائدہ پہنچا سکتے تھے غافل اور بے پروا ہیں،علماء جن کو قوم کی اصلاح میں بڑا دخل ہے،زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔ایسے میں جو بن آئے بہتر ہے۔''

(مکتوباتِ اردو کا ادبی وتاریخی ارتقاء،خواجہ احمد فاروقی،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی،۲۰۱۳ء،ص ۲۸۵)

مسدس حالی کو اب تک برصغیر میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے مختلف اداروں اور پبلیشرز نے کئی ایڈیشن شائع کر چکے ہیں۔اس نظم کے کئی اشعار لوگوں کو ازبر یاد رہتے ہیں۔آج بھی لوگ مسدس کے کئی بند جلوس اور خاص کر قوم کو بیدار کرنے والے علمی و ادبی اور مذہبی محفلوں میں پڑھا کرتے ہیں۔آج بھی مسدس دلوں کو گرمی بھی بخشتی ہے روشنی بھی۔'مسدس' سے متعلق مجنوں 'گورکھپوری کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

''مسدس ،اپنے موضوع پر اور اپنی نوعیت کی نہ صرف اردو میں بلکہ شاید دنیا کی اور زبانوں میں بھی سب سے زیادہ طویل نظم ہے۔اس پر بھی ملک میں اس قدر مقبول ہوئی کہ گھر گھر پڑھی اور کسی زمانے میں بار بار پڑھی گئی۔ایسی طویل نظمیں عموماً پڑھنے والوں کو تھکا دیتی ہیں،لیکن 'مسدس' اس عیب سے پاک ہے۔شروع سے آخر تک پڑھ جایئے ،نہ کہیں گرانی محسوس ہوگی نہ جی اکتائیگا،مسدس حالی کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب اس کا تسلسل اور زبان کی سادگی ہے جو اس کی تاثیر کے وزن کو اول سے آخر تک یکساں قائم رکھے ہوئے ہے۔''

(مضمون 'حالی کا مرتبہ اردو ادب میں،مجنوں گورکھپوری)

حالی نے مسدس کے ذریعہ قوم کو بیدار کیا اور مذہبی اعتبار سے قوم کے اندر موجود کمیوں اور خامیوں کو لوگوں کے سامنے رکھا اور کہا کہ تمہارا ماضی کیسا شاندار تھا اور حال کیسا ہے؟۔پہلے دور جاہلیت سے شروع کرتے ہیں، پھر نبی ﷺ کی آمد کا دور اور ساتھ ساتھ مسلمانوں کے فتوحات اور اقتدار کے حوالوں سے لوگوں میں جوش و جذبہ پیدا کیا جس سے وہ اپنا حال اور مستقبل سنوار سکے۔

سرسید احمد خاں خود علمی و ادبی اور قوم و ملت کی خیر خواہی کے کاموں میں ہمیشہ مصروف رہتے تھے۔ اور ساتھ ساتھ اپنے رفقاء کو بھی اس کی ترغیب دلاتے تھے۔اس سلسلے میں الطاف حسین حالی سے 'مسدسِ حالی' لکھوائی اور وہ مکمل ہونے کے بعد جیسے مسدس سرسید کے پاس پہنچی تو وہ خوش ہوئے اور اس سے متعلق سرسید کا ایک خط مولانا الطاف حسین حالی کے نام ملاحظہ فرمائیں جس میں ''مسدسِ حالی'' کو وہ اپنے نجات کا ذریعہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جناب مخدوم و مکرم من عنایت نامہ مع پانچ جلد مسدس پہنچے جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہوگئی اگر اس مسدس کی بدولت فنِ شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہے کہ صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے۔بیان سے باہر ہے۔تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی

مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہات دوراز کار سے جو مایہ ناز شعروشاعری ہے بالکل مبرا ہے کیونکہ ایسی خوبی وخوش بیانی اور موثر طریقے سے ادا ہوا ہے متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جاسکتے۔ حق یہ ہے جو بات دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے۔ نثر بھی نہایت عمدہ اور نئے ڈھنگ کی ہے پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اڑایا ہے یا ادا کیا ہے میری نسبت جو اشارہ اس نظم میں ہے اس کا شکر کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں اگر پرانی شاعری کی کچھ بو اس میں پائی جاتی ہے تو صرف انہی الفاظ میں ہے جن میں میری طرف اشارہ ہے بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اعمال حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا میں کہوں گا کہ حالی سے 'مسدس' لکھوالایا ہوں اور کچھ نہیں۔۔۔۔۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔ مسجدوں کے اماموں کو چاہیے کہ خطبوں میں اسی کے بند پڑھا کریں۔''

(رسالہ فکر ونظر، سرسید نمبر، علیگڈھ، ۲۰۱۷ء، ص ۳۴۲)

حالؔی ایک ایسے ادیب ہیں جنھوں نے اردو شاعری اور ادب کو نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ انھوں نے ''مسدس مدوجزرِ اسلام'' لکھ کر مسلمان قوم کو خواب خرگوش سے جگایا۔ حالؔی سرسید احمد خاں کے عقیدت مندوں اور علی گڑھ تحریک کے سرگرم رفقاء میں سے تھے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں بڑی باقاعدگی سے شرکت کیا کرتے تھے۔ مولانا حالؔی ساری زندگی سرسید کے سحر سے نہ نکل سکے انھوں نے بھی اپنی ذاتی زندگی کی ساری خوشیوں اور آسائشوں کو برصغیر کے مسلمانوں کی اصلاح پر قربان کر دیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو شوکت رفتہ کا جو مرتبہ مسدس کی صورت میں لکھا تھا اس کے اثرات ان کے خطوط میں بھی نمایاں ہیں۔

اردو شاعری میں مولانا حالؔی کا اعلیٰ ترین کارنامہ ان کی طویل نظم ''مدوجزر اسلام'' ہے جو عام طور پر ''مسدس حالی'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس نظم میں مسلمانوں کے ماضی کے تاریخی واقعات کی جھلکیوں کا عکس ملتا ہے۔ اس نظم میں نہ صرف قوم کی سابقہ عظمت اور شان وشوکت پر بحث کرتے ہوئے موجودہ دور میں ان کی غیرت کو للکارا ہے۔ بلکہ اس کو تاریخی وقعات کے ساتھ بیان کر کے ان کی عہد بہ عہد ترقی اور تنزل کے اسباب اور وجوہات کو بھی بیان کیا ہے۔ جس سے مولانا کے تاریخ اسلام کے گہرے مطالعے اور آگاہی کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے عہد بہ عہد تاریخی واقعات کو نمونے کے طور پر نظم کا روپ دے کر مسلمان قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ ❁❁❁

مسدس حالی کا مذہبی تناظر ۔ایک مختصر جائزہ

کے۔ نادرہ بیگم

اسلامیہ ویمنس آرٹس اینڈ سائنس کالج، وانمباڑی

اردو نثر کے عناصر خمسہ کے اہم اور ممتاز رکن کی حیثیت سے مولانا الطاف حسین حالی بہت مشہور ہیں ۔ان کی شخصیت بڑی ہی جامع الکمالات تھی حالی کو اس بات کا بھی فخر حاصل ہے کہ انھوں نے جدید اردو نظم کی بنیاد رکھنے میں مولانا محمد حسین آزاد کا ہاتھ بٹایا۔اردو کی مشہور طویل نظم'' مدوجزر اسلام''مولانا حالی کی ایک شاہکار تصنیف ہے ۔حالی نے پہلے پہل ایسے عنوانات پر نظمیں لکھیں جنھیں اس سے قبل اردو شاعری میں نظر انداز کیا جاتا رہا۔حالی کی وطن دوستی ،قوم وملت کا درد اور جذبے کی تڑپ نے انھیں اس شاہکار تصنیف پر آمادہ کیا، جو ان کے ہر لفظ میں نمایاں ہے ۔دل سے نکلی ہوئی بات دل پر اثر کرتی ہے ۔اس کے بھرپور نمونے ان کی تصنیفات میں بکھرے نظر آتے ہیں۔وطن دوستی کو حالی ایمان کا جز وسمجھتے تھے ۔اپنی اس شاہکار تصنیف میں حالی زمانے کی ناسازگاری اور قوم کی بدحالی پر صرف ماتم نہیں کرتے بلکہ ان انھیں درست کرنے کی بھی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔انھوں نے اسلام کے ماضی اور اپنے اسلاف کی بلند روایات کے تحفظ کی کوشش کی ہے۔حالی کے خیال کے مطابق مسلم قوم کی مصیبتوں کا تدارک اسی طرح سے ممکن تھا۔اپنی نظم مسدسِ حالی اور شکوۂ ہند میں حالی نے مسلمانوں کا ماضی یاد دلانے کے علاوہ، حال کے تقاضوں سے بھی عہدہ برآنے کی کوشش، جس دل سوزی اور دلیری سے کی ہے ان کے عہد کے کسی دوسرے شاعر نے نہیں کی ۔اس نظم کی تصنیف سرسید احمد خاں کی تحریک پر ہوئی تھی۔اسلام کے عروج و زوال کا یہ بہترین مرقع ہے اور شاہکار ادب پارہ۔

مسدس حالی کو سرسید اپنی نجات کا ضامن تصور کرتے تھے۔اس نظم کو رام بابو سکسینہ ایک الہامی کتاب قرار دیتے تھے۔اس میں اسلام کی گذشتہ عظمت، سابق مسلمانوں کے کارنامے، ان کے بلند خیالات اور اولو العزمی کے برخلاف موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی پستی، سستی اور زوال کا ذکر ہے۔اس نظم کو حالی نے اسلام کے مدوجزر کی کہانی اور مئوثر تاریخ بیان کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔اس کے بہت سے بند واعظوں کی زبان پر جاری ہیں۔

اس طویل نظم میں مولانا حالی نے طلوعِ اسلام سے پہلے ملکِ عرب کی ابتر حالات ، پھر اللہ کے

رسول ﷺ کی بعثت ، اوران کی تعلیمات ، اسلام کا عروج ،مسلمانوں کی دینی ، اخلاقی ، سماجی اور دیگر ترقیات میں سبقت بیان کی ہے۔ پھر مسلمانوں کا زوال اور خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے زوال پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ اسلامی وراثت کا حاصل ہونا ، پھر کھو دینا، اسلامی عقائد اور خیالات پر بحث کی ہے ۔مسدس حالی کے مطالعہ سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ کامیابیوں کے جتنے عنوان ہیں۔ سب اللہ کے رسول کے احکام سے منسلک ہیں جنھوں نے زندگی کے ہر پہلو کا ایک معیار بتایا۔ حالی نے نظم کے آخری بند میں بڑے پتے کی بات بتائی ہے کہ ہر چیز کو فنا ہے اور احساسِ فنا بڑا تسلّی بخش احساس ثابت ہوسکتا ہے ۔

حالی نے اسلامی تعلیمات کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ اس نظم میں کیا ہے۔ مسلمانوں کو غیرت دلا کر ان کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعثتِ رسول ﷺ کے طفیل ایسا عظیم انقلاب برپا ہوا جس کے اثر سے عرب کے لوگ جو جانوروں سے بدتر زندگی گزار رہے تھے، صحیح معنوں میں انسان بن گئے ۔ حضور ﷺ نے زندگی کے تمام پہلوؤں میں انسانیت کی مکمل اہنمائی کی جس کے نتیجے میں مسلمان ابرِ رحمت کے مانند ساری دنیا پر چھا گئے ۔ آپ نے جہالت اور گمراہی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی قوم کو جہانداری اور جہاں بینی کے اصولوں سے آشنا کیا۔ واقعتاً مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے اور ان پر چھائے جمود توڑنے اور انہیں عمل کی طرف مائل کرنے میں اس نظم کا بڑا حصّہ ہے۔ جناب رسالت مآب کی شان میں جو چند بند حالی نے کہے ہیں ان میں حبِ نبی ﷺ کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ، ضعیفوں کا ماویٰ یتیموں کا والی ، غلاموں کا مولیٰ

مسلمانوں کا جاہ وجلال اور عزت وحرمت اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے سے تھی۔ جب مسلمانوں نے مذہب سے روگردانی کی اور عیش وعشرت میں پڑ گئے ۔ اپنے فرائض سے چشم پوشی کرنے لگے تو ان کی تمام شان وشوکت اور عظمت وبرتری خاک میں مل گئی۔ اور وہ برائے نام مسلمان رہ گئے ۔

مسدّسِ حالی میں جہاں قوم کی زبوں حالی کے اسباب کی نشاندہی کی گئی ہے وہیں اسلام کے بنیادی اصولوں سے نافرمانی، بے راہ روی اور گمراہی سے بچنے کی بھی تلقین کی ہے۔ حالی مسلمانوں کو توحید کا دامن تھامے رکھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ شرک و بدعت اور نافرمانی سے دور رہنے کی تاکید کرتے ہیں۔

معاشرتی اور سماجی برائیوں سے بچ کر توحید پر عمل کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔

اس نظم میں حالی نے مسلمانوں کی غفلت کا بڑا ہی دردانگیز نقشہ پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمان خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہیں اور اہلِ یورپ ان کی اس غفلت کا بھرپورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ کسی کو اس بات کا احساس نہیں۔

بچوگے نہ تم اور نہ ساتھی تمہارے اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے

خوابِ غفلت کی انتہا یہ ہے کہ مسلمان، مسلمان کے ساتھ دستِ گریبان ہے۔ نظم کے آخر میں مسلمانوں سے درخواست کی گئی ہے کہ تاریخِ عالم میں پہلے ان کا جو مرتبہ تھا، اس کو حاصل کرنے کے لئے ہمّت کریں، کمر باندھیں۔ اس بیداری کا یہ نتیجہ کہ آج مسلمان دنیا کے نقشے پر ایک علاحدہ آزاد اور خودمختار دیکھے جاسکتے ہیں۔ بقول انور سدید:

> ''یہ نظم کی اردو کی مقصدی شاعری میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے اس طویل نظم میں حالی نے قوم کی دکھتی ہوئی رگ کو ایک ماہر نباض کی طرح پکڑا ہے اور مؤثر انداز میں شعر کا روپ دیا ہے۔''

بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

> ''یہ نظم دکھے ہوئے دل کی پکار ہے ایک مخلص انسان کی آنکھوں سے ٹپکا ہوا آنسو ہے ایک مصلح کا پیام ہے اور ایک رہنما کا نعرہ''

الغرض پوری نظم مسدّسِ حالی پڑھنے سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ کامیابی اور ترقی کے جتنے عنوان ہیں سب اللہ تعالی کے احکام کی اطاعت و رسولِ اکرم ﷺ کی تعلیمات کی پیروی میں منحصر ہیں۔

کلامِ اقبالؔ میں قرآنی تلمیحات

ڈاکٹر ایس محمد یاسر
صدرِ شعبۂ اردو، سی عبدالحکیم کالج اٹانامس (خودمختار)

علامہ اقبالؔ کا شمار بیسویں صدی کے ایسے شعراء میں ہوتا ہے، جنہوں نے کلامِ الٰہی 'قرآنِ مجید' سے اپنے والہانہ لگاؤ اور شغف کی وجہ سے اپنے کلام میں قرآنی الفاظ' اشارات' تلمیحات اور قرآنی فکر کو پیش کیا ۔ بلاشبہ علامہ اقبالؔ اردو کے صفِ اول کے ممتاز اور نمائندہ شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں' جو اس لحاظ سے انفرادیت کے حامل ہیں کہ ان کے ہاں 'کتابِ الٰہی' سے غیر معمولی شغف پایا جاتا ہے۔

علامہ اقبالؔ اپنی افتادِ طبع، مناسبتِ مزاج، فکری رجحان اور قلبی میلان کے باعث کلامِ الٰہی سے حیرت انگیز طور پر غیر معمولی شغف وانہماک رکھتے تھے۔ آپ نے اپنے افکار اور خیالات کو کلامِ ربّانی سے اخذ کیا تھا، جس کی وجہ سے آپ کے ہاں شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآنِ مجید کے الفاظ، معانی ومفاہیم کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ آپ کے ہر دور کے کلام میں آیاتِ قرآنی کے الفاظ، قرآنی اشارے اور قرآنی تعبیرات ملتی ہیں۔ اس سلسلہ میں کلامِ اقبال میں بہت سے اشعار موجود ہیں:

قرآں میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآں
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر
اب میری امامت کے تصدّق میں ہیں آزاد محبوس تھے اعراب میں قرآن کے

ہر چند کہ اردو زبان اپنے مزاج اور منہاج کے لحاظ سے اسلامی تلمیحات اور قرآنی لفظیات سے مختلف سطحوں پر ہم آہنگ ہے، تاہم بیسویں صدی کے اوائل ہی میں علامہ اقبالؔ کے ذریعہ اردو شاعری میں ایک نئے آہنگ کا اضافہ ہوا، جو اپنی ساخت اور بنیاد کے لحاظ سے کافی مضبوط، مستحکم اور توانا تھا۔ بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ یہیں سے علامہ اقبالؔ فکری وفنی سطح پر اپنی انفرادیت بھی حاصل کرنے لگتے ہیں، اور ان کے فلسفیانہ افکار وخیالات، اپنی تمام علمی، تاریخی واستدلالی بصیرت کے ساتھ الٰہیات، قرآنیات اور اسلامیات کے امتزاج کے ساتھ ساتھ فارسی واردو شاعری کی بیش بہا فنی روایات، لفظیات

اوراستعارات وتلمیحات کے ہمراہ جلوہ گر ہوتے ہیں۔

جہاں تک تلمیحات کا تعلق ہے، علامہ اقبالؔ نے اردو شاعری میں موجود تلمیحات کو اپنے افکار کے مخصوص سیاق وسباق میں استعمال کر کے بالخصوص قرآنی تلمیحات کے مفاہیم کو وسعتیں عطا کر دی ہیں۔مثلاً اقبال کا یہ شعر

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم عصا نہ ہوتو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

حضرت موسیٰ کا لقب کلیم اللہ ہے اور عصا آپ کو بطورِ معجزہ عطا کیا گیا تھا،لیکن اقبالؔ نے اس شعر میں ''عصا'' اور ''کلیمی'' کو جن تلمیحی معنوں میں استعمال کیا ہے، وہ اقبالؔ ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں مذکور ''رشی'' اور ''برہمن'' کے اشارے بھی نہایت اہمیت کے حامل ہیں کیوں کہ رشی اپنی فاقہ کشی پر مجبور ہے اور مدِ مقابل برہمن کا طلسم بجائے خود نہایت مضبوط اور مستحکم ہے۔ اس مصرعۂ اولیٰ کے بعد عصا اور کلیمی، جو ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں، یہ ثابت کرتے ہیں کہ اضداد ہی سے حقائق مبرہن ہوتے ہیں اور حق و باطل میں معرکہ آرائی، دراصل ازل سے ابد تک کا نامختتم سلسلہ ہے۔حق و باطل کے درمیان صف آرائی، جس میں حق کی فتح اور باطل کی شکست قطعی اور یقینی ہے۔اسی مفہوم میں اقبالؔ نے کہا ہے

ستیزہ کار ہے رہا ہے ازل سے تاامروز چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

گویا فکری اعتبار سے اقبالؔ حق و باطل کی معرکہ آرائی میں غلبہ اور فتح مندی کے لئے زورِ بازو، طاقت وجرأت،عزم وحوصلہ، دلیل و برہان، روحانی و مادّی وسائل کے استعمال پر زور دیتے ہیں۔دراصل ''عصا'' ایک قوت کا اشاریہ ہے اور اِسے اقبالؔ نے تلمیحی وعلامتی پیرایہ میں استعمال کر کے کلیمی کے لئے اس کی اہمیت اجاگر کی ہے۔اگر کلیمی مطلوب ہے تو عصائے کلیم بھی لازمی ہے، ورنہ خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا۔

اقبالؔ نے اس شعر میں رشی اور برہمن کے فرضی تصادم سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بغیر وسائل کے محض فاقہ کشی اور جفاکشی سے کوئی نتیجہ خیزی نہیں ہوسکتی کیوں کہ برہمن نہایت مضبوط اور طاقتور تھا کہ رشی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔

لیکن یہی کیفیتِ تصادم جب حضرتِ کلیم کو درپیش ہوئی تو معجزۂ الٰہی ''عصا'' کی شکل میں موجود تھا۔ لہٰذا فرعونیت اپنے انجام سے دوچار ہوئی۔

فکری وفنی سطح پر یہ شعر جتنا مکمل اور اپنی جگہ ترسیل میں کامیاب ہے۔اس کا تعلق تأثر آفرینی سے ہے۔تحیر،تجسس اور تہہ داری کا بے مثال نمونہ ہے' لیکن تأمل سے اس کے مفاہیم اور ''تلمیح'' کی جلوہ گری صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔

فنونِ لطیفہ سے متعلق یہ مصرعہ تو ضرب المثال کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

گویا اقبالؔ نے ہنرمندی کے لئے ''ضربِ کلیمی'' کو لازمی قرار دے کر تلمیحی معنوں میں تہہ داری پیدا کی ہے۔ضربِ کلیمی کی معنویت،عصائے موسیٰؑ کی معجزانہ حیثیت اور اس کی افادیت سے عبارت ہے۔

یہاں اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اقبالؔ کے ہاں ضربِ کلیمی کے بغیر معجزۂ جن کی نمود نہیں ہوسکتی اور ضربِ کلیمی سے جو ہنر محروم ہو، وہ ہنر نہیں ہوسکتا۔شاید اقبالؔ نے اپنے مجموعۂ کلام ''ضربِ کلیم'' کو بھی اسی تناظر میں موسوم کیا۔

اقبالؔ کے ہاں بطور خاص حضرت موسیٰؑ علیہ السلام اور آپ کے معجزات کی تلمیحات قدرے زیادہ ملتی ہیں۔شاید اس کی بدیہی وجہ یہی ہے کہ قرآن مجید میں اس ضمن میں تفصیلات زیادہ ہیں اور موسیٰؑ اور فرعون کا تصادم گویا معرکۂ خیر وشر اور رزم گاہِ حق وباطل ہے۔

موسیٰ علیہ السلام، شبالی وادیٔ سینا، کوہِ طور، ذوقِ تکلم، اَرنی، لن ترانی، عصائے موسیٰؑ، ضربِ کلیم، یدِ بیضاء، فرعون، سامری وغیرہ ایسے جلی عناوین ہیں' جن سے تلمیحاتِ قرآنی کا معتد بہ حصہ عبارت ہے۔ اور حق وباطل کا معرکہ گویا موسیٰؑ وفرعون اور موسیٰؑ وسامری کے تصادم کا علامتی اظہار یہ ہے۔بقولِ اقبالؔ

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰؑ طلسم سامری

جب حق وصداقت کی معرکہ آرائی باطل سے ہوتی ہے تو حق یدِ بیضاء، کلیم اللّٰہی اور ضربِ کلیمی کے اوصاف سے متصف ہوتا ہے، جو فتح مندی سے ہمکنار کرتا ہے

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک مگر غم کیا کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضاء

حضرت موسیٰؑ کا زمانہ، جادو کے عروج کا زمانہ تھا، جادوگروں سے آپ کا جو مقابلہ ہوا، قرآن میں مذکور ہے، نتیجۂ کار کے طور پر تمام جادوگر سجدہ ریز ہوگئے اور فرعونیت کے علی الرغم ایمان کی دولت سے

مالا مال ہوئے۔اس واقعہ کو اقبالؔ نے تلمیحی معنوں میں استعمال کیا ہے کہ دورِ حاضر میں دانش مندی ایک سحر اور جادو کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔عقل و دانش،فہم و فراست،عقل و تدبر،فکر و فلسفہ ایک جادو بن کر اذہان پر غالب آ چکا ہے اور کیفیت کچھ ایسی رونما ہوئی ہے کہ ساحرانِ فرعون نے جس طرح،حق سے تصادم کے لئے اپنے فن کو بطور ہتھیار استعمال کیا۔ بالکل اسی طرح الحاد و لادینیت، کفر و طغیان، تمرّد و سرکشی نے علم و فن اور فکر و فلسفہ کو اتنا فروغ دیا ہے کہ ''سحرِ قدیم'' کی یاد تازہ ہو رہی ہے لہذا ضروری ہے کہ اہلِ حق بھی اپنے ہاتھ میں عصائے موسیٰؑ تھام لیں اور اس معرکۂ ایمان و مادیت میں چوبِ کلیم سے کام لیں۔

تازہ پھر دانشِ حاضر سے ہوا سحر قدیم گذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیمؑ

کوئی اگر کلیم الٰہی صفات سے متصف ہو جائے تو وہی حالات دوبارہ پیش آ سکتے ہیں، جو صرف کلیم اللہٰی سے مخصوص ہیں۔ یہاں اقبالؔ تلمیحی طور پر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دورِ حاضر کے فرعون سے معرکہ آزما ہونے سے پہلے اوصافِ موسیٰؑ سے متصف ہونا ضروری ہے۔جیسے اقبالؔ کہتے ہیں:

مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی

اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ ''لاتخف'' اور اسی لئے اقبالؔ کہتے ہیں کہ کلیمی سے پہلے شبانی سے سابقہ پڑتا ہے جس کے لئے کسی شعیب کا میسّر آنا ضروری ہے۔

اگر کوئی شعیب آئے میسّر شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

اقبالؔ کے ہاں ایک عمومی فکر یہ ہے کہ علم و دانش تحقیق کے طالب ہیں اور تحقیق و جستجو کہیں منتج نہیں ہوتی۔دل کا ربط و تعلق ذوق و وِجدان سے ہوتا ہے۔اقبالؔ نے ایک نظم میں ''عقل و دل'' کا مکالمہ بھی پیش کیا ہے۔لہذا اقبالؔ یہ دعوت دیتے ہیں کہ

خیمہ زن ہو وادیٔ سینا میں مانند کلیم شعلۂ تحقیق کو نحارت گر کا شانہ کرا

یہاں اقبالؔ نے واقعۂ موسیٰ کے ایک پہلو کو تلمیحی جہت میں استعمال کیا ہے۔حضرت موسیٰ نے جس طرح وادیٔ سینا میں پڑاؤ ڈالا اور پھر جو واقعات پیش آئے،انہیں صرف عقل و دماغ کی کسوٹی پر پرکھا نہیں جا سکتا۔

واقعۂ حضرت موسیٰ کلیم اللہ کی تلمیح اردو میں صرف ''ارنی'' اور ''لن ترانی'' تک تغزل میں محدود

تھی ،لیکن اقبالؔ نے اپنی قرآنی بصیرت ،شاعرانہ فنکاری اور چابکدستی سے قرآنِ مجید میں مذکور واقعے کی مختلف کڑیوں سے منفرد تلمیحات تخریج کیں اور انہیں اپنے مخصوص فکری سیاق وسباق میں استعمال کر کے امتیاز حاصل کیا ہے۔

علامہ اقبالؔ کے ہاں جو مخصوص قرآنی تلمیحات ملتی ہیں ،ان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے مختلف قرآنی قصص وواقعات بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

اقبالؔ نے علم بلاغت جو بیان کی صنعت تشبیہہ کو بھی تلمیح میں استعمال کیا ہے۔تشبیہہ تمثیل کی ایک شاندار مثال نظم ''خضرِ راہ'' کا درجِ ذیل شعر بھی ہے،جس کا پس منظر تلمیح سے عبارت ہے

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

درجِ بالا شعر میں جس عمدگی سے قرآنی تلمیح کو نظم کیا گیا ہے کہ اس میں ''سہلِ ممتنع'' کا وصف پیدا ہو گیا،اقبالؔ ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

'اولادِ ابراہیم' کے ذریعہ اقبالؔ فرزندانِ توحید کو فرضِ منصبی کا احساس دلانا چاہتے ہیں۔'نمرود دراصل تمرد وطغیان،ظلم وعدوان اور انکار وکفران کی علامت ہے۔''آگ'' آزمائش اور ابتلاء کی علامت ہے۔ کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے؟۔

ایک اور جگہ اقبال نے اسی قرآنی تلمیح کو نہایت مؤثر طور پر پیش کیا ہے۔جوابِ شکوہ میں کہتے ہیں:

آج بھی ہو جو براہیم سا ایماں پیدا آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

حالات وواقعات اور کیفیات کے تطابق کی صورت میں نتائج میں بھی مطابقت ہوگی۔اس تلمیحی شعر میں بھی اقبالؔ نے ''سہل ممتنع'' کی صورت پیدا کر دی ہے۔اِس شعر کو اقبال نے جس سیاق وسباق میں استعمال کیا ہے،وہ خود بھی شعر کی اثر آفرینی میں اضافہ کا موجب ہے۔

اقبالؔ نے حضرت ابراہیم علیہ اسلام کے اسی واقعہ کی قرآنی تلمیح کو ''عقل ودل'' کے معرکہ کے ضمن میں بھی پیش کیا ہے۔عقل،حسبِ سابق اقبالؔ ہی کے الفاظ میں:

عقل، غیاب و جستجو عشق، حضور و اضطراب

علامہ اقبالؔ نے جن مخصوص قرآنی تلمیحات کو اپنے کلام میں استعمال کیا ہے۔ان میں واقعۂ موسیٰؑ

کے بعد زیادہ تر تلمیحات حضرت ابراہیم علیہ اسلام کے واقعات سے مستعار ہیں۔ جوابِ شکوہ میں ایک جگہ اقبالؔ کہتے ہیں

بت شکن اٹھ گئے، باقی جو رہے بت گر ہیں تھا ابراہیم پدر، اور پسر آذر ہیں

بت شکن اور بت گر کے ذریعہ اقبالؔ نے صنعتِ تضاد کو استعمال کیا ہے۔ اسی طرح پدر اور پسر بھی قلب کی صورت میں مستعمل ہوئے ہیں۔ تھا ابراہیم پسر اور پدر آذر تھا لیکن شاعر نے یہاں برعکس صورتِ حال کی عکاسی کے لئے صرف دو لفظوں کے ردوبدل سے اپنے مطلوبہ مفہوم کو عمدہ پیرایہ میں ذہن نشین کرایا ہے۔

گویا جنہیں بت شکن بننا تھا۔ الٹا بت فروشی اور بت گری میں لگے ہوئے ہیں۔ توحید کے علم بردار اپنی بنیادی خصوصیت سے محروم ہو گئے ہیں۔

ایسی صورتِ حال میں جب کہ پدر ابراہیم ہے لیکن پسر پھر آذری کے اوصاف سے متصف ہونا سرمایۂ افتخار سمجھ رہے ہیں۔ شعر کی داخلی اور خارجی فضا اسی تاثر کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

یہاں یہ تصریح بھی ضروری ہے کہ اقبالؔ کے ہاں قرآنی تلمیحات کا استعمال صرف فنی بنیادوں پر نہیں بلکہ فکری اور شعوری سطحوں پر ہوا ہے۔ قرآنی تلمیحات کا استعمال کوئی علم بلاغت، علم معانی کی تکنیک نہیں کہ جسے فنکار محض اپنے فنی رکھ رکھاؤ تجربے اور مشق سے حاصل کر سکے۔ قرآنی تلمیحات کے استعمال کے لئے قرآنی فکر سے آہنگ ہونا پڑتا ہے۔ قرآن کریم کو اپنے شعور میں جزوِ مزاج کے طور پر پیوست کرنا پڑتا ہے۔ یہ تمام کوشیش شعوری طور پر کسبی بھی ہوتی ہیں اور قدرتی طور پر وہبی حیثیت سے عطا بھی کی جاتی ہیں، اور یہاں ہمارا استدلال یہ ہے کہ علامہ اقبالؔ وہبی اور کسبی دونوں حیثیتوں سے اس نعمت سے مالا مال تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ اسلام اور نارِ نمرود کی ابتلا و آزمائش پر ایک جگہ اقبالؔ نے بجا طور پر کہا ہے ؎

کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

علامہ اقبالؔ نے اپنی نظم ''**لاالہ الااللّٰہ**''، میں بھی تلمیحاً حضرت ابراہیم علیہ اسلام کا ذکر کرتے ہوتے کہا ہے

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے صنم کدہ ہے، جہاں 'لاالـــہ الاالـلّـــہ'

اسی طرح علامہ اقبالؔ نے اپنے کلام میں بہت سے مقامات پر حضرت ابراہیم علیہ اسلام کی آزمائشوں اور امتحانوں کا ذکر کیا ہے۔ جن میں سب سے اہم آزمائش فرزندِ ارجمند کی قربانی سے متعلق تھی۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی ! سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی؟

بہ اعتبارِ مجموعی اقبالؔ کے ہاں جو مخصوص تلمیحات ملتی ہیں، ان میں حضرت موسیٰ علیہ اسلام اور حضرت ابراہیم علیہ اسلام کے متعلق مذکور قرآنی واقعات کی تلمیحات زیادہ ہیں۔

اگر چہ کہ اقبالؔ کے ہاں حضرت آدم علیہ اسلام سے متعلق تلمیحات بھی نسبتاً زیادہ ہیں، تاہم بالعموم اقبالؔ کے ہاں قرآنی تلمیحات میں حضرت موسیٰ علیہ اسلام اور حضرت ابراہیم علیہ اسلام سے متعلق تلمیحات کا دائرہ قدرے وسیع تر ہے۔

علامہ اقبالؔ کے کلام میں قرآنی تلمیحات کا جو وفور اور تلمیحات کے استعمال میں جس فراخدلی سے کام لیا ہے اس کے پیشِ نظر یہی کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان میں اس سلسلہ میں کوئی شاعر علامہ اقبالؔ سے ہم سری کا مدعی نہیں ہے۔ بلکہ بشمول عربی دیگر زبانوں میں بھی قرآنی تلمیحات کے معاملہ میں اقبالؔ کی انفرادیت مسلم ہے۔ اقبالؔ کے ہاں قرآنی اشارات، قرآنی تعبیرات قرآنی استعارات اور قرآنی لفظیات بھی ملتے ہیں۔ لیکن سب سے اہم ''قرانی تلمیحات'' ہیں کہ آپ نے تلمیحات کو نئی جہتوں اور جدید معنیاتی اُبعاد میں استعمال کیا ہے۔

''کلامِ اقبالؔ میں قرآنی تلمیحات کے جائزہ'' کے تحت یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اقبالؔ کے ہاں قرآنی تلمیحات ایک نئے جہانِ لفظ و معنی کے ساتھ جلوہ گر ہیں، اور بیسیوں اشعار کی عمارت ہی قرآنی تلمیح کی بنیاد پر کھڑی ہے۔

علامہ اقبالؔ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ وغیرہ سے متعلق تلمیحات پر خصوصی توجہ مرکوز کی ہے اور ان تلمیحوں سے بے شمار اشعار ترتیب دیئے ہیں۔ علاوہ ازیں قرآنی تلمیحات کو اقبالؔ نے اپنے مخصوص فکری و فنی تجربات سے ہم آہنگ کر کے لازوال بنا دیا ہے۔

اقبال کی غزلوں میں قرآنی تلمیحات

گلزار احمد ماگرے

ریسرچ اسکالر یونیورسٹی آف حیدرآباد

ان حسن یا خوبصورتی کو پسند کرنا انسان کی فطرت ہے۔ جیسے ہر کوئی انسان اپنی آرائش کے لیے اچھے کپڑے زیب تن کرتا ہے ویسے ہی ادیب وشاعر اپنے کلام کو مزین کرنے کے لیے علم بدیع یعنی صنعتوں کا استعمال کرتے ہیں۔ صنعتوں کے استعمال سے کلام میں تاثیر اور چاشنی پیدا ہوتی ہے۔ انہی صنعتوں میں سے ایک صنعتِ تلمیح بھی ہے۔ جہاں اقبال نے اپنے کلام کو تشبیہات واستعارات سے زینت بخشی وہاں انہوں نے اپنے کلام کو تلمیحات سے بھی مزین کیا ہے۔ ان کے کلام میں تلمیحات کا کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ ان میں سے اکثریت اسلامی تلمیحات کی ہے۔ اس مقالہ میں قرآنی تلمیحات کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔ جس کے سبب ان کے کلام کے ان شعری نمونوں کو پیش کیا جائے گا جن میں قرآنی تلمیحات کا استعمال ہوا ہو۔ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ پہلے اس صنعت کی تعریف پیش کی جائیگی۔ ڈاکٹر مصاحب علی لکھتے ہیں:

> ''تلمیح وہ صنعتِ معنوی ہے جس میں شاعر اپنے کلام میں کسی مسئلہ مشہور یا قصہ یا قول یا مثل یا اصطلاحِ نجوم یا موسیقی وغیرہ کی طرف لطیف اشارہ کرے، جس کے بغیر معلوم ہوئے اور بے سمجھے کلام کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں نہ آوے۔ آیت قرآن پاک کا لانا، کسی معجزہ کا ذکر کرنا، کسی حدیث کو نظم کرنا، کسی تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کرنا تلمیح کی تعریف سے خارج از بحث نہ سمجھنا چاہیئے'' (اردو ادب میں تلمیحات، ڈاکٹر مصاحب علی صدیقی، نظامی پریس لکھنو، اشاعت ۱۹۹۰، ص ۶۰)

لفظ ''حور'' کا ذکر قرآن پاک میں بیشتر جگہوں پر آیا ہے۔ سورۃ الدّخان میں جہاں اللہ تعالی نے مومنین کے لیے جنت کی نعمتیں گنوائی ہیں وہاں یہ بھی ارشاد فرمایا گیا ہے ''**کذالک وَزَوَّجنٰھُم بِحُورٍ عِین**''۔ ترجمہ (اسی طرح ہوگا اور ہم ان سے بیاہ دیں گے بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں)۔ سورہ دخان آیت نمبر ۵۴۔

یہ جنّت مبارک رہے زاہدوں کو کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

قرآن پاک میں جنت کا ذکر کئی مرتبہ آیا ہے۔ جنت عالم برزخ میں وہ مقام ہے جہاں پر اللہ کی طرف سے بیشتر نعمتیں میسر ہوں گے۔ وہاں ان لوگوں کو داخل کیا جائے گا جن پر اللہ کا فضل وکرم ہو۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرماتے ہیں ''**اعد اللہُ لھم جنٰتٍ تجری من تحتھا الانھٰرُ خٰلدین فیھا ذٰلک الفوزُ العظیم**'' ۔یعنی (اللہ نے ان کے لیے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے دامن میں یا جن کے نیچے ندیاں بہتی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ یہی ہے بہت بڑی کامیابی)۔ سورۃ التوبہ آیت نمبر ۸۹۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

حضرت اسماعیلؑ برگزیدہ پیغمبر اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند تھے۔ مذکور ہ شعر میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جب ابراہیمؑ نے خواب میں اپنے بیٹے اسماعیلؑ کو ذبح کرتے ہوئے دیکھا۔ اور پھر انہیں اس خواب کے بارے میں کہا تو وہ اللہ کے لئے ذبح ہونے کے لئے بالکل تیار ہوئے اور یوں اپنے والد کی فرمابرداری کا بھی اعلیٰ ثبوت دیا۔ اللہ تعالیٰ سورۃ الصٰفٰت میں ارشاد فرماتے ہیں'' **فلما بلغ معہُ السّعی قال یٰبنیّ اِنّی اَریٰ فی المنام اَنّی اَذبحک فانظر ما ذا ترا ،قال یٰاَبتِ افعل ماتؤمر ستجِدُنّی اِن شآ ءَ اللہُ من الصّٰبرین**'' ۔ترجمہ (پھر جب وہ پہنچا اس کے ساتھ بھاگ دوڑ کرنے کی عمر کو اس نے کہا: اے میرے بیٹے! میں دیکھ رہا ہوں خواب میں کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں تو دیکھو! تمہاری کیا رائے ہے؟ اس نے کہا: ابا جان! آپ کر گزریئے جس کا آپ کو حکم ہو رہا ہے۔ اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے)۔ سورۃ الصافات آیت نمبر ۱۰۲۔

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ
خودی ہو علم سے محکم تو غیرت جبریل اگر ہو عشق سے محکم تو صور اسرافیل

ان اشعار میں دو تلمیحات ہیں جبریل اور اسرافیل۔ یہاں جبریل کی تلمیح پر بات کی جائے گی اور تلمیحِ اسرافیلؑ کا ذکر آگے آئے گا۔ حضرت جبرئیل اور اسرافیل اللہ کے چار برگزیدہ فرشتوں میں سے ہیں۔ جہاں تک حضرت جبرئیل کا تعلق ہے تو ان کو اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ وہ اللہ کا پیغام اللہ کے نبیوں اور رسولوں تک پہنچائیں۔ قرآن پاک میں جبریل علیہ السلام کی عظمت کا اعتراف بیشتر جگہوں پر کیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔ ''**قُل مَن کان عدُوًّالِجبریلَ فَاِنَّہٗ نَزَّلَہٗ عَلیٰ قَلبِکَ بِاِذنِ اللّٰہِ مُصدِّقًالّما بینن یدیہِ وَ ھُدًی وَّ بُشریٰ لَلمُؤمنین**'' ۔ترجمہ (اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم) کہہ دیجیے جو کوئی بھی دشمن ہو جبرائیل (علیہ السلام) کا تو (وہ یہ جان لے کہ) اس نے تو نازل کیا ہے اس قرآن کو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دل پر اللہ کے حکم سے یہ تصدیق کرتے ہوئے آیا ہے اس کلام کی جو اس کے سامنے موجود ہے اور ہدایت اور بشارت ہے اہل ایمان کے لیے)۔سورۃ البقرہ آیت نمبر ۹۷۔اوپر کے اشعار کے ذیل کے مصرعوں میں اسرافیل کی تلمیح کو دیکھا جا سکتا ہے۔

حضور حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا
مری نوا میں نہیں ہے ادا ے محبوبی کہ بانگِ صورِ سرافیل دل نواز نہیں

حضرت اسرافیلؑ کو اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہ اللہ کے حکم سے اس دن صور پھونکیں گے جس دن قیامت ہوگی۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''**وَنُفِخَ فِي الصُّورِ ذٰلِکَ يَو مُ الوَعِيدِ**'' ۔ترجمہ (اور صور میں پھونکا جائے گا یہ ہے وعدے کا دن) ۔دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے ''**يَومَ ينفخُ فی الصُور فَتَاتُونَ اَفوَاجا**'' ۔ترجمہ (جس دن پھونکا جائے گا صور میں تو تم سب چلے آؤ گے فوج در فوج)۔سورۃ ق آیت نمبر ۲۰ اور سورۃ النبا آیت نمبر ۱۸۔

وہ دانائے سُبل ختم الرسل مولائے کل جس نے غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادی سینا

حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے بندے اور آخری رسول ہیں۔ان کے بعد پیغمبروں کے آنے کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔اللہ تعالیٰ کے بعد حضرت محمد ﷺ وہ ذات ہیں جنہیں روئے زمین کے تمام مسلمان اپنے رہنما اور رہبر مانتے ہیں۔اقبال کے اس شعر میں دو چار تلمیحات ہیں جن میں ''ختم الرسل'' ایک ہے۔اس تلمیح کا تعلق قرآن مجید کے سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر ۴۱ سے ہے۔قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں ''**مَا كان محَمَّدُ اَبآ اَحَدٍ مِّن رِّجَالکم ولکن رَّسولَاللّٰهِ و خاتم النَّبِيّين وَكانَ اللّٰهُ بِكلِّ شَيءٍ عليماً**''

اقبال کے ہاں خاص بات یہ ہے کہ وہ تلمیحات کو تخلیقی ہنرمندی سے برتنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔اسی سبب ان کے ہاں استعمال شدہ تلمیحات کو قاری کبھی آسانی کے ساتھ واقعے سے متعلق محسوس کرتا ہے۔

علامہ اقبالؔ کا اسلامی فلسفہ ۔ مختصر جائزہ

ایس۔جی۔انیسہ بیگم

اسلامیہ ایمنس آرٹس اینڈ سائنس کالج، وانمباڑی

علامہ اقبالؔ ایک ہمہ جہت شاعر ہیں۔ وہ شاعر ہونے کے ساتھ، مفکر اور فلسفی بھی ہیں۔ ایک ایسے مفکر جنہوں نے حیات وکائنات کے مختلف اور متنوع مسائل پر غور وفکر کیا۔ علامہ کی شاعری عروج رفتہ کی صدا ہے، ان کے افکار ونظریات عظمتِ مسلم کے لئے ایک بہترین توجیہ اور جواز فراہم کرتے ہیں، اور اسلام کی انقلابی، روحانی اور اخلاقی قدروں کا پُر اثر پیغام ہے۔ ان کی شاعری میں نرمی جذباتیت ہی نہیں بلکہ وہ حرکت وعمل کا ایک مثبت درس بھی ہے۔ اس سے انسان میں خودی کے جذبے پروان چڑھتے ہیں اور ملت کا تصور نکھرتا ہے۔ ناقدین نے علامہ اقبالؔ کی شاعری کو مختلف پہلوؤں سے پرکھا اور اس کے تنقیدی پہلوؤں کا بھی جائزہ لیا ہے۔ غور کیا جائے تو علامہ کی شاعری اسلام کے بنیادی عقائد جن میں سچائی، عبادات سے محبت، عشق خداوندی اور عشق رسول ﷺ سے عبارت ہے۔

علامہ اقبالؔ کی فکر، توحید اور عشق رسول اللہ سے جڑی ہوئی ہے۔ انہوں نے امت محمدیہ کو یہ پیغام دینے کی مسلسل کوشش کی کہ خود کو جانو اور پہچانو، اپنے آپ کو مایوسی اور یاسیت سے نکالو، اور خود کو قائم و بحال رکھو۔ اس سلسلہ میں جو بھی معرکہ لڑنا پڑے لڑنے کے لئے تیار رہو۔ علامہ اقبالؔ آج اپنی زندہ فکر کی وجہ سے زندہ ہیں۔

اقبالؔ کی فکر اسلامی نظریاتی وتہذیبی پیغام کی علمبردار ہے، علامہ نے ترجیحاً نوجوانوں کو خطاب کیا اور باور کرایا کہ قوم کو باکردار اسلامی نظریہ پر پختگی سے قائم اور جمے ہوئے نوجوان ہی ملت اسلامیہ کی ضرورت ہیں۔ علامہ اقبالؔ نے برصغیر کے مسلمانوں میں بالخصوص فکر اجاگر کی اور اس کی آبیاری کی کہ ''قوموں کی حیات ان کے تخیل پر ہے موقوف'' یعنی کوئی قوم فکر ونظر سے محروم ہو تو انہیں تباہی سے کوئی نہیں بچاسکتا۔ اقبالؔ نے باور کرایا کہ قرآن کریم اپنے نظریہ حق کا کرشمہ بتاتا ہے کہ اپنے ماننے والوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے، اس کے اثر سے دل ودماغ کی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ جو یہ کام کرنے کے لئے تیار ہوجائے تو خیر وشر کا شعور زندگی کو جگمگا دیتا ہے اور جو حق کا دامن چھوڑ دے، اسے طاغوتی طاقتیں روشنی سے نکال کر تاریکیوں میں ڈال دیتی ہیں۔

علامہ اقبالؔ عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑے مفکر اور فلسفی بھی ہیں۔علامہ اقبالؔ مسلمانان برصغیر کے ایک عظیم محسن ہیں،مسلمانوں کو غیر اسلامی نظریات سے مرعوب نہ ہونے اور اپنی دین،ثقافت اقدار سے گہری وابستگی کے ذریعے نشاۃ الثانیہ کی راہ دکھائی۔مصباح الحق صدیقی رقم طراز ہیں :

''اقبالؔ نے پوری امت مسلمہ کے مسائل پر قلم اٹھایا ہے،وہ پوری دنیا کے اتحاد کے علمبردار تھے۔اس اتحاد کے لئے وہ کسی سیاسی دباؤ کے قائل نہیں تھے۔وہ یہ یگانگت صحیح قسم کے جذبہ اخوت اسلامی کے ساتھ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ان کے اس اتحاد کی بنیاد اسلام کے نظریہ حریت فکر واظہار رائے اور مساوات ہے۔''(اقبالؔ افکار وخیالات۔ص۱۳۲)

علامہ نے یہ بھی پیغام دیا اور اپنی فکر کو آشکار کیا کہ نظریہ کی قوت پنہاں کا کمال یہ ہے کہ اپنے ماننے والوں کو جذبہ دیتا ہے کہ ڈرو نہیں،غم نہ کرو تم حق پر ہو تم کو ہی غلبہ پانا ہے،اللہ کی رحمت اور تائید ایسی طاقت ہے جو حزب اللہ کو غلبہ دیتی ہے۔علامہ اقبالؔ کی فکر صرف فلسفہ نہیں یقین محکم ہے،اس کی نگاہ میں محض فلسفیانہ قیاس،شاعرانہ خواب مطمئن نہیں کرسکتی زندگی میں معرکہ آرائی کے لئے زندہ عامل ناگزیر ہے۔ اسلامی،نظریاتی،فکری کام کرنے والے کے لئے فکر وتخیل کی بنیاد پختہ عقیدہ محکم ایمان ہی ہے جو ثبات زندگی اور کشمکش حیات کو قوت دیتا ہے۔علامہ اقبالؔ نے کہا۔

یقین محکم ، عمل پیہم، محبت فاتح عالم جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

علامہ نے شمشیر برآں کو یقین محکم قرار دیا۔علامہ اقبالؔ نہ صرف مسلمانوں بلکہ پورے بنی نوع انسان کو اپنے حیات بخش پیغام سے نوازا۔ان کے احساس کمتری کو دور کرکے ان میں خودی اور خودداری کا جذبہ بیدار کیا۔عمل سے غافل قوم کو سعی پیہم کا درس دیا۔علامہ کی ولولہ انگیز شاعری نے مسلمانان برصغیر کو حریت فکر سے آشنا کیا۔ان کے انقلابی فکر وفلسفہ سے عالم انسانیت کو بالعموم اور عالم اسلام کو بالخصوص ایک نیا جذبہ اور ولولہ ملا جس کی ضیا پاشیوں سے عصر حاضر میں بھی تمام انسانیت بلالحاظ مذہب وملت روشنی حاصل کرتی جارہی ہے۔سید ابوالحسن علی ندوی کہتے ہیں۔

''اقبالؔ حکمت وفلسفہ اور دوسرے علوم ونظری میں بھی اپنی ایک مخصوص رائے رکھتے ہیں۔'' (نقوش اقبالؔ،ص۹۹)

ابتدا میں علامہ اقبالؔ کی نظم ''شکوہ'' پر علمائے اسلام نے بھی تنقید کی جس میں علامہ نے اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوکر تاریخ اسلام کے متعدد حوالوں سے شکوہ وشکایت کی ہے تاہم انہوں نے نظم ''جواب شکوہ''

لکھ کر علماء کا گلہ بھی دور کر دیا۔ دوسری جانب مردمومن کا فلسفہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ علامہ اقبالؔ نے ایک مقام پر یہ فلسفہ انتہائی سادہ الفاظ میں ایک ہی شعر میں سمو دیا ہے۔

یہ راز کسی کو نہیں معلو م کہ مؤمن قاری نظر آتا ہے ، حقیقت میں ہے قرآن

یعنی مردمومن کو چاہیے کہ، اس کے افکار اور کردار دونوں قرآن کے سانچے میں اس طرح ڈھل جائے کہ وہ خود بھی قرآن ہی محسوس ہو۔ انسانی تاریخ، تمام علوم اور ہر طرح کے تمدن تعمیر ہی نہیں ہوسکتا اگر ایمان و یقین پر مبنی اعتقاد کی اساس مہیا نہ ہو، اقبالؔ فرماتے ہیں۔

دین ہو ، فلسفہ ہو ، فقیر ہو، سلطانی ہو ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر

حرف اس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں ہوگیا پختہ عقا ئد سے تہی جس کا ضمیر

علامہ اقبالؔ نے اپنے پیغام کے ذریعے قوم کو حرکت و عمل کا پیغام دیا۔ ان افکار، اسلامی تعلیمات سے کامل ہم آہنگی کے مظہر ہیں۔ علامہ اقبالؔ نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ انسانی زندگی کے ہر دور میں قرآن پاک میں انسانوں کی راہ نمائی کی اہلیت بدرجہ اتم موجود ہے اور قرآن کے اساسی حقائق کبھی دفتر پارینہ نہ بنیں گے۔ علامہ کا تصور یہ تھا کہ ملت اسلامیہ کے لئے قرآن، آئین حیات کا اور اخلاق محمدی ﷺ، اسوہء زندگی کا کام کرتا ہے۔ علامہ نے رسالت ﷺ کو مثالی خودی کا ایک نمونہ اور پیکر بنا کر پیش کیا ہے۔ علامہ اقبالؔ نے رسول کریمؐ کی ثنا یوں کی ہے۔

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا

علامہ کے نزدیک اسلام سراپا حرکت ہے اور ہمہ جہتی جدوجہد کا نام ہے۔ علامہ اقبالؔ کا خیال یہ تھا کہ خاطر جبلت و خالق طبیعت سے ہر لمحہ ہدایت طلب کرتے رہنا اور بہتر تقدیر کے لئے دعا کرتے رہنا چاہیے۔ وہ بال جبرئیل میں کہتے ہیں۔

تری دعا سے فضا تو بدل نہیں سکتی مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

الغرض علامہ اقبالؔ کا شاعری کا واحد مقصد یہ ہے کہ عام انسان فلسفہ خودی کو سمجھ کر اور عشق رسولؐ سمجھ کر اور عشق رسولؐ میں غرق ہوکر، مردمومن بن جائے۔ ان کا فلسفہ مردمومن یہی ہے کہ نئی نسل اپنے اندر اسلامی تصورات فروغ دیں اور اپنے نفس پر قابو رکھے اور طبعیت نیابت الہیٰ سے اپنی زندگی میں تبدیلی لائے اور عمل صالح سے مردمومن کا مرتبہ حاصل کرلیں۔

اقبال کا تصور عشق اور مولانا روم

نثار احمد ڈار

ریسرچ اسکالر

علامہ اقبال کثیر الجہات، عظیم المرتبت اور آفاق گیر شہرت رکھتے ہیں۔ وہ نابغہ روزگار ہستی تھی جو صدیوں بعد کرہ ارض پر ظہور پذیر ہوئی۔ حکیم الامت علامہ اقبال نے جو تصورات پیش کیے ہیں چاہے وہ عشق کا تصور ہو یا خودی کا تصور، مردِ مومن کا تصور ہو، یا عظمتِ آدم کا بیان ہو یا ملتِ اسلامیہ کی بیداری اور سرفرازی کا ذکر، مغربی تہذیب وتمدن اور علم ودانش پر تنقید ہو یا علوم وفنون کی روح کی بات، سب میں عشق کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک عشق ایک عطیہ الٰہی اور نعمتِ ازلی ہے۔ اقبال کے ہاں عشق اور اس کے مترادفات یعنی وجدان، خود آگہی، باطنی شعور، جنون، محبت، دردوسوز، شوق، ارزومندی، جستجوں، مستی اور سرمستی کا ذکر جس تکرار اور شدّتِ احساس کے ساتھ ملتا ہے کسی اور موضوع میں نہیں ملتا ہے۔

اقبال کے تصورِ عشق کو ہم صرف تصوف ووجدان کے ذریعے درک کر سکتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک عشق محض اضطراری کیفیت، ہیجان جنسی، حواس باختہ از خود رفتگی، فنا آمادگی یا محدود کو لامحدود میں گم کر دینے کا نام نہیں بلکہ ان کے یہاں عشق نام ہے ایک عالمگیر قوتِ حیات کا، جذبہ عمل سے سرشاری کا،

طریقہ عشق بازاں کا عجب نادر طریقہ ہے جو کئی عاشق نہیں اس کوں مسلمان کر نہیں گنئے

حصولِ مقصد کے لیے بے پناہ لگن کا اور عزم وآرزو سے آراستہ جہدِ مسلسل کا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کا تصورِ عشق روایتی تصور سے قطعی منفرد اور ہٹ کر ہے۔

مومن از عشق است وعشق از مومن است عشق را ناممکن ما ممکن است

ڈاکٹر علامہ اقبال کے عشق کا تصوّر دیگر کلاسیکی شعرا سے مختلف ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں:

> ''اقبال کا تصوّرِ عشق دوسرے شعرا کے سوقیانہ یا رسمی عشق سے بالکل مختلف ہے۔ اقبال نے عشق کے جو معانی لیے ہیں وہ ان کے خط بنام ڈاکٹر نکلسن بسلسلہ تشریحِ خودی، میں کچھ یوں بیان ہوئے ہیں: ''یہ لفظ عشق نہایت وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ عشق کسی

شے کو اپنے اندر جذب کر لینے اور اسے اپنا جزو حیات بنا کر اپنا لینے کا نام ہے۔''

علامہ اقبال کے نزدیک عشق ایک ایسا جذبہ ہے جس کا آغاز ہے عروج ہے لیکن اختتام اور حد نہیں۔ یہ لازوال اور محدود ہے پر پابندی سے آزاد ہے زماں و مکاں کی قید سے بے نیاز آفاقی جذبہ ہے۔

می نداند عشق سال و ماہ را دیر و روز و نزد دور راہ را

عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا اور زمانہ بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

اقبال کی نظر میں عشق وہ نا قابل تسخیر قوت ہے جو غلاموں کو بھی خود آگاہی کی دولت عطا کر کے ان پر اسرار شہنشاہی اشکار کر دیتی ہے جو کئی عاشق نہیں اس کوں مسلمان کر نہیں گنئے

جب عشق سکھاتا اداب خود اگاہی کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہ

علامہ اقبال کے روحانی مرشد و پیشوا مولانا روم ہیں۔ مولانا جلال الدین رومی کو اقبال نے اپنا رہبر مانا۔ اپ اپنی مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' میں پیرِ رومی کے بارے میں فرماتے ہیں:

پیر رومی مُرشد روشن ضمیر کاروان ِ عشق و مستی را امیر

(ترجمہ: پیر رومی ایک روشن ضمیر مُرشد ہیں اور عشق و مستی کے قافلہ کے سالار ہیں۔)

لیکن اس اعتراف کے باوجود بھی اقبال نے رومی کو بہت حد تک نئی معنویت عطا کی۔ یہ اقبال جیسے نابغہ روزگار کی بڑی دین ہے۔ مالک رام اس حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

> ''اقبال نے رومی سے بہت استفادہ کیا ہے جیسا کہ ان کے کلام سے ظاہر ہے، لیکن اس طرف بہت کم لوگوں کا خیال گیا ہے کہ خود اقبال نے بھی رومی کو بہت کچھ دیا۔ رومی کی معنویت میں اقبال کی بدولت بہت وسعت پیدا ہوگئی۔''

مولانا رومی وجدان کے بانی اور رہبر تسلیم کئے جاتے ہیں اور اقبال بھی وجدانی اہمیت کے قائل ہیں۔ اس لئے مولانا رومی کو وہ وجدانی تصور کے تحت اپنا مرشد اور پیر طریقت تسلیم کرتے ہیں۔ اقبال مولانا کے تصور عشق اور ان کی عملی شخصیت سے بہت متاثر تھے کیونکہ مولانا کے عشق میں بے عملی کی بجائے عمل کی حرکت و حرارت ہے۔ اقبال نے مولانا کے عشق کو اپنا مطمح نظر بنا لیا کیونکہ وہ ایسے عشق کو کرامت تصور کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

عشق کی مستی سے ہے پیکر گُل تابناک عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام

اقبال میں شخصیت کے تحفظ اور ارتقاء کی امنگ جگانے والے مولانا رومی ہی تھے۔ دوسری گول میز

کانفرنس (لندن) سے اقبال مایوس ہوئے تو اس وقت بھی مولانا روم کے کلام نے انہیں سنبھالا اور مولانا رومی کی عظمت کا سکہ ان کے دل پر بٹھا دیا:

ہم خوگرِ محسوس ہیں ساحل کے خریدار　　اک بحر پُر آشوب و پُر اسرار ہے رومی

اقبال نے جس قدر مولانا رومی کا اثر قبول کیا ہے۔ اس قدر مشرق و مغرب کے کسی بھی مفکر یا شاعر کا اثر قبول نہیں کیا۔ انہیں غیر معمولی عقیدت اور داخلی ربط ہے۔ اقبال نے بال جبرائیل کی نظم مریدِ ہندی اور مرشد رومی میں خود کو مرید اور مولانا کو مرشد قرار دیا ہے۔

اقبال اور رومی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ''اگر رومی نے اقبال کی فکر کو چار چاند لگائے ہیں تو اقبال نے بھی رومی کے افکارِ عالیہ کو بڑی عقیدت سے دنیا میں متعارف کروایا ہے۔ اقبال نے مولانا رومی سے استفادہ ہی نہیں کیا بلکہ ایک دبستان فکر رومی کی بنیادی رکھی۔ اقبال اور رومی کے ہاں بہت سے نظریات مشترک ہیں۔ اقبال کا نظریہ خودی جو اقبال کے کمال کی وجہ سے اس کا اپنا بن گیا۔ اس کے بنیادی تصورات بھی رومی کے ہاں ملتے ہیں۔

علامہ اقبال نے بھی عشق کو ہی راہِ فقر کی کلید قرار دیا ہے۔ عشق کے بغیر کسی معرکہ میں کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ عشقِ حقیقی ہی معرفتِ حق تعالیٰ کے لازوال سفر کی جانب رہنمائی کرتی ہے۔ جذبہ عشق کے بغیر زندگی اور موت برابر ہے۔ جذبہ عشق کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی۔ علامہ اقبال عشقِ حقیقی کو بڑی خوبصورتی سے بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی　　نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق　　عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدہِ تصورات

علامہ اقبال نے مردِ مومن کی صفات بیان کی ہیں ان میں جذبہ عشق سے سرشاری اس کی نمایاں صفت ہے۔ مردِ مومن عشقِ حقیقی کا پیکر ہوتا ہے۔ عشق ہی اس کا دین، عشق ہی اس کی حیات، عشق ہی اس کا شعار ہوتا ہے۔

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق　　معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

توڑ دیتا ہے بت ہستی کو ابراہیمِ عشق　　ہوش کا دارو ہے گویا مستی تسنیم عشق

علامہ اقبال کا تصور عشق اور مولانا روم

ساجد منیر

ریسرچ اسکالر بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری جموں وکشمیر

اردو ادب کی تاریخ میں علامہ اقبال بیسویں صدی کے ایک کامیاب مفکر شاعر مانے جاتے ہیں ۔جنہوں نے اپنی فکری وفلسفی روش سے اردو شاعری کی دنیا کو ایک نئی روح بخشی۔اقبال نے اپنی شاعری میں جن تصورات کو پیش کر کے مقامِ بلند حاصل کیا ہے،ان میں تصورِ خودی،تصورِ زماں ومکاں،تصورِ مرد مومن،تصورِ عمل اور تصورِ عشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

اقبال کے نظام فکر وفن میں عشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔کسی چیز کی محبت میں حد سے گزر جانے کو ''عشق'' کہتے ہیں۔عشق سے مراد وہ آگ ہے جو عاشقوں کے دل اور سینے میں جلتی رہتی ہے اور خدا کے سوا جو کچھ ہے اسے جلا کر خاکستر کر دیتی ہے، بالکل یہی کیفیت ایک انسان کی دوسرے انسان کے لیے بھی پیدا ہوسکتی ہے جسے صوفیانہ اصطلاح میں عشقِ مجازی کہتے ہیں۔اقبال کی شاعری میں جس عشق کی روداد ہمیں دیکھنے کو ملتی ہے وہ عشق حقیقی ہے یعنی کہ اقبال نے اپنی پوری شاعری خدا اور اس کے رسول کی محبت میں سرشار ہوکر کی ہے،جس کا اعتراف انہوں نے خود مثنوی 'اسرار خودی' میں اس طرح کیا کہ:

''میری شاعری کا کوئی حرف قرآن حکیم سے باہر نہیں اگر باہر ہو تو روزِ محشر مجھے ذلت و رسوائی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے اور میری شاعری وجود میں آنے سے پہلے ہی فنا ہو جائے۔''

بلاشبہ اقبال ایک عالمگیر اور بین الاقوامی شہرت کے مفکر شاعر ہیں لیکن ان کو اپنی اس حیثیت کو منوانے کے لئے دنیا کے بیشتر نامور شاعروں اور مفکروں کا نظر غائر سے مطالعہ کیا ہوگا۔چنانچہ ان کے کلام کے مطالعے سے یہی پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے دنیا کے بے شمار صاحبِ نظر افراد سے اپنے ذوق کے مطابق استفادہ کیا ہے۔یہ ضرور ہے کہ ان کے استفادے کی نوعیت ہمیشہ ان کے عقیدہ،توحید ورسالت کی پابند رہی ہے اور علمائے شعر وحکمت کے وہی خیالات ان کی توجہ کا مرکز بنے ہیں جو قرآن وسنت کی تعلیمات سے کسی نہ کسی صورت مماثل تھے۔

علامہ اقبال نے اپنی زندگی میں جن مفکرین سے فیض اٹھایا،ان میں ایک اہم نام مولانا جلال الدین رومی کا ہے۔اقبال نے جابجا اپنے کلام میں رومی کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔اس میں شک نہیں کہ اقبال

کے لیے رومی کی حیثیت ایک راہ نما اور ایک مرشد کی ہے۔ وہ انہیں پیر رومی کہنے پر فخر کرتے ہیں۔ ایک جگہ اعتراف کیا ہے کہ اسی مرد مومن کے فیض سے علم کے سربستہ راز ان پر فاش ہوئے اور انہی کے کرم سے یہ خاک اکسیر بن گئی۔ اس حوالے سے ان کے فارسی شعر ملاحظہ ہوں:

باز بر خوانم فیض پیر روم دفتر سربستہ اسرار علوم
پیر رومی خاک را اکسیر کرد از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

جلال الدین رومی کا زمانہ تیرہویں صدی عیسوی کا تھا اور یہ اسلامی تاریخ کا پُر آشوب دور تھا۔ اسی زمانے میں بلخ کا ایک نامور فرزند جلال الدین رومی مسلمانوں کی بے حسی اور بے عملی کو زائل کرنے اور ان میں جہد و عمل کی نئی روح پھونکنے ایک فارسی مثنوی لکھنے میں مشغول تھا۔ نکلسن نے رومی کو دنیا کا سب سے بڑا صوفی شاعر اور جامی نے ان کی مثنوی کو ''زبان فارسی میں قران'' بتایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مثنوی اسلامی تعلیمات کا شعری اظہار ہے۔ اس میں رومی نے اسلام کے نامور مجاہدانہ کارناموں کا تذکرہ کرتے ہوئے، اپنے عہد کے شکست خوردہ مسلمانوں کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کیا، پھر ان کے سامنے ایک ایسا ضابطہ حیات پیش کیا جس پر عمل پیرا ہو کر مسلم قوم اپنا کھویا ہوا مقام پھر سے حاصل کر سکیں۔ مثنوی معنوی کے مطالعے سے رومی کے افکار و احساسات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مولانا رومی کے نظامِ فکر میں عشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ان کا تصورِ عشق، رسمی عشق سے الگ ہے۔ ان کے یہاں عشق کا مفہوم اپنی پسندیدہ شے کے حصول کی شدید خواہش اور اس کے لئے دیوانہ وار کوشش کرنا ہے۔ اس عشق کے بغیر زندگی نامکمل ہے اور اس کے بغیر انسان ترقی کے مدارج طے نہیں کر سکتا۔ علامہ اقبال بھی عشق کے لئے یہی نظریہ رکھتے ہیں۔ اقبال کے تصور عشق میں ایسے وصل کی کوئی جگہ نہیں جس میں عاشقوں کے انفرادی وجود کے مٹ جانے کا خطرہ ہو۔ ان کا تصورِ عشق اردو اور فارسی کے دوسرے شعرا سے مختلف ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق محض اضطراری کیفیت، ہیجان جنسی تلذذ، حواس باختہ از خود رفتگی، یا محدود کو لامحدود کر دینے کا نام نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں عشق ایک عالمگیر قوت حیات، جذبہ عمل سے سرشاری، حصول مقصد کے لئے بے پناہ لگن اور عزم و آرزو سے آراستہ جہدِ مسلسل کا نام ہے۔

اقبال اطاعتِ رسول کو ہی حقیقی عشق تصور کرتے تھے۔ ان کے خیال میں عشق میں اطاعت نہ ہو تو وہ عشق نامکمل ہوتا ہے۔ عشق کی بدولت آدمی میں ایک حیرت و آزادی کا ایسا شدید اور طاقتور احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ ساری مادی اور خارجی بندشیں اس کی نظر میں کمزور اور بے وقعت ہو جاتی ہیں۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق　　عشق نہ ہو تو شرع و دین بتکدۂ تصورات
مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ　　عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

اقبال کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ عشق ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں ان کی اردو اور فارسی شاعری سے ہوتا ہے۔ اقبال کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں مدح رسول اکرم ﷺ کو ایک نئے انداز کے ساتھ اختیار کی۔ فرماتے ہیں:

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے　　کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

بقول عبدالسلام ندوی:

''اقبال کی شاعری محبت وطن اور محبت قوم سے شروع ہوئی اور محبت رسول پر اس کا خاتمہ ہوا''۔　　(کامل اقبال)

اقبال کے نزدیک انفرادی اور اجتماعی زندگی کو مستحکم کرنے کا ایک بہترین اور مؤثر ذریعہ عشق رسول ہی ہے۔ عشق ایک عطیہ الٰہی اور نعمت ازلی ہے۔ عشق ہی وہ جذبہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بغیر کسی خوف و ہراس کے آگ میں جانے سے نہ روک سکا۔

علامہ اقبال کا رومی کے ساتھ غیر معمولی تعلق تھا۔ انہوں نے اپنے کلام میں ایک دو جگہ نہیں، بل کہ جگہ جگہ اس بات کا اظہار کیا ہے کہ رومی ان کے مرشد معنوی ہیں اور بصیرت اور بصارت کی ساری منزلیں انہوں نے مولانا رومی کی رہنمائی میں حاصل کی ہیں۔ رومی سے اپنی عقیدت کے اظہار کے لیے کہیں انہوں نے ان کے خیالات کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے، کہیں ان کے اشعار کی تضمین کی ہے، کہیں مصرعے پر مصرعے لگائے ہیں، کہیں ان کے اشعار کو انتساب کے طور پر اپنے مجموعہ کلام کے سرورق کی زینت بنایا ہے اور کہیں ان کی زمین میں شعر کہنے کو اپنے لئے فخر گردانا ہے۔ اسرار و رموز سے لے کر ارمغان حجاز تک رومی سے علامہ اقبال کے اظہار عقیدت کی یہی صورت ہے اور کئی مقامات پر اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ حیات و کائنات کے رازوں سے انہیں مولانا روم نے آشنا کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش　　لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

ڈپٹی نذیر احمد کی اسلام پسندی " توبۃ النصوح " کے حوالے سے

ڈاکٹر بشیرہ سلطانہ

جے، بی، اے، ایس کالج برائے خواتین، چنئی۔۸۱

ڈپٹی نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ان کے ناولوں کا موضوع اصلاحِ معاشرت ہے۔خاص طور سے مسلم گھرانوں کی اندورنی معاشرت کی ایسی بے لاگ تصویریں انھوں نے کھینچی ہیں کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ ابھر جاتا ہے۔روزمرہ کے معمولی واقعات، جو صبح وشام ہماری آنکھوں کے سامنے گھروں میں اندر اور باہر واقع ہوتے ہیں،ان کا خوبی سے بیان کرنا نذیر احمد کی تحریروں کا وصف ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد اپنی طرز کے موجد ہیں۔ان کے اس طرز میں امتیازی حیثیت ان کے مکالموں کو حاصل ہے۔سرشار اور داغ کی طرح انھیں بھی بچپن میں بیگمات کی زبان سننے کا موقع ملا ہے۔جس سے ان کے طرز بیان میں سلاست، لچک اور مٹھاس پیدا ہوئی۔دہلی کی ٹکسالی زبان ومحاورات اور اصطلاحات کا لطف نذیر احمد کے ہاں اٹھایا جاسکتا ہے۔دلکش مکالموں میں ظرافت کی چاشنی سونے پر سہاگہ کا کام کرتی ہے۔

نذیر احمد کے ناولوں کا موضوع مذہب اور اخلاق ہے۔اس حیثیت سے ان کے ناولوں کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ایک مذہبی ناول اور دوسرے اخلاقی ناول۔ مذہبی ناول میں : توبتہ النصوح ، رویائے صادقہ ،ایامی اور ابن الوقت شامل ہیں۔ان سارے ناولوں میں مذہبی کردار کثرت سے دیکھنے کو ملیں گے۔ دوسری قسم اخلاقی ناولوں کی ہیں۔جس میں بنات النعش ، مراۃ العروس اور فسانہ مبتلا شامل ہیں۔یہ سارے ناول اخلاق اور آدابِ معاشرت کے موضوع پر لکھے گئے ہیں۔

نذیر احمد کے موضوعات مذہب واخلاق کے مرقع اور ان کے کردار مسلم معاشرے کے عام کردار ہوتے ہیں۔انھوں نے اپنے دور کے مسلم معاشرہ کے رنگ کی تصویر اپنے ناولوں میں کھینچی ہے۔ان کے ناول حقیقت نگاری کی تصویریں ہیں۔ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ تصویریں صرف ایک خاص طبقے تک محدود ہیں یعنی صرف مسلم معاشرے ہی سے انھیں سروکار ہے۔توبتہ النصوح کی تمہید میں نذیر احمد خود رقم طراز ہیں:

> ''ارادہ یہی تھا کہ بلا تخصیص مذہب تلقین حسنِ معاشرت اور تعلیم نیک کرداری و اخلاقی ضرورت لوگوں پر ثابت کی جائے لیکن نیکی کو مذہب سے جدا کرنا ایسا ہے جیسے کوئی

شخص روح کی جسد کو یا بو کو گل سے یا نور کو آفتاب سے یا عرض کو جوہر سے یا ناخن کو گوشت سے علاحدہ اور منفک کرنے کا قصد کرے''

(توبتہ النصوح: ڈپٹی نذیر احمد، ص:۵)

'توبتہ النصوح' دہلی کے ایک مسلم خاندان کا قصہ ہے جو بے دینی کا شکار ہو گیا ہے۔ حالت اس قدر بگڑے ہوے ہیں کہ بچے خدا سے تک ناواقف ہیں۔ نماز کا نام انھوں نے نہیں سنا۔ غرض دین سے ان کا کوئی سروکار نہیں ہے۔

توبتہ النصوح جیسا کہ نام سے ظاہر ہے نصوح نامی ایک شخص کی توبہ کا قصہ ہے۔ نذیر احمد یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ حالات جتنے بھی ابتر کیوں نہ ہو گئے ہوں، انسان ضلالت اور گمراہی کے دلدل میں کتنا ہی کیوں نہ پھنس گیا ہو، اگر وہ اس سے نکل کر ہدایت کے راستے پر گامزن ہونا چاہتا ہے تو کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ اس میں وہ نہ صرف کامیاب ہو سکتا ہے بلکہ اپنے قرابت داروں کو بھی راہ راست پر لا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے بنیادی شرط توبہ ہے۔ یعنی سچی توبہ قرآن کے الفاظ میں 'توبتہ النصوح' اسی مناسبت سے نذیر احمد نے ناول کا نام بھی ''توبتہ النصوح'' رکھا ہے۔ نذیر احمد کرداروں کے نام ان کی شخصیت اور فطرت کے مطابق ہی تجویز کرتے ہیں۔ مثلاً نصوح وہ ہے جس نے توبہ کی ہے۔ نصوح کی بیوی فہمیدہ کا نام اس کی عقل وفہم اور فراست کی وجہ سے دیا گیا ہے۔ نصوح کے بڑے بیٹے کلیم کا نام اس لیے ہے کہ وہ بڑا باتونی اور قیل وقال کا عادی ہے۔ ایک صحیح بات، صحیح طریقے سے قبول نہیں کرتا اور اپنی ذات کے پندار میں بحث ومباحثہ کرتا رہتا ہے۔ سلیمؔ، اپنی سلیم الطبع کی وجہ سے سلیم ہے۔ علیم: اپنے علم وعرفان کے سبب علیم ہے۔ حمیدہ اخلاقِ حمیدہ سے متصف ہے۔ غرض نذیر احمد کے تمام ناولوں میں کرداروں کے نام اس کی شخصیت کے عکاس ہوتے ہیں۔

نفسیات کا لحاظ کئے بنا نہ کوئی کردار حقیقت کا روپ دھار سکتا ہے اور نہ ہی کوئی مکالمہ جاندار لگ سکتا ہے۔ توبتہ النصوح کے کرداروں اور مکالمے بڑے جاندار اور حقیقی لگتے ہیں۔ کرداروں کو اجاگر کرنے کے لئے جذبات، محسوسات، نفسیات اور ماحول کا جائزہ ضروری ہے، توبتہ النصوح کے کرداروں میں اس کا بھرپور اظہار موجود ہے۔ ناول میں نصوح کو جو ماحول دیا گیا ہے۔ اس کی ہر چھوٹی تفصیل بھی بڑی نفاست کے ساتھ حقیقی رنگوں میں پیش کی گئی ہے۔

اس ناول کے سارے کردار بہر حال مذہب سے متاثر ہیں۔ کسی نے مثبت اثر لیا ہے۔ تو کسی نے منفی۔ مگر کوئی کردار ایسا نہیں ہے جو مذہب سے متاثر نہ ہوا ہو۔ اس لئے اس ناول کے ہر کردار کو زیر بحث

لا ناضروری ہے۔

نصوح کا کردار خالص ایک مذہبی کردار ہے۔نصوح بری طرح خوفِ خدا سے لرزاں ہے۔ یہ خوف اس کے ہر عمل سے ظاہر ہے۔ وہ انفرادی طور پر ہی یہ کیفیت اپنے لئے لازمی نہیں سمجھتا بلکہ اپنے خاندان کے سارے افراد کو اسی رنگ میں رنگا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی شدید خواہش کا اظہار صرف قولاً ہی نہیں بلکہ عملاً بھی کرتا ہے۔اس کا اکثر تو مثبت نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔لیکن اپنی بڑی لڑکی نعیمہ اور بڑے لڑکے کلیم کی جانب سے مزاحمت کا بھی سامنا ہوتا ہے۔لیکن بالآخر نصوح کامیاب ہی رہتا ہے اور اس کا مشن کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچتا ہے۔کلیم کو باپ کی نافرمانی کی سزا دنیا میں ہی مل جاتی ہے اور وہ مرنے سے پہلے باپ سے معافی چاہتا ہے جو ایک طرح سے نصوح کی جیت ہی ہے۔ دینداری اور دنیا داری کی اس کشمکش میں نذیر احمد نے اپنا تصرف بھی دکھایا ہے اور نصوح کے مشن کو کامیاب بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے جس کے سبب ناول کی فطری رفتار متاثر ہوئی ہے۔

نصوح ایک ایسا مذہبی کردار ہے جو مذہبیت کی ترجمانی کرتا ہے۔نصوح کا کردار مذہبی کا علاوہ فلسفی کا بھی ہے جو فلسفہ اور منطق کی مدد سے گھر میں ایک دینی انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے۔ گفتگو اور مکالموں کے زور پر مناظرے تو جیتے جاسکتے ہیں لیکن کس کے دل کی دنیا پلٹی نہیں جاسکتی۔

مجموعی حیثیت سے نصوح کا کردار ایک دلچسپ کردار ہے جو خالص مذہبی کردار ہے۔ یہ کردار نذیر احمد کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ مذہبی تعلیمات نصوح کی زبانی نہایت تفصیل سے کہلوائی گئی ہیں بلکہ اس ناول میں نصوح کا کردار دراصل نذیر احمد کا ''متکلم'' کردار ہے جو کچھ پیغام وہ قوم کے نام دینا چاہتے ہیں نصوح کے احوال واقوال میں بیان کیا ہے۔



ڈپٹی نذیر احمد کے ناول "فسانہ مبتلا" میں مذہبی اقدار

ارشد علی

اسکالر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

ڈپٹی نذیر احمد کا نام اپنے اندر کئی پہلوؤں کو سموئے ہوئے ہے، انہوں نے کئی باغوں کو سیراب کیا ہے، جن میں خطابت، تراجم، شاعری، فقہ، تفسیر وغیرہ نمایاں پہلو ہیں، لیکن خاص طور پر ان کا نام ایک خاص صنف سے منسلک ہے اور وہ ناول نگاری ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں سے ''فسانہ مبتلا'' میں بھی کئی مذہبی اقدار کو اجاگر کیا گیا ہے۔ خصوصی طور پر وراثت، حسنِ صورت اور تعدد ازدواج کو موضوع بحث بنایا گیا۔ ناول میں ان اصول اور اقدار سے واقف کرانے کے لیے ڈپٹی نذیر احمد نے مبتلا کے چچا "میر متقی" کے کردار کا سہارا لیا ہے، ان کے دہلی سے چلے جانے کے بعد ان کے شاگرد رشید، عارف اور سیّد حاضر کے ذریعے وہی کام لیا ہے۔ مقالہ کا عنوان تقاضہ کرتا ہے کہ اس میں مذکور مذہبی اقدار کو نمایاں کیا جائے۔ لیکن اس سے قبل مذہبی اقدار سے شناسائی لازمی ہے۔

مذہبِ اسلام میں عبادات کے ساتھ ساتھ معاملات پے زور دیا گیا ہے، بلکہ عبادات سے بڑھ کر شفافیت کے عنصر، لوگوں کے ساتھ معاملات اور اخلاقی وسماجی اقدار بہر صورت پورا کرنے کا حکم ہے۔ اللہ کی رحمت سے قوی امید ہے اپنے حقوق جیسے عبادات اور دینی معاملات میں کوتاہی تو معاف کر دے گا مگر حقوق العباد شاید معاف نہ کرے۔ حقوق العباد پر جانے سے پہلے حقوق اللہ سے متعلق گفتگو کرتے ہیں جس میں سب سے پہلے ذکر ایمان باللہ کا ہے، ڈپٹی نذیر احمد مبتلا کے پیدائش کے بعد ان پرورش کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ہم تو معاذ اللہ کسی کلمہ گو مسلمان پر کُفر اور شرک کا الزام کیوں لگانے لگے۔ مگر بہ مجبوری اتنی بات کہنی پڑتی ہے کہ مبتلا کے ساتھ جو برتاؤ کیے جاتے تھے واہمہء شرک اور مظنہء کفر سے خالی نہ تھے۔ یہ بات کہ جس خدا نے ہم کو پیدا کیا ہے وہی ایک وقتِ مقررہ تک، ۔۔۔۔۔، ہماری زندگی اور تن درستی کی حفاظت کرتا ہے اور جس طرح بدوں اُس کے فضل وکرم

کے ہم دنیا میں آ نہیں سکتے تھے، اُسی طرح بغیر اُس کی مدد اور حمایت کے ایک لمحہ دنیا میں رہ نہیں سکتے۔۔۔۔۔۔ غرض یہ بات اُن لوگوں کے معتقدات میں تو ضرور ہوگی جو مبتلا کو پال رہے تھے، مگر ان کے برتاؤ میں توکّل وانابت کی کوئی بات ہمارے دیکھنے میں نہ آئی۔"

یقیناً یہ دنیا فانی ہے اور یہاں کی ہ چیز حادث ہے، یہاں کی نہ خوشی دائمی ہے اور غم لازوال ہے، اس لیے ہم کو ہر صورت میں اللہ کا شکر بجالانا ہے، نہ تو کسی کے چھن جانے پر افسوس کرنا چاہیے، نہ کسی چیز کے حصول پر حد سے زیادہ خوش ہونا چاہیے۔ مبتلا کے عیش وآرام کی زندگی کے زوال اور مصائب کے آمد پر ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں:

"راحت ہے تو ایک وقتِ خاص تک اور مصیبت ہے تو وہ بھی ایک میعادِ مقررہ تک۔ نہ اس کو ثبات نہ اور نہ اس کو قیام۔ وہ عارضی اور یہ چندروزہ۔ جن کو خدا نے عقلِ سلیم دی ہے وہ ہر حالت کو اسی طور پر انگیز کرتے ہیں کہ ان کے زائل ہونے پر ان کو ملال نہ ہو، تاسّف نہ کرنا پڑے۔"

(فسانہ مبتلا: پانچویں فصل: ص:38)

لیکن جب کوئی مصیبت ہم پر آئے، یا مصیبت کا سلسلہ شروع ہو جائے تو اس وقت کون سے اقدار کو بروئے کار لانا ہے، تو اس وقت صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کا معمول تھا کہ وہ اپنے رب سے رجوع کرتے تھے، اسی سے اپنے دکھڑا سناتے تھے، اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے، تو ہمارے لیے بھی یہی اصول ثابت ہوں گے، اسی کو قرآن کی یہ آیت بیان کرتی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ (سورہ البقرہ: 45)

ناول میں میر تقی حج سے واپسی کے بعد اپنی بھانجی اور مبتلا کی اہلیہ سے ملنے کے بعد والد کی وفات پر تعزیت کرتے وقت اسی صبر کو لازم پکڑنے کی بات کہی ہے، بلکہ اس کے مفہوم کو مزید واضح کیا ہے:

''اس کی طرف رجوع کرنے کے۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ معنی ہیں کہ اس کی رحمت پر پورا بھروسا اور اعتماد کر کے صمیمِ قلب سے یقین کر لو کہ جو کچھ ہوا خوب ہوا، بہتر ہوا، مناسب ہوا اور یوں ہی ہونا چاہیے تھا۔ یہ تو درجہ رضا اور تسلیم کا ہے اور اسی کا نام صبرِ جمیل ہے۔"

(فسانہ مبتلا: ساتویں فصل: ص:53)

مزید برآں اولاد کی تربیت میں والدہ کا لاڈ و پیار حائل ہوتا ہے۔ اور اگر والد بھی نرم پڑ جائے تو

آگ پر تیل کا کام کرتا ہے، اس طرح مبتلا کے لاڈ و پیار اور اصلاح میں کمی کو نمایاں کرتے ہیں:

"ہرگز نہیں! اُس نے عورتوں کو مبتلا کی شرارتوں کی پردہ داری کرنے دی؛ اس نے بیٹے کے حالات سے پوری پوری خبر رکھی اُس نے جتنی خبر رکھی اُس کا بھی تدارک، جیسا چاہیے تھا، نہ کیا۔" (فسانہ مبتلا: پہلی فصل: مبتلا کی وِلادت اور طفولیت: ص:20)

اس میں دو فصل مذہبی اقدار کے بحث سے متعلق بہت اہم ہے باوجود کہ اس کی وجہ سے اس ناول کی فنّی حیثیت پر ضرب آئی ہے، ایک میں حسنِ صورت پر مباحثہ ہوا ہے اس کو مکمل طور پر عارف نے ثابت کیا ہے کہ حسنِ صورت ایک عارضی شء ہے، یہ طبعی نہیں بلکہ شخصی ہے اس پر قابو پایا جا سکتا ہے، اس متعلق عارف نے آئندہ فصل میں بہت عمدہ بات کہی:

"حُسن پرستی مرض ہے۔ سوچنا دوا، اور موجباتِ ترغیب سے دور رہنا پرہیز۔ بھائی مرضِ جسمانی میں اگر مزمن ہوتا ہے تو اس سے جلد صحت نہیں ہوتی اور بعض صورتوں میں تو برسوں علاج اور ساری عمر کیلیے پرہیز کرنا پڑتا ہے۔ یہی حال ہے امراضِ روحانی کا، جن کا دوسرا نام ہے بُری لت، بدعادت، تمہارا علاج تمہارے ہی ہاتھ میں۔ کرو تو تم، اور نہ کرو تو تم۔"

(فسانہ مبتلا: انیسویں فصل: ص:145)

بہت ہی اہم اصول ہے کہ جتنی برائیاں ہیں اس سے بچنے کے لیے لائحہ عمل پیش کیا گیا ہے۔

ناول کے انیسویں فصل میں تعدد ازدواج پر مبتلا اور عارف ایک تفصیلی مباحثہ ہوتا ہے، دونوں اپنے دلائل دیتے ہیں عارف ثابت کرتا ہے کہ تعدّد ازدواج میں کیا خامیاں ہیں لیکن مبتلا کے حسن پرستی کا مرض بالکل پرانا ہو گیا تھا جس پر عمل پیرا ہو کر اپنی بربادی کی راہ فراہم کیا، اور نتیجہ بھی وہی ہوا کہ آخر میں اپنے برے انجام کو پہنچا۔

خلاصہ یہ کہ یہ ناول ڈپٹی نذیر احمد کے گذشتہ ناولوں کے مقابلے میں فنی اعتبار سے بھی بہتر ہے اور اقدار کو نہایت عمدہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، جس کا اثر اکثر کرداروں پر دکھلایا گیا، اور اقدار کی پامالی کی صورت میں اس خسارہ کو بھی بتایا گیا ہے۔



نسیم حجازی کے تاریخی ناولوں میں مذہبی اقدار ایک مختصر جائزہ

کریم النساء

شعبہ اردو اسلامیہ ویمنس آرٹس اینڈ سائنس کالج وانم باڑی

اردو زبان کے مشہور مورخ، ناول نگار نسیم حجازی ۱۹ مئی ۱۹۱۴ء کو سوجان پور، ریاستِ پنجاب میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد چودھری محمد ابراہیم نے آپ کا نام محمد شریف رکھا۔ آپ کی والدہ عمر بی بی تھیں۔

نسیم حجازی کا رجحان اسلامی تاریخی ناولوں کی طرف اس وقت ہوا جب دوسری عالمی جنگ کی تباہ کاریوں کا آغاز ہو چکا تھا، دوسری جانب برصغیر میں تحریکِ آزادی فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہو چکی تھی، نسیم حجازی کے ابتدائی ناولوں میں 'آخری چٹان' بھی شامل ہے جس میں تاریخی کردار کے طور پر چنگیز خان، ہلاکو خان اور جلال الدین خوارزم کو ایک دوسرے سے نبرد آزما دکھایا گیا حالانکہ یہ آخری خلیفہ عباسی کا ہے۔ جب اہل بغداد مناظرہ بازی اور غیر اسلامی رسومات میں گھر چکے تھے اور حکمران تعیش اور بے پروائی کے دلدل میں پھنسے جا رہے تھے دوسری طرف چنگیز خان کی وحشت اور بربریت اپنے عروج پر تھی ان حالات میں جب مسلمان کا شیرازہ بکھر چکا تھا، جلال الدین خوارزم شاہ کا عزم و حوصلہ بھی اتحاد کی کمی کی بدولت ناامیدی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اصل موقع پر جنگی مناظر اور وحشت و بربریت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ آخری چٹان کے واقعات کو قاری کے دل پر نقش کرنے کے لئے اسلام کی ترویج و اشاعت سے مربوط کیا گیا ہے۔

ابتدائے اسلام کی روشنی اور اس کے توسط سے دنیائے عالم میں پھیلی تاریکی کے خاتمہ کا ذکر ہے۔ پھر ان اولوالعزم اصحابِ رسول اور ان کے جانشینوں کا تذکرہ ہے جن کے تیز رفتار گھوڑوں نے دنیا کی وسعتوں کو سمیٹ لیا تھا۔ ایک طرف وسط ایشیاء میں فتوحات کے منازل طے ہو رہے تھے اور دوسری طرف اسپین کے سرحدوں پار اسلامی جھنڈا لہرانے لگا اور بہتری کی طرف ہندوستان کے میدانوں میں اسلامی فتوحات کا دائرہ بڑھنے لگا۔ ناول کے اکثر تاریخی واقعات چنگیز خان، علاء الدین، خوارزم شاہ، جلال الدین خوارزم شاہ اور شمس الدین التمش خلیفہ ناصر، خلیفہ ظاہر مستقیم باللہ اور صلاح الدین ایوبی سے موسوم ہیں۔ معاشرہ کی عکاسی کی خاطر بعض تخیلاتی کردار ظاہر بن یوسف، ثریا، صفیہ، عبدالملک، عبدالعزیز

،زیداورعبدالرحمٰن وغیرہ شامل کئے گئے ہیں،جن کے امتزاج سے یہ تاریخی ناول بیک وقت اپنے عہد کی عکاسی کے ساتھ اس عہد کے معاشرہ کے رسم ورواج اور رہن سہن وغیرہ کا نقشہ کھینچتا ہے،تاریخی اعتبار سے جو واقعہ سب سے پہلے سامنے آتا ہے وہ بیت المقدس پر صلاح الدین کی زیر قیادت اسلامی افواج کی یلغار کا ہے۔ایک مختصر محاصرہ کے بعد مسلمان فوج شہر کی فصیل پر کمانڈے ڈال کر چڑھنے میں کامیاب ہوتے ہیں،تیروں کی بارش میں فصیل پر چڑھنا ایک ناممکن کام تھا مگر چند مسلمان تکمیل کی خاطر چڑھتے گئے یہاں تک کہ نشانِ صلیب کو سرنگوں کرنے اور اسلامی جھنڈا لہرانے میں کامیاب ہوئے۔اس واقعہ کا تذکرہ تاریخی اسلام میں یوں رقم کیا گیا:

''کئی دن تک نہایت پرزور مقابلہ ہوتا رہا مسلمان شہر پناہ کو چھوڑنا چاہتے تھے لیکن اوپر سے تیر بازی ہورہی تھی۔باہر بھی صلیبی معروف کار تھے۔اس لئے شہر پناہ تک پہنچ نہ سکے۔جب صلیبیوں ں کی قوت کمزور پڑی تو مسلمانوں نے رُلا کر کے ان کو دھکیل دیا اور بڑھتے ہوئے فصیل تک پہنچ گئے۔اور تلوار کی زور پر مسلمانوں کو قبضہ کی صورت میں ان کی ہلاکت و بربادی یقینی ہے،اس وقت وہ جان ومال کی حفاظت سے شہر بہ شہر حوالہ کرنے کے لئے آمادہ ہوگئے۔'

اس واقعہ کی صداقت تاریخِ مسلمانان عالم میں ان الفاظ میں رقم کی گئی ہے۔''سلطان صلاح الدین نے عیسائی لشکروں کو پے در پے شکست دے کر بیت المقدس کو ان سے چھین لیا''۔

داستان مجاہد میں تاریخ اسلام کی پہلی صدی ہجری کے ربع آخر سے دوسری صدی ہجری کے ابتدائی عہد کی تصویر کشی کی گئی ہے۔تاریخ اسلام کے اہم کردار عبدالملک بن مروان،حجاج بن یوسف،مجتبیٰ بن مسلم،موسیٰ بن نصیر،طارق بن زیاد،اور سلیمان بن عبدالمالک،شامل ہیں۔ناول کا پلاٹ متوازن ہے۔تجسس قاری کی دلچسپی کی خاطر جابجا موجود ہے۔کردار نگاری موزوں انداز میں ہے،ناول کے پلاٹ میں جس کہانی کا تانا بانا بنایا گیا ہے،اس کے لئے تخیلاتی کردار پیش کئے گئے ہیں۔جن میں عشق ومحبت ،جذبہ تصویر کشی کی گئی ہے۔ڈاکٹر وقار عظیم اس ناول کے بارے میں یوں رائے دیتے ہیں۔

ان کا دوسرا ناول محمد بن قاسم ہے جو اپنے نام ہی سے مضمون کا احاطہ کرتا ہے۔اس ناول میں بھی تاریخی کردار محمد بن قاسم،حجاج بن یوسف،سلیمان بن عبدالملک اور رجا داہر وغیرہ بالکل درست کردار ہیں۔جب کہ تاریخی اعتبار سے زمانہ بھی تقریباً وہی دکھایا گیا ہے،البتہ ناول کی ابتداء کے لئے ناہید کے کردار کی تخلیق کی گئی،جس کی پکار پر اسلامی افواج دیبل کی طرف بڑھیں اور پھر زبیر کا کردار جو نہایت باہمت

،سخت جان،اور بہترین دوست کے روپ میں پیش کیا گیا ہے ساتھ ہی صالح انتقامی کردار ہے۔کہانی کی ابتداء عرب سے دور سیلون سے شروع ہوتی ہے۔پھر محمد بن قاسم کی تربیت اوراس کی جرأت وشجاعت کے وہ قصے جو اسے کم عمری میں سپہ سالار بنائے گئے ،مربوط کئے گئے ہیں،کہانی کا تسلسل نہایت دلچسپی کے ساتھ قائم رہتا ہے۔اگر ناول اور تاریخ کی ہم آہنگی کو مربوط کر کے دیکھنا ہوتو اس ناول کو دیکھا جاسکتا ہے ۔اس لئے بلاشک وشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ نسیم حجازی ناول اور تاریخ کو ہم آہنگ کرنے کا سلیقہ جانتے تھے۔ ان کے ناول مسلمانوں کے عروج وزوال کے تاریخی حقائق پر مبنی ہیں۔ان کے ناولوں نے اردوداں طبقے کی کئی نسلوں پر اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔یہ ناول ۱۹۴۸ء میں منظر عام پر آیا اس میں اندلس کے شہر غرناطہ کے ایک خاص عہد کو موضوع بنایا گیا ہے۔جب اندلس کے تمام بڑے شہروں پر عیسائیوں نے اپنا قبضہ جمایا تو صرف غرناطہ ایک ایسا شہر تھا جو مسلمانوں کے لئے پناہ گاہ بنا ہوا تھا۔یہاں تمام حریت پسند اور مجاہدین اسلام جمع ہوئے اوراس کی حفاظت کے لئے آخری دم تک جدوجہد کرتے رہے۔کئی اسلامی ہیرو زنے اپنی شاندار تاریخ کو زندہ رکھنے کے لئے اپنی جانیں نچھاور کیں۔اس ناول میں ''بدر بن مغیرہ'' کو بنیاد بنا کر اندلس کی تاریخ کے ایک طویل عہد کو پیش کیا گیا ہے۔جو ۱۲۳۸ء سے شروع ہوکر ڈیڑھ سالہ عروج وزوال کے واقعات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

''شاہین'' اگرچہ اندلس کی تاریخ کے پس منظر لکھا گیا ہے،لیکن نسیم حجازی نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اسے اپنے دور سے منسلک کر دیا ہے۔اس ناول میں جگہ جگہ پر مسلمانوں کو اپنے مٹتے ہوئے نقوش کو بچانے کے اشارے دیتے گئے ہیں۔اس میں حالات اور واقعات کو اس انداز سے ابھارا گیا ہے کہ قارئین متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔انہوں نے ایک سنجیدہ فن کار کی طرح اندلس کی تاریخ کا مطالعہ ومشاہدہ کیا اور پھر اپنے تجربوں اور فن کارانہ صلاحیتوں کی مدد سے ایک طویل عہد کو بڑی ہنرمندی سے ناول کے قلب میں ڈھالا ہے۔انہوں نے نہ صرف اس عظیم شاندار تاریخ کو دہرایا ہے بلکہ عصری تقاضوں کو مدنظر رکھ کر قارئین میں ایک نیا جذبہ اور شعور پیدا کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

مذکورہ ناولوں کی خوبیاں اور اسلامی تاریخی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے نسیم حجازی کو اردو کی اسلامی تاریخی ناول نگاری کا اہم ستون سمجھنا چاہئے ،مسلمانوں کی تابندہ تاریخ کو اجاگر کرنے والے نسیم حجازی 2 مارچ 1996ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے ان کی تحریریں اردو ناول نگاری کا اہم اثاثہ ہیں۔



قاضی عبد الستار کا تاریخی ناول ''صلاح الدین ایوبی'' ایک تنقیدی جائزہ

فوزیہ حبیب

اسلامیہ ویمنس آرٹس اینڈ سائنس کالج، وانمباڑی

اردو کے معروف ناول نگار قاضی عبدالستار کی پیدائش 8 فروری 1933 میں ہوئی تھی۔ قاضی عبد الستار دورِ جدید کے صفِ اول کے ناول نگار ہیں۔ انھوں نے اردو ناول کو نئی وسعت اور نئی جہت سے روشناس کرایا۔ قاضی صاحب کے قلم میں ماضی کی تابناک یادوں اور کھوئے ہوئے ماحول کو دوبارہ زندہ کرنے کی حیرت انگیز قوت ہے۔ قاضی صاحب کے تاریخی ناول، تہذیب اور عہد کے اعتبار سے قدرے مختلف ہیں لیکن ناول کے مرکزی کردار اتنے معروف ہیں کہ مصنف کے لئے تخیل سے کام لینے کی گنجائش کم رہ جاتی ہے۔

''صلاح الدین ایوبی'' قاضی عبدالستار کا ایک مشہور تاریخی ناول ہے۔ جس میں اسلامی تاریخ کے روشن کردار، عظیم مجاہد اور فاتح کی زندگی کے اخلاقی پہلوؤں اور ان کی انسانی ہمدردیوں کو اختصار کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ اس میں صلاح الدین ایوبی کے دور کی اسلامی حکومت کے عروج اور صلیبی جنگوں کا احاطہ بھی نظر آتا ہے۔ ناول میں ہیرو کی شخصیت میں ایسا کردار نظر آتا ہے جس میں رحمدلی، سخاوت، مروت اور کسر نفسی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ناول نگار نے فنی وسائل سے کام لیتے ہوئے، ہیرو کی شخصیت پر افسانوی رنگ چڑھایا ہے اور اس میں داستانِ محبت کو شامل کر کے اس میں دلچسپی پیدا کی ہے۔

قاضی عبدالستار کا شاہکار ناول ''صلاح الدین ایوبی''، مسلم فاتح و مجاہد صلاح الدین ایوبی کے دور کی اسلامی تاریخ اور صلیبی جنگ و جدال کا احاطہ کرتا ہے۔ ناول کا آغاز دوسری صلیبی جنگ سے ہوتا ہے اور تیسری صلیبی جنگ کا احاطہ کرتے ہوئے یہ ناول صلاح الدین کے انتقال پر اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔ تیسری صلیبی جنگ صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں لڑی جاتی ہے۔

ناول کے عنوان سے واضح ہے کہ ناول کا مرکزی کردار صلاح الدین ایوبی ہیں۔ صلاح الدین ایک مذہبی انسان تھے۔ عدل، اخوت اور صوم وصلاۃ کی پابندی ان کی سرشت میں شامل تھی۔ وہ علماء وفضلاء کو بہت پسند کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کامیاب سپاہی اور سپہ سالار تھے۔ ان کے تلوار کی گھن گرج اور

ایمانی قوت سے دنیائے مسیحیت خوف زدہ رہتی تھی۔ ناول کا دوسرا اہم کردار فرانس کی ملکہ 'ایلینو' ہے۔ یہ ایک امیر زادی ہے جو اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے کسی پابندی میں مقید نہیں ہے۔ فرانس کے شاہ لوئی ہفتم کی بیوی ہے۔ سردار آرک سے اس کے ناجائز تعلقات ہیں اور وہ صلاح الدین کی جواں مردی اور بہادری پر عاشق ہے۔ جب اسے یہ علم ہوجاتا ہے کہ اس کا باڈی گارڈ کوئی اور نہیں بلکہ صلاح الدین ایوبی ہے تو وہ اسے مسیحیت قبول کر کے اپنی ذاتی ریاست ''اینٹک'' کا فرماں روا بننے کی دعوت دیتی ہے، صلاح الدین کے انکار پر وہ برہم نہیں ہوتی بلکہ اسے صحیح سلامت دمشق واپس جانے کا نہ صرف مشورہ دیتی ہے بلکہ اس کام میں اس کی مدد بھی کرتی ہے۔

قاضی عبدالستار نے ڈرامائی انداز میں اپنے فن کو عروج تک پہنچایا ہے۔ انھوں نے جس بصیرت کے ساتھ لمحہ وصال کا بیان کیا ہے اسی بصیرت کے ساتھ ہجر کی کیفیت کی ترجمانی بھی کی ہے۔ جب ایلینور پر سلطان کی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے، تو وہ اس سے قبل کہ اوروں پر یہ راز افشا ہوجائے، سلطان کو واپس جانے کا مشورہ دیتی ہے، ان دونوں کے بیچ ہوئی طویل گفتگو کو اردو کے ڈرامائی ادب کا شاہکار کہا جاسکتا ہے:

> ''ہاں ہماری دعا ہے کہ تم صحیح سلامت دمشق پہنچ جاؤ اور کسی آہو چشم غازی بنتِ عم سے شادی کرو، لڑکے پیدا کرو اور بوڑھے ہوجاؤ اور قصرِ دمشق کے خنک دالانوں میں مودب بیٹھے ہوئے پوتوں، نواسوں سے جب دوسری صلیبی لڑائی میں اپنے کارنامے بیان کرو تو تمہاری آواز رندھ جائے، تمہاری آنکھیں بھیگ جائیں اور تم طلائی کام سے مزین آستینوں سے آنسو پونچھ کر اٹھ جاؤ اور شہتوت کی چھاؤں اور گلاب کی جھاڑیوں کی آڑ میں بچھی ہوئی سنگ ساق کی کرسی پر بیٹھ کر روتے رہو، اور جب تمہارے بے گناہ خادم ناریلی اور نیزے لے کر حاضر ہوں تو تم ان پر برس پڑو اور تمہاری تنہائی کی حفاظت پر زرہیں کمر خواجہ سرا ہلالی تلواریں علم کر کے کھڑی ہوجائیں۔''

(صلاح الدین ایوبی، صفحہ۔46)

قاضی عبدالستار کے اس ناول میں یہ بات محسوس کی گئی ہے کہ انہوں نے دیگر ناولوں کی طرح اس کا موضوع اور تھیم جنگ رکھا اور ہیرو اس کو منتخب کیا جس کی ساری زندگی تلوار کے ہمراہ اور زندگی کی اکثر راتیں میدانِ جنگ میں گزری ہوں۔ جس سے قاری کے ذہن میں کتاب شروع ہونے سے پہلے ہی ہیرو کے متعلق ایک خاکہ تیار ہوجاتا ہے اور اس ہیرو کو قاری مکمل جنگی روپ میں تلاش کرتا ہے اور اس کے سحر

میں ڈوب جانا چاہتا ہے جیسا کہ دیگر جاسوسی ناولوں میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔لیکن یہاں قاضی صاحب ایسے معاشرہ کو پیش کرتے ہیں انسانی نفسیات کا بھی عکس ملتا ہے اور حسن و جمال کی طربیہ محفلیں بھی ملتی ہیں کہیں کہیں یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ قاضی صاحب انسانی نفسیات کے تعلق سے جو مخصوص ذہن اپنے اندر رکھتے تھے وہی اپنی تحریروں میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ٍ قاضی صاحب کا یہ ناول ایک مخصوص تہذیب و تمدن اور زبان کا عکاس ہے ۔انہوں نے جن واقعات، کردار، مناظر اور ماحول کو پیش کیا ہے وہ سبھی اپنے زمان ومکان سے موافقت رکھتے ہیں۔قاضی صاحب نے ناول میں اخلاق، انسانیت، محبت، شجاعت اور جنگی صفات کے پسِ منظر میں صلاح الدین ایوبی کو اسلامی ہیرو کے طور پر پیش کیا ہے۔اور وہ اس میں پوری طرح کامیاب بھی ہوئے ہیں۔انہوں نے اس ناول میں تکنیکی سطح پر کئی تجربے کئے ہیں ان میں شعور کی رو، فلیش بیک، بیانیہ اور خطوط کی تکنیک قابلِ ذکر ہیں۔ناول کی ابتدا میں ہی ملکہ ایلینو ر کے خط ملنے کے بعد کہانی فلیش بیک میں چلی جاتی ہے۔ اور اکتالیس سال قبل ملکہ اور صلاح الدین کے مابین کے رشتے کی ایک ایک پرتیں کھلنے لگتی ہیں۔قاضی صاحب نے شعور کی رو کی تکنیک کے ذریعے صلاح الدین ایوبی اور عصری طرز معاشرت کا بہترین فکری ونفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔ناول کا بیشتر حصہ مذکورہ تکنیک میں بیان کیا گیا ہے۔

قاضی عبدالستار اردو فکشن کے ایک لیجنڈ تھے ان کے افسانوں اور ناولوں کو پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ ایک شاندار قوم کی سلطنت اور تہذیب گرچہ بساطِ عالم سے اجڑ گئی لیکن قاضی عبدالستار کی افسانوی دنیا میں ازسرِ نو قائم ودائم ہوگئی۔

مختصر یہ کہ ناول ''صلاح الدین ایوبی''، صلیبی جنگ وجدال کے زمانے کا ایک حسین مرقع ہے۔ یہ ناول اپنے عہد کی نہ صرف تاریخ اور طرزِ معاشرت کی جیتی جاگتی تصویر ہے بلکہ اسلامی فاتح ومحافظ دین صلاح الدین ایوبی کے طرزِ فکر اور عملی زندگی کا آئینہ بھی ہے۔



انتظار حسین کے افسانوں میں اساطیری پہلو کی عکاسی

شاہین انصاری

ریسرچ اسکالر (شعبہ اردو)، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

قصہ کہانی سننے اور سنانے کا مشغلہ انسانی جبلت میں دور جاہلیت ہی سے شامل رہا ہے۔ قصے اور کہانیاں کسی نہ کسی شکل میں ہر عہد اور ادب میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ کئی دفعہ دوران مطالعہ دیکھا گیا ہے کہ تصوف وحکمت اور مذہبی متعلقات سے مربوط حکایات اور قصے کہانیاں اپنے خاص مقاصد کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔

اسطورہ، اساطیر، دیومالا اور متھ مختلف زبانوں میں یکساں معنوں میں مستعمل ہیں۔ لیکن ان کے اصطلاحی معنوں پر غور کیا جائے تو اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ ان کا اطلاق اس کہانی یا واقعے پر ہوتا ہے جس کا سرا کسی نہ کسی طرح سے قدیم وتاریخی قصوں سے جا ملتا ہے۔ اس میں اسلامی اور غیر اسلامی قصے بھی شامل ہیں۔

افسانوی ادب میں لوک کہانی اور اساطیری کہانی کی قدیم روایت کی واضح جھلکیاں جاتک کتھاؤں، جس کا تعلق گوتم بدھ کے گزرے ہوئے جنم سے ہے۔ اسی طرح قدیم اور جدید افسانوی ادب بھی اساطیری مذہبی رنگ میں ڈوبا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کہانیوں میں پیروں، پیغمبروں، حضرت آدم کی کہانیاں اور سادھو، مہاتماؤں کی زندگی کے واقعات سے تعلق رکھنے والی کہانیاں ملتی ہیں۔

اردو افسانے کا وہ ابتدائی دور جسے ہم افسانے کا تعمیری اور تشکیلی دور کہہ سکتے ہیں۔ اس دور کی تخلیقات میں افسانے کے خدوخال تو نظر آتے ہیں لیکن فن کی کسوٹی پر ان کو مکمل افسانہ نہیں کہہ سکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان تخلیقات میں اساطیری اور دیومالائی عناصر اور مذہبی حکایات کا استعمال بخوبی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اردو افسانے کے ارتقاء میں دو اہم اور قابل ذکر موڑ دیکھنے کو ملتے

ہیں ایک تو ہے رومانیت پسندی اور دوسرا ہے حقیقت پسندی۔ ان دونوں رجحانات کے افسانہ نگاروں نے متھ، دیومالائی اور اساطیری حکایات کو اپنے افسانوں میں برتا اور اسے نئے رنگ اور نئی جہت سے روبرو کرایا ہے۔

اردو افسانے کی تاریخ میں اساطیر سے اپنے افسانوں کا خمیر تیار کرنے والوں میں سب سے اہم اور

معتبر نام انتظار حسین کا ہے۔ انتظار حسین کو اساطیری واقعات کو افسانے کا موضوع بنا کر پیش کرنے کی تمام باریک بینی پر فنی مہارت حاصل ہے۔ انتظار حسین نے بڑی فن کاری سے اساطیر کو اپنے افسانے کا حصہ بنایا ہے۔ جو ان کی شعوری کوشش کا کامیاب تجربہ ہے۔ ان کے اساطیری افسانوں کی کامیابی کا راز، ان کے اپنے وجود کی تلاش کا حصہ بھی ہے۔ ان کے افسانے ہجرت کی منہ بولتی تصویر بھی ہیں اور عہد نامہ جدید کی عکاس بھی۔ انہوں نے داستانی تمثیلی اسلوب کے سبب اردو افسانے کو نئی راہ پر ڈال دیا ہے اور تخلیقی ہنر سے بیک وقت مذہبی روایتوں کو قدیم اساطیری واقعات اور دیو مالائی قصہ سے ملا کر آج کے موجودہ سماج کی صورت حال پر بھرپور طنز بھی کیا ہے۔

انتظار حسین کی پیدائش ۲۱ دسمبر ۱۹۲۵ء کو ضلع بلند شہر کے قصبہ ڈبائی کے ایک متوسط خاندان میں ہوئی تھی۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہی ان کے والد کی نگرانی میں پروان چڑھی۔ ان کے والد مذہبی انسان تھے جس کا اثر ان کے افسانوں پر صاف نظر آتا ہے۔ ان کے اساطیری افسانے اردو ادب کی روایت میں ایک بیش قیمتی اضافہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔

انتظار حسین کے کل چھ (۶) افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کے پہلے اور دوسرے افسانوی مجموعے بعنوان ''گلی کوچے، ۱۹۵۲''، دوسرا ''کنکری، ۱۹۵۵'' کو چھوڑ کر ہر مجموعے میں ایسے افسانے ملتے ہیں جن میں اسلامی اور غیر اسلامی اساطیری واقعات کا عمل دخل پایا جاتا ہے۔

''آخری آدمی'' انتظار حسین کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے جو ۱۹۶۷ء میں منظر عام پر آیا۔ اس میں جملہ گیارہ کہانیاں شامل ہیں۔ ''آخری آدمی'' اس مجموعے کی پہلی کہانی ہے۔ اس افسانے کی شروعات ہی افسانہ نگار نے اس فن کاری سے کی ہے کہ قاری اس کے سحر سے نکل نہیں پاتا اور پڑھنے والا کہانی کو مکمل کرنے کے بعد ہی رکتا ہے۔

انتظار حسین کا افسانہ ''آخری آدمی'' قرآن مجید میں شامل اس واقعے پر مبنی ہے جس میں انسانوں کے بندر بننے کا ذکر ملتا ہے۔ اس واقعہ کا بیان قرآن مجید میں سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۶۵ میں بہت تفصیل سے کیا گیا ہے۔ افسانے میں ایک کردار کے ذریعے یہ نصیحت کی گئی تھی کہ سبت کے دن مچھلی پکڑ کر کھانا منع ہے اور وہ کہتا ہے کہ:۔

> ''رب کی سوگند جس نے سمندر کو گہرے پانیوں والا بنایا اور گہرے پانیوں کو مچھلیوں کا مامن ٹھہرایا، سمندر تمہارے دست ہوس سے پناہ مانگتا ہے اور سبت کے دن مچھلیوں پر ظلم کرنے سے باز رہو کہ مبادا تم اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے قرار پاؤ''

افسانے کے مرکزی کردار الیاسف نے کہا سبت کے دن مچھلی نہیں پکڑوں گا اور اس نے اپنی عقل کا استعمال کرتے ہوئے اللہ سے مکر کرتے ہوئے سمندر کے پاس ایک گڑھا کھود کر سمندر سے ملا دیا اور مچھلی اس راستے سبت کے دن آتی اور اس گڑھے میں گر جاتی تھیں ان کو وہ دوسرے دن کھاتے تھے اور اللہ کے حکم سے وہ سب بندر میں تبدیل ہو گئے۔ جس کا بیان افسانہ نگار نے افسانے میں اس طرح کیا ہے۔:۔

''اس پر اس شخص نے، جو انہیں سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا کرتا تھا یہ کہا کہ بندر تو تمہارے درمیاں موجود ہیں۔ مگر یہ کہ تم دیکھتے نہیں۔ لوگوں نے اس کا برا مانا اور کہا کہ کیا تو ہم سے ٹھٹھا کرتا ہے اور اس نے کہا کہ بے شک ٹھٹھا تم نے خدا سے کیا کہ اس نے سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا اور تم نے سبت کے دن مچھلیوں کا شکار کیا اور جان لو کہ وہ تم سے بڑا ٹھٹھا کرنے والا ہے۔''

انتظار حسین کی کہانی ''نرناری'' ان کے آخری افسانوی مجموعے ''خیمے سے دور'' میں شامل چوتھا افسانہ ہے۔ 'نرناری' ایک ایسی کہانی ہے جس میں انہوں نے Myth اور Legend کا استعمال بہت ہی فن کارانہ انداز میں کیا ہے۔ اس افسانے میں انتظار حسین نے اپنی مہارت سے داستانوی فضا قائم کرنے کی بھر پور کوشش کی ہے۔ جس میں وہ فن اور موضوع کے لحاظ سے کامیاب نظر آتے ہیں۔ اس افسانے کا تانا بانا اصل میں تین کرداروں کے ذریعہ بنا گیا ہے۔ تین کرداروں کے ضمن میں مدن سندری اور پتی دھاول اور مدن سندری کا بھائی گوپی قابل ذکر ہیں۔ کہانی کے پس منظر میں ایک عالی شان مندر کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ اسی مندر میں گوپی اور دھاول اپنے بگوان کے چرنوں میں خود کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ دونوں کے سر دھڑ سے الگ ہو جاتے ہیں اور ان دونوں کی لاشیں خون سے لت پت پڑی رہتی ہیں جسے دیکھ کر مدن سندری اپنے پتی اور بھائی کے ویوگ میں بہت تڑپتی ہے اور ان کی زندگی کی بھیک رو رو کر اور سر پٹکتی ہوئی دیوی کے گن گان کرتی ہوئی مانگتی ہے۔ آخر میں وہ بھی مجبور ہو کر خود کو ختم کرنے کے ارادے سے تلوار لے کر اپنے آپ کو مارنے کی کوشش کرتی ہے تو اس کے اس فیصلہ سے دیوی بہت خوش ہو جاتی ہے اور دیوی کی آواز آس پاس زور سے گونجنے لگتی ہے اور دیوی اسے کہتی ہے کہ تو اپنے پتی اور بھائی کا سر دھڑ سے ملا دے میں نے دونوں کو نیا جیون دان دے دیا ہے۔ یہ بات سن کر مدن سندری کے احساسات و جذبات بے قابو ہو جاتے ہیں اسی وجہ سے وہ یہ سمجھ نہیں پاتی ہے کہ بھائی گوپی کا سر اور دھڑ کون سا ہے اور جلد بازی میں پتی کے سر کو بھائی کے دھڑ سے ملا دیتی ہے اور بھائی کے سر کو اپنے پتی کے دھڑ سے۔ اس طرح مدن سندری کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے جس کو افسانہ نگار نے بڑی فن کاری

سے پیش کیا ہے اور ہندو دیومالائی واقعات کو افسانے کے قالب میں ڈھال کر افسانے میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔

مدن سندری اور دھاول کی زندگی پوری طرح اجیرن بن جاتی ہے۔ مدن سندری جب اپنے پتی کے بارے میں سوچتی ہے تو اسے دھاول کے وجود میں اپنے بھائی کے وجود کا احساس ہوتا ہے اور جب وہ ایک بہن بن کر بھائی گوپی کو دیکھتی ہے تو اس کے پتی کا وجود کاٹنے دوڑتا ہے، یہی صورت حال دھاول کی زندگی میں بھی دوہرا وسوسہ پیدا کر دیتا ہے کہ وہ خود کیا ہے مدن سندری کا پتی ہے یا بھائی۔ اس وسوسہ سے پورے افسانے میں دونوں کرداروں کی نفسیاتی کشمکش کو بڑی ہی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ کہانی کے اختتام پر دیوا نندرشی کی وجہ سے ان دونوں کی حقیقت سے پردہ اُٹھ جاتا ہے۔

افسانے کے مطالعہ سے قاری کو یہ کہانی بظاہر تو عام سی کہانی معلوم ہوتی ہے لیکن انتظار حسین نے ایک طرف جہاں ہندو Mythology کا عمدہ استعمال کرتے ہوئے کہانی کو اسطور کی راہ پر لاتے ہوئے کرداروں کی ذہنی اور نفسیاتی کشمکش کو خوبصورت پیرائے میں پیش کیا ہے۔ انتظار حسین نے اسلامی اور غیر اسلامی دونوں واقعات پر افسانے تحریر کر کے اپنے وسیع مطالعہ، بلند تخیل اور قوت تخلیق کی فنی مہارت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

انتظار حسین کا افسانہ ''زرد کتا'' بھی ایک کامیاب اور اساطیری اہمیت کی حامل کہانی ہے۔ اس کہانی میں بزرگان دین کے ملفوظات کو داستانوی زبان میں نہایت فن کاری سے پیش کیا ہے۔ انتظار حسین کا افسانہ ''کچھوئے'' بدھ جاتکوں پر مبنی بہت ہی بہترین کہانی ہے۔ جس کی تعریف اردو کے مشہور اور مقبول نقاد گوپی چند نارگ نے کچھ اس طرح بیان کی ہے ''اس کہانی میں بودھی حکایتیں سلسلہ در سلسلہ چلتی ہیں۔''

انتظار حسین کے اساطیری افسانوی ادب کے بارے میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اردو کی افسانوی تاریخ انتظار حسین کے اساطیری افسانوں کے بنا کسی بھی صورت میں مکمل نہیں کہی جاسکتی ہے۔

❁❁❁

امیرالنساء کے افسانوں اور ناول میں اسلام پسندی

ڈاکٹر لیس محمد مدثر

اسسٹنٹ پروفیسر جمال محمد کالج، ترچی

اردو زبان میں اصلاحی اور مذہبی پس منظر میں لکھے گئے ناولوں کی لمبی فہرست ہے۔اسی میں ایک اہم نام ناول ''عنبرین'' کا بھی ہے۔

اسلام پسند قلم کار، افسانہ نگار اور ٹمل ناڈو کی اولین ناول نویس خاتون محترمہ اے امیرالنساء صاحبہ کو بچپن ہی سے اسلام اور ادب سے خصوصی دل چسپی تھی۔ بڑی توجہ اور اِنہماک سے وہ کتابوں کا مطالعہ کرتی تھیں۔ کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے ان کی نظر میں وسعت اور نظریات میں گہرائی پیدا ہوگئی۔ پھر اس راہ سے علم وادب کے زینے طے کرتی چلی گئیں۔

ان کی پیدائش ''گُڑیاتم''، ضلع ویلور، ٹمل ناڈو کے نیک نام متموّل گھرانے میں ۱۴/اپریل ۱۹۵۰ء کو محترمہ امیرالنساء پیدا ہوئیں۔ محترمہ امیرالنساء نے کم عمری ہی سے لکھنا شروع کیا۔ مصنفہ کا تعلق گھر کی چار دیواری تک محدود نہیں تھا، بلکہ وہ مسلم معاشرے کی اصلاح وتعمیر سے عملی وابستگی بھی رکھتی تھیں، اور اسے اسلام کا ترجمان دیکھنے کی آرزومند تھیں۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

> ''نبی کریم ﷺ نے ہر اصلاح کا آغاز اپنی ذات، اپنے گھر اور اپنے خاندان سے کیا تھا۔ وعظ ونصیحت سے زیادہ اپنی عملی زندگی کے ذریعے دوسروں کو متوجہ فرمایا تھا۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ساری خرابیاں ہمیں اپنی ذات اور اپنے گھر سے باہر نظر آتی ہیں۔ اگر واقعتاً ہمیں ملت کا درد اور قوم کی فکر ہے تو آیئے اصلاح کی ابتدا اپنی ذات اور اپنے گھر سے کریں''۔ (لمحۂ فکر، ص:۲)

امیرالنساء ''تعلیمِ نسواں'' کی پُرزور وکالت کرتی ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ ''مرد پڑھا فرد پڑھا، عورت پڑھی خاندان پڑھا''۔ مگر وہ تعلیم برائے تعلیم کی قائل نہیں ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر واضح ہے:

> ''ماں کی گود ہی بچے کی پہلی درس گاہ ہوتی ہے۔ ظاہر ہے ایک تعلیم یافتہ ماں ہی بچے کی تربیت اچھے ڈھنگ سے کرسکتی ہے، مگر تعلیم برائے تعلیم نہیں ہونا چاہیے، اور نہ تعلیم کا

مقصد روزگار سے جڑنا چاہیے، کیوں کہ جب عورت گھر سے باہر نکلتی ہے تو گھر کا شیرازہ بکھر جاتا ہے، بچے نوکروں کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں۔شوہر کے ساتھ جب بیوی بھی باہر سے تھکی ماندی آتی ہے تو نہ شوہر کو گھر کا سکون ملتا ہے، نہ بیوی ہی اس قابل ہوتی ہے کہ اپنی ذمے داریوں کو صحیح طور پر انجام دے سکے....موجودہ دور میں کمر توڑ مہنگائی اور معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے رجحان نے عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے عورت اپنا مقصدِ حیات فراموش کر گئی....عورت کی اصل ذمے داری گھر ہے۔وہ گھر کو جنت بھی بنا سکتی ہے اور جہنم بھی۔تعلیم وتربیت ہی اسے فرائض وحقوق کا احساس دلاتے ہیں۔اگر عورت زیورِ تعلیم سے آراستہ نہ ہو تو وہ اپنے فرائض صحیح طریقے سے کیسے انجام دے سکتی ہے؟''۔(مشعلِ راہ،ص:۴۸،۴۹)

امیر النساء اپنے مزاج اور منہاج کے اعتبار سے نہایت متشرع اور متدین واقع ہوئی ہیں۔ان کا یہ مزاج ان کی تحریروں میں بھی صاف نظر آتا ہے۔چاہے ان کے افسانے ہوں یا مضامین ،اخلاق ونصیحت سے خالی نہیں ہوتے۔چوں کہ یہ سفرنامہ مقاماتِ مقدسہ سے متعلق ہے اس لئے اس میں ان کی اسلامی فکر اور صالح مزاجی اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔

امیر النساء کا یہ ناول عین اسلامی تعلیمات کا درس دیتا ہے۔اس میں انھوں نے قرآن اور حدیث کے حوالے سے بہت سی باتیں بتائی ہیں۔امیر النساء کا یہ ناول ''عنبرین'' کی اشاعت 1981ء میں ہوئی ہے۔شاید اس زمانے میں خواتین کا ناول لکھنا تو دور کی بات،انھیں ناول پڑھنے سے بھی منع کیا جاتا تھا۔ اس لیے کہ ناول پڑھنا اخلاقی بُرائی سمجھی جاتی تھی چوں کہ ناول میں عام طور سے ہر بات کھلم کھلا پیش کر دی جاتی تھی جس میں فحش گوئی،عریانیت اور خفیہ حقیقت شامل ہیں،ہمارے سامنے ایسے بہت سے ناول نگار خواتین ہیں جنھوں نے ناول کو اپنے مقاصد کا حربہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔یہاں پر میں ان ناول نگاروں کا نام لینا نہیں چاہتا یہ تو ہر ایک کے علم میں ہے۔جہاں تک ''عنبرین'' کا تعلق ہے یہ ناول ہر خاتون کو پڑھنا چاہئے تا کہ سماج میں جینے کے طور طریقے اور آداب واطوار سے واقف ہوں اور سماج میں اونچ نیچ کے فرق کو ختم کر کے ایک صالح معاشرہ کی بنیاد رکھی جائے،جو محبت ویگانگت اور دوستانہ فضا کا ضامن ہو۔امیر طبقہ اپنی دولت ووجاہت سے غریب طبقہ کو مجبور کر رہا ہے۔اپنی شان وشوکت کے

مظاہرے کے لیے فضول خرچی میں مبتلا ہے۔ بے جا رسومات اور تکلفات سے سماج میں بُرا اثر چھوڑ رہا ہے۔ یہاں پر ناول نگار نے اس بُرائی کو نہ صرف سماجی بُرائی ظاہر کی ہے بلکہ اسلامی طریقۂ کار کے خلاف بتا کر گویا احکامِ خداوندی کی مُہر بھی ثبت کی ہے۔ ولیمہ کو سنت قرار دے کر غریب لوگوں کو زیادہ سے زیادہ شامل کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے غریب پروری کا ثبوت دیا ہے۔ عام طور سے امیروں کی مہمان نوازی بہت خوب ہوتی ہے اور غریبوں کی طرف کچھ بھی التفات نہیں ہوتا ہے اور غریبوں کے ساتھ ایسا معاملہ ہوتا ہے گویا وہ بن بلائے مہمان ہیں۔ سماج کی اس بُرائی کا ناول نگار نے پردہ فاش کیا ہے۔ عنبریں نے اپنے چچازاد بہن غزالہ کو اس سماجی بُرائی سے متنبہ کرنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ ''ویسے تو تم نئے دور سے تعلق رکھتی ہو، مگر تمھیں سو سال پہلے پیدا ہونا چاہئے'' گویا وہ یہ کہنا چاہتی ہے کہ یہ اونٹوں کا زمانہ نہیں رہا یہ تو راکٹوں بلکہ سیٹالائٹ کا زمانہ ہے۔

نوشین بیگم اور عنبرین کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس لیے ہمیشہ ماں اور بیٹی میں بحث ہوتی رہتی ہے لیکن ناول نگار نے ماں کے رتبہ کو کم ہونے نہیں دیا ہمیشہ عنبرین کی گفتگو اور لب ولہجہ میں ماں کی عظمت اور محبت کا توازن باقی رکھا۔ جہاں کہیں ایسے مواقع آئے کہ ماں کی دل شکنی ہو، عنبرین نے وہاں یا تو احتیاط کا پہلو اختیار کیا یا پھر خاموشی۔ یہ تعلیم سماج کی بھی ہے بلکہ اسلامی احکامات کے عین مطابق بھی۔ بقول امیر النساء

> ''نوشین بیگم اور عنبرین کہنے کو تو دونوں ماں بیٹی تھیں، مگر دونوں کے مزاج اتنے مختلف تھے جیسے ندی کے دو کنارے، مزاجوں کا یہ اختلاف اگرچہ ان کی محبت میں کمی کا سبب نہیں بنتا تھا، مگر خیالات دونوں کے آپس میں کبھی کبھی ٹکرا بھی جاتے تھے۔۔۔۔اس کی باتوں سے نہ مخالف کی دل شکنی ہوتی تھی، نہ دل آزاری۔'' (''عنبرین'' امیر النساء صفحہ ۲۷)

شمیم بیگم جو نوشین بیگم کی خالہ ہے، ناول نگار نے اس کردار کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ اس کی غربت ومجبوری اور اپنی بھانجی کی دل آزاری پر صبر کرنا اور تحمل سے کام لینا، اس کردار کی اخلاقی بلندی کا مظہر ہے۔ نوشین بیگم اپنی حقیقی خالہ کو عنبرین کی کھلائی کہتی ہے اور اپنے زمینوں کی دیکھ بھال کرنے والی نوکرانی بتانے کے باوجود صبر وتحمل سے کام لیتی ہے، اُف تک نہیں کرتی اور اس نے اپنی بھانجی کی امیرانہ شان وشوکت پر دھبہ آنے نہیں دیا۔

نوشین بیگم کی ''اس ہاتھ لے اور اس ہاتھ دے'' حکمت عملی عنبرین کو پسند نہ تھی۔ امیر لوگوں کے لیے قیمتی تحفہ دیں، اس لیے کہ وہ بھی قیمتی تحفہ دیتے ہیں۔ غریبوں کے لیے سستا تحفہ اس لیے کہ ان سے واپسی کی امید نہیں۔ عنبرین کم اور زیادہ کا فرق مٹا دینا چاہتی ہے۔ ناول نگار نے عنبرین کی وطن پرستی اور محبّ الوطنی کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے ملک میں بنی ہوئی چیزوں کو غیر ملکی اشیاء پر ترجیح دی ہے اور سالگرہ منانا جو مغربی تہذیب کی تقلید، یہ بھی وہ پسند نہیں کرتی جس میں بے جا روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ وہ یہ چاہتی ہے کہ کاش یہ روپے کسی غریب کے کام آتے۔

نوشین بیگم کا کردار غریب پروری کے منافی ہے، وہ یہ کہتی ہے کہ ہر ایک کا ٹھیکہ کیا ہمیں نے لے رکھا ہے۔ ایسے تو دنیا میں کئی غریب لوگ رہتے ہیں، بقول غالبؔ 'کس کی حاجت روا کرے کوئی'۔ بقول نوشین بیگم

> ''اگر غریب اپنی غریبی کی وجہ سے پریشان ہیں تو اس میں ہمارا کیا قصور، نہ تو ہم ان کی غریبی کے ذمہ دار ہیں نہ ان کی پریشانیوں کے۔ وہ اگر دولت مند بننا چاہتے ہیں تو بن جائیں خوشی سے، ہم نے روکا تھوڑی۔۔۔۔۔۔ ہر ایک اپنے مقدر کا کھاتا ہے۔ ہم نے کسی کی جاگیر نہیں چھینی۔'' (''عنبرین'' صفحہ ۴۹)

عنبرین کو شہر کی زندگی سے زیادہ دیہاتی ماحول زیادہ پسند ہے۔ اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عنبرین کے مزاج میں سادگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ شہر کی زندگی میں بے جا فضول خرچی، رسم و رواج، تکلفات ہوتے ہیں۔ دیہات میں کفایت شعاری، فضول خرچی سے احتراز، بے جا تکلفات اور نام و نمود سے پرہیز کیا جاتا ہے۔ اسی لیے شعیب نوشین بیگم کے عتاب کا شکار بنتا ہے۔ شعیب دیہات کا پروردہ ہے، جی حضوری اس کی طبیعت میں نہیں، خودداری اس کے مزاج میں رچ بس گئی ہے۔ اس کی نظر میں اپنے اور غیر سب برابر ہیں۔ اس کردار کے ذریعے ناول نگار نے امارات کے سامنے سر جھکانے کے بجائے خودداری اور غیرت کی تعلیم دی ہے۔ یہی سادگی اور بے تکلفی عنبرین کے لیے شعیب جیسے لڑکے کو اپنا شریکِ حیات بنانے پر آمادہ کیا۔ عنبرین نے دولت مند بیگم عتیق الرحمٰن کے لڑکے سے بیاہی جانے کے ایک ایسے لڑکے شعیب سے اپنی شادی کے لیے منظوری دی ہے جو خود اپنے ماتحت پرورش پایا ہے، عنبرین کا فیصلہ ناول نگار کے نظریۂ حیات کو تقویت دیتا ہے۔

''بیٹی بچاؤ، بیٹی پڑھاؤ'' کا نعرہ آج سے تقریباً تیس سال پہلے امیر النساء نے لگا دیا تھا، انھوں نے اس ناول میں لڑکیوں کی تعلیم پر بہت زور دیا ہے۔ اگر لڑکیاں زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو گئیں تو وہ ماں باپ

اور شوہر پر بوجھ نہیں بنے گی۔انھوں نے لڑکیوں کو اپنے پیر پر کھڑے ہونے کی ترغیب دی ہے ،انھوں نے جو ذریعۂ معاش تلاش کرنے کی ترکیب بتائی ہے وہ خالصتاً ایک پردہ نشین خاتون کے لیے بالکل مناسب ہے یعنی ٹیلرنگ،کوکنگ اور کچن گارڈننگ کی ٹریننگ وغیرہ۔امیر النساء کے الفاظ میں

''ٹیلرنگ سیکھنے کے بعد کوئی لڑکی بے کار نہیں رہ سکتی۔گھر بیٹھے اسے کام مل جائے گا۔اس طرح پکوان میں بھی ماہر ہوجائے گی۔کہیں بھی شادی بیاہ میں جا کر گھروں میں کھانا بنا سکتی ہے یا خود کوئی چھوٹا موٹا ہوٹل چلا سکتی ہے۔اس طرح کچن گارڈننگ بھی مفید کورس ہے۔سبزیاں وغیرہ اُگا کر فروخت کر کے وہ اپنی آمدنی میں اضافہ کر سکتی ہے۔''(عنبرین صفحہ ۶۷)

الغرض ناول نگار نے عنبرین کو ایک مثالی کردار کے طور پر پیش کیا ہے۔امیر النساء نے اس ناول میں نہ صرف سماجی برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ اس ناول میں ایک مسئلہ کو اٹھایا،سلجھایا اور اس کا حل بھی بتایا ہے۔خواتین کی پریشانیاں اور اس کو کس طرح دور کیا جائے ،ایک عملی نمونہ پیش کر کے اس ناول کو امیر النساء نے مشعلِ راہ بنا دیا ہے۔میں تو سمجھوں گا اگر کسی خاتون کو زندگی کے طور طریقے جاننا، اچھی سماجی زندگی پانا اور اپنے مستقبل کو بنانا ہے تو اس ناول کا مطالعہ بے حد ضروری ہوگا۔



امجدؔ حیدر آبادی کے کلام میں اسلام کی ترجمانی

ڈاکٹر محمد امین اللہ

اسوسیٹ پروفیسر، شعبہء اردو ایس۔وی۔یونیورسٹی، تروپتی

حکیم اشعراء حضرت امجدؔ حیدر آبادی کا شمار اردو کے نہایت ہی اہم رباعی گو شعرا میں ہوتا ہے۔ آپ نے ۴۰۰ سے زائد رباعیاں کہی ہیں اور ان میں بیشتر رباعیات اسلامی تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ ان رباعیات کے مطالعہ سے یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ یہ کوئی عام شاعر کا کلام نہیں بلکہ ایک صوفی شاعر کا کلام ہے۔ حضرت امجدؔ نے نثر کے مقابلہ میں نظم کو اور نظم میں علی الخصوص رباعی گوئی کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ چناں چہ اِس مضمون میں رباعیاتِ امجدؔ کے حوالہ سے اسلامی تعلیمات کی نشاندہی کرتے ہوئے انہیں سلسلہ وار بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حضرت امجدؔ ایک صوفی صافی اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی رباعیات خالص روحانی جذبات اور گہرے مشاہدات کی سچّی ترجمانی کرتی ہیں۔ حضرت امجدؔ صرف اور صرف یادِ الٰہی میں گم ہوجانا چاہتے ہیں۔ اللہ کو راضی کرلینا اور اُس کو پالینا ہی اُن کی زندگی کا مقصد عین رہا ہے۔ اسی لئے وہ فرماتے ہیں۔

ہر وقت ہے لب پہ گفتگوئے مقصود لیکن نظر آتا نہیں روئے مقصود
کیا تم سے بتاؤں زندگی کا مقصد ہے مقصد زیست جستجوئے مقصود

(رباعیات امجد، حصّہ دوم، ص:۶۲)

لیکن خدا کی ذات کو دیکھنے کے لیے نہ انسان کی بینائی مدد دے سکتی ہے اور نہ عقل وخرد کے ذریعہ اس کو سمجھا جاسکتا ہے۔ کائنات کا گہرا مطالعہ اور خودشناسی ہی کے ذریعہ اس کے وجود اور کبریائی کی پہچان ہو سکتی ہے۔ حضرت امجدؔ مخلوق میں خالق کا پرتو دیکھتے ہیں۔ وہ مخلوقات پر غور کر کے خالق کو دریافت کرتے ہیں۔ خارجی نشانیوں کے ذریعہ داخلی حقیقتوں کو جان لیتے ہیں۔ وہ ہر وقت اللہ کی یاد میں رہتے ہیں اور ایسے احساسات کو پیش کرتے ہیں جو ایمان ویقین میں اضافہ کرنے والی ہوتی ہیں۔ خدا کے وجود اور اس کی خدائی کو اس قدر پُر زور دلائل کے ساتھ ثابت کرتے ہیں کہ دلِ منکر بھی نورِ ایمان سے لبریز ہوجاتا ہے۔ ذیل کی چند رباعیاں اس بات کی شاہد ہیں:

صنعت تری ہر خار دکھاتا ہے ہر غنچہء گل تیری صدا دیتا ہے

ہر اصل، اصولِ معرفت ہے یا رب پتّہ پتّہ تیرا پتہ دیتا ہے
(رباعیات امجد، حصّہ دوم، ص:۶۲)

بجتا ہو ستار اور مضراب نہ ہو پھیلی ہوئی چاندنی ہو مہتاب نہ ہو
میں میں نہیں ہوسکتا نہ ہو تو جب تک ممکن ہی نہیں حَباب ہو آب نہ ہو
(رباعیات امجد، حصّہ دوم، ص:۵)

خالق ہے کوئی ارض و سما شاہد ہے انتَ کے لیے اپنا انا شاہد ہے
س پر بھی اگر کوئی نہ مانے نہ سہی خود اپنے وجود پر خدا شاہد ہے
(رباعیات امجد، حصّہ دوم، ص:۱)

معرفتِ الٰہی کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے کہ وہ انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ حضرت امجد نے خود آگہی اور خود شناسی کے وسیلے سے خدا کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ کبھی وہ دل کی کھٹک میں خدا کی آہٹ پاتے ہیں تو کبھی انہیں خدا سے ہم کلامی کی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ کہتے ہیں:

کچھ اپنا پتہ اُس نے بتایا تو نہیں اب تک اس کا سراغ پایا تو نہیں
ملتی ہے دل کی کھٹک آہٹ سے دیکھو دیکھو کہیں وہ آیا تو نہیں
(رباعیات امجد، حصّہ اوّل، ص:۹)

یہ کیا میرے روبرو ہے معلوم نہیں میں کون ہوں کون تو ہے معلوم نہیں
ہوتی رہتی ہیں دل ہی دل میں باتیں کس سے یہ گفتگو ہے معلوم نہیں
(رباعیات امجد، حصّہ دوم، ص:۸۸)

ایک اور رباعی میں قربِ الٰہی کے احساس کو یوں ادا کیا ہے۔

دونوں یکجا مگر ملاقات نہیں باہم کوئی گفتگو نہیں بات نہیں
تو مجھ سے قریب تر میں تجھ سے نزدیک کے بات ہے ہم دونوں میں کیوں بات نہیں
(پیامِ امجد، ص:۳۵)

سچ تو یہ ہے کہ جب اللہ والے اللہ کی محبت میں اس کا قرب حاصل کر لیتے ہیں تو وہ دنیا کے ہر غم اور خوف سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ خدا کے ہو جانے میں جو ابدی لذت انہیں حاصل ہوتی ہے، اِس کا ذکر

حضرت امجدؔ یوں کرتے ہیں:

ساری دنیا سے ہاتھ دھوکر دیکھو جو کچھ بھی رہاسہاہے کھوکر دیکھو
کیا عرض کروں اس میں کیا لذت ہے اک مرتبہ تم اک کے ہوکر دیکھو

(جمالِ امجد،ص:۱۴۵)

حضرت امجدؔ نے تصوف کی مختلف اصطلاحیں مثلاً وحدت الوجود، وحدت الشہود، ہمہ اوست، ہمہ ازاوست وغیرہ کی شاعرانہ وضاحت بھی کی ہے۔آپ کی رباعیات میں ان اصطلاحوں کی تشریح بڑے ہی دلچسپ اور عام فہم انداز میں ملتی ہیں۔

علمِ تصوف کا ایک اہم مسئلہ وحدت الوجود ہے۔اس مسئلہ کو سمجھنے اور اپنے باطن میں انگیز کرنے والے کو موحد کہتے ہیں جو خدا کی وحدانیت کو کائنات کی ہر شئی میں دیکھتا ہے۔ایک موحد کی طرح حضرت امجدؔ کائنات کے ذرہ ذرہ میں خدا کی وحدانیت کو دیکھ لیتے ہیں۔مثال کے طور پر ذیل کی چند رباعیاں ملاحظہ ہوں:

ذرہ ذرہ میں ہے خدائی دیکھو ہر بت میں ہے شانِ کبریائی دیکھو
اعداد تمام مختلف ہیں باہم ہر ایک میں ہے اکائی دیکھو

(رباعیات امجد،حصّہ اوّل،ص:۳۰)

انسان ہزار ہیں مگر قسم ہے ایک گو حروف کثیر ہیں مگر اسم ہے ایک
اس عالم کثرت کا ہے منشا واحد اعضا ہیں جدا جدا مگر جسم ہے ایک

(رباعیات امجد،حصّہ اوّل،ص:۳۱)

ہر رنگ میں بے رنگ کی صورت دیکھی پتھر میں شعلہ کی لطافت دیکھی
واحد سے ہوا ہمیشہ واحد کا صدور کونین میں وحدت ہی کی کثرت دیکھی

(رباعیات امجد،حصّہ دوّم،ص:۵۰)

حضرت امجدؔ کی شاعری کا سرچشمہ قرآن وحدیث ہے۔ان کی بیشتر رباعیاں کسی نہ کسی مذہبی نکتہ کی ترجمانی ہوتی ہیں۔

'**لا موجود الا اللہ**' کے عنوان پر لکھی گئی یہ رباعی ملاحظہ ہو۔

ہیں مست مئے شہود تو بھی میں بھی ہیں مدعی نمود تو بھی میں بھی یا تو ہی نہیں
جہاں میں یا میں بھی نہیں ممکن نہیں دو وجود تو بھی میں بھی

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص:69)

''**وحدہ لاشریك**'' کے عنوان سے حضرت امجد کی یہ رباعی ملاحظہ کیجئے۔

بے خود میں رہوں تو وہ خریں آتا ہے　　پردہ ہی میں وہ پردہ نشین آتا ہے
وہ جب آتا ہے میں نہیں رہتا ہوں　　میں جب رہتا ہوں وہ نہیں آتا ہے

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص:68)

نماز کی اہمیت کو یوں واضح کرتے ہیں۔

پیراہنِ کبر چاک ہو جاتا ہے نفسِ سرکش ہلاک ہوجاتا ہے
مومن کے لئے عجیب نعمت ہے نماز سرخاک پر رکھ کے پاک ہوجاتا ہے

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص:24)

اللہ کی ذات، حیّ و قیوم ہے۔ وہی ذات باقی رہنے والی ہے۔ باقی سب کا فنا ہونا لازمی ہے۔ حضرت امجد نے اس خیال کو کس خوبی سے باندھا ہے ملاحظہ ہو۔

واجب ہی کو ہے دوام، باقی فانی قیوم　　ہی کو ہے قیام، باقی فانی
کہنے کو تو زمیں و آسماں سب کچھ ہے باقی　　ہے اسی کا نام باقی فانی

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص:5)

توبہ ایک ایسا عمل ہے، جس سے نفس کی صفائی اور قلب کا تزکیہ ہوتا ہے۔ حضرت امجد توبہ کی اہمیت اور فضیلت کے تعلق سے لکھتے ہیں:

جب میں اپنی خطاؤں پہ شرماتا ہوں اک خاص سرور قلب میں پاتا ہوں
توبہ کرتا ہوں جب گناہ سے امجد پہلے سے زیادہ پاک ہوجاتا ہوں

(رباعیاتِ امجد، حصہ سوم، ص:76)

غرض حضرت امجد کا شمار اردو کے اُن اہم شاعروں میں ہوتا ہے جن کی شاعری کا سرچشمہ قرآن و حدیث اور تصوف ہے۔ رباعیات امجد کے علاوہ آپ کی تمام شعری اور نثری تصنیفات میں بھی حضرت امجد نے اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کو حکیمانہ انداز میں پیش کیا ہے۔



اردو زبان کے فروغ میں مذہبی صحافت کا رول

ڈاکٹر شیخ فاروق باشاعمری
صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ ڈگری کالج، نندیال، آندھراپردیش

1857ء کے بعد ہندوستان پر انگریزوں کا پوری طرح تسلط ہوگیا تو انہوں نے مذہب عیسائیت کا پرچار شروع کیا، جس سے ہندوستانی عوام پر بدترین اثرات مرتب ہوئے۔ نوجوان طبقہ اس کی جانب متوجہ ہونے لگا اس کے علاوہ اسلام پر آریہ سماج کی جانب سے رکیک حملے ہونے لگے۔ اسلام اور اسلامی تعلیمات کا مضحکہ اڑایا جانے لگا جس کی وجہ سے مسلمان نوجوانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا ہونے لگے۔ ان حالات میں علمائے اسلام بالخصوص علمائے اہل حدیث اپنی تقریر وتحریر کے ذریعہ میدان صحافت میں کود پڑے اور اپنے سنجیدہ علمی اور تحقیقی تحریروں کے ذریعہ دشمنان اسلام کا منہ توڑ جواب دیا اس ضمن میں جن اخبارات ورسائل پیش پیش تھے ان میں اشاعت السنہ ایک اہم ماہانہ اردو رسالہ ہے۔ جو 1878 میں بٹالہ سے جاری ہوا۔ یہ جماعت اہل حدیث کا پہلا رسالہ ہے جس نے اردو زبان میں علوم اسلامیہ کی تشریح وتوضیح کی اور اسلام پر ہونے والے عیسائی اور قادیانی حملوں کا جواب دیتا تھا ہفت روزہ اخبار ''اہلحدیث'' امرتسر سے 1903 میں مولانا ثناء اللہ امرتسری کی ادارت میں جاری ہوا جو کثیرالاشاعت ہونے کے ساتھ ساتھ ہر مذہب وملت میں نہایت مقبول تھا۔ یہ اخبار ہر جمعہ کو شائع ہوتا تھا، جس میں مذہبی اخلاقی، مضامین، فتاوی اور مخالفین کے اعتراضات کے جوابات اردو زبان میں دیے جاتے تھے، اس اخبار کا آخری شمارہ 1947 اگست کو شائع ہوا۔ یہ اخبار مسلسل 44 سال جاری ہوا۔ اس اخبار کے چند شمارے ریختہ ویب سائٹس پر قارئین کے لیے دستیاب ہیں۔ اس اخبار میں کوئی نہ کوئی نظم یا شاعری ضرور ہوتی تھی۔

آخبار اہل حدیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مضامین کی زبان نہایت عام فہم اور آسان ہے جسے عوام آسانی سے سمجھتے تھے۔ اس اخبار کے ذریعہ آسان اردو زبان کو فروغ حاصل ہوا۔ ضیاء السنہ مولانا ضیاء الرحمٰن صاحب کی ادارت میں فروری 1902 کو کلکتہ سے جاری ہوا اس اخبار میں مدیر کی پند ونصائح پر مشتمل نظمیں ہوتی تھیں۔ توحید وسنت کی خوبیاں اور شرک وبدعت کی برائیاں اجاگر کی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ خلفائے اسلام کی تاریخ اور سوانح عمریاں اور انگریزی اور عربی اخبارت کی خبریں بھی شائع ہوتی تھیں۔

''مرقع قادیانی'' مولانا ثناء اللہ اورتسری کی ادارت میں شائع ہونے والا ایک اہم اخبار ہے جو 1907 کو جاری ہوا۔اس رسالہ میں مرزا غلام احمد قادیاتی کی نبوت اوراس کے مسیح موعود ہونے کی تردید کی جاتی تھی۔''النذیر'' بھی ایک اہم رسالہ ہے جو منشی نذیر حسین کی ادارت میں میرٹھ سے شائع ہوتا تھا۔ اس میں ویدوں کی حقیقت بیان کی جاتی تھی۔ایک اہم ماہانہ اخبار مسلم اہل حدیث گزٹ دہلی سے ابو الفضل عبدالحنان صاحب کی ادارت میں 1933 کو جاری ہوا جس کا اہم مقصد دینی،مسلکی اوراصلاحی مضامین کے علاوہ شرک و بدعت سے امت مسلمہ کو بچانا تھا۔اس کے سرورق پر اسلامی اشعار درج کیے جاتے تھے۔اس اخبار میں چیدہ چیدہ خبریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ان رسائل واخبارت کے علاوہ مجلّہ ہاتف، ہمدرد اہل حدیث،نصرۃ السنہ،المشیر ،صحیفہء اہل حدیث،السعید، تنظیم اہل حدیث،تبلیغ السنہ،اہل الذکر، اخبار محمدی،آثار السنہ جیسے اخبارات و رسائل جماعت اہل حدیث صحافیوں کی نمایاں خدمات ہیں۔درج ذیل چند ایسے اخبارات و رسائل کا تذکرہ کیا جاتا ہے جن کی خدمات ادب اور تاریخ کے حوالے سے ہمیشہ یادرکھی جائیں گی۔

رسالہ پروانہ ماہنامہ اردو زبان کا ایک اہم رسالہ ہے جو مولانا احمد شوکت میرٹھی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا جس میں شعروشاعری کا گلدستہ ہوتا تھا اس میں معیاری شعراء کا کلام شائع ہوتا تھا۔رسالہ تہذیب ماہنامہ 1915 میں لکھنو سے شائع ہوتا تھا۔جس میں تنقیدی مضامین شائع ہوتے تھے۔بیسویں صدی کی ابتدا میں ندوہ تحریک اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ترجمان کی حیثیت سے علامہ شبلی نعمانی کی ادارت میں شائع ہوا۔جس سے اسلامی صحافت میں ایک سنہرے دور کا آغاز ہوا۔اس مجلّہ نے صحافت کی جدید راہوں کو اپنایا۔زبان کے اسلوب کے نئے انداز اپنائے اس لیے کہ الندوہ کو جو مدیران دستیاب ہوئے وہ عالم اسلام کی معروف شخصیات ہونے کے علاوہ صاحب طرز انشاپرداز اور بلند پایہ ادیب صحافی تھے جیسے علامہ شبلی،حبیب الرحمٰن خاں شیروانی،علامہ سید سلیمان ندوی،سید ابوالحسن علی حسنی ندوی،مولانا عبدالسلام وغیرہ۔

ہندوستانی صحافت کے ایک اہم روح رواں مولانا محمد علی جوہر ہیں جنھوں نے انگریزی میں کامریڈ نکالا،جن کی انگریزی انشاپردازی کی سحر بیانی سے انگریز بھی مسحور ہوجاتے تھے،اردو زبان میں ہمدرد کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار جاری کیا،تحریک آزادی کی تاریخ میں اس کے رول کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا،ہمدرد نہ خالص سیاسی تھا نہ خالص اسلامی بلکہ دونوں کا امتزاج ہمیں اس میں ملتا ہے،مولانا کی صحافت کا اگر جائزہ لیا جائے تو ان کے تین اسلوب ہیں۔پہلا اسلوب وہ ہے جس میں متانت سنجیدگی اور

استدلالی کیفیت اور عام فہم انداز ملتا ہے، دوسرا اسلوب شخصیاتی بحثوں اور معاصرانہ چشمک کا مظہر ہے، تیسرا اسلوب جس میں خطاب قاری سے نہیں بلکہ خالق سے ہے، مولانا کا یہ اسلوب زبان و بیان کی لطافتوں اور نزاکتوں سے پر ہے۔

مولانا عبدالحلیم شرر اردو زبان و ادب کے ایک اہم ادیب اور صحافی ہیں، کئی ایک رسالے اور اخبار جاری کیے جیسے اتحاد پندرہ روزہ، پردہ عصمت پندرہ روزہ، پیام یار ماہنامہ، دل افروز ماہنامہ، رسالہ دلگداز ماہنامہ، رسالہ سخن سنج سہ ماہی، رسالہ محشر ہفت روزہ، ظریف ہفت روزہ، العرفان ماہنامہ، مؤرخ ماہنامہ، مہذب وغیرہ۔ ان کے بیشتر رسائل علمی، ادبی اور تاریخی ہوتے تھے، جیسے پیام یار یہ پرچہ علمی، ادبی اور تاریخی تھا۔ اس کے تین حصے ہوتے تھے۔ پہلے حصہ میں علمی مضامین اور نیچرل نظمیں شامل ہوتے تھے، حصہ دوم میں معیاری شعراء کا منتخب کلام اور حصہ سوم میں ناول شائع ہوتے تھے۔ مولانا کا رسالہ دلگداز اردو صحافت میں ایک اہم مقام رکھتا تھا یہ پرچہ اردو کا بہترین علمی، ادبی اور تاریخی رسالہ تھا۔ اس کے تعلق سے جوش شرر صاحب رقمطراز ہیں۔

> ''دلگداز وہ پرچہ ہے جس نے بحیثیت لٹریچر اردو کی دنیا میں خود ہی ناموری نہیں حاصل کی بلکہ اردو کو اعلی درجہ کمال اور سراپا اثر حالت پر پہونچا دیا''۔
>
> (مہذب یکم اگست 1890)

اس رسالہ میں شرر صاحب کے مضامین کے علاوہ ناول بھی شائع ہوتے تھے۔

مذہبی ادب کے فروغ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے رسالے ''الہلال اور البلاغ'' کے نمایاں رول کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں کا مقصد دین اسلام اور صراط مستقیم کی تبلیغ و اشاعت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اثر مضامین مذہبی اور اصلاحی نوعیت کے ہوتے تھے۔۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی صحافت کے ذریعہ نہ صرف اردو صحافت کا معیار بلند کیا بلکہ اپنی خطیبانہ نثر کے ذریعہ اردو کو نیا لب و لہجہ اور نیا اسلوب عطا کیا۔ الہلال نے جہاں سیاست، معاشیات، نفسیات، جغرافیہ، تاریخ، عمرانیات، سوانح، ادب اور مسائل حاضرہ پر اعلی درجہ کی تحریریں شائع کیں وہیں امت مسلمہ کی مذہبی و اقتصادی اور ذہنی و فکری رہنمائی بھی کی۔ یہ کثیر الاشاعت اخبار تھا ایک وقت اس کی تعداد اشاعت چھبیس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ الہلال اور البلاغ کے ذریعہ مولانا نے جو بھی اسلوب اپنایا اس سے اردو زبان و ادب کو فروغ حاصل ہوا۔ مولانا کے اسلوب کا تتبع بہت سے ادیبوں نے کیا لیکن کسی کو مولانا کے نوک قلم تک رسائی حاصل نہیں ہو سکی۔ مولانا کی ادارت میں بہت سے اخبار جاری ہوئے جیسے الندوہ، نیرنگ

عالم، وکیل، دارالسلطنت وغیرہ۔

دہلی سے ماہنامہ ''محدث'' 1933 میں جاری کیا گیا جو خالص اسلامی تعلیمات پر مبنی رسالہ تھا۔اس رسالہ کی خاصیت یہ تھی کہ عام اصلاحی اور اقتصادی پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی تھی، اور مسلمانوں کی دینی و دنیاوی رہبری کرتا تھا۔اس میں دارالحدیث رحمانیہ دہلی کے طلبہ مضامین لکھتے تھے۔ پندرہ روزہ ''ترجمان'' جو دہلی ہی سے شائع ہوتا ہے ایک خالص دینی و اصلاحی مقاصد کے تحت جاری ہوا۔اس کی اشاعت بلا ناغہ آج بھی جاری ہے۔اس اخبار میں دینی، علمی، اخلاقی، اصلاحی اور جماعتی مضامین شائع ہوتے ہیں، نیز ملکی اور عالمی مسلمانوں کے مسائل پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ ماہنامہ آثار جامعہ اثریہ دارالحدیث مؤ ناتھ بھنجن سے شائع ہوتا ہے اس رسالہ میں اسلامی موضوعات، اسلامی عقیدہ اور اسلامی عمل کو اجاگر کیا جاتا ہے۔1988 سے یہ رسالہ آثار جدید کے نام سے جاری ہے۔

ماہنامہ ''البلاغ'' دارالمعارف ممبئی سے شیخ ارشد مختار عمری کی ادارت میں شائع ہوتا ہے اس کا سن اجرا آگست 1990 ہے اس رسالہ میں حالات حاضرہ، سماجی و معاشرتی مسائل کی عکاسی کی جاتی ہے نیز قرآن اور حدیث کی روشنی میں سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔''محدث'' جامعہ سلفیہ بنارس سے سن 1982 میں جاری ہوا، یہ جامعہ سلفیہ بنارس کا ترجمان ہے۔کتاب وسنت کی بے لاگ ترجمانی میں اس رسالہ کو اہم مقام حاصل ہے۔ہفت روزہ مسلم سری نگر کشمیر سے شائع ہوتا تھا جس کا سن اجراء 1942 ہے اس رسالہ میں علمی، ادبی، تاریخی اور اصلاحی عناوین کے علاوہ تحقیقی مسائل پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ نوائے اسلام ماہنامہ رسالہ ہے جو 1984 کو جاری ہوا۔ یہ رسالہ مجلس الدعوہ السّلفیہ کا علمی وتبلیغی اور اصلاحی رسالہ ہے، اس میں دینی معاشرتی اور تاریخی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ماہنامہ مجلّہ طوبی جو جامعہ ابن تیمیہ مشرقی چمپارن بہار سے 2001 میں ارشد مدنی کی ادارت میں جاری ہوا۔ یہ رسالہ جامعہ ابن تیمیہ کا ترجمان ہے اس میں دینی، اصلاحی اور تاریخی مضامین شائع ہوتے ہیں۔مجلّہ الفرقان سہ ماہی جامعہ خیرالعلوم، ڈرمریا گنج سدھارتھ نگر سے 1997 میں جاری ہوا مولانا عبدالحفیظ ندوی اس کے مدیر تھے۔ یہ رسالہ بلا ناغہ تاحال جاری ہے۔

مذہبی صحافت کے فروغ میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا نام صف اول میں شمار کیا جاتا ہے۔انہوں نے مذہبی صحافت کے معیار کو اپنے مقالات سے بلند کیا۔انہیں ایک اسلامی ادیب ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔انہوں نے مختلف اخباروں اور رسائل کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی، سچ، صدق، اور صدق جدید خود ان کے اخبار تھے۔ ہمدرد، معارف، الندوہ، صوت الکلام میں وہ مستقل کالم لکھتے تھے۔صدق جدید

کے اسلوب کی ایک مثال ملاحظہ ہو جس میں مغربی طرز حیات اور اسلامی طرز زندگی کی وضاحت کرتے ہیں۔ زنا بالجبر کی خبر نشر کرنے کے بعد اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''گویا پولیس تھک کر مایوس ہوگئی، عدالتیں ناکام ہوگئیں، جیل خانے ناکافی ثابت ہوگئے اور اب ضرورت اس کی ہے کہ مجرموں کو گولی سے اڑا دیا جائے اور یہ مطالبہ وہاں شروع ہوگیا ہے جہاں حرام کاری کے لیے تازیانہ اور سنگساری کی سزا پسماندہ ذہنیت کی نشانی اور وحشت و بربریت کی دلیل ہے، اے مغرب کے دانشورو! اسلام کے تصور عفت و عصمت کی خوب ہنسی اڑالو، اسلامی آداب حیا وحجاب کے ساتھ جی بھر کر تمسخر کرلو، شابیں پی پی کر اپنے معاشرے کو زنا پسندی کے سیلاب میں غرق کردو، اپنے افسانوں، ناولوں، اخباروں، رسالوں، ناٹکوں، کھیل تماشوں، تصویروں، مجسموں غرض ہر راستے سے ہیجانی شہوت اور تاطم نفس برپا کردو اور جب اپنے ہی لاء ہوئے ہولناک طوفان کی پوری زد میں اپنی ہی بہنوں، بیٹیوں اور بیویوں پر پڑنے لگے اور چوپایوں وانسانوں کے درمیان کوئی فرق حیا وغیرت کے لحاظ سے نہ رہ جائے تو بے تحاشا گولیاں چلانے اور مارشل لا لگانے کے لیے شور مچانے لگو''۔

اس اقتباس کا موضوع مذہبی سزائیں ہیں لیکن اس زبان کی چاشنی اس قدر رچ بس گئی ہے کہ بار بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ اس قسم کی مثالوں کو مذہبی ادب کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

غرض مذہبی صحافت کی تاریخ نہایت طویل ہے، اس مختصر سے مضمون میں ان سب کا احاطہ مشکل ہے، درج بالا چند رسائل اور جرائد پر نظر ڈالنے کے بعد ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ اردو زبان وادب کے فروغ میں ان رسالوں کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ان رسالوں نے جہاں امت مسلمہ کی دینی و اصلاحی رہبری کی وہیں اردو زبان کو فروغ دینے میں سرگرم تھے اور آج بھی ہیں۔



شبیب احمد کاف کے افسانوں میں اخلاقی رجحانات

ڈاکٹر ایم سعید الدین
اسسٹنٹ پروفیسر آف اردو، اسلامیہ کالج (خود مختار)، وانمباڑی

شبیب احمد کاف کا شمار تمل ناڈو کے مشہور و معروف افسانہ نگاروں کی فہرست میں ہوتا ہے جن کے افسانے شمال کے رسائل و جرائد کی زینت بنتے رہے ہیں۔ان کے افسانوں میں ایک سبق موجود ہوتا ہے۔انہوں نے اردو ادب کو شاہکار افسانے دئے۔ ان کے افسانوں کے اکثر و بیشتر موضوعات اخلاق پر مبنی ہیں۔شبیب احمد کاف کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ہر بات کو نہایت سیدھے سادے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ان کے اکثر افسانوں میں بے ساختہ پن نمایاں ہے اور یہ بے ساختہ پن کسی تکلف یا آورد کا نتیجہ نہیں بلکہ زندگی کی سچائیوں اور حقیقتوں کے عمیق مطالعہ کا نچوڑ ہے۔ بقول ڈاکٹر جلال عرفان:

> ''شبیب احمد کاف تمل ناڈو کے بہت ہی کم عمر افسانہ نگار تھے جنہوں نے قلیل عمر میں ادبی زندگی میں ملک گیر شہرت حاصل کی۔شبیب احمد کاف کے افسانوں میں کئی ایک رنگ پھوٹ پڑے۔ انہوں نے لکھا اور ہر موضوع پر لکھا لیکن بے مقصد نہیں لکھا۔ ایک سالم معاشرے کی تعمیر کے لئے جیسے ادب کی ضرورت تھی ، ویسا ہی معاون ادب لکھا۔ ادب برائے مقصد کے نظریے کے تحت لکھا۔'' (وانمباڑی میں اردو ادب کی ایک صدی۔ڈاکٹر جلال عرفان۔ص ۲۲۱)

زندگی کی بے ثباتی کے احساس نے شبیب احمد کاف سے تھوڑی سی مدت میں بہت کچھ لکھوا ڈالا۔ زندگی کی ناپائیداری کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں:

> ''زندگی بہت مختصر ہے۔آہستہ چلو گے تو پیچھے رہ جاؤ گے۔ہمیں بہت کام کرنے ہیں۔ اس لئے بھاگتے رہو۔ رکنے یا آہستہ چلنے سے جمود آتا ہے۔'' (آزادی کے بعد تمل ناڈو میں اردو نثر کا ارتقاء۔۔ڈاکٹر پی احمد باشاہ،ص ۱۵۳)

شبیب احمد کے بارے میں پروفیسر سید سجاد حسین مزید لکھتے ہیں:

> ''شبیب رومان پسند ضرور تھے لیکن انہوں نے حقیقت کی چلچلاتی دھوپ سے بھی آنکھیں چار کی ہیں۔ زندگی کی لطافتوں کے علاوہ زندگی کی کثافتوں کو بھی سمیٹنے کی ہمت کی

ہے اس لئے ان کے مشاہدات نے جب افسانوں کا روپ دھارا تو یہ ان کے مشاہدات نہ رہ کر ہم سب کے مشاہدات بن جاتے ہیں۔'' (شبیب احمد کاف 'افسانوں کے آئینہ میں' ناشر اسلامیہ کالج، وانمباڑی۔ص ۷)

شبیب کی کہانیوں میں معاشرے کے ستائے ہوئے کردار شکست خوردہ ذہنیت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے زندگی کے ولولے اور عزم کا ثبوت دیتے ہیں اور اپنے پس ماندہ ماحول کا مقابلہ کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ ان کے افسانوں میں جذبہ کی شدت ہر جگہ کارفرما نظر آئے گی۔ کردار سازی میں شبیب احمد کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ قلم کی ایک جنبش سے چند فقروں یا کلمات سے وہ ایسے زندہ کردار پیدا کر دیتے ہیں کہ جن کی شخصیت چیخ کر اپنی انفرادیت قائم کر لیتی ہے۔

''لہو پکارے گا'' ایک ایسا متاثر کن افسانہ ہے جس میں ماں باپ اور بیٹا بہو کے درمیان پیش آنے والے واقعات کو بڑی عمدگی کے ساتھ افسانے کے روپ میں ڈھالا گیا ہے۔ ہمارے ملک میں مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ سلگتا ہوا مسئلہ فرقہ وارانہ فسادات ہے۔ ہندوستان کا موجودہ مسلم معاشرہ ہمیشہ فرقہ وارانہ فسادات کی زد میں ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے سر پر عصبیت اور نفرت وعناد کی تلوار ہمیشہ لہراتی رہتی ہے۔ کب، کہاں اور کیسے فساد برپا ہو جائے، اس کی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ

اس حقیقت کو افسانہ نگار نے اپنے افسانے ''ثالث'' میں جوان کے افسانوی مجموعہ کا پہلا افسانہ بھی ہے، اس میں بیان کیا ہے۔ اس افسانے میں سلام کا کردار ہمیں سعادت حسن منٹو کے افسانے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کی یاد دلاتا ہے جس کا مرکزی کردار ایک پاگل قسم کا سکھ ہے۔ اس کی حرکتیں اور باتیں مجذوب کی طرح ہوتی ہیں لیکن اس کا منتہائے نظر صلح کل ہے۔ اسی طرح سلام با کا کردار ایک صوفی منش، درویش صفت یا مجذوب قسم کا کردار ہے۔ لیکن اپنے عمل سے وہ اتنا بڑا کام کرواتا ہے جو کسی ذی ہوش انسان کے بس کی بات نہیں۔ جب تک ہوش مندی، سمجھ داری اور ہوشیاری کا دعویٰ کرنے والے آپس میں لڑ جھگڑتے رہیں گے اس وقت تک مسائل کو سلجھانے کے لئے ہمارے معاشرے کو سلام با جیسے مجذوب انسانوں کی ضرورت باقی رہے گی۔ چنانچہ یہی ہوا کہ جب گاؤں میں فساد پھوٹ پڑا، دونوں طرف کے لوگ مارے گئے، بعض معذور ہوئے۔ چند دوکانیں لٹیں، سڑکیں سنسان ہوئیں، گلیاں ویران ہوئیں اور کرفیو لگا۔۔۔۔

''اس ہنگامے کا سبب کوئی نہیں جانتا۔ سبب کبھی ہوتا کہاں ہے۔ کوئی وجہ ہوتی تو اس کوڑھ کا علاج ضرور ہو چکا ہوتا۔ رونا یہی ہے نا کہ وجہ کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ چند آہیں

بلند ہوتی ہیں۔فضا چیخوں سے تھرا اٹھتی ہے، چوڑیاں ٹوٹتی ہیں، سسکیاں طول پکڑتی ہیں،
گردنیں کٹتی ہیں اور موریاں، نالیاں لال ہو جاتی ہیں۔''

جس انداز سے تڑپ اور کرب کی کیفیات کی منظر کشی ان جملوں میں کی گئی ہے، وہ شبیب کی فنی دسترس کا ثبوت دیتا ہے۔

شبیب احمد کے مزید دو افسانوں کا مرکزی موضوع بھی فسادات ہی ہے جن میں ایک ''یہاں انسانیت دفن ہے'' اور دوسرا ''رکھا کیا ہے'' ہے۔

فسادات کے موضوع پر لکھے گئے شبیب احمد کے دیگر تمام افسانوں میں افسانہ ''رکھا کیا ہے'' اس لحاظ سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ یہاں مصنف نے مسلم معاشرے کی اجتماعی اور انفرادی نفسیات کا بے لاگ اظہار کیا ہے۔

افسانہ وہی عمدہ تصور کیا جاتا ہے جس میں مصنف براہِ راست نہ بولے اور وہ کرداروں کو بالراست بولنے دے اور یہی وہ فنی خوبی ہے جو افسانہ ''رکھا کیا ہے'' میں پائی جاتی ہے۔ یہ مکالماتی افسانہ ہے۔ کردار نگاری برائے نام ہی ہے لیکن جس طرح مکالموں کے ذریعہ کرداروں کی شخصیت کو ابھارا گیا ہے وہ افسانہ نگار کے فن پر دلالت کرتا ہے۔

اس افسانے کا ایک کردار 'سبرا منیم' موجودہ مسلم سماج کی بعض خامیوں کی جانب اس طرح اشارہ کرتا ہے:

''تمہاری قوم کی بھی کچھ خامیاں ہیں ،غلطیاں ہیں، جنہیں وہ دوہراتے
ہیں۔۔۔تمہاری قوم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ Highly Inflammable
ہے ۔جلدی بھڑک جانے والی چیز ہے۔ایسا کیوں ہے کہ صرف تم محمد ﷺ کے نام پر
مرجانے کے لئے تیار ہو،لیکن ان کی تعلیمات پر عمل پیرائی کے لئے راضی نہیں۔''

شبیب احمد کاف کے اکثر و بیشتر افسانوں میں انسان دوستی کے فطری جذبات اور حقوق العباد کے اسلامی تصورات کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔اسلامی نقطۂ نظر سے حقوق العباد کی جو اہمیت ہے، کوئی بھی باشعور مسلمان اس سے انکار نہیں کرسکتا لیکن آج کے مسلم معاشرے میں اس کی جو دھجیاں اڑائی جارہی ہیں، اس کی عکاسی شبیب کے افسانوں میں بخوبی کی گئی ہے۔

افسانہ ''کاتب صاحب'' میں مسلم ملکوں کی اپنے ملازمین کے ساتھ ناانصافی کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔ مسلم محنت کش طبقے کی سچی تصویر افسانے ''ایکسپرس'' میں کھینچی گئی ہے۔ایک بوجھ اٹھانے والا قلی جس کا اصلی نام کوئی نہیں جانتا، لیکن جو اپنی تیز رفتاری کے باعث ''ایکسپرس'' کے نام سے مشہور ہے

،وہ افسانہ نگار کی زندگی کو یہ سبق دے کر کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے کہ محنت ہی میں کامیابی کا راز ہے اور آہستہ چلو گے تو پیچھے رہ جاؤ گے۔ یہ کردار بوڑھا ہو کر بھی اتنا خوددار ہے کہ وہ مدد کے لئے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ وہ خود اپنی محنت کی کمائی سے زمین خرید لیتا ہے اور اس کی رجسٹری بھی کرواتا ہے لیکن اس کے برعکس ایک استاد شمس صاحب ہیں کہ زمین کی رجسٹری کے لئے اس کے پاس مدد طلب کرتے ہیں۔اس موقع پر افسانے کے آخر میں ایک سوال لمحۂ فکر فراہم کرتا ہے؟

''استاد کس کو کہوں، شمس صاحب کو یا ایکسپرس کو''

اس طرح یہاں عملی زندگی میں ایک معمولی قلی ایک قابل استاد کو مات دیتا نظر آتا ہے۔

ان کے ایک اور افسانے ''حق تو یہ ہے'' (جو ان کے افسانوی مجموعہ کا عنوان ہے) میں بھی افسانہ نگار نے گفتار کے غازی اساتذہ پر گہرا طنز کیا ہے۔ وہ اپنے طلبہ کو جو سبق پڑھاتے ہیں اس پر خود عمل نہیں کرتے۔ اس افسانے میں ایک استاد کو جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے لیکن شاگرد استاد کا حق ادا کرنے کی خاطر اس کی جگہ خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیتا ہے، پھر بھی اس کو یہ خیال ستاتا ہے کہ:

''اس نے استاد کا حق ادا کیا یا نہیں''

کسی مسجد میں پنکھا نہ ہونے کی بات دوسرا کوئی اتنی شدت سے محسوس بھی کرتا ہو یا نہ ہو لیکن ایک حساس انسان کو اس کی کمی بار بار کچوکے لگاتی ہے۔ شبیب احمد کے افسانے ''آٹھواں پنکھا'' میں ایک ذی حس آدمی کے اسی حساس کو نہایت ہی دلچسپ انداز میں اجاگر کیا گیا ہے۔ اسی دوران مسجد کے پس منظر میں افسانہ نگار نے مسلمانوں کی اپنے مذہب سے رسمی وابستگی پر ہلکی سی چوٹ بھی کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

''جمعہ کے دن نمازی برسات کے پتنگوں کی طرح آجاتے اور مسجد بھر جاتی۔۔۔۔ ویسے ہی چار و نا چار وہ مسجد کو آئے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ کچھ تو یہ سوچ کر کہ جمعہ بھی نہ پڑھیں تو جنت ہرگز نہ ملے گی، کچھ اس خیال سے کہ نسلی مسلمانوں کو جمعہ تو ضرور پڑھنا چاہئے۔''

بہر حال! مسجد میں آٹھویں پنکھے کی کمی کو پورا کرنے کے لئے وہ جٹ جاتا ہے لیکن متوسط طبقے کی محدود آمدنی کی وجہ سے اس رقم کا جلدی انتظام نہیں کر پاتا۔ دریں اثناء اس کی ملاقات اپنے بچپن کے دوست عبدالرزاق سے ہوتی ہے۔ اس کی مفلوک الحالی اس کے لئے ایک اور دکھ کا باعث ہوتی ہے۔ اس کے گھر میں بھی پنکھے کی کمی ہوتی ہے۔ جس کے کھانے کے لالے پڑے ہوں، وہ پنکھا کیا خریدے گا لیکن پھر بھی وہ مچھروں سے پریشان ہے۔

ایک مرتبہ اس کو اپنے سفر کے دوران کسی لاڈج میں ٹھہرنا پڑتا ہے تو مچھرا تنا تنگ کرتے ہیں کہ وہ رات بھر سو نہیں پاتا کیوں کہ وہاں بجلی فیل ہو جاتی ہے چنانچہ اس موقع پر اس کو اپنے غریب دوست کی تکلیف یاد آتی ہے اور وہ سیدھے اپنے شہر واپس جا کر مسجد کے بجائے اپنے مفلس دوست عبدالرزاق کے ہاتھوں میں پنکھا تھما دیتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک غریب اور نادار ضرورت مند دوست کی مدد کرنے سے زیادہ کارِ ثواب اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ حقوق العباد کا اس سے بہتر اظہار کیا ہو سکتا ہے کہ آٹھویں پنکھے کی صحیح جگہ مسجد نہیں بلکہ ایک غریب اور نادار دوست کا گھر ہے۔ بقول افسانہ نگار:

''جس کے گھر کی ہر شئے سے افلاس ٹپکا پڑ رہا ہے، دیوار اور دریچے مفلسی کی غماز ہیں۔''

''پس ماندگان'' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں ایک بھائی اپنے خون کی قیمت سے اپنی ان بیاہی بہنوں کے لئے شادی کا انتظام کرتا ہے۔ دل کو چھو لینے والا یہ افسانہ ایک غریب گھرانے کے نوعمر لڑکے زکریا کے ایثار و قربانی کی داستان ہے جو فسادات کے دوران نافذ کرفیو کے موقع پر جان بوجھ کر پولیس کی گولی کا نشانہ بن جاتا ہے اور حکومت سے اپنی موت پر ایک لاکھ روپئے کی رقم اپنے مجبور و لاچار والدین کو دلواتا ہے۔ اس رقم سے وہ اپنی بیٹیوں کی شادی رچا کر ایک پہاڑ جیسی ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر اطمینان کی سانس لیتا ہے۔ فسادات اور ان کے روح فرسا مناظر کی کامیاب عکاسی افسانہ ''جنازہ'' میں ملتی ہے جو شبیب کے افسانوی مجموعہ ''حق تو یہ ہے کہ۔۔۔'' میں شامل ہے۔ کہانی میں ایک ڈھائی سالہ بچو خادو کرفیو کے دوران طبی امداد نہ ملنے پر دم توڑ دیتا ہے۔ بے بسی کے ان حالات میں اس کی لاش گھر ہی میں پڑی سڑنے لگتی ہے۔ بچے کی لاش کو اس کا باپ اور بھائی رات کی تاریکی میں سینے سے لگائے چھپتے چھپاتے ایک ندی میں پھینک آتے ہیں۔ یہ افسانہ ایک ایسے سلگتے ہوئے سماج کی جیتی جاگتی تصویر ہے جس میں انسان نہیں، بھیڑیئے بستے ہیں۔

اس طرح کہانی ''کپا'' میں کپا کے کردار کی تصویر کشی سے قاری کے رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کپا تمام عمر بستی کے مردوں کو کفنانے دفنانے کی خدمت انجام دیتا ہے اور جب وہ خود مر جاتا ہے تو بستی والے اس کی لاش کو ڑا گاڑی میں ڈال کر بے دردی سے میدان میں پھینک دیتے ہیں۔ شبیب چوں کہ مفلوک الحال طبقہ کے مونس اور ہمدرد ہیں، اس لئے وہ اپنی کہانیوں میں دبے کچلے طبقوں کے کردار کو مرکزی حیثیت دیتے ہیں۔ رکشا والے، پھیری والے، قلی، مزدور، معاشرہ کی بے بس لڑکیاں، لاچار و مجبور

بھکاری، روزگار کی تلاش میں بھٹکتے گریجویٹ نوجوان غرض وہ سارے لوگ جو کسی نہ کسی مصیبت و پریشانی یا مسائل سے دوچار ہیں، شبیب کی کہانیوں میں جگہ پاتے ہیں۔

شبیب کی کہانیوں کے مجموعہ کا ایک افسانہ ''ترجیح'' ہے جو باپ بیٹے کی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بیٹے کو باپ کی جگہ پر ریلوے میں ملازمت مل جاتی ہے۔ بیٹا اپنی ملازمت کے دوران اپنی فرض شناسی کی ایک بہترین مثال پیش کرتا ہے۔ وہ سگنل مین ہے اور ریل گاڑیوں کو الگ الگ لائنوں کے سگنل دینے پر مامور ہے۔ ایک دن اس کا بوڑھا باپ جو کہ قوت سماعت سے پوری طرح محروم ہو چکا ہے، اپنے بیٹے کے لئے کھانا لے کر آ رہا ہے۔ جس پٹری پر وہ آ رہا تھا اسی پٹری پر ایک ٹرین پوری رفتار سے آتی دکھائی دیتی ہے۔ بیٹے کے پاس سوائے ہزاروں مسافروں کی جان بچانے کے کوئی چارہ نہ تھا، اس لئے وہ اپنے باپ کی پرواہ کئے بغیر گاڑی کو رکنے کا سگنل نہیں دیتا اور تیز رفتار گاڑی آن کی آن میں اس کے باپ کے جسم کو چیرتی ہوئی گذر جاتی ہے۔ اپنے موضوع اور مرکزی خیال کے لحاظ سے یہ افسانہ فرض شناسی اور ایثار کی بہترین مثال پیش کرتا ہے۔ اس کہانی کے مناظر نہایت جذباتی ہیں اور اسلوب تحریر اس قدر متاثر کن ہے کہ پڑھنے کے بعد قاری کافی دیر تک اس کے تاثر میں ڈوبا رہتا ہے۔

شبیب احمد کاف کا ایک اور افسانہ ''ایٹی'' سماج کی ایک تلخ حقیقت کا پردہ فاش کرتا ہے۔ بوڑھا ایٹی رکشا چلانے والا کہانی کا مرکزی کردار ہے۔ اس کے کئی لڑکے اور لڑکیاں ہیں۔ لڑکے برسر روزگار ہیں لیکن باپ کی خبر گیری نہیں کرتے۔ اس لئے یہ بوڑھا غریب ایٹی رکشا چلا کر اپنا پیٹ بھرتا ہے۔ وہ اپنی نوعمر لڑکی کو تعلیم دینے کی خواہش میں اسے ایک کرسچین ادارے کے حوالے کر دیتا ہے کہ وہ اسے پڑھا لکھا کر کسی قابل بنائیں۔ کہانی کا المیہ یہ ہے کہ اس کی لڑکی بھی پڑھ کر ایک نوجوان کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ ایٹی کی غیرت مند طبیعت اس صدمے کو سہہ نہیں پاتی اور بالآخر وہ خودکشی کر لیتا ہے۔ اس موقع پر شبیب کی فن کارانہ چابکدستی ملاحظہ کیجئے جس میں نئے ذہنوں کو خودغرضی و بے بسی پر طنز کے نشتر پیوست ہیں:

> ''اتنی روشنی بھی نہیں تھی، دور دور کھمبے تھے۔ آج کل کے رشتہ داروں کی طرح، کوئی مل جل کر رہنا نہیں چاہتا۔ پھر بہانہ یہ ہے کہ فاصلے میں محبت باقی رہتی ہے۔ ڈھکوسلہ، کسی کو حصہ دار بنانا نہیں چاہتے۔ خوشیوں میں ایک ہی ماں، ایک باپ کی اولاد ایک دوسرے سے دور بھاگتی ہے۔'' نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ ہر گھرانے کے افراد اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی

مسجد بنا کر الگ تھلگ رہنا پسند کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی خیر خیریت تو درکنار، نوبت طوطا چشمی تک آ پہنچتی ہے کہ کہیں بھولے بسرے سرراہ رشتہ دار نظر آ بھی گئے تو خودغرضی اور بے حسی مانع آ جاتی ہے اور خون اپنی کشش کھو بیٹھتا ہے۔''

مجموعی طور پر شبیب کی کہانیوں میں ہمارے سماج اور معاشرے کے بیش پا افتادہ موضوعات جیسے خودغرضی، بے حسی، بے رحمی، بھوک، افلاس، جبر واستبداد، رشتوں کی بے وقعتی اور فرد کی تاجرانہ ذہنیت کی بڑی کامیاب عکاسی کی گئی ہے۔ فنی سطح پر کہانی پن اور واقعاتی تسلسل کے ساتھ شبیب کے ہاں جاندار رویہ عمل کردار ملتے ہیں۔ منظّم ومربوط خیالات اور دلنشین جملے شبیب کی کہانیوں کی پہچان ہیں۔ شبیب نے اپنی کہانیوں کے ذریعے اپنے زمانے کی حسیت کو بیان کر کے فرد کو ایک نیا وژن دیا ہے۔ چنانچہ ان حقائق کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شبیب کے افسانوں میں بصارت بھی ہے اور بصیرت بھی۔ گویا سبھی افسانے ان کے زورِ قلم کی گواہی دے رہے ہیں۔

شبیب احمد کاف کی شخصیت، فکر وفن اور ان کے کردار کے حسین پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی بیوی آمنہ تحسین نے بڑی پتہ کی باتیں بتائی ہیں

''انسانی کردار کا سب سے روشن پہلو حسن اخلاق ہے۔ یہی کسی فرد کو سماج میں قابل احترام اور عوام وخواص میں مقبول بناتا ہے۔ میں نے شبیب احمد کاف کو اخلاق کا پیکر پایا۔ بزرگوں کا احترام، چھوٹوں کے لئے شفقت اور برابر والوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا پایا۔ وہ ایک وسیع القلب اور وسیع النظر شخصیت تھے۔ ہر ایک سے بڑی خوش دلی اور اخلاق سے ملتے۔ سب کو اپنا گرویدہ بنا لیتے۔ میں نے انہیں کبھی کسی سے نفرت کرتے نہیں دیکھا۔ اگرچہ کسی سے انہیں دلی تکلیف بھی پہنچی ہو۔ فطرت میں غصہ ضرور تھا لیکن اس پر قابو رکھنا بھی جانتے تھے۔ لوگوں کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی ہو تو وقت گزارتے، ورنہ اکتاہٹ کا شکار ہوتے اور فوراً وہاں سے چل پڑتے۔ جو لوگ بہت زیادہ حساس اور غور وفکر کے عادی ہوتے ہیں، وہ اکثر اس کمزوری کا شکار ہوتے ہیں۔''

ستار فیضؔی کی شاعری میں مذہبی عناصر

ڈاکٹر محمد نثار احمد

اسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو ایس-وی-یونیورسٹی، تروپتی (آندھرا پردیش)

جناب ستار فیضی کا نام شیخ عبدالستار ہے۔ قلمی نام ستار فیضی اور تخلص فیضؔی۔ یکم جون 1965 (انیس سو پینسٹھ عیسوی) کو کڈپہ میں پیدا ہوئے۔ اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کی۔ انھیں اردو سے والہانہ محبت ہے۔ 1989ء (انیس سو نواسی عیسوی) میں اردو کے مدرس بنے۔ اُس وقت سے آج تک انھوں اردو درس و تدریس اور اردو شعر و ادب کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ اِن دنوں ستار فیضی کڈپہ ضلع میں میدکور کے ضلع پریشد اردو ہائی اسکول میں اسکول اسسٹنٹ کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ستار فیضی آندھرا پردیش کے اہم اور ممتاز شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے شاعری میں مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ حمد، نعت، مناجات، منقبت، غزل اور نظم کے علاوہ انھوں نے کہانیاں اور مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان کی کہانیاں اور نظمیں مختلف اخبارات، رسائل و جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔ چند ایک کے نام یہ ہیں: گل بوٹے ممبئی، بچوں کی دنیا دہلی، الحیات رانچی، روشن ستارے حیدرآباد، دعوت دہلی، الہدیٰ نیپال، ندائے صالحات کڈپہ، قومی صحافت لکھنؤ، صدائے بسمل جارکھنڈ، تریاق ممبئی، ماہنامہ اردو دنیا، ماہنامہ تریاق، بدرِ کامل ناندیڑ کے علاوہ سالار ویکلی، روزنامہ سیاست، روزنامہ اعتماد اور روزنامہ رہنمائے دکن میں ان کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔

ستار فیضی کا مجموعۂ کلام ''دھنک'' کے نام سے اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی جزوی مالی تعاون سے 2014ء شائع ہو چکا ہے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ ''مہک'' اور شعری مجموعہ ''کسک'' زیرِ طبع ہے۔ سرورِ کونین کے نام سے ایک شراکتی نعتیہ مجموعہ بھی اردو اکیڈمی کے مالی تعاون سے منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ اس کے علاوہ ''چھتّیس حرکاتی نظمیں''، ''فیضی کے سو 100 شعر''، ''فیضی کی پچاس پہیلیاں''، ''ایکٹیوٹی بُک''، ''لطیفوں کا مجموعہ ''مسکان''، بچوں کی نظمیں ''غنچہ غنچہ''، ''بھارت میرا مہان'' اور گذشتہ دنوں ان کی نعتوں پر مشتمل ایک مجموعہ ''شاہِ اُمم'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ستار فیضی صاحب نے تیلگو میں بھی چند کتابچے شائع کئے ہیں۔ اردو ساہتیہ نُو رتنالو، بھکتی مُکتی، بھارتیہ پرمُکھا مسلم مہیللو، وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔

ستار فیضی کی ادبی شخصیت کی کئی جہتیں ہیں۔ ستار فیضی نے اپنی شاعری میں مذہبی موضوعات کو مختلف جہتوں میں پیش کیا ہے۔ حمد و نعت اور دعا و مناجات کے علاوہ دیگر منظومات میں بھی دینی، اسلامی اور

اخلاقی موضوعات کونظم کیا ہے۔

بچوں کے لیے لکھنے والے بیشتر شاعروں نے اپنے مجموعہ کلام کے شروع میں حمد ضرور لکھا ہے۔حمد کے ذریعے بچوں کو بچپن ہی میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے جلال و جمال کا تصور ذہن کرادیا جائے تو پوری زندگی اس کے مثبت اور خوش گوار اثرات مرتب ہوں گے۔ستار فیضی اپنی حمدیہ نظموں میں بندگی کے جذبات کا وفور اور عبدیت کے احساسات کا شعور نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ برتا ہے۔حمدیہ کلام کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

میری زبان پر ہے اک پاک نام تیرا تو بادشاہِ عالم ، میں ہوں غلام تیرا
کتنی وسیع تر ہے یہ کائنات تیری پیارا نظام تیرا، اعلیٰ ہے ذات تیری
ہر شاخ پھول بولے گلشن میں تیری خوشبو جن و بشر بھی بولے قدرت ہے تیری ہر سو

ستار فیضی نے حمد کے ساتھ ساتھ نعتیہ کلام بھی بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔سیرت کے ایک واقعہ کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نظم کیا ہے۔سیرت کا مشہور واقعہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ شریف سے قریب واقع ایک شہر طائف تشریف لے گئے تا کہ وہاں کے لوگوں کو دین اسلام کی دعوت دے سکیں لیکن وہاں آپ کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نعلین مبارک لہولہان ہوگئے۔اس واقعے کو ستار فیضی نے ''طائف کا واقعہ'' کے نام سے بہترین انداز میں بیان کیا ہے۔اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پہنچے وہاں جو آقا، ماحول بد کو پایا تبلیغ کام ان کا، احمد تھا نام ان کا
ان کی مخالفت کی، ان کو نہ اہمیت دی وہ قوم سنگ دل تھی، گستاخیوں کی کِل تھی
طائف کے لوگ سارے، پتھر دے ان کو مارے تکلیف دے کے ہنستے، کینہ حسد بھی رکھتے

لوگوں نے ظلم ڈھایا، ہر طرح سے ستایا دل دل میں خوب روتے، پھر بھی دعائیں دیتے آقا کی تھی شرافت، چاہا نہیں ہلاکت ہوتی رہی شرارت، تھا صبر و استقامت

اس نظم میں ستار فیضی نے بڑی عمدگی کے ساتھ طائف کے واقعے کو بڑے دلنشیں اسلوب میں پیش کیا ہے۔اس میں سلاست کے ساتھ سوز و گداز کی کیفیت پائی جاتی ہے۔اس کے علاوہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور واقعۂ طائف کی اثر پذیری صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔

یقیناً ستار فیضی کے کلام میں نعتیہ شاعری کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔نعت گوئی کو وہ اپنے لیے سرمایہ نجات تصور کرتے ہیں۔طرحی و غیر طرحی نعتیہ مشاعروں میں پابندی کے ساتھ شرکت کرتے ہیں۔ان کی ایک نعت کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

پاک سیرت ہے نبی کی، خود خدا نے کہہ دیا ہر جگہ مشہور ہے آقا شرافت آپ کی!

ستار فیضی نے بچوں کے لیے قطعات بھی کہے ہیں جن میں مذہبی، اخلاقی اور دینی موضوعات کو پیش کیا گیا ہے۔ان قطعات میں حمد و نعت اور مناجات کے علاوہ اسلامی واقعات اور دینی تعلیمات کے ساتھ ساتھ مذہبی و تہذیبی پہلو بھی شامل ہیں۔ان کے قطعات میں بڑی سادگی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ایک قطعہ ملاحظہ فرمائیں:

درگزر کر ہر خطا بخش دے تو ہر گنہ
نام لیوا ہوں ترا سرخ روئی کر عطا

ستار فیضی نے بچوں کی دلچسپی کا خیال کرتے ہوئے ان کی کردار سازی کے لیے جو پہیلیاں لکھی ہیں، ان میں بھی مذہبیت کا رنگ جھلکتا ہے۔انہوں نے مذہبی عام سوالات کو پہیلیوں کی شکل میں یوں پیش کیا ہے:

حمدیہ پہیلی:

سب سے بڑا ہے اس کا نام حکم سے اس کے صبح و شام
ذکر سے بن جاتے ہیں کام بولو بچو اس کا نام ۔۔۔؟

نعتیہ پہیلی:

سب سے اونچا ان کا مقام ان کی رحمت دہر تمام
نماز اذاں میں صبح و شام بعد اللہ کے ان کا نام ۔۔۔؟

ننھے بچوں کے لیے ایک دعائیہ منی نظم ملاحظہ فرمائیے:

ذات خدا کی اللہ اکبر ذکر نبی کا سب سے بہتر
ذہن ہمارے تیز بنادے ذہن و دل اللہ سجا دے

سرورِ کونین (شراکتی مجموعہ) میں شامل نعتیں جو خاص طور پر بچوں کے لیے کہی گئی ہیں۔ایک نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میرے لب پر ہے نام احمد کا فیض ہے صبح و شام احمد کا

لاکھ شاہوں پہ ایک بھاری ہے ہے جو سچا غلام احمد کا

دین و دنیا سنور گئی اس کی جو رکھے احترام احمد کا
کنکروں کو زبان دیتا ہے پیارا پیارا کلام احمد کا
ہیں وہ سردارِ انبیائے کل کیا بتاؤں مقام احمد کا
جس طرح ہے گلاب میں خوشبو ساتھ رہکے ہے نام احمد کا
کفر و ظلمت کے دور میں فیضی نور پھیلا تمام احمد کا

ستار فیضی کی بچوں کے لیے لکھی گئی تمام مذہبی نظمیں متذکرہ باتوں کی زندہ مثالیں ہیں۔انہوں نے بچوں اور بڑوں کے لیے اتنی کثرت اور خوبی سے نظمیں لکھی ہیں کہ موضوع اور مواد دونوں کا حق ادا ہوگیا ہے۔اس معاملے میں ستار فیضی کی انفرادیت انہیں آندھرا پرادیش ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے ایسے شاعر کے طور پر اپنی شناخت بنانے میں مدد دیتی ہے۔



حفیظ جالندھری کا ''شاہنامہ اسلام''۔ایک مختصر جائزہ

ڈاکٹر اے۔یم۔مسعودہ تسکین

اسسٹنٹ پروفیسر، قائد ملّت کالج، چینئی

شاہنامہ اسلام حفیظ جالندھری کی ایک ایسی تصنیف ہے جو نہ صرف شاعری سے تعلق رکھتی ہے بلکہ وہ اسلام کی منظوم تاریخ بھی ہے۔ یہ شاعر کے جذباتِ مذہبی کی ایک دل کش تصویر ہے جو اشعار سے کھینچی گئی ہے۔شاعر کے سادہ الفاظ اور اثر انگیز تراکیب نے اس تصویر کی تاثیر کو دوبالا کیا ہے۔اردو زبان میں حفیظ جالندھری نے 'شاہنامہ اسلام' کے لئے ایک الگ زمین ہموار کی جس میں انھوں نے اسلامی فتوحات سے لیکر اس کے ہر پہلو کو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔

شاہنامہ اسلام کی پہلی جلد ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔اس میں دو ہزار سے زائد اشعار ہیں۔اس کا بیشتر حصّہ اس عہد زریں سے تعلق رکھتا ہے جب اسلام کے مقدس ہادی محمدؐ کی ذات اپنے جمال جہاں آرا سے دنیا کو منوّر کررہے تھے۔ یہ اسلامی اخلاق کی ایک درسی کتاب کا کام کرتی ہے۔اس کتاب کی وجہ تالیف بتاتے ہوئے 'سبب تصنیف'' میں شاعر نے اپنی آرزو کو سادہ، مگر مؤثر لفظوں میں یوں بیان کیا ہے:

تمنّا ہے کہ اس دنیا میں کوئی کام کرجاؤں اگر کچھ ہوسکے، تو خدمت اسلام کر جاؤں

شاعر نے نظم کے پیرائے میں جو بیش بہا سبق اس دئے ہیں وہ واقعی اسلام کی بڑی خدمت کہلانے کی مستحق ہے۔منظوم 'شاہنامہ' کی بنیاد، دقیقی طوسی سے شروع ہوتی ہے جو عہد سامانی کا ایک غیر معمولی شاعر تھا۔ابھی اس نے کوئی ہزار کے قریب ہی اشعار کہے ہونگے کہ وہ اپنے غلام کے ہاتھوں اپنی بدنیتی کے سبب قتل کردیا گیا۔اس کے چند سال بعد فردوسی نے اس ادھوری ایرانی تاریخ کے مفاخرات کو منظّم کرنا شروع کردیا تھا اور انھوں نے اس کام کو مکمل کرنے کے لئے اپنی تمام زندگی صرف کردی۔تیس سال کی محنت کے بعد انھوں نے اس ادب کو ایک ایسی مثنوی فراہم کی جیسے دنیا ''شاہنامہ فردوسی'' کے نام سے یاد کرتی ہے۔اسی سے متاثر ہوکر حفیظ جالندھری نے بھی اردو میں شاہنامہ لکھی۔

شاہنامہ کی پہلی جلد کا آغاز کرہ ارض پر انسانی زندگی کے ظہور سے شروع ہوتا ہے۔انھوں نے محمدؐ کی ولادت کا ذکر کرنے سے پہلے ان کے آباواجداد حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کا حال لکھا ہے۔

پھر مختصر طور پر یہ بتایا ہے کہ اس وقت دنیا کے مختلف خطوں میں جہالت اور گمراہی پھیلی ہوئی

تھی، سرزمین عرب میں عام لوگوں کے حالات اور معاملات کس قسم کے تھے، ایسے میں نبی پاک محمدؐ کی ولادت پھر آپؐ کی دعوت اسلام اور اس کے نتیجے میں وہ تمام آلام ومصائب جن کا سامنا اس چھوٹی سی جماعت نے کیا اس کا ذکر ہے۔ آپؐ کے دنیا میں تشریف لانے کے متعلق جو اشعار لکھے گئے ہیں انھیں پڑھ کر محبانِ رسول پر حالت وجد طاری ہوگی:

معین وقت آیا ، زورِ باطل گھٹ گیا آخر اندھیرا مٹ گیا، ظلمت کا بادل چھٹ گیا آخر
مبارک ہو کہ دورِ راحت و آرام آپہونچا نجات دائمی کی شکل میں اسلام آپہونچا
مبارک ہو کہ ختم المرسلیں تشریف لے آئے جناب رحمتہ للعالمیں ، تشریف لے آئے

ولادت کے بعد یتیمی، دائی حلیمہ کی گود میں پلنا ، دادا کے زیر سایہ تربیت پانا، جوان ہوکر سچائی اور امانت میں شہرت حاصل کرنا، حضرت بی بی خدیجہؓ سے نکاح اور اس کے بعد وحی نازل ہونے اور پیغمبری ملنے کے تاریخی واقعات کا ذکر اختصار کے ساتھ مگر شاعرانہ انداز میں کیا ہے۔ آپؐ نے جو تکالیف فرض رسالت ادا کرنے میں اٹھائیں، مشکلات کا جو دلیرانہ مقابلہ کیا ان حالات کا ذکر اور آخر میں ہجرت اور غزوات کے تذکرے نہایت موثر پیرائے میں لکھے ہیں۔ مدینہ پہنچے پر مسلمانوں نے اپنے ہادی برحقؐ کے زیر سایہ جو تربیت پائی، اس کا نقشہ نظم ''دارالامان مدینہ'' کے اشعار میں ملاحظہ ہو:

تماشوں ، رنگ رلیوں کی جگہ پائی عبادت نے فسادوں اور جھگڑوں کو مٹایا ذوق محنت نے
مسلماں تھے، کہ تھیں زہد وورع کی زندہ تصویریں نمازیں اور تسبیحیں، اذانیں اور تکبیریں
تجارت یا زراعت ، یا دعائیں یا مناجاتیں مشقّت کے لئے دن تھے، عبادت کیلئے راتیں

شاہنامہ اسلام کی جلد اوّل کا خاتمہ قریش مکّہ کی دھمکی، مدینہ پر جنگ کے آثار، انصار کا جوشِ ایمان ، کفار کا میدانِ بدر میں ڈیرا ڈالنا اور مسلمانوں کی کمزور جماعت جہاد کے راستے پر نکلنا جیسے واقعات پر کیا گیا ہے۔ شاہنامہ اسلام کی پہلی جلد کے شائع ہونے کے چھ برس بعد، دوسری جلد آگست ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی۔ اس جلد میں جنگ بدر کا مکمل واقعہ کم وبیش ہزار اشعار میں پیش کیا ہے۔ یہ جنگ تاریخ اسلام میں بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ یہی جنگ تھی جس نے فیصلہ کر دیا کہ ایمان کے مقابلہ میں اکثریت اور سامان کوئی چیز نہیں۔

جنگ بدر کی شکست کے بعد سے ہی قریش انتقامی تیاریاں شروع کر چکے تھے۔ ابوسفیان کا تجارتی منافع جو پچاس ہزار دینار تھا، اسے انتقامِ بدر کے لئے محفوظ کرلیا تھا۔ دوسرے قبائل عرب میں جوش پھیلانے اور لوگوں کو گرمانے کا سب سے بڑا آلہ شاعری تھا۔ قریش کی درخواست پر دو شاعر عمرو جمحی اور

مسافح جو بہت مشہور تھے مکہ سے نکلے اور تمام قبائل قریش میں اپنی آتش بیانی سے بھڑکانے کی کوشش کی۔ اس کا نقشہ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہو:

گروہ کفر جب سے بھاگ کر مکّہ میں آیا تھا　　اسی دن سے یہ دستورالعمل اس نے بنایا تھا
کہ تیاری کرے ہر فرد جنگ انتقامی کی!　　پذیرائی نہیں ہوگی کسی عذر اور خامی کی
قبائل کو قریشی شاعروں نے جاکے بھڑکایا　　پرستارانِ باطل کو ضیاء حق سے دھڑکایا

جنگ بدر کے حالات کے بعد حضرت فاطمہ الزہرا کی شادی، قریش کی انتقامی تیاریاں، آخر مدینے پر حملہ آور ہونے کے لئے ایک بڑی فوج کی چڑھائی، آنحضرتؐ کا صحابہؓ کو ساتھ لے کر اُحد کی طرف دفاع کے لئے نکلنا، منافقینِ مدینہ کا عین میدان جنگ میں دغا دے جانا یہ سب واقعات جزئیات کے ساتھ دو ہزار سے زائد اشعار میں تفصیل سے دوسری جلد میں بیان کئے گئے ہیں۔

شاہنامہ اسلام کی تیسری جلد مکمل طور پر صرف ایک ہی واقعہ جنگِ اُحد کے بیان پر مشتمل ہے۔ جنگِ اُحد کے حالات، جنگِ بدر کے بالکل برعکس تھے، بدر میں مسلمانوں کو نمایاں فتح اور اُحد میں افسوسناک شکست ہوئی تھی اس کی وجہ اسلامی فوج کے بعض حصّوں کی کمزوری اور بعض کی جانب سے صریح ہدایات کی عدم پیروی تھی۔ شاعر کی یہ خواہش تھی کہ شکست کے جو اسباب تھے وہ بھی بیان ہو جائیں، مگر ان لوگوں کا پاسِ ادب بھی ملحوظ رہے جو اس وقت حکم عدولی کے مرتکب ہوئے کیونکہ رسولؐ نے ان لوگوں کو معاف کر دیا تھا۔ ان میں بعض نے دوسرے مواقع پر بہتر عمل سے اپنی کوتاہی کی تلافی کر دی۔ جنگِ اُحد کے حالات اور جو سبق ان سے حاصل ہوئے انھیں سلیس اردو اور پُر اثر شعروں میں بڑی خوبی کے ساتھ نظم کیا گیا ہے۔ حفیظ جالندھری کی طبع رسائی نے جا بجا رنگینیِ کلام کے بھی جوہر دکھائے ہیں۔ عربی کے اس مشہور گیت کا اردو ترجمہ خاص طور پر قابل ذکر ہے جو ان عرب کی عورتوں نے جنگ اُحد کے موقع پر گایا تھا۔ جو مخالفِ اسلام قریشیوں کو حوصلہ دلانے اور جنگ پر ابھارنے کے لئے آئی تھیں۔ گیت ''نغمہ زنانِ قریش اردو میں'' کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

ہم　بجلیاں　انوار　کی　　ہم　ناریاں　ہیں　نار　کی
ہم　دخترِیں　ہیں　نور　کی　　ہم　مشعلیں　ہیں　طور　کی
ہم　پیاریاں　ہیں پیار　کی　　ہم　ناریاں　ہیں　نار　کی

زمانہ رسالت میں عورتیں جنگوں میں شریک ہوتی تھیں، زخمیوں کی امداد کرتی تھیں اور وقت ضرورت جنگ میں بھی شریک ہو جاتی تھیں۔ ان میں ایک نہایت نیک اور باہمت خاتون ''حضرت اُمِّ عمارہؓ'' بھی

تھیں جو جنگ میں زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں ان کے شوہر اور بیٹے بھی شریکِ جنگ تھے۔ جب انھوں نے رسولؐ کی ذاتِ پاک پر حملہ ہوتا دیکھا تو مشکیزہ ہاتھ سے رکھ کر جنگ کے لئے تیار ہوگئی۔ اس دلآویز واقعہ کو شاہنامہ اسلام میں یوں بیان کیا گیا ہے:

نہتّی تھی مگر کرنے لگی پیکار دشمن سے مروڑا اس کا بازو چھین لی تلوار دشمن سے
اسی شمشیر سے اس نے سر شمشیر زن کاٹا ہوا اس شیرزن کے خوف سے اعداء میں سناٹا
جدھر بڑھتے ہوئے پاتی تھی وہ محبوبؐ باری کو پہنچتی تھی وہیں اُمّ عمارہؓ جاں نثاری کو

تیسری جلد میں دیگر دو جلدوں سے بھی زیادہ حواشی زیر ورق لکھے گئے ہیں اور اکثر روایات کے ساتھ ان کے حوالے بھی درج ہیں۔ اس اہتمام کی وجہ سے شاہنامہ اسلام اچھے اشعار کا مجموعہ ہونے کے ساتھ علمی کتابت کی حیثیت سے بھی ممتاز ہے۔ شاعر نے جابجا کتابوں کے حوالے دیئے ہیں اور احادیث جمع کی ہیں، جس سے ظاہر ہے کہ حفیظ جالندھری نے فقط شاعری نہیں کی بلکہ علمی تحقیقات کی بھی قابلیت دکھائی ہے۔ جو لوگ محض ذوق وسخن کی خاطر اس نظم کا مطالعہ کرے وہ علمی تحقیقات والے حصّوں کو قدرے خشک پائیں گے۔ مگر شاعر نے ان کی دلچسپی کے لئے بھی کافی سامان مہیا کر دیا ہے۔ اس جلد کی تصنیف کے دوران شاعر نے کثرت مطالعہ کے ساتھ سیاحتِ یورپ کے ذریعے سے بھی اپنی معلومات کو بڑھایا ہے۔ جو شاہنامہ اسلام کی تیسری جلد کا طرۂ امتیاز ہے۔

شاہنامہ اسلام کی چوتھی جلد ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی۔ جس میں شاعر کی کوشش رہی کہ ان واقعات کے بیان میں کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے یہ تاثر تفریحی صورت اختیار کر جائے۔ حفیظ جالندھری نے اپنا مقصد چوتھی جلد کے دیباچہ میں واضح کیا ہے کہ:

> ''دلچسپی پیدا کرنے اور مرد وزن کی توجہ کھینچنے کے لئے حسن وعشق رومان وفراق کی کوئی جھلک شاز وکرشمہ کا کوئی نظارہ اس کتاب میں داخل کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا بلکہ خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے کہ پڑھنے یا سننے کا اس طرح ہٹنا خصوصاً ایسی تصانیف کے لئے موزوں نظر نہیں آیا جو قوموں کی احیائے صاقہ کے لئے لکھی جاتی ہیں۔ اور تو اور ایسی روایات تک حتی الوسیع پرہیز کیا گیا ہے جو کافی سند کے بغیر مولود شریف کی عام کتابوں اور بعض کتب سیر میں درج کر دی گئی ہیں۔''

غزوۂ احزاب کے وقت آنحضرتؐ نے سلمان فارسیؓ کی رائے کو پسند کی اور خندق کھودنے کے کام کا آغاز کیا۔ بیس روز کی محنت اور رات دن کی مشقت سے ایک ہزار آدمی نے اس خندق کو کھدوایا تھا اور اس

کھدائی کے ختم ہوتے ہی لشکر کفار نمودار ہو گئے۔ کفار عرب کے متعلقہ لشکروں کی تعداد چوبیس ہزار جنگی آدمیوں پر مشتمل تھی اور مسلمان صرف ایک ہزار تھے اور ان میں بھی زیادہ تر عابد اور زاہد کمزور لوگوں میں سے تھے جو بھوک اور فاقہ سے نڈھال تھے۔ خندق پر کوئی دن حملہ سے خالی نہ جاتا تھا۔ صحابہ کرام دن بھر ان کے حملوں کا جواب دیتے اور وہ راتوں کو پہرے پر رہتے شب خون کا ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ تقریباً ایک مہینے تک یہ محاصرہ قائم رہا۔ مسلمان انتہائی استقلال کے ساتھ لشکر کفار کا مقابلہ کیا۔ جس کا ذکر شاہنامہ اسلام میں یوں کیا ہے:

سرِ خندق مجاہد تھے ہزار افراد کی گنتی یہی غازی مجاہد تھے، یہی زہاد کی گنتی
مگر ان پر ہزاروں در ہزاراں حملہ آور تھے ہزار انسان کیا تھے خواہ کیسے بھی دلاور تھے
ادھر چوبیس دستے اور ہر دستہ ہزار انسان ذخیرے اسلحہ کے اور ناؤنوش کے ساماں

چوتھی جلد غزوۂ احزاب پر ختم ہو جاتی ہے۔ شاید شاعر کا خیال اس سلسلہ کو جاری رکھنا تھا لیکن کئی وجوہ کی بناء پر یہ آگے نہ چل سکا۔ غالباً ایک بڑی وجہ یہ بھی ہو سکتا کہ شاعر کو شاہنامہ لکھنے کے لئے بطور پس منظر اسلامی تاریخ کا جو مطالعہ کیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ان کے مصروفیات بہت بڑھ جانے کی وجہ سے ایک طویل اور مربوط نظم لکھنے کے لئے جو ذہنی فراغت درکار تھی وہ انھیں میسر نہیں ہوئی چنانچہ شاہنامہ اسلام غزوۂ احزاب کے بیان سے آگے نہ جا سکا۔

الغرض شاہنامہ اسلام تقریباً آٹھ ہزار اشعار پر مشتمل اس کی چار جلدیں عرب کی ابتدائی تاریخ سے شروع ہوتی ہے اور غزوۂ احزاب پر ختم ہو جاتی ہے۔ شاعر نے شاہنامہ لکھنے کے لئے اسلامی تاریخ کے دور اوّل کے بارے میں بہت سے مآخذ کا مطالعہ کیا ہے قرآن مجید، احادیث اور سیرت کی کتابوں پر خصوصاً بہت توجہ دی ہے۔ شاہنامہ اسلام کے مختلف اشعار پر جگہ جگہ حواشی میں آیاتِ قرانی، احادیث اور سیرت کی کتابوں کے جو حوالے ہیں اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا تو شاید نبی آخر الزماں محمدؐ کی آخری علالت تک چار جلدیں مزید لکھی جاتیں مگر ایسا نہ ہو سکا۔ یہ ''شاہنامہ اسلام'' اردو کا کافی معروف شاہنامہ ہے۔ یقیناً اس کو ہم ایک اہم منظوم اسلامی تاریخ کی حیثیت سے دیکھ سکتے ہیں اور یہ درسِ اخلاقیات کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔



حافظؔ کرناٹکی کی رباعیوں میں قرآنی آیات کی ترجمانی ایک جائزہ

کے۔ایچ۔کلیم اللہ

صدر،شعبۂ اردو مظہر العلوم کالج

حسنِ اتفاق سمجھئے یا اکیسویں صدی کا امجدؔ سمجھئے۔امجدؔ، حیدرآبادی تھے تو حافظؔ، کرناٹکی ہیں۔جناب امجد حسین حافظؔ کرناٹکی اردو کے ایک کہنہ مشق شاعر، بچوں کے معروف ادیب اور صحافی ہیں۔اردو کے اصناف سخن میں آپ کو رباعی سے زیادہ طبعی مناسبت ہے۔لہٰذا آپ نے کافی رباعیاں کہی ہیں جو مجموعوں کی صورت میں منظرعام پر آچکے ہیں۔

حافظؔ صاحب نے ''ندائے اطفال'' ماہنامہ ۱۵/اگست ۲۰۰۸ء کو جاری کیا۔جس میں حمد، نعت، نظمیں، رباعیات اور مختلف موضوعات پر مضامین شائع ہوتے رہے۔آگے چل کر یہ رسالہ چند شماروں کے بعد بجائے ''ندائے اطفال'' کے ''صدائے اطفال'' کے نام سے موسوم ہوا۔

حافظؔ کرناٹکی نے کرناٹکا اردو اکاڈمی کے چیرمین کا منصب سنبھالنے کے بعد پہلے سے جاری ''ندائے اطفال'' کو ''صدائے اطفال'' کے نام سے جاری کیا تھا۔جب تک حافظ صاحب چیرمین رہے یہ رسالہ بڑے آب وتاب کے ساتھ جاری رہا۔جس کا سرورق دیدہ زیب اور رنگین ہے۔اس رسالہ کے آخر میں جناب حافظؔ کی رباعیاں تسلسل کے ساتھ شائع ہوتی رہیں۔راقم الحروف کو آپ کے رباعیات پڑھنے کا موقع ملا لیکن یہ علم نہ تھا آپ کے رباعیات کا ایک مختصر مجموعہ ''موجِ تسنیم'' کے نام سے ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا ہے۔جس میں ۳۰۰ رباعیاں ہیں۔اس کے بعد ''رباعیاتِ حافظؔ'' حصّہ اوّل ۲۰۱۱ء میں اور ''رباعیاتِ حافظؔ'' حصّہ دوّم ۲۰۱۵ء میں شائع ہوئیں۔حصّہ اوّل ۲۰۷۹ رباعیات اور حصّہ دوّم ۱۷۲۰ رباعیات پر مشتمل ہے۔ان تین اشاعتوں میں کل ۴۰۹۹ رباعیات ہیں اور یہاں پر یہ سلسلہ ختم نہیں ہوتا ہے بلکہ حافظ صاحب خود اس طرح رقم طراز ہیں:

> ''میں نے رباعیاتِ حافظؔ کی ترتیب کے وقت ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ تمام رباعیات ایک جلد میں نہیں سما پائیں گی اس لئے اسے رباعیات حافظ جلد اوّل کا نام دیا اور اب جو رباعیوں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے تو اسے رباعیاتِ حافظ جلد دوم کے نام سے

قارئین کی نذر کرتے ہوئے ایک خاص طرح کی طمانیت کا احساس ہو رہا ہے۔ کیوں کہ جلد دوّم کے علاوہ بھی بہت ساری رباعیاں بچ گئی ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ آئندہ یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا، کہنا مشکل ہے۔'' (رباعیاتِ حافظؔ، حصّہ دوم، اپنی بات۔ صفحہ ۵)

آپ کی رباعیوں کی ایک اور کتاب منظرِ عام پر آنے والی ہے۔ اس طرح آپ کی رباعیاں پانچ ہزار سے تجاوز ہو جائیں گی۔ یہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ آپ رباعی کے ایک قادرالکلام شاعر ہیں۔

حافظؔ صاحب نے ''موجِ تسنیم'' میں وہی انداز اپنایا جو آپ کے نظموں کا اسلوب ہے یعنی بچوں کی رہبری اور اصلاح کی خاطر ان رباعیوں کو انتہائی سادہ، سلیس اور عام فہم زبان میں لکھا گیا ہے۔ ''موجِ تسنیم'' کی رباعیوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رباعیاں بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں، لیکن اس میں بڑوں کے لئے بہت سی کام کی باتیں نکل آتی ہیں۔

''موجِ تسنیم'' کی رباعیوں کا انداز ملاحظہ کیجئے:

جو کہنا تھا وہ لفظوں کی زبانی کہنا — باتیں کبھی کھٹّی، کبھی میٹھی کہنا
دن رات ہے یہ مشغلہ اپنا حافظ — بچوں کے لئے سہل رباعی کہنا

میں علم کا طالب ہوں مرا، یارِ قلم — ہوتا ہے ہر اک لمحہ گہربارِ قلم
جاہل سے ہمیشہ اسے نفرت ہی رہی — ہے علم کے عاشق کا طرف دارِ قلم

بعض لوگ کہتے ہیں کہ رباعی اہلِ عرب کی جدّت ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایران میں ایجاد ہوئی۔ عرب والوں نے اہلِ ایران سے مستعار لی۔ ہمارے خیال سے ایجاد کا سہرا ایران والوں کے سر ہے۔ اردو میں یہ فارسی سے مستعار لی گئی ہے۔

دکن میں رباعیاں تو کہی گئیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ محمد قلی قطب شاہ، وجہیؔ، غواصیؔ، عبداللہ قطب شاہ علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ، نصرتیؔ اور میراں یعقوب، بعد کے شعراء میں اکبرالہ آبادی، حالیؔ، جوشؔ، فراقؔ، امجدؔ حیدرآبادی، اصغرؔ ویلوری، حافظ کرناٹکی وغیرہ کے کلام میں رباعیاں کافی تعداد میں ملتی ہیں۔

شاعر بننے اور پیدا ہونے میں بہت فرق ہے۔ حافظ کرناٹکی کا شمار آخر الذکر میں ہوتا ہے۔ ان کی طبیعت میں روانی اور جولانی پائی جاتی ہے۔ آپ کو رباعی سے بڑا شغف ہے۔ حافظؔ کرناٹکی کو رباعی کہنے پر پوری قدرت حاصل ہے۔ انھوں نے رباعیاں لکھ کر اپنی شاعری کا لوہا منوایا ہے، اس لئے کہ رباعی

ایک مشکل صنفِ سخن ہے۔جس میں بڑے بڑے شعرالڑکھڑا جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ چاہے میرانیسؔ ہوں، چاہے حالیؔ ہوں یا امجدؔ حیدرآبادی ہوں رباعی کہتے ہوئے بڑے محتاط نظر آتے ہیں۔یہ فن بڑی احتیاط اور محنت چاہتا ہے اور اس میں کامیاب نکل آنا ایک اچھے اور کہنہ مشق شاعر ہی سے ممکن ہے۔ بالخصوص جنوبی ہند میں رباعی گوشعراء آٹے میں نمک کے برابر نظر آتے ہیں۔کیوں کہ رباعی کہنا اس لئے مشکل طلب ہے کہ اس کی بحر دیگر اصنافِ شاعری سے قطعی الگ ہے۔مسرت کی بات ہے کہ جناب حافظ کرناٹکی کے بہت ہی کامیاب رباعیاں ہیں تو ان کے ایک کامیاب شاعر ہونے کی دلیل ہے۔وہ اپنے فنِ رباعی کی قدر کرتے ہوئے یوں گویا ہیں:

الفاظ کا آئینہ رباعی میری　　معانی کا ہے گنجینہ رباعی میری
افکار کے دریا کی مچلتی ہوئی موج　　گہرائی کا تخمینہ رباعی میری

حافظ کرناٹکی کی رباعیوں میں بے ساختگی اور برجستگی سے تاثیر پیدا کی گئی ہے۔انھوں نے مذہبی موضوعات پر بہت زیادہ رباعیاں کہی ہیں۔ان کی رباعیوں میں سلاست وروانی اور فصاحت و بلاغت کا عکس ملتا ہے۔انھوں نے رباعی کے لئے رواں اور مترنم اوزان استعمال کئے ہیں۔ان کی ہر رباعی اس کی شاہدِ عدل ہے۔ان میں تہذیبی وثقافتی قدروں کا دل سے احترام ملتا ہے۔حافظؔ صاحب خلوص، محبت اور حق گوئی و بے باکی جیسی اعلیٰ صفات سے متصف ہیں جس کا پرتَو ان کی شاعری میں ہمیں نظر آتا ہے۔حافظ کرناٹکی نے حمدیہ،نعتیہ،متصوفانہ،ناصحانہ غرض مختلف موضوعات پر رباعیات کہی ہیں۔

حافظؔ صاحب کی ایک خصوصیت نغمگی اور موسیقیت ہے۔الفاظ کا انتخاب بھی آپ کی رباعیوں میں جان پیدا کردیتے ہیں۔ہر لفظ اپنے اندر ایک حرکت اور اثر رکھتا ہے۔جس سے قاری نہ صرف لطف اندوز ہوتا ہے بلکہ اس مضمون سے متاثر بھی ہوتا ہے۔چوں کہ رباعی کا اصل مقصد بھی یہی ہے کہ شاعر اپنے قاری کو ایک دعوتِ فکر اور پیغام دینا چاہتا ہے۔اسی لئے رباعی بہ نسبت اور اصنافِ شاعری کے عام فہم، سلیس اور سادہ ہوا کرتی ہے۔اس اصول پر حافظ صاحب کی رباعیاں پوری اترتی ہیں۔

حافظؔ کی شاعری کی ایک اور خوبی ان کا پیامی انداز ہے۔آپ پرخلوص انسان اور باوقار شخصیت کے مالک ہیں۔آپ کی طبیعت میں عاجزی، انکساری، محبت اور رواداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔اور آپ حافظِ قرآن ہونے کا شرف بھی رکھتے ہیں۔اصل میں جذبۂ خدمتِ خلق سے معمور ایک سیماب صفت انسان ہیں، یہی مزاج ومذاق ان کی شاعری میں اجاگر ہے۔جو کچھ کہتے ہیں وہ مستند اور معتبر ہے۔

آپ کی شاعری تفریح طبع کا ذریعہ نہیں بلکہ زندگی کی حقیقتوں کی عکاس وترجمان ہے۔یہی وجہ ہے

کہ آپ کے کلام میں اچھے اخلاق اور شریف النفسی کے مضامین بکثرت ملتے ہیں۔ آپ نے اخلاقی قدروں اور ایمانی قوتوں سے اپنی شاعری کو مزین کیا ہے۔

قرآنِ کریم ایک ایسی جامع اور مکمل کتاب ہے جس کے بعد انسان کو کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن انسانی زندگی کے تمام روحانی، سیاسی، سماجی، ثقافتی اور معاشی پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے اس میں وہ سب کچھ ہے جو انسان کو اَبد تک ہدایت، قوت اور بصیرت سے بہرہ اندوز کرتا رہے گا۔ قرآن صرف ایک زمانے اور اس زمانے کی ایک مخصوص انسانی جماعت کے لئے نہیں بلکہ پورے عالمِ انسانیت کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا اور قرآن ایسی بھرپور کتاب ہے کہ ہر عہد میں انسان کی رہنمائی کرتا رہے گا۔ انہیں نورانی اور روحانی باتوں کو حافظؔ نے اپنی رباعیوں میں قلم بند کیا ہے۔ وہ خود یوں فرماتے ہیں:

> ''میرے مطالعے کا بنیادی حوالہ بھی اسلامی ادب رہا ہے۔ اس لئے عام طور پر میری سوچ اور میری فکر پر ان کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ دراصل میرا ماننا ہے کہ اسلامی علوم وافکار میں اتنی تابنا کی اور بصیرت و بصارت کو منور کرنے کی ایسی نورانیت پائی جاتی ہے جو دنیا کے کسی بھی علمی سرمائے کو نئی بلندی فراہم کرسکتا ہے۔'' (رباعیاتِ حافظؔ، حصّہ اوّل، اپنی بات۔ صفحہ ۴)

اس روشنی میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

قرآن کی آیت: **اِنَّ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیءٍ قَدِیْر**

جو ہونا ہے ہوگا وہ ہُوا کرتا ہے — پیدا سبھی اسباب خدا کرتا ہے
قادر ہے وہ ہر شئے پہ ہے قدرت اس کی — کیا بندۂ مجبور بھلا کرتا ہے

قرآنی آیت: **اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب.**

ہونٹوں پہ ترا نام سجالیتا ہوں — روتا ہوں، تڑپتا ہوں، مزالیتا ہوں
اللہ ترا ذکر لبھاتا ہے مجھے — ہنستا ہوں کبھی اشک بہالیتا ہوں

قرآنی آیت: **وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ**

اللہ کا جس پر بھی کرم ہوتا ہے — وہ صاحب فن اہل قلم ہوتا ہے
آتے ہیں اُسے فکر و تصور کے سلام — **گھر بیٹھے عطا اُس کو بھرم ہوتا ہے**

قرآنی آیت: **لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَتِ اللّٰه**

تم اہل وفا ہوتو وفا کرتے رہو　　**رحمت پہ کرو تکیہ دعا کرتے رہو**
ہرحال میں ہر رنگ میں ہر صورت میں　　تم خالق و مالک کی ثنا کرتے رہو

قرآنی آیت: **وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِہ اللّٰہِ تَبْدِیْلاً**

تبدیل نہ ہوپائے گا قانونِ خدا　　بدنظمی پہ چھا جائے گا قانونِ خدا
قرآن کا ہر لفظ اٹل ہے حافظؔ　　خودمیں نہ لچک لائے گا قانونِ خدا

جناب حافظؔ نے حضور پاک ﷺ سے والہانہ عقیدت ومحبت کا اظہار اپنی رباعیوں میں کیا ہے جو دین کی اساس اوراصل ہے۔ یوں گویا ہیں:

ہم لوگ بصیرت سے ہوئے مالامال　　توحید کی دولت سے ہوئے مالامال
اللہ کے محبوب کے صدقے حافظؔ　　اعزاز شفاعت سے ہوئے مالامال

اس بات کی تصدیق ڈاکٹر محمد داؤد محسنؔ کے پیش لفظ سے بھی ہوتی ہے: اقتباس ملاحظہ ہو

''وہ (حافظؔ کرناٹکی) صرف نام کے حافظؔ نہیں بلکہ عالمِ دین اور حافظِ قرآن بھی ہیں۔ اس اعتبار سے ان کے یہاں قرآن وحدیث کی تعلیمات کا درآنا لازمی امر ہے۔'' (حافظؔ کرناٹکی اور حمدیہ رباعیات۔ پیش لفظ)

غرض حافظ کرناٹکی نے اپنی رباعیات کو نہ صرف تفریحِ طبع کا ذریعہ بنایا بلکہ اس کو قرآن کی تفہیم اور احادیث کی اشاعت کا وسیلہ بھی بنایا۔ ان کا لہجہ پراعتماد ہے، تلقین بھی کرتے نظر آتے ہیں، ان کے اظہار میں عجیب کیفیت ہے۔ لہذا ان کی رباعیاں شاندار بھی ہیں اور جاندار بھی، خوب سیرت بھی اور خوب صورت بھی۔

❁❁❁

اردو نعت کے فروغ میں غیر مسلم دھلوی شعرا کی خدمات

ڈاکٹر فضل الرحمٰن
جامعہ ہمدرد (ہمدرد یونیورسٹی)، نئی دہلی

مشترکہ تہذیب ہندوستان کی ایک امتیازی شان اس کی گنگ وجمن تہذیب ہے جس کی نشو ونما میں صوفیاء کرام، علماء عظام اور مختلف مذاہب کے سادھوؤں، سنتوں، دھرم گروؤں اور دانشوروں کا اہم کردار رہا ہے۔ اپنے خیالات اور تعلیمات کی تبلیغ واشاعت کے لیے نہ صرف انھوں نے رواداری، امن وآشتی کا طریقہ اختیار کیا بلکہ عوام کے قلوب اور اذہان تک پہنچنے کے لیے انھیں کی زبان استعمال کی۔ کیونکہ عوام کو متاثر کرنے اور ان کو قریب کرنے کے لیے ان ہی کی زبان میں گفتگو کرنی ضروری ہے۔ اس کے بعد ہی ایک دوسرے کے خیالات ونظریات میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اس لیے تبلیغ وتعلیم کے لیے انھوں نے جہاں دیگر اصول وطریقے اپنائے وہاں اس علاقہ کی رائج زبانوں پر دسترس حاصل کی تاکہ بحسن وخوبی اپنا پیغام عوام تک پہنچا سکیں۔ چنانچہ فروغ اردو اور ارتقاء اردو کی تاریخ شاہد ہے کہ شروع سے ہی مسلم اور غیر مسلم دانشوران قوم کا تعلق اردو ادب سے رہا۔ یہاں تک کہ بھکتی اور ریت کال میں بھی مسلم صوفی اور غیر مسلم سادھو سنت شعرا اور دیگر اہل علم و دانش نے اردو ادب کے حوالہ سے مثالی کردار ادا کیا۔

جن غیر مسلم شعرا وادبا نے اپنی منثور یا منظوم تخلیقات سے اردو ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے ان کی ایک بڑی تعداد ہے۔ ہر ایک کا مفصل یا بطور اختصار تذکرہ کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے بلکہ ایک تحقیقی مقالہ کا متقاضی ہے۔ چند شعرا وادبا کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

☆ پنڈت امرناتھ، آشفتہ دہلوی ☆ پروفیسر جگن ناتھ آزاد ☆ کشن لال، خنداں دہلوی
☆ منشی گنیشی لال، خستہ دہلوی ☆ پیارے لال، رونق دہلوی ☆ پنڈت تربھون ناتھ زتشی، زار دہلوی
☆ پنڈت امرناتھ مدن، ساحر ☆ پنڈت جواہر ناتھ کول، ساقی دہلوی ☆ لالہ مُرلی دھر، شاد دہلوی
☆ چنڈ پرشاد نگم، شیدا دہلوی ☆ شیش چندر، طالب دہلوی ☆ منشی عزت سنگھ، عیش دہلوی
☆ پنڈت جگموہن ناتھ ہکو، فدا ☆ پنڈت برج موہن دتاتریہ، کیفی دہلوی ☆ چندر بھان، کیفی دہلوی

☆ آنند موہن زتشی گلزار دہلوی ☆ دِگمبر پرشاد، گوہر دہلوی ☆ لالہ چھنومل، نافذ دہلوی
☆ جوئیس، نجیف دہلوی ☆ لالہ فتح چند، نسیم دہلوی ☆ گلگ دھرم پال گپتا، وفا دہلوی

طوالت کے خوف کے پیش نظر مشتے نمونہ از خروارے آئندہ سطور میں ہم چند دہلوی غیر مسلم شعرا و ادبا کا اجمالی خاکہ پیش کر رہے ہیں:

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

اسمِ گرامی جگن ناتھ اور تخلص آزاد ہے۔ والد محترم کا نام تلوک چند محروم ہے۔ جو پاکستانی پنجاب میں دریائے سندھ کے پار، عیسیٰ خیل میں ہیڈ ماسٹر تھے، آپ کو ''کل ہند انجمن ترقی اردو'' کا صدر بنایا گیا۔ آپ کی متعدد تصانیف ہیں جو اردو نثر و نظم میں گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آزاد کی نعتیہ کاوشوں میں ان کا سلام جس کا عنوان ''فخرِ دوراں'' ہے کافی مشہور ہے۔ جس کے چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

سلام اس ذاتِ اقدس پر، سلام اس فخرِ دوراں پر ہزارو جس کے احسانات ہیں دنیائے امکاں پر
سلام اس پر جو حامی بن کے آیا غم نصیبوں کا رہا جو بیکسوں کا آسرا، مشفق غریبوں کا
سلام اس پر جو آیا رحمۃ للعالمین بن کر پیام دوست لے کر، صادق الوعد و امیں بن کر

آنند موہن زتشی، گلزار دہلوی

اردو ادب کے فعال رکن اور قومی ہم آہنگی کے ممتاز ترجمان گلزار دہلوی ۷/ جولائی ۱۹۲۶ء کو گلی کشمیریان، بازار سیتارام، دہلی کے ایک معزز اور ذی علم خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد جناب پروفیسر تربھون ناتھ زتشی زآر، دہلی کے مشہور شاعر، اور والدہ محترمہ برج رانی بیزار دہلوی مشہور شاعرہ تھیں۔ گلزار صاحب کیفی دہلوی اور سائل دہلوی کے شاگرد رشید ہیں۔ آپ نے حمد، نعت، غزل، رباعی، نظم، قطعہ اور منقبت سبھی اصنافِ سخن میں کلام کہا ہے۔ مثلاً ان کے یہ اشعار دیکھیں:

گلزار آبروئے زباں اب ہمیں سے ہے دلّی میں اپنے بعد یہ لطفِ سخن کہاں
رکے رکے سے قدم رک کے بار بار چلے قرار دے کے ترے در سے بے قرار چلے
چند امیدیں نچوڑی تھیں تو آہیں ٹپکیں دل کو پگھلائیں تو ہوسکتا ہے سانسیں نکلیں

دِگمبر پرشاد گوہر دہلوی

اردو نعت کے فروغ و ارتقا سے متعلق دہلی کے غیر مسلم شعرا میں گوہر دہلوی کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔

آپ پیشے کے لحاظ سے جوہری تھے، اور دریبہ میں بڑی دوکان تھی لیکن شعروادب سے بھی حد درجہ شغف رکھتے تھے۔ گوہر صاحب کی نعتیہ شاعری کس معیار کی ہے اس کا اندازہ ان کے ان اشعار سے بحسن وخوبی لگایا جاسکتا ہے:

کھُل گئے چرخ پہ اسرارِ خدا آج کی رات پڑ گئی عرش پہ بنیادِ وفا آج کی رات
کس کے پرتو سے منور ہے بساطِ عالم عرش پہ کون ہوا جلوہ نما آج کی رات
نورِ عرفاں سے مرا دل بھی ہے روشن گوہرؔ ظلمتِ کفر میں پھیلی ہے ضیا آج کی رات

(نوراحمد میرٹھی، بہرِ زماں بہرِ زباں ﷺ، ادارہ فکرِنو، کراچی، ۱۹۹۶ء ص ۵۲۱)

پنڈت برج موہن دتاتریہ، کیفی دہلوی

دہلی کے ایک مشہور کشمیری پنڈت خاندان میں ۱۲؍دسمبر ۱۸۶۶ء آپ کی پیدائش ہوئی۔ کیفی صاحب کی نظم ونثر میں ڈیڑھ درجن سے زائد کتابیں ہیں جس میں کیفیہ، منشورات، چراغِ ہدایت، بھارت درپن اور واردات بہت مشہور ہوئیں۔ توزک قیصری، مراری دادا، پریم ترنگی، تمثیلی مشاعرہ، راج دُلاری، نہتا رانا، دریائے لطافت، جگ بیتی، ہماری زبان، خمسۂ کیفی، دساتیر اردو، چند نظمیں (مختصر انتخاب کلام) ۱۹۵۴ء میں علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ جناب نرائن داس ضمیر نے آپ کے ذوق شعری کی رہنمائی کی اور خواجہ الطاف حسین حالی جیسے معروف ومستند اردو ادیب سے بھی غزلوں پر اصلاح لی۔ ۱۸۸۴ء میں روایتی غزل گوئی سے جدا ہوکر حالی اور آزاد کی تحریک کے زیر اثر شاعری کی طرف مائل ہوئے اور کئی اصناف سخن پر طبع آزمائی کی۔ کیفی صاحب کے مندرجہ ذیل نعتیہ اشعار ان کی بالغ نظری اور فکری بلندی کی بخوبی ترجمانی کرتے ہیں:

ہو شوق نہ کیوں نعتِ رسول دوسرا کا مضمون ہو عیاں دل میں جو لولاک لما کا
تھی بعثتِ محمود خدا کو منظور تھا پھل وہ بشارت کا نتیجہ نہ دعا کا
ہے حامیٔ و ممدوح مرا شافعِ عالم کیفی مجھے اب خوف ہے کیا روزِ جزا کا

(بیسویں صدی کے شعراء دہلی، جلد اول، ماہنامہ شاعر، بمبئی، اگست ۱۹۸۹ء مدیر افتخار امام صدیقی)



اردو کے غیر مسلم نعت گو شعرا : ایک جائزہ

طارق پارے

نعت ایک اہم صنفِ سخن ہے جس کی عظمت و حرمت مسلم ہے۔اس میں حبِ نبی اور آپ ﷺ سے عقیدت کا اظہار والہانہ انداز میں کیا جاتا ہے۔شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو جس نے اپنے کلام میں نعت کو گل سر بدنہ بنایا ہو۔حضور اکرم صلی اللہ وسلم کی سیرت کے بیشمار گوشوں کو شعرا نے بیان کر کے گلہائے عقیدت کا نذرانہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

نعت عربی زبان کا لفظ ہے۔احادیث میں بھی دو تین جگہ یہ لفظ آیا ہے اور ہر جگہ خوبیوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔عربی جیسی وسیع اور وقیع زبان میں تعریف و توصیف کے لیے اور بھی بہت سے الفاظ ہیں مثلاً حمد،ثناء،مدح وغیرہ۔ابتدا میں ان الفاظ کے محل استعمال میں کوئی خاص پابندی نہ تھی لیکن رفتہ رفتہ اہل قلم حضرات نے الفاظ کا استعمال مخصوص کر لیا اور لفظ ''حمد'' اللہ تعالی کی تعریف کے لئے اور ''نعت'' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ثناوصفات کے لئے استعمال ہونے لگا۔اس طرح عربی فارسی اور اردو زبان میں نعت سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف ہی مراد لی جاتی ہے۔

نعت گوئی کی ابتدا عرب سے ہوئی۔حضور ﷺ کے زمانے میں اکثر صحابہ کرام جو شعری ذوق رکھتے تھے آپ کو اشعار کے ذریعے سے خراجِ عقیدت پیش کرتے۔عرب سے یہ صنفِ سخن عجم آئی اور یہاں اس کو بڑی پذیرائی ملی۔ چناچہ فارسی کے مشہور شعرا فردوسیؔ،سعدیؔ،حافظؔ اور نظامیؔ وغیرہ نے نہ صرف اس میں طبع آزمائی کی بلکہ اسے بام عروج پر پہنچایا۔دیگر اصناف ادب کی طرح اردو کی نعتیہ شاعری کا آغاز بھی جنوبی ہندوستان کی سرزمین سے ہوتا ہے جو صوفیائے کرام کی مرہون منت ہے۔اردو کے پہلے صاحب شاعر قلی قطب شاہ کی کلیات میں بھی نعتِ رسول موجود ہے۔چونکہ اردو شاعری بھی فارسی کے تتبع میں کی گئی ہے۔اس لئے وہ تمام صفات جو فارسی شاعری میں موجود ہیں اردو شاعری میں بھی در آئیں اور اردو شعرا نے فارسی شعرا کی طرح اس میں خوب جوہر دکھائے اور حضورؐ سے اپنی عقیدت کا اظہار بڑے والہانہ انداز میں کیا۔بیسویں صدی اردو شاعری کی تاریخ کا سنہری دور تھا۔نعت گوئی پر بھی اثر پڑا اور ایسے غیر مسلم شعرا کی بھی ایک بڑی تعداد سامنے آئی جنھوں نے مدح رحمتہ العالمین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ایسے شعرا میں دلورام کوسریؔ،شیو پرشاد منورؔ،منی لال جواںؔ،سادھورام آرزوؔ،رگھوندر راؤ جذبؔ،گھنشیام لال عاصیؔ،جگن ناتھ کمالؔ،وشنو کمار شوقؔ،شنکر لال ساقیؔ،روشن لال نعیمؔ،ہربگھوان شادؔ،بنارسی لال شیداؔ،درگا سہائے سرور

جہاں آبادیؔ، اور یوگندر پال صابرؔ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مشہور تذکرہ نگار ''چمنستان شعرا'' کے مصنف جناب لچھمی نرائن شفیقؔ اردو شعرا کی نعت گوئی میں پہلا نام ہے جن کا کلام تقریباً ساڑھے تین سو سال قبل ملتا ہے جس نے ۱۰۶ اشعار پر مشتمل معراج نامہ بمشکل مثنوی کہا۔ شفیقؔ کا نمونہ کلام ؎

عجائب رات تھی وہ نور افشاں کہ ہر کوکب تھا اک مہر درخشاں
سفیر نیک یہ پیغام لایا سلام حق کہا اور سنایا
چل اٹھ اے شہ کہ ہے معراج تیرا غنی بھی آج ہے محتاج تیرا

یہاں اردو کے معروف ہندو شاعر دلورام کوثریؔ کی نعت گوئی کا تذکرہ مقصود ہے۔ دلورام کی شاعری کے شعری محاسن، پختہ کلامی، جذبوں کی صداقت اور خیالات کے تنوع کا اظہار جا بجا موجود ہے اور جناب فخر انسانیت سے بے پناہ محبت نے کوثری کو نعت گوئی پر مجبور کیا۔ نوت گوئی ان کا محبوب مشغلہ تھا اور وہ ہمہ وقت اسی میں محو رہتے۔ نعت گوئی کے میدان میں کوثریؔ نے ایک نیا نعتیہ دیوان جو غیر منقوطہ تھا مرتب کیا۔ اس میدان میں وہ اپنا مقام جتاتے ہوئے کہتا ہے ؎

نبی کے ہوئے نعت گو دو برابر کہ دونوں کو ایک مدح خوانی میں رکھا
ہے حسان پہلا تو میں دوسرا ہوں نہیں فرق اوّل میں ثانی میں رکھا
خدا نے اسے سونپی محفلِ عرب کی مجھے بزم ہندوستانی میں رکھا

مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ ہندو نعت گو شعرا میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ شادؔ کی پیدائش ۱۸۶۴ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔ شادؔ کو شاعری کا فطری ذوق تھا۔ ۱۳۲۶ھ میں ان کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ''ہدیہ شادؔ'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں ۱۰۲ نعتیہ غزلیں، ایک قصیدہ، سات مخمس، اور پانچ سلام ہیں۔ شادؔ نے اپنے نعتیہ اشعار میں حضورؐ سے جس خلوص اور وابستگی کا اظہار کیا ہے وہ نعت کے ایک ایک شعر سے عیاں ہے۔

جوش ملسیانی اردو کے استاد شاعر ہیں انھوں نے بھی بہترین نعتیں کہی ہیں۔ عرش ملسیانی جن کی نعتوں کا دلکش مجموعہ ''آہنگ حجاز'' کے نام سے قدر دانوں سے داد تحسین وصول کر رہا ہے۔ لکھنو کے نمائندہ شاعر کرشن بہاری نورؔ کا بھی اسی سلسلہ کا ایک مجموعہ ''نور تجلی'' کے نام سے شائع ہوا۔ وہ اپنے عہد کے شعرائے نعت میں ایک امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے ؎

آتے ہیں نبی جاتے ہیں نبیؐ بستر پر شکن پڑتی ہی نہیں کٹ جاتی ہے جب معراج کی شب، عالم میں سویرا ہوتا ہے
وہ نور خدا کا ٹکڑا تھا، کس طرح بھلا ہوتا سایہ مٹی سے بنایا جاتا ہے، جس جسم میں سایہ ہوتا ہے

ہرعیب سے دل گر پاک نہیں، دیدار نبی ناممکن ہے ہوجاتا ہے جب دل آئینہ، آئینہ میں جلوہ ہوتا ہے

کنور مہندر سنگھ کا نام بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ان کی نعتیں فنی اور صوتی اعتبار سے ایک بہت بلند و بالا مقام رکھتی ہیں۔ یہاں پر ان کی فکر کی طہارت، خود اپنے جذبے کے خلوص، اعتماد، اپنائیت تخیل میں تغزل اور غنائیت سے بھرپور لب ولہجہ ان کی پہچان ہے ۔

عشق ہو جائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں صرف مسلم کا محمدؐ اجارہ تو نہیں

اردو کے غیر مسلم شعرا میں ایک اور اہم نام پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا ہے۔آپ اردو ادب میں وشن ستارے کی مانند ہیں جس کی تابانی نے اردو زبان وادب کو آفاقی تناظر عطا کرنے میں قابل قدر کردار ادا کیا ہے۔ایک شاعر اور نقاد کے طور پر ہی نہیں، ماہر اقبالیات کی حیثیت سے بھی آپ عالمی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔مشرق سے مغرب، یہاں تک کہ امریکا تک پھیلی ہوئی اردو دنیا کے متعدد علمی وادبی وتعلیمی مراکز ایسے ہیں جنھوں نے آپ کی شخصیت کی متنوع حیثیتوں کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ان کی نعتیں شامِ جان کو معطر کر دیتی ہیں اور حضرت محمد ﷺ سے انکی والہانہ محبت کا پتہ دیتی ہیں۔مگر میں اختصار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کے ایک شعر پر اکتفا کر رہا ہوں ۔

سلام اس ذات اقدس پر، سلام اس فخر دوراں پر ہزاروں جس کے احسانات ہیں دنیائے امکاں پر

سلام اس پر کہ آیا رحمتہ اللعالمیں بن کر پیام دوست لے کر صادق الود و امیں بن کر

ان کے علاوہ لکھنو اسکول کے ایک اور شاعر کا بھی ذکر کرنا مناسب ہوگا جو رسولؐ اور آل مدح میں سرشار ہیں وہ حضرت شہید لکھنوی مرحوم کے شاگرد ہیں۔ان کا نام ہنومان پرشاد اور تخلص عاجز ہے۔انہو ں نے بھی بہترین نعتیں کہی ہیں۔بڑی ناسپاسی ہوگی اگر ہم رانی روپ کماری کنور کا ذکر نہ کریں اگرچہ موصوفہ کے لئے زمانہ سازگار نہیں تھا، پھر بھی انھوں نے رسول ﷺ وآلِ رسول ﷺ کی مدح وثنا میں کوئی کمی نہیں فرمائی۔انھوں نے نعت ومنقبت، سلام ومرثیہ بھی میں طبع آزمائی کی۔چند شعر ملاحظہ ہوں:

نعت کا چرچا ہو کیوں نہ ثنا خوانوں میں ان کے باعث ہے بہار آئی گلستانوں میں

ایسا ہوگا نہ ہوا ہے کوئی انسانوں میں کلمہ پڑھتے ہیں سب جن کا صنم خانوں میں

بیسویں صدی میں نعت گو شعرا میں جو گراں قدر اضافہ ہوا ہے ان میں ایک اہم نام گوپی ناتھ امن کا ہے۔انہوں نے کہا:

ثنا خوانِ پیمبرؐ ذاکر ِ آلِ پیمبر ہے خدا ہی جانتا ہے بندہ مومن ہی کہ کافر ہے

اکثر غیر مسلم شعرا نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کسی ایک فرقے اور مذہب تک

محدود نہیں۔ مثلاً چندر پرکاش جوہر کہتے ہیں ؎

تخصیص کوئی مذہب و ملت کی نہیں ہے اس رحمتِ عالم کی دعی سب کے لئے ہے

پنڈت جاوید وششٹ نعت، قصیدہ اور منقبت کے ایک اہم شاعر گزرے ہیں۔ دیکھئے وہ عرفانِ رسولؐ کی کس منزل پر نظر آتے ہیں ؎

اک برہمن ہند تجھے پیار کرے ہے شوٹی سے ہمالہ نمسکار کر رہے ہیں
کاش میں بھی کعبے کی زیارت اسے حاصل تیری ہی محبت چمتکار کرے ہے
تو صاحب یٰسین ہے صاحب طٰہٰ قران ہے شاہد کہ خدا پیار کرے ہے

۲۰۰۰ء کے بعد ایک نمائندہ سکھ شاعر کرنیل سنگھ پنچھی کی نعتوں کا ایک الگ مجموعہ شائع ہوا ان کی عقیدت ایک نعت کے صرف اشعار سے ہوسکتا ہے ؎

عقیدت کہہ رہی ہے آج اس کی چوم لوں آنکھیں کہ جس نے گنبد خضرا پہ چھائی چاندنی دیکھی
نہ ہو مایوس پنچھی اک زیارت یوں بھی ہوتی ہے اسی کو دیکھ لے جس نے مدینے کی گلی دیکھی

اردو نعت گوئی کے میدان میں ان شعرا کے علاوہ جن شعرا حضرات نے طبع آزمائی کی ہے، ان میں رام نرائن جگر، پریم چند گپتا پریم، رگھوناتھ سہائے امید، درشن سنگھ دگل، کالی داس گپتا رضا، اجیت سنگھ حسرت، مہادیو پرشاد سوامی، رام ناتھ رمن، چرن داس شیو، سندر لال شگفتہ، مدن کمار فراق، ہری چند اختر، رام پرتاپ اکمل، گنیشی لال خستہ، این۔ آر سکسینہ گلشن، ہیرانند سوز، کرشن موہن کمار پاشی، بنارسی داس شیدا، للتا پرشاد سیوک، گوندے سہائے نفیس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

دراصل ہر انسان کا رجحان نیکی اور نیکوکاری کی طرف ہوتا ہے۔ ایسے لوگ مذہب میں ہوں وہ کچھ بھی کہلائیں ان کا مذہب، مذہبِ انسانیت ہی ہوتا ہے۔ چناچہ موجودہ اور گزرے ہوئے نعت گو غیر مسلم شعرا نے اس بارے میں جس فراخ دلی کا ثبوت فرہم کیا وہ ہندوستان کی ملی، سماجی اور قومی تاریخ میں ایک روشن باب ہے۔



اردو زبان کی ترویج میں جماعت اسلامی کا مذہبی لٹریچر
(جموں وکشمیر کے حوالے سے)

اشتیاق احمد
ریسرچ اسکالر

جماعت اسلامی ایک مذہبی، سماجی اور سیاسی تنظیم ہے۔جس کی بنیاد سید ابوالاعلی مودودی جو ایک مشہور ومعروف عالم دین اور مفکر اسلام تھے، نے ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو رکھی تھی (۱)۔ابتدا میں اس جماعت میں صرف ۷۵ ارکان شامل ہوئے تھے لیکن بعد ازاں یہ جماعت ایک سیل رواں کی مانند ابھری اور پورے برصغیر میں پھیل گئی۔۱۹۴۶ء میں جموں وکشمیر میں بھی جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی گئی۔ابتدا میں مذکورہ جماعت جماعت اسلامی ہند کے ساتھ ہی کام کرتی تھی لیکن بعد میں بعض وجوہات کی بنا پہ اس سے الگ ہوگئی۔اسی طرح سیتقسیم ہند کے بعد جماعت اسلامی ہنداور جماعت اسلامی پاکستان بھی الگ ہوجاتی ہیں۔

موسس جماعتِ اسلامی مولانا سید ابوالاعلی مودودی ایک ذہین وفطین انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مشہور ومعروف عالم دین بھی تھے۔انہوں نے مختلف اداروں سے دینی وروایتی علوم حاصل کئے۔ان کی مادری اور پیشہ ورانہ زبان اردو تھی۔چونکہ اس زمانے میں ہندوستان میں بھی اکثریت اردو زبان بولتی اور سمجھتی تھی یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اسی زبان کو ذریعۂ تبلیغ بنایا۔انہوں نے اپنی تقریروں کے ساتھ ساتھ اپنی تحریروں میں بھی اس زبان کا استعمال کر کے نہ صرف اسلامی تعلیمات کو فروغ دیا بلکہ اردو زبان کی ترقی ترویج میں بھی بہت اہم کردار ادا کیا۔موصوف تحریر میں خداداد صلاحیت کے حامل تھے اور اسی زور بیان کی وجہ سے وہ مقبول بھی ہوئے۔اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرنے کی غرض سے ہی انہوں نے شعبہ صحافت میں کام کیا۔اس سلسلے میں وہ متعدد اخبارات میں بحیثیت مدیر بھی کام کرتے رہے۔جن میں اخبار ''مدینہ'' (بجنور) ''تاج'' (جبل پور) جمعیت علمائے ہند کا روزنامہ ''الجمعیت'' وغیرہ قابل ذکر ہیں (۲)۔اس کے بعد مولانا موصوف نے حیدرآباد دکن سے ۱۹۳۲ء میں رسالہ ''ترجمان القرآن'' جاری کیا۔اس کے ساتھ ساتھ وہ تصنیف وتالیف کا کام بھی کرتے رہے۔ان کی پہلی تصنیف ۲۴ سال کی عمر میں ''الجہاد فی الاسلام'' کے نام سے منظر عام پر آئی۔بعد ازاں اس سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے ایک سو کے آس پاس کتابیں تصنیف وتالیف کیں۔یہی وجہ ہے اردو زبان کی ترویج کے سلسلے میں ان کا نام لینا ناگزیر ہوجاتا ہے۔ان کی تصنیفات وتالیفات میں تفہیم القرآن، الجہاد فی

الاسلام ،خطبات،خلافت وملوکیت،سنت کی آئینی حیثیت، دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ،دکن کی سیاسی تاریخ ،حقوق الزوجین،اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی،اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر،انقلاب ہنداور مسلمان ،تحریک اور کارکن،اسلامی ریاست،تجدید،احیائے دین،مسلۂ قومیت،رسائل ومسائل،رسالہ دینیات،شہادت حق ،سود،تفہیمات،تعلیمات،تنقیحات،تصریحات،ٹرکی میں عیسائیوں کی حالت(ترجمہ)،مکاتیب سید ابوالاعلی مودودی، نشری تقریریں،وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جماعت اسلامی جموں وکشمیر اور اردو زبان کی ترویج

جماعت اسلامی جموں وکشمیر ۱۹۴۶ء میں وجود میں آئی اور جماعت اسلامی ہند سے الگ ہوکر دعوت وتبلیغ کا کام انجام دیتی رہی۔اس سلسلے میں مذکورہ تنظیم کو تقریباً تین دفعہ پابندی کا بھی سامنا کرنا پڑا ۔آخری دفعہ فروری ۲۰۱۹ء میں پانچ سال کے لئے پابندی عائد کی گئی۔لیکن انہوں نے اس مدّت کے دوران اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ اردو زبان کو فروغ دینے میں بھی اہم رول ادا کیا ہے۔جموں وکشمیر میں لسانی اعتبار سے کافی تنوّع دیکھنے کو ملتا ہے اور اس تنوع کے درمیان اردو رابطے کی زبان کی حیثیت سے بولی جاتی ہے ۔اس کے علاوہ اردو کو یہاں کی دفتری زبان ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔یہی وجہ ہے کہ دینی تنظیمیں بھی دین اسلام کی تبلیغ واشاعت کے سلسلے میں اسی زبان کو ترجیح دیتی ہیں۔اور جماعت اسلامی جموں وکشمیر نے بھی کشمیری کے ساتھ ساتھ اردو زبان کو اپنی دعوت کا میڈیم بنایا ہے۔مذکورہ جماعت کے دعوتی وتبلیغی،تعلیمی وتربیتی اور دیگر دفتری امور اسی زبان میں طے پاتے ہیں۔جماعت اسلامی ہند کی طرح جماعت اسلامی جموں وکشمیر کے کارکنان ورفقاء نے بھی مولانا مودودی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اردو زبان کا سہارا لے کر مختلف موضوعات مثلاً سیاست،مذہب،معاشرت ،معیشت،تعلیم وتربیت،حقوق نسواں،منشیات وغیرہ پر قلم اٹھایا ہے۔اس سلسلے میں کشمیر سے ان کے ہفت روزہ ''مومن'' اور ماہنامہ ''پیام طلبہ'' بڑی پابندی کے ساتھ اردو میں شائع ہوتے تھے۔انہوں نے اپنے چھاپہ خانے بھی قائم کئے تھے جہاں سے اردو میں مختلف علمی وادبی کتابیں شائع ہوتی تھیں اور مختلف کتب خانوں کا قیام بھی عمل میں لایا گیا جن میں دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی کتابیں بھی دستیاب رکھی جاتی تھیں تاکہ قارئین کو آسانی سے مختلف علمی وادبی کتابوں سے مستفید ہونے کا موقع ملے۔مختلف اجلاس،اجتماعات،دروس قرآن ودروس احادیث کا اہتمام کرنے کے ساتھ ساتھ خاص طور پر ارکان کے لئے سالانہ کانفرنس کا انعقاد بھی کیا جاتا تھا۔اور ان سبھی تقریبات میں اردو زبان کا ہی استعمال کیا جاتا تھا۔اس طرح سے کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان کی ترویج میں جماعت اسلامی جموں وکشمیر کی خدمات قابل

ستائش ہیں۔ مذکورہ تنظیم کی لسانی وادبی خدمات کو درج ذیل ضمنی عنوانات کے تحت تفصیل سے پیش کیا جاتا ہے

ا۔رسائل و اخبارات ، ۲۔تصنیفات و تالیفات ، ۳۔مختلف تقریبات ، ۴۔دروس قرآن وحدیث، ۵۔ چھاپہ خانے اور کتب خانے

ا۔رسائل واخبارات

جماعت اسلامی جموں وکشمیر نے ابتدا سے لے کر اب تک کئی رسائل و اخبارات جاری کئے ہیں ۔جن میں ''اذان''''مومن''''پیام طلبہ''وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(الف)''اذان'': جماعت اسلامی جموں وکشمیر نے ۱۹۴۶ء میں وجود میں آنے کے بعد''اقامت'' اور''شہادت'' کے نام سے دو الگ الگ پرچے جاری کئے تھے لیکن مذکورہ پرچوں کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہو پائی جو بعد میں اجرا ہونے والے''اذان'' کو حاصل ہوئی۔ یہ پرچہ جماعت اسلامی کی دعوت کا صحیح ترجمان تھا۔''اذان'' ۱۹۵۱ء میں حکومت جموں و کشمیر کی طرف سے منظور کیا گیااور E.P.884 رجسٹریشن نمبر کے تحت رجسٹر ہوکر ماہنامہ کی صورت میں شائع ہونے لگا۔ کچھ عرصہ بعد ''اذان'' کو پندرہ روزہ کر دیا گیا۔۱۹۷۳ء میں پندرہ روزہ سے ہفتہ روزہ کر دیا گیا۔اور اسی سال قارئین کے مطالبات کی وجہ سے روزنامہ کی شکل میں شائع کیا جانے لگا۔لیکن ۱۹۷۵ء میں جب پورے ہندوستان میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی تو جماعت اسلامی پر پابندی عائد کی گئی اور اس وجہ سے''اذان'' کی اشاعت بھی متاثر ہوگئی۔ جب ایمرجنسی کا دور ختم ہوا تو ''اذان'' دوبارہ شائع ہونے لگا۔ چونکہ جماعت اسلامی کو انتخابات میں حصہ لینا تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تمام تر مالی مشکلات کے باوجود اسے روزنامہ کی صورت میں شائع کیا۔لیکن بعد ازآں اس کو مختلف وجوہات کی بنا پہ پھر ہفتہ روزہ کی شکل اختیار کرنا پڑی ۔۱۹۸۸ء میں جماعت اسلامی پر ایک بار پھر پابندی عائد ہونے کی وجہ سے''اذان'' کی اشاعت بھی بند ہوگئی۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ''اذان'' جہاں جماعت اسلامی کی دعوت کا ایک مضبوط ہتھیار ثابت ہوا وہیں اردو زبان کی اشاعت وترویج کا بھی ایک اہم ذریعہ بھی رہا ہے۔ایک مضمون نگار شیخ جاوید ایوب کے بقول:

> ''ماہنامہ اذان نہ صرف جماعت اسلامی جموں وکشمیر کا ترجمان تھا بلکہ وہ دین حق کا داعی بھی تھا، جماعت اسلامی کی تاریخ کا ایک سنہرا باب بھی ہے جو نہ صرف جماعت اسلامی کی تاریخ کو مرتب کرنے کا ایک بہت اہم ذریعہ ہے بلکہ اس کے نصب العین کا ایک

زبردست وکیل بھی تھا۔''(۳)

(ب)ہفت روزہ ''مومن'': ''اذان'' کے بعد جماعت اسلامی جموں وکشمیر نے اردو زبان میں ہی ایک اور پرچہ ''مومن'' کے نام سے آر۔این۔آئی نمبر JKURD/1999/3112 کے تحت رجسٹر کر کے سرینگر سے جاری کیا۔سولہ صفحات پر مشتمل یہ اخبار بڑی پابندی کے ساتھ ہر ہفتہ جمعہ کے دن شائع ہوتا تھا۔''اذان'' کی طرح ہی ''مومن'' بھی جماعت اسلامی کے نصب العین کی ترجمانی کرتا تھا۔مذکورہ اخبار کے پہلے صفحہ پہ جلی حروف میں اخبار کا نام ''مومن'' اور اس کے اوپر علامہ اقبال کی نظم ''مردِ مسلمان'' کا پہلا ہی شعر لکھا ہوتا

ہر لحظ ہے مومن کی نئی آن نئی شان گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

نچلے حصے میں کسی خاص موضوع سے متعلق تصویریں اور جلی حروف میں شہ سرخی اور بعض شماروں میں اس کی تفصیلات بھی چھپتی تھیں۔دوسرے صفحے پہ کلام الٰہی'' اور ''کلام نبوی'' کے عنوان کے تحت قرآن شریف کی کسی آیت اور رسول اللہ ﷺ کی کسی حدیث کا اردو ترجمہ اور تفسیر بھی پیش کی جاتی تھی۔صفحہ نمبر تین سے صفحہ نمبر تیرہ تک مختلف قومی و بین الاقوامی حالات و واقعات پر مبنی خبروں، تبصروں اور تجزیوں کے ساتھ ساتھ مذہبی، سیاسی، سماجی، تہذیبی، معاشی، تعلیمی و تدریسی مسائل سے متعلق مضامین بھی چھپتے تھے۔ بارھواں صفحہ ''روداد جہاں'' تیرھواں ''ہفتۂ رفتہ'' چودھویں صفحے پر انعامی مقابلہ سے متعلق سوالات ،پندرھویں صفحہ پر اشتہارات اور سولھواں اور آخری صفحہ کسی خاص موضوع کے لئے مختص ہوتے تھے۔لیکن فروری ۲۰۱۹ء میں جماعت اسلامی پر پابندی عائد ہونے کی وجہ سے مذکورہ اخبار کی اشاعت بھی بند ہو جاتی ہے۔(۴)

(ج)''پیام طلبہ'': جماعت اسلامی جموں وکشمیر نے سرینگر کشمیر سے ہی نوجوانوں اور طالب علموں کے لئے ''پیام طلبہ'' کے نام سے ایک ماہنامہ بھی جاری کیا تھا۔اور یہ ماہنامہ آر۔این۔آئی نمبر JKURD/2016/6766 کے تحت ۲۰۱۶ء کو رجسٹرڈ کیا گیا۔لیکن جماعت اسلامی پر پابندی عائد ہونے کی وجہ سے اسے بھی بند ہونا پڑا۔مذکورہ رسالہ میں ابتدائی صفحہ پہ ''تذکیر'' کے عنوان کے تحت قرآن پاک کی کسی ایک آیت اور کسی ایک حدیث رسول ﷺ کا متن، ترجمہ اور تشریح پیش کئے جاتے تھے۔مذکورہ رسالہ کا اداریہ بھی علمی اعتبار سے بہت عمدہ ہوتا تھا۔آخری صفحات میں سے ایک صفحہ '' ننّھے شاہین'' کے نام سے بچوں کے لئے اور ایک ''آئینہ'' کے نام سے قارئین کے خطوط کے لئے مختص ہوتا تھا۔اس کے علاوہ اس رسالے میں مختلف مضامین شائع ہوتے تھے جن کا مقصد نوجوانوں میں دینی شعور بیدار کرنے

کے ساتھ ساتھ انہیں سماج کے دیگر مختلف شعبہ جات سے متعلق واقفیت فراہم کرنا بھی تھا۔ مذکورہ رسالہ میں سیرت النبی ﷺ، ادب و ثقافت، تعلیم کی اہمیت و افادیت، آداب واخلاق، منشیات کے نقصانات، فحاشی اور عریانی کے منفی اثرات، مختلف افکار ونظریات، سیر و سیاحت کے فوائد، سائنس اور ٹکنالوجی کی اہمیت وغیرہ موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس میں حمدیہ اور نعتیہ کلام کے ساتھ ساتھ مختلف دینی وعلمی شخصیات سے لئے گئے انٹرویو بھی شائع کئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ کور پیج پر مختلف اداروں کے اشتہارات بھی چھاپے جاتے تھے۔ اس رسالہ کو ریاست میں اچھی خاصی مقبولیت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب اردو زبان کی ترقی وترویج کی بات کی جاتی ہے تو رسالہ ''پیام طلبہ'' کی خدمات بیان کرنا لازم آتا ہے۔ اس سلسلے میں مذکورہ رسالہ کا جنوری ۲۰۱۹ء کا شمارہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ شمارہ اسلامی ادب کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اور اس میں اسلامی ادب کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی اہمیت وافادیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں اردو ادب کے گمشدہ ستاروں یعنی نعیم صدیقی، ماہر القادری، مولانا عامر عثمانی، حفیظ میرٹھی، نسیم حجازی، اسعد گیلانی، مائل خیر آبادی وغیرہ ادبا و شعرا کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ان کی فنی خوبیوں کو سراہا گیا ہے۔ (۵)

ایک اور شمارہ ''نظام تعلیم حقائق کی روشنی میں'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس میں ''غازی سہیل خان'' نامی ایک مضمون نگار کا مضمون ''فروغ اردو اور ہماری ذمہ داریاں'' شائع ہوا تھا۔ مضمون نگار نے اس میں اردو زبان کی خدمات کو پیش کرتے ہوئے اردو زبان کے درپیش مسائل پر بھی بحث کرتے ہیں اور اس کے علاوہ اردو زبان کو فروغ دینے کے حوالے سے بھی مختلف تجاویز پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

گو جماعت اسلامی کے کارکنان ورفقاء بھی اسلامی تعلیمات سیکھنے اور سکھانے کے حوالے سے اردو زبان کے رہین منت ہونے کے معترف ہیں۔ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ جماعت اسلامی سے منسلک مختلف مصنّفوں، کالم نویسوں اور مضمون نگاروں نے بھی اپنی تصنیف وتالیف کے ذریعے سے اردو زبان کو فروغ دینے میں نہایت ہی اہم اور ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔

۲۔ مختلف تقریبات

جماعت اسلامی دعوت وتبلیغ کے سلسلے میں پورے جموں وکشمیر میں کام کرتی تھی۔ اس سلسلے میں مختلف تقریبات، اجتماعات اور اجلاس ریاست کے مختلف علاقوں میں منعقد کئے جاتے تھے۔ اور ان میں مختلف علاقوں اور مختلف زبانیں بولنے والے لوگ شریک ہوتے تھے۔ چونکہ اردو جموں وکشمیر کی رابطے کی زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خطیب ومقررین اپنے خطبات وتقاریر میں اردو زبان کا ہی استعمال کیا کرتے

تھے۔مزید برآں ان تقریبات کی تشہیر بھی اردو زبان میں چھاپے گئے اشتہارات، بینرز، دعوت ناموں وغیرہ کے ذریعے سے کی جاتی تھی۔

۳۔دروس قرآن واحادیث

جماعت اسلامی درس قرآن اور درس حدیث کو کافی اہمیت دیتی ہے۔درس قرآن میں وہ مولانا مودودی کی تفسیر ''تفہیم القرآن'' کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ تفسیر اردو میں لکھی گئی ہے۔اس میں عام فہم، سلیس اور رواں زبان استعمال کی گئی ہے۔اور دروس احادیث کے دوران بھی مولانا موصوف کی ترتیب دی ہوئی احادیث پر مبنی کتابیں پیش نظر رکھی جاتی ہیں۔اس سلسلے میں کئی دروس قرآن واحادیث کتابی صورت میں بھی شائع بھی ہو چکے ہیں۔اس حوالے سے غلام قادر لون صاحب کے دروس کا مجموعہ قابل ذکر ہے۔

۴۔ چھاپہ خانے اور کتب خانے

جماعت اسلامی جموں وکشمیر کے ہاں ''چنار پبلیکیشنز'' اور ادارہ مطبوعات طلبہ کے نام سے طباعتی ادارے بھی تھے۔اخبار ''مومن'' اور رسالہ ''پیام طلبہ'' یہیں سے چھپتے تھے۔اس کے علاوہ یہاں سے کئی کتابیں اردو زبان میں چھپ کر منظر عام پر آچکی ہیں۔جن میں ''مجموعۂ احادیث'' غلام قادر لون کی ''تاریخ کشمیر'' ڈاکٹر حافظ محمد زبیر کی ''صالح مصلح'' پروفیسر غلام اعظم کی ''سید مودودی شخصیت یادیں اور کارنامے'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔علاوہ ازیں دستور جماعت اسلامی، سالانہ نصاب، تربیتی گائیڈ، ڈائریز وغیرہ بھی یہاں سے اردو میں شائع ہوتے تھے۔

چھاپہ خانوں کے علاوہ جماعت اسلامی جموں وکشمیر کے کتب خانے بھی اردو زبان کے فروغ کے سلسلے میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔مذکورہ تنظیم کا ایک مرکزی کتب خانہ بھی تھا جس میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کی کتابیں بھی اردو میں بھی موجود تھیں۔مرکزی کتب خانے کے علاوہ مختلف علاقوں اور بستیوں میں بھی کتب خانے قائم کئے گئے تھے جن میں اردو زبان میں متعدد کتابیں دستیاب ہوا کرتی تھیں۔کتابوں کی خرید وفروخت کے لئے خاص تقریبات کے موقعوں پہ جگہ جگہ ''بک اسٹال'' بھی لگوائے جاتے تھے۔جس کی وجہ سے قارئین کو بہ آسانی کتابوں تک رسائی ہوتی تھیں۔

۵۔مسابقتی امتحانات:

جماعت اسلامی جموں وکشمیر ضلعی وریاستی سطح پر مسابقتی امتحانات بھی کرواتی تھی اور امتیازی حیثیت حاصل کرنے والے بچوں کو انعام واکرام سے بھی نوازا جاتا تھا۔ان امتحانات میں ٹی ایس ٹی یعنی ٹیلنٹ سرچ ٹیسٹ بڑی اہمیت کا حامل تھا۔اس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں دیگر مضامین کے علاوہ

اردو زبان و ادب سے متعلق سوالات بھی پوچھے جاتے تھے۔اور اس کا مقصد جہاں ذہین اور محنتی طلبہ و طالبات کی شناخت اور حوصلہ افزائی تھا وہیں نئی نسل کو اردو زبان وادب سیکھنے کی طرف آمادہ کرنا بھی اس کے مقاصد میں شامل تھا۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جماعت اسلامی ہند کے ساتھ ساتھ جماعت اسلامی جموں وکشمیر نے مختلف اخبارات ورسائل،تصنیفات وتالیفات اور خطبات وتقاریر کے ذریعے سے جہاں اسلامی تعلیمات کی تبلیغ واشاعت کا کام انجام دیا ہے وہیں اردو زبان کو فروغ دینے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔

۱ رسالہ ''پیام طلبہ'' (تحریکات: افکار ونظریات) شمارہ نومبر ۲۰۱۷ء،صفحہ نمبر ۲۱
۲ رسالہ ''پیام طلبہ''(مولانا مودودی: فکر ونظر) شمارہ نومبر۔دسمبر ۲۱۰۸ء،صفحہ نمبر ۷
۳ ایشین میل''سرینگر کشمیر شمارہ ۱۹ اکتوبر ۲۰۱۷ء
۴ ہفت روزہ ''مومن''سرینگر، جلد ۳۱، شمارہ ۲۷، ۲۰ جولائی ۲۰۱۸ء
۵ رسالہ ''پیام طلبہ''سرینگر (اسلامی ادب) جنوری ۲۰۱۹ء

اُردو شاعری میں تصوف

نظیر احمد گنائی
ریسرچ اسکالر شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی

تصوف کی ابتداء حضور ﷺ کے زمانے میں ہو چکی تھی لیکن لفظ صوفی اور تصوف غیر مستعمل تھے۔ آپ ﷺ کی زندگی دینِ اسلام کی ابتداء اور تکمیل تھی۔ اس لیے تصوف کی بنیادی خصوصیات عملی طور پر کسی نہ کسی شکل میں آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب میں موجود تھیں۔ اصحاب صفہ کی زندگی شریعت وطریقت کے مطابق تھی۔ اصحاب صفہ ہی اولین صوفیہ کا گروہ ہے جنہوں نے براہ راست انوارِ نبوت سے فیض حاصل کیا۔ اسلام میں تصوف کے حوالے سے محمد ادریس یوں لکھتے ہیں کہ:

> ''اوّل اسلام میں تصوف نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور نہ اس طرح کا کوئی نظام پایا جاتا تھا۔ تزکیہ تربیت، نفس، قرآن وحدیث کی مجموعی تعلیم وتربیت کا ایک پہلو تھا۔ جو دوسرے پہلوؤں سے مربوط اور منسلک تھا۔ بعد میں اس نے ایک نظامِ فکر وعمل کی صورت اختیار کر لی۔'' (مضامین تصوف، مرتب، محمد ادریس، ص ۸۴۔۸۵)

اُردو شاعری میں تصوف کا ظہور

اردو ادب کے نشو نما میں اولیاء اللہ اور صوفیوں کا عمل دخل رہا ہے۔ اُردو شاعری میں صوفیانہ عناصر فارسی اور عربی کے توسط سے ہی آئے ہیں۔ عربی میں حسان بن ثابتؓ اور فارسی میں مولانا رومیؒ اور جامیؒ وغیرہ جیسے بڑے شاعروں نے اس فن میں اپنے جوہر دکھائے اور صوفی عناصر کو بلند اور اعلیٰ مقام بخشا۔ اُردو میں حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کے خلیفہ اکمل، حضرت ابوالحسن امیر خسروؒ نے پہلی بار اس فن میں طبع آزمائی کی۔ حضرت ابوالحسن امیر خسروؒ سے لے کر اب تک جتنے بھی اولیاء اللہ اور صوفی بزرگ آئے ہیں۔ انہوں نے اپنے رفقاء اور عوام الناس میں درس وتدریس کا کام اردو میں ہی کیا ہے۔ وعظ ونصیحت ہو یا ملفوضات غرض ہر کام کے لیے انہوں نے اردو زبان کو ہی اپنایا۔ اپنی دینی اور دنیاوی تعلیمات نثر وشاعری کو انہوں نے بڑے سلیقے سے نبھایا۔ حضرت امیر خسروؒ نے اپنی شاعری میں تصوف کو اس طرح پیش کیا ہے کہ:

نمی دانم چہ منزل بود، شب جائے کہ من بودم بہ ہر سو رقصِ بسمل بود، شب جائے کہ من بودم

اُردو میں یوں ہے کہ

نہیں معلوم تھی کیسی وہ منزل، شب جہاں میں تھا ہر اک جانب بپا تھا رقصِ بسمل، شب جہاں میں تھا

حضرت امیر خسروؒ کے بعد کئی شعراء کا ذہن اس فن کی طرف مائل ہوا، وہ کچھ اس طرح سے ہیں جیسے:

سلطان محمد قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، ملک خوشنود، ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، مرزا محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد، میر تقی میر، نظیر اکبر آبادی، حیدر علی آتش، مرزا اسد اللہ خاں غالب، میر انیس، مرزا دبیر، امیر مینائی، داغ دہلوی، خواجہ الطاف حسین حالی، اسمٰعیل میرٹھی، احمد رضا خان فاضل بریلوی، اکبر الہ آبادی، شاعر مشرق علامہ اقبال، فانی بدایونی، حسرت موہانی، اصغر گونڈوی وغیرہ نے بھی بعد میں اس موضوع پر اپنا قلم اٹھایا۔ غرض ہر دور میں کوئی نہ کوئی ایسا شاعر پیدا ہوا جو صوفیت سے یا تو متاثر تھا یا خود بھی صوفی رہا۔ صوفیانہ کلام کے حوالے سے معروف چنیدہ شخصیات درج ذیل ہیں:

سلطان باہوؒ، وارث شاہؒ، میاں محمد بخشؒ، بابا بلھے شاہؒ، شمس تبریزیؒ، مولانا رومیؒ، مولانا جامیؒ، شیخ سید شیرازیؒ، امام غزالیؒ، ابنِ عربیؒ، شیخ فرید الدین عطارؒ وغیرہ

اُردو شاعری میں یہ روایت یا تو نسل در نسل چلی آئی یا تو سلسلہ نسبی سے آئی۔ تصوف اور اس کے معاملات اردو شاعری کے اہم ترین موضوعات میں سے ہیں سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اپنی غزلوں میں عشق حقیقی کا بھر محل استعمال کیا ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں منزلوں کا بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ نسبت اسلاف کا بھی پرتو ان کے کلام میں جابجا ملتا ہے۔ حکمرانی کے ساتھ ساتھ رب العالمین کی تمام تر وحدت، آزمائش اور جلال کی ذکر کر کے ہر نعمت کا شکر بھی ادا کیا ہے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے بعد وجہی اور غواصی نے بھی تصوف کے مضامین کو اپنی شاعر کا موضوع بنایا ہے۔ ان دونوں کے بعد ولی دکنی نے بھی اپنی کلیات میں جابجا تصوف کے باب کھول دئے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں یہ شعر:

لب پہ دلبر کے جلوہ گر ہے جو خال حوض کوثر پہ جوں کھڑا ہے بلال

ولی دکنی کے بعد سراج اورنگ آبادی نے اس موضوع کو بام عروج بخشا ہے وہ لکھتے ہیں کہ

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

سراج کے بعد اس شاعر کا دور آتا ہے کہ جس نے صوفی گھرانے میں ہی آنکھ کھولی ہے۔ حضرت خواجہ میر درد نام سے ہی اثر پرور ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری سے تصوف کو ایسی رونق بخشی کہ دنیائے اردو ادب میں ان کا نام سنہری حروف میں لکھا گیا ہے۔ ان کے یہ اشعار اس حوالے سے کافی اہمیت رکھتے ہیں:

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

نے گُل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار کس بات پر چمن ہوس رنگ و بو کریں

خواجہ میر درد کے بعد اُردو شاعری میں ایک بڑے شاعر کا جنم جس کا نام میر تقی میر ہے۔ یہ وہ شاعر ہیں جنہوں نے درد و غم کو ہی زندگی کا تسکین بنایا ہے۔ اپنے کلام میں عشق و محبت، درد و غم، ظلم و بے بسی، ہجر و فراق، یاس و تڑپ، وصال و رخصت کے ساتھ ساتھ ہر اس موضوع کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے جس کا تعلق برائے

راست یا بلا واسط خدا کی وحدانیت سے ہو۔ ذرا یہ ملاحظہ فرمائیں:

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر میں ورنہ وہی خلوتی ٔرازِ نہاں ہوں

دوسری جگہ میر تقی میرؔ کچھ یوں کہتے ہیں:

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

میر تقی میرؔ کے بعد نظیرؔ اکبر آبادی نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ نظیرؔ کے ساتھ ہی خواجہ حیدر علی آتش ایسے شاعر گزرے ہیں کہ جنہوں نے تصوف کی دنیا میں قدم رکھا اور ایسے اشعار کہے جن سے تصوف کی صورتیں پنہاں ہوئیں۔ ان کے بعد بہادر شاہ ظفرؔ اور شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ نے بھی اس فن میں طبع آزمائی کی اور چنندہ اشعار درج کئے ہیں۔ پھر اس کے بعد اُردو ادب میں وہ درخشاں ستارہ نمودار ہوا کہ جس نے اُردو شاعری کو دل والوں کی شاعری بنادی۔ جن کا اسم گرامی مرزا اسد اللہ خان غالبؔ۔ مرزا غالبؔ نے اُردو شاعری کو ایسی وسعت عطا کی کہ محبِّ ادب اُردو شاعری کی طرف راغب ہوئے۔ فارسی شاعری ہو یا اُردو شاعری دونوں میں وہ کمال حاصل کیا کہ تادم ادب نواز انہیں یاد کریں گے اور ہر دور میں ان کے کلام کو تر و تازہ قرار دیں گے۔ مرزا اسد اللہ خان غالبؒ کہتے ہیں:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

دوسری جگہ کہتے ہیں کہ:

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

مرزا غالبؔ کے بعد میر انیسؔ، مرزا دبیر، امیر مینائی اور داغؔ دہلوی نے اس موضوع پر کلام لکھا ہے۔ داغؔ دہلوی لکھتے ہیں کہ:

تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں تجھے ہر بہانے سے ہم دیکھتے ہیں

داغؔ دہلوی کے بعد الطاف حسین حالیؔ، اسمٰعیل میرٹھی اور اکبر الہ آبادی نے بھی اس فن میں طبع آزمائی کی اور تصوف کے حوالے سے بہترین کلام پیش کیا۔ اسکے بعد رضا احمد خان بریلوی نے احمد مصطفیٰ محمدِ مجتبیٰ پیغمبر آخر الازماں ﷺ۔ کی شان میں ایسے بہترین نعت لکھے اور اہلِ بیت کے نام سے منقبت لکھے۔ انہوں نے تصوف کے ایسے باب کھول دے جن کا تصور عام قاری کر نہیں سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کو ایسے بیان کیا کہ لگتا ہے ان کا دل معرفتِ الٰہی سے سرشار ہوا ہے۔

پانچ جاتے ہیں ، چار پھرتے ہیں نفس یہ کوئی چال ہے ظالم
کیسے خاصے بجار پھرتے ہیں کوئی کیوں پوچھے تیری بات رضا
تجھ سے کتنے ہزار پھرتے ہیں

احمد رضاؔ خان بریلوی کے عہد کے بعد جن شعرا نے بہترین کلام لکھا ہے۔انہوں نے صرف عشق و عاشقی کو ہی محور بنالیا تھا۔ان شعراء نے ظلم وتشدد، بھوک وافلاس، محکومی، آپسی نابرابری کے موضوعات پر ہی قلم اٹھایا۔ پھر کچھ مدت کے بعد نور وحدت کی ایک جھلک ظہور ہوئی تو سیالکوٹ کی پاک سرزمین سے ایک ستارہ روشن ہوا جس نے اپنے کلام کے ذریعے انقلاب برپا کردیا۔ میری مراد ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ سے ہے، شاعر مشرق حکیم الامت علامہ اقبالؔ نے شاعری کی وہ تہیں کھول دی جن پر اُردو ادب ناز کرتی ہے اور اپنے کلام ایسے موضوعات میں بھر دئے جن کے ذریعے قوم کی اصلاح اور معاشرے میں سدھار ہوا۔علامہؔ اقبالؔ تصوف کی نسبت یوں فرماتے ہیں:

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

دوسری جگہ کہتے ہیں کہ:

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق عشق نہ ہو تو شروع و دیں بت کدۂ تصورات

مختصر طور پر ہم یہ کہیں گے کہ متذکرہ شعرا کے یہاں تصوف کا کلام پڑھنے کو ملا۔اگر دیکھا جائے تو تصوف بذات خود ایک پیچیدہ موضوع ہر دور میں رہا ہے۔ مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ ہر دور میں ایسے شاعر بھی گزرے ہیں کہ جنہوں نے اس فن میں اپنے جوہر دکھائے اور اُردو شاعری کو تصوف کی دنیا سے مالا مال کردیا۔ان شاعروں نے عشق و عاشقی کے علاوہ تصوف اور صوفیت کو بھی موضوع بنایا۔شعراء نے اپنے فنی صلاحیتوں سے تصوف پر کلام لکھا لیکن بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض شعراء کے ہاں تصوف کا ظہور قدرتی ہوتا ہے۔ اس حوالے سے پروین شاکرؔ کے اس شعر سے میں اپنے موضوع کو سمیٹتے ہوئے کہوں کہ:

دینے والے کی مشیت پہ ہے سب کچھ موقوف مانگنے والے کی حاجت نہیں دیکھی جاتی

اردو ادب میں ہندوستانی تہواروں کا تذکرہ

ڈاکٹر شاہدہ مناف
راجے چھترپتی آرٹس کالج۔ بلڈانہ (مہاراشٹر)

تہواروں کی بنیاد عموماً مذہب پر ہوتی ہے۔ یہاں کئی دھرم و مذہب، تہذیب وثقافت کے ماننے والے بستے ہیں۔ اردو ادب اور شاعری میں بھی تہواروں کو بھی بڑی اہمیت اور عظمت کے ساتھ پیش کیا جاتا رہا ہے۔ ہندوستان چونکہ ایک وسیع وعریض ملک ہے اور یہاں ہر مذہب وفرقے کے لوگ بستے ہیں، اسی بنا پر کئی نامور ادیبوں نے سخن آرائی کی ہے اور اس کے ساتھ ہی ہمارے شعراء حضرات نے بھی ہندوستانی تہواروں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ شاعر چاہے کسی زبان کا ہو وہ تعصب اور تنگ نظری کا شکار نہیں ہوتا، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ کئی مسلم شعراء نے دیوالی، ہولی، راکھی، بسنت بہار اور چھمانی کی نظمیں و گیت لکھے ہیں تو دوسری طرف ہندو شعراء نے عیدین، محرم، اور کربلا کے واقعات کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک انسانیت ہی سب سے بڑا مذہب اور دھرم ہوتا ہے۔

ردو شاعری میں سلطان قلی قطب شاہ، امیر خسرو، فائز دہلوی، شاہ حاتم، نظیر اکبر آبادی، سعادت یار خاں رنگین، سیماب اکبر آبادی، منشی دوارکا پرساد، انشاء، بے نظیر شاہ، آل احمد سرور، حرمت الاکرام، شمیم کرہانی، مخمور سعیدی، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی نظیر بنارسی، گوپی ناتھ امن لکھنوی، بہادر شاہ ظفر، غالب، کوثر چاند پوری، جمیل مظہر اور اقبال جیسے کئی عظیم شاعروں نے عیدوں، شب برات، عیدِ میلاد النبی، راکھی، ہولی، دیوالی، دسہرہ، چھماونی، بسنت بہار، جیسے تہواروں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

عیدالفطر، ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں میں بڑے اہتمام کے ساتھ منایا جانے والا تہوار ہے۔ ایک شاعر نے عیدالفطر کی روایات کا تذکرہ اپنی شاعری میں کرتے ہوئے کہتا ہے:

تہوار تو تہوار ہے ہندو نا مسلمان ہم رنگ اچھالے ، تو پکائے سیویاں
رنجیدہ پڑوسی جو اٹھا دار سے خوشیوں کا گزر ہوگا نا پھر تیرے مکاں سے

سچ مانیں تو حقیقت میں بچوں کی عید ہوتی ہے۔ عیدی، تحفے، کپڑے، مٹھائیاں، اور ڈھیر ساری فرمائشیں۔۔۔۔

عید مبارک عید مبارک چاند کی تم کو دید مبارک
کپڑے اور خوش رنگ کھلونے بر آئی امید مبارک
پہلے دئے بھیا نے پیسے عیدی کی تمہید مبارک
ہر خواہش ، ہر فرمائش پر امی کی تائید مبارک
(حافظ باقوی۔)

ہمارے ملک میں ایسے سیکڑوں مواقع آتے ہیں جب ملک کی مختلف ریاستوں میں کوئی نا کوئی تہوار یا میلہ یا عرس یا جینتی منائی جاتی ہے۔ دراصل یہ ایک بہانہ یا رسم ورواج یا تہوار ہوتا ہے حقیقت میں دیوالی، دسہرہ، ہولی، عیدین جیسے کچھ ہی خاص مواقع ایسے ہوتے ہیں جن میں ہر خاص وعام، گرم جوشی اور اخلاق واخلاص کے ساتھ مناتے ہیں۔

میر تقی میر ہولی کے موقع پر فرماتے ہیں:

آؤ ساقی، بہار پھر آئی ہولی میں کتنی شادیاں لائی
جس طرف دیکھو معرکہ سا ہے شہرہ ہے یا کوئی تماشا ہے
جشن نو روز ہند ہولی ہے راگ و رنگ اور بولی ٹھولی ہے

دیوالی ہندوؤں کا ایک اہم تہوار ہے لیکن ہندوستان میں یہ عوامی تہوار کی طرح دھوم دھام سے منایا جاتا ہے

ہر ایک مکان میں پھر جلا دیا ہولی کا ہر اک طرف کو اجلا ہوا دوالی کا
جہاں میں یار عجب طرح کا ہے یہ تہوار کسی نے نقد لیا اور کوئی کرے ہے ادھار
کھلونے کھیلوں قباسوں کا گرم ہے بازار ہر ایک دکان میں چراغوں کی ہو رہی ہے بہار
مٹھائیوں کی دکانیں لٹا کے حلوائی پکارتے ہیں کہ لالہ دوالی ہے آئی
بتاشے لے کوئی برفی کسی نے تلوائی کھلونے والوں کی ان سے زیادہ بن آئی

(نظیر اکبرآبادی)

ہندوستان میں جین فرقے کے لوگ بھی بستے ہیں وہ لوگ سال میں ایک بار ایک ملن کا تہوار مناتے ہیں ایک دوسرے سے معافی مانگتے ہیں اس لئے اس کو چھماؤنی کا نام دیا گیا ہے۔ تدبیر بنارسی اس تہوار پر لکھتے ہیں۔

دل میں نئے ارمان بسانے کا دن آیا غنچے کی طرح دل کو کھلانے کا دن آیا
پھولوں کی طرح ہنسنے ہنسانے کا دن آیا آپس میں گلے ملنے ملانے کا دن آیا
جیون ہے کہ بھگوان مہاویر کا پرساد ملنے کے لئے ہاتھ بڑھانے کا دن آیا
ہر بگڑی ہوئی بات بنانے کا دن آیا بھگوان کے بھی درشن دکھانے کا دن آیا

اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان اپنی تہذیب وتمدن میں سب سے آگے ہیں کیونکہ زندگی کی خوشیاں، رنگ رلیاں، شان وشوکت اور حقیقی زندگی کی کامیابی وکامرانی اور مذہبی تحریکات وعوامل کا مرہون منت ہے۔ تہوار مذہبی ہو یا عوامی یا علاقائی یہ تو ان گذشتہ وقوع پذیر ہونے والے واقعات، ان تحریکات کی یادیں، ان کا اعادہ یا ان کی پیروی کا دوسرا نام ہے۔ ان تہواروں پر اردو ادب میں خصوصا شعرا نے مختلف عیدوں کی مناسبتوں سے اس کے رسوم وروایات، تہذیب وثقافت کی ایک خوبصورت اور دلکش تصویر اپنے اشعار میں کھینچی ہے۔

❁❁❁

اردو میں مذہبی کتابیں

(سکھ مت، بدھ مت اور جین مت کے اردو تراجم کے حوالے سے)

حافظ محمد سیفی عمری

استاد زائر، جامعہ دارالسلام عمر آباد

اردو زبان مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کی آئینہ دار ہے۔اس زبان کے بولنے، پڑھنے، لکھنے، سمجھنے اور محسوس کرنے والوں میں جہاں مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے متوالے ہیں، وہیں مختلف مذاہب ومسالک اور عقائد وافکار کے پیروکار بھی ہیں، چنانچہ ان لوگوں نے اپنی مقدس اور مذہبی کتابوں کو اردو کا قالب عطا کیا ہے، چاہے ان کا تعلق مذہبِ اسلام سے ہو کہ عیسائیت سے، ہندومت سے ہو کہ جین مت سے، سکھ ہوں کہ بدھ، ہمیں اردو زبان میں ان کا بیش بہا سرمایہ ملتا ہے۔اس مقالہ میں جین مت، بدھ مت اور سکھوں کی بنیادی اور اہم مذہبی کتابوں کے اردو تراجم کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔

سکھ مت کے اردو تراجم:

سکھوں اور اردو کا رشتہ کافی قدیم اور مضبوط ہے۔اردو ادب کے فروغ اور ترقی میں سکھوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

سکھ مذہب میں سب سے زیادہ اہمیت 'گرو گرنتھ صاحب' کو حاصل ہے، اس مذہبی کتاب کا نہ صرف ترجمہ اور تشریح اردو زبان میں موجود ہے بلکہ اس کا رسم الخط بھی اردو زبان میں دستیاب ہے۔بعض ابواب اور حصوں کے مختلف تراجم اردو زبان میں موجود ہیں۔''محلّہ'' جو 'سری جپ جی صاحب'' کے نام سے مشہور ہے، اس کا منظوم ترجمہ دل محمد صاحب نے کیا ہے۔اس کے علاوہ ایک اور ترجمہ ماسٹر لال سنگھ آنند خالص نے 'ورِدِحق' کے نام سے منظوم کیا ہے۔ڈاکٹر خواجہ عبدالحی فاروقی نے ''صدق وصفا'' کے نام سے نثری ترجمہ کیا ہے اور ڈاکٹر جیت سنگھ ستیل نے'' کلام نانک'' کے نام سے کیا ہے۔

سکھ منی صاحب کے بانی کا ترجمہ بھی دل محمد صاحب نے کیا ہے، گورو تیغ بہادر صاحب بھی اردو میں شائع ہو چکی ہے۔ان تراجم کی خصوصیت یہ ہے کہ حاشیے میں نامانوس اور مشکل الفاظ کی وضاحتیں بھی درج ہیں تاکہ قارئین کو ترجمہ سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔

سری آدی گرنتھ کا ترجمہ منشی برج لعل نے کیا ہے، اس کے اصل شلوک فارسی زبان میں موجود ہیں پھر اس کا ترجمہ اور شرح اردو زبان میں کیا گیا، اس نسخہ کی ضخامت ۱۴۴ صفحات ہے۔یہ گیان پریس گوجرانوالہ سے شائع ہوئی۔

''پوتھی پنج گرنتھی''اس مجموعہ میں گرنتھ صاحب کے جپ جی، رہ رس، اوفکار، سدھ

گومٹ، آنند، باون اکھری، سکھ منی اور آسادی وار کے حصے شامل ہیں۔ دیارام عاکف نے اس کا ترجمہ اور شرح اردو زبان میں کیا ہے۔

امام مرتضیٰ نقوی نے ایک کتاب ''اردو ادب میں سکھوں کا حصہ (گرونانک سے عصرِ حاضر تک)'' لکھی ہے جس میں انھوں نے اپنی کتاب کو دو حصوں: حصہ نظم اور حصہ نثر میں تقسیم کیا ہے۔ حصہ نظم میں انھوں نے ۳۷ اردو شعرا، اور حصہ نثر میں ۱۶ نثر نگاروں کا تذکرہ، ان کی نگارشات کا نمونہ اور ان کے سوانحی حالات درج ہیں، نیز ۲۲ ادباء وشعراء کے نام مذکور ہیں جن کے کارنامے اور حالات دستیاب نہیں ہو پائے، ہاں یہ ضرورت ہے کہ ان کا تعلق سکھ مذہب سے ہے اور انھوں نے اردو ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

ڈاکٹر سیفی پریمی مذکورہ کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے:

> ''بعض بزرگوں نے اردو زبان کی بنیاد اور تشکیل کے سلسلے میں مسلمان صوفیوں کے اقوال پیش کیے ہیں، لیکن سکھ بزرگوں کے ارشادات پیش نہیں کیے ہیں، حالانکہ اردو کی داغ بیل کے سلسلے میں گرونانک کی نظموں کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ ان کی 'جپ جی'، 'حاضر نامہ' اور 'سہ حرفی' وغیرہ میں عربی فارسی کے الفاظ ملتے ہیں، اور مصرعوں کے ٹکڑے اردو کے ہیں۔ ان الفاظ کو آورد یا ہجوم کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ دراصل وہ سیاق وسباق میں معنی کی لہریں پیدا کرتے ہیں اور اردو کے ٹکڑے مصرعوں میں مطالب کے ساتھ وزن وموسیقی کی فضا کو قائم رکھتے ہیں۔ اس صحت مند روایت کو سکھ اہلِ قلم نے آگے بڑھایا ہے۔ آج ہمارے سامنے سکھ شاعروں کی طویل فہرست موجود ہے جنھوں نے نعت، قصیدہ، سلام وغیرہ مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے''۔

(اردو ادب میں سکھوں کا حصہ، ص:۱۱)

سکھ دھرم کی کچھ مشہور کتابیں جو اردو میں دستیاب ہیں وہ آرتی (دھنا سری محلّہ) از رتن سنگھ، بابا فرید کے اشلوک از رتن سنگھ، پوتھی اونکا از سوامی مترسین، پوتھی پنج گرنتھی از دیارام عاکف، پوتھی رہ راس از سوامی مترسین، پوتھی شبدناویں محل از سوامی تیجا سنگھ، تذکرہ بابا نانک از مولوی صوفی غلام قاسم، جپ جی از شکیل الرحمٰن، جنم ساکھی از بھائی بالا والی مترجم دیارام عاکف، دھرم وچار از جواہر سنگھ کپور، سکھ مت از میجر بلبیر سنگھ، سکھوں کے دس گرو از جوالہ دت شرما، صاحب کمال از دولت رائے اور گورونانک از گوپال سنگھ وغیرہ ہیں۔

غرض اردو کے فروغ میں سکھ مذہب اور اس کے پیروکاروں کی تخلیقات ایک بیش بہا اضافہ ہیں۔

جین مت کی کتابیں

شارب ردولوی نے عالمی اردو ادب کے خصوصی شمارہ کے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے کہ جین مت کی تقریباً ۱۴۰ کتابیں اردو میں دستیاب ہیں۔ جین مذہب کی ایک اہم کتاب 'جین پوجن سنگرہ' ہے، جس کو صبح وشام جین مذہب کے پیروکار اپنی عبادت گاہوں اور گھروں میں ورد کرتے رہتے ہیں۔ اس میں سو سے زائد پوجن ہیں اور اس کے اردو میں کئی ایڈیشن ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔

جین مذہب کی کئی اہم کتابیں اردو زبان میں موجود ہیں جس میں سے بعض کے نام مع مولف یا مترجم پیش ہیں: آئینہ ہمدردی از پارس داس، اہنسا دھرم از شیو برت لال، جین دھرم از مہرشی شیو برت لال، جین دھرم کے مقدس مقامات از بابو نیمی داس، جین رتن مالا از لالہ کیوڑا مل جی، جین سماج از لالہ دیپ چند جین، جین کرم فلاسفی از بابو کھشپ داس جین، جین قانون از چمپت رائے جین، جین مت سار از لالہ سندر لال جین و سمیر چند جین، حسنِ ازل از پنڈت گیا نیشور پرشاد مائل دہلوی، دھرم اور پرماتما از بابو شبھ داس جین، رازِ حقیقت سوامی درگاہ داس جی، سناتن جین درشن پرکاش از سومنی لال جین، لطفِ روحانی از ماسٹر بشمبر داس، مرقعِ عبارت از بھولا ناتھ جین، موکچ مارگ پرکاشک از پنڈت ٹوڈرمل جین اور جین رتین مالا از لالہ کیوڑا مل جی وغیرہ ہیں۔

بدھ مت کی کتابیں

بدھ مذہب کا شمار، دنیا کے قدیم ترین مذاہب میں ہوتا ہے، یہ مذہب ہندوستان میں پیدا ہوا اور پھر ساری دنیا میں پھیلا۔ گرونانک جی کے صحیفہ کو بدھ مت میں بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہے، اس صحیفہ کے کل تین اجزا ہیں۔ ان میں سے ایک جز ''سوتا پیٹک'' کہلاتا ہے، سوتا پیٹک کا ایک حصہ 'دھم پد' کہلاتا ہے۔ دھم پد میں کل ۲۶ ابواب اور ۴۲۳ اقوال ہیں۔ دھم پد کی اصل زبان پالی ہے۔ اس کا منظوم ترجمہ اردو زبان میں بشیشور پرشاد منور لکھنوی نے کیا اور اس کو انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ نے ۱۹۵۴ء میں شائع کیا تھا۔ 'دھم پد' میں موت وحیات، جرم وسزا، سچ اور جھوٹ، غصہ وسُکھ وغیرہ موضوعات دوہوں یا دو مصرعوں کی شکل میں موجود ہیں۔ دھم پد ''دھرم کا راستہ'' کا ایک اور ترجمہ بشن نارائن نے کیا ہے، جس کو رہبر پریس مرادآباد نے شائع کیا ہے۔

راجندر انجم نے ''جاتک کتھائیں'' کا ترجمہ کیا جس کو پبلی کیشن ڈیویژن، سی جی او کمپلکس، نئی دہلی نے شائع کیا۔ اس کے علاوہ بودھ دھرم کی چند مشہور کتابیں جو اردو زبان میں موجود ہیں وہ دھمپد بھگوان بدھ از چندولال، مہاتما بدھ کی حکایتیں از پال کاروس اور مسعود فاروقی ہیں۔

غرض جس طرح اسلام، ہندومت اور عیسائیت کی کئی اہم مذہبی کتابیں اردو زبان میں موجود ہیں ویسے ہی جین مت، بدھ مت اور سکھوں کی اہم کتابیں اردو زبان میں موجود ہیں اور دراصل یہ اردو ادب کے سرمایہ کی قیمتی متاع ہیں۔

آخر میں نند کشور وکرم کا ایک اہم اقتباس ملاحظہ کریں:

''یونیورسٹیوں میں غیر اسلامی مذہبی ادب سے متعلق تحقیقی کام نہ ہونے کے برابر ہو رہا ہے۔۔۔۔حالانکہ آزادی سے پیشتر ان مذاہب سے متعلق بے شمار کتابیں چھپ رہی تھیں اور کئی رسائل بھی منظر عام پر آ رہے تھے، مگر اب آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بند سا ہوتا جا رہا ہے اور ان مذاہب سے تعلق رکھنے والے حضرات اردو سے نابلد ہوتے جا رہے ہیں۔ نئی نسل کے زیادہ تر طلباء انگریزی اور ہندی کی جانب رجوع کرتے جا رہے ہیں اور اب اردو جسے کبھی گنگا جمنی یا مشترکہ تہذیب کی دین کہا جاتا تھا، آہستہ آہستہ مسلمانوں کی زبان بنتی جا رہی ہے اور اگر یہی صورت حال رہی تو آئندہ دس پندرہ سال جب حصول آزادی سے پہلے پیدا ہونے والی نسل ختم ہو جائے گی تو یہ مکمل طور پر مسلمانوں کی زبان بن کر رہ جائے گی اور صرف کتابوں ہی میں گنگا جمنی یا مشترکہ تہذیب کی حیثیت سے ہی اس کا ذکر ملے گا۔

(عالمی اردو ادب دہلی، دھارمک نمبر، ص: ۸ اور ۹)

❁❁❁

کلیّات

امیر النساء





ترتیب و تدوین

ڈاکٹر ایس۔ محمد یاسر

©حقوق محفوظ

کلّیات امیر النساء

[کلّیات نثر- ناول: افسانے: سفرنامے: مضامین: خطبات]

اے- امیر النساء

ترتیب و تدوین ڈاکٹر ایس-محمد یاسر
صدر شعبہ اردو، سی-عبدالحکیم کالج: میل وشارم (تامل ناڈو)

صفحات: ۵۰۴ | تعداد: ۵۰۰ جلدیں | اشاعت بار اوّل: جنوری ۲۰۲۰ء

قیمت: پانچ سو روپے

زیر اہتمام شعبہ اردو، سی-عبدالحکیم کالج: میل وشارم (تامل ناڈو)

سرورق، تزئین دبستان فاؤنڈیشن: کڈپہ (آندھرا پردیش)

Kulliyath-e-Ameerunnisa

[Collection of Writings in Prose]

A.Ameerunnisa

Edited By:

Dr. S.Mohamed Yassir

HOD, Dept. of Urdu

C.Abdul Hakeem College (Autonomous)

MELVISHARAM-632509 (Tamil Nadu)

e-mail: prof.yassir@gmail.com

Mobile: +91 9994965700

Pages: 504 Copies: 500 First Published: Jan.2020

Price Per Copy: ₹ 500=00

Published By:

Department of Urdu,

C. Abdul Hakeem College (Autonomous)

MELVISHARAM-632509 (Tamil Nadu)

Printed @ Sajitha Book Centre, Chennai-1.

Ph : +91 98409 77758 / 94458 66758

اشاریہ

مقدمہ	پروفیسر قاضی حبیب احمد	08
عرض مرتب	ڈاکٹر محمد یاسر	14

تحسین فکر و فن

ہمشیرہ کے حضور ایک خراج	جناب الحاج 'اے-محمد اشرف	18
امیر النساء کی افسانہ نگاری	پروفیسر سلیمان اطہر جاوید	21
با مقصد انشاء پرداز: محترمہ اے-امیر النساء	مولانا محمد رفیع کلوری عمری	28
امیر النساء کے سفرنامے	ڈاکٹر ایس-محمد مدثر	41
عنبرین: ایک تجزیہ	ڈاکٹر کے-ایچ-کلیم اللہ	49
ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم	مولانا شاکر احسن باقوی	55
محترمہ امیر النساء کی ناول نگاری	ڈاکٹر ابوبکر ابراہیم عمری	61
گفتار و کردار کی غازی: محترمہ امیر النساء	ڈاکٹر شیخ فاروق باشا	64

ناول

ناول : عنبرین [۱۹۸۱]

78

عنبرین

کردار و گفتار کی غازی: محترمہ امیر النساء

ڈاکٹر شیخ فاروق باشا
لکچرر، شعبہ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج: رائے چوٹی (آندھرا پردیش)

خطابت بقول شورش کاشمیری ''عوام سے اجتماعاً ہم کلام ہونے کا نام ہے''۔ خطابت زبان کا اعجاز ہے۔ ترتیب و ترہیب اس کے جوہر ہیں۔ انسان اور خطابت کو ہم رکیب اور ہم عمر کہہ سکتے ہیں۔ روئے زمین پر سب سے پہلے خطیب، انبیاء اور رسول تھے۔

دنیا میں جنھوں نے اپنے افکار و خیالات سے عوام و خواص پر حکمرانی کی، سیاسی، سماجی، معاشی، تعلیمی، مذہبی اور اصلاحی میدانوں میں اپنے گہرے نقوش چھوڑے وہ دنیا کے سب سے بہترین خطیب اور سحر بیاں مقرر تھے۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو خطابت کے میدان میں اہل یونان کو اولیت حاصل ہے۔ ارسطو نے سب سے پہلے خطابت کے اصول و ضوابط متعین کیے۔ اہل یونان کے بعد اہل روم اس میدان میں آگے نظر آتے ہیں، ان کے بعد عربوں کا ذکر آتا ہے۔ عربی زبان نے فن خطابت کو مستحکم کیا۔ عربوں کو اپنی زبان، حافظہ، شاعری اور خطابت پر بے حد ناز تھا۔ خطابت میں اسلوب بیان کی دلکشی اور سحر بیانی کو ملحوظ رکھا جاتا۔ ایجاز و اختصار، روانی اور سلاست، فصاحت و بلاغت سے ان کے خطبات مزین ہوتے۔ اردو خطابت عربی خطابت سے متاثر نظر آتی ہے۔ جوش بیانی، شعلہ نوائی، سحر بیانی، رعنائی و زیبائی، ایجاز و اختصار جیسی سبھی خصوصیات عربی خطابت ہی کا فیض ہیں۔ سائنسی علوم و فنون کے ظہور کے بعد بیسویں صدی میں جرمنی، فرانس، انگلستان، اور امریکہ کے خطباء کو عالمی شہرت نصیب ہوئی۔

ہندوستان میں تحریک آزادی کے پس منظر میں خطابت کے فن نے اپنی جولانیاں بکھیریں۔ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید نے جہاد کے موضوع پر خطاب کر کے لوگوں کو جنگ آزادی میں شریک ہونے کی ترغیب دلائی۔ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء نے اصلاحی،

سماجی، تعلیمی اور مذہبی خطابات کے ذریعہ فن خطابت کو مستحکم کیا۔ تحریک خلافت اور ترک موالات کے دوران اردو خطیبوں نے سارے ہندوستان میں دھوم مچادی۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری جیسی ہستیوں نے اس فن کو ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید بنادیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد میدان خطابت کے شہسوار تھے۔ مذہب، سیاست، ادب ہر موضوع پر ان کا اسلوب منفرد اور انداز بیاں نرالا تھا۔ مواد اور اسلوب دونوں دلکش ہوتے ۔ مولانا محمد علی جوہر، خطابت میں یکتا تھے۔ ان کے تعلق سے مشہور ہے کہ ان کا دل سلگتا اور خون بولتا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں قلم کے دھنی اور زبان کے غنی تھے۔ عطاء اللہ شاہ بخاری بے پناہ عوامی خطیب کی حیثیت سے مشہور تھے۔ ان کے علاوہ اردو زبان کے خطیبوں کی فہرست بہت طویل ہے، ہر ایک کا اپنا ایک الگ انداز اور اسلوب ہے۔ فن خطابت کو معراج پر پہنچانے میں سب کا اپنا اپنا رول رہا ہے۔

تقریر اور خطابت کا فن زندہ معاشرہ میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے ذریعہ ایک معاشرہ کو صالح قدروں پر گامزن کیا جاسکتا ہے۔ ایک اچھا مقرر اور خطیب اپنے خیالات و افکار سے ایک صالح معاشرے کی تشکیل میں نہایت اہم رول ادا کرتا ہے۔ خطابت کے لیے زبان، اظہار اور موضوع تینوں اہمیت کے حامل ہیں۔ مطالعہ اور مشاہدہ خطابت کے لیے سونے پہ سہاگہ ہیں۔

خطابت کے میدان میں مردوں کے مقابلہ میں خواتین کا رول بھی غیر معمولی رہا ہے۔ خصوصا ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کی شرکت نہایت شاندار رہی۔ انہوں نے اپنے خطابات کے ذریعے ہندوستانی خواتین کو جنگ آزادی میں شریک ہونے کی ترغیب دلائی۔ بی اماں والدہ محترمہ مولانا محمد علی جوہر نے تحریک خلافت میں بھرپور حصہ لیا۔ بیگم سلمی تصدق حسین نے ۱۹۳۸ء میں پٹنہ میں مسلم لیگ کے شعبہء خواتین کے قیام کے بعد مسلم خواتین کو مسلم لیگ کی رکن بنانے کی مہم میں بھرپور حصہ لیا۔ لیڈی ہارون نے اصلاح الخواتین کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔ بیگم مولانا محمد علی جوہر امجدی بیگم، آل انڈیا خواتین مسلم لیگ کی سب کمیٹی کی رکن مقرر ہوئیں۔

تاریخ اسلام میں ایسی بے شمار شخصیات پیدا ہوئیں جنہوں نے اپنے بلند کردار ،اخلاص وللّٰہیت ، جہد مسلسل اور علم وعمل سے ایک نئی تاریخ رقم کی۔ انہی شخصیات میں محترمہ امیر النساء کا نام بھی شامل ہے۔ اللہ تعالی نے انہیں بے شمار صلاحیتوں اور لیاقتوں سے نوازا تھا۔ وہ ایک ادیبہ ،شاعرہ، افسانہ نگار ، ناول نگار، خاتون ہونے کے علاوہ ایک بہترین ممتاز اور قادرالکلام متکلمہ اور خطیبہ تھیں ۔خطابت ان کے لیے قدرت کا عطیہ تھی، وہ ہر موضوع پر متاثر کن تقریر کرسکتی تھیں۔

محترمہ امیر النساء ایک باشعور اور اعلی اقدار کی حامل خاتون تھیں ۔وہ ایک صالح معاشرہ کی تشکیل میں تادم آخر سرگرم رہیں ۔امت مسلمہ خصوصا خواتین کی اصلاح اور تعلیمی ترقی کے لیے ہمیشہ فکرمند رہتیں ۔آپ کے خطبات اور تقاریر اس بات کے شاہد ہیں ۔آپ نے تعلیمی ،سائنسی، عصری، اصلاحی اور مذہبی موضوعات پر لب کشائی کر کے امت مسلمہ کو ہر آن بیدار کرنے کی کوشش کی ۔امت کی اصلاح اور تربیت کا شوق اس قدر دل میں موجزن ہوتا کہ مدرسہ، اسکول ،کالج، دینی اجتماعات اور دیگر خواتین کی محفلوں میں کوئی میسر لمحہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں ۔آپ کے خطبات سے خلوص وصفا کے چشمے پھوٹتے ،جن سے سامعین بھرپور سیراب ہوتے۔ قرآن مجید آپ کے خطبات کا اہم موضوع ہوتا۔اس کتاب مبین کو وہ سرچشمہء ہدایت سمجھتی تھیں۔ایک اجلاس میں قرآن مجید کی عظمت وفضیلت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتی ہیں:

> ”قرآن پاک کی عظمت وفضیلت اظہر من الشّمس ہے۔ اگر کوئی ایسی تجارت کرنا چاہتا ہے جسمیں محنت کم اور نفع زیادہ ملے تو یہ قرآن پاک ہے جو ایک حرف پر دس نیکیاں دلاتا ہے اگر آپ کو روشنیوں سے محبت ہے اور کمرے میں تیز روشنی کے بلب روشن کرنا چاہتی ہیں تو قرآن پاک کی نورانیت سے بڑھ کر کوئی روشنی نہیں، اگر آپ کو اونچے مکانات پسند ہیں اور ساتویں منزل پر اپنا مکان بنانا چاہتی ہیں تو قرآن پاک ساتویں ہزار منزل پر پہنچا دیتا ہے۔قرآن پاک کا نزول دنیائے انسانیت پر اللہ رب العالمین کا سب سے بڑا انعام ہے۔

اس انعام پر جتنی بھی خوشیاں منائی جائیں کم ہے۔ اس انعام پر صرف ظاہری خوشی اور زبانی شکر کافی نہیں اسکے شکر کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کتاب ہدایت کو باقاعدہ پڑھا جائے اسے سمجھنے کی کوشش کی جائے اور قرآنی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کی جائے۔ جب انسانیت کی خیر وفلاح کا سرچشمہ بن کر قرآن مجید نازل ہوا تو اسکی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ پاک نے اپنے ذمہ لے لی، یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کی محفوظ ترین کتاب قرآن مجید ہے اور دعوتی کام میں ہی ہماری سربلندی اور عزت ہے۔ اگر یہ فریضہ ہم نے انجام نہیں دیا تو ہمیں پستی اور تنزلی سے کوئی بھی چیز عروج واقبال کی تک نہیں پہنچا سکتی''

محترمہ نے قرآن مجید کا مطالعہ بہت ہی تدبر وتفکر کے ساتھ کیا ہے۔ قرآن اور سائنس کے تعلق سے آپ کے افکار اس بات ضامن ہیں۔ آج ہمارے معاشرے میں قرآن مجید کا وجود محض برکت کا باعث ہو چکا، اسے کتاب برکت اور ثواب دارین کے لیے پڑھا جاتا ہے حالانکہ وہ کتاب ہدایت اور اوراق حیات کو مزین کرنے کا ذریعہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار محترمہ نے بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ قرآن کے سائنسی انکشافات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتی ہیں:

''قرآنِ پاک کا نزول اس لیے کیا گیا کہ اس سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ آج ہماری قوم اسی لئے ذلت وپستی سے دو چار ہے کہ ہم نے قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کی کوشش نہیں کی ورنہ قرآنِ مجید میں حیاتِ انسانی کا کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا گیا کہ جس سے ہمیں روشنی نہ ملتی ہو۔ آج ہم اسی لئے دنیا میں خوار ہو رہے ہیں ورنہ ساری دنیا پر ہماری حکمرانی ہوتی آج سائنسی انکشافات قرآنی آیات کے حقائق کو واضح کر رہی ہیں۔ سائنسدان جب کسی بات کو لے کر ریسرچ کرتے ہیں تو یہ کتاب مبین انہیں کائنات کے اسرار

رموز سمجھنے اور سائنٹیفک انداز میں اس پر غور تدبر کی دعوت دیتی ہے۔
اوٹاوا کے فرانسیسی پروفیسر اور سرجن ڈاکٹر مورس بوکائلے کا تو دعوی
ہے کہ تخلیق کائنات کے بارے میں آج جتنے بھی قابل فہم نظریات
دنیا میں رائج ہیں وہ سب قرآن حکیم کے بیان کئے ہوئے نظریہ کے
عین مطابق ہیں اور قرآن پاک میں تسخیر کائنات، قدرتی تغیرات
اور آسمانی مخلوق یعنی فرشتوں کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے،
جدید سائنسی تحقیق اسے تسلیم کرتی ہے"

محترمہ نے اپنے خطبات میں مسلمان قوم کو سائنس اور علم طب کی تعلیم سے آراستہ ہونے پر زور دیا ہے کیونکہ آج وہی قوم ترقی کی راہ پر گامزن ہے جو سائنس کے میدان میں اپنے آپ کو ثابت کر پاتی ہے۔ محترمہ، سرسید احمد خاں کے خیالات سے متاثر نظر آتی ہیں۔ سرسید کی طرح انہوں نے اسلامی و عصری تعلیم پر کافی زور دیا ہے۔ کئی ایک تقریروں میں طالبات کو اعلیٰ تعلیم پر ابھارا ہے۔ وہ اپنی طالبات کو اعلیٰ درجہ کی تاجرہ، عالمہ و فاضلہ، وکیل و جج، ڈاکٹر اور بینک کے اعلی عہدوں پر فائز کرنا چاہتی ہیں۔ اس کا اظہار کئی خطبات میں انہوں نے کیا ہے۔

دور حاضر میں اولاد کی تربیت کا مسئلہ بہت ہی نازک اور سنگین صورت حال سے دو چار ہے۔ والدین تن آسانی کا شکار ہوتے جارہے ہیں۔ وقت کی کمی، ذاتی مصروفیتوں اور اپنے پسندیدہ مشاغل میں اس قدر مگن ہیں کہ اولاد آہستہ آہستہ ان کی گرفت اور تربیت سے آزاد ہوتی جارہی ہے۔ موبائیل فون کے خطرناک عواقب و نتائج سے غافل ہوکر والدین اپنے کاموں میں مصروف و مشغول ہیں۔ محترمہ امیر النساء نے اپنے خطبات میں بڑے شد و مد کے ساتھ اولاد کی تربیت اور بچوں پر موبائیل فون کے خطرناک اثرات کے تعلق سے اظہار خیال کیا ہے۔ ایک تقریر میں کہتی ہیں:

"بچوں کے معصوم ذہن کی اسکرین پر سب سے پہلے لا الہ الا اللہ
محمد رسول اللہ کا کلمہ ثبت کریں۔ ماں کی گود بچوں کے لئے سب سے
پہلا مدرسہ ہوتی ہے۔ چار سال کی عمر تک بچے ماں کے زیر تربیت
ہوتے ہیں۔ قدم قدم پر شیطانی طاقتیں بچوں کو بہکانے کے لئے

برسرپیکار ہیں۔ ٹی وی کی صورت میں، انٹرنٹ کی شکل میں اور موبائل فون کے چھوٹے اسکرین پر بھی۔ اس آزمائشی دور میں بچوں کی صحیح تربیت کی ساری ذمہ داری ماں کے نازک کندھوں پر ہوتی ہے''

ایک اور مقام پر موبائیل فون کے تعلق سے کہتی ہیں:

''والدین کی یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ گھر سے ہی صحیح تربیت کا آغاز کریں، انہیں موبائل سے دور رکھیں۔ یہ ایک ایسا خطرناک آلہ ہے کہ اس سے بچوں کے اخلاق و کردار بہت جلد متاثر ہوتے ہیں۔ آج کل مائیں اپنے بچوں سے محبت یا ان کی مانگ کی خاطر بچوں کے ہاتھ میں موبائل تھما دیتی ہیں کہ بچہ کارٹون وغیرہ سے دل بہلائے اور انہیں کچھ دیر کیلئے فراغت مل جائے حالانکہ یہ کارٹون یہودی اور نصرانیوں کی سازش ہیں۔ اس کے ذریعہ وہ بچوں کی معصومیت چھین کر انہیں تشدد اور تخریب کاری کی تعلیم دیتے ہیں۔ جس قدر ممکن ہو، بچوں کو موبائل سے دور رکھیں۔ بچوں کے غیر ضروری مطالبات پورے نہ کریں۔ انہیں فضول خرچی کی عادت ہرگز نہ ڈالیں۔ بچوں کے سامنے کبھی جھوٹ نہ بولیں۔ اساتذہ اور بزرگوں کا ادب کرنا سکھائیں۔ انہیں نماز کا عادی بنائیں۔ سلیقہ مندی اور آداب سکھائیں۔ اولاد کی شکل میں آپ کے لئے اللہ پاک کا بہت بڑا تحفہ ہیں۔ ان کی صحیح تعلیم و تربیت ہی والدین کی دنیا اور آخرت میں کامیابی ہے''

خاتون ہونے کی حیثیت سے محترمہ امیر النساء نے محسوس کیا کہ اسلام میں عورت کو جو مقام اور مرتبہ دیا گیا ہے وہ نہایت ہی منصفانہ ہے وہ سارے حقوق انہیں دیے گئے ہیں جن سے دنیا کے دیگر موجودہ مذاہب نے آنکھ چرائی ہے:

''ہمیں فخر ہے کہ اسلام ہمارا مذہب ہے۔ آج ہمارے ملک کی

صورتِ حال یہ ہے کہ موجودہ حکومت تعصب اور تنگ نظری کی عینک لگا کر اسلام کے خلاف کوئی نہ کوئی ایسا مسئلہ چھیڑ دیتی ہے جس کی وجہ سے مسلمان اپنے مذہب سے بیزار ہو کر لادینیت اختیار کر لیں یا ان کے دلوں میں اسلام سے نفرت پیدا ہو۔ ہمارے حکمرانوں کو مسلم خواتین سے خواہ مخواہ کی ہمدردی پیدا ہو رہی ہے کہ اسلامی قوانین عورتوں کے حقوق پامال کر رہے ہیں اور ان پر ظلم ہو رہا ہے حالانکہ جن لوگوں کو مسلم خواتین کی ہمدردی کا بخار چڑھا ہے، دراصل خود ان کے مذہب میں ستی کی رسم عام تھی، بیوہ عورت کو جینے کا کوئی حق نہیں تھا۔ آج بھی ڈاوری اور جہیز کے نام پر نئی دلہنوں کا قتل کر دیا جاتا ہے اور ماں کی کوکھ میں ہی لڑکیوں کو مار دیا جاتا ہے۔ لڑکیاں والدین کے لئے بوجھ سمجھی جاتی ہیں۔ صرف اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس نے عورتوں کو مساوی حقوق دئے، بیوہ اور مطلقہ عورت کے نکاح ثانی کو مستحسن قرار دیا، ماں کے پیروں تلے جنت بتائی، انہیں وراثت میں حقوق دینے کی تاکید کی۔ مسلم خواتین کو اسلام نے وہ تمام حقوق عطا کئے ہیں جو کسی مذہب نے نہ پہلے دئے اور نہ آج دے رہے ہیں''

اسلام میں حسن سلوک کی بڑی اہمیت ہے اس کے نورانی پہلو پر ایک تقریر میں اظہار خیال کیا ہے۔ انداز تخاطب، روانی اور سلاست سے معمور ہے:

''حسنِ سلوک یہ نہیں کہ کسی نے ہم سے اچھا برتاؤ کیا جواب میں ہم بھی اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں بلکہ حسنِ سلوک یہ ہے کہ کوئی ہم سے غلط سلوک کرے ہم اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ کوئی ہمیں محروم کرے تو ہم اسے عطا کریں۔ کوئی ہمیں برا بھلا کہے تو ہم اسے معاف کریں۔ بزرگوں کی تعظیم کریں، ان کی خدمت

بجالائیں، وہ والدین ہوں یا ساس سسر یا جن کی خدمت کا اللہ پاک نے ہمیں موقع عطا کیا ہے۔ چاہے وہ ہمارے رشتے دار ہوں یا نہ ہوں ۔بچوں کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں۔ جو ہمارے ماتحت ہوں ہمارے اپنے نوکر چاکر وغیرہ، ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں۔ نبی اکرمؐ کی یہی سنت ہے کہ وہ نوکروں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالتے تھے۔آج ہمارا کیا حال ہے؟ ہزار دو ہزار کی رقم دے کر گویا انہیں زرخرید غلام سمجھ لیتے ہیں۔ان پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کو اللہ پاک نے مکارم اخلاق بنا کر بھیجا، یعنی اچھے اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا تھا ۔آپؐ مسلمانوں کے لئے بھی رحمت تھے اور غیر مسلموں کے لئے بھی رحمت تھے ،دوستوں کے لئے بھی رحمت تھے اور دشمنوں کے لئے بھی رحمت تھے۔ بچوں اور بوڑھوں کے لئے بھی سراپا رحمت تھے۔کمزوروں اور طاقتوروں کے لئے یکساں رحمت تھے۔ امیروں کے لئے بھی رحمت اور غریبوں کے لئے بھی رحمت تھے۔ حاکموں اور محکوموں کے لئے بھی رحمت تھے۔ آپ کی رحمت بے زبان جانوروں اور درختوں کے لئے بھی یکساں تھی۔ایسے ہی اخلاق کی تعلیم آپؐ نے اپنی امت کو دی تھی۔آپؐ نے فرمایا کہ تم اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپس میں رحمت کا مظاہرہ نہ کرلو۔رحمت کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ پوری انسانیت کو جہنم کی آگ سے بچانے کی فکر کریں۔ رسول رحمتؐ کے امتی ہونے کا تقاضہ ہے کہ ہم اللہ کے بندوں تک اللہ کا دین پہنچائیں تبھی ہم رحمۃ للعالمینؐ کے امتی ہونے کا حق ادا کرسکیں گے‘‘

محترمہ امیر النساء مسلم پرسنل لاء بورڈ کی ممبر تھیں۔عام خواتین کی بہ نسبت وہ حالات حاضرہ سے

زیادہ باخبر تھیں۔ عالمی اور ملکی حالات سے باخبر کرتے ہوئے ایک تقریر میں کہتی ہیں:

''تم نے مادی وسائل کا غلط استعمال کیا۔ دنیا کو سمیٹ کر گاؤں کی شکل دے دی، فاصلے سمٹ گئے، امن وسلامتی داؤں پر لگ گئی۔ عالمی خبریں ہمیں باخبر کر رہی ہیں۔ تیونس اور مصر کے انقلاب میں آہنی حکمرانوں کے تخت وتاج موم کی طرح پگھل کر بہہ گئے۔ اردن لیبیا، یمن، بحرین اور الجزائر میں عوامی مظاہرے غلط قیادت کی صحیح رہنمائی کی پیش رفت ثابت ہو رہے ہیں۔ طاقت کا غلط استعمال حکمرانوں سے سلطنتیں چھین کر اوروں کو سونپ رہا ہے۔ ہم اپنی عظمتوں کا سودا ذلت کے ہاتھوں کروا رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا انقلاب ہے جو قدرت کی طرف سے ہماری کوتاہیوں پر برپا کیا جا رہا ہے۔

مغرب کی اندھی تقلید ہم سے خراج مانگ رہی ہے:

ہماری ٹھوکروں میں آج بھی ہوتی شہنشاہی
اگر ہم نے چٹائی پر گذارا کرلیا ہوتا''

ان خیالات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ایک ایک لفظ صحیح ثابت ہو رہا ہے۔ ہم اپنی کوتاہی اور غلط قیادت کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ آج نئی نسل جس تیزی سے اسلامی تہذیب وتمدن سے انحراف کر رہی ہے اس کی حفاظت بے حد مشکل نظر آتی معلوم ہوتی ہے۔ مادی وسائل کی فراوانی نے رشتوں اور قرابت داری کے مضبوط بندھن کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔ اولاد کا والدین سے تعلق کمزور سے کمزور ہوتا جا رہا ہے محترمہ کا خیال ہے کہ یہ سب بڑوں کی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ ایک اجلاس میں ان خیالات کو بے حد متاثر کن انداز میں پیش کیا ہے:

''مادی آسائشوں نے بچوں کو روبوٹ بنا دیا۔ ان کے اندر جذبات سے عاری مشینی انداز آ گئے محبت مروت ایثار وقربانی سے یکسر خالی۔ خودغرضی بے مروتی دشمنی اور نفرت کے جذبات ان کے اندر پنپنے لگے۔ اخلاقی تباہی نے ان کے کردار کو مسخ کر دیا۔ اگر ہم بچوں کو

مادی وسائل فراہم کرنے کے بجائے اپنے وقت کو فارغ کر کے اپنے عظیم رہنماؤں کے بے مثال تاریخی واقعات سے ان کی کردار سازی کرتے۔ سادگی کا درس دیتے اور غیروں کی تہذیب وتمدن سے کاٹ کر اپنی تہذیب وتمدن سے جوڑتے تو یہ عارضی دنیا دوسروں کے لئے ایک موڈل بن جاتی اور ہماری نسل دوسروں کے لئے آئیڈیل بن جاتی۔ آج ہم اپنی کوتاہیوں کی قیمت اس طرح چکا رہے ہیں کہ نوجوانوں پر ضعیف اور لاچار والدین، جن کے قویٰ مضمحل ہو چکے ہیں، ان کے لئے بوجھ بن چکے ہیں۔ ہماری خدمت اور دیکھ بھال کے لئے ان کے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔ ہم نے انھیں بے بی کیر سنٹروں کے حوالہ کیا، وہ ہمیں اولڈ ایج ہوم میں منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری ساری توانائی زائل ہو چکی ہے، سماعت اور بصارت متاثر ہے۔ ساری قوت زبان نے حاصل کر لی ہے۔ ہم اپنے سکھ دکھ بچوں سے شیر کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی تنہائیوں کے فسانے، اپنی مجبوریوں کی داستانیں، اپنی بیماریوں کی کہانیاں سنا کر اپنا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے ہیں مگر افسوس کہ ہماری بے معنی باتیں سننے کے لئے ان کے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔ انہیں اس ماحول سے گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ وہ جلد سے جلد ہم سے پیچھا چھڑا کر گھر کی بوجھل فضا سے دور آزادی کی فضا میں سانس لینا چاہتے ہیں۔ یہ ہماری کوتاہیوں کی قیمت ہے جو سود کے ساتھ وصول ہو رہی ہے''

محترمہ نے اپنی تقریروں اور خطبات میں خواتین کو بے حد شائستہ اور نرم و نازک لب ولہجہ میں نصیحت کی ہے۔ اسلامی اخوت ومودت کا درس دیا ہے، مشہور صحابیات کی زندگیوں کے روشن پہلوؤں کو بطور نمونہ پیش کر کے نصیحت کی ہے اگر ہماری خواتین ان باتوں پر عمل پیرا ہوں تو ان کی زندگیاں گل وگلزار بن جائیں۔ ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہتی ہیں:

"اگر آپ کو رول موڈل بنانا ہے اور پسندیدہ شخصیات کے نقش قدم پر چلنا ہے تو صحابیاتؓ کو اپنا نمونہ بناؤ۔ بی بی خدیجہؓ نہ صرف تاجر خاتون تھیں بلکہ عرب کی سب سے مالدار خاتون تھیں۔ نبی اکرم ﷺ کی زوجیت میں آنے کے بعد آپ نے سادگی کو اپنا شعار بنایا۔ بیش قیمت لباس نہیں پہنے، وہ چاہتیں تو اپنے لئے بہترین ملبوسات اور بیش قیمت زیورات خرید تیں۔ مگر آپؓ نے خود کو ان فضولیات سے دور رکھا۔ بوقت وفات انہیں نئی چادر تو درکنار دھلا ہوا لباس تک میسر نہیں۔ انہیں غسل کے بعد وہی ملگجے کپڑوں میں دفنا دیا گیا جو وہ پہلے سے پہنے ہوئے تھیں۔ ان کی عظمت ان کے کردار سے جھلکتی تھی۔ بہترین لباس ان کے نزدیک تقویٰ تھا۔ آج ہمارا کیا حال ہے؟ اپنی حیثیت سے زیادہ بیش قیمت لباس خریدتی ہیں۔ شادی سے پہلے والدین پر بوجھ ڈالتی ہیں اور شادی کے بعد شوہر پر بوجھ بنتی ہیں۔ سادگی کو اپنا شعار بناؤ! خوش اخلاقی کے زیور سے خود کو سجاؤ! لڑکی کی خوبصورتی اس کے لباس وزیورات سے نہیں، اسکے بہترین کردار سے ہوتی ہے۔ والدین کی بے لوث خدمت، اساتذہ کا احترام، شوہر اور اس کے گھر والوں کی بہترین اطاعت ہی اس کا حسن ہے۔ شادی کے بعد بچوں کی بہترین تربیت، سسرال والوں کے ساتھ اس کا حسن سلوک ہی عورت کا سنگھار ہے۔ پیاری طالبات! اللہ پاک کا شکر ہے کہ ہمیں اسلام جیسا بہترین مذہب ملا جہاں عورت کو مساوی حقوق دیئے گئے۔ عورت مردوں کے برابر تعلیم حاصل کرسکتی ہے۔ وقت ضرورت اپنے خاندان کی کفالت بھی کرسکتی ہے۔ مذہب اسلام کے دائرے میں رہ کر وہ سارے حقوق حاصل کرسکتی ہے جو مردوں کو دیئے گئے ہیں مگر پردے کی پابندی

کے ساتھ۔ اکثر عورتیں سمجھتی ہیں کہ پردہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے اور ترقی اسی وقت ممکن ہے جب ہم پردے کی قید سے آزاد ہو جائیں۔ یہ ہماری بھول ہے۔ ہر میدان ہمارے لئے کھلا ہے بس ہمارے اندر صلاحیت ہونی چاہئے۔ آپ جانتی ہیں کہ ازواج مطہراتؓ نے پردے کے احکامات نازل ہونے کے بعد بھی کیسے کیسے کارنامے انجام دئے ہیں جو رہتی دنیا تک ہمارے لئے نمونہ ہیں''

دور حاضر میں فیشن پرستی اور مغرب پرستی کی وباء ہماری نوجوان نسل میں بڑھتی جارہی ہے جس کا نتیجہ ہے کہ بے حیائی اور بے شرمی کی فضا عام ہورہی ہے۔ ایک اجلاس میں صفت حیا کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کرتے ہوئے محترمہ کہتی ہیں:

''جب بھی شیطان کسی سماج کو تباہ کرنا چاہتا ہے، وہ سب سے پہلا وار عورت کی صفت حیا پر کرتا ہے۔ اس نے سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام اور بی بی حوا علیہا السلام کو اس جال میں پھنسایا تھا اور آج بھی اس کا سب سے پسندیدہ ہتھیار ہے اور اس فتنے میں الجھ کر کتنے ہی گھر برباد ہو چکے ہیں۔ اگر عورت سے حیا کی صفت ختم ہو جائے تو معاشرہ حیوانیت کا شکار ہو کر نسلوں میں بگاڑ کا سبب بن جاتا ہے۔ مغربی عورتوں کی بے راہ روی اور آزادی کو انہوں نے ایسے انداز میں پیش کیا کہ مسلمان عورتیں شرعی قوانین کو بوجھ سمجھ کر پردے کی قید سے آزاد ہو گئیں اور کبھی عورت کی آواز گھر سے باہر نہیں پہنچتی تھی اور آج پارلیمنٹ کے ایوانوں، کمرۂ عدالت کی بلند و بالا عمارتوں، غلط و صحیح ہر جگہ سے اس کی آواز گونج رہی ہے۔ اسلام نے عورتوں کے حدود متعین کئے انہیں عزت و حرمت کے اونچے مسند پر بٹھایا۔ مگر مغربی دنیا کی آندھی نے ان حدود کو پامال کر ڈالا کیونکہ آج دنیا کی سرپرستی ان قوموں کے ہاتھوں میں پہنچ

گئی ہے جنہیں اسلام سے کوئی نسبت نہیں۔ ملالہ یوسف زئی کا نام آپ سب نے سنا ہے اور یہ بھی جانتی ہیں کہ دشمنوں نے اسے کیسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور وہ ان کے ہاتھوں کا کھلونا بنی ہوئی اوروں کو رجھانے کیلئے اسے ایوارڈ سے نوازا جارہا ہے۔ ہماری ناسمجھی ہے کہ اس کی ظاہری شہرت سے ہم خوش ہورہی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہماری قوم کی بیٹیوں کو ہمارے ہی خلاف استعمال کررہے ہیں، فلسطینی عوام نے اسکولوں کے لئے ملالہ کے فنڈ کو مسترد کردیا۔ ہم خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ مسلمان عورتیں ترقی کی راہ پر گامزن ہیں''

محترمہ امیر النساء کو اس بات کا شدید خیال تھا کہ وہ ایک موثر یا سلجھی ہوئی خطیب نہیں ہیں حالانکہ آپ کا انداز اور اسلوب بے حد سلجھا ہوا اور شائستہ ہوتا، باوجود اس کے کہ الفاظ میں بجلی کی کڑک، نہ آواز میں گھن گرج، خوشنما الفاظ اور نہ دلفریب جملے، پھر بھی دل سے نکلے ہوئے الفاظ دلوں کو صدا دیتے تھے۔ سامعین اور حاضرین کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ محترمہ امیر النساء آج کی خواتین کے لیے مثالی نمونہ ہیں۔ وہ ایک اسلام پسند خاتون تھیں، دینداری اور وضع داری ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اعلی تہذیب وتمدن کی حامل تھیں۔ وسائل کی کمی کے باوجود دعوتی، اصلاحی اور تعلیمی میدان میں انہوں نے جو کارنامے انجام دیے وہ زرین حروف سے لکھنے کے قابل ہیں۔ ہماری خواتین کو چاہیے کہ وہ بھی محترمہ کی طرح آگے آئیں دوسروں کے لیے صحیح رہنمائی اور رہبری کا فریضہ انجام دیں۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ الیکٹرانک اور سوشیل میڈیا کے اس دور میں خواتین بھی بڑی تعداد میں تحریر اور خطابت کے میدان میں آگے آرہی ہیں۔

شیخ فاروق باشا

Books and Chapters in edited Volumes / Books published, and papers in National/International Conference Proceedings

1. A chapter entitled „Protective Role Of Curcuma Longa Extract Supplementation In Stz Induced Diabetic Rats‟ for the book entitled "Biodiversity Assessment: Tool for Conservation" 2017 edited by R. Lakshmidevi, Obaiah Jamakala, S. Mannur Ismail, B. Sujatha and M. Bhaskar*, Bhumi Publishing, Kolhapur, Maharashtra, India. ISBN: 978-81-931247-3-4

2. A chapter entitled „Biodiversity For Sustainable Livelihood" for the book entitled "Biodiversity Assessment: Tool for Conservation" 2017 edited by M. Bhaskar*, B. Sujatha, S. M. Ismail and J. Obaiah, Bhumi Publishing, Bhumi Publishing, Kolhapur, Maharashtra, India. ISBN: 978-81-931247-3-4

3. A chapter entitled „Holistic Approach Towards Herbal Medicine And Their Impact On Health Ailments‟ for the book entitled "Floral and Faunal Wealth of India" 2019 edited by Bhaskar Matcha, B. Sujatha, Ch. Vivek, M. Reddy Sri and W. M. S. Jhonson, **Bhumi Publishing, Bhumi Publishing, Kolhapur, Maharashtra, India.**
ISBN: 978-81-931247-8-9

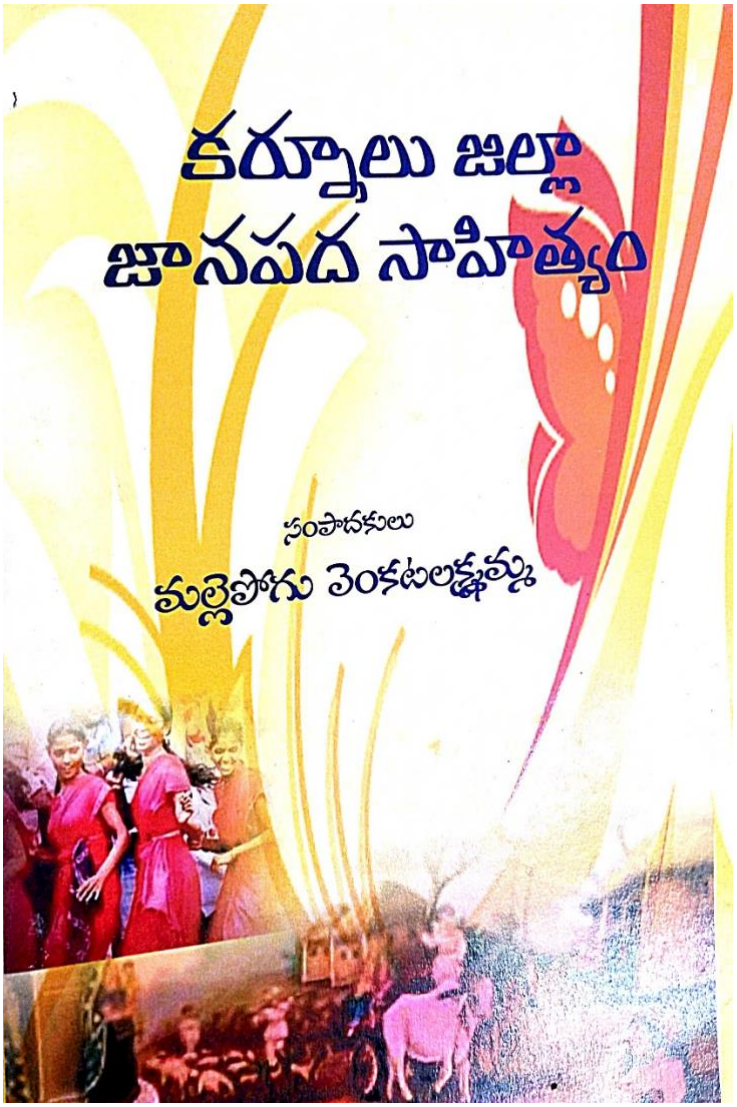
4. A chapter entitled‟ Prejudice Towards One Gender Is Imbalance To The Society‟ for the book entitled "International Terrorism And Women trafficking-challenges and policy options" 2019 edited by B.Sujatha, S.Parvathi, S.Lalitha, G.siromani. ISBN:978-81- 939248-7-7

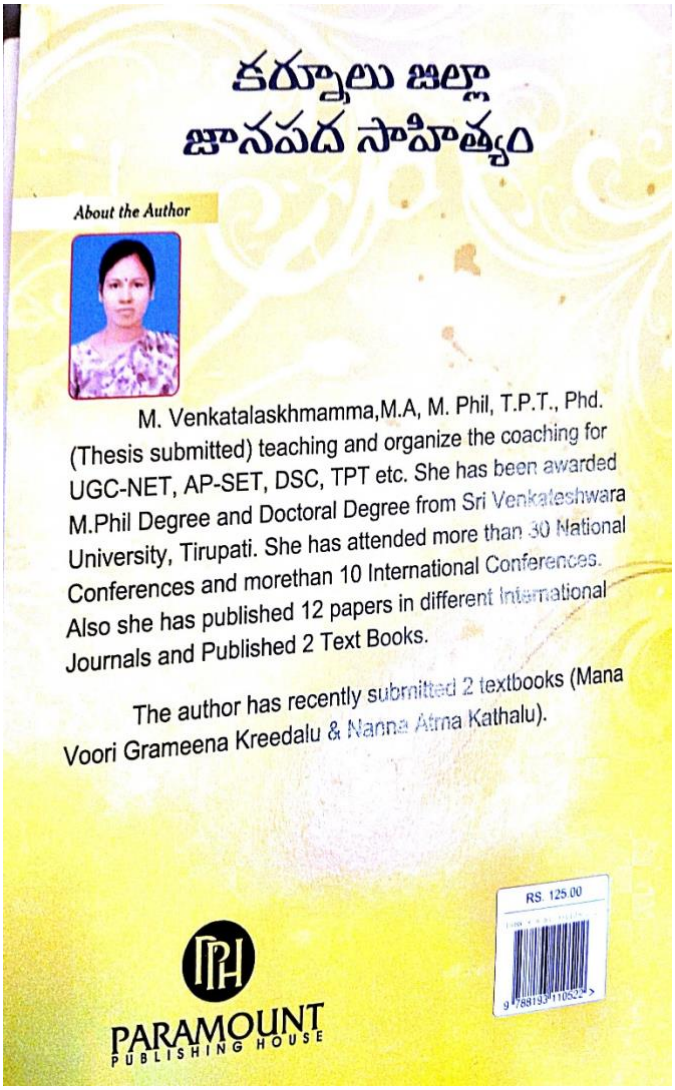
5. A chapter entitled „Comprehensive Study On PearlFarming And Economic Viability‟ for the book entitled "Limnology" 2020 edited by B. Sujatha, S. Payani, Ch. Vivek, G. Bupesh and M. Bhaskar, Bhumi Publishing, Bhumi Publishing, Kolhapur, Maharashtra, India. ISBN:978-93-88901-01-7

6. A chapter Entitled‟ Aquatic Life And Pesticide Residues:With Special Emphasis On Fate And Behaviour Of Aquatic Organisms‟ for the bookentitled "Limnology" 2020 edited by Ch. Vivek, G. Bupesh, B. Srikant,S. Payani, B. Sujatha and M. Bhaskar, Bhumi Publishing, Bhumi Publishing, Kolhapur, Maharashtra, India. ISBN:978-93-88901-01-7

ముద్రితమైన పుస్తకాలు :

1.కర్నూలు జిల్లా జానపద సాహిత్యం – సంకలనం – 2016- పారామౌంట్ పబ్లిషింగ్ హౌస్ -ఐ. యస్. బి. యన్.nember-978-81-931105-02.2.





మల్లేవారి కథలు – కథా సంకలనం -2017

మల్లెల వారి కథలు

(కథాసంపుటి)

రచయిత : మల్లెపోగు వెంకటలక్ష్మమ్మ (మద్దూరు)

యం.ఎ., యం.ఫిల్., పి.హెచ్.డి.

తెలుగు సాహితి పరిశోధకులు

శ్రీ వెంకటేశ్వర విశ్వవిద్యాలయము

తిరుపతి

దేశభాషలయందు తెలుగులెస్స

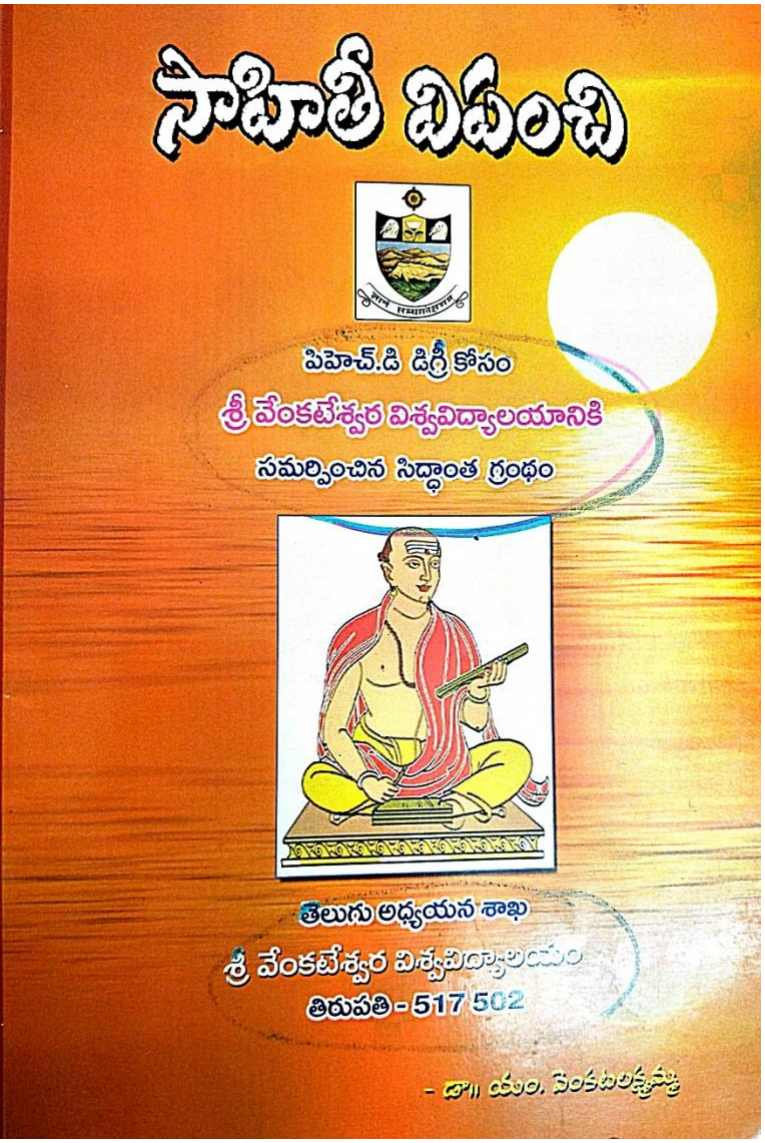


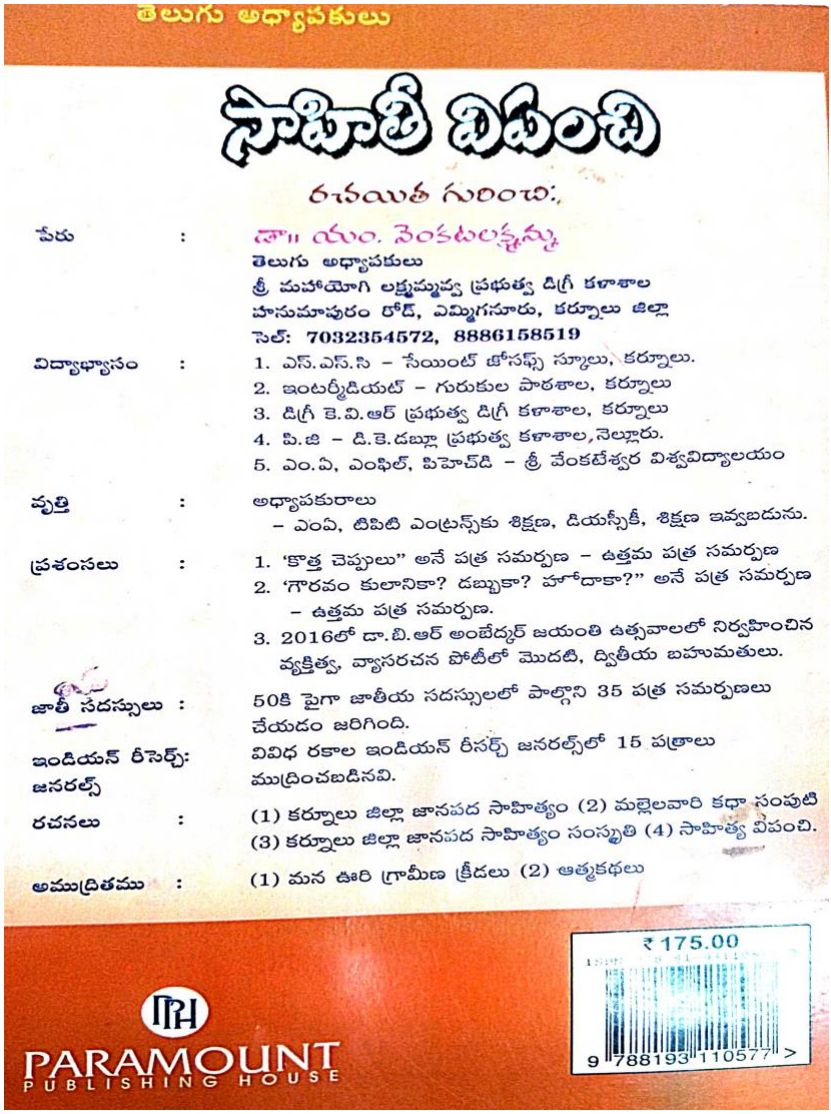
మల్లెపోగు వెంకటలక్ష్మమ్మ

కర్నూలు

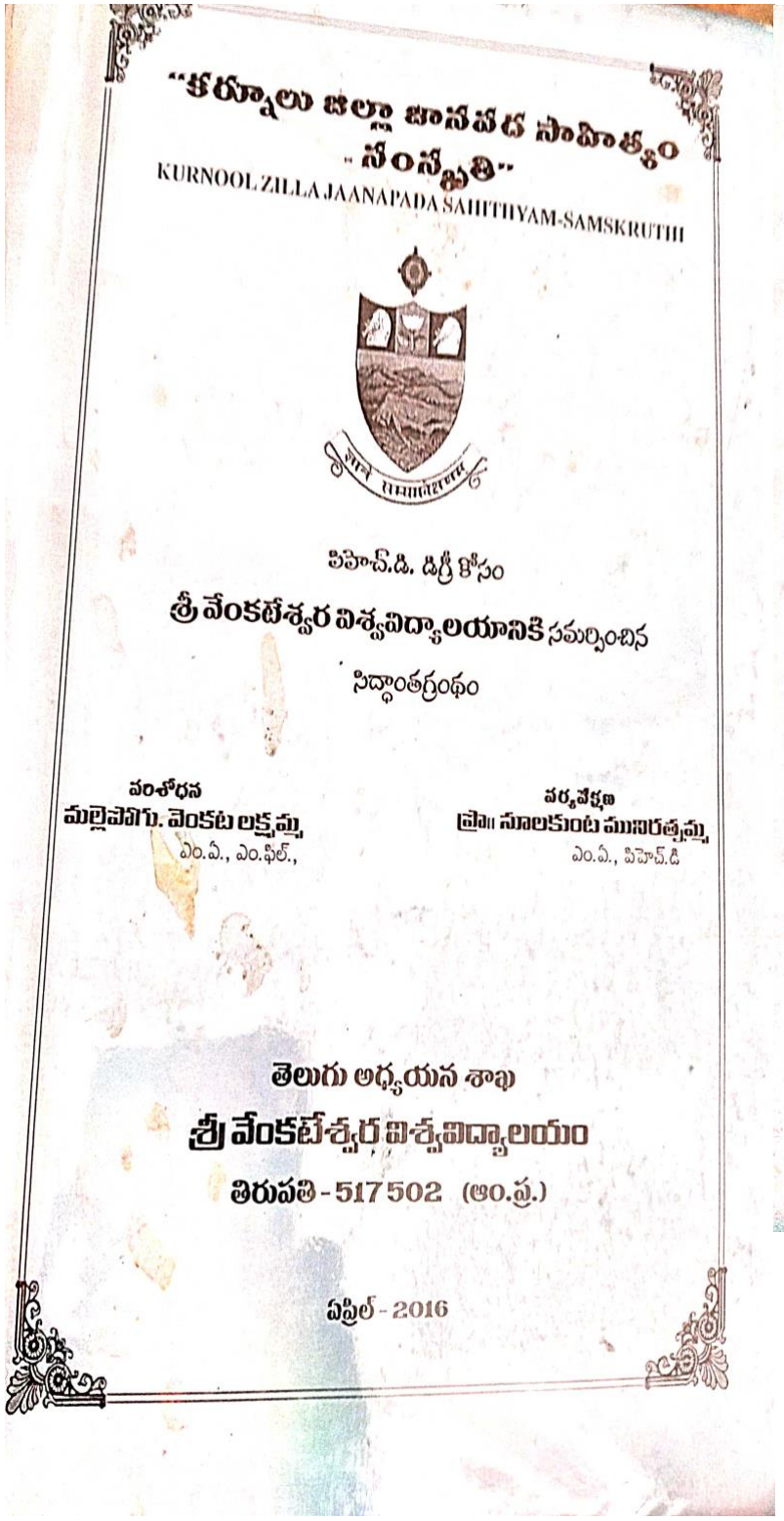
సాహితీ విపంచి -2019

పారామౌంట్ పబ్లిషింగ్ హౌస్ – ఐ. యస్. బి. యన్. నెంబర్ -97881-93-1100577





కర్నూలు జిల్లా జానపద సాహిత్యం సంస్కృతి – ఐ. యస్. బి. యన్. నెంబర్ -9788193110560 (2019)



"కర్నూలు జిల్లా జానపద సాహిత్యం
- సంస్కృతి -"

KURNOOL ZILLA JAANAPADA SAHITHYAM-SAMSKRUTHI

పిహెచ్.డి. డిగ్రీ కోసం

శ్రీ వేంకటేశ్వర విశ్వవిద్యాలయానికి సమర్పించిన

సిద్ధాంతగ్రంథం

పరిశోధన

మల్లెపోగు. వెంకట లక్ష్మమ్మ

ఎం.ఏ., ఎం.ఫిల్.,

పర్యవేక్షణ

ప్రొ॥ సూలకుంట మునిరత్నమ్మ

ఎం.ఏ., పిహెచ్.డి

తెలుగు అధ్యయన శాఖ

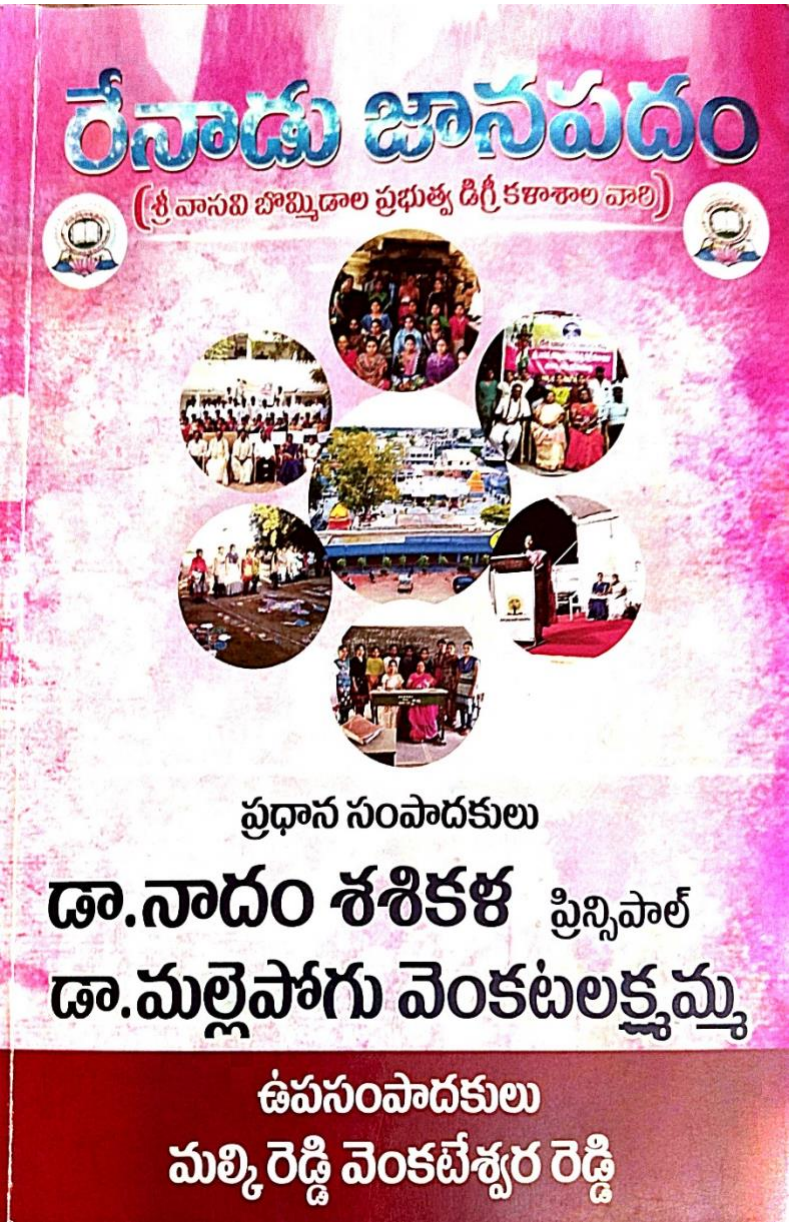
శ్రీ వేంకటేశ్వర విశ్వవిద్యాలయం

తిరుపతి - 517 502 (ఆం.ప్ర.)

ఏప్రిల్ - 2016

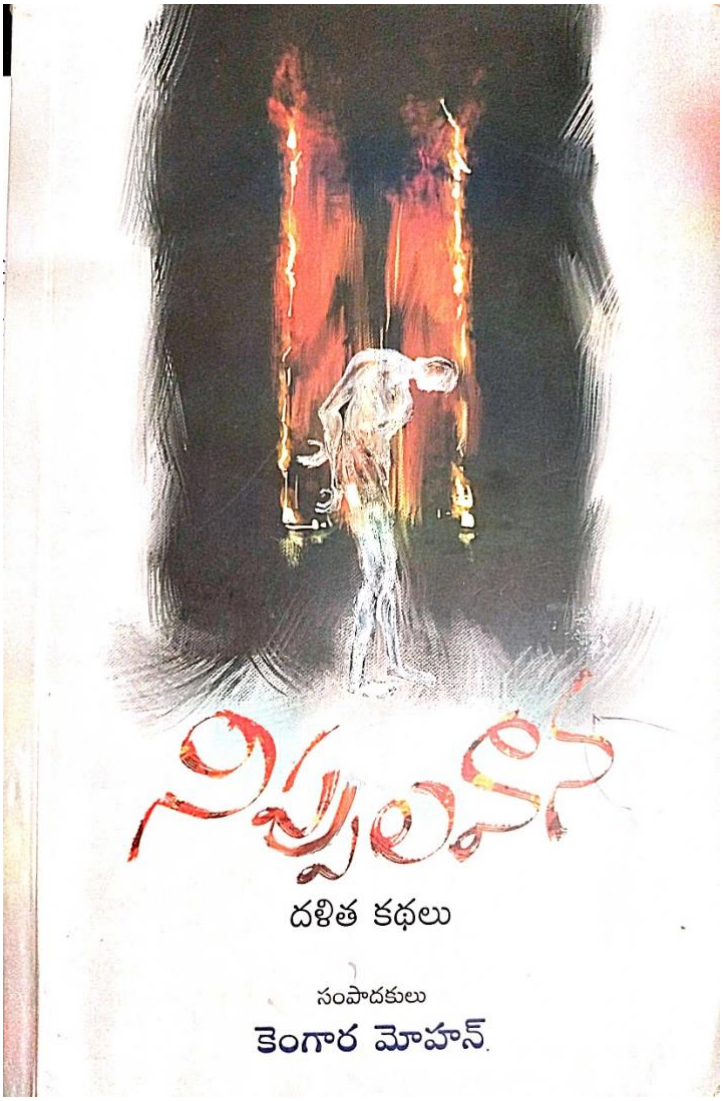
రేనాడు జానపదం - (2020)

పారామౌంట్ పబ్లిషింగ్ హౌస్ ఐ. యస్. బి. యన్. నెంబర్ -9789388808-15-6





నిప్పుల వాన దళితకథా సంకలనం – ఒక చాప్టర్ – కైమా కథ – సంపాదకులు – కెంగార మోహన్.2021.



NIPPULA VAANA *dalit stories*

ఈ నిప్పులవాన కథా సంకలనం కథలన్నీ వస్తు ప్రాధాన్యత కల్గిన కథలు. భారతీయ సమాజంలో పాతుకుపోయి ఉన్న సామాజిక వివక్షత, అంటరానితనం, వృత్తి నిర్బంధం, విలువలేనితనం వీటిచుట్టూనే మొత్తం కథలన్నీ సంచరించాయని చెప్పాలి. వివక్షలో నలిగిపోయే బతుకు దృశ్యాలను చిత్రించడానికే కథకులందరూ ప్రయత్నించారు. 'నడిమింటి బోడెక్క బసివిరాలయ్యేద' కథ తెలుగు సాహిత్యంలో ప్రసిద్ధి చెందింది. మాదిగ బోడెక్క బసివిరాలిని ఇచ్చే ఉత్సవంలో వారి వాళ్ళు దుర్మార్గాన్ని కళ్ళకుకట్టే కథ కుల సాంస్కృతిక విధ్వంసాన్ని చిత్రించిన కథతో ఈ సంకలనాన్ని ప్రారంభిస్తున్నారు.

- జి.వెంకటకృష్ణ

మా జీవితాలపై కురుస్తున్నది మాత్రం నిప్పులవాన. ఇప్పటికీ తప్పని అవమానాలు. కులం పేరు చెబితే ఇళ్ళు కూడా అద్దెకివ్వడం లేని సమాజంలో బతుకుతున్నాం. ఎన్ని చట్టాలొచ్చినా మార్పు సాధ్యం కాని, మార్పు రాని సమాజంలో బతుకుతున్నాం. ఆర్థిక అసమానతలు పోతే సమసమాజం వస్తుందన్న నమ్మకం క్రమేపి తగ్గిపోతుంది. వాటికంటే ముందు కులనిర్మూలన జరగాలి. అప్పుడే కొంత పురోగమనం వైపు సమాజం వయనం సాగిస్తుందనిపిస్తుంది. అందుకే ఈ నిప్పులవానను తీసుకొస్తున్నాం.

- కెంగార మోహన్